جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء

نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

یت سالانہ عہ | ی پرچہ ۸ر

زیر ادارت

لنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۱	بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء	جلد ۱۸

ہماری شاعری	جناب نواب نصیر حسین صاحب خیال	۲
قدر اول کے ستارے	محمد عاصم صاحب حسنی	۳۲
تدوین علوم	مولوی خلیل احمد صاحب (جامعی)	۴۸
بسم مولوی سید سعید احمد صاحب اسعد ٹونکی	مولنا محمد سورتی صاحب	۶۰
بیداری کا انعام (فسانہ)	حضرت کوثر چاندپوری	۶۴
رلیات	حضرت جگر مرادآبادی	۷۹
تنقید و تبصرہ		۸۱
دنیا کی رفتار (الف) ممالک غیر	ڈاکٹر زومر	۸۹
(ب) ہندستان	س۔ا	۹۱
(ج) عالم اسلامی	ن۔ن	۹۳
شذرات		۹۹

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ قرول باغ سے شائع کیا

ہماری شاعری

میں عرصے سے خموش ہوگیا ہوں اور سے مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے ۔ چہکنا گیا ، اس ملک کی موجودہ فضا میں تو بولنا حرام ہوگیا ہے۔ ایک میں کیا ، بلبلِ نالہ کش تک دم بخود ہے ! مگر احباب کی فرمائش سے مجبور ہوکر آج کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں ۔

مجھے مذہب سے محبت ہے اس لئے اس کی اس سریلی آواز یعنی شاعری سے بھی بہت الفت ۔ اس شاعری کے متعلق حد کی غلط فہمیاں ہیں۔ اس لئے اس کی نسبت ذرا وضاحت سے کام لینا تھا۔ مگر ضیق وقت گلوگیر ہے ۔ اندازے زیادہ زبان ہلانا مشکل ہے ۔

اس بیان میں فلسفہ و روح شاعری اور اُس کیف و انبساط کو بتانے کی کوشش کی ہے جسے مُلہم ہندی رَس سے تعبیر کرتا ۔ اور جسے ہمارا کُن رس و سخن رَس ہی سمجھ سکتا ہے۔ افسوس کہ اتنی بڑی کہانی دو بولوں میں ختم ہوجائے گی ۔ مگر اسے اہل علم اور اہل نظر دیکھیں گے ۔ میرا مدعا پوشیدہ نہ رہے گا ۔ میں مطمئن ہوں ۔ آج نہیں ، کل لوگ آئیں گے میرا مطلب سمجھیں گے سمجھائیں گے اور اس مختصر کو مطول کر دکھائیں گے !!

نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ہمارے ہاں شاعری کو سمجھا ہی نہیں گیا ہے۔ اس مبحث پر جو کچھ لکھا گیا اس میں اس ،، اور اس کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ بہت ہوا تو ایک صاحب ناعری جزویست از پیغمبری ۔ اس چیستاں کا بوجھنا بھی آسان نہیں

اس لئے پہلے شاعری کو سمجھنا چاہیئے تاکہ اُس کے متعلق غلط فہمیاں دور ہوں اور اُس سے وہ فوائد حاصل ہوسکیں جو منشائے فطرت ہے۔

جاننا چاہیئے کہ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہموزنی و تقابل اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صنعت کو تَرصُیع کہتے ہیں اس ترتیب و نظام پر نظر کرکے عقلا اس کا خود بخود وجود میں آجانا محال اور اس لئے کسی ایک صناع کا ماننا فرض سمجھتے ہیں جن عقلا نے اس صنعت و حسن کو سمجھ کر اُس کے صانع کی بندگی فرض سمجھی وہ تین قسم میں منقسم ہیں۔

اول، وہ جو بذریعۂ وحی اُس کی غائت تک پہنچے اور دنیا کو اُس کے سمجھانے پر مامور ہوئے اور خلق کو وہ قوانین دے گئے جو اُس صنعت کے برقرار رکھنے میں ممد اور اُس صانع کی بندگی کے لئے ضروری تھے۔ انھیں انبیا اور مرسلین کہتے ہیں۔

دوم، وہ جو بذریعۂ طبیعیات و مشاہدات اس مسئلے کی صداقت تک پہنچے اور اپنے استدراک اور استدلال کو عیاں کر گئے انھیں حکما و عقلا کہتے ہیں۔

سوم، وہ جو بذریعۂ حیات و جذبات اس مسئلے سے باخبر ہوسکے اور دلائل و براہین سے قطع نظر کرکے تخیلات و قیاسات سے کام لینے اور عوام کو اس طریقے سے متاثر کرنے لگے انھیں شعرا کہتے ہیں۔

یہاں تیسرے قسم کے حکما و عقلا یعنی شعرا سے بحث ہے۔

<u>شاعری و شاعر</u>۔ ایسا ہر وہ خیال جو بذریعۂ حیات و جذبات، دل و دماغ میں پیدا ہوکر زبان و قلم سے نکلے وہ شاعری ہے۔ اور جو فرد اپنے حسن اور جذبہ سے اس عالم مرصع کی صنعت و حسن کو سمجھے اور اس کے صانع کا عاشق و مرید ہوکر اپنے خیالات، وہ نظم میں ہوں یا نثر میں، ادا کرے وہ شاعر ہے۔

<u>شعر</u>۔ کسی فقرے یا جملے کے موزوں یعنی وزن میں ادا ہونے کا نام شعر ہے۔ ایسے

کا ذوق بھی پیدا کر دیا۔ پھر اُسی گھر نے انھیں صحیفۂ کاملہ(۱) کی سی زبور بخشی جس نے شاعری کے مفہوم کو بتا کر اُسے فتوائے جواز دے دیا۔

ایام جاہلیت کی شعر گوئی گو شاعری کے اُس معراج کمال تک نہ پہنچ سکی جو معرض بحث میں ہے۔ مگر بلاشک وہ اُس کیف سے بھی خالی نہیں جو ایک پرجوش اور آزاد قوم کا زیور ہے انھوں نے کسی غیر مستحق کا قصیدہ کبھی نہیں پڑھا اور سرداران وقت کی خوشامدانہ تعریف کبھی نہیں کی۔ عویر، امرءالقیس کا مشہور ممدوح ہے۔ مگر اُس فصیح اللسان نے اُس (عویر) کا قصیدہ اس وقت کہا جب کہ عویر نے اُس (امرءالقیس) کے کنبہ کی جان بچائی۔ وہ صلہ کا مستحق تھا اور اسے دیا گیا۔

توہین ہوئی عربی شعر گوئی کی کہ وہ اپنی آزادی کو فراموش کر کے، اموی و عباسی خلفا کی درباری ہو گئی۔ بدقسمت تھا ابو نواس کہ امین (خلیفہ) کی مسند کا حاشیہ نشین بن کر اپنے قومی شعار و وقار کو سلام کر بیٹھا۔ بدنصیب تھا ابو تمام کہ شخصی توجہات سے اس کے حامی کا نام بلند ہو سکا۔ اور قابل افسوس ہے متنبی کہ سیف الدولہ اور اس کے لواحقین کی مدح میں اس کی خوش بیانی صرف ہوئی اور اُن کی بدولت وہ قصیدہ گو سمجھا گیا!

ایران، یونان کے ہاتھوں غارت ہوا۔ سکندر اور اُس کے لشکر نے جہان آور آثار وصنادید عجم شکست کئے، وہاں افسوس کہ زردشت کے بے علم کے اُس پر از نور آتشکدہ کو بھی سرد کر ڈالا جو برق وادئ ایمن کو چمکاتا اور دلوں کو گرماتا تھا۔ اور اس وجہ سے فارسیوں کی داستانِ باستان کا ایک ورق بھی ایسا دستیاب نہ ہو سکا جو اُن کی شاعری کی حکایت سناتا۔ اس باب میں تازیوں کی تاخت کے بعد کی روایت کے سوا کوئی اور تاریخ (نامہ) موجود نہیں۔ ناچار بہ اختصار اسی کا قصہ دہرایا جاتا ہے۔

عجم پر عرب کا اصل تسلط عباسیوں کے وقت میں ہوا۔ ہارون، فارس کا دلدادہ تھا۔

---
(۱) صحیفہ سجادیہ۔

اور مامون اس کا عاشق۔ اس طرف اور خصوصاً طوس و مرو[1] میں یہ مدتوں رہا۔ ان مشرقی ممالک پر سو سال سے، اسلامی نہیں اموی اور جمہوری نہیں شخصی سلطنت کا اثر غالب تھا۔ اس لئے فارسیوں اور ترکیوں کی زبان سے اُس وقت جو نکلتا وہ شامی و عراقی لب و لہجے میں ہوتا۔

قصیدہ، عربی میوہ ہے۔ اُس کا نخل زمین فارس پر بھی لگا یا گیا۔ اور یوں وہاں شخصی رطب اللسانی کی تلخ بنیاد پڑ گئی۔ عباس مروزی نے مامون کی شان میں بہ زبان فارسی جو قصیدہ خوانی کی وہ اس کی شاہد ہے۔ بنیاد غلط پڑی۔ اس لئے آدم پرستی کی عمارت یہاں بھی کھڑی ہو گئی۔ اور وہ کجی آج بھی نمایاں ہے۔ ایسی کجروی کے بعد بھی فارسی شعر گویوں میں فردوسی و سعدی قابل تعریف ہیں کہ وہ اگر اس حسن کو خاطر خواہ جلوہ نہیں دیتے تو اُس کے صفات سے بھی دور نہیں جاتے اور کسی کی تقلید کے بغیر دنیا کے آگے اپنا اصول پیش کرتے ہیں۔

فردوسی، پہلوی[2] کا وہ پہلا ناظم ہے جو اپنے صحیح جذبات کے بیان میں عجم یعنی گونگا نہیں۔ شہنامہ میں اس کی حمد استادانہ بلکہ مجتہدانہ ہے۔ اس کے بعد کے شعر گو اس کے تابعین ہیں اور تبع تابعین اور اُن میں کے بیشتر اس ضروری بیان کو تقلیداً و رسماً ادا کرنے والے۔ فردوسی حقیقی یزدان پرست ہے اس لئے اُس نے جمشید[3] کی نمرودیت و فرعونیت سے دنیا کو خوف دلایا وہ تثلیث یعنی اپنے ملک و قوم کا طرفدار اور اُن پر کسی بیرونی حملہ و حکومت کو خلاف نظرت جانتا اور اسے ایک صانع کی صنعت کی پامالی سمجھتا ہے، اس لئے وہ (فردوسی) رستم[4] کے سے

---

(۱) مرو۔ ترکستان کا ایک مشہور مقام۔

(۲) پہلوی۔ اصلی فارسی زبان جو ساسانیوں کے زوال تک ایران میں رائج تھی۔

(۳) جمشید۔ ایران و توران کا وہ مشہور بادشاہ جس نے اخیر میں دعوائے خدائی کیا۔

(۴) رستم اُن تورانیوں سے جنگ کرتا رہا جو اُس وقت ایران پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

ملک وقوم کے فدائی کی داستان گویوں جلوہ دیتا اور دنیا کو غلامی سے جنگ کا رستہ دکھاتا ہے۔ وہ شیدائے حقیقت ہے۔ اس لئے لہراسپ[۱] وگشتاسپ کا مدح خواں ہے اور[۲] زردشت کے سے زبردست معلم کا ثناخواں۔ افسوس کہ اُس کا کارنامہ یعنی شہنامہ محض ایک داستانِ پاستان سمجھا اور اُس کے منشار کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ بعد کے شعر گو اُس کے نقش قدم پر نہ چلے۔ اس لئے بے راہ ہوئے۔ سلاطین ایران شخصیت کے غرور میں مست تھے۔ اُن کے درباری شعرگو اُن کی اس شراب کو دو آتشہ بناتے رہے۔ آزادی روح و زبان سلب ہوئی اور فارسی ادب غلامی کا مترادف ہوگیا۔

شہنامے کے سے میوہ دار درخت کے پھلنے کے بعد زمین ایران پر گلستان کے پھول بسے۔ سعدی، یثرب و بطحا کی زبان کا نمک چش، اور خم معرفت آلِ محمد کا جرعہ کش ہو ہے۔ مصلح الدین واقعی مصلح دنیا تھا۔ بداخلاقیوں کے عہد میں اُس نے اخلاق کا سبق دیا۔ خودمختار سلاطین کو بے اختیار منوایا اور سے

رعیت چو بیخ ست و سلطاں درخت   درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

کا سا اصول پیش کر کے دنیا کو حکمرانی کا راز اور راعی و رعایا کے حقوق و اتیاز کو بتلایا کہ اس کے بغیر عالم میں وہ حسن یعنی تناسب قائم نہیں رہ سکتا جو اس کائنات کی خوبصورتی و دل فریبی کے لئے لازم اور جس پر اس کارخانہ کی بنیاد نظر آتی ہے!

شیخ کے کلام اور خصوصاً اس کی گلستاں کی قدر ہوئی تو صرف اس قدر کا شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد؟ کے مقولہ کو فراموش کر کے وہ مکتبوں تک پہنچائی اور بازیٔ اطفال بنائی گئی اور یوں بالغ دماغوں تک اس کی رسائی نہ ہوسکی کہ ہماری زندگی میں کام آتی۔ اور پھر اس گلستان

---

(۱) لہراسپ اور اس کے بیٹے گشتاسپ کے زمانے میں زردشت کا ظہور ہوا اور انھوں نے زردشتی دین قبول کیا۔

(۲) زردشت ایران کا وہ معلم و ہادی جس نے دعوائے پیغمبری کیا اور جمشید وغیرہ کے اصول کو توڑ کر وحدانیت کا سبق دیا۔

فراموش قوم اور اس کے شعر گو، بعد کو، اپنے تخیلات کی وادی میں حیران و سرگردان پھرے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے اور اُن میں سے بیشتر یتبعہم الغاوٗن کے مصداق ہو گئے!

ہند میں جس فارسی ادب نے گھر کیا وہ ترکوں کے ذریعے سے یہاں پہنچا تھا۔ اس قوم میں افراسیاب کے وقت سے لہو ولعب زیادہ پسند اور سنجیدگی ناپسند تھی۔ چنگیزیوں اور اُن کے بعد کے تورانیوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر بھی اپنے عادات وخصائل نہ بھولے۔ اور اس لئے فارس کے ادبی باغ سے اپنے ساتھ وہ میوہ چن لا جو بظاہر خوش نما ہو مگر بے مغز تھا۔ اس کا بیج، اُن کے ہاتھوں سے، یہاں بھی ڈ اور وہ تین سو برس یعنی غوریوں سے لودیوں تک، اس زمین پر پھولتا پھلتا اور زبان ہی کو مزا نہیں دیتا رہا بلکہ ہمارے خون میں سرایت کر گیا۔

مغل یا منگول اپنی قومیت و مذاق میں ان ترکوں سے بہتر نہ تھے۔ وہ چین و ماچین کے اس اثر رنگ کے آئینہ دار بھی بنے جس پر مانی[1] کی قلمیاں زیادہ چڑھیں اور حجازی قلم جس پر کم رنگ بھر سکا تھا!

بابر تیموری اس قوم کا سردار ہے جو آخر شاہ ہند بنا۔ اپنے خاندان میں اس کی گردش و فلاکت ضرب المثل رہی۔ اور اس وجہ سے اس میں وہ فروتنی ہونا چاہئے تھی جو ایک فلک زدہ کے لئے ضرور ہے۔ مگر وہ اپنی مصیبت اور دشت نوردی کے عالم میں بھی یوں بے باکانہ کہتا ہے ؎

نوروز و نوبہار و مئ و دلربا خوش ست   بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

---

(۱) مانی۔ یہ علم، عراقی ہے۔ مگر اس کا اصول زیادہ تر توران و چین میں پھیلا۔ ادھر کے مسلمانوں میں دین مانی کی اکثر باتیں رائج ہیں اور اس کا اثر اب تک باقی ہے۔ مانی زیادہ تر اپنی مصوری کے باعث مشہور ہوا۔

یہ یونانی ایپکوریّن[1] کے وہ خیالات تھے جو سکندر کی نکالی ہوئی راہ سے فرغانہ پہنچے اور وہاں رہ گئے اور بعد کو ہند آئے۔ اس وجہ سے کہ ہمایوں سے شاہجہاں تک زیادہ تر یاری چال رہی اور شاہی اثرات سے اس ملک کی رفتار و گفتار بے قید ہوگئی اور یہاں کا درباری فارسی ادب اُسا شاعری کو جلوہ نہ دے سکا جو حسن کی مدح خواں اور اس کی وکیل رہی ہے۔ عالمگیر اس معاملے میں خالی الذہن تھا۔ ورنہ اُس کی توجہ سے جہاں اور بدعات دور ہوئے وہاں ہماری شاعری کی یہ بدعت بھی دماغوں سے خارج ہو کر اسے ایک عبادت منواتی اور مرقات مصعدِ اعلیٰ تک اسے پہنچا دیتی!

اورنگ زیب کے بعد یہ ملک مخصوں میں گرفتار اور بعد کو طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ بہادر شاہ (اول) سے فرخ سیر تک عجب اُلجھن کا زمانہ تھا ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ‌‌ ‌‌ ‌‌ کہ یاران فراموش کردند عشق

عشق عاشقی کیسی، یہاں تو خود فراموشی تھی۔ مگر ہماری اردو شاعری بھی عجب سخت جان ہے کہ ٹھیک اسی عالم انتشار میں وہ پیدا ہوئی اور بڑھنے لگی۔

تاتاریوں کی تاخت نے توران و ایران سے صلحا، و اصفیا، کو اخراج کرکے ہندوستان پہنچایا۔ ان کی برکت سے امید تھی کہ اب اس ملک میں بھی اس بادۂ حجاز کا دور عام اور علی الدوام ہو جائے گا جس کے وہ جرعہ کش رہے تھے۔ لیکن یہاں اس وقت تک ملک گیری و خانہ جنگی کا نشہ، اس طرح نہ اترا تھا کہ دماغ یکسو ہو کر اس کی طرف ہاتھ بڑھ جاتے۔ کوتاہ دست محروم اور پیرمغاں مغموم رہے۔ ہاں، سلطان بلبن کے دور میں سلطان[2] جی کی توجہ و برکت

---

(۱) ایپکورین۔ یونان کا وہ مشہور فرقہ جو حیات انسانی کو اسی دنیا میں ختم سمجھتا اور اسلئے کھاؤ پیو اور خوش رہو کا سبق دیا کرتا تھا۔

(۲) سلطان جی۔ حضرت نظام الدین اولیاء۔

سے میر خسرو کا طوطیٔ زبان چہکا۔ اس نوا کا اثر ہو چلا تھا کہ سلطنت گردی کے ساتھ ادب(۱) و مذاق گردی بھی ہوگئی۔ اور خسرو کے ترانے قوالوں کے گلوں میں اٹر کر اس طرح بلند نہ ہو سکے کہ ہماری فضا پر چھا جاتے۔ اور اس لئے فرخ سیر و محمد شاہ کی محفلوں میں خسروی ساوْرے(۲) کی جگہہ پوربی(۳) گونجنے لگی۔

بیدل(۴) پوربی عظیم آبادی، عالمگیری شہزادوں اعظم و معظم کے معلم تھے۔ اُن کا اور اُن کے سرود کا اثر دربار و بزار دونوں پر گو عام تھا، مگر اُن کی تعلیم عام فہم نہ تھی، اس لئے ہمارے دماغ اس کے اصلی فوائد سے خالی رہے۔ ہماری اردو شاعری وجود میں آئی تو وہ ابتدا زیادہ تر ان اثرات میں پرورش پاتی اور فارسی کے اس ادب کا شیر بھی نوش کرتی ر جو نہر لبن سے نہیں بلکہ سیحون و جیحون سے لایا گیا اور یہاں پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔

بدقسمتی سے اس ادب میں ہمارے ملکی یعنی وہ ویدی خیالات بھی معقولیت کے سا داخل نہ ہونے پائے جو اس عالم مرصع کو جلوہ دینے والے بلکہ اس کے شارح و مفسر ہیں۔ اور اس وجہ سے ابتداً ہماری نظم اُس حسن ہی سے معرا نہ رہی جو شاعری کی روح ہے بلکہ اُن صحیح و فطری جذبات سے بھی محروم ہوگئی جو اُس ذات حسن کے صفات ہیں!

اس میں شک نہیں کہ حافظ کے بعد سلجوقیوں بلکہ صفویوں تک ادب فارسی کے پتلے پر وہ خرقہ بھی نظر آیا جو اس کا عیب پوش رہا۔ لیکن اس کے اس جامہ احرام کا ایک اچھا حصہ زمزم

---

(۱) ادب گردی و مذاق گردی، اردو کے یہ نئے الفاظ ہمارے تصرفات میں سے ہیں!
(۲) ساورا۔ بھجن کی طرح بروزن داورا، میر خسرو کا ایک ایجاد کردہ راگ جو بھجن کی دھن میں گایا جاتا تھا۔
(۳) پوربی ایک راگ ہے۔ بیدل پوربی تھے۔ اس وقت ان کا کلام بہت مقبول تھا۔ اس مناسبت سے اُن کی غزلوں کو پوربی کہا گیا!
(۴) مرزا عبد القادر بیدل پوربی، عظیم آبادی تھے۔

میں نہیں بلکہ دنیا کے اُن حصّوں میں بھی غوطہ کھا گیا جو بظاہر صفا ہوں مگر باطناً قلتین[1] تھے۔ پہلی صدی ہجری سے تیسری بلکہ چوتھی صدی ہجری تک عالم اسلامی، عالم انتشار میں تھا۔ نقلیات کا مقابلہ عقلیات سے اور ان دونوں کی جنگ روحانیات سے شروع ہوگئی۔ معتزلہ[2] بیچ میں آئے لیکن اُن کے اخوان الصفا کے سر پر وہ تیشۂ سخت لگا کہ اٹھ نہ سکے۔ اور بعد کو ہماری علمی جماعت صاف صاف دو گروہ (علمائے ظاہر و علمائے باطن) میں منقسم ہو کر ایک دوسرے کی دستار اچھالنے لگی۔ اشاعرہ[3] وحنابلہ کے آپس کے فسادات سے فائدہ اٹھا کر یہ فرقہ علمائے باطن مضبوط تر ہوگیا۔ یہی وہ گروہ ہے جو اپنی مختلف شکل وشمائل میں اور اپنی سادگی وضع کے باعث بعد کو ایک صوف کے نام سے شناخت کیا گیا۔ ابن جوزی[4] و بن تیمیہ کی شمشیر زبان گو اس فرقے پر بھی چلتی رہی مگر اُن گوشہ نشینوں کا قلع قمع نہ کر سکی۔ اہل ظاہر نے اگر انھیں لخت لخت کرنا چاہا تو انھوں نے بھی اپنے زور زبان سے انھیں پارہ پارہ کر دیا۔ ان اہل باطن کا واعظ انھیں اہل ظاہر میں سے ہے جس کی نسبت بہ بانگ دہل کہا گیا، کہ

واعظان کین جلوہ بر محراب و ممبر می کنند
چوں بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند!

یہ واعظ جیسے یوں بدنام ہوا کہ ہمارے ادب وشاعری کے قصائد میں وہ ایک مستعد مشبہ بہ ہی کا کام دے کر نہیں ہنسا تا بلکہ وہ ہماری محفلوں کا خونخوار محتسب بھی بنا اور آخر اس غریب پر دروازۂ رحمت تک بند ہوگیا!

اس وقت ہماری حکومتیں زیادہ تر اُن علمائے ظاہر کے قبضے میں تھیں جن کی تائید پر آن (سلطنت) کی ہستی منحصر تھی اس لئے ان (علمائے ظاہر) کے اصول کے خلاف تقریر و

---

(۱) قلتین۔ اس کے اصل معنی گندے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کا فارسی ادب منزہ نہیں بلکہ نجس ہو رہا تھا!
(۲) معتزلہ مسلمانوں کا وہ مشہور فرقہ جس کے مسلک کی بنیاد عقل پر رکھی گئی۔ اس فرقے نے بنی عباس کے شروع عہد میں فروغ پایا لیکن مسلمانوں کے اُن دوسرے فرقوں نے جن کے ہاتھوں میں بعد کو سلطنت کی باگ آگئی معتزلہ کو زندہ نہ رہنے دیا۔ انکی انجمن اخوان الصفا خاک میں ملائی اور انکی کتابیں تک جلائی گئیں۔ (۳) اشاعرہ مسلمانوں کا یہ بھی ایک نمایاں فرقہ تھا اور یہ حنابلہ یعنی حنبلیوں کی ضد تھا۔ (۴) ابن جوزی و بن تیمیہ مشہور محدثین ہیں، صوفیوں کے دشمن اور اپنے سوا اسلام کے دوسرے فرقوں کو بد کہنے میں مشاق وممتاز۔

تحریر کفر و بغاوت تھی۔ اہل باطن۔ رحمت و شفقت کو قہاری سے اور عشق و محبت کو جباری سے بدلا ہوا دیکھ کر منہ بناتے مگر زبان نہ ہلا سکتے تھے۔ لیکن خیالات و جذبات کیونکر اور کب تک رُکتے۔ انھوں نے اپنے بیانات کا آخر دوسرا طریقہ اختیار کیا اور اپنے تصورات کا نقشہ، مجاز کے اس پردے پر کھینچا جو حقیقت کا مظہر تھا مگر ظاہرین کی گرفت سے باہر تھا۔

فراق و وصل و گل و بلبل و بہار و خزاں　　جنون و عشق و وفا و جفا و ناز و ادا
بہار حسن و دلِ آویزی کرشمۂ حسن　　ہجوم شوق و فورِ توحش و سودا
ریا بھرے ہوئے پند و نصائح واعظ　　شراب و ساقی مہ رُو و ساغر و مینا
قصور و حور و جن و انس و آسمان و زمین　　بہشت و دوزخ و رندی و توبہ و تقوا

یہ تشبیہات و استعارات کسی ایک قوم اور کسی ایک ملت کے خیالات کے آئینہ دار نہیں بلکہ سامیوں (Semitics) افلاطینوں (Neo-Platonistis) مرقیطیوں (Marcanatistis) اور مانیوں (Maniehaeism) اور ویدیوں (Vedistis) اور عربوں (Saracenes) کے مخلوط دماغ کا وہ جوہر تھے جو رومن و فرنچ پراقلیت[1] (Praclete) اور جرمن پائے ٹسٹ[2] کے سے داعیانِ عشق باطنیوں کے گھروں میں کشید ہو کر دو آتشہ و سہ آتشہ بنے اور شراب معرفت کے نام سے پئے اور پلائے گئے۔ ان ہی کنایات و استعارات کی بنیاد پر ہمارے روحانی ادب و شاعری کی خشت اول رکھی گئی اور اور اُن سے وہ محل تیار ہو گیا جہاں ہمارے مزاج پرورش پاتے رہے اور پرورش پا رہے ہیں!

---

(۱) پراقلیت۔ فرنچ لفظ ہے۔ باطنیوں اور صوفیوں کی طرح یورپ کا وہ فرقہ جو وہاں اصلی عیسوی مذہب کے پھیلانے کی کوشش کرتا رہا۔

(۲) پائے ٹسٹ ([illegible]) جرمنی کا وہ مشہور فرقہ جس نے پروٹسٹ (مذہب) کے خشک و قشری رویے سے عاجز آ کر، مذہب کی بنیاد عشق و محبت پر رکھی

بیانات وتعلیمات کا یہ مجازی دو ّیدانتی (یعنی معرفتی) انداز. Reasoning
یعنی عقلیات وتعینات سے گو دور نظر آئے مگر جذبات وحسیات بلکہ تنزہات سے وہ قریب تر تھا
اس لئے ہمارے حواس اس سے لذت گیر رہے اور جب تک وہ ان نیچرل نہ بنا ہمارے دماغ
بے زحمت عروج پاکر پرکیف دکھائی دیئے. لیکن بے بصری یا بلند پروازی نے ایسی لاجواب
اور یٹری (طلاقت) کے لئے فضول الفاظ اور پیچ در پیچ استعارات کے وہ طوفان اٹھائے
کہ اُس کا اصلی وفطری زور ہوا لکہ غائب ہوگیا۔ فارسی ادب وشاعری اس ساز وسامان سے
اس ملک میں داخل ہوئی اور رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہوگئی کہ فرخ سیر کے عہد میں ہمارے ریختہ[1]
کی بنیاد آخر اسی پر قائم ہوکر ریختہ ہوگئی۔

ابھی کہا جاچکا ہے کہ تاتاریوں کی سفاکیوں نے ترک وفارس کے اہل صفا کو کس طرح
ہندوستان پہنچایا اور کس خموشی وصلح جوئی سے وہ اپنے فرائض و وظائف میں مشغول تھے. شاہ
بوعلی قلندر کا دارۂ استغراق اگر میدان پانی پت کو گھیرے ہوئے ؎ در دیر وحرم جلوہ دلدار یکیست
کی آوازے اس زمین کو فتح کر رہا تھا تو دلی میں سلطان جی کا رواق عروج بھی ؎ پروانہ چراغ
حرم ودیر نداند۔ کی صدا سے یہاں کی فضا پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ اہل دل کی ایسی صفائیوں نے
اس ملک کے بند چشموں میں ایک تلاطم ڈالا اور یہاں کے قدیم رنگ باطنیت میں ہیجان شروع
ہوگیا۔ بابا کبیر داس انھیں صداؤں سے اٹھے اور گرو نانک بھی انھیں آوازوں سے چونکے
اور پھر ہماری زمین پر سرمد ظاہر ہوکر منصور سمجھا گیا ؎ آگاہ نئی چو شیشہ، از بوئے گلاب۔ کی
خوشبو دلی کی ہوا میں جذب وتحلیل ہوکر ہمارے سروں پر نفی واثبات کا نور برسانے لگی! اور
یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عالمگیر کے بعد جب سلطنت میں انقلاب وزوال شروع ہوا تو سختیٔ قلب گھٹنے
اور گدازی دل بڑھنے لگی اور ہماری رنگین مزاجی شوب کھاکر آخر صوفیانہ ہوگئی:
فرخ سیر ومحمد شاہ کے زمانے کو یاد کرنے والے اُس عہد کی صرف اُن آزادیوں بےفکریوں

---

(۱) ریختہ. یعنی اُردو نظم۔

اور خصوصاً اُن رنگ[1] رلیوں کو جلوہ دیتے ہیں جو جلوخانہ دہلی میں اس وقت بنظاہر آئینہ تھیں۔ مگر اس تصویر کا دوسرا رخ مٹا دیا جاتا اور دماغ اُس سے خالی رہ کر طرح طرح کے وسوسوں کا آزرنگ بن جاتا ہے۔ اس دور میں علوم و فنون کی ترقی کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے لیکن اتنا سن لو کہ ان شاہوں کے جلوس میں جہاں ایک طرف عیش و نشاط کے ساز چھڑے تو دوسری طرف اخلاق و معرفت کے نعرے بھی گونجتے اور دلوں کو گرماتے اور ہلاتے رہے۔

نواب نوازش علی خاں و نواب اشرف علی خان دہان (دہلی) کے اُسی عہد کے امرا میں سے ہیں جن کے گھر میں محفل میلاد و مجالس عزا کی بنیاد پڑی۔ اور حضرت خواجہ ناصر عندلیب اور حضرت شاہ گلشن علی اُسی زمانے کے وہ صاحب باطن بزرگ ہیں جن کا مدرسہ و تکیہ، مذہب و اخلاق کے درس کے لئے مشہور اور جائے پناہ خاص و عام رہا اور اُن کی برکت و توجہ سے یہ مذہبی چرچا آخر گھر گھر پھیل گیا۔

یہ انھیں بزرگوار کا فیض تھا کہ نواب اشرف علی خاں کے خلف الرشید، نواب فضل علی خاں فضلی (۱۱۴۵ھ) نے اُردو میں اپنی کربل کتھا سنا کر اس زبان کو کوثر و تسنیم سے دھویا اور ہمارے دماغ کو مصفا و مطہر کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ہندی نثر نہیں ہوئی مستمع"۔ اس دعوے نے ثابت کر دیا کہ آپ کی اردو کی زبان کھلی تو اس ذکر میں جس کا اخلاق، عقلیات و جذبات دونوں کا حامل اور ممدوح فریقین ہے!

دکھن میں آپ کی زبان بہت قبل وجود میں آئی۔ عادل شاہی (ہمعصر اکبر و جہانگیر) دربار نے وہاں اس کی بنیاد نظم پر رکھوا دی۔ شجاع الدین نوری اُدھر کا وہ زردشت ہے جس کا نام و کام دونوں نورٌ علیٰ نور سمجھا گیا۔ وہ اس زبان کی پہلی نظم پر فخریہ کہتا ہے ؎

---

(۱) رنگ رلیوں بھی بولتے ہیں۔ مگر ہماری زبان پر رنگ رلیوں ہے۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا | ولے سب تعصب دیا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا، نہ جھجکا ذرا | وہ ہم مرثیہ سے پہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعا | وہ ہم تک کا احوال پورا لکھا
میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا | عجب حال عاشور خانہ کا تھا
جن وانس کرتے تھے سب واہ وا | کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زبان اپنی میں کس نے ایسا لکھا | کبھی اس سے پہلے سنائے پڑھا
(۱)ان سے اس کا ملے گا صلا | ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا

ملاحظہ ہو۔ وہاں بھی آپ کی زبان پھوٹتی اور اس کی نظم کی بسم اللہ ہوتی ہے تو اسی ذکر میں جو عشق و معرفت کا سرچشمہ اور ہماری حیات کے لئے آبحیات ہے!

یہ تھے وہ اذکار جو دلی کی ان معرفت گاہوں میں زبانوں اور گلوں سے رستوں سے اٹھائے اور ہند کی فضا میں پھیلائے جا رہے تھے۔ شاہ ناصر عندلیب کے بعد اُن کے خانہ باغ میں وہ بلبل درد آشنا چہکا جو خواجہ میر (درد) کے لقب سے مشہور ہے۔ موسیقی کہ رازِ فطرت کو بلند اور شاعری کو راز فطرت کو عیاں کرتی ہے، وہاں (دلی) کے اس صومعہ میں بھی مدتوں گونجی۔ ان میر کے مضامین نے دلی ہی کو نہیں سارے ہند کو کھینچا۔ کلاونت اور اتائی سب ٹوٹے اور ان آوازوں سے اپنے مزنار(۲) بھرے جو دوسری جگہ جاتی سے خالی کئے گئے۔

درد نے اپنی واردات کے بیان میں تشبیہات و استعارات کا وہ گہرا پردہ نہ ڈالا جس میں حقیقت پوشیدہ ہو کر راز کی راز رہ جاتی۔ انھوں نے اپنا رستہ الگ نکالا۔ اور پرلنے انداز میں اگر کہا بھی تو یوں کہا ؎

اے درد اس جہاں میں اگر صدائے غیب | بے پردہ ہوئے جس سے وہ پردہ ہے ساز کا

---

(۱) اس سے ثابت ہو گیا کہ اردو نظم و نثر کی بنیاد اخلاق پر ہے نہ کہ بد اخلاقی پر۔
(۲) مزمار۔ باجہ۔ ساز

یعنی لاکھ ڈھانکو مگر راز حقیقت کھول ہی دیتا اور حسن و معرفت کو عیاں کر ہی دیتا ہے !

اس نعمت خدا داد کا مزا یوں تو اس وقت کسی نے نہیں چکھا مگر میر تقی میر نے اُس سے جو لطف اٹھایا اُس کا کیف اُن کی بات بات سے عیاں ہے۔ یہ خواجہ میر کے سجادی کے وہ دوسرے فقیر تھے جن کے قلب حزیں پر زمانے کی نیرنگیوں اور سلطنت گردیوں کا اتنا اثر پڑا کہ دلّی قفس بنی، اور سے کون رو رو کے زندگی کاٹے۔ میر، دلی میں جی نہیں لگتا، فرما کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں کے باغ میں بیٹھ کر اپنا فسانہ سناتے رہے۔ میر صاحب، ہو حق، کے بندے نہیں۔ وہ عالم حسن پر آنکھیں بند کر کے نظر ڈالتے اور اُس میں جذب ہو جانے کی بہ خموشی یوں آرزو کرتے رہتے ہیں ؎

بہ رنگ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے کہ ہمراہ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے

یہ تھا وہ مذاق جو اس وقت دلی ہی تک محدود نہ رہا۔ بلکہ ملک میں عام ہو گیا۔ بنگالہ میں وہ درد کے مشہور مرید و شاگرد (مرزا جان تپش کی سرگرمی سے گرم ہوا۔ اہل درد کی یہ وہی آگ تھی جو کلکتہ و مرشد آباد اور خصوصاً ڈھاکہ کی زبان و کلام میں مدتوں شعلہ بنی رہی اب بھی اس کا اثر کچھ باقی ہے اور وہاں کی راکھ کرید و تو دبی دبائی چنگاری[1] مل ہی جائے گی۔

بہار اور خصوصاً عظیم آباد (پٹنہ) نے دلی کے ساتھ ساتھ اس حسن پر جی قربان کیا۔ بیدل ہی اس کے دلدادہ نہیں۔ راسخ جو ہمعصر و ہم مرتبہ میر ہیں اس کے شیدائی رہے۔ وہ ہر طرف سے منہ پھیر کر فرماتے ہیں۔ ؎

نگراں کبھو نہ یہ جانب رخ دلفریب پری رہی مری چشم تا نگہہ پسیں تری محو جلوہ گری رہی

سنو۔

مجھے سونپ داغ فراق سے، ہلوے یوں جدا کہ پھر ملے مرے دل میں تادم واپسیں وہ امانت انکی دھری رہی

(۱) جیسے استاد وحشت (خان بہادر رضا علی، کلکتوی) کی شاعری!

سنو، سنو۔

نہیں ہوش والوں سے کچھ حسد بھی رشک ہے تو انھوں سے ہے جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے میری طرح بے خبری ہے

نہ تھی چشم راسخ خستہ دل، کبھی خالی اشک سے دو دستاں

شب و روز جام پر آب کی روش آنسوؤں سے بھری ہے

نادری و درّانی حملوں نے دلی کے چاندنی چوک اور لال قلعہ ہی کو نہیں لوٹا بلکہ وہاں کے دماغوں کو بھی اجاڑ کر تتر بتر کر دیا۔ فیض آباد اسی وقت آباد ہوا۔ صفدر جنگی و سالار جنگی لڑا کے درجات عالی ہوں کہ انھوں نے دارالسلطنت (دتی) کے ان جواہر کو بھی سمیٹا جو دلی کے تخت و تاج کا کوہ[1] نور تھے اور انھیں اپنی شہ نشین کا کرسی نشین کر دیا۔ میر ضاحک، دلی سے اسی عہد میں فیض آباد آئے اور میر حسن اسی زمانے میں وہاں آباد ہو کر ان نوابوں (صفدر جنگی و سالار جنگی) سے وابستہ ہو گئے۔

حسن، خواجہ میر ہی کی مسند فقر کے حاشیہ نشین تھے۔ ان کا گھر نشتوں سے خود ادب و اخلاق کا مدرسہ تھا جہاں اُن کی تربیت ہوئی۔ اس عندلیب درد کی صحبت اور ان سے ارادت۔ اپنی اس قربت و مودت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں: "بہ قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد کہ در مندیہائے اوشان میان درویشان چوں فرد نشر۔ دیگرے را بخیال خود قائم نہ کردم کہ وضع آں را پسندم و دل بہ گفتار آں ہا بندم"

حق ہے۔ اس صحبت سے آشنا ہونے کے بعد کدھر جاتے۔ یہ اسی مزے اور یکسوئی کا نتیجہ تھا کہ اُن کے دماغ و زبان نے ہمارے یہاں آخر وہ اعلیٰ مذاق شاعری قائم کر دیا جس کا مثل ممکن نہیں۔ اس اعلیٰ فطرت اور قدرتی شاعری کا اظہار اصل انھیں کے وقت میں ہو گیا تھا۔ مگر اس کی تکمیل ان کے پوتے میر انیس کے ذریعے سے مقدر تھی اور وہ ہو کر رہی۔

---

(۱) کوہ نور۔ وہ مشہور و معروف ہیرا جو دلی کے تخت و تاج کا زیور بنا رہا۔

حسن بچپنے سے ایک عظیم الشان کام کے سرانجام کے لیے تیار ہو رہے تھے اور قدرت نے اس کام کی خاطر انھیں منتخب کر کے ایسی تعلیم و تربیت پر لگا دیا جس کی تحصیل کے بغیر اُس امر کا خاطر خواہ انجام ممکن نہ تھا۔ یہ عظیم الشان کام اُن کی اُس بے نظیر مثنوی کا سرانجام تھا جو دنیا میں سحرالبیان کے نام سے ظاہر ہوئی اور بدرمنیر بن کر چمکی۔ اس مثنوی کو جس نے بغور پڑھا وہی سمجھ سکتا ہے کہ جب تک دنیاؤ مافیہا کے مختلف شعبہ و مدارج میں کسی کو دخل تام نہ ہو ایسی کوئی شے اس کے دماغ و قلم سے نکل نہیں سکتی۔

اس عجیب و غریب تصنیف کے مختلف رنگ و پہلو ہیں۔ مگر ان میں سب سے اول اور پختہ رنگ اس کی اُس حمد کا ہے جس سے بسم اللہ کی گئی۔ یہی وہ شراب معرفت تھی کے لئے حسن کا دست سوال یوں بلند ہوا۔

اگر چاہتا ہے مرے دل کا چین — نہ دیکھیو وہ ساغر جو ہو قلتین

وہ بادۂ خالص ملا جسے انھوں نے پیا اور پلایا اور اُس کے سرور میں داتِ اصل، دینے والے کی یوں ستائش کرتے ہیں ؎

کروں پہلے توحید یزداں رقم — جھکا جس کے سجدے میں اول قلم
سرلوح پر رکھ بیاض جبیں — کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک — تری ذات ہے وحدہٗ لاشریک
وہ رہے سب ہیں اس سے وہ ہے سب سے پیش — ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش
وہی مالک الملک دنیاؤ دیں — ہے قبضے میں اس کے زمان و زمیں
سدا بے نمودوں کی اس سے نمود — دل بستگاں کا ہے اس سے کشود
اسی کی نظر سے ہے ہم سب کی دید — اُسی کے سخن پر ہے گفت و شنید
نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے — وہ کچھ شے نہیں پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں ہے وہ نہ ہے سنگ میں — ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

وہ ظاہر میں ہر چند ظاہر نہیں — یہ ظاہر کوئی اس سے باہر نہیں
تامل سے کیجئے اگر غور کچھ — تو سب کچھ وہی ہے نہیں اور کچھ
اُسی گل کی بو سے ہے خوشبو گلاب — بھرے ہی لئے ساتھ دریا حباب
پر اس جوش میں آکے بہتا نہیں — سمجھنے کی ہے بات کہتا نہیں

سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ہندوستان میں اور سلطنتِ صفویہ کی بنیاد ایران میں تقریباً ایک ہی وقت میں پڑی۔ حکومتِ مغلیہ کا بانی ایک رندمشرب بادشاہ یعنی بابر اور سلطنت صفویہ کا بانی ایک صوفی مشرب عالم یعنی شاہ صفی الدین ہے۔ مگر یہ طرفہ تماشہ ہے کہ یہاں کے مغلیہ، مرتاضین ومشائخین کا ادب واحترام کرتے ہیں اور صفویہ اپنے ہم مشربوں کے عدو ہو جاتے ہیں۔

شاہ صفی الدین، حضرت شیخ جیلانیؒ کے مرید تھے۔ انھوں نے اخیر میں اپنا ایک جتھا قائم کیا اور اُس کی امداد سے شمال ومغرب ایران کے اکثر بلاد پر قبضہ کرکے وہاں کے حاکم بن بیٹھے۔ ان کے اخلاف نے بعد کو، فارس پر ہاتھ مارا اور اصفہان میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور یہ سلطنتِ صفویہ کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ان سلاطین کو روس وترک سے زیادہ اپنے ہم قوم وہم مشرب فرقہ وجماعت (صوفیین) کا خدشہ تھا۔ اس گروہ کی تعداد اس وقت غیر معمولی اور اُن کی طاقت مسلم تھی اس لئے صفویوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی اُن کے پامال کرنے کی فکر کی۔ شاہ اسمٰعیل اور شاہ سلطان حسین کا زمانہ تاریخ ایران میں مشائخ کشی کے لئے مشہور ہے۔ اس وقت ہزاروں جاسوس مقرر ہوئے۔ انھوں نے ان گوشہ نشینوں کا سراغ لگا کر انھیں گرفتار کرایا اور حکومت نے انھیں سیاست کا شکار بنایا۔

تیسری صدی ہجری کے بن جوزی وبن تیمیہ کی سنان زبان کا حال ابھی سن چکے۔ مگر نویں صدی ہجری کی اس تیغ صفاہانی کی صفائیوں کی روداد بھی تاریخوں میں پڑھو کہ اہل صفا کے لئے وہ کس طرح شمشیر براں بنی رہی اور اُن غریبوں کے لئے اپنے ملک میں، امن وامان کا رستہ کیونکر بند ہوکر کوچہ ہائے تیغ سے بھی اُن کا گذر نامحال ہوگیا۔ مشہور علامہ سید شاہ طاہر کاشانی کا واقعہ

سی تاریخ داں پر پوشیدہ نہیں ۔ اُن کا سا شیخ وقت، بہ سختی و مجبوری کسی طرح اپنی جان لے کر ایران
ے ہندوستان چلا آیا۔ یہ وہی علامہ طاہر ہیں، جن کے دست پاک پر، بقول فرشتہ (تاریخ) برہان
ناہ سلطان دکھن نے بیعت کی اور معہ اراکین سلطنت امامیہ مسلک اختیار کر کے اس مشرب کا
ذمت گذار ہوگیا۔

ان سلاطین کے غیظ و غضب کی تلوار اس وقت کے زندہ اہل باطن ہی پر نہ چلی بلکہ اُن
کے خنجر مردوں کی ہڈیوں کو بھی ریتنے میان سے نکل پڑے۔ شاہ سلطان حسین وحشت و خشونت
یں آکر ایران کے صلحا و عرفا کے مزاروں کے بھی پیچھے پڑا اور گڑے مردے اکھاڑنے لگا۔
پنے جوش غضب میں ایک دفعہ اصفہان سے شیراز پہنچا۔ اور وہاں سعدی و حافظ کی قبروں کو
یہ خاک کرنے کھڑا ہوگیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس وقت کچھ امرائے سلطنت مانع ہوئے۔ آخر
فیصلے کے لئے شیخ و خواجہ کے کلام سے تفاول کیا گیا۔ سعدی نے آواز دی، کہ ؎

الٰہی بحق بنی فاطمہ   کہ بر قول ایمان کنی خاتمہ

ور لسان الغیب نے جواب دیا کہ ؎ جوز اسحر نہاد حمائل برابرم۔ یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم۔ اس
پر بادشاہ ٹھنڈا ہوا اور وہ تربتیں سلامت رہ گئیں!

صفویوں کے عہد میں لاریب علمی ترقیاں بھی ہوئیں اور اس کے لئے وہ لائق ستائش
یں۔ اس وقت جید علما بھی پیدا ہوئے۔ لیکن معقولات و منقولات کی تلوار اُن میں بھی چلتی رہی
ور ان دونوں کے خدنگ روحانیت کی طرف ہمیشہ سیدھے رہے۔ سلطنت کبھی معقولی تھی اور
بھی منقولی اور ان کے بل پر وہ (حکومت) باطنیت کا استیصال کرتی رہی۔ اور اس کا یہ
یتجہ تھا کہ وجدان کمزور اور شاعری جو اس کا ایک زبردست آلۂ کار ہے بے کار ہو جائے۔

ان حالتوں اور تزکیۂ نفس کے ایسے اداروں کی تباہیوں کو دیکھ کر شیخ وقت، ملا بہاء الدین
آملی، زیادہ خموش نہ رہ سکے۔ ظاہر بینوں کو وہ گھورتے، اور معقولیوں کو معقول کرتے رہے۔
شاہ عباس (صفوی)، کے عہد میں کہ اس وقت وہ قاضی القضاۃ تھے، اپنی مشہور مثنوی

نان و حلوا تصنیف کی۔ اس میں ارشاد کرتے ہیں ؎

لَیْتَ شِعْرِیْ مَا عُلُوْمُ الْفَلْسَفَہ — کَمْ اَرَی الْاَعْمَارَ فِیْہَا مُتْلَفَہ[1]

رازان نہ گردد بر تو ہرگز کشف راز — گر بود شاگرد تو صد فخر رازؔ[2]

اَیُّہَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَہ — کُلَّمَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَہ[3]

دل منور کن ز انوار جلی — چند باشی کاسہ لیس بوعلیؔ[4]

علم نبود غیر علم عاشقی — مابقی تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ وہی نان و حلوائے شیخ ہے جس کی لذت سید اکرم جناب مفتی میر محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ، اپنی مثنوی من و سلویٰ میں نہ بھولے۔ فرماتے ہیں ؎

سیدا نان بہائی خوردہ — نعمت الوان شاہی خوردہ

نظم او دریا و نظم شبنم ست — ہست ایں کشکول و آں جام جم ست

بوریا با مسند جمشید چیست — نسبت ذرات با خورشید چیست

یہ نان و حلویٰ، من و سلویٰ بنا اور اس کا مزا مدتوں ہماری زبانوں پر رہا۔ شیخ کی ؎ مرحبا اے بلبل بستانِ حیؔ[5] کی پکار نے لیلائے عشق کو پھر بے پروا اور قیس دل کو پھر مجنوں بنا دیا! یہ صدائے نادر فارس سے ہند بھی پہنچی اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس بستان حی کے بلبل، درد و میر اپنی نواسنجیوں سے باغ ہند کو فردوس بریں بنا رہے تھے۔ لکھنؤ میں بھی

---

(۱) یعنی فلسفہ میں وہ شعور کہاں جس سے معرفت حاصل ہو۔ اس میں عمر عزیز بیکار صرف کی۔

(۲) علامہ فخرالدین رازی۔

(۳) اے قوم مدرسوں میں جو تو نے سیکھا وہ حقیقت سے دور اور وسوسہ ہی وسوسہ ہے!

(۴) بوعلی سینا مشہور حکیم۔

(۵) حیؔ یہ لیلی کے قبیلے کا نام ہے۔ یہاں بستان حی سے مراد گلشن عشق ہے۔ دل کو بلبل کہا اور اسے اس باغ میں چہکا دیا۔

آوازیں مدتوں گونجیں اور نواب سعادت(۱) علی خاں کے وقت تک کہ صحیح تعلیم و تربیت کا وہاں
داج تھا، شیخ کی یہ کڑکتی صدا کانوں میں آ رہی اور ظاہر بینوں پر بجلی گرا رہی تھی ؎

علم رسمی سر بسر قیل ست و قال — نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
طبع را افسردگی بخشد مدام — مولوی باور نہ دارد ایں کلام
چند ازیں فقہ و کلامِ بے اصول — مغز را خالی کنی اے بوالفضول
صرف شد عمرت بہ بحثِ نحو و صرف — از اصولِ عشق ہم خواں یکد وحرف

لکھنؤ، دلی سے آزاد ہوتے ہی وہاں کی ہر چیز سے آزاد ہو گیا۔ غازی الدین حیدر
نصیر الدین حیدر کے دور میں وہاں کا مذاق تک بدل چکا تھا۔ حکومت آغا میر کے سے بے ید
ل گردشِ چشم پر گھوم رہی اور وہاں کی زمین و آسمان چکر میں تھے۔ شاعری کہ اہل خبر کی زبان
ہے، بے خبروں کے منہ میں پڑ کر ریختی ریختان ہی سے نکل چکی اور نمائشی باغوں کی بھول بھلیاں
یں گم ہو چکی تھی۔ خواجہ آتش۔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو وہاں کا یہ رنگ دیکھ کر دنگ ہو گئے۔
دہلی نژاد اور اُسی دائرے کے فقیر تھے جو درد و میر کا تکیہ گاہ رہا تھا۔ انھوں نے اس
ہدیم لب و لہجے میں اپنی آواز بلند کرنا چاہی تو گلوگیر ہونے لگی۔ مگر وہ بے پروا، ایک سر دشتہ
طریہ زندگی کہ اپنی آتش بیانی سے گرم کرتے رہے۔ اس وقت اُن کے لئے ایک نہیں ہزار در
کھلے تھے اور جب چاہتے ایک آغا میر نہ سہی کسی امیر کی مسند کے حاشیہ نشین ہو جاتے۔ مگر انھوں
نے اپنی آزادی زبان جو انسان کا شرف ہے، کسی قیمت پر فروخت نہ کی اور یہ فرما کر کہ ؎

طلبِ دنیا کی کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی — خیالِ آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

---

(۱) ظاہر بیں اور قشر یین (علما) ہند اور خصوصاً لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے بعد عروج پا سکے۔ نواب
مرحوم خود ذی علم تھے۔ اس وجہ سے ان کا دم دل کے اثر میں آنا محال تھا۔ مگر ان کے بعد ہی علمائے ظاہر
کا زور شور شروع ہو گیا۔ اور پھر لکھنؤ کی خود مختاری و شاہی کی بدولت وہاں کی معاشرت و مذہبیت دُشرت
اطرافِ ہند میں پھیل گئی۔

اپنے جھونپڑے میں بیٹھے آتش افروزی کرتے رہے۔

قدیم شامی و عراقی اور جدید ایرانی صفوی زمانے کی طرح اس وقت ہند میں بھی اہل علم کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ اُن ملکوں کی تقلید میں یہ ملک بھی معقولیوں اور منقولیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور سے علم نحو غیر علم عاشقی۔ کو فراموش کر کے ان دونوں کا روئے سخن اُن عشاق کی طرف بھی ہو جاتا جو معرفت کے سرروش سمجھے جاتے ہیں۔ آتش کا سا اہل عشق اُن کی زد سے کیونکر بچتا۔ زبانیں کھلیں۔ یہ سنتے اور بیٹھے ہجو کیا کرتے!

یہ وہی وقت ہے کہ لکھنؤ کے فرنگی محل کا نام بلند ہو چکا اور بحر العلوم (مولٰنا عبدالحی) کی توجہ سے وہ ایک محیط علم مانا جا چکا ہے۔ خواجہ آتش بھی وہاں کے فضل و کمال پر نظر کرتے اور دیکھو کس جوش میں فرماتے ہیں ؎

چھائے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام ۔۔۔ ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام

فرنگی محل کا استعارہ علم و فضل سے ہے۔ مطلب یہ کہ علوم کا ذخیرہ ہمارے سینے میں بھی ہے اور اس لئے اس کے نتیجہ و ماحصل یعنی معرفت سے ہم بھی آشنا اور اس کے پیامبر ہیں!

خواجہ صاحب تقریباً ۱۱۶۰ء میں پیدا ہوئے اس لئے انھوں نے ملا حسن علیہ الرحمۃ جنھوں نے ۱۲۰۹ء میں وفات پائی، زمانہ بھی دیکھا اور بحر العلوم (علیہ الرحمۃ) جن کا وصال ۱۲۲۵ھ میں ہوا، کے تو وہ ہمعصر و ہمنوا ہی ہیں۔ اس وقت وہاں منطق کا بھی بیحد زور ا اور فرنگی محل کا میر زاہد پر حاشیہ مشہور ہو رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے بھی سنا۔ مسکرائے اور بے تکلف فرمایا کہ ؎

عالمِ منطق مصور ہو تری تصویر کا ۔۔۔ منہ کتابی قطبی ہے، خط حاشیہ ہے میر کا

یعنی علوم اور سارے قضیہ کا نتیجہ تصویر یار کا کھینچنا اور عالم شہود میں اُسے لانا ہے۔ اور خطوط جو اس روئے روشن کے صفحات ہیں وہ بمنزلہ حاشیہ و تفسیر ہیں اور قال اقول سے بیناز ہو کر ہم خود سے تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں!

خواجہ صاحب کی آتش بیانیوں نے گو ملک میں ایک آگ لگا دی۔ مگر لکھنؤ کے دل اُن سے زیادہ گرم نہ ہوئے۔ اس سرد مہری کی اصل ذمہ دار اُس وقت کی حکومت ہے اور مولویانِ لکھنؤ کی غیر عالمانہ خشونت! مگر پھر بھی اسی شہر (لکھنؤ) کا آتش پارہ[۱]، ایک مقام پر اسی حسن و نور کا آتشکدہ یوں سلگا دیتا ہے۔ ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

یہ شگوفہ بھی گل بکاؤلی سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن کر گیا!

یہ آتشی مذاق، دلی کا تحفہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب اہلِ ذوق وہاں بھی نہ رہے تو شاعری کے خوان نعمت پر مکھیاں بھنکنے لگیں ؎

خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی روحِ فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

ذرا فکر، اپنے معشوق کی صفائی طبیعت کا کیا خوب خاکہ کھینچا ہے۔ پھر خرمن دل پر یوں بجلی بھی گرائی جاتی ہے ؎

نصیر[۲] لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سُن کے جس کو بندھے ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی نہیں ہے یارا!

یہ تھا وہ مذاقِ شاعری جو آج سے سو سال قبل یعنی ۱۲۵۴ھ میں دلی و لکھنؤ اور ملک کے ایک اچھے حصے میں پھیل کر ہم کو اور ہماری شاعری کو بدنام اور اُسے بھنگیریوں[۳] کی گپ بنا رہا تھا۔

مگر پھر بھی اُسی اجڑے دیار اور دلی کے پرانے میکدے میں ایسی نجاستوں کی شستہ و شو بھی ہو جاتی ہے۔ وہاں پھر ایک سرجوش[۴] اٹھتا اور بادۂ حجاز کا وہ سرشار طلب جام میں یوں

---

(۱) پنڈت دیا شنکر نسیم (۲) شاہ نصیر مرحوم دہلوی

(۳) ظاہر بیں اور قشری علما کی عصبیت نے جب ہمارے ادب و شاعری سے الٰہیات و تصوف کو خارج کیا اور لکھنؤ کی حکومت کے وہ شریک غالب بنے تو اردو شعرا کا بھی رنگ بدلا اس لئے کہ وہ سلطنت اور پھر قشری حکومت کے خلاف نہیں جا سکتے تھے۔ اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب ہوا اور وہ نمائشی باتوں میں گرفتار ہو کر اتنی مسخ ہو گئی کہ اگر اُس شہر کے بعض شعرا اُس کی حالت پر نظر نہ کرتے تو یہ بدنامی کلنگ کا ٹیکا بن جاتی! (۴) غالب۔

عجلت کرتا ہی ؎

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہو ساقی کوثر کے باب میں

یعنی حکم ہو چکا ہے۔ عدول نہ کر۔ ہاں ابھی سے کہ یہ قطرہ سرور میں عروج پاکر دریائے حقیقت میں جلد مل جائے!

عظیم آباد (پٹنہ) ہمیشہ درد آباد رہا ہے۔ اس وجہ سے وہاں آتش نوازی نہیں آتش پرستی ہوا کی ہے۔ اور یہ اسی کا صلہ ہے کہ لکھنؤ میں اگر اُس دریائے نور کا یوں ذکر چھڑا

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہو اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

(آتش)

تو وہاں (عظیم آباد) یہ سمجھ کر کہ اس کے غمگین سننے والے کہیں بے چین سے بے چین نہ رہ جائیں اُن کی یوں تسلی کر دی گئی ؎

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا (شاد)

ہاں، رخ یار کی بہت شرحیں دیکھیں اور بڑی لن ترانیاں سنی گئیں۔ اچھا اس کی ایک اور تفسیر یاد کر لو ؎

ہوا نور بار جو رُخ تیرا، دَلَمُوع وجھک اعتلا
چمک اٹھے دشت وجبال و در، تَشَعْشَعًا متزلزلا

کوچہ یار کا دکھڑا ابھی تو خوب سنا گیا۔ اب اُس حقیقی کوچہ کی بھی ذرا سیر کر لو۔ ؎

ہیں نگاہ شوق میں تحد ترا کوچہ ہو کہ قتل گہ
ترے جلوہ گاہ میں دونوں ہی جو سنا ہو وہ تو کہلا

تو مڑی یا تو نہی بجا بجا کر ہمارے یہاں آرزو کے سے سانپ کو خوب خوب کھلایا گیا ہے۔ اب اس مار آستین کو مارو اور اس ہفی (افعی) کا سر کچلو، سنو ؎

ہمیں شاد جس کا بہت تھا ڈر وہی پیش آگیا الحذر
تمھیں سب کہتے تھے کہ امید سے نہ زیادہ رکھو خلا ملا!

یہ سچ ہے کہ قوموں کے عروج کے وقت یعنی جب کہ اُن کے قوائے دماغی سالم رہتے ہیں، ان میں بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی شاعری کو لیجئے تو والمیکی و کالیداس اور فردوسی و شیکسپیر اس وقت پیدا ہوئے جبکہ اُن کی قوم کی ترقیوں کا زمانہ تھا۔ مگر یہ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ اقوام کے زوال کے وقت یعنی جبکہ اُن کے قوائے دماغی مضمحل و پامال ہو جاتے ہیں، اُن میں بڑے لوگ پیدا ہوں۔ اس لحاظ سے میر انیس کی سی زبردست ہستی کا اس ملک میں جبکہ وہ زوال پذیر ہو رہا تھا، وجود میں آنا عجیب سمجھا گیا ہے۔ لیکن معلمین اخلاق ہمیشہ ایسے ہی وقت ظاہر ہوئے ہیں جب کہ اُن کی قوموں کے اخلاق خراب ہو کر پستی کی طرف مائل ہو رہے تھے، میر انیسؒ بھی ایک معلم اخلاق تھے۔ اس ملک میں جب کہ وہ ہر اعتبار سے مضمحل و پست ہو رہا تھا ان کا ظہور اس لئے حیرت انگیز نہیں کہ اُن کی زبان و کلام سے یہاں بھی اُس رحمت کا نزول مقدر تھا جس کا وعدہ ہو چکا ہے

ان کے بزرگ خاندان میر امامی، ہروی ہراتی، شیخ[۱] طریقت تھے۔ ان کے یہاں تعلیم

(نوٹ صفحہ ۲۶) سید الشعرا خان بہادر سید علی محمد شاد (عظیم آبادی) وفات جنوری ۱۹۲۷ء بعمر ۸۰ سال۔ شاد مرحوم بھی خواجہ میر درد ہی کی خانقاہ کے مجاوروں میں سے ہیں۔ بسلسلہ ملاحظہ ہو۔

خواجہ میر درد
|
میاں آشکی (عظیم آبادی)
|
شاہ الفت حسین فریاد (" ")
|
شاد

(۱) میر امامی صاحب سجادہ
(۲) میر رات اللہ — (۱) میر امامی ہروی اس پائے کے بزرگوار تھے کہ امام و شیخ وقت کہلائے۔ ہرات میں
(۳) میر فیض اللہ — انکا سجادہ و تکیہ مشہور تھا جہاں روحانیات کا درس دیا جاتا۔ ہرات کے انقلابوں سے تنگ آ کر یہ شاہجہاں
(۴) میر ضاحک — کے عہد میں ہند آئے بادشاہ نے انھیں بڑی قدر و منزلت کے ساتھ اپنے تخت طاؤس کے برابر جگہ دی۔
(۵) میر حسن — اور دلی میں بھی ان کی تعلیم شروع ہو گئی تا انکے بیٹے میر رات اللہ (عالمگیری) اور انکے پوتے میر فیض اللہ
(۶) میر خلیق — (بہادر شاہی) نے بھی مناصب پائے اور اپنے خاندانی امتیاز کو سنبھالے رہے۔ ان میر فیض اللہ کے بیٹے
(۷) میر انیس — میر ضاحک ہیں اور اُن کے خلف الرشید میر حسن۔ ان میں بھی اپنے خاندان کے اوصاف موجود تھے۔

و ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ یہ طریقہ نسلاً بعد نسل خون میں سرایت کرتا ہوا حسن تک پہنچا اور حسن سے انیس کی رگوں میں آ کر گرم ہونے اور لہو کی طرح دوڑنے لگا۔ انیس کا زمانہ عجیب پر آشوب[1] زمانہ تھا۔ ہم زمانے سے کھیل رہے اور زمانہ شناس ہم پر ہنس رہے تھے۔ انھوں نے وہ دیکھا جو خدا دشمن کو نہ دکھائے، اور اس سے اُن کے دل میں وہ ہیجان ہوا جو ایک فطرۃً معلم و شاعر کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کی ایسی پستی کے اسباب و علل پر غور اور اس کے علاج کی تدبیر کرنے لگے۔

ان کے گھر میں کئی پشت سے اخلاق پرستی یعنی[2] مرثیہ گوئی کا رواج تھا اور اس سے متاثر تھے۔ انھوں نے اس واقعہ (جس پر مرثیہ کا مدار ہے) کے راز کو سمجھا اور ایک زبردست آئیڈیل پیش کر کے ہمارے قوائے عقلی کی درستگی میں مشغول ہو گئے۔

وہ سمجھے اور خوب سمجھے کہ پوری تول تولنے کا نام اخلاق ہے اور اس کے برعکس بداخلاقی۔ انھوں نے دیکھا اور خوب دیکھا کہ آپس کے عمدہ برتاؤ اور مساوات کا نام اخلاق ہے اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷) درد کی صحبت و ادارت نے اس پر جلا کی۔ اس کا ذکر اوپر آ چکا اور ان کے رنگ شاعری کو بتایا جا چکا ہے۔

(۱) انیس کے وقت کا ہندوستان بد اخلاقیوں کا نمونہ اور نکبتوں میں آپ اپنی مثال ہو رہا تھا۔ ہمارے دل پستی و انقلاب ہی کی طرف نہیں بلکہ غلامی کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ اس وقت اگر کہیں کچھ روشنی دکھائی بھی دی تو وہ ایک مریض کا سنبھالا تھا جو اُسکے پرستاروں کو غلط امیدیں بہلائے رکھتا مگر اُسکی شمع حیات کو جلد گل کر دیتا ہے۔

(۲) انیس کے پردادا میر ضاحک سے مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا۔ پھر ان کے صاحبزادے میر حسن نے مرثیے کہے میر خلیق کی مرثیہ گوئی محتاج بیان نہیں اس خاندان میں میر انیس وہ چوتھے بزرگوار ہیں جنھوں نے مرثیہ کے ذریعے سے اخلاق کا درس دیا۔ اس پر وہ فخر کرتے اور اپنے ایک صاحبزادے میر عسکری رئیس کی زبان سے فرماتے ہیں ؎ عمریں گذریں ہیں اسی دشت کی سیاحی میں　　پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

رئیس اس دشت کے پانچویں سیاح ہیں۔ "عمریں گذریں ہیں" اس سے مراد خاندان کی عمر ہے نہ کہ کسی ایک فرد کی یعنی اس مداحی میں ہمارے خانوادے کی عمریں صرف ہو گئیں!

اس کے خلاف بداخلاقی۔ ان کی طبیعت رسا اس نکتہ تک پہنچی اور خوب پہنچی کہ اخلاق، ادب و تادیب یعنی ڈسپلن میں ہے اور بے ادبی و بدروی، بداخلاقی۔ ان کے پرفکر دماغ نے طے کیا اور خوب طے کیا کہ اپنے کسی اصول پر قیام و استقلال عین اخلاق ہے اور اس کا نتیجہ شریفانہ آزادی اور اصول سے انحراف، بداخلاقی اور اس کا لازمی نتیجہ ذلت و غلامی۔ ان پر منجلی ہو گیا اور خوب منجلی ہوا کہ صحیح اخلاق معرفت ہے اور معرفت ے

پیکان آبدار کہ آید ز دست دوست　　　　بر عاشقانِ سوختہ باران رحمت است

اور ے گردن نہادیم، الحکم للہ اور پھر ے ہو عید جو قربان ہو سیر راہ خدا میں۔ پر عمل کے بغیر ناممکن اور اس کے خلاف عمل جہالت و بداخلاقی۔ اس ایک واقعہ کے اندر اتنی کرامتیں پا کر وہ اس کی طرف جھک پڑے۔ اور ے ہرچہ گوئم از زبان شہ بود۔ پر عمل کرنے اور اس مردہ ملک پر اپنے پاکیزہ سروں سے اخلاق کا صور پھونکنے لگے۔

انیسؔ وہ شاعر ہیں جنھوں نے اس عالم مثالی میں پریشان خواب اور اس آئینہ عالم میں غلط تصویر کبھی نہیں دیکھی! وہ ہمیشہ ے تو موی بینی و من پیچش مو۔ تو ابرو من اشارتہائے ابرو۔ کو دیکھتے، سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔ وہ ملک و قوم کی بربادی و تباہی کو دیکھ کر بیحد متاثر ہوتے اور اس کا چارہ نہ دیکھ کر غیبی امداد کے طالب ہوتے اور گھبرا گھبرا کر بے اختیار کہتے ہیں ے

یا منتقم ظہور امام زماں دکھا　　　　اب دم لبوں پہ ہے در امن واماں دکھا
آنکھیں ہیں منتظر رخِ آرام جاں دکھا　　　　پھر برق ذوالفقار کو آتش فشاں دکھا
دشمن رہے نہ ایک شہہ مشرقین کا
اس دن غلام سوگ اتاریں حسین کا

ہماری بداطواریاں انھیں دکھ دیتی ہیں تو وہ ایک آنے والے کو پکارتے اور شہہ مشرقین کے اصول کے توڑنے والوں کی گردنوں پر تیغ انتقام چلانا اور اس کے دشمن یعنی بداخلاقیوں کا خرمن جمع کرنے والوں پر برق ذوالفقار گرانا اور اس جہاں میں ازسرِ نو

اخلاق قائم کرنا، در رحمت کھلوانا اور اس وقت بندہ ہائے اخلاق کا غم دور کرنا اور اُن کا سوگ اتروانا چاہتے ہیں!

اس مضمون کے سننے والوں کے لئے یہ موزوں فقرہ کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" غالباً اب چیستاں نہ رہا ہوگا! ایک شاعر (ناظم نہیں) معلم اخلاق اور صادق اللہجہ ہوتا اور اُس حسن اور صفات حسن کو جلوہ دیتا ہے جو اس عالم مرصع کو روشن کر رہا ہے اور اس لئے وہ قدرت کا پیامبر ہے! اس خصوص میں انیس اپنے پیش روؤں سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں! اپنے بیان وکلام کا جو دائرہ وہ کھینچ گئے اس سے نکلنا محال ہے۔ اور ایسی جرأت پر صاف کہہ دیا جائے گا کہ

اس احاطہ سے جو باہر ہو وہ بیرونی ہے

ہند کا شرف کہ یہاں انیس پیدا ہوئے۔ شاعری کی معراج کو وہ اس کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور اُن کے زور زبان سے "پہنچی یہ زمین آسمان تک" اور اردو کی عزت کو انہوں نے اسے منہ لگایا اور اُن کے خیالات کا وہ بار اٹھا سکی اور اُن کے سُروں کا ارگن بن سکی!

اس بیان کے شروع میں کہا گیا ہے کہ۔ اس عالم کے ذرہ ذرہ میں ہموزنی و تقابل اور تناسب پایا جاتا ہے جس کا دوسرا نام حسن ہے۔ اصطلاح میں اس صنعت کو ترصیع کہتے ہیں۔ اس ترتیب و انتظام پر نظر کر کے عقلا اُس کا خود بخود وجود میں آجانا محال اور اس لئے کسی صناع کا ماننا فرض سمجھتے ہیں۔

اسی ترصیع نے مادہ پرستوں کو خدا پرست، حکماء کو صفات پرست و قدرت پرست اور شعرا کو حسن پرست بنا دیا۔ اور ان سب نے مختلف لب و لہجہ میں اس کی ثنا کی ہے۔ مگر یہ حسن جہاں واقعی کندن کی طرح چمکا وہ کان کہیں اور ہی ہے۔ اس حسن کے ذخیرے میں سے ایک ذرہ پر نظر کرو۔ پرکھو اور دیکھو کہ وہ صنعت (ترصیع) کس طرح چمکتی اور اس صانع کے یہاں کیونکر صفت کی جاتی ہے۔

صبح کاذب کا فور ہوئی اور عاشور محرم کی صبح صادق بے حجاب ہو چلی۔ پو پھٹ رہی

اور ـــہ ڈوبتے جاتے ہیں دریائے فلک کے تارے ! نور برس رہا اور اُس دھندکے میں پنہاں ، آشکار اور قدرت کا تماشا ظاہر ہو رہا ہے ۔ اس کیفیت کا اثر پڑتا اور اَرنی گوئے اوج طور بھی اس وقت غش سے چونک کر کلمہ پڑھتا اور سارا عالم اُس صناع کی یوں حـــمد کرنے لگتا ہے ـــہ

قربانِ صنعتِ قـــلم آفریدگار　　　　تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیع آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار　　　　ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار

عالم تھا محو قدرت ربِ عباد پر
مینا کیا تھا وادئے مینو سواد پر

صاحبو ـــہ

بدیں نامہ برعـــمرہا بگذرد　　　　بخواند ہر آنکس کہ دارد خرد

قدرِ اول کے ستارے

جب مطلع آسمان اندھیری رات میں ابر و باراں سے بالکل پاک ہو تو ہمیں ایسے لاتعداد چھوٹے بڑے منور اجرام سے مزین نظر آتا ہے جو ابتداءً منتشر و بے قاعدہ سے معلوم ہوتے ہیں مگر چند روز دلچسپی و توجہ سے مشاہدۂ فلکی کرنے کے بعد ان کی ترتیب بخوبی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

مقدمین ہیئت و نجوم نے آسانی کے لئے ان کے متعدد مجامع النجوم قرار دئے۔ نیز اپنی گرد و پیش کی اشیا کی مشابہت سے ان کی فرضی شکلیں قائم کیں اور نام رکھے۔ بارہ بروج جو منطقۃ البروج کے نام سے معروف ہیں ترتیب دئے اور انکے درمیان ایک فرضی خط کھینچا جس پر آفتاب ہمیشہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ اس کی حرکت کی وجہ سے موسمی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ اس خط کو طریق الشمس کہتے ہیں۔ اس کا دور تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

منطقۃ البروج کے شمال میں اکیس مجامع النجوم اور جنوب میں پندرہ مجامع قرار دئے گئے ہیں۔

ستارے اپنی چمک دمک کے لحاظ سے درجوں میں منقسم ہیں جنھیں اصطلاح میں قدر کہتے ہیں۔

قدما نے چودہ ستاروں کو جو ان کے خیال میں کل کراتِ فلکی کے روشن ترین ستارے تھے قدرِ اول میں رکھا مگر متاخرین نے ان میں چھ ستاروں کا اضافہ کرکے قدرِ اول کے بیس ستارے کر لئے اور ان ستاروں کو مختلف مجامع میں ترتیب دیا۔ ان نئے مجامع کے نام ان لوگوں نے اپنے مذاق کے مطابق رکھے۔ مثلاً شمال میں دوربین عظیم ہرشل

اور جنوب میں منظار اکبر یا دوربین (Telescopium.) اور منظار اصغر یا خوردبین (Microscopium.) وغیرہ۔

خالی آنکھ سے نظر آنے والے ستارے چھٹی قدر تک کے ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد قدما کے نزدیک ۱۰۲۲ تھی۔ مگر اب پانچ ہزار شمار کئے جاتے ہیں۔ چونکہ سب ستارے بلحاظ نوع یکساں نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی مسافت کے متعلق ہم سطحی رائے قائم کر کے کہہ سکتے ہیں کہ مدھم اجرام بہ نسبت روشن اجرام کے بعید تر ہیں اور جو ستارے ہمیں نظر نہیں آتے وہ محتاج دوربین ہیں۔ زمانہ حال کی عظیم ترین دوربینیں اب تک بیسویں قدر تک کے ستارے دیکھ سکی ہیں۔ جن کی تعداد کم و بیش ایک ارب (سو کروڑ) ہے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ آئندہ ان سے قوی تر دوربینیں تیس یا تیس قدر تک کے ستارے دیکھ سکیں گی جن کی تعداد تین چار ارب سے زیادہ ہوگی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم ان دوربینی اجرام سے قطع نظر کر کے خالی آنکھ سے نظر آنے والے ستاروں کی رفعت و وسعت نور و حرارت کا مقابلہ اپنے آفتاب سے کریں تو ہمیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ یہ ننھے ننھے جھلملاتے چراغ بجائے خود بڑے بڑے آفتاب ہیں اور بعض بعض کے سامنے تو ہمارے آفتاب کی وہی حقیقت ہی جو کرۂ ارض کی آفتاب کے مقابلے میں۔

یہ بڑے بڑے اجرام باہم ایک دوسرے کی کشش سے جکڑے ہوئے اس فضائے لامحدود میں ایک دوسرے کے گرد آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں۔ ان کی گردش باہمی بعینہ ایسی ہے جیسے زمین کے گرد چاند کی یا آفتاب کے گرد زمین و دیگر سیاروں کی۔ کلٌّ فی فلکٍ یسبحون۔

اب ہم مختصراً قدر اول کے ستاروں اور ان کے مجامع کے حالات ناظرین کی دلچسپی کے لئے لکھتے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم آفتاب اور اس کے نظام کو لیتے ہیں جو خود ایک روشن ستارہ ہے اور ہمارے نظام شمسی کا مرکز ہے۔ بظاہر اسی کے وجود سے ہماری دنیا آباد ہے اور ہم زندہ ہیں۔

آفتاب | یہ کل ثوابت میں زمین سے نزدیک تر اور سب سے چھوٹا ستارہ ہے۔ ہمارا نظام شمسی اسی

سے متعلق ہے۔ زمین سے اوسطاً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ اس کی روشنی وغیرہ آٹھ منٹ میں آتی پہنچتی ہے۔ یہ کسی دوسرے جرم سماوی سے کسب نور و حرارت نہیں کرتا اپنے ہی نور سے زمین اور دوسرے سیاروں کو منور کرتا ہے۔ جرم آفتاب کرۂ ارض سے بارہ لاکھ اکسٹھ ہزار سات سو گنا بڑا ہے۔ اس کا قطر آٹھ لاکھ بانوے ہزار پانسو اسی اور محیط لاکھ اکہتر ہزار پانسو ہے۔ اس کی خارج شدہ حرارت کا ۱/۲۲۸۱۰۰۰۰۰۰۰ حصہ زمین تک پہنچتا ہے۔ اس کی حرارت کو منتشر ہونے نہ دیا جائے تو یہ اتنی مقدار یخ کو بہ آسانی پگھلانے کے لئے ہے جس سے ساری زمین ڈھکی ہوئی ہو اور جس کی ضخامت گیارہ بارہ میل ہو۔ اس میں مثل زمین کے متعدد عناصر کا وجود ہے۔ مثلاً لوہا۔ نکل۔ تانبا۔ چاندی۔ کاربن۔ ایلومینیم پوٹاسیم وغیرہ ان کے علاوہ دیگر عناصر کا بھی گمان کیا جاتا ہے۔ مگر ہنوز ان کے وجود کا پتہ نہ چلا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ آفتاب کے کسی ایسے گوشے میں ہوں جہاں ہماری موجودہ تحقیق کی رسائی نہ ہو اور آئندہ پتہ لگے۔ مثلاً گندھک فاسفورس۔ نائٹروجن۔ آرسنک۔ کلورین۔ وغیرہ۔ اس میں کچھ مہیب غار بھی موجود ہیں۔

سوائے حکیم فیثاغورث کے کل فلاسفہ قدیم زمین کے گرد آفتاب کی گردش کے قائل تھے۔ چنانچہ یہ خیال ایک عرصہ دراز تک رہا یہاں تک کہ کوپرنکس[1] کا زمانہ آیا۔ یہ حکیم ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو حکیم کے قول کی تائید کی اور اس کے قائم کردہ نظام کی تجدید کی زمین کو مرکزیت سے ہٹا کر آفتاب کو مرکز تسلیم کیا اور بجائے سماوی گردش کے ارضی گردش ثابت کی۔

متاخرین نے مطالعے کو وسعت دی۔ جدید انکشافات کئے اور مندرجہ ذیل سیارے معلوم کئے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔۔

عطارد۔ زہرہ۔ مریخ اور پلوٹو زمین سے باعتبار حجامت چھوٹے اور مشتری۔ زحل

---

(۱) کوپرنکس ۱۴۷۳ء میں بمقام تھارن پولینڈ میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۳ء میں بعمر ستر سال فوت ہوا۔

یورنیس نیپچون بڑے ہیں۔ اب ہم اسی ترتیب سے ان کے مختصر حالات لکھتے ہیں۔

عطارد | اس کا مدار، مدار ارض میں واقع ہے۔ یہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر اس جیسے سولہ سترہ اجسام باہم مل جائیں تو زمین کے برابر ہوں۔ اس کا قطر صرف تین ہزار میل ہے۔ آفتاب کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس لئے بہ آسانی نظر نہیں آتا۔ کیپلر[1] غریب کو تا دم مرگ تمنا ہی رہی کہ اس کو دیکھے۔ مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

زہرہ | جسامت میں زمین سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ چونکہ اس کا مدار بھی مثل عطارد کے مدار ارض میں واقع ہے۔ اس لئے اثنائے گردش میں بہ نسبت دیگر سیاروں کے زمین سے زیادہ قریب چلا آتا ہے۔ اس حالت میں راصدین کو اس کے معائنہ سطحی میں بہت آسانی ہوتی ہے اس کی فضا ابر وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہے۔ باوجود اس کے یہی سیاروں میں سب سے زیادہ روشن اور خوبصورت ہے۔ چنانچہ جب یہ آسمان پر ہوتا ہے تو پھر نہ کسی سیارے کی روشنی اس کا مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ کسی ثابت کی۔ علما کا خیال ہے کہ اگر کبھی نقل مکانی کی ضرورت درپیش ہوئی تو سب سے پہلے زہرہ ہی اہل زمین کا مسکن بنے گا۔ واللہ اعلم۔ آفتاب سے اوسطاً چھ کروڑ ستر لاکھ میل پر گردش کرتا ہے۔

زمین | اس کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔ مثل دیگر سیاروں کے آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس کی گردش سالانہ ۳۶۵¼ دن میں تمام ہوتی ہے۔ یہ زمانہ سال کہلاتا ہے۔ حکمائے قدیم زمین کو مسطح اور ساکن سمجھتے تھے۔ مگر در اصل یہ کروی اور متحرک ہے۔ اور قطبین پر دونوں طرف ساڑھے تیرہ میل چپٹی ہو گئی ہے۔ اس کا ایک تابع بھی ہے جسے چاند کہتے ہیں۔ یہ زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور ستائیس دن سات گھنٹے تینتالیس منٹ میں اس کے گرد گھوم جاتا ہے۔ اس زمانے کو قمری مہینہ کہتے ہیں۔ چاند کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔

---

(۱) کیپلر ۱۲ر دسمبر ۱۵۷۱ء میں پیدا ہوا اور بعمر ۵۹ سال ۱۶۳۰ء میں فوت ہوا۔

گلیلیو[1] نے منجملہ دیگر اجرام ؑ کے اس کا معائنہ بھی اپنی دوربین سے کیا تھا پہلی ہی نظر میں اس نے چاند کی ہر چیز بہ آسانی دیکھ لی۔ مثلاً پہاڑ وادیاں۔ آتش فشاں پہاڑ۔ کشادہ میدان سمندر اور چٹانیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہم چاند پر سے زمین کو دیکھیں تو یہ بھی مثل چاند کے چمکدار اور روشن نظر آئے گی۔ مثلاً اس نے زہرہ کے ابر آلود کرے کو پیش کیا جو باوجود بادلوں کے بھی زمین سے کہیں زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ حالانکہ بذات خود روشن نہیں ہے بلکہ آفتاب سے اخذ نور کرتا ہے جیسے زمین اور دیگر سیارے۔ چاند بظاہر سورج کے برابر نظر آتا ہے۔ حالانکہ جرم آفتاب سے چھ کروڑ تئیس لاکھ گنا چھوٹا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کا فاصلہ زمین سے دو لاکھ اڑتالیس ہزار اور سورج کا نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔

مریخ | اس کا قطر چار ہزار میل ہے۔ گلیلیو نے اس کا معائنہ اپنی نو ایجاد دوربین سے سنہ ۱۶۱۰ء میں کیا تھا۔ اس نے قرص مریخ پر بحر و بر کی علامات دیکھیں۔ پھر وقتاً فوقتاً ہیئت داں اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ جب اس کی رویت بہتر ہو تو اس کی سطح پر بعض بعض مقامات پر سیاہ خطوط کا جال سا بچھا معلوم ہوتا ہے۔ جس کا طول تین سے چار ہزار میل تک ہے۔ ریگستانوں کا بھی پتہ لگتا ہے قطبین پر برف پوش چوٹیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی سالانہ گردش تقریباً دو سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے دو تابع قمر ہیں جن کا قطر دس سے بیس میل تک ہے۔

نجیمے۔ تین چار سو کی تعداد میں مریخ و مشتری کے درمیان گردش کر رہے ہیں۔ ان سب میں بڑا سیرس جس کا قطر چار سو اسی میل ہے اور باقی چھوٹے ہیں۔

مشتری | نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریباً اٹھاسی ہزار چھ سو چالیس میل

---

(۱) گلیلیو ۱۵ فروری ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا ۱۶۰۵ء میں دوربین ایجاد کی۔ ۸ جنوری ۱۶۱۰ء کو مشتری کے اقمار معلوم کئے۔ اور اسی زمانے میں خوردبین ایجاد کی ۱۶۳۷ء میں اندھا ہوگیا اور ۸ جنوری ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔

سے اتنا بڑا سیارہ ہے کہ اس کے جرم میں کرۂ ارض جیسے اجرام چودہ سو سما سکتے ہیں۔ اس کے
قمر ہیں جن کا انکشاف ۱۶۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک ہوا۔ ابھی تک ان میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔
ہوتا ہے کہ اس نے اپنی کشش سے تقریبًا پچاس دمدار سیارے نظام شمسی میں داخل کر دئے
ہیں۔ یہ زہرہ کے بعد سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔

زحل | مشتری کے بعد سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر تقریبًا ستر ہزار میل ہے۔ سالانہ گردش
ساڑھے انتیس برس میں تمام ہوتی ہے۔ اس کے آٹھ قمر ہیں مثل مشتری کے اس نے بھی چار
دمدار سیارے نظام شمسی میں داخل کئے ہیں۔ اس کے دو قمر سر ولیم ہرشل[1] نے ۱۷۸۹ء میں دریافت
کئے۔

یورینس | یہ ستارہ جدید دریافت ہوا ہے۔ اس کا انکشاف ۱۷۸۱ء میں سر ولیم ہرشل نے
کیا۔ اس کا سال ہمارے ۸۴ برس کے برابر ہوتا ہے۔ یہ آفتاب سے ایک ہزار آٹھ سو ملین میل
پر گردش کرتا ہے۔ بوجہ بُعد آفتاب اس میں روشنی و حرارت کم پہنچتی ہے۔ اس کی وسعت بھی
کافی ہے۔ یعنی چونسٹھ اجسام مثل زمین کے اس میں سما سکتے ہیں۔ اس کے چار قمر ہیں اور دو دمدار
سیارے اس کے متعلق ہیں۔

نیپچون | اس کا فاصلہ آفتاب سے دو ہزار آٹھ سو ملین میل ہے۔ ۱۸۴۶ء میں اس کا انکشاف
ہوا۔ اس کی گردش سالانہ ایک سو ساڑھے پینسٹھ سال میں تمام ہوتی ہے۔ اس میں بھی چونسٹھ اجسام
مثل زمین کے سما سکتے ہیں۔ اس کا صرف ایک قمر ہے۔ اس کے متعلق نو دمدار سیارے ہیں۔

پلوٹو | اس کا تعارف ہم سے ابھی ابھی ہوا ہے۔ یعنی جنوری ۱۹۳۰ء میں انکشاف ہوا۔ باعتبار
جسامت مریخ کے برابر خیال کیا جاتا ہے۔ تین ارب بہتر کروڑ میل آفتاب سے دور ہے۔ اس

---

(۱) سر ولیم ہرشل ۱۷۳۸ء میں پیدا ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں انگلستان گیا۔ ۱۷۷۴ء میں اپنی دوربین بنائی اور مطالعہ
آسمان شروع کیا۔ آٹھ سو چھپن نئے ستارے معلوم کئے اور ستاروں کی فہرست مرتب کی۔ پانسو اسی شہاب دریافت
کئے اور ثابت کیا کہ آفتاب الجاثی کے ایک نقطے کی طرف جا رہا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں فوت ہوا۔

کی گردش آفتاب کے گرد تین سو سال میں تمام ہوتی ہے۔ جس قدر نور و حرارت آفتاب سے زمین اخذ کرتی ہے اس کا $\frac{1}{1600}$ حصہ پلوٹو آفتاب سے لیتا ہے۔ اس کی روشنی مریخ سے $\frac{1}{1000}$ کی نسبت رکھتی ہے۔

دمدار سیارے | ان کے اجسام ٹھوس نہیں ہوتے کبھی کبھی نظر آتے ہیں اور بعض بعض تو نظام شمسی کو قطع کرتے ہوئے اس طرح باہر نکل گئے ہیں کہ اب شاید واپس نہ آئیں۔ اسی طرح یہ آوارہ گرد سیارے مختلف نظاموں کی سیر کرتے پھریں گے۔ یہاں تک کہ کسی ایسے زبردست نظام میں چلے جائیں جہاں کا آفتاب اپنی قوت جاذبہ سے انھیں مقید کر کے پھر باہر نہ نکلنے دے اور یہ وحشی ہمیشہ کے لئے پابزنجیر ہو جائیں۔ بعض دمدار سیارے کئی کئی مرتبہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی سیارہ ۱۸۱۲ء، ۱۸۲۲ء، ۱۸۲۹ء اور ۱۸۳۲ء میں متواتر دیکھا گیا۔ فضا کسی وقت دمدار سیاروں سے خالی نہیں رہتی۔ ممکن ہو کہ وہ ہمیں نظر نہ آئیں۔ مگر راصدین ان کی حرکات و سکنات کا ہر وقت معائنہ کر سکتے ہیں۔

کیپلر کا قول ہے کہ آسمان میں دمدار سیاروں کی تعداد سمندر کی مچھلیوں سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی کسی وقت فضا ان کے وجود سے خالی نہیں رہتی۔ وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں نے انھیں معلوم کیا۔ منجملہ ان لوگوں کے سر ولیم ہرشل کی بہن[1] بھی ہیں۔ جنھوں نے آٹھ دمدار سیاروں کا انکشاف کیا۔

شہاب ثاقب | عوام کی اصطلاح میں تارے ٹوٹنا مستعمل ہے۔ دراصل یہ چھوٹے چھوٹے سیارے ہیں جو آفتاب کے گرد نہایت سرعت سے چکر لگا رہے ہیں۔ کبھی منتشر ہوتے ہیں۔ اور کبھی غول کے غول نظر آتے ہیں۔ جب یہ کرۂ ہوا میں اتفاقاً داخل ہو جاتے ہیں تو تیز

---

(۱) Caroline کارولائن سر ولیم ہرشل کی بہن ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئی۔ ۱۷۷۲ء میں انگلستان آئی۔ اور آخر تک ولیم ہرشل کی مددگار بنی رہی۔ اس نے آٹھ دمدار سیاروں کا پتہ لگایا اور آخر کار ۱۸۴۸ء میں اٹھانوے برس کی ہو کر فوت ہوئی۔

رفتاری کے باعث ہوا جیسی لطیف شے کی مزاحمت بھی گوارا نہیں کر سکتے اور ذرا سی رگڑ سے مشتعل ہو کر شعلہ فشاں ہو جاتے ہیں عظیم الجثہ شہاب تو کرۂ ہوا کو قطع کر کے اپنی راہ لیتے ہیں مگر چھوٹے شہاب اپنی تیزی و شعلہ فشانی سے خود جل کر بخارات بن جاتے ہیں اور ایک روشن خط کچھ دیر نظر آکر غائب ہو جاتا ہے۔ بعض وقت بڑے شہاب بھی کرۂ ہوا کو قطع کرتے وقت کشش ارضی سے کھچ کر زمین پر آ رہتے ہیں۔ ان کے گرنے اور پھٹنے کی آواز نہایت ہیبتناک ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت زبردست شہاب باشندگان ہنگری پر بلائے آسمانی بن کر نازل ہوا۔ زمین کے قریب آتے آتے پھٹا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ منجملہ ان ٹکڑوں کے ایک ٹکڑا جس کا وزن دس گیارہ من تھا کسی جگہ پڑا ہوا ملا۔ اور مقامات پر بھی کبھی کبھی ان کا نزول ہوا ہے۔ پارہ ہائے شہاب کا تجزیہ کرنے سے بعض عناصر کا بھی پتہ لگتا ہے مثلاً تانبا نکل۔ لوہا وغیرہ۔

ہم نظام شمسی میں داخل ہو کر اپنی منزل مقصود سے دور ہو گئے۔ ابھی ہمیں بہت راستہ طے کرنا ہے۔ لہذا اب ہم نظام شمسی کو چھوڑ کر نظام انجم کی راہ لیتے ہیں۔ امید ہے کہ معزز ناظرین کو اصل سلسلہ تحریر یاد ہو گا۔

ہم اول لکھ آئے ہیں کہ سلف نے قدر اول کے صرف چودہ ستارے شمار کئے تھے۔ بعد کو ان کی تعداد میں چھ کا اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ اب قدر اول کے بیس ستارے مانے جاتے ہیں اب ہم ان بیس ستاروں اور ان کے مجامع النجوم کے حالات باختصار لکھتے ہیں۔

قنطورس | اس مجمع النجوم کی ہیئت مجموعی ایک ایسے حیوان سے مشابہ ہے جس کا اوپر کا جسم آدمی سے اور نیچے کا حصہ گھوڑے سے ملتا ہو۔ اس مجمع النجوم میں دو نہایت روشن ستارے ہیں۔ اول ستارہ جو ساڑھے چار سال[1] نور کے فاصلے پر واقع ہے رجل قنطورس کہلاتا ہے۔ اور بلحاظ نور تیسرا ستارہ ہے

---

(۱) یعنی یہ ستارہ اتنی دور واقع ہے کہ اسکی روشنی زمین تک ساڑھے چار برس میں آتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار فی سکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔

جاتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے دو نیل ترسٹھ کھرب پچانوے ارب ترپینہ کروڑ میں لاکھ میل
یہ ہم سے سورج کے بعد دیگر ثوابت کے مقابلے میں قریب ترہے۔ بہ اعتبار جسامت یہ آفتاب سے
ہی مانا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا ستارہ بھی قدر اول کا ہے۔

یہ مجمع النجوم جنوری و فروری میں بالکل جنوبی مشرقی افق سے طلوع ہوتا ہے اور جون
جولائی میں جنوب مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔

دجاجہ صلیب شمالی بھی کہلاتا ہے۔ اس کا روشن ستارہ قدر اول سے ذرا کم ہے۔ مگر پہلی قدر کے
ستاروں ہی میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو ذنب الدجاجہ یا الرُّدف بھی کہتے ہیں۔ یہ بہ اعتبار م
یہ استثنیٰ سہیل رجل الجزا تمام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ ہو۔ یعنی زمین سے دو
چھتیس نیل باسٹھ کھرب اٹھتر ارب چالیس کروڑ میل دور ہے۔ اس پر بھی روشن نظر آتا ہے ہما
آفتاب سے ہزار گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے۔

دجاجہ میں ایک ستارہ ۶۱ دجاجہ کہلاتا ہے جس کی رفتار پرواز دو سو میل فی ثانیہ
اس کو کرۂ شمالی کا نزدیک ترین ستارہ تسلیم کرتے ہیں۔ جسے جنوبی کرہ میں رجل قنطورس ما
جاتا ہے۔ مجمع النجوم دجاجہ اپریل و مئی میں شمال مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور نومبر
میں شمال مغرب میں غروب ہوجاتا ہے۔ دجاجہ ۶۱ کا بعد زمین سے بیسل نے ۱۸۳۸ء میں
معلوم کیا۔

النہر اس کو دریا بھی کہتے ہیں۔ نہایت وسیع مجمع النجوم ہے۔ الجبار کے مغربی پہلو سے شروع
ہوکر مغرب جنوب میں بڑھتا چلا گیا ہے۔ مگر اس کے اکثر ستارے مدہم ہیں۔ مگر ایک ستارہ قدر اول
کا ہے جو آخر النہر یا الف نہر کہلاتا ہے۔ یہ برج حمل کے بالکل جنوب میں جنوبی افق پر اٹھتا نظر آتا ہے
مجمع النجوم نہر کا طلوع ستمبر اکتوبر میں ہوتا ہے اور فروری۔ مارچ میں بالکل غروب ہوجاتا ہے

سفینہ یہ بھی وسیع مجمع النجوم ہے۔ چنانچہ ولیم ہرشل نے اس کو چار حصوں میں منقسم کیا اور سب

(۱) بیسل ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۶ء میں بعمر ۶۲ سال فوت ہوا۔

ے نام علیحدہ علیحدہ رکھے۔ لنگر سفینہ کا روشن ترین ستارہ سہیل کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آسمان پر دوسرے درجے کا ستارہ مانا جاتا ہے۔ اس کے سال نور کا اندازہ پانسو اور ہزار سال کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ روز بروز ہم سے دور ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سال تین سو ساڑھے اٹھتر ملین میل دور ہوجاتا ہے۔ باوجود اس کے بھی اس کی روشنی میں فرق نہیں آتا۔ ہزاروں برس سے ایسا ہی روشن نظر آتا ہے اور واللہ عالم کب تک ایسا ہی نظر آئے گا۔ اس کے متعلق عوام الناس کا خیال ہے کہ جب یہ طلوع ہوتا ہے تو تمام حشرات الارض مرجاتے یا چھپ جاتے ہیں۔ اور پڑے میں خوشبو پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کو سہیل یمانی بھی کہتے ہیں۔ نومبر، دسمبر میں طلوع اور فروری میں غروب ہوجاتا ہے۔ سہیل برج جوزا کے بالکل جنوب میں جنوبی افق پر نظر آتا ہے۔ در شعرائے یمانی سہیل کے شمال میں واقع ہے۔ لہٰذا دونوں ستاروں کی جائے وقوع بخوبی ذہن نشین کرلینا چاہیے تاکہ شناخت میں آسانی ہو۔

حوت جنوبی | یہ مجمع النجوم کچھ روشن نہیں۔ اس میں صرف ایک قدر اول کا ستارہ ہے جسے فم الحوت کہتے ہیں۔ زمین سے چودہ نیل چھیاسٹھ کھرب بیالیس ارب چالیس کروڑ میل ہے۔ آج کل نو دس بجے سمت الراس سے گزرتا ہے۔ یہ مجمع النجوم برج دلو کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ جون جولائی میں طلوع اور نومبر تک غروب ہوجاتا ہے۔

مسک الاعنہ | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس میں ایک قدر اول کا ستارہ ہے جسے عیوق کہتے ہیں۔ یہ بلحاظ نور آسمان پر چھٹا ستارہ شمار کیا جاتا ہے۔ زمین سے اٹھائیس نیل چوہتر کھرب انیس ارب دس کروڑ چالیس لاکھ میل ہے اور ہر سال اٹھاون کروڑ چونتیس لاکھ سولہ ہزار میل ہم سے دور ہوجاتا ہے۔ سورج سے ایک ہزار گنے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کو رقیب الثریا بھی کہتے ہیں۔ عیوق ستمبر میں طلوع اور اپریل تک غروب ہوجاتا ہے۔

شلیاق | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام نسر واقع ہے شمالی کرہ میں سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے بیس نیل باون کھرب ننانوے ارب

چھتیس کروڑ میل ہے آفتاب سے سو گنے سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اس کا طلوع اپریل میں ہو جاتا ہے۔ ا
نومبر میں بالکل شمال مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔

عقاب | شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کی ہیئت ایک ایسے عقاب سے مشابہ ہے۔ جو پر تولے ہوئے اڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور منہ بجانب مشرق ہے۔ اس روشن قدر اول کا ستارہ نسر طائر کہلا ہے۔ یہ بلحاظ نور کرہ فلکی پر گیارہواں ستارہ قرار دیا گیا ہے۔ زحل کے برابر روشن نظر آتا ہے۔ یہ آفتاب سے باعتبار جسامت و نور چھ سات گنا زیادہ ہوگا۔ زمین سے آٹھ نیل اکیس کھرب انیس ار اٹھتر کروڑ چالیس لاکھ میل ہے۔ مجمع النجوم عقاب برج قوس کے شمال میں واقع ہے۔ نسر طائر کا طلو مئی میں اور غروب نومبر میں ہوتا ہے۔ نسر طائر کے ادھر ادھر دو چھوٹے ستارے بحیثیت نمایاں واقع ہیں۔ جن سے یہ بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے

کلب اکبر | یہ جنوبی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام شعرائے یمانی ہے۔ اس کو عرب عبور بھی کہتے تھے۔ اور قبیلہ قیس اس کی عبادت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے سورہ نجم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی۔ اس کو کلب الجبا بھی کہتے ہیں۔ چونکہ عرب میں اس کا مطلع غرب بجانب یمن ہے اس لئے یمانی کہلاتا ہے۔ باعتبار نور کرہ فلکی کے تمام قدر اول کے ستاروں سے زیادہ روشن ہے۔ اس کی روشنی ساڑھے آٹھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ اس کا بعد زمین سے پانچ نیل ستر کھرب اکانوے ارب چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میل ہے آفتاب سے تقریباً بیس بائیس گنا بڑا ہے۔ پانچ میل فی ثانیہ ہم سے قریب ہو رہا ہے۔ اس کا ایک سیارہ بھی معلوم کیا گیا ہے۔ اس کی پیشین گوئی بیسل نے کی تھی اس کا انکشاف ۱۸۶۲ء میں بمقام امریکہ ہوا۔ خیال ہے کہ یہ سیارہ شعرائے یمانی کے گرد پچاس برس میں اپنی حرکت سالانہ تمام کرتا ہے اور یہ بھی روز بروز مثل مشتری وغیرہ کے سرد ہوتا جا رہا ہے۔ یہ شعریٰ کی روشنی کا دس ہزارواں حصہ روشنی دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی کی طرح اور بھی سیارے ہوں۔ شعرائے یمانی کا طلوع نومبر میں ہوتا ہے اور مارچ یا شروع اپریل میں بالکل غروب ہو جاتا ہے۔ نہایت روشن چمکدار ستارہ ہے۔ اس

نجوم میں چار ستارے ایسے ہیں جن کا وزن مجموعی آفتاب سے نوسو چالیس گنا زیادہ ہے۔

اصغر | یہ جنوبی مجمع النجوم ہے اور کلب اکبر کے شمال قدرے مشرق میں واقع ہے۔ اس نجوم کا قدر اول کا ستارہ شعرائے شامی کہلاتا ہے۔ بلحاظ نور آٹھواں شمار کیا جاتا ہے۔ عرب میں س کا مطلع عین بجانب شام ہے۔ اس لئے شامی مشہور ہے۔ تقریباً دس سال میں اس کی روشنی ین تک پہنچتی ہے۔ زمین سے پانچ نیل چھیاسی کھرب چھپن ارب چھیانوے کروڑ میل ہے۔ یہ بھی ل شعرائے یمانی کے ہم سے روز بروز قریب ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی رفتار ڈھائی میل فی یہ ہے۔ اس کے بھی ایک سیارے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مگر ہنوز انکشاف نہیں ہوا۔ شعرائے امی کا طلوع نومبر میں ہوتا اور غروب مارچ یا شروع اپریل میں۔

| منطقۃ البروج میں ہے اور دوسرا برج ہے۔ اس میں ستاروں کے دو نسق واقع ہیں۔ اول یا۔ دوم فرودد۔ ثریا کو خوشہ پروین بھی کہتے ہیں۔ یہ بہت سے ستارے ایک جمع ہو گئے ہیں۔ ایت خوشنما اور مشہور مجمع النجوم ہے۔ اس کا بڑا ستارہ درمیان میں واقع ہے۔ اور ر سط الثریا کہلاتا ہے۔ یہ تیسری قدر کا ہے۔ رنگ سبزی مائل ہے۔ اگر دوربین سے دیکھیں تو بہت سے ستارے نظر آتے ہیں۔ خالی آنکھ سے دس تک گن سکتے ہیں۔ ثریا منازل قمر میں سے ہے اور چاند کی تیسری منزل ہے۔

دوسرا نسق فرود ہے۔ اس کی شکل بالکل وی (V) سے مشابہ ہے۔ اس مجمع کا روشن قدر اول کا ستارہ الدبران کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ ثور مذکور کی آنکھ پر واقع ہے۔ اس لئے اسے عین الثور بھی کہتے ہیں۔ دو ہزار چالیس میل فی منٹ ہم سے دور ہو رہا ہے۔ زمین سے چھبیس نیل اڑتالیس کھرب چھپن ارب تیئیس کروڑ میل ہے۔ الدبران چاند کی چوتھی منزل ہے عرب اس کو منحوس خیال کرتے تھے۔ قبیلۂ بنی تمیم وبر ان کی پرستش کیا کرتا تھا۔

شروع اکتوبر میں طلوع اور آخر مارچ میں غروب ہوتا ہے۔

الجبار | جنوبی مجمع النجوم ہے۔ نہایت روشن تاروں سے مزین ہے۔ اس کے سات روشن تارے خالی آنکھ سے جگ مگ جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ خط معدل النہار پر واقع ہے۔ اس شمالی و جنوبی دونوں نیم کروں کے لوگ اسے خوب پہچانتے ہیں۔

اس مجمع النجوم میں دو قدر اول کے ستارے ہیں۔ پہلا ابط الجوزا اور دوسرا رجل الجوزا کہلاتا ہے۔ ابط الجوزا بلحاظ نور نواں ستارہ مانا جاتا ہے اور زمین سے اٹھاون نیل پنیسٹھ کھرب انہتر ارب ساٹھ کروڑ میل ہے۔ اور رجل الجوزا زمین سے دو پدم تریسٹھ نیل پچانوے کھرب تہتر ارب بیس کروڑ میل ہے۔ اور یہ سہیل کے بعد قدر اول کے تمام تاروں سے زیادہ مسافت رکھتا ہے۔ جبار کا سر جن تاروں سے بنتا ہے۔ وہ منازل قمر میں سے ہیں اور چاند کی پانچویں منزل مانے جاتے ہیں۔ جبار کا طلوع اکتوبر میں اور غروب شروع اپریل میں ہوتا ہے۔

جوزا یا توامین | یہ تیسرا برج ہے۔ اس کی برج کی ہیئت ایسے دو آدمیوں سے مشابہ ہے جو توام ہوں۔ اسی وجہ سے اس کو توامین کہتے ہیں۔ اس میں بھی مثل جبار کے دو قدر اول کے ستارے ہیں پہلے کا نام مقدم التوامین یا الف توامین ہے۔ اور دوسرے کا نام موخر التوامین یا ب توامین ہے۔ مگر مقدم التوامین بہ نسبت موخر التوامین کے مدہم ہے۔ یہ دن بدن ہم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اور موخر التوامین روز بروز نزدیک آ رہا ہے۔ یہی وجہ مقدم کے موخر ہونے کی ہے۔ چنانچہ مقدم التوامین کا فاصلہ زمین سے ارسٹھ نیل چار کھرب بیس ارب تہتر کرور ساٹھ لاکھ میل ہے اور موخر کا فاصلہ انیس نیل اکاسی کھرب پچاس ارب انچاس کرور ساٹھ لاکھ میل ہے۔ اس مجمع میں توام ثانی کے پستان پر ایک ستارہ ہے۔ جسے الہنعہ کہتے ہیں یہ چاند کی چھٹی منزل ہے۔ دو تین ستارے جوزا کے سر پر واقع ہیں جنہیں عرب الذراع المبسوط کہتے ہیں۔ یہ چاند کی ساتویں منزل مانے جاتے ہیں۔ برج جوزا کا طلوع اواخر اکتوبر میں ہوتا ہے، اور غروب اواخر اپریل میں۔

اسد | پانچواں برج ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کا نام قلب الاسد ہے۔ اس کی روشنی زمین تک ایک سو پچاس برس میں پہنچتی ہے۔ یہ زمین سے ستاسی نیل اٹھانوے کھرب چون ارب چالیس کروڑ میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضرور جسیم و روشن ہوگا۔

برج اسد میں الجبہہ ایک ثنّی ستارہ ہے۔ یہ چاند کی دسویں منزل مانا جاتا ہے۔ مگر مسلمان ہیئت داں الجبہہ سے مراد اسد کی پیشانی کے تین چار ستارے لیتے ہیں۔ الجبہہ کو ہندو نجومی منحوس خیال کرتے ہیں۔

ذنب الاسد | اس کو زبرہ بھی کہتے ہیں اور یہ چاند کی گیارھویں منزل ہے۔ اسد میں ایک ستارہ قدر دوم کا ہے۔ اسے صرفہ کہتے ہیں وہ چاند کی بارھویں منزل ہے۔ اہل عرب کا خیال تھا کہ جب صرفہ طلوع ہوتا ہے تو گرمی رخصت ہو جاتی ہے اور جب یہ غروب ہوتا ہے تو سردی۔ چونکہ اسد نہایت وسیع برج ہے اس لئے اس میں ایک نہ ایک سیارہ ضرور رہتا ہے۔ اسد کا طلوع شروع دسمبر میں اور غروب آخری یا شروع جون میں ہوتا ہے۔

عوا | یہ شمالی مجمع النجوم ہے۔ اس کے قدر اول کے روشن ستارے کو سماک رامح یا حارس شمالی کہتے ہیں۔ بلحاظ نور چھٹا ہے اور سوا تین میل فی منٹ کی رفتار سے برج سنبلہ کی طرف جا رہا ہے۔ زمین سے اناسی نیل اٹھارہ کھرب۔ اڑسٹھ ارب چھیانوے کروڑ میل ہے۔ ہمارے آفتاب سے لحاظ نور و جسامت ہزار گنا سے بھی زیادہ ہوگا۔ اس مجمع النجوم میں پانچ ستارے جن کی شکل ایل (L) کی سی ہے۔ چاند کی تیرھویں منزل شمار کئے جاتے ہیں۔ عوا کا طلوع شروع فروری اور غروب وسط ستمبر تک ہوتا ہے۔

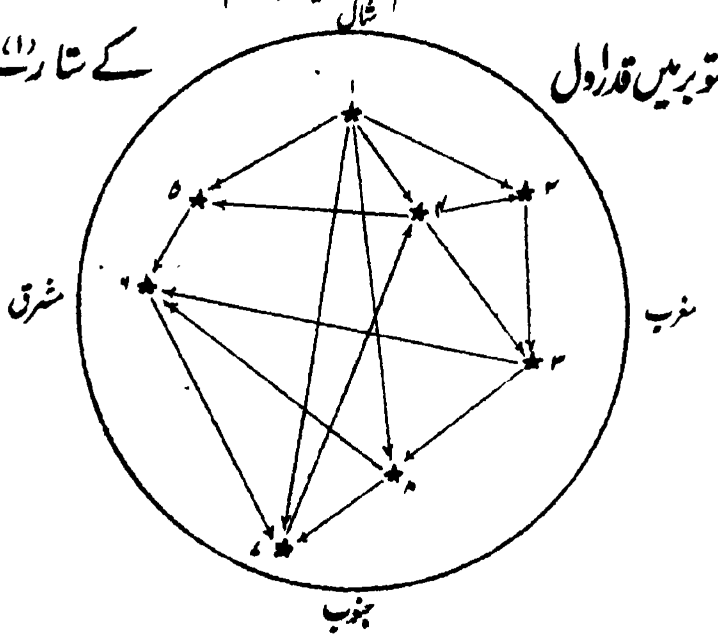
عذرا یا سنبلہ | منطقۃ البروج میں سے ہے اور چھٹا برج ہے۔ اس کے قدر اول کے ستارے کو سماک المنزل کہتے ہیں۔ یہ السماک اور ساق اور سر بھی کہلاتا ہے۔ یہ بلحاظ نور سولھواں ستارہ ہے۔ اور چاند کی چودھویں منزل ہے۔ ہمارے آفتاب سے ہزار گنا ضرور جسیم اور روشن ہوگا۔

برج سنبلہ کی ہیئت ایک ایسی لڑکی سے مشابہ ہے جس کا دامن لٹکا ہوا ہے۔ الٹا ہاتھ نیچے کی طرف اور سیدھا ہاتھ کندھے کی طرف اٹھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں گیہوں کی بال ہے۔ یہی سنبلہ کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کا طلوع شروع فروری اور غروب اگست تک ہوتا ہے۔

عقرب آٹھواں برج ہے منجمین اسے نحس جانتے ہیں۔ اس کے قدر اول کے ستارے کو قلب العقرب کہتے ہیں۔ یہ سرخ رنگ ستارہ مریخ سے مشابہ ہے۔ ہندی اس پر مریخ کا گمان کرتے ہیں۔ برج عقرب میں چاند کی تین منزلیں ہیں۔ اس کا سر جسے اکلیل کہتے ہیں۔ چاند کی سترھویں منزل ہے۔ قلب اٹھارھویں اور دم کے دو تین ستارے انیسویں منزل شمار ہوتے ہیں۔ اس کا طلوع اپریل میں اور غروب اگست و ستمبر تک ہوجاتا ہے۔

اب ہم اکتوبر میں دس گیارہ بجے نظر آنے والے صرف قدر اول کے ستاروں کا ایک نقشہ پیش کرتے۔ امید ہے کہ اس سے یہ چند ستارے بہ آسانی پہچانے جاسکیں گے۔ اختر شناسی کے لئے ہمیں سب سے زیادہ موزوں قطب تارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیں ساکن نظر آتا ہے اور باقی ستاروں کے مقامات بدلتے معلوم ہوتے ہیں۔ لہذا ہم اس کو مرکز قرار دیتے ہیں تاکہ آسانی ہو

اکتوبر میں قدر اول کے ستارے[۱]



(۱) قطب تارا

(۲) نسر واقع

(۳) نسر طائر

(۴) ذنب الدجاجہ

(۵) عیوق

(۶) الدبران

(۷) آخر النہر

(۸) فم الحوت

ہم بخوف طوالت مضمون ختم کرتے ہیں۔ اس عظیم الشان کارخانے کا ایک شمہ بھی ابھی
ال نہیں ہوا ۔ ربنا ما خلقت ہذا باطلا۔

وٹ صفحہ ۴۶) ارض البلد کی کمی بیشی کے لحاظ سے اگر ہمارے نقشہ میں کچھ اختلاف واقع ہو تو اس کو اپنے
رق حقیقی سے صحیح کر لینا چاہیے؟

تدوین علوم

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے اپنے بعض شاگردوں کے کہنے سے علوم
تالیف اوران کی موجودہ شکل کے متعلق ایک مختصر سا رسالہ " السر المکتوم " کے نام سے تص
فرمایا تھا۔ اس رسالے میں علوم کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔عربیہ۔شرعیہ۔فلسفیہ۔ محاضریہ۔ ب
اگرچہ بہت مختصر ہے۔مگر پوری جامعیت کے ساتھ تمام جزئیات کو حاوی ہے۔ اس رسالہ کا ب
ترجمہ ہوچکا ہے۔جس کا بالاستیعاب تو میں نے مطالعہ نہیں کیا مگر کہیں کہیں سے دیکھا ضرو
لیکن خود میں نے ترجمے کے وقت اسے پیش نظر نہیں رکھا بلکہ اپنے طور پر حتی الامکان بہت آ
الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ نیز ہر مفہوم کو الگ الگ پیراگراف میں ترتیب دیا ہے۔اور آخر میں تمام
کی فہرست اجمالی طور پر اپنی طرف سے بڑھادی ہے۔"

علوم عربیہ | علوم عربیہ کو اس لئے مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے سے کلام عرب کو سمجھا جائے ۔
عرب کی چند حالتیں ہیں، یا تو مفردات سے بحث کی جائے گی۔ اس کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) مفرد سے بحث کی جائے اس کے معنی کے لحاظ سے اسے علم اللغۃ کہتے ہیں۔

(۲) مفرد سے بحث کی جائے اس طور پر کہ لفظ کس طریقہ سے ادا کیا جائے اسے علم ا
کہتے ہیں۔

(۳) مفرد سے بحث کی جائے اس لحاظ سے کہ وہ کس ہیئت اور شکل پر ہے اسے علم اله
کہتے ہیں۔

(۴) مفرد سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ کیا نسبت ہے،
کون اصل ہے اور کون فرع اسے علم الاشتقاق کہتے ہیں یا مرکبات سے بحث کی جائے گی اس کی بھ
صورتیں ہیں۔

۱۔ مرکب سے بحث کی جائے اس حیثیت سے کہ کلموں کی آخر کی حالت ترکیب کے وقت
ہونا چاہئے ۔ اسے علم الاعراب کہتے ہیں۔
۲۔ مرکب سے اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ کلموں کو آپس میں کس طور پر مرکب ہونا چاہئے
ے علم التالیف کہتے ہیں۔
۳۔ مرکب سے بحث کی جائے کلام کی خوبی اور عمدگی کے لحاظ سے تو اسے علم البدیع کہتے ہیں۔
یا اشعار کے حالات سے بحث کی جائے گی اس کی بھی چند صورتیں ہیں۔
۱۔ حالت شعر سے بحث کی جائے باعتبار وزن شعر کے تو اسے علم عروض کہتے ہیں۔
۲۔ حالت شعر سے بحث کی جائے شعر کے آخری کلموں کو پیش نظر رکھ کر تو اسے علم القافیہ کہتے
ں۔
اسی کے ساتھ وہ علوم بھی شامل ہیں جن میں اصطلاح عرب کے مطابق نقوش و کتابت سے
ث کی جائے اسے علم الخط کہتے ہیں۔
آنحضرت صلعم سے پہلے یہ علوم ترقی یافتہ صورت میں نہ تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے نقوشِ
بت کی تشکیل کی ابوالاسود تھے۔ اس نے اشعار اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں پر زیر زبر اور
ں کی علامتیں بنائیں۔
پھر خلیل ابن احمد نے لغت میں کتاب العین تصنیف کی اور عروض و قافیہ کو مکمل صورت
ں بنایا اس کے بعد سیبویہ کا زمانہ آیا اس نے اپنی مشہور کتاب علم نحو میں لکھی اسی کے ساتھ اس نے
م مخارج ۔ صرف ۔ علم التالیف ، اور تھوڑا سا معانی کا حصہ شامل کر دیا۔ کچھ دنوں بادشاہوں کے
ساحیوں اور دوسرے ادیبوں نے قصوں اور فصیح و بلیغ شعرا کے کلام کی باریکیوں کو ایک جا اکٹھا
نا شروع کر دیا اور یہی چیزیں علوم معانی ۔ بیان اور بدیع کے استنباط کا سبب بنیں۔
لوم شرعیہ | وہ علوم جن کے ذریعے سے ایسی باتیں معلوم ہوں جنھیں آنحضرت صلعم نے خدا کی طرف
ے لوگوں تک پہنچایا۔ ایسی باتوں کا سرچشمہ کتاب (قرآن) اور سنت (حدیث) ہے یا جو کچھ قرآن

وحدیث سے عقل کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔ علما نے علوم شرعیہ کو چار پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) فقہ جس میں عبادات لین دین۔ میراث۔ گھر کا انتظام۔ ملکی انتظام اور آداب زندگی کا ذکر ہوتا تھا۔

(۲) تفسیر جس میں قرآن کے نادر الفاظ کی شرح۔ اسباب نزول۔ تعارض کا حل۔ مشکل کی توجیہ ناسخ و منسوخ کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

(۳) سیر۔ جس میں رسول مقبول کی عادات شریفہ۔ آمد ورفت، جنگوں اور شواہد وغیرہ کا بیان۔

(۴) رقائق۔ جس میں رقت آمیز وعظ۔ دعائیں جنت دوزخ کا ذکر۔ عمل کی فضیلت صحابہ کرام کے اوصاف اور پرہیزگاری کا ذکر ہو۔

ان علوم کے حاصل کرنے والے علما کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے۔

(۱) بعض ایسے علما تھے جنھوں نے ایک ہی فن میں مہارت پیدا کی۔

(۲) بعضوں نے دو میں۔

(۳) اور بعضوں نے تمام فنون میں۔

ضحاک بن مزاحم نے تفسیر، امام ابوحنیفہ۔ مالک اور شافعی نے فقہ۔ ابن اسحاق اور واقدی نے غزوات (جنگ نامے)، واعظوں اور صوفیوں نے رقت آمیز مواعظ تصنیف کئے۔ ابن عباسؓ بہت سے علموں کے جامع تھے۔

صحابۂ کرام میں عبداللہ بن عباسؓ امام تفسیر۔ عمرؓ، علیؓ۔ ابن مسعودؓ۔ ابن عباسؓ امام فقہ تھے اس زمانے کے بعد اور علما نے ان علوم پر غور و فکر کی نظر ڈالی لیکن ان کے پیش نظر صرف دو ہی چیزیں تھیں۔ قرآن او حدیث۔ لہذا انھوں نے قرأت قرآن کے مختلف طریقوں پر کتابیں تصنیف کیں (جسے علم قرأت سبعہ، عشرہ وغیرہ کہتے ہیں)، ان میں سات یا اس سے زائد مذہب پیدا ہوگئے۔ چند مذاہب تو روایتہً حاصل کئے گئے اور بعض کا علم کلام عرب اور علم الخارج کے ذریعے سے ہوا۔ مصحف عثمانی کو سامنے رکھ کر انھوں نے قرآن کا رسم الخط ایجاد کیا۔

پہلے پہل ان علما نے بلا امداد غیرے احادیث کی جمع و ترتیب کا کام شروع کر دیا پھر ان کی گہری نظر نے دوسرے فنوں کی طرح ڈالی۔ (دوسرے فنون یہ ہیں)

(۱) وہ جو حدیث صحیح کو سقیم سے۔ مشہور کو غیر مشہور سے۔ معلول کو اس کے غیر سے ممتاز کر دے جیسے بخاری۔ مسلم۔ مستدرک حاکم۔ مسند احمد۔ ترمذی۔ ابو داؤد۔ نسائی اور دارقطنی۔

(۲) وہ جو حدیثوں کو فقہ اور اس کے ابواب پر تقسیم کر دے۔ جیسے کتب شافعی۔ ابن ماجہ بیہقی۔ شرح سنہ وغیرہ۔

(۳) وہ جو حدیثوں کی تقسیم صحابہ کے لحاظ سے کرے اور یہ کتب مسانید کہلاتی ہیں جیسے مسند ابی یعلی۔ مسند بزار وغیرہ۔

(۴) ایک فن اسماء الرجال کا ہے۔ (راویان حدیث کے ناموں کی تشریح) اس کے متعلق ضعیف و عادل کی بحث اور حدیث کے نادر الفاظ کی تشریح و توضیح۔

(۵) کتب احادیث کی ترتیب دوسری کتابوں کے نمونے پر جیسے احیاء العلوم کی ترتیب۔

(۶) کتب صحاح کے نمونے پر جیسے صحیح ابی عوانہ اور اسمٰعیلی۔

(۷) مشکل حدیثوں کی یادداشت۔ دو مختلف حدیثوں میں تطبیق۔ اور اصول حدیث کا بیان۔

(۸) متن حدیث کی شرح جیسے ابن حجر کی شرح بخاری پر۔ نووی کی مسلم پر اور اس کے علاوہ بہت سی شروح جو حد شمار سے باہر ہیں۔

(شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "خدا کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے اسرار حدیث کی مجمل اور مفصل طور پر بیان کرنے کی توفیق عنایت کی۔ میں نے ان اسرار کو اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں جمع کر دیا ہے")

پھر یہ علما مذکورہ چاروں علموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ خاص طور پر تفسیر کی طرف زیادہ توجہ کی اور ہر فن کے عالم نے تفسیر لکھی لیکن اس طرح پر کہ نحوی نے نحو کو۔ لغوی نے لغت کو۔ مؤرخ نے مناسب قصوں کو۔ قاری نے قرأت کو۔ فقیہ نے فقہ کو۔ معانی جاننے والے نے معانی کو۔

کلام جاننے والے نے کلام کو۔ اور صوفی نے تصوف کو زیادہ دخل دیا۔ اس وجہ سے تصانیف کی کثرت ہو گئی اور ہر جگہ پھیل گئیں

اس کے بعد ان تمام فنون کو علما نے ایک جا جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ رازی، بیضاوی اور نیشاپوری نے ایسا ہی کیا۔

علم فقہ میں غور و فکر نے انھیں اس نتیجہ پہنچایا کہ اصول فقہ اور علم جدل یا معرفۃ خلاف کو مستقل علم کی صورت دے دی۔ لیکن ہونے والے واقعات چونکہ کسی خاص حد پر پہنچ کر رک نہیں جاتے اس لئے متقدمین کی تصانیف کافی نہ ہو سکیں۔ لہذا نصوص کے ذریعے استنباط کیا فتاوی اور واقعات جمع کئے۔ پھر اقوال و اسباب کی باہمی ترجیح و اولیت کو پیش نظر رکھا۔ پھر علم المذاہب کی تحریر اور حکایت اقوال و اسباب کے یقینی ہونے کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ہر فرقہ کی تائید میں عقلیات و نقلیات کے پیش نظر تصنیفات کیں۔

وہ مذاہب جن میں تخریج و ترجیح کو بکثرت استعمال کیا گیا تھا چار تھے۔

(۱) لوگوں کے دلوں کو پاکیزہ بنانے کے لئے دو طریقے اختیار کئے۔

(الف) وعظ و نصیحت اور رقت آمیز قصوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ منبروں پر چڑھ کر پر اثر وعظ کہنا شروع کیا۔

(ب) آخرت کو درست کرنے کے لئے چند قواعد کی بنا ڈالی اور انھیں (عام کتابوں کی طرح) فصلوں اور بابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ جیسے احیاء العلوم (غزالی) صحابۂ کرام تابعینؒ، علما اور صوفیا کی تاریخ کی طرف توجہ کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے یا تو ہر ایک شیخ کی سیرت اور اس کے اقوال کو الگ الگ لکھا۔ ایسی کتابوں کو مقامات اور ملفوظات کہتے ہیں۔ یا سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ جیسے مشائخ چشتیہ، علما، احناف یا ایک زمانہ اور ملک کے لوگوں کے حالات یکجا کئے ایسی کتابوں کو طبقات کہتے ہیں۔ اس میں کچھ تو تاریخ اور کچھ حصہ اسماء الرجال کا شامل کر دیا گیا۔

اس خاکسار (شاہ صاحب) نے بھی اپنے محترم باپ۔ چچا اور بعض اور اہل حرمین کے چند حالات

کو اپنی کتاب انفاس العارفین میں جمع کیا ہے۔

(۲) بعض لوگوں نے اوراد وظائف میں۔

(۳) بعض نے حالات وکیفیات میں۔

(۴) بعض نے صوفیا کرام کے رموز (جو تغیر حالات کی صورت میں ہوتے ہیں) کے بیان میں کتابیں لکھیں۔

پھر خود صوفیا کرام ہی کے طریقت میں مختلف گروہ ہوگئے۔ اور ہر مسلک پر رسائل لکھے گئے۔

(الف) بعض نے آنحضرت صلعم پر درود شریف پڑھنے کے بابت کتابیں تصنیف کیں۔ جیسے دلائل الخیرات۔

(ب) بعض نے حزب اور مناجات لکھیں۔

جب مذہبی تشتت وانتشار رہوا۔ ٹکڑیاں الگ الگ بن گئیں اور انجام بحث ومباحثہ تک پہنچا۔ یہ مباحثہ معتزلہ۔ شیعہ۔ فلاسفہ اور اہل کتاب سب ہی کے درمیان ہوتا تھا۔ ان مباحثوں کی ضرورت کبھی نصرت دین کے خیال سے بھی ہوتی تھی۔ اس کے لئے باقاعدہ سوسائیاں قائم ہوئیں۔ لیکن (چونکہ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا اس لئے) قطعی اصول وفروع۔ خوش بیانی اور خوش فکری کی بھی ضرورت تھی۔ اور اس کمال کا بغیر تعلیم وتعلم حاصل ہونا بظاہر ناممکن ہی سا ہے۔ لہٰذا علم کلام (اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے) مرتب کیا گیا۔

علم کلام کی ایجاد کی طرف سب سے پہلے معتزلہ نے توجہ کی۔ اس طرح پر کہ فلسفہ سے حد ورسم۔ قیاس ومقولات عشرا اور الٰہیات سے امور عامہ کی بحثوں کو لے لیا اور اس کے ساتھ صفات۔ نبوت اور معاد کی شرعی بحثوں کو شامل کر دیا۔ پس فلاسفہ کے وہ اصول جو شرعی قواعد کے خلاف نہ تھے انھیں باقی رکھا۔ اور جو ایسے نہ تھے انھیں نکال کر دوسرے اصول ان کی جگہ قائم کر دئے۔ علم کلام کو فلسفہ سے مستنبط کرنے کے یہی معنی ہیں۔

اہل سنت والجماعت میں سب سے پہلے جس شخص نے علم کلام کے بارے میں غور کیا وا
ابوالحسن اشعریؒ ہیں۔ مذہب اعتزال سے آپ کے رجوع کرنے کا قصہ مشہور ہے۔ نیز آپ جانتے
تھے کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور پھر ان سے فروعات کس طرح اخذ کی جاتی ہیں۔ آپ
اسی طریقے پر چلتے رہے۔

پھر ابونصر اور ابوعلی وغیرہ نے ان اصولوں کی جو اسلام کے مخالف تھے تاویل کر کے
اسلامی قواعد کی صورت میں فلسفے سے مطابقت دی۔ اس لئے مسلمانوں کو ان کے کلام کی
نقل و تردید کی ضرورت ہوئی۔ علم کلام اسی طرح بڑھتا گیا۔ اس کی وسعت روزافزوں تھی
لیکن متکلمین کا قلبی تذبذب دور نہیں ہوا۔ وہ اسی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے۔ نوبت بایں جا
رسید کہ وہ علم کلام "حق صریح" سمجھنے لگے۔

جب اصحاب حدیث نے یہ دیکھا تو اہل سنت کے عقیدے کے موافق بہت سے
رسائل لکھے اور ان میں صرف وہی حدیثیں لیں جن سے یہی مسائل استنباط ہوتے ہوں

صوفیائے کرام نے ابتداءً انھیں رموز و اشارات کی طرف توجہ کی جن کو حالات سے
تعبیر کرتے ہیں۔ پھر حالات سے معارف کی طرف پیش قدمی ابن عربی اور آپ کے شاگرد صدرالدین
(رحمہما اللہ) نے کی۔ اور اس وقت سے اس علم کی بہت سی شاخیں ہوگئیں جن کا تعلق علوم
اشراقیہ سے ہے۔ اس لئے مثال۔ ناسوت اور لاہوت وغیرہ کا استعمال ان کی اصطلاح
میں بکثرت ہوتا ہے۔ (شاہ صاحب فرماتے ہیں) کہ صوفیائے کرام کے نزدیک جس شخص نے
سب سے پہلے لوح۔ قلم۔ امر اور خلق کا ان مذکورہ معانی پر اطلاق کیا ہے وہ فارابی ہے۔

پھر ان کے متبعین نے حسب ضرورت ہر باب کی طرف توجہ کی۔ باہم مناظرے بھی ہوئے

یہاں تک علوم شرعیہ کی تقسیم کا ذکر ہے

علوم حکمت | علوم حکمیہ کی حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد جب زمین پر پھیلی اور متفرق
گروہ ہو کر جدا جدا مقامات کو اپنا وطن بنایا۔ ہر خطہ میں ایک جماعت آباد ہوئی۔ ذہانت تجربہ

اور اُن باتوں کی شناسائی کے اعتبار سے جن کا تعلق شہری اور خانگی انتظامات سے ہے اور ان کو بھی جن کا تعلق شائستگی نفس سے ہے نیز اُن نکات کو جن کا تعلق طب۔ ادویہ اور بیماریوں سے ہے اور ان کو بھی جو نجوم۔ کہانت۔ قیافہ اور حساب سے متعلق ہیں۔ نیز وہ نکات بھی جو جسمانی اور نفسی ریاضتوں کے سلسلے میں آتے ہیں۔

ان لوگوں میں جو صنعتیں بھی موجود تھیں وہ اجتماعی طور پر پائی جاتی تھیں۔ اسی لئے اگلے اور پچھلے گروہوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا ان فنون کی طرف میلان نہ ہو بلکہ جن اطراف نے حکومت کی شکل اختیار کر لی اور وہاں ان علوم کے حاصل کرنے کا رواج بھی پڑ گیا۔ تو پھر ان علوم میں اُن کو اوروں سے زیادہ مہارت ہو جاتی تھی۔

فریدوں کے زمانے سے لے کر آنحضرت صلعم تک حکومت افارس اور روم ہی میں پائی جاتی تھی اور وہاں کے حکما تمام باتوں سے زیادہ ان علوم کے حاصل کرنے کے جذبات اپنے اندر رکھتے تھے۔

اس امر پر اتفاق ہے کہ اسکندر سے تقریباً تین سو سال پہلے یونان میں لوگ بڑے عقلمند اور تحصیل علم کی خاطر بڑے صابر اور اس کے دلدادہ تھے۔ ان علوم میں خوب خوب داد فکر دی آخر علم طب کے ذریعے انھیں معدنی۔ نباتاتی اور حیوانی اشیاء۔ ان کے خواص اور ان کے اصول طبعی کا علم ہوا نیز اس علم نے ان کو اس طرف بھی متوجہ کیا کہ موالید ثلاثہ کے معجون مرکب جسم میں غذائیت اور نمو کے لحاظ سے طبیعت کیا کیا تصرفات کرتی ہے پھر انھوں نے فضائی اور معدنیاتی اشیاء وغیرہ کی تفتیش کی۔ آخر انھوں نے ان تحقیقات سے چند نکتے اور حکایتیں حاصل کریں جنھیں سمجھدار لوگوں نے محفوظ کر لیا اور پھر رسالوں کی شکل دے دی۔ علم نجوم نے انھیں سیارات کی تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور چونکہ بغیر حسابی قاعدوں کے جانے اس کا یاد کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا ان قواعد کو ترتیب دیا گیا تاکہ تحصیل علم نجوم کے لئے وسیلہ بن سکیں سلسلہ تحقیق جاری رہا تا آنکہ ہیئت۔ ہندسہ اور حساب کا بھی فنون میں شمار ہونے لگا۔ مزید برآں ریاضت و عبادت نے جو انبیاء سابقین

سے حاصل ہوئی تھی ثمرات نفس کے معلوم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ تدریجاً اس ادراک نے ترک دنیا اور معرفت تک پہنچا یا۔ پھر ان حقائق کی لوگوں کو خبر دی نیز رسائل تصنیف کئے جن کا ذکر کنایۃً ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ بحث و مباحثہ شروع ہو گئے یہاں تک کہ فن مناظرہ کے تمام حربوں کو استعمال کرنا پڑا۔

ارسطو جو کہ بہت ہی صائب الرائے متین۔ سنجیدہ اور جنگ وجدل سے متنفر تھا۔ جب اس کا زمانہ آیا تو اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ مباحث حد و برہان کی تشریح کر دی جائے۔ نیز شعر وجدل اور برہان کا باہمی فرق بتلا دیا جائے۔ آخر اس نے قواعد کی وہ ترتیب رکھی جسے عقل بلا چون وچرا تسلیم کرے۔ اس کا یہ طریق عمل خلیل نحوی سے ملتا جلتا تھا جس نے عروض کو ایجاد کیا تھا۔

ارسطو نے کیا یہ کہ مذکورہ تینوں علموں کو علم طبعی سے الگ کر دیا۔ اور اس میں کچھ اور اضافہ کر کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دی۔

اس نے اشراقیوں کے کلام کو دیکھا جو مناقضہ۔ تعقید اور اضطراب سے مملو تھا۔ دیکھنے والے کو صاف معلوم ہو جاتا تھا کہ حد و برہان کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ تو اس نے ایک بہت کھلی اور مختصر بات کہہ ڈالی جس نے ترددات کا خاتمہ کر دیا۔ اگر اسکندر نہ ہوتا تو تصانیف کی یہ کثرت نہ ہوتی اور نہ لوگوں ہی کو اس طرف توجہ کا شوق ہوتا۔

بطلیموس علم ہیئت و نجوم کا بڑا ماہر تھا ان علوم میں اس کی تصنیفات بہترین ہیں۔
اقلیدس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اصول ہندسہ میں ایک کتاب لکھی۔
بقراط طب کا ماہر تھا اس نے اسی فن میں بہت کچھ لکھا۔ جالینوس نے اس کی تشریح کی اور انتہائی حدود تک پہنچا دیا۔

دورِ جاہلیت اس حالت میں ختم ہوا کہ ان کے پاس یہ کتابیں اور رسائل تھے اور مصنفین کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ ان کی تحصیل میں مشغول تھے۔ اور ان کے مباحث

...ما اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

موسیقی کے متعلق یہ خیال ہے کہ صناعات کے زمرے میں داخل ہے علوم میں نہیں۔ ہاں ...جماعت نے جب دیکھا کہ مسائل کے منتشر ہونے کے باعث موسیقی کی تحصیل دشوار ہے تو ایسی ...بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک رسالے میں ان قواعد کو جمع کر دیا جائے لہذا اس فن ...کتابیں اور رسالے تصنیف کئے گئے۔

اس کے بعد حکما میں اس بات پر بحث و مباحثہ شروع ہو گیا کہ یہ کیا وجہ ہے کہ بعض ...وں سے سرور حاصل ہوتا ہے اور بعضوں سے نہیں۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتوں کے ...ق گفتگو ہونے لگی۔ چونکہ اس قسم کی بحث کا تعلق حکمت سے ہے۔ لہذا یہ قرار پایا کہ موسیقی کو ...م حکمیہ میں داخل کر دیا جائے۔ جب اسلام کا دور آیا اور حنین نے کتب فلسفہ کو یونانی سے ...بی میں منتقل کیا تو مسلمانوں نے اس کے انتشار و پراگندگی پر غور کیا جب ابوعلی کا زمانہ آیا تو ...ں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور بعض باتوں پر دونوں کا از خود اجتماع ہو گیا۔ لیکن بعض ...ں میں شارع علیہ السلام کی مصلحتوں پر آگاہی نہ ہوئی۔ نہ سلسلۂ کلام کے مقصد پر۔ آخر ...نے اپنے طریقے پر جو سمجھ میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا۔ ابوعلی نے کتاب الشفا میں ان علوم ...ترتیب و تالیف میں بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی۔ نیز حکمت نظری کو چار پر تقسیم کیا۔

(۱) منطق۔ اس میں نو ابحاث رکھیں۔

کلیات خمس۔ مقولات عشر۔ قضایا۔ قیاس۔ مباحث حد و برہان۔ خطابت۔ جدل۔ ...ر اور مغالطہ۔

(۲) طبیعات۔ اس میں آٹھ ابحاث رکھیں۔

سماع الطبعی۔ کون و فساد۔ کائنات جو معادن۔ نباتات۔ حیوانات اور نفس۔

(۳) ریاضیات۔ اس میں چار بحثیں۔

ہیئت۔ حساب۔ ہندسہ اور موسیقی۔

(۴) الٰہیات۔ اس میں دو بحثیں۔

امورِ عامہ اور معرفت باری تعالیٰ وعقول۔

ختمِ کتاب پر اسرارِ شریعت کو بیان کیا جیسے جزا سزا۔ نبوت۔ عبادت۔ تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

اگر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ ابوعلی سنے ذات باری۔ صفات اور کلام باری کے متعلق جو کچھ بحث کی ہے وہ بہت پھس پھسی ہے۔ اس لئے کہ محض ظن وتخمین سے کام لیا گیا ہے۔ طبعیات میں فلاسفہ کے کلام کا منشا عناصر وموالید میں اکثر حادثات کے اسباب کی تشریح ہوتی ہے۔ جن کا ظہور حدسی ہوتا ہے

علوم محاضریہ | ضرورتاً یا رسماً انسانوں کے لئے یا اس لئے کہ انسانوں کا ایک گروہ ان سے دلچسپی لیتا ہے۔ جو قواعد کلیہ۔ مفید صنعتیں اور دلچسپ حکایتین مرتب کی گئی ہیں۔ ان کا نام علوم محاضریہ ہے۔ انھیں میں سے بعض میں سے بعض علوم ایسے بھی ہیں جن سے اشیاء کی پیشگی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ حوادثاتِ دنیا مثلاً فتح۔ شکست۔ ارزانی وقحط وغیرہ کو ان کے آنے سے پہلے جاننے کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہ علوم نجوم۔ کہانت۔ فال۔ خواب کی تعبیر۔ رمل اور جفر وغیرہ ہیں۔

کچھ ایسے علوم بھی ہیں جن سے مزاج میں اعتدال اور بیماریوں کا دفعیہ ہوتا ہے اور اور ان کی ضرورت بالکل عیاں ہے۔ مثلاً طب۔ تعویذ اور پالو جانوروں جیسے گھوڑا۔ اونٹ بکری۔ گائے۔ گدھا۔ ہاتھی اور کبوتروں کا علاج۔

انھیں میں نادر صنعتوں کا شمار ہے جیسے تیر اندازی۔ خوش خطی۔ کیمیا۔ موسیقی۔ طباخی اور کسانی فنون حکمت بھی انھیں میں داخل ہیں۔

حکمت ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے عمدہ اخلاق۔ تدبیر منزل اور سیاست مدینہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ قدیم حکما واقعی اور فرضی حکایتیں وحشیوں اور پرندوں اور درندوں کی زبانی

اسی غرض سے مرتب کرتے تھے۔ پھر ان کی کوشش ان حکایتوں سے عجیب عجیب نکتے بہم پہنچاتی تھی۔

علوم محاضریہ میں . . . بادشاہوں راہبونکے قصے۔ عجیب وغریب حکایتیں۔ شہروں کے حالات۔ پہاڑوں اور درختوں کی کیفیات داخل ہیں۔

لغات کی معرفت یعنی ترکی۔ عربی۔ فارسی اور ہندی وغیرہ اور مختلف خطوں کی پہچان یہ بھی علوم محاضریہ کا ایک جزء ہے۔

قومی اشعار۔ ان کا طریقۂ تحریر۔ اشعار کی ترتیب اور خطوں کا طریقۂ تحریر۔ مذاہب اقوام ان کی کتابوں کی روایت۔ اور ان کے تراجم (جیسے یہودی۔ نصرانی۔ مجوسی اور ہندو) کا جاننا۔ ان سب کا شمار علوم محاضریہ میں کیا گیا ہے۔

ان اوراق میں جن امور کے تذکرہ کا ہم نے ارادہ کیا تھا یہ ان کا خاتمہ ہے۔ اول و آخر خدا ہی کے لئے تمام اوصاف لائق و زیبا ہیں۔

(فہرست ان علوم کی جن کو علماء عرب نے مرتب کیا یا ان میں اضافہ و تشریح کی۔)

علم لغت۔ علم مخارج۔ علم صرف۔ علم اشتقاق۔ علم الاعراب۔ علم تالیف۔ علم بدیع۔ علم عروض۔ علم قافیہ۔ علم خط۔ فقہ۔ تفسیر۔ سیر۔ رقائق (نصائح و مواعظ) تمیز صحیح۔ تقسیم حدیث فقہ و ترجمہ کے لحاظ سے۔ تقسیم حدیث صحابہ کے لحاظ سے۔ علم اسماء الرجال جرح و تعدیل۔ تخریج۔ کتب احادیث تخریج احادیث بطرز صحاح۔ ضبط احادیث مشکلہ۔ جمع احادیث مشکلہ۔ اصول حدیث۔ شروح کتب۔ اصول فقہ علم جدل۔ معرفۃ الخلاف۔ علم الترجیح۔ فتاوی۔ علم المذاہب۔ علم الکلام۔ علم اخلاق۔ تدبیر منزل۔ سیاست مدن۔ طب۔ معرفت ادویہ۔ نجوم کہانت۔ قیافہ۔ حساب۔ ہیئت۔ موسیقی۔ علم القرآت۔ علوم محاضریہ (ان کے علاوہ اور بہت سے علوم عقلیہ و نقلیہ جن کی ایجاد یا ترقی و تجدید میں عربوں کو دخل ہے) ۔ ۴۴۔

حکیم مولوی سید سعید احمد صاحب اسعد ٹونکی مرحوم

حکیم صاحب سلف صالحین کی یادگار اور آخری عہد اسلامی کے تمدن کے علم بردار تھے۔ خاندانی علم وفضل کے ساتھ ذاتی فضل وکمال سے آراستہ، مروجہ علوم وفنون عربی وفارسی کے علاوہ فن طب اور اردو فارسی شاعری کے مسلم استاد تھے۔

آپ کے والد ماجد مولوی حکیم سید احمد علی صاحب سیماب بن مولنا سید محمد علی صاحب واعظ رامپوری المتوفی [illegible] خلیفہ حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے اور برادر خورد مولنا حکیم سید حیدر علی صاحب رامپوری کے آپ کا خاندان سادات بخاری سے تھا۔

ولادت سنہ ۱۲۷۰ھ ٹونک میں ہوئی، اپنے والد بزرگوار و دیگر اہل فضل وکمال سے جو ان دنوں ٹونک میں تھے علم وفضل حاصل کیا، سنہ ۱۳۰۲ھ میں بھوپال گئے۔ وہاں بڑے بڑے فضلا سے تحصیل علوم وفنون کی۔ مثلاً قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری، شیخ حسین عرب صاحب یمانی وغیرہ فن طب میں کمال پیدا کیا، نباضی وتشخیص میں فرید عصر تھے۔ ذہانت، قوت حافظہ، طباعی اور ذکاء میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ حواس کی ذکاوت وتیزی میں ضرب المثل تھے۔ علاج وطب میں وہ کمال تھا کہ دور دور کے لاعلاج مریض آتے، ایک مرتبہ ہاتھ رکھ کر پوری کیفیت بیان کر دیتے تھے، اکثر امراض میں سول سرجن ان کی رائے ومشورے سے کام کرتا تھا۔ جراحی کے مشکلات میں خصوصاً ان کا مشورہ قابل قدر خیال کیا جاتا تھا۔ بہت سے معرکے کے علاج ایسے کئے اور مایوسوں کو ان کے ذریعے وہ شفا حاصل ہوئی جو زبان زد عوام وخاص ہے۔ برص و دیگر لاعلاج بیماریوں میں انگریز ان کے پاس آتے یا باہر بلوا کر علاج کراتے اور اکثر کامیاب ہوتے تھے۔

سنہ ۱۳۱۰ھ میں حج بیت اللہ کے لئے گئے اور ایک سال تک وہاں رہے جس میں اہل علم وفضل سے خوب صحبت رہی۔ شیخ احمد مغربی اور علامہ شیخ محمد سہارنپوری ...

الفت تھی، عرب کے قبائل سے بھی آمد و رفت اور تعلقات و روابط پیدا کئے، وہاں طب کی
ہ خواہش و قدر دیکھی کہ حد بیان سے باہر۔

اخلاق و عادات میں نہایت منکسر المزاج، سادہ اور رحم دل تھے خلق خدا کی نفع رسانی
ں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے، غریب و امیر سب کو ایک نظر سے دیکھتے، بلکہ غربا کا زیادہ
یال کرتے تھے، مریض کو دیکھ کر اگر قابل علاج ہوتا علاج کرتے اور غریبوں سے کبھی فیس نہ لیا
رتے، بلکہ اپنے پاس سے کچھ خدمت کر دیتے تھے۔ اگر لاعلاج مریض آتا تو صاف طور پر اس کے
علاج سے دست بردار ہو جاتے اور اکیلے میں کہہ دیتے کہ اس میں کچھ حالت نہیں، اتنی مدت
ا یہ مہمان ہے۔ اسے فلاں نسخہ استعمال کراؤ۔

ریاست سے جاگیر و تنخواہ تھی مگر دربار میں زیادہ آمد و رفت نہ رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت
ں سادگی کے ساتھ خودداری استغنا اور سچائی بہت تھی۔ مال و زر کی طمع مطلق نہ تھی، اس
لئے ایسے تمام مقامات سے جہاں دین کو دنیا پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ بہت پرہیز کرتے تھے ہمیشہ
ہل علم و فضل سے محبت و مودت کا سلسلہ قائم تھا۔ مولنا سید عرفان صاحب مرحوم اور ان کے
ھائی مصطفیٰ میاں مرحوم نبیرگان سید احمد صاحب بریلوی سے خاص اخلاص تھا، اتباع سنت میں
خاص کوشش کرتے اور اہل توحید سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اکابر و فضلا کے حال ہر مجلس
یں اس طرح بیساختہ بیان کرتے تھے کہ گویا کوئی محفوظ چیز دہرائی جاتی ہے۔ ایسا خوش بیان قوی
لحافظہ بہت کم دیکھا گیا۔

۱۳۱۲ھ سے ایک آنکھ میں پانی اتر آیا تھا، پھر دوسری میں بھی ۱۳۱۵ھ میں ایک آنکھ
بنوائی جو کچھ دنوں کے بعد خراب ہو گئی، دوسری آنکھ ۱۳۱۶ھ میں بنوائی مگر وہ تیار نہ تھی۔
س کے بنوانے میں بیحد تکلیف ہوئی اور جو کچھ بصارت تھی وہ بھی جاتی رہی، اس سے سخت
صدمہ پہنچا اور زندگی سے دل تنگ ہو گیا، خصوصاً نماز کے اوقات کی معرفت نہ ہونے پر سخت
فسوس کیا کرتے تھے!

فارسی۔ طب وغیرہ میں بہت سے شاگرد چھوڑے۔ جن میں حکیم سید یحییٰ میاں خلف اکبر اور سید احمد میاں نواسہ طب و فارسی میں اور مولوی سید شرف الدین صاحب، مولوی عبدالرحمٰن صاحب فارسی میں۔ سید عیسیٰ بسمل منجھلے صاحبزادے شعر و شاعری میں خاص کر قابل ذکر ہیں۔ تاریخ نکالنے میں خاص مہارت رکھتے تھے، بہت لوگ اس فن میں بھی ان سے تلمذ رکھتے ہیں، حافظ عبیداللہ البصیر کو خاص کمال حاصل ہوا ہے۔ جناب حکیم صاحب کی پہلی اہلیہ سے دو یادگار ایک لڑکا ایک لڑکی باقی ہیں اور دوسری زوجہ سے پانچ اولاد تین لڑکے اور دو لڑکیاں زندہ و آباد ہیں
تالیف کی طرف بہت کم توجہ تھی بعض کتب تاریخ و سیر کا ترجمہ کیا ہے۔ اصحاب بدر کے حالات میں ایک کتاب تیار کی تھی جو اب تک شائع نہ ہو سکی، فارسی، اردو کی نظموں کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے جن کی بابت کوشش ہو رہی ہے کہ یکجا جمع کر دی جائیں۔

وفات سے عرصہ قبل اطلاع دیتے تھے کہ اب میں پانچ چھ ماہ کا مہمان ہوں، اور ایسا ہی ہوا۔ گذشتہ سال ذوالقعدہ ۱۳۸۵ھ میں جب میں نے عبداللہ میاں کی والدہ کو بلانا چاہا تو ان سے فرمایا "بیٹا میں چاہتا تھا تم یہاں رہو، تو مولوی میاں میری وفات کے وقت یہاں آ جائیں گے، اور میری نماز جنازہ پڑھائیں گے، مگر اب تم جاتی ہو اللہ حافظ! انشاء اللہ حشر کے میدان میں ملیں گے۔ میں اب پانچ چھ ماہ کا مہمان ہوں۔" ایسا ہی ہوا۔ ۲۹ ربیع الآخر سنہ ۸۶ھ اتوار کے روز عصر کے وقت دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت کر گئے اور ام عبداللہ بیماری کی وجہ سے ٹونک نہ پہنچ سکیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات سے قبل خود اپنی تاریخ اس طرح لکھ گئے گویا غیب سے اطلاع مل چکی تھی، اور اور اس کا پورا یقین ہو چکا تھا۔

تاریخ ہے سرّی میری رحلت کی بجا ۔۔۔ سمجھو ہاے الف سی لکھ دیکھو تجھا دلجا تاریخ نمبر
ایک صوری و دعائیہ بیا بغفراں ۔۔۔ اک اور ہے۔ رہی بہاو جنتواں بجا ۱۲۰

علی حزیں کے قطعہ پر فارسی میں یہ قطعہ بھی لکھوایا ملاحظہ ہو۔

بودایں جائے یارب قطعہ از روضۂ رضواں | سعید خستہ ہشتاد و سالہ آرمید اینجا
بشوق قرب مولیٰ از قلق وارہ می گشتم | سرم بر آستاں بارگاہ او رسید اینجا

قطعہ تاریخ وفات از جناب مولوی حکیم سید میر حسن صاحب سہا نقوی دہلی

طبع سہا ز کثرت رنج و ملال و غم | تاریخ گفت طوطی فضل و ہنر نماند
تاریخ انتقال بگوشم سروش گفت | آں منبعِ عطا شجر بارور نماند

قطعہ تاریخ وفات از صاحبزادہ یٰسین محمد خاں صاحب طالب

تھی جو تاریخ ولادت مصدر فیض و لی ۱۲۷۰ | اس سے ہر فیض میں ہر خیر میں تھا نیکنام
خاتم فیض: اُس کا پایا عیسوی سال وفات ۱۹۴۱ | دفتر فیض و سخا کا مٹ گیا عالم سے نام
تھا ربیع الثانی اور تاریخ تھی انتیسویں ۲۹ | چھپ گیا زیر زمیں وہ علم کا ماہ تمام
یک ہزار و سہ صد و پنجاہ سن ہجری تھے اور | روز یکشنبہ تھا وقتِ عصر جب آیا پیام

بیداری کا انعام

(۱)

بھیا! مائی اللہ کے نام پر!

یہ تھی وہ آواز جو فضا پر رات کی تاریکی مسلط ہوئی ہر" گلی قاسم جان" کے ایک بلند مکان کی ڈیوڑھی پر محمود کے منہ سے پہلی مرتبہ نکلی، جب اس کی بھوک اور ضمیر میں زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ بھوک کا تقاضہ تھا کہ جس طرح بھی میسر آئے" تنور شکم" کو پر کر دو، غیرت کہتی تھی کہ دوسرے کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کے مقابلے میں مرجانا بہتر ہے۔ آخر پیٹ کی آگ کے شعلوں نے دامن غیرت کو داغدار کر دیا۔ اور محمود اندھیری رات کا سیاہ نقاب چہرے پر ڈال کر ایک شاندار مکان کے سامنے سے گذرا جس کے برآمدے میں چند خوش باش احباب اپنے لمحاتِ فرصت سے اطمینان کے ساتھ فائدہ اٹھا رہے تھے۔

درمیان میں خوبصورت بیضوی میز پڑی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز پر" سوڈا واٹر" کی چند بوتلیں اور بادۂ ناب سے بھرے ہوئے متعدد کانچ کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ قہقہے کی مسلسل صدائیں دروازوں کی چقوں کو چیر کر سڑک پر آرہی تھیں اور بجلی کے قمقمے اپنی پرنور شعاعوں سے راستے کو روشن کر رہے تھے۔ محمود آہستہ آہستہ برآمدے کے سامنے آیا، اس نے یہ نظرہ دیکھا اور اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر سر سے پیر تک لرز گیا . . . . کاش نوجوانوں کا بے پروا گروہ جو آئندہ چل کر سیکڑوں نفوس کی بربادی کا باعث ہوگا۔ مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کرتا اور سمجھتا کہ زہر کے یہ خوش رنگ پیالے انسان کو دنیا میں کسی کام کا نہیں رکھتے۔

اس نے چاہا کہ ان کو اپنی شکستہ حالی پر متوجہ کرے اس کے لبوں میں حرکت کے آثار

یدا ہوئے۔ زبان نے جنبش کرنے کا ارادہ کیا لیکن الفاظ نے ساتھ نہ دیا اور اس کا وہ سوال وحمیت کے خون کو کھولاتا ہوا لب تک آنا چاہتا تھا دل کا دل میں رہ گیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور عجلت کے ساتھ پچاس ساٹھ قدم چلنے کے بعد پھر ہمت کر کے وہ ایک دروازے پر رکا اور چاہتا کہ سوال کرے لیکن خاندانی وجاہت، باپ دادا کی عزت وشہرت نے اس کے دامن کو جھٹکا دے کر کہا۔ محمود! کیا محض ایک روٹی کے لئے یا تانبے کے چند سکوں کے معاوضے میں اپنی خاندانی نام ونمود کو فروخت کردے گا! پیٹ نے کہا ضرورت میں سب کچھ جائز ہے حاجتمندی گناہ کو بھی ثواب کر دیتی ہے لیکن ضمیر نے کہا غیرت مند اشخاص کے لئے ''موت'' دنیا کے تمام آلام کا بہترین علاج ہے۔ مگر زندگی آہ سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی چیز! کیا ممکن ہے کہ میں اس کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ کر دوں۔ دو منٹ توقف کرنے کے بعد وہ اس دروازے سے بھی گزر گیا جو خطرہ بار بار پیش آتا ہے انسان اس کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ اس سے کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا۔ محمود کے سامنے دو مرتبہ غیرت وضرورت کی کشمکش ہو چکی تھی ضرورت بڑھ رہی تھی اور غیرت اسی اعتبار سے مغلوب ہو کر کمزور ہو رہی تھی۔ جس طرح آگ کی معمولی سی چنگاری پر بہت سی لکڑیاں ڈال دی جاتی ہیں اور وہ ان کے وزن سے دب کر خود ہی بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح ضرورت کے بوجھ سے محمود کی غیرت دب گئی تھی اب اس میں تاب نہ تھی کہ وہ ضرورت کے مقابلے میں صف آرا رہ سکے۔

محمود پھر ایک دروازے پر رکا اور ڈیوڑھی میں منہ ڈال کر پوری قوت سے آواز بلند کی ''بھیا بائی اللہ کے نام پر!''

گھر میں سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں برتنوں کی جھنکار محمود کے کانوں میں پیام امید پہنچا رہی تھی مگر اس کی پہلی صدا بیکار ثابت ہوئی اس نے چاہا کہ اب اس دروازے کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے لیکن پھر بھی اسی ناگوار فرض کو انجام دینا تھا پھر نہیں کیوں نہ اس کی تکمیل کر لی جائے۔ اس نے پھر اپنے لہجے میں سائلانہ لوچ پیدا کر کے وہی ''صدائے طلب''

بلند کی چونکہ اس مرتبہ وہ ذرا دلیر بھی ہوگیا تھا، غیرت کا نشہ پہلی آواز کے بعد کچھ کم ہو چکا تھا اس لئے اس مرتبہ اس کے حلق نے خوب کام دیا، اگرچہ آواز میں فن سوال کی پوری مہارتیں موجود نہ تھیں ـــــ وہ سوال کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک منتظر رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس نے ہمت کرکے تیسری مرتبہ پوری قوت سے اسی سوال کو دہرایا مگر اس کا جواب پھر نہایت تلخ اور دلشکن تھا اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "چلو ـــ آگے بڑھو کیوں کان کھاتے ہو!"

محمود کی غیرت و حمیت پر یہ ایسی کاری ضرب تھی کہ اگر امید اس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ اس سے زیادہ بے غیرتی پر آمادہ نہ ہوتا۔ وہ دروازے کی سیڑھیوں کو طے کر کے سڑک پر آیا اور اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ اب کیا کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ دنیا میں جہاں تنگ نظر اور کم ظرف لوگوں کی کثرت ہے وہاں ارباب خیر اور صاحبان ہمت کی بھی کمی نہیں، بدقسمتی سے مجھے پہلی مرتبہ نہایت ناپاک نفوس سے واسطہ پڑا کہ انھوں نے مجھے عام سائلوں کی طرح جھڑک دیا اور ان کے بے درد قلوب میری دردبھری آواز سے متاثر نہ ہوئے جو بہت حد تک میری قلبی کشمکش اور دماغی کوفت کی آئینہ دار تھی لیکن بہت ممکن ہے کہ آئندہ اس کی تلافی ہو جائے۔ جب یہ حرکت کی ہے تو مقصد حاصل ہونے سے پہلے اس کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں، پھر بھوک بھی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ شدت گرسنگی سے پاؤں اٹھانا بھی مشکل تھا۔

جہاں تک اس کے پیروں کی قوت نے اجازت دی وہ چلتا رہا دس پندرہ منٹ گزر جانے پر وہ ایک موڑ پر کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ قریب کے دروازے میں کسی شخص کے داخل ہونے کی آہٹ ہوئی وہ اس دروازے کے پاس پہنچا اور اس نے پھر ایک مرتبہ وہی آواز بلند کی، تقریباً دو منٹ کے بعد ادھیڑ عمر کا ایک آدمی جس کے چہرے سے شرافت و نرم دلی نمایاں تھی ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں گرم گرم پاؤ کی پلیٹ لئے ہوئے باہر آیا اس نے سر سے پیر تک محمود کو دیکھا اور ایک خاص شفقت کے ساتھ پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے

ہا، بہ لو اس کو یہیں بیٹھ کر کھا لو۔"

محمود کا سر چکرانے لگا۔ اس کا دماغ معطل ہو گیا۔ سارے بدن میں آگ سی جلتی ہوئی معلوم ہونے لگی اور اسی حالت میں اس کا ہاتھ پہلی بار اس کھانے کو لینے کی غرض سے اٹھا جو دو گھنٹے کی گداگری کے بعد حاصل ہوا تھا اگرچہ اس کا ضمیر اب بھی اس بزدلی پر ملامت کر رہا تھا۔ اس وقت اس نعمت غیر مترقبہ کو ٹھکرا دینا دنیا ہی تھا جیسے گلا کٹ جانے کے بعد جینے کی آرزو کرنا اس واسطے چار و ناچار اس نے رکابی لے لی اور کھانا شروع کر دیا — چار وقت کا فاقہ اور اس پر مزیدار پلاؤ کے بڑے بڑے لقمے — تھوڑی ہی دیر میں اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ صاحب خانہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا دفعتہً پلیٹ اس کے ہاتھ سے گرتی دیکھ کر اس کے حواس پریشان ہو گئے۔

محمود کی گردن ڈھیلی ہو کر ایک طرف کو لٹک گئی اگر وہ چوکھٹ کے سہارے نہ بیٹھا ہوتا تو اس کے گر جانے میں کوئی شک نہیں۔

ارے کیا تم بیمار تھے! صاحب خانہ نے نبض پر ہاتھ رکھا، کمزوری چہرے ہی سے ظاہر تھی۔ پھر بیہوشی میں نبض کا ساقط ہو جانا کوئی تعجب خیز امر نہ تھا، ذرا سی دیر میں محمود کے چاروں طرف گھر کے آدمیوں کا ہجوم ہو گیا۔ کوئی منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا کوئی چائے کی پیالی لئے کھڑا تھا کسی کے ہاتھ میں پنکھا تھا کوئی شانہ جھنجھوڑ کر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب کو یہی خیال تھا کہ اس طرح ان کے دروازے پر دم توڑ دینا قیامت سے کم نہیں۔ نہ معلوم کیا الزام لگایا جائے۔

محمود کے منہ سے نحیف سی آواز نکلی "پانی" — فوراً پانی حلق میں ڈالا گیا۔ خدا خدا کر کے محمود اٹھ کر بیٹھا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

صاحب خانہ کے سخت اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا کہ میں چار وقت کا بھوکا ہوں اس سے زیادہ اپنا کوئی حال ظاہر نہیں کیا۔ یہ معلوم ہو جانے پر کہ محمود کی غشی نتیجہ تھی سخت بھوک میں

دفعتہً ثقیل غذا کے معدے میں پہنچ جانے کا، اس کے واسطے چائے اور انڈوں کا انتظام

(۲)

میرٹھ کے مشہور رئیس اور ممتاز دولتمند "قاضی اشفاق حسین" کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کی پاک طینتی، ان کا بے ریا اخلاق، اور ان کی مخلصانہ قومی خدمات ایسی نہ تھیں کہ ہندوستان کا کوئی آدمی ان کے نام کے ساتھ لفظ "مولانا" کا اضافہ نہ کرتا ہو۔ وہ شہر کے سب سے بڑے تاجر اور سربرآوردہ بزرگ تھے۔ ان کا عالیشان محل شاہ پیر دروازے میں مرجع انام تھا۔ روزانہ شام کے وقت ان کے دروازے پر سائلوں کا ہجوم ہوتا اور قاضی اشفاق حسین اپنی نورانی داڑھی میں کنگھا کرتے ہوئے گھر سے برآمد ہوئے، ہر طرف سے دعا کا شور پیدا ہوتا اور ہر ضرورت مند قاضی صاحب کی فیاضی سے فائز المرام ہو کر واپس جاتا عام طور پر مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا نصف حصہ غربا پر تقسیم کر دیتے ہیں ممکن ہے کہ اس میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے سینے میں ایک ایسا دردمند دل تھا جو ابنائے جنس کی غربت و افلاس اور بیکسی و بیچارگی پر ہر وقت تڑپتا رہتا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ نہایت مخیر، کریم النفس اور پاک خصلت آدمی تھے۔

قاضی اشفاق حسین کے بہت دن تک کوئی اولاد نہ ہوئی اور دولتمند ہو کر بھی وہ اگر کسی چیز کے لئے بے چین رہتے تھے تو صرف اولاد کے لئے ان کے احباب نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ عقد ثانی کر کے اپنے دامن آرزو کو گوہر مقصود سے پر کر لیں لیکن بیوی سے انھیں غیر معمولی محبت تھی وہ ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ اپنی دہ سالہ رفیق زندگی کو صدمہ پہنچا کر اپنی تمنا حاصل کریں وہ اس قسم کے مشوروں پر باوجود بیحد خلیق اور متحمل مزاج ہونے کے چیں بجبیں ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ اولاد کی آرزو اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب دوسری شادی کی جائے تو وہ چہرہ پر غصے کے آثار نمایاں کر کے کہتے، یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ میں اپنا دل خوش کرنے کی غرض سے اس غریب کو ایک دائمی اذیت میں مبتلا کر دوں۔ جو میری ذات پر سب

سے زیادہ اعتماد رکھتی ہو اور پھر اس کی کیا ضمانت ہو کہ عقد ثانی کے بعد میں صاحب اولاد ہو جاؤنگا اگر اس وقت بھی قسمت نے ساتھ نہ دیا تو میرے لئے تو دنیا جہنم ہو جائے گی۔

واقعہ یہ ہو کہ قاضی صاحب میں جملہ اوصاف انسانی بدرجہ کمال موجود تھے اور سب خوبیوں کے ساتھ قدرت نے انھیں مستقل مزاجی بھی غضب کی عطا فرمائی تھی اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کا متزلزل ہو جانا یقینی تھا لیکن یہ قاضی صاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ انھوں نے اس طرف ذرا توجہ نہ کی اور موجودہ بیوی کے ساتھ اپنے "پیمان وفا" کو کبھی سست نہ ہونے دیا۔

دنیا میں صرف استقلال ایسی چیز ہے جس سے ہر نوع کی تکالیف کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقی مسرتیں حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کو پہلے مستقل مزاج بننا چاہئے۔ قاضی صاحب کا اصول زندگی ہی یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں مستقل اور ثابت قدم رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی زندگی میں ناکامی سے وہ ہمیشہ ناواقف رہے۔ چنانچہ اس معاملہ خاص میں بھی قدرت نے ان کا ساتھ دیا۔ اور شادی کے پورے چودہ سال بعد ان کی بیوی کے بطن سے ایک نہایت خوبصورت اور تندرست بچہ پیدا ہوا جس کو "محمود حسن" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اگرچہ قاضی صاحب نے محمود کی تربیت میں نہایت بیدار مغزی اور احتیاط سے کام لیا اور اور اس میں شک نہیں کہ اگر ان کا سایہ محمود کے سر سے نہ اٹھتا تو وہ دنیا میں بہترین اوصاف کا انسان ہوتا لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ محمود کی زندگی "حیات پدر" کا جواب ہو اور اس طرح ایک بے نظیر چیز کی مثال اس کی قیمت کو کم کر دے۔

محمود ابھی آٹھ سال ہی کا تھا کہ قاضی صاحب کا انتقال ہو گیا اولاد سب سے زیادہ جس عمر میں ماں باپ کے التفات کی محتاج ہوتی ہے حقیقتاً وہی عمر ہے اس عمر میں بچہ کے اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے اور اس کا سنگ بنیاد ماں باپ ہی کے ہاتھ سے رکھا جاتا ہے اگر بنیاد کو کافی مستحکم نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ عمارت پائدار نہ ہوگی جس طرح باغ کا سرسبز پودا جس کی جڑیں زمین میں اچھی طرح پیوست نہیں ہوئیں اور جو اپنی غذا جذب کرنے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا، آلی

کی معمولی سی غفلت سے خشک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہونہار بچہ کی اخلاقی حیثیت بالکل تباہ ہو جاتی ہے اگر اس کی ابتدائی تربیت پر کافی توجہ نہ کی جائے۔

قاضی صاحب کے مرتے ہی ان کے گھر کا رنگ بدل گیا۔ گھر میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کی مسند پر بیٹھتا اور ان کا صحیح جانشین ہوتا۔ اس لئے محمود کی ماں نے اپنے بھائی کے لڑکے "بشیر حسن" کو بلا کر اپنے یہاں رکھ لیا اور کاروبار کی نگرانی اس کے سپرد کر دی۔

بشیر ابھی نوجوان تھا اگرچہ اس کی تعلیم بہت اعلیٰ نہ تھی تاہم جس اہلیت کا آدمی اس کام کے واسطے موزوں ہو سکتا تھا وہ قریب قریب اس میں موجود تھی اس نے آتے ہی تمام کاروبار تجارت پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور نہایت دانشمندی سے جملہ امور کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمدنی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی بلکہ بحیثیت مجموعی بشیر کی موجودگی سے قاضی صاحب کی تجارت کو فروغ ہو گیا۔

قاضی صاحب زیادہ تر چمڑے کی تجارت کرتے تھے چمڑے کی شناخت اور اس کی خرید و فروخت میں بشیر کو پہلے سے کافی مہارت حاصل تھی چنانچہ میرٹھ ایسے شہر میں جہاں یہ کاروبار کسی فن کے نقطۂ نگاہ سے نہیں کیا جاتا۔ بشیر بہت زیادہ کامیاب ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ بشیر قاضی صاحب کی تجارتی حیثیت کے لحاظ سے ان کا بہترین جانشین تھا لیکن دوسرے اوصاف اس میں بالکل مفقود تھے۔

خصوصاً محمود کی تربیت سے وہ مجرمانہ تغافل روا رکھتا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بشیر نے شروع ہی سے محمود کو ایک زبردست حریف سمجھا اس لئے ابتدا ہی سے یہ انتظام کیا کہ اس کی دماغی قابلیتوں پر جہالت کا پردہ پڑ جائے تاکہ وہ جوان ہو کر بھی بشیر سے بے نیاز نہ ہو چنانچہ اس نے محمود کو لہو و لعب میں مشغول کر دیا۔ تھیٹر، سنیما، رقص و سرود کی طرف اسے متوجہ کیا۔ یہ چیزیں محمود کے لئے بے انتہا جذب و کشش کا سامان رکھتی تھیں، اس کی نگاہوں میں یہ قوت نہ تھی کہ وہ ان کے تاریک پہلو تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف ظاہری سطح کو دیکھتا تھا جو ایک زبردست قوت تسخیر کی حامل تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں محمود میرٹھ کی اوباش جماعت کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ اس کی ماں نے بہت کوشش کی کہ محمود کی اصلاح ہو جائے۔ لیکن اس کی ہر کوشش بشیر کی ناپسند

امداد کی محتاج تھی اور اس کا یہ عالم تھا کہ وہ دانستہ اس معاملہ خاص میں کوتاہی کرتا تھا اور محمود کی گم کردہ راہی کو اپنے لئے نشانِ منزل سمجھتا تھا۔ محمود کی ماں جب زیادہ پریشان ہوتی تو وہ کہہ دیتا کہ محمود قاضی صاحب کی تنہا نشانی ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں اس پر سختی کروں۔ اور تکلیف پہنچا کر اس کے اخلاق کو درست کروں، یہ وہ حربہ تھا جو مخصوص طور پر ایک عورت کے جذباتِ محبت کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا اور اس کی کامیابی یقینی تھی۔

تمام کاروبار پر بشیر حاوی تھا۔ محمود کو مہینے میں بلا کسی محنت و کاوش کے اتنی رقم مل جاتی تھی جو اس کے دلچسپ مشاغل کے لئے کافی ہوتی تھی۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود مفت میں یہ دردِ سر مول لیتا اس نے اس طرف کبھی توجہ ہی نہ کی۔

محمود کی عمر کے ساتھ ساتھ بشیر کی حرص بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ محمود کا شباب اس کے لئے مایوسی و نامرادی کا وہ پیام لا رہا ہے جو ایک دن اس کو دولتمندی کی اس بلند مسند سے نیچے اتار دے گا۔ اگرچہ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ محمود کو اتنا ہوش کبھی نہ آئے گا کہ وہ اس کی عیارانہ چالوں سے آگاہ ہو۔ لیکن یہ بھی مقتضائے عقل و دانش کے خلاف تھا کہ بشیر محض اسی خیال کی بنا پر اپنے مستقبل سے غافل رہے۔

بشیر نے دوربینی کے لحاظ سے اپنا سرمایہ محفوظ کرنا شروع کیا۔ تمام نقد روپیہ اس کی تحویل میں رہتا تھا اور مہینے میں دو چار ہزار کی رقم الگ کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، بشیر کی طمع اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے اعتدال سے کام لینا بھی چھوڑ دیا اور وہ بڑی بڑی رقموں پر غاصبانہ نگاہیں ڈالنے لگا جس کا انجام یہ ہوا کہ سرمایہ کم ہونے لگا جس کے باعث تجارت میں بھی انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے۔ رفتہ رفتہ بشیر کی تجارت بالکل گر گئی اور وہ اپنی ساکھ قائم نہ رکھ سکا بعض مطالبوں میں قاضی صاحب کے چند مکانات بھی قرق ہو گئے۔ آخر میں مجبوراً بشیر نے ایک دیوالیے کی حیثیت سے اپنا کاروبار بند کر دیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ بشیر اپنا دامن بچا کر محمود سے جدا ہو جائے چنانچہ اس نے محمود کی ماں سے کہا کہ یہ کام اب میرے بس کا نہیں جب تک ہو سکا میں نے

آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ اب میں قطعاً مجبور ہوں، روپیہ میرے پاس بالکل نہیں ہے قرض خواہ ہر طرف سے مجھ پر زغہ کر رہے ہیں۔ دوکان کو بند ہوئے آج ایک ہفتہ ہو گیا۔ میں کسی صورت سے آپ کے یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں آپ کے پاس جس قدر نقد سرمایہ ہو اس کو محفوظ کر لیجئے اور غیر منقولہ جائداد کو فروخت کر کے قرض ادا کرنے کی تدبیر کیجئے۔ اس بعد جو کچھ بچے اس کو اپنے مصارف اور گذر اوقات کی غرض سے اپنے قبضے میں رکھئے تاکہ محمود کو اس پر دست درازی کا موقعہ نہ ملے۔

محمود کی شادی ہو چکی تھی، مگر اس سے اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار انقلاب نہ ہوا تھا۔ بلکہ ناپاک صحبتوں کے اثر سے وہ بادۂ ناب" کے جرعۂ تلخ کو بھی سرمایۂ نشاط تصور کرنے لگا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی فضول خرچیاں حد سے تجاوز ہو چکی تھیں، آتش سیال کی پرستش کے واسطے جس ماحول کی ضرورت ہے وہ محمود نے پیدا کر لیا تھا۔ اس کے گھر میں ہر وقت ایک ہنگامۂ رقص و سرود اور محشر نا و نوش بپا رہتا تھا اس کی ماں نے بہت سعی کی کہ محمود کے سر سے یہ سودا نکل جائے اور وہ اس خطرناک وادی سے نکل کر منزل حیات کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو لیکن جس دماغ میں بیابان کا مفہوم "چمنستان عشرت" اور بربادی کا ترجمہ نشاط زندگی" ہو اس پیکر جنون و جہالت کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ اگرچہ وہ غریب اپنے مقصد اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن اپنی جان اس نے اس کے نذر کر دی۔

ماں کے مرنے پر گھر کے سب اختیارات محمود کو حاصل ہو گئے۔ اس کی بیوی "ربیعہ" میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ شوہر کی بگڑی پر زبان اعتراض دراز کر سکے۔ اس کو اب نہ مخلت کی تلخ گفتاریوں کا اندیشہ تھا نہ ناصحانہ جھڑکیوں کا خوف۔ وہ گھر میں بھی آزاد تھا باہر بھی آزاد تو ربیعہ چونکہ بالکل تنہا رہ گئی تھی اس کی غمگسار ساس باقی نہ تھی کہ اپنی مشفقانہ باتوں سے اس کا غم غلط کرتی رہے اس لئے وہ محمود سے اجازت لے کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ جو پنجاب میں کسی جگہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ربیعہ کے جاتے ہی محمود اور زیادہ بے لگام ہو گیا گھر بھی

اس پر بظاہر ربیعہ کا کوئی اثر نہ تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ بعض چیزوں کو خاص اس کی ملک سمجھتا تھا۔ اب ان سب پر وہ قابض ہو گیا۔ اس میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو اس کے مقصد میں خاص طور پر مفید ثابت ہوئیں، رفتہ رفتہ وہ وقت آیا کہ محمود نے باپ دادا کی ہر چیز کو قربانگاہ عیش پر بھینٹ چڑھا دیا پہلے غیر منقولہ جائداد، پھر گھر کا قیمتی اسباب، اس کے بعد سکونتی مکان، اور سب سے آخر میں محمود نے اپنی غیرت و حمیت ان تباہ کاریوں کی نذر کی۔ قرض کی وہ معمولی معمولی رقمیں جو اس نے شراب کے خالی پیالوں کو پُر کرنے اور آغوش تہی کو کامیاب مدعا بنانے کی غرض سے ساہوکاروں سے حاصل کی تھیں، بتدریج بڑھتے بڑھتے ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ محمود گھر سے بے گھر ہوا اور اس کے پاس پہننے کے کپڑے تک نہ رہے۔

ربیعہ جس دن سے گئی تھی، محمود نے اس کو پوچھا تک نہ تھا گو کہ وہ محمود کے لئے تڑپ رہی تھی، مگر اس کے شبستان عیش میں ربیعہ کے واسطے کوئی گنجائش نہ تھی۔

جب محمود کی جائداد نیلام ہو گئی، اس کا سارا سامان فروخت ہو گیا تو اس کے حواس درست ہوئے اور آنکھیں کھل گئیں لیکن اب سوائے منہ چھپا کر فرار ہو جانے کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ممکن تھا کہ ربیعہ سے اس کو کچھ امداد مل جاتی، لیکن جس بیوی کو کبھی محبت کی نظر سے نہ دیکھا تھا ضرورت کے وقت اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا اُسے گوارا نہ تھا۔

عرصۂ حیات محمود پر تنگ تھا مگر موت کو اس کے وجود سے نفرت تھی، وہ ہفتوں تک دیوانہ وار جنگلوں میں پھرتا رہا۔ مگر یہاں بھی اس کی سوزش قلب کا کوئی علاج نہ تھا بالآخر مجبور ہو کر اس نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ اس نے دہلی کے راستے پر پیدل چلنا شروع کیا اور جس دن وہ دہلی کی آبادی میں داخل ہوا ہے دو وقت کا بھوکا تھا۔

وہ صبح چار بجے دہلی پہنچ گیا تھا یہ وہ وقت تھا جب محمود دہلی کے دوران قیام میں پارسی تھیٹریکل کمپنی میں رات بھر دل بہلانے کے بعد قیمتی موٹر میں سوار ہو کر امپیریل ہوٹل کی طرف روانہ ہوا کرتا تھا جس ہوٹل میں وہ پوری شان امارت کے ساتھ داخل ہونے کا عادی تھا اور جس کے اسٹیشن

پر متعدد موٹریں ہیسیوں، احباب اس کے خیر مقدم کی رسم ادا کرنے جمع ہوا کرتے تھے آج وہ میلے پرانے لباس میں نہایت بیکسی کے ساتھ اس میں داخل ہو رہا تھا اور کتوں کی خوفناک آوازیں اس کے استقبال میں بلند ہو رہی تھیں۔

وہ دن بھر شہر کے کم آباد محلوں میں پھرتا رہا شام کو بھوک سے اس کا بُرا حال ہو گیا، پورے چار وقت سے اس کے پیٹ میں کوئی چیز غذا کی قسم سے نہ پہنچی تھی اس کے ہاتھ پیروں کی رگیں کھنچ رہی تھیں، معدے سے شعلے بلند ہو رہے تھے جن کی حدت سے زبان بالکل سوکھ گئی تھی۔ انسان ہر تکلیف میں تھوڑا بہت صبر کر لیتا ہے مگر بھوک سے خدا پناہ میں رکھے جو زبردست سے زبردست آدمی کو نہایت ذلیل کارروائیوں پر آمادہ کر دیتی ہے۔

مزدوری سے محمود کو عار نہ تھا، کیونکہ اس شغلے کو وہ اپنی آئندہ زندگی کا سہارا بنا چکا تھا لیکن اس کا وقت تھا نہ طاقت! مجبوراً صرف ایک وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے اس نے دنیا کے ذلیل ترین پیشے "گداگری" پر اعتماد کیا۔

(۳)

محمود نے صاحب خانہ کے کہنے سننے پر وہ رات وہیں بسر کی لیکن یہ طے کر لیا کہ بہت سویرے کسی کو اطلاع کئے بغیر ہی چلا جاؤں گا۔ اس کا میزبان نفسیات انسانی سے باخبر تھا۔ وہ محمود کی صورت دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ آدمی شریف مگر مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے اب اس کی باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ اس کی غیرت اجازت نہیں دیتی کہ وہ دن کی روشنی میں اپنے آپ کو ایک معمولی گداگر کی صورت میں ظاہر کرے، چنانچہ اس نے محمود کو زیادہ مجبور نہ کیا۔

محمود صبح چار بجے کے قریب بیدار ہوا تو دیکھا کہ پلنگ کی برابر میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی ہے جس پر کشتی میں کھانا اور چائے رکھی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں میزبان کا شکریہ ادا کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ چلنے پر آمادہ ہوا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی جیب میں غیر معمولی وزن کا احساس کیا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پچاس روپے کاغذ

ایک پڑیہ میں بندھے ہوئے جیب میں پڑے ہیں۔ اب اس کا ارادہ ہوا کہ اپنے مخیر میزبان کا شکریہ ادا کر کے یہ روپیہ اس کو واپس کر دے۔ مگر جس کاغذ میں روپیہ لپٹا ہوا تھا اس پر لکھا تھا۔

" امید ہے آپ یہ روپے قبول کر لیں گے اور اب تو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کیونکہ اتفاقاً آج میں بھی بارہ بجے شب کو رنگون روانہ ہو رہا ہوں، اب میری روانگی کا وقت آگیا اور میں جا رہا ہوں۔ گھر پر ایک فراش کے علاوہ کوئی نہیں ہے یہی آپ کے ناشتے کا انتظام کرے گا۔ اس کو روپیہ واپس کرنا ایسا ہی ہے جیسے کنوئیں میں ڈال دینا۔ بہرحال آپ کسی صورت سے روپیہ مجھ تک نہیں بھیج سکتے، ایسی حالت میں بہتر ہے کہ آپ اس کو بلا پس و پیش قبول کر لیں۔"

اگرچہ محمود نے صرف ایک وقت کی روٹی کے لئے فقیرانہ ہیئت اختیار کی تھی اس کی ہمت یہ تھی کہ وہ اس پیشے کا پھر کبھی نام نہ لے۔ لیکن اب یہ روپیہ بھی چار و ناچار اس کو لینا ہی پڑا۔ اس مکان سے نکلتے ہی اس نے اپنے ارادے میں بلندی محسوس کی اور قلب میں جوش عمل کا امنڈتا ہوا دریا اسے نظر آیا۔ وہ پہلے تو دن نکلنے کے انتظار میں ادھر اُدھر پھرتا رہا پھر بازار پہنچ کر اس نے چالیس روپے کے جوتے خرید کئے اور وہاں سے سیدھا اسٹیشن گیا۔ جہاں دو گھنٹے قیام کر کے اس نے اپنے لئے ایک مقصد زندگی اور ایک شاہراہ عمل تجویز کی۔

چالیس روپیہ کا سرمایہ بظاہر کچھ بھی نہ تھا مگر قوی ارادہ اور ولولۂ عمل ایک ایسی چیز ہے جو ذرے کو پہاڑ بنا دینے کی زبردست طاقت رکھتی ہے، محمود نشۂ عمل سے سرشار تھا، ارادے کی شراب کا خمار اس کے دماغ میں قوت پیدا کر رہا تھا۔ اور وہ ان حالات میں کامیابی کے بہت قریب ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے طے کر لیا کہ میں یہاں سے بمبئی جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر اپنی تجارت کو فروغ دوں گا، ہر چند سرمایہ میرے پاس نہیں لیکن جو ارادے بے سروسامانی کے عالم میں قائم کئے جاتے ہیں وہ اکثر کامیاب ہوئے ہیں، میں کہ برگ و نوا سے فائدہ نہ اٹھا سکا یقیناً بے نوائی

اور بے سروسامانی مجھے راس آئے گی۔

بمبئی میں ایک ہفتے کے اندر ہی اس کے سب جوتے فروخت ہو گئے جس کے بعد اس کو نوے روپئے حاصل ہوئے دہلی میں جس دوکان سے محمود نے جوتے خرید کئے تھے اس سے یہ قرارداد ہو گئی تھی کہ آئندہ اگر ضرورت ہوئی تو اسی نرخ پر وہ جس جگہ سے چاہے گا مال طلب کر سکے گا چنانچہ اس نے یہ روپیہ اس دوکان کو بھیج کر استدعا کی کہ مال فوراً بھیج دیا جائے۔ اب اس نے بمبئی کی ایک دوکان پر ۸ روپیہ پر مزدوری شروع کر دی۔ بارہ دن کے بعد جب پارسل وصول ہوا تو وہ مزدوری سے چھ روپئے پیدا کر چکا تھا جس میں سے چار روپئے نقد اس کی جیب میں موجود تھے۔ اس نے مزدوری برابر جاری رکھی، صرف شام کو تین چار گھنٹے کے لئے وہ کسی اچھی جگہ اپنی دوکان لے کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اتنے وقت میں جو کچھ فروخت ہوتا تھا اس کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھتا تھا اور مزدوری کے سلسلے میں اپنے کھانے پینے کے مصارف پورے کرتا تھا۔

چونکہ بمبئی میں دہلی کے جوتوں کی یہ پہلی دوکان تھی لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود کا یہ کاروبار اتنے بڑے شہر میں فروغ نہ پاتا۔ ایک سال کے ہیر پھیر میں محمود نے ہزاروں روپئے پیدا کر لئے اس نے شہر کے ایک بڑے بازار میں ایک شاندار دوکان کھول دی، اور اب کثرت سے دہلی کے جوتے اس کے یہاں موجود رہتے ہیں جن کو وہ ہندوستان کے باہر بھی مصر، سوڈان، افریقہ وغیرہ بھیجتا رہتا ہے، اس نے اسی کے ساتھ کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی ہے جس میں اس کو کافی منافع ہوتا ہے۔

اگرچہ محمود بظاہر بہت مطمئن ہے اور اس کی حیثیت اب اس قدر مضبوط ہو گئی ہے کہ اس کو اس طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ ہر وقت کسی خیال میں محو رہتا ہے وہ اقتصادی جنگ میں جتنا کامیاب ہو رہا ہے دماغی کشمکش میں اتنا ہی مغلوب ہوتا جا رہا ہے وہ ربیعہ کی مفارقت کو اپنے لئے نہایت تکلیف دہ خیال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے میزبان کا قرض ادا کرنے کی اُسے سب سے زیادہ فکر ہے۔

حقیقتاً ان ہی وجوہ سے وہ ہر وقت پریشان اور مضطرب رہتا ہے بظاہر اس کو جس قدر اطمینان ہے اتنا ہی وہ دل میں بے چین ہے۔

(۴)

محمود کے لئے ربیعہ کا بلا لینا کچھ دشوار نہ تھا، وہ اگر معمولی طور پر بھی اُسے یاد کرتا تو ربیعہ ایسی عورت نہ تھی کہ محمود کی بدسلوکی کا انتقام لیتی، وہ بوئے گل کی طرح اگر محمود کی زندگی کے چمن سے جدا ہو گئی تھی تو "عروسِ بہار" بن کر واپس بھی آسکتی تھی۔

ہر چند پانی کی گستاخ موجیں "کنول کے پھول" کو ایک لمحہ چین لینے نہیں دیتیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ موجوں کے ان تھپیڑوں سے متاثر ہو کر تالاب سے بے وفائی کرے، وہ جھیل ہی میں کھلتا ہے اور وہیں مرجھا کر اپنی شگفتگی سے خوش ہونے والے پانی میں فنا ہو جاتا ہے۔

ربیعہ بھی محمود ہی کو اپنی کشتیِ حیات کا ناخدا سمجھتی تھی اور محمود کی بے التفاتی کو اپنی موت سے تعبیر کرتی تھی، لیکن محمود کے لئے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ وہ ربیعہ سے بے انتہا شرمندہ تھا اس لئے اس کو بلانے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی، جس زمانے میں محمود میرٹھ میں مقیم تھا اور اس کے پاس کافی سرمایہ تھا اس کو اطلاع دی گئی تھی کہ ربیعہ کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا ہے آکر دیکھ جاؤ۔ مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ کی تھی، اس کے بعد بیماری کے حیلے سے بھی اُسے بلایا گیا مگر محمود نہ گیا۔

ان حالات میں اُسے ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی اُس بیوی کو جس کا قلب اس کی بے اعتنائی سے مجروح ہے دعوتِ التفات دے۔ مگر یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ بیوی اور بچے کو بھول جائے۔

اس نے ایک دن ربیعہ کو اپنے تمام حالات قلمبند کر کے بھیج دیئے یہ بھی لکھ دیا کہ میں نے محض شرم کی وجہ سے تمھیں نہیں بلایا اگر تمھیں باوجود میری بد اخلاقی کے مجھ پر رحم آسکتا ہو تو پچھلی باتوں کو ایک بدبخت انسان کی بکواس اور بیمار آدمی کا ہذیان سمجھ کر بھلا دو۔ اور خدا کے لئے میرے نورِ عین کو لے کر چلی آؤ۔ میرے کاشانۂ حیات کا دروازہ تمھارے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے اور صرف تمھاری میرے گھر میں کمی ہے۔ خط لکھنے کے دسویں روز محمود کو تار سے اطلاع دی گئی کہ ربیعہ بمبئی روانہ ہو چکی ہے۔ اسٹیشن پہ

سواری کا انتظام کر دو۔

محمود وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا، پنجاب میل کے بمبئی اسٹیشن پر رکتے ہی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کھڑکی سے سر نکال کر زور سے کہا "مسٹر محمود"۔ اس آواز کی صدائے بازگشت ابھی فضا میں گونج رہی تھی کہ محمود دوڑ کر زنانے ڈبے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے ربیعہ کے ساتھ آنے والے آدمی کو غور سے دیکھ کر معلوم کیا کہ یہ اس کا وہ مخیر میزبان ہے جس کے دروازے پر اس نے اپنا طویل روزہ افطار کیا تھا۔

یہ بھی ایک اتفاقی بات تھی کہ عارف نے معمولی توقف کے بعد محمود کو پہچان لیا۔ ربیعہ نے محمود کو دیکھتے ہی عارف کو اشارے سے بتایا کہ یہی محمود ہیں تو عارف پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی، ان کے حافظے میں محمود کی دو سال قبل کی ہیئت اس طرح محفوظ تھی جیسے کوئی ہوشیار مصور آئینے پر تصویر بنا دیتا ہے۔ ممکن تھا کہ عارف اس کو اپنے ذہن و دماغ کا ایک مغالطہ سمجھے لیکن جب محمود نے بھی ان کو متعارفانہ نگاہوں سے دیکھ کر ان کا خیر مقدم کیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے خیال کو غلط سمجھتے۔

عارف محمود کے کاروبار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس قدر جلد ترقی کرنے پر انھوں نے بہت تحسین کی جس کا محمود نے ادب کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور پھر پچاس روپیہ کا نوٹ پیش کر کے عارف سے کہا کہ اب اپنا یہ عطیہ واپس کر لیجیے۔

عارف نے کہا میں اس معاملے میں ربیعہ کی اجازت کا پابند ہوں کیونکہ جس رقم سے یہ روپیہ آپ کو دیا گیا تھا اس میں میرے علاوہ ربیعہ اور ان کے بھائی بھی شریک تھے۔ ہم تینوں کے مشترک سرمایہ سے تجارت ہوتی تھی اور جس روز آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے۔ اسی دن مجھے بھی "نمک" کی تجارت میں پندرہ ہزار کا نفع ہوا تھا۔ اسی منافع سے میں نے اپنی ذمہ داری پر پچاس روپئے تم کو دیئے تھے لیکن اب یہ روپیہ خیرات کی مد میں درج ہو چکا ہے۔ میں اس کو کسی طرح اپنے اختیار سے واپس نہیں لے سکتا۔ اور نہ ایک سائل کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دو سال کے بعد کسی

عطیہ اُسے واپس کرے۔

جب ربیعہ کے سامنے یہ قصہ بیان کیا گیا تو محمود نے اس کی پوری تفصیل بھی اُسے سنادی
ں کو سن کر ربیعہ بہت روئی، آخر میں یہ روپیہ غربا کو تقسیم کر دیا گیا۔ اور اس طرح محمود اپنے سر سے ایک
جھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہوا۔

ربیعہ کے بمبئی آنے کے بعد محمود نے ایک اخبار میں پڑھا کہ جو شخص بشیر حسن ساکن میرٹھ کے
رثا کا پتہ بتائے گا ان کو پانچسو روپے انعام دیا جائے گا چونکہ اعلان گورنمنٹ کی طرف سے تھا،
س لئے محمود نے فوراً بشیر کے ساتھ اپنی قرابت کی اطلاع اُس پتے پر دے دی جو اعلان کے
نیچے درج تھا وہ حیران تھا کہ بشیر کے ورثا اور اعزہ کو کیوں تلاش کیا جا رہا ہے۔ ایک مہینے کے
عد جواب آیا کہ بشیر حسن نے ایک معقول جائداد اپنی اولاد کے لئے وقف کی تھی لیکن اس کا تمام
اندان وبائے طاعون میں تباہ ہو گیا اس لئے جستجو کی جا رہی ہے کہ اس خاندان کا کوئی فرد
زندہ موجود ہو تو وقف کی آمدنی اس کے نام منتقل کی جائے ورنہ وقف عامہ میں شامل کر دی جائے۔
دور کے دو عزیزوں کے نام پہلے دریافت ہو چکے ہیں لیکن آپ بہت قریب کے عزیز ہیں لہذا آپ
کو منجملہ پانچسو روپیہ ماہوار کے تین سو روپیہ ماہانہ ملا کریں گے، دو سو روپیے دوسرے اعزہ کو دئیے
جائیں گے، بشرطیکہ انھوں نے اپنا حق قرابت ثابت کر دیا۔

چونکہ آخر میں بعض کارروائیوں سے اور اپنے خیر خواہوں کے کہنے سننے سے محمود پر
بشیر کی عیاریاں منکشف ہو چکی تھیں اس لئے اس روپے کو اس نے بشیر کا عطیہ خیال نہ کیا بلکہ ایک
مہلک غفلت کے بعد اپنی "بیداری کا انعام" سمجھ کر قبول کرلیا۔

غزلیات

از حضرت جگر مرادآبادی

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ وار
بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا

ہاں سنبھلے، اے خدائے عشق اے توفیق غم
پھر زبانِ بے ادب پر ذکر یار آ ہی گیا

جب نگاہیں اٹھ گئیں۔ اللہ ری معراج شوق
دیکھتا کیا ہوں، وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

ہائے کافر دل کی۔ یہ کافر جنوں انگیزیاں
تم کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

درد نے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے
دفعتاً پردہ اٹھا اور پردہ دار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

کس نظر سے آج وہ دیکھا کیا
دل مرا ڈوبا کیا اچھلا کیا

حسن سے بھی دل کو بے پروا کیا
کیا کیا اے عشق تو نے کیا کیا

تو نے سو سو رنگ سے پردا کیا
دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا

وہ بھی نکلی اک شعاعِ برقِ حسن
میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا

لذت ناکامیابی۔ الاماں
تو نے ہر امروز کو فردا کیا

اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار
اس نے بھی انداز دل پیدا کیا

خون دل۔ خون تمنا۔ خون شوق
آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں
میں نے صحرا کو جگر صحرا کیا

تنقید و تبصرہ

کتب:

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن ۔ مانی الاسلام ۔ نقش و نگار ۔ کامیاب مطالعہ

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن | مؤلفہ مولوی سید ممتاز علی صاحب دیوبندی۔ بڑی تقطیع کاغذ دبیز۔ ہر حصہ مجلد، لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی۔ قیمت حصہ اول ہے؍۔ دوم للعہ؍، سوم ہے؍، چہارم للعہ؍

ملنے کا پتہ: دارالاشاعت پنجاب لاہور۔

اس کتاب کے اب تک چار حصے بغرض تنقید موصول ہوئے ہیں، پوری کتاب آٹھ حصوں میں ہے جن میں سے دو زیر طبع ہیں اور دو زیر تالیف۔

مؤلف نے اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات کو بہ ترتیب موضوع و عنوان فراہم کیا ہے۔ اس طرح پر قرآن کو اول سے پڑھنا شروع کیا۔ ہر ہر آیت جس جس موضوع کے تحت میں آسکتی ہے یا جس جس موضوع کے تحت میں آنی مناسب ہو اس اُس کے تحت میں لکھی گئی۔ جو اُن موضوعوں کے تحت میں نہیں آسکی اس کے لئے ایک نیا موضوع یا عنوان قائم کیا گیا اور اس کے ذیل میں لکھی گئی۔ یہ انتخاب قرآن مجید کی ہر آیت کے متعلق کیا گیا۔ یہاں تک کہ جملہ آیات مضمون وار مرتب ہوگئیں۔ اس مجموعے کی ضخامت قرآن مجید سے زیادہ ہوگئی اور ہونی بھی چاہئے تھی کیونکہ ہر آیت کم سے کم ایک بار تو ضرور کسی موضوع کے تحت میں آئی اور بہت سی آیتیں جن میں مختلف پہلو نکلتے ہیں مختلف عنوانوں کے تحت میں دو دو یا تین تین بار آئیں۔

یہ چاروں حصے ہم نے مطالعہ کئے۔ اس سے قبل مولوی عبیداللہ صاحب کی اقتباس الانوار اور مولانا وحیدالزمان کی تبویب القرآن بھی ہماری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں یہ کتاب بہت زیادہ مفید اور کارآمد اور اپنے مقصد کو پورا کرنے والی ہے۔

درحقیقت ایک عرصے سے طالبان قرآن اس ضرورت کو نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ آیات قرآنی بترتیب مضامین مرتب کی جائیں جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی یا اردو میں حقائق قرآنی سمجھانے سے قاطبۃً قاصر ہیں کیونکہ وہ ایک ایک آیت

کی تشریح کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور بہت کم ان حقائق سے بحث کرتی ہیں جن کا وہ آیت ایک حصہ ہوتی ہے۔ صورت یہ ہے کہ قرآن میں ایک حقیقت کی تعلیم ایک آیت میں شروع ہوتی ہے دوسری جگہ کسی سورۃ میں اس پر کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ پھر تیسرے مقام پر کوئی استثنا یا قید یا شرط بڑھائی جاتی ہے پھر کہیں تکمیل یا تتمہ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مسئلہ قرآن کے مختلف مقامات میں پھیلا ہوتا ہے۔ اس کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے ان جملہ آیات کو ایک جگہ فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ مکمل حقیقت ذہن میں آسکے۔ اس لئے علوم قرآن تفاسیر میں نہیں ہیں بلکہ خود قرآن میں ہیں اور آیات کو آیات کے ساتھ ملانے سے وہ سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اسی ضرورت سے قرآنی آیات کی تبویب شروع کی جن میں سے اب تک سب سے بڑی اور بکار آمد کوشش یہ کتاب ہے جو زیر تنقید ہے۔ اس کا پہلا حصہ کتاب العقائد ہے جس میں اللہ کی ذات وصفات اور اس کے افعال کے متعلق آیات ہیں۔ دوسرا حصہ کتاب الاحکام ہے جس میں فقہی احکام کی آیات جمع کی گئی ہیں۔

تیسرا حصہ کتاب الرسالۃ ہے جس میں قرآن اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے متعلق جملہ آیات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھے حصے میں جس کا نام کتاب المعاد ہے قیامت اور اس کے متعلقات کی آیات ہیں۔

کتاب میں پہلے ہر موضوع بطور عنوان کے اوپر لکھا گیا ہے۔ پھر اس کے تحت میں متعدد ضمنی سرخیاں حاشیے میں قائم کی گئی ہیں۔ پھر اس کے ذیل میں آیات نقل کی گئی ہیں جن کا شمار اوپر اور سورۃ کا شمار نیچے دیا گیا ہے۔ اس کا حوالہ دیکھنے کے لئے وہ قرآن درکار ہے جس میں ہر آیت کا شمار لکھا ہوا ہو۔

یہاں ضمناً مجھے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ارباب مطابع جو قرآن چھاپتے ہیں ان کو چاہئے کہ آیات کے اندر ان کے شمار بھی ضرور لکھا دیا کریں۔ اس میں ان کے لئے کوئی دقت نہیں ہے اور بڑی آسانی سے وہ اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں کیونکہ صرف ہندسہ ہی لکھنا تو ہے۔

مؤلف کی محنت جانکاہی اور ان کے خلوص کی قدر کرتے ہوئے میں اس کتاب کے نقائص اور خامیوں کی طرف بھی ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ کتاب ابھی زیر ترتیب ہے اور مؤلف نے لکھا بھی ہے کہ احباب جو مشورہ دیں گے ان پر میں کاربند ہوں گا۔ اس لئے ممکن ہے کہ میرے مشورے کچھ مفید ثابت ہو سکیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مولف نے عنوانات کی ترتیب کسی علمی اصول پر نہیں رکھی۔ پہلے حصے کا نام انھوں نے کتاب العقائد رکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جملہ عقائد کے متعلق آیات

دں گی مگر صرف اللہ کی وجود کے اثبات اور اس کے صفات ہی پر یہ حصہ ختم ہوجاتا ہے اور دوسرا حصہ کلام فقہیہ کے متعلق شروع ہوجاتا ہے۔ پھر تیسرا حصہ کتاب الرسالۃ ہے یعنی رسول اور کتاب جو عقائد یں سے ہیں احکام کے بعد آتے ہیں علیٰ ہذا چوتھا حصہ معاد بھی عقائد ہی کا حصہ ہے۔ ملائکہ کا کوئی عنوان ہیں قائم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں ایک باب آخر میں قضاء وقدر کے متعلق ہے اور پھر وہی باب بجنسہ کتاب الاحکام یعنی دوسرے حصے میں دہرایا گیا ہے۔ یہ بہت بڑی غفلت ہے۔

ذات الٰہی کے متعلق کوئی عنوان نہیں قائم کیا گیا حالانکہ قرآن میں اس کے متعلق جملہ آسمانی کتب سے زیادہ تعلیمات موجود ہیں۔ علم جو صفات الٰہی میں سے ایک نہایت ممتاز صفت ہے اس کو ذیلی سرخیوں میں لکھا گیا ہے اور علم غیب جو علم مطلق کی ایک فرع ہے زیب عنوان ہے۔ نعمتوں کے بیان میں آیات کے استیعاب کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں شرک کے ذیل میں ہے۔ "مشرکوں کے اعمال اکارت ہیں" اور ارتداد کے تحت میں ہے "مرتدوں کے اعمال رائگاں ہیں" لیکن کفر کے تحت میں اس سرخی کو چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ آیات موجود ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں ہے الذین کفروا اعمالہم کرماد الآیہ سورۂ نور میں ہے الذین کفروا اعمالہم کسراب الآیہ معلوم نہیں یہ آیات کس ذیل میں لکھی گئی ہیں۔

تیسرے حصے میں کتب سماوی میں سے قرآن۔ تورات اور انجیل کے ذکر کے ساتھ زبور اور صحف ابراہیم وغیرہ کا بھی ذکر لازم تھا۔

شق القمر والی آیت پیش گوئیوں میں بھی درج ہے اور علامات قیامت میں بھی۔ ایسی صورت میں ایک ہی معنی کا تعین لازمی تھا۔ کوئی آیت قرآن کی دو مختلف معنوں میں لینا صحیح نہیں۔ یہی معاملہ الذین آتیناہم الکتاب یعرفونہ الآیہ کے متعلق کیا گیا ہے حصہ دوم صفحہ ۱۳۱ میں یہی آیت کعبے کے بارے میں ہے اور حصہ سوم صفحہ ۲۷ میں یہی آیت رسول کے متعلق ہے۔ حالانکہ اس کا مفہوم ایک ہی ہوسکتا ہے علاوہ بریں اسی مضمون کی دوسری آیت جو سورہ انعام میں ہے یعنی الذین آتیناہم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم الذین خسروا انفسہم فہم لا یومنون۔ یہ نہ کعبے کے متعلق ہے نہ رسول کے ذیل میں ہے نہ قرآن کے۔

سورۂ ص کی آیت "کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب" قرآن مبارک کتاب ہے کی سرخی میں درج کی گئی ہے حالانکہ اس کو مقاصد قرآن کے تحت میں بھی درج کرنا لازم تھا۔

رسول اللہ کی شان میں سورۂ والضحیٰ کو نقل کرنا اور اس میں آیت ووجدک ضالاً فہدیٰ کو حذف کردینا خیانت مجرمانہ ہے کیونکہ اس میں اللہ نے ایک حقیقت بیان کی ہے جو کسی دوسری آیت سے نہیں مل سکتی۔

چوتھا حصہ کتاب المعاد ہے۔ اس سے پہلے عالم برزخ ہونا چاہئے تھا جس کے متعلق قرآن میں تعلیمات بھری پڑی ہیں۔ معاد میں نفخ صور بار اول اور نفخ صور بار دوم کے الگ الگ عنوانات قائم کئے ہیں۔ لیکن پہلے کی آیات دوسرے میں اور دوسرے کی آیات پہلے میں خلط ملط کر دی ہیں۔ نفخ صور بار اول میں آیت ۶۹/۳۹ یعنی واشرقت الارض بنور ربہا درج کی ہے حالانکہ خود قرآن میں اس آیت کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے کہ یہ نفخ صور دوم کے تحت میں ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۶۴ کی ساتوں آیتیں نیز آیت ۹۲/۱۸ جو نفخ دوم میں درج ہوئی ہیں نفخ اول کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الساعہ اور القیامہ دونوں کی آیتوں میں لوگوں نے بہت غلطیاں کی ہیں۔ خاصکر اس وجہ سے بھی کہ الساعہ کہیں کہیں القیامہ کے معنی میں بھی آگیا ہے جس کو وہ تمیز نہیں کرسکے۔ اس لئے اس میں نہایت غائر نظر ڈال کر امتیاز کرنا چاہئے تھا۔

یہ نقائص اس لئے میں نے دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ آئندہ حصوں نیز آئندہ اشاعت میں ان کی اصلاح کی جائے تاکہ یہ کتاب زیادہ مفید ہوسکے۔ ورنہ اس کتاب کی خوبی اور مؤلف کی محنت کو میں نہایت قابل قدر سمجھتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت قرآن کے صلہ میں اللہ ان کو دین اور دنیا دونوں میں کامیاب کرے گا۔

مانی الاسلام | مصنفہ مولنا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر دیانات وادبیات اسلامیہ کالج لاہور۔ تقطیع ۲۲×۲۰ حصہ اول ضخامت ۱۱۰ صفحے قیمت عہ حصہ دوم ضخامت ۴۸۰ صفحے قیمت عہ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ غالباً مصنف سے مل سکے گی۔

مولانا روحی صاحب نے اس کتاب میں مذہب کے جملہ جہات عقائد و اعمال پر بسط و تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور نہایت شستہ عبارت میں فلسفیانہ طریق پر مذہب جمہور یعنی اہل سنت کی حمایت کی ہے بلکہ حمایت کا حق ادا کردیا ہے۔ چونکہ ایک مدت سے وہ عقائد و دیانات اسلامی کے معلم رہے ہیں اس لئے ان کی بحثیں نہایت غور و خوض اور کافی عرصے کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش نظر ان جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو رکھا ہے جو مذہب سے ناواقفی کی وجہ سے اس کی تعلیمات پر اعتراض یا اس سے اعراض کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عقائد و مسائل کے اثبات میں فلسفیانہ استدلال کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جابجا اسلامی مسائل میں انھوں نے سرسید کی غلطیاں دکھائی ہیں اور [illegible]

بااعتقاد تیا پیدا کو جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

اس سے پہلے اسی قسم کی ایک کتاب مولوی عبدالقیوم صاحب وکیل جالندھر نے "دین کامل" کے نام سے لکھی ہے جس کے اوپر جامعہ کے صفحات میں تنقید ہو چکی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ طریقہ دین حق کو سمجھانے کا نظری ہے جو اس کو فلسفیانہ بحثوں میں الجھا کر بہت کچھ شکوک پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ علماء سلف نے اس استدلالی طریق کو عقیم اور بے نتیجہ اسی وجہ سے قرار دیا ہے کہ اس سے نہ کسی کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے نہ اذعان اور یقین پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً معجزہ انبیاء کی تصدیق کی حجت ہوتا ہے مگر جب معجزہ خود ہی اپنے ثبوت میں مولانا روحی کے پچاس صفحوں کے استدلال کا محتاج ہو تو وہ کیونکر دلیل نبوت کہا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اس کتاب کے سرورق پر یہ آیت لکھی ہے "افلا یتدبرون القرآن" اس سے مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ اپنی اس کتاب میں وہ غالباً قرآن کی تعلیمات بیان کریں گے مگر کتاب پڑھنے سے معلوم ہوا کہ عوام مسلمانوں کے عقائد فلسفیانہ لباس میں جلوہ گر کئے گئے ہیں۔ جہاں فلسفہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے وہاں بزرگوں، صوفیوں اور بالخصوص شعراء کے اقوال سے اس کی تلافی کی جاتی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کا حریف مخاطب ان لوگوں کو حجت تسلیم کرے۔

سوال قبر روح اور بدن ہر دو سے پر سماع میت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر علماء اور بزرگوں کے اقوال سے مولانا نے شہادتیں پیش کی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ سماع میت پر حضرت عائشہ ام المومنین رضؓ کے استدلال قرآنی کی انھوں نے تردید کی ہے کہ آیت میں اسماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو قرآن میں بہت سی آیتیں سماع کی نفی پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً

والذین تدعون من دونہ مایملکون من قطمیر — جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے

ان تدعوہم لا یسمعوا دعائکم الآیہ

اہل شرک اللہ کے ماسوا جن لوگوں کو پکارتے تھے ان میں مردہ بزرگ اولیاء بلکہ انبیاء وغیرہ سبھی ہیں۔ ان کی نسبت تصریح ہے کہ وہ نہیں سنتے۔ ایسی صورت میں اگر قرآن اور حدیث میں تعارض ہے تو محفوظ طریقہ یہ ہے کہ حدیث میں تاویل کی جائے نہ کہ قرآن میں۔

اسی طرح ایصال ثواب کے مسئلے میں بھی انھوں نے قرآن کے خلاف فیصلہ کیا ہے جو یہ تصریح کرتا ہے کہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" اور "ہل تجزون الا ما کنتم تعملون"

مہدی کی آمد کا عقیدہ جس کا اشارہ بھی قرآن میں نہیں ہے اور جو حدیثیں اس کے متعلق ہیں وہ

بہ تحقیق اہل سنت مجہول ہیں انکو نزدیک دینی ہے اور تعجب یہ ہے کہ اس کے نسب اور نام تک کو اہل سنت سے تسلیم کرانے پر مصر ہیں۔

تصوف کے ثبوت میں بھی جس کے نام تک سے قرآن یا حدیث آشنا نہیں ہیں انھوں نے غیر جزو صرف کئے ہیں اور اس کو اسلامی تعلیمات کی حقیقت قرار دیا ہے۔ مکاشفہ کے اثبات میں سے پر لعن طعن کر کے بزرگوں کے اقوال سے سندیں پیش کی ہیں۔ مگر کشف تو ہر ایک ماہر فن کو اپنے فن کے متعلق ہوتا ہے۔ اس کو دین کے ساتھ کیا خصوصیت ہے۔

ان کے نزدیک ہر مسلمان کو شیخ کی بھی ضرورت ہے حالانکہ قرآن اس کو نہایت خطرناک بتاتا ہے "وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ" (دنیا کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی اطاعت کرے تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے) دوسری آیت میں بتصریح اس کی ممانعت ہے۔ "اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء" (اسی کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے اوپر نازل کیا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو) حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے شیخ کی تلاش کرنا بعینہ ایسا ہی ہے جیسے آفتاب کے ہوتے ہوئے چراغ ڈھونڈھنا۔ رسول پاک نے جو بیعت لی تھی وہ امامت کی حیثیت سے تھی چنانچہ ان کے بعد صحابہ کرام میں سے صرف وہی لوگ بیعت لیتے تھے جو خلافت یا امارت کا منصب رکھتے تھے۔ دیگر صحابہ سے بیعت لینا مطلقاً ثابت نہیں ہے۔ پیری اور مریدی کی بیعت مسلمانوں میں اس وقت شروع ہوئی ہے جب تاتار کے غلبہ کے بعد ان کی دینی صلاحیت فوت ہوگئی اور ارشاد و ہدایت کا منصب دنیا کمانے کا ذریعہ بن گیا۔

غرض یہ ہے کہ جو عقائد جو اعمال اور جو رسوم مسلمانوں میں مذہب کے نام سے پھیلے ہوئے ہیں مولانا روم نے اپنے فلسفے سے انھیں کی حمایت کی کوشش کی ہے۔ اور مخالفین کو نہایت سخت بلکہ بعض مقامات پر کرخت لہجے میں مخاطب فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے پانچ ہی اجزاء ایمان قرار دئے ہیں۔ اللہ۔ رسول۔ ملائکہ۔ کتاب اور یوم آخر ان کے سوا کوئی چھٹا عقیدہ قرآن میں نہیں۔ مسلمانوں نے ان کے اوپر سیکڑوں عقائد اضافہ کرلئے لیکن نتیجہ سوائے ہلاکت اور غضب الٰہی کے اور کچھ نہ ہوا۔ کیونکہ یہ سب الگ الگ فرقوں کے خیالات تھے جن سے امت کی وحدت فنا ہوگئی۔ تعجب ہے اگر مولانا روم جیسا شخص بھی اسی سے عبرت نہ لے اور اسی لکیر کا فقیر بنا رہے جو ترکستان کو جاتی ہے۔

(ا۔ س۔ ع)

نقش و نگار | جناب جلیل احمد صاحب جلیل قدوائی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ حجم ۱۰۸ صفحہ۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۱۶ لمبائی اور سطح ہے کی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس۔ قیمت ۸؍۔ مصنف سے کاشانہ اناؤ کے پتے سے مل سکتی ہے۔

اردو داں پبلک جلیل قدوائی صاحب سے فسانہ نگار کی حیثیت سے واقف ہے۔ ان کی چند متفرق نظمیں بھی اردو کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کی نظموں کا مجموعہ اب تک نہیں چھپا تھا اس لئے ان کے شاعرانہ جوہر لوگوں پر اچھی طرح نہیں کھلے تھے۔ اس مجموعے کو پڑھ کر اہل ذوق کو بیحد خوشی ہوگی کہ نئی نسل میں ایک ایسا شاعر موجود ہے جس کی زبان میں حسرت کی زبان کی سی سادگی اور شادابی اور خیالات میں وہ درد اور اثر ہے جو غزل کی جان اور سچی شاعری کی پہچان ہے۔

کتاب کے ساتھ حضرت احسن مارہروی کا تعارف اور عبدالشکور صاحب سابق پروفیسر اتر میڈیٹ کالج علی گڑھ کا مقدمہ بھی ہے جس میں جلیل صاحب کے کلام پر بہت حسن ذوق کے ساتھ تنقید کی گئی ہے اگر پڑھ کر اصل کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

ہم نمونے کے طور پر چند اشعار درج کرتے ہیں جنھیں حضرت احسن اور عبدالشکور صاحب کی نظر انتخاب نے چھانٹا ہے۔

باغ میں چاندنی چھٹکتی ہے　　آنکھ بے اختیار روتی ہے
بے قراری ہمارے دل کی حیف　　نام عشاق کا ڈبوتی ہے

فکر پوشیدگی راز میں ہیں دیوانے　　سی رہا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئے لیکن　　حیات غم حیات جاوداں معلوم ہوتی ہے
بھرے آتے ہیں آنسو سن کے حال گریۂ بلبل　　ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

مٹ چلے ہیں دل سے کچھ کچھ داغ ہائے آرزو　　پھر چمک اٹھیں نہ اس ظالم کو ہنستا دیکھ کر

جلوہ دکھلاتی ہے اپنا زیر دامان سحاب　　نوعروس برق یعنی دختر ابر بہار
آج ہوتی ہے دل میں ایک خلش　　آج کھلتا ہے راز راحت کا

کیسا ویرانہ، کیسی آبادی؟ — اقتضا اور کچھ ہے وحشت کا
عمر ساری ملال میں گزری — اللہ اللہ فریب راحت کا
تسکین ہے وجہ راحت دل — تسکین کا اعتبار کب تک
دل مرحوم کی اٹھان کی شان — ہائے اس ہونہار کی باتیں
ڈرایا اس قدر طوفان بحر زندگانی نے — کہ ہم ساحل کو بھی موج لب ساحل سمجھتے ہیں
مایوسیوں نے پیہم دل سرد کر دیا ہے — اب آرزو کے بدلے اک داغ آرزو ہے
منزل کا ہوش کچھ ہے نہ ہے راہ کی خبر — لے جائے کس طرف دل دیوانہ دیکھئے

ایک نظم "برکھا رت" کے چند اشعار۔

باغ میں پریاں جھول رہی ہیں — حسن پہ اپنے پھول رہی ہیں
دھانی ساڑھی اونچا دامن — ترچھی نظریں تیکھی چتون
نین رسیلے حجب متوالی — ہنسی انوکھی بات نرالی
سر سے وہ آنچل کا ڈھل جانا — شرما کر وہ سر کو جھکانا

کامیاب مطالعہ | از سید تجمل حسین صاحب ایم اے، بی ٹی لکچرر ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ حجم ۱۲۱ صفحے قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ میرامان منزل، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ یا مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرولباغ۔ دہلی۔

اس رسالے میں مصنف نے جو اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور ٹریننگ کالج کے لکچرر کی حیثیت سے طالب علموں اور معلموں دونوں کی تعلیم کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ مطالعے کے نفسیاتی اصولوں کو بہت سلیس شگفتہ عام فہم زبان اور دلنشیں انداز میں سمجھایا ہے اور ایسے گر بتائے ہیں جن سے کام لے کر طالب علم کم سے کم محنت کا زیادہ سے زیادہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہے۔ ہندوستانی طالب علم عموماً طالب علم بہت بے تکے طریقے سے محنت کرتے ہیں۔ سارا بار حافظے پر ڈال دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرح سے کہ نفسی قوانین کی صریحی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ حافظے کا ٹٹو اناڑی سوار کے ہاتھ سے لگام کے جھٹکے اور چابک کھاتے کھاتے اڑیل ٹٹو ہو جاتا ہے کہ کسی طرح نہیں چلتا۔ اس کتاب کے مطالعے سے طالب علموں کو اس مرکب پر پورا قابو حاصل ہو سکتا ہے اور وہ ایک اشارے سے اسے جدھر چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کی فہرست درج کرتے ہیں جس سے کتاب کے مضامین کا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) طالب علم کی جسمانی صحت (۲) مطالعے کے لئے جگہ اور وقت کا تعین (۳) مطالعے کی مختلف قسمیں۔ (۴) مطالعے کو کامیاب بنانے کے طریقے (۵) حافظہ اور اس کی ترتیب (۶) حفظ کرنے کے صحیح طریقے (۷) امتحان اور اس کی تیاری

دنیا کی رفتار*

ممالک غیر

جرمنی کا قرضہ (ڈاکٹر برونگ وزیر اعظم جرمنی کا جو اعلان حال میں جرمنی کے قرضے کے متعلق شائع کیا ہے اس سے دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری درخواست پر ڈاکٹر زومر نے جو جرمنی کے مشہور انشورنس بنک "الائنس داسشٹ گارٹ" کی ہندوستانی شاخ کے جنرل منیجر ہیں یہ نوٹ جرمن قرضے کے مسئلے پر لکھ کر رسالہ جامعہ کو عنایت فرمایا)

جرمنی کے ذمے بیرونی قرضے دو قسم کے ہیں

(الف) سیاسی قرضے (تاوان جنگ)

(ب) تجارتی قرضے (بیرونی بنکوں کے قرضے جرمن کارخانوں پر)

سیاسی قرضوں کا تصفیہ پہلی بار سنہ ۱۹۲۴ء میں ڈا ایس (Dawes) کمیٹی نے کیا۔ پھر سنہ ۱۹۲۹ء میں ایک اور تصفیہ ہوا جو "تجویز ینگ" (Young Plan.) کے نام سے مشہور ہے۔

تاوان جنگ کا مطالبہ اس بے بنیاد دعوے پر مبنی تھا کہ لڑائی جرمنی نے شروع کی اور اس میں سراسر اسی کا قصور تھا۔ صلحنامہ ورسائی (Treaty of Versailles.) کے بعد سے اب تک متعدد فرانسیسی اور انگریز سیاست داں اس دعوے کی تردید کر چکے ہیں۔ مگر فرانس ہنوز ان مطالبات پر مصر ہے۔ "تجویز ینگ" کی رو سے جرمنی سنہ ۱۹۶۶ء تک تقریباً دس کروڑ پاؤنڈ (ڈیڑھ کرور ارب روپیہ) سالانہ دینے کا پابند کر دیا گیا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں دنیا کے ماہرین تجارت پر یہ بات روشن ہو گئی کہ جرمنی کے لئے اس خطیر رقم کے ادا کرنے کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ اسے سالانہ قسط تاوان کے مساوی رقم کا مال باہر بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ بجائے اس کے ہوا یہ کہ یورپ، امریکا اور ایشیا کے ملکوں نے بھاری تامینی محصول لگا کر جرمن مال کی درآمد کو روک دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جرمنی غیر ملکی بازاروں میں اتنا مال نہیں بھیج سکتا جتنا فرانس، انگلستان، امریکا کے سیاسی مطالبات ادا کرنے کے لئے بھیجنا ضروری ہے۔ مجبوراً اسے یہ رقم غیر ملکوں سے اور زیادہ تر خود انگلستان اور امریکا سے قرض لینا پڑی۔

اس طرح ایک چکر سا بن گیا جس میں سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں۔ جرمن حکومت نے اپنے ملک کے لوگوں پر خصوصاً صنعت و حرفت اور تجارت پر بھاری ٹیکس لگائے۔ صنعتی کارخانے اور تاجر باہر کے

ملکوں میں اتنا مال بھیج نہیں سکتے تھے کہ حکومت کو محصول ادا کریں۔ اس لئے انھوں نے انگلستان اور امریکہ کے بنکوں سے اپنے ملکیت اراضی کی ضمانت پر اور جرمن قوم کی محنت اور جفاکشی کی ساکھ پر روپیہ قرض لینا شروع کر دیا۔

عموماً غیر سرکاری قرضے انگلستان اور امریکہ سے لئے گئے۔ یہ قرض کی رقم ٹیکس کی صورت میں جرمن حکومت کو ادا کی جاتی تھی اور وہاں سے تاوان کی صورت میں پھر غیر ملکوں میں چلی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۱ء میں منقطع ہوگیا کیونکہ اب دنیا کی عام اقتصادی مشکلات کی وجہ سے بین الاقوامی قرضوں کا ملنا ناممکن تھا۔ جولائی ۱۹۳۱ء سے اب تک بین الاقوامی ماہرین کے کم سے کم تین کمیشن مقرر کئے جا چکے ہیں جنھوں نے اس مسئلے پر اچھی طرح غور کر کے یہ فیصلہ کیا اور مختلف حکومتوں کو اس سے آگاہ کر دیا کہ جرمنی یا تو اپنا سیاسی قرضہ ادا کر سکتا ہے یا تجارتی قرضہ۔ دونوں قرضے ساتھ ساتھ نہیں دے سکتا۔

سب سے زیادہ سیاسی پیچیدگیاں سیاسی قرضے میں پڑتی ہیں کیونکہ تاوان جنگ میں سے ۴۰ فیصدی فرانس کو دیا جاتا ہے۔ مگر تجارتی قرضہ قریب قریب سو فیصدی ایسا ہے جو جرمنی کے تاجروں اور کارخانوں نے انگلستان اور امریکہ کے بنکوں سے لیا ہے۔ چنانچہ صرف انگلستان کے بینکوں کا (غیر سرکاری) قرضہ بیس کروڑ پاؤنڈ (تین ارب روپیہ) تک پہنچ گیا ہے۔

غرض اب صورت حال یہ ہے۔ اگر جرمنی سیاسی قرضہ (تاوان جنگ) ادا نہ کرے تو حکومت فرانس کا بجٹ خطرے میں پڑ جائے گا لیکن فرانس کے لئے ان مشکلات کا برداشت کرنا ممکن ہے۔ وہ آج کل دنیا کا سب سے دولتمند ملک ہے لیکن اگر جرمنی اپنا تجارتی قرضہ نہ دے تو انگلستان اور امریکہ کے بنک بیٹھ جائیں گے یعنی ان دونوں ملکوں کا پورا مالیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

جیسا ڈاکٹر برونگ نے اپنے اعلان میں کہا جرمنی سیاسی قرضے کے ادا کرنے سے بالکل معذور ہے مگر وہ تجارتی قرضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ جرمنی کے اس رویئے سے انگلستان اور امریکہ کی تجارت سنبھل سکتی ہے مگر اس میں فرانس کا نقصان ہے۔ اسی لئے انگلستان اور امریکہ مل کر فرانس کی مخالفت کر رہے ہیں اور فرانس کی ہمت نہیں کہ جرمنی سے جنگ کا اعلان کرے کیونکہ یہ گویا انگلستان اور امریکہ سے یعنی تقریباً کل مہذب دنیا سے کھلم کھلا دشمنی مول لینا ہے۔

اس صورت حال میں جو زبردست خطرہ پنہاں ہے اس کا تجربہ فرانس کو ابھی سے ہونے لگا ہے چنانچہ آج ہی خبر آئی ہے کہ فرانس کی حکومت کو ایک ایسی متحدہ قومی مجلس وزراء ترتیب دینے میں کامیابی نہیں ہوئی [illegible]

مشکلات کا مقابلہ کرسکے خصوصاً تاوان جنگ کی اُس کانفرنس میں جو لوزان میں ہونے والی ہو حصہ لےسکے اس لئے اُس نے استعفٰے دیا۔

ان امور سے صاف ظاہر ہو کہ اگر اب یورپ میں کوئی جنگ ہوئی تو انگلستان جرمنی کے خلاف نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گا۔

ہندوستان

صوبہ متحدہ میں عدم ادائیگی لگان کی تحریک کچھ عرصہ ہوا صوبہ متحدہ کے بعض اضلاع میں کانگریس کی طرف سے عدم ادائیگی لگان کی تحریک اٹھائی گئی ہو جس سے ہندوستان کے سیاسی حالات میں ایک نئی صورت حال کا اضافہ ہو گیا ہو۔ صوبہ متحدہ مثل دوسرے صوبوں کے نہیں ہو کہ جہاں معاملہ کاشتکاروں اور حکومت کے درمیان ہو بلکہ یہاں پر دونو کے درمیان زمینداروں کا ایک طبقہ ہو کہ جس سے اصل کشمکش پیدا ہونے کا اندیشہ ہی۔ زمینداروں کا یہ طبقہ انگریزی حکومت کا پیدا کردہ ہو یا یہاں کے زراعتی حالات کا لازمی نتیجہ ہو؟ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہو جس سے سردست بحث نہیں۔ اصل واقعہ یہ ہو کہ اس صوبے کی زراعتی زندگی کے تین خاص عناصر ہیں: (۱) کاشتکار (۲) زمیندار اور (۳) حکومت۔ ان ہر سہ عناصر کے باہمی اشتراک عمل اور توازن پر اس صوبے کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ان عناصر کو باہم ایک دوسرے کی نسبت سے جو درجہ حاصل ہونا چاہئے وہ اس وقت نہیں ہو لیکن اس باہمی امتزاج کی کشمکش میں کسی عنصر کو سرے سے خارج کر دینے کی کوشش کرنا اس صوبے کی زندگی کو شدید نقصان پہنچائے بغیر ممکن نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ کچھ عرصے سے دنیا کا عام معاشی نظام بہت کچھ بگڑا ہوا ہو اور ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی نے ہندوستان کی عام تجارتی حالات اور اس کی وجہ سے اجناس کی ارزانی نرخ نے صوبۂ متحدہ کی اقتصادی حالت کو اور بھی خراب کر دیا ہو۔ بیرون ہند اور ہندوستان کی عام کساد بازاری کی وجہ سے گذشتہ فصل ربیع کی پیداوار کاشتکاروں کے ہاں جوں کی توں پڑی رہ گئی اور ان کے فروخت نہ ہو سکنے کی وجہ سے روپیہ ان کے لئے عنقا ہو گیا ایسی صورت میں جب ادائیگی لگان کا وقت آیا تو کاشتکار بجائے نقدی ادا کرنے کے اجناس کے سوا کچھ نہ پیش کر سکے۔ لیکن غلے کے دانے سکے تو بن نہیں سکتے تھے تھوڑی بہت جو کچھ بھی اجناس نقدی کی صورت میں تبدیل کی جاسکیں وہ ارزانی نرخ کے باعث بہت کم قیمت ثابت ہوئیں اور اس سے تخفیف اور عدم ادائیگی لگان کا سوال پیدا ہوا۔

صوبہ متحدہ میں خصوصیت سے اس نوعیت کا سوال پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ ایک تمام تر زراعتی صوبہ ہے۔ یہاں کی آبادی کا ۷۶ فیصدی حصہ ایسا ہے جو تمام تر زراعت و کاشتکاری پر زندگی بسر کرتا ہے اور ۵ فیصدی ایسا جو جزوی طور پر گزران کرتا ہے۔ اس صوبے کی زراعت سے متعلق کل آبادی تین طبقوں پر مشتمل ہے۔ (۱) زمیندار جن کی تعداد کوئی بارہ لاکھ ہے اور جن میں بیشتر ایسے ہیں جو خود بھی کاشتکاری کرتے ہیں۔ (۲) کاشتکار جن کی تعداد ۵۵ لاکھ ہے، جو بذات خود کاشتکاری کرتے ہیں اور اپنی پیداوار کا ایک حصہ (خواہ بصورت جنس یا بصورت نقد) زمیندار کو بطور لگان دیتے ہیں (۳) مزدور جن کی تعداد ۶۰ لاکھ ہے جو صرف اجرت پر کھیتوں میں کام کرتے ہیں اور اپنی کوئی ملک یا حق کاشت نہیں رکھتے۔

صوبے کی یہ زراعتی مشکلات کچھ آج نئی نہیں بلکہ ایک زمانے سے چلی آتی ہیں۔ سادی دشواریوں کے علاوہ کہ جن کا کلی انسداد یا امکان ارضی آج تک نہیں کر سکے، ایک بہت بڑا مسئلہ اس صوبے کی اضافہ آبادی کا ہے۔ زیادہ سے زیادہ قدیم اعداد جو یہاں کی آبادی کے ملے ہیں وہ اکبر بادشاہ کے زمانے کے ہیں اور اُس وقت اس صوبے کی آبادی ۲ کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ پھر انگریزی عہد کی ابتدا یعنی ۱۸۵۲ء میں یہی تعداد بڑھ کر ۳ ۱/۲ کروڑ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اب ۱۹۳۱ء کی تازہ مردم شماری سے یہ تعداد ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ ہو جاتی ہے، گویا ہر دسویں سال یہاں کی آبادی میں ۶.۲ فیصدی کا اضافہ ہوتا رہا ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی مزروعہ زمین کا رقبہ بھی بڑھتا رہا ہے، لیکن وہ آج تک کبھی ۴ فیصدی سے آگے نہیں بڑھا۔

یہ کمی حکومت کی طرف سے ذرائع آبپاشی میں توسیع اور طریقۂ کاشت کی ترقی سے پوری کی جاتی رہی ہے اور کچھ عرصے سے حکومت کے تمام میلانات مزارعین اور کاشتکاروں کی حمایت اور تائید میں رہے ہیں۔ اب تک زمینداروں کو اپنے کاشتکاروں کو بے دخل کرنے کا جو حق حاصل تھا ان کے اس حق میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ۵۱ فیصدی کاشتکار موروثی کاشتکار ہیں، یعنی وہ اپنا حق کاشت اپنے بعد اپنی اولاد کو منتقل کر سکتے ہیں۔ ۲۹ فیصدی ایسے ہیں جنھیں حین حیات حق حاصل ہے یعنی زمیندار ان کی زندگی میں انھیں اس زمین کا حق کاشت سے محروم نہیں کر سکتا جس پر وہ کاشت کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت کم تعداد ایسی رہ جاتی ہے جنھیں بہ ضرورت بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ رسد و بیگار کا ایک نہایت تکلیف دہ حق جو ایک عرصے سے چلا آتا تھا وہ بھی بجز کسی خاص حالات کے عام طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اب کوئی زمیندار اپنے اسامیوں سے بلا اجرت خدمت یا بلاقیمت غلہ نہیں لے سکتا

اس حالت میں ایک بڑی چیز جو مزارعین کے حقوق کو محفوظ کرنے اور زمینداروں کی دست درازیوں کو روکنے کے لئے کی گئی ہے، وہ قانون لگان آراضیات صوبہ آگرہ ہے جو ۱۹۲۶ء میں زمینداروں کے متفقہ مخالفت کے باوجود سوراجی اور سرکاری ممبران کے اتفاق آرا سے پاس ہوا تھا۔

یہ تمام تحفظات اور مراعات ہیں جو گزشتہ کچھ عرصے سے مزارعین اور کاشتکاروں کے ساتھ ہوتی رہی ہیں اور جن سے اس صوبے کے اندر اس طبقے کی حالت اگر بہت اچھی نہیں تو کچھ بہت بری بھی نہیں رہی ہے، لیکن گزشتہ سال کے اندر نرخ اجناس میں ۳۰ سے کر ۵۰ فیصدی تک کی یکبارگی کمی نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی ہے جس سے کاشتکار پورا لگان ادا کرنے سے ایک حد تک معذور ہو گئے۔ حکومت صوبۂ متحدہ نے اس کے لئے یہ کیا کہ ۱۹۳۰-۳۱ء کے کل مطالبات مالگذاری میں سے جو تقریباً ۷ کرور ہوتے ہیں۔ ایک کرور ۱۰ لاکھ کی کمی کر دی، یعنی تقریباً ۱۶ فیصدی کی رعایت ہو گئی۔ گویا موجودہ مطالبہ مالگذاری اب سے ۳۰ سال قبل کے مطالبے سے ۴۰ لاکھ یا ۷ فیصدی کم ہو گیا ہے۔ اور اسی طرح ۱۹ کرور ۴۰ لاکھ کے لگان میں ۴ کرور ۱۲ لاکھ کی کمی ہو گئی ہے۔ یعنی گویا کل مطالبات لگان پر ۲۱ر۲۱ فیصدی رعایت ہو گئی ہے۔

یہ رعایتیں حکومت کی طرف سے خواہ کتنی ہی فیاضی کے ساتھ کی گئی ہوں کاشتکاروں کی مالی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ زمینداروں کی خصوصاً چھوٹے زمینداروں کی حالت بھی قابل رحم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کانگریس کی عدم ادائگی لگان کی تحریک کا شکار سب سے پہلے اور سب سے زیادہ یہی ہوں گے۔ کاش کانگریس کے کارکنوں میں اور ان لوگوں میں کوئی مفاہمت ایسی ہو سکتی جس سے کاشتکاروں کی مشکلات واقعی رفع ہو جاتیں۔ مشکل یہ ہے کہ اقتصادی مسئلوں کے ساتھ سیاسی مصلحتیں ایسی گتھ گئی ہیں کہ جو گرہیں آسانی سے سلجھ سکتی تھیں وہ اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

عالم اسلامی

موتمر اسلامی

گزشتہ مہینے کا سب سے اہم واقعہ موتمر اسلامی کا وہ عظیم الشان اجلاس ہے جو قدس الشریف میں منعقد ہوا اور جس کو سیاسیات حاضرہ میں بلاشبہ ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے بھی مصر و حجاز میں موتمر کے اجلاس منعقد ہو چکے ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر ہنگامی واقعات سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلامی کے

باہمی ربط و یگانگت کے لئے ان سے کوئی خاص نتائج مرتب نہیں ہوئے۔ برعکس اس کے اجلاس قدس کے انعقاد میں ایک نہایت اہم اور ضروری مقصد پیش نظر تھا اور وہ یہ کہ مسلمانانِ عالم کہیں وقتی اور مقامی مصروفیتوں کے خیال میں اپنے ملی اور تمدنی مصالح کو فراموش نہ کر دیں۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت عجیب ہے اول تو ان کو اسلام سے بطور ایک تمدن یا نظام اجتماع کوئی ربط یا تعلق باقی نہیں رہا۔ مذہب کی حیثیت ان کے نزدیک کم و بیش ایک مجموعہ عقائد یا شکل عبادات کی سی ہو گئی ہے اور اس میں وہ قوت موجود نہیں رہی جو ان کے انفرادی نشو و نما یا جماعتی زندگی کے قیام کا باعث ہو۔ ثانیاً ان کی وطنی اور مقامی ضروریات دن بدن ان کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر رہی ہیں اور ذہناً ان کی حالت اس قدر پست ہو گئی ہے کہ وہ دنیا کے سیاسی اور معاشی حالات کی تعبیر اپنے دین مقدس کی روشنی میں نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص مذہب کا نام لیتا ہے تو وہ گھبرا اٹھتے ہیں اور ان کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ شاید اس کا مطلب ان کے سیاسی اور ملکی مصالح کی نفی ہے حالانکہ سیاست اور خدمتِ ملک و وطن میں ان کا رویہ مذہب اور تمدن کی طرف سے کچھ ایسی بے اعتنائی پیدا کر دیتا ہے جس سے بجا طور پر تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اسی حماقت آمیز کشمکش میں گرفتار ہیں کہ آیا ان کی اجتماعی حالت اسلام کی بدولت سدھرے گی یا اول ان کی اجتماعی حالت ٹھیک ہو جائے گی اور پھر اسلام کو ترقی اور سربلندی نصیب ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقاصد الگ الگ نہیں ہیں جیسا کہ غلطی سے بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں بلکہ وہ ایک ہی مقصد کے دو مختلف اجزا ہیں جن کی تکمیل اور نشو و نما ساتھ ساتھ ہوتی ہے ہم کسی ایسی ترقی کو صحیح معنوں میں دینی ترقی سے تعبیر نہیں کر سکتے جو اس کے پیروؤں کے انفرادی اور اجتماعی نشو و نما کے لئے فلاح و کامرانی کا پیام نہ لائے نہ یہ ممکن ہے کہ اول ایک قوم اسلام کا اصول حیات ترک کر دے اور پھر کسی دوسرے طریق سے آزادی اور ترقی کی طرف قدم بڑھا کر اس کی خدمت کا دعویٰ کرے۔ اسلام اور مسلمانوں کی دنیوی کامیابی میں ایک ایسا ربط قائم ہے کہ ایک کے ترک سے قدرتاً دوسرے کا ترک لازم آئے گا۔ لہٰذا اربابِ موتمر کی یہ کوشش کہ مسلمانانِ عالم کے لئے عقائد و مسلمات یا وطنی اور ملکی ضروریات سے الگ کچھ ایسے ذرائع و وسائل تلاش کئے جائیں جن سے ان کے قوائے ملی میں از سر نو ایک تازہ حرکت پیدا ہو سراسر مستحق ستائش و مبارکباد ہے۔ یہ کہنا کہ دنیائے اسلام کے موجودہ حالات اس نئی تحریک کے لئے کہاں تک امید افزا ہیں۔ ایک طرح کا مغالطہ ہے اس لئے کہ اگر ہماری موجودہ فضا اس قسم کی تحریکوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مساعد نہیں لہٰذا نظرِ بحالات ان کی کامیابی کے آثار کم ہیں تو یہ بھی ممکن نہیں کہ بجز اس قسم کی کسی تحریک کے ہم اپنے حالات میں کوئی خوشگوار

تبدیل پیدا کرسکیں۔ جہاں تک ارباب موتمر کو فراست ایمانی حاصل ہو اور وہ تعلیمات اسلامی پر بصیرت کی نظر رکھتے ہیں اسی قدر مسلمانان عالم کی ضروریات کے متعلق ان کا اندازہ صائب اور ٹھیک ہوگا۔ اور جہاں تک اخلاص و ہمت کے ساتھ وہ ان کے اہتمام میں سرگرم عمل رہیں گے اسی قدر ان کی کامیابی یقینی ہے۔ ہماری رائے میں بطور ایک تمہیدی اور افتتاحی اجلاس کے موتمر کا انعقاد نہایت کامیاب رہا اور اگرچہ ابتدا ہی میں اس سے کوئی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرلینا دانشمندی سے بعید ہے لیکن موتمر کے مختلف جلسے اور اس کی کارروائیاں ہمت افزا ضرور ہیں۔

البتہ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ موتمر کا یہ اجلاس جس قدر اہم تھا اتنا ہی اس کے متعلق غلط بیانی بلکہ رازو اخفاء سے کام لیا گیا۔ ایک تو مسلمانوں کی ذاتی کاوشیں اور ایک دوسرے سے بے اعتمادی اور بدگمانی کی مصیبت ہی کیا کم تھی اس پر طرہ یہ ہوا کہ خبر رسانی کے جملہ فرائض حضرت رائٹر نے ادا کئے۔ یہ بزرگ بڑے صیہونیت کے طرفدار، جہاں تک ممکن تھا اپنے اصول قومی کے مطابق ہر روایت میں کچھ ایسی تحریف کر دیتے تھے، جس سے موتمر کے متعلق کوئی صحیح خیال قائم کرنا دشوار تھا۔ انھوں نے اول تو جلسوں کے متعلق کوئی خاص اطلاعات بھیجی نہیں اور بھیجیں تو غلط۔ البتہ شرکائے موتمر کے باہمی اختلافات کو خصوصیت کے ساتھ شہرت دی گئی اور وہ ناگوار واقعہ جو ایک مصری مندوب کی بدولت ابتدائے موتمر میں پیش آیا اس کے متعلق خوب خوب رنگ آمیزیوں سے کام لیا گویا موتمر کی ساری کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار اسی ایک مندوب کے طرز عمل سے وابستہ تھا۔ اجلاس موتمر سے پہلے بھی مغرب کی خبر رساں ایجنسیاں اس مبارک تحریک کے بارے میں حتی الوسع مبالغہ آمیز بیانات اور گمراہ کن اطلاعات شائع کرتی رہیں۔ اول خلافت کا مسئلہ چھیڑا گیا۔ پھر یہ فتنہ اٹھایا گیا کہ مفتی فلسطین جامعہ ازہر کے حریف بننا چاہتے ہیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد یہ اطلاع موصول ہوئی کہ مسلمانان عالم نے موتمر کی دعوت پر کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا، نہ کوئی اسلامی ریاست اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مثلاً جب اجلاس موتمر سے کچھ مدت پہلے مفتی سید امین الحسینی قاہرہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں انھوں نے اکابر مصر سے موتمر کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے تو اس پر جریدۂ فلسطین کے نامہ نگار مصر نے جس انداز میں تنقید فرمائی وہ یہ تھا:۔

> "... قاہرہ میں عام خیال یہ ہے کہ فلسطین کی مجوزہ اسلامی یونیورسٹی ازہر کے مقابلے پر قائم کی جا رہی ہے ... مفتی فلسطین کہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا مقصد صرف اس صیہونی جامعہ کے اثرات کو زائل کرنا ہے جو قدس میں موجود ہے ... انھوں نے یہ

بھی کہا ہے کہ موتمر سے مقصود مسلمانان فلسطین کی حالت کو مستحکم اور قومی بنانا ہو تاکہ وہ صیہونیوں کو اپنی اس خواہش میں کہ اماکن مقدسہ ان کے تصرف میں آجائیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ الحاج امین اس معاملے میں صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں ... اماکن مقدسہ کا مسئلہ محض ان کے ذہن کی پیداوار ہو ... اس لئے کہ اس کا تعلق صرف دیوار گریہ سے ہے جس کے بارے میں "مہذب دنیا" (رداوین ہمارے ہیں) جمعیت اقوام کی خاص مجلس کا فیصلہ قبول کر چکی ہے ... مسلمانان مصر پر سید امین الحسینی کی اس کوشش کا جو بدنیاتی پر مبنی ہے کوئی اثر نہیں پڑا ... یہاں ہر شخص کو یہ بدگمانی ہے کہ مفتی فلسطین قدس کو خلافت کا مرکز بنانا چاہتے ہیں حالانکہ مصریوں کو ... خود اس کی خواہش ہو"

گویا ایک ہی وقت میں موتمر کے متعلق وہ تمام فتنے چھیڑ دیئے گئے جن سے اس کے مقاصد کو نقصان پہنچنے کی توقع تھی۔ مسلمانان عالم کی باہمی رنجشوں اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی اختلافات کا مسئلہ تو اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اس کی بجا یا بے جا شہرت کے ساتھ ہی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ ایک طرف خلافت اور ازہر کے نام سے امم اسلامیہ میں باہم رقابت کا جذبہ پیدا کیا جائے اور دوسری طرف مغربی ائمہ سیاست موتمر کے وجود کو اپنے اغراض و مقاصد کی راہ میں ایک زبردست خطرہ تصور کریں چنانچہ جہاں موتمر کے بظاہر ناکام جلسوں کی تصویریں نہایت مسرت اور اطمینان کے ساتھ کھینچی گئیں وہاں دبی زبان میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑا:۔

"... یہ خیال کرنا نادانی ہوگی کہ موتمر بالکل ناکام رہی ... جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا۔ یہ حقیقت آشکارا ہوتی جائے گی کہ یہ موتمر امم اسلامیہ کے اس عزم کی تمہید ہے کہ وہ اپنے تنظیم و ضبط کی طرف متوجہ ہوں۔ جونہی یہ تحریک زیادہ سمجھدار لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جیسا کہ یقینی ہے، اس سے مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ یہ خیال ہے جو بہت سے مغربی اہل الرائے حضرات نے ظاہر کیا ہو اور ...."

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت جب ممالک اسلامی ایک دوسرے کی حالت سے قطعاً بے خبر ہیں۔ جب ہمارے اجزائے ملی میں ایک طوفان انتشار رونما ہو۔ نہ مذہب سیاست کا حامل رہا ہو نہ سیاست

[illegible] سے مسلمانوں کا وجود ہی نہیں اور اگر ہے تو ارباب حل و عقد اس کی ترجمانی نہیں کرتے چنانچہ مسلمانوں کو حریت و جمعیت اور عقائد و مسائل کے اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس پاک اور مقدس سرزمین کی جس کو بہت سے انبیاء علیہم السلام کا مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے اسلام کے مسلمانوں پر مجبور کرنا اور بغیر کسی سرمایہ یا ذرائع نشر و اشاعت کے اس امر پر آمادہ ہو جانا کہ وہ ان کے حقوق و حمایت کے لئے جدوجہد کریں، ایک ایسا مبارک اور حوصلہ افزا اقدام ہے جس کا خیر مقدم ہر مسلمان کو دلی مسرت کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ اب تک موتمر نے جن مسائل پر غور کیا ہے اور اس نے جو فیصلے صادر کئے ہیں وہ بتقاضائے وقت و حالات نہایت مناسب ہیں مثلاً اس کی یہ قرار داد کہ فلسطین میں ایک زرعی بینک قائم کیا جائے، یہود کے سامان تجارت کا مقاطعہ کر دیا جائے اور مسلمانوں کو صیہونیت کے خطرے سے مطلع کیا جائے فلسطین میں یہودی سازشوں کے سدباب کے علاوہ اہل فلسطین کی سیاسی اور اقتصادی ترقی کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔ جدید تعلیمی اصولوں کے ماتحت جامع اقصیٰ کا قیام اور مصر میں ایک جامع عربی لغت کی تیاری کا فیصلہ نہایت مستحسن ہے۔ اسلامی تمدن کی نشاۃ ثانیہ میں ان کی اہمیت کو نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔ یہ تحریک کہ تمام عالم اسلامی میں نوجوانان اسلام اپنی انجمنیں قائم کریں بلاد اسلامیہ کے باہمی ربط و ضبط اور ان میں یگانگت اور وحدت کا احساس پیدا کرنے میں بڑے بڑے موثر و نتائج عمل کا موجب بن سکتی ہے۔ اسی طرح اماکن مقدسہ اسلام اور حجاز شریف کے تحفظ کا عہد، الحاد و لامذہبیت کے خلاف تعلیمات اسلامی کے نشر و اشاعت کا عزم اور حجاز ریلوے کو واپس لینے کا تہیہ کہ وہ ایک عظیم الشان اسلامی وقف ہے، نہایت ہی مبارک اور مفید ارادے ہیں جن کے حصول و اتمام پر ممالک اسلامی کے لئے بلاشبہ نہایت اہم اور دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔

البتہ یہ امر کہ موتمر کو ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی ہو سکتی ہے بہت کچھ وقت طلب ہے اور اس کے متعلق ابھی سے کوئی خیال ظاہر کرنا پیش از وقت ہوگا لیکن اگر موتمر کے شرکا اور ان کی سرگرمیوں کے متعلق کوئی قیاس قائم کرنا ممکن ہے تو بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اجلاس نہایت کامیاب رہا اور یقین ہے کہ تبدیلی حالات کے ساتھ اس کی کامیابی کی رفتار بھی برابر بڑھتی رہے گی [illegible] ہے کہ موتمر میں تقریباً وہ سب بزرگ موجود تھے جو اپنی خدمات اسلامی اور اخلاص [illegible] کے محتاج نہیں۔ ان حضرات نے موتمر کی تمام کارروائیوں میں نہایت گرمجوشی سے [illegible] کام کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی صحبتوں اور مشوروں میں

شریک ہوتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا انہیں نماز جمعہ بھی پڑھایا گیا تاکہ ممکن ہو کہ ان کا فاصلوں کے خلاف کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اس امر کا تذکرہ بے جا نہیں کہ جیسا کہ ظاہر ہے کہ جیسا میں کسی کی مخالفت بات کو خواہ کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ مؤتمر کی تمام کارروائیوں میں ایک زبردست روح اخوت اور اتحاد عمل کا اظہار ہوا ہے اور ارباب مؤتمر نے اپنے قول و عمل سے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی خصوصیات اسلام کے بلند و برتر مقاصد سے ناواقف نہیں۔ اس کے لئے صرف اس مسرت آمیز واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ کہ ملت اسلامیہ کی وحدت اور اسلام کی بے تعصب اور تفرقہ و انتشار سے بالاتر روح کے تقاضے پر ایک شیعی رہنما یعنی سید محمد حسین آل کاشف الغطاء نے جامع اقصیٰ میں امامت فرمائی اور تمام حضار مؤتمر نے ان کے پیچھے فریضۂ نماز ادا کیا۔ ہماری رائے میں مؤتمر کا انعقاد نہایت مناسب موقعہ پر عمل میں آیا ہے اور اس کا وجود جس سرزمین سے وابستہ ہے اس کے رہنے والے ان تمام خصائص عمل اور ملکات ذہنی کے مالک ہیں جو عزت و کامرانی کی شرط ہیں اور جن کے ہوتے ہوئے کوئی سعی و کوشش ناکام نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے ہم اپنی فرسودہ سیاست یا بے روح زندگی کی بدولت مؤتمر کے مستقبل سے ناامید ہوں لیکن ہمیں اپنی بے بصری اور کور ذوقی سے بڑھ کر ان بلند ہمت اور اولو العزم لوگوں کے قوائے عملی و فکری پر اعتماد رکھنا چاہیے جن کو قدرت نے ایک حساس دل اور بے چین طبیعت عطا کی ہے اور جن کی حمیت دینی اور ذوق جہاد و حریت ایک عالم میں مسلم ہے بفضلہ تعالیٰ مؤتمر میں وہ پختہ کار اور ریختہ اہل سیاست بھی شامل ہیں جن کا فہم و تدبر اور حزم و احتیاط اعتراض سے بالاتر ہے اور ایسے ہیں وہ بالغ نظر فلسفی بھی اور صاحب بصیرت بھی شریک ہیں جن کو زندگی اور اس کے حقائق پر غیر معمولی دسترس اور عبور حاصل ہے یقین ہے کہ عالم اسلامی کے ہر حصے میں اس تحریک کا دلی جوش اور سرگرمی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ البتہ اس کی کامیابی کا راز صرف اس اسلوب ذہنی پر منحصر ہے جس کی طرف مؤتمر کے خاتمے پر علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا جب مندوبین کو الوداع کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہ ان سے بڑھ کر حقائق کی ترجمانی کا دعویٰ کون کر سکتا ہے فرمایا: ”... اسلام کو اس وقت دو خطرے درپیش ہیں ایک الحاد و مادیت اور دوسرا وطنیت وقومیت کا، مجھے یقین ہے کہ اسلام کی پاک اور مقدس روح ان دونوں خطرات کو شکست دے سکتی ہے۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا خود مسلمانوں سے ہے۔ حضرت سرورِ کائنات صلعم کی ایک حدیث ہے انا خاتم الانبیاء وانتم خاتم الامم۔ میں جب کبھی اس کا خیال کرتا ہوں تو میری گردن شرم و ندامت سے جھک جاتی ہے کیا آج ہم مسلمان اس قابل ہیں کہ جناب رسالت مآب صلعم ہم پر فخر کریں۔ جب تک ہم ان ذمہ داریوں کو نہ سمجھیں جو رسول اللہ صلعم نے ہمیں عنایت فرمائی تھیں تم اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ہم پر فخر کریں۔“

شذرات

اردو اکادمی کا پہلا لکچر جس کا اعلان ہم پچھلے پرچے میں کر چکے ہیں، ۲ر جنوری کو ہوا۔ علاوہ جناب مقرر کے باہر کے ارکان میں سے جناب خواجہ غلام السیدین صاحب، جناب تجمل حسین صاحب، جناب یوسف الزمان صاحب اور جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا تشریف لائے تھے۔ مقامی ارکان اکادمی اور دہلی کے دوسرے علم دوست حضرات بھی موجود تھے۔ خصوصاً کالجوں کے طلبہ بہت کافی تعداد میں شریک تھے۔ جلسے کا افتتاح خواجہ غلام السیدین صاحب صدر جلسہ کی تقریر سے ہوا۔ موصوف نے حاضرین کو لکچروں کے اس سلسلے کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، جو اکادمی نے شروع کیا ہے اور اکادمی کی علمی خدمات کے متعلق ہمت افزا امیدیں ظاہر کیں۔ اس کے بعد سید وہاج الدین صاحب کا تعارف کرایا۔ سید صاحب علی گڑھ کے مایۂ ناز طالب علم ہیں۔ آپ نے ۱۹۲۰ء میں بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور اسی سال سرکار نظام کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ وہاں سے ٹریننگ کے لیے ڈھاکہ بھیجے گئے اور اول نمبر پر کامیاب ہو کر واپس آئے۔ اب آپ اورنگ آباد کے عثمانیہ کالج میں معاشیات اور نفسیات کے پروفیسر ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کا شاہد رسالہ "اردو" ہے جو آپ کے متعدد گراں قدر ترجمے شائع کر چکا ہے۔ گذشتہ سال ہندستانی اکیڈمی نے آپ کی ایک تالیف "نفسیات ترغیب" پر انعام دیا ہے۔ آپ کے اسلوب بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ دقیق علمی مضامین کو ایسے دلپذیر اور دلنشین انداز میں پیش کرتے ہیں گویا پتھر کو پانی کر دیتے ہیں۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد سید وہاج الدین صاحب نے اپنا فاضلانہ مقالہ "نفسیات مذہب" پڑھا جس کا خلاصہ آئندہ مہینے رسالہ جامعہ میں شائع ہوگا اور پورا لکچر رسالے کی شکل میں تین چار مہینے کے اندر چھپ جائے گا۔

آخر میں جناب صدر نے فاضل مقرر کا شکریہ ادا کیا اور لکچر کے موضوع کے متعلق حاضرین کو اپنے خیالات سے مستفید فرمایا۔ جلسہ جناب شیخ الجامعہ کی تقریر پر ختم ہوا جس میں موصوف نے اکادمی کی طرف سے جناب صدر اور فاضل مقرر کی خدمت میں تحفۂ سپاس و امتنان پیش کیا۔

اکادمی کا دوسرا لکچر ۱۲ر فروری یوم یکشنبہ کو منعقد ہوگا۔ وقت کا تعین ابھی نہیں ہوا ہے۔ حضرات ممکن کی خدمت میں دعوت ناموں کے ذریعے سے اطلاع دے دی جائے گی۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب سابق مدیر جمہور سید جمال الدین افغانی کی سیرت پر تقریر فرمائیں گے جس کے متعلق موصوف مدت سے تحقیق و

تدقیق کر رہے ہیں۔ جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب استاذ تاریخ مسلم یونیورسٹی نے جلسے کی صدارت کو منظور فرمایا ہے۔

ہم اس نمبر میں جناب نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ کا ایک مضمون "ہماری شاعری" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔ یہ ایک خطبہ ہے جو جناب موصوف نے مسلم یونیورسٹی کے یونین کے لئے مرتب فرمایا تھا۔ ہم نواب صاحب کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے یہ مضمون رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت کر دیا۔ نواب صاحب کے کیف بیان سے خمخانۂ ادب کے پرانے میخواروں نے تو ایسے ایسے لطف اٹھائے ہیں کہ اب تک مزے لے رہے ہیں لیکن نئے پینے والے اس لذت سے محروم ہیں کیونکہ ایک عرصے سے موصوف نے بزم خیال کے میکدۂ بے خروش کو چھوڑ کر عرصۂ عمل کو جولان گاہ بنا لیا ہے۔ شکر ہے کہ خیالی خم کی مہر ٹوٹی اور بادۂ کہن میں پھر جوش آیا۔ اسی ایک مضمون سے ناظرین جامعہ کو حضرت خیالؔ کے طرز تخیل اور طرز ادا کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس میں آپ نے شاعری کو اس رنگ میں دکھایا ہے جس میں آج کل کے وجدانی حکیم فلسفے کو دکھاتے ہیں یعنی اس پراسرار قوت کے ذریعے سے جسے وجدان کہتے ہیں بغیر عقل و ادراک کی مدد کے حقیقت اور سرچشمۂ حقیقت میں ڈوب جانا یا یوں کہئے کہ اپنی روح کو روح کائنات سے ہم آہنگ کر کے کائنات کی ہم آہنگی، تناسب، "ترصیع" یعنی حسن کا جلوہ دیکھنا اور دکھانا۔ اس چیز کو پیش نظر رکھ کر حضرت خیالؔ نے تاریخ کے چند مناظر دکھائے ہیں جن میں عام تمدنی کا ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ کر اس میں ہر دور کی شاعری کا نقش ابھارا ہے۔ ہماری رائے میں ناظرین حضرت خیالؔ کے اسلوب بیان کی حلاوت اور کیف سے سرور حاصل کرنے کے بعد بھی تشنہ لب رہ جائیں گے اور موصوف سے فرمائش کریں گے کہ جس گردہ تصویر کی انھوں نے طرح ڈالی ہے اس میں رنگ بھر کر اسے مکمل کر دیں۔

ہم نے افسانہ نویسی کے جس انعامی مقابلے کا اعلان کیا تھا اس کے لئے آخر دسمبر تک متعدد افسانے موصول ہوئے جو کمیٹی کے سامنے پیش کئے گئے۔ افسوس ہے کہ کمیٹی کے نزدیک کوئی افسانہ اس معیار پر پورا نہیں اترا جو انعام کے لئے مقرر کیا گیا تھا اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ ان میں سے دو تین افسانے رسالے میں شائع کرنے کے لئے منتخب کر لئے جائیں اور انعام کی رقم ان کے لکھنے والوں میں تقسیم کر دی جائے۔ یہ افسانے آئندہ چند مہینے کے اندر شائع ہوں گے اور اشاعت کے بعد مجوزہ معاوضہ مصنف کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب بی اے (آکسن)

[illegible]

[illegible] فروری [illegible]

[illegible] تاج الدین صاحب [illegible] ۱۰۳
[illegible] ۱۰
[illegible] صاحب [illegible] ۱۳۲
[illegible] صاحب [illegible] ۱۳۶
[illegible] ۱۴۲
[illegible] صاحب ۱۵۰
[illegible] ۱۴۹
[illegible] ۱۴۷

نفسیات مذہب

یہ اس خطبہ کا خلاصہ ہے جو سید وہاج الدین صاحب بی اے، بی ٹی پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۲ جنوری ۱۹۳۲ء کو پڑھا تھا۔ امید ہے کہ پورا خطبہ دو تین مہینے کے اندر رسالے کی شکل میں چھپ کر اور ارکان اکادمی کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔

(مدیر)

مذہبیت یا حاسہ مذہبی، فطرت انسانی کے سربستہ اسرار میں سے ہے جن کی تحلیل دشوار ہے۔ اس کی نزاکت اور لطافت، علمی موشگافیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، یا یہ کہیے کہ خشک علیت اس کی عقدہ کشائی کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی، اور مذہب کے علمی مفتش کو قدم قدم پر یہ طعنہ سننا پڑتا ہے کہ

از بے خبری بے خبراں معذورند ذوقیست دریں بادہ کہ مستاں دانند

مذہب کو ٹٹولنا صرف انجان جگہوں میں قدم رکھنا ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کے متاع دل اور روحانی سرمایہ پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ بقول میر

یہ کارگاہ شیشہ گری، وہ دکان شیشہ گری

کچھ مذہب ہی پر موقوف نہیں نفس انسانی کی تمام تاثرات، تمام جذبات، تمام وجدانات اسی نوع کے شخصی اور سربستہ راز ہوتے ہیں۔ ان کی پوری پوری حقیقت اور معنویت سے اگر کوئی واقف ہوتا ہے تو صرف وہ نفس جو انہیں آغوش میں پال رہا ہو۔ دوسرا انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا غریب فلسفی اور نفسیات داں اپنا ہی کھا کر بیٹھے دور کا دور ہی کھڑا رہتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ان تاثرات کی توجیہ کر دے گا۔ ان کی تقسیم در تقسیم کر ڈالے گا۔ کوئی موٹی سی اصطلاح بتا دیگا۔ اور بس۔ اس سے زیادہ کا وہ اہل نہیں۔ محض دقت نظر اور نظری علیت اس کے کام نہیں

سکتی جب تک کہ وہ ویسا ہی جیتا جاگتا، فروزاں، رخشندہ وہندہ شعلۂ احساس اپنے دل میں نہ پیدا کرلے۔ اس موضوع پر بحث کرنے سے پہلے اقبال کی زبان میں میری دعا صرف یہ ہے کہ:

یارب! درون سینہ دل باخبر بدہ   در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ

مذہب کی تعریف | تاثرات اور وجدانات کی تعریف عموماً بہت دشوار ہوتی ہے، یہ چیزیں سراسر کیفی اور ذوقی ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ ان کے مظاہرات بیان کرسکتے ہیں، یا ان کی ماہیت بتاسکتے ہیں، لیکن ان کی کوئی جامع ومانع تعریف کرنا اگر ناممکن نہیں تو کم از کم دشوار ضرور ہے، یہی حال، بدرجۂ اتم حاسۂ مذہبیت کی تعریف کا ہے۔ خود عالمان دین اس کی تعریف پر متفق نہ ہوں، باطن شناسان حقیقت اور رمز آشنایان معرفت

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست

کہہ کر چپ ہوجاتے ہوں، تو نفسیات داں ایک تعریف پر کیونکر قائم اور متفق ہوسکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مذہبیت کے لازمی عناصر تین ہیں، عمل، ایمان اور مذہبی تاثرات لیکن ان تینوں کی ہم آہنگی ضروری ہے، محض عقیدہ بغیر عمل صالح کے، مذہب کے مفہوم سے اتنا ہی مستبعد ہے، جتنا کہ محض اخلاقی عمل بغیر ایقان اور ایمان کے۔ پس ان مختلف اجزا کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ ہماری بحث کسی خاص عرفی مذہب سے نہیں بلکہ ان کی قدر مشترک یعنی حاسۂ مذہبیت سے ہے، اس لئے ہم اس کی تعریف یوں کرسکتے ہیں کہ "انسان کے وہ تمام افعال، تاثرات اور تجربات جو اس عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں کہ ایک ہستی بزرگ و برتر موجود ہے جو حقیقت کا سرچشمہ اور نجات کا مدار ہے" یہ تعریف ہمارے موضوع کے لئے بہت موزوں ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا جاچکا ہے، ہمارا تعلق خاص خاص مذاہب اور ان کے مخصوص ارکان و عبادات و دیگر ادارات سے نہیں، بلکہ عبد اور معبود کے تعلق سے ہے یعنی اس حاسۂ روحانی سے جو ہر شخص میں موجود رہتا ہے، خواہ وہ اعمال و عبادات مذہبی کی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو، عالم لاہوت سے متعلق ہو، یا ناسوت کے، شریعت ہو یا طریقت، منصور کا نعرۂ "انا الحق" ہو

یا اس گنڈے کا عقیدہ تجسیم و تشبیہت جس کا مقصد الہٰی روپ کے کھاہو۔

ان دیکھی حقیقت پر ایمان | عشق مجازی کی طرح عشق حقیقی، جسے ہم نے احساسِ مذہبی کہاہو، کوئی ایک جذبہ نہیں، بلکہ وجدان ہے اور مختلف جذبات سے مرکب ہو۔ وجدان اور جذبے میں یہ فرق ہے کہ وجدان کوئی خاص جذبہ نہیں بلکہ ایک مجموعی ذہنی کیفیت یا رجحان نفس کا نام ہے جس کے ماتحت مختلف اوقات میں مختلف جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

اگر سوال کیا جائے کہ مذہبیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہو تو عام لفظوں میں اس کا جواب یہ ملے گا کہ مذہبیت کی بنیاد یہ عقیدہ یا ایمان ہے کہ ہمارے اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے، جس کے منشا کے ساتھ خود کو مطابق کرنا انسان کا خاص فرض ہے۔ اب سوال یہ ہو کہ خود اس

"دیکھے بھالے بن سوجھے ‎ ‎ ‎ ‎ جانے پہچانے، بن بوجھے"

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے۔ جب ہم ایمانی کیفیت کے اثر پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت وجود باری تعالیٰ کا احساس (تصور نہیں، بلکہ احساس)، ایک حقیقت محسوس کی طرح انسان کے ساتھ رہتا ہے، بقول امام غزالیؒ کے

"طریقۂ تصوف پر کاربند رہنے سے ایک ایسی وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی حیثیت ایک صریحی ادراک کی سی ہوتی ہے، جیسے کہ انسان خود اپنے ہاتھ سے کسی چیز کو ٹٹول رہا ہو"

اتصالِ ایمانی سے ان دیکھی حقیقت، دیکھی بھالی، سمجھی بوجھی حقیقتوں سے زیادہ حقیقی بن جاتی ہو اور جس طرح ایک مقناطیس کی جنبش سے گرد و پیش کی آہنی اشیاء مقناطیسیت سے بھر جاتی ہیں، اسی طرح سے ایمانی مقناطیسیت انسانی شعور کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کے حواس پر غالب آجاتی ہے، کائنات کا ہر ذرہ تجلی زار نظر آتا ہے۔ صفاتِ الٰہی، رحیمی و کریمی، جباریت و قہاریت عدل و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

ایمان باللہ کے اجزائے نفسی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود یہ ایمانی کیفیت جس سے ان دونوں کی حقیقت موجود بن جاتی ہے، کیا چیز ہے؟ عقیدہ یا ایمان کے پانچ نفسی محرکات ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں یعنی (۱) سب سے پہلے روایتی بچپن کی تعلیم اور ماحول کا اثر جسے ہم اثر پذیری یا انفعالیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ (۲) دوسرے فطرت کے حسن و جمال کا تصور اور کائنات کے توازن اور ہم آہنگی کو دیکھ کر مبدء فیاض کا یقین۔ اسے ہم فطری عنصر کہہ سکتے ہیں۔ (۳) تیسرے اخلاقی کشمکش کا احساس اور اس سے ایک اعلیٰ اخلاقی مقنن کے وجود کا یقین اسے ہم اخلاقی عنصر کہیں گے (۴) چوتھے داخلی تاثری عنصر مثلاً انسان میں مذہبی جذبات کا پیدا ہونا، انکسار، کسر نفس، سوز و گداز، رقت قلب وغیرہ صوفیانہ کیفیت نفسی اسی عنصر میں آتی ہے (۵) اور سب سے آخر میں عقل و استدلال کا عنصر مثلاً نظام کائنات کی باقاعدگی اور ترتیب سے یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا کہ اس مستمر انتظام عالم کا خالق کوئی نہ کوئی صاحب مشیت ہستی ضرور ہے۔ ہم اس ترتیب سے فرداً فرداً ان عناصر خمسہ سے بحث کریں گے۔

(۱) روایتی عنصر یا اثر پذیری۔

انسانی سیرت کی تشکیل میں تفکر اور استدلال کا دخل اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی عادتوں، اس کے اخلاق اور اس کے معتقدات کو سانچے میں ڈھالنے والے زیادہ تر ماحول تعلیم اور تربیت کے اثرات ہوا کرتے ہیں۔

ہمارے مذہبی عقائد میں بھی بہت زیادہ دخل بچپن کے ماحول اور تعلیم و تربیت کا ہوتا ہے کوئی بچہ ذات باری تعالیٰ کا ایمان، عقلی ثبوت سے نہیں بلکہ ماں کی گود میں، یا خاندان والوں کے اعمال و اقوال کی وجہ سے حاصل کرتا ہے اور اس طرح جو بنیادیں قائم ہوتی ہیں وہ اٹل ہوتی ہیں۔ دوسرے اس کے علاوہ، انسان خود اپنے نفس پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ دعا اور عبادت کا اثر اسی قسم کا خود آفریدہ اثر ہوتا ہے۔ انسان جب صدق دل سے دعا مانگتا ہے تو اپنے قلب میں طمانیت اور سکون کا اثر پاتا ہے۔ عبادت میں خضوع و خشوع سے نفس میں انکساری اور فروتنی پیدا ہوتی ہے۔ مرشد کے سامنے حاضر ہو کر مشکلیں بیان کرنے سے نفس کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ارشاد و ہدایت سے نفس کو رہبری ملتی

ہے، منتشر ذہن میں یک سوئی پیدا ہوتی ہے۔ ہر مذہب کی عبادت کا فلسفہ زیادہ تر اثر پذیری ہی کے ضمن میں آتا ہے۔ عبادت کے ارکان و قواعد ایسے ہوتے ہیں جن سے نفس کی اثر پذیری بڑھ جاتی ہے۔ جسمانی طہارت و پاکیزگی کا انعکاسی اثر ذہن پر پڑتا ہے۔ عبادت گاہوں کی خاموش فضا احترام کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ حضورِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ عبادت کے الفاظ سے تسکین ہوتی ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

نہ صرف عقیدہ یا ایمان، بلکہ ہر قسم کے معتقدات اور ہر قسم کی تعلیم بھی اسی انفعالیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک عالم کے علمی معتقدات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی یہی عنصر موجود ملے گا۔ نفسیاتِ جدیدہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آج اس نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ انسانی زندگی تعقل اور استدلال کی اتنی ماتحت نہیں ہے جتنی جذبات و وجدانات کی۔ نظامِ نفسی ارسطو اور مل کے منطقی قوانین کا اتنا پابند نہیں ہے جتنا والہانہ جذبات و وجدانات کا۔ انسانی زندگی میں جو کچھ خوشگواری پائی جاتی ہے، ہمارا مذہب، ہمارا ادب، ہمارے فنونِ لطیفہ سب کا سرچشمہ یہی غیر فکری عناصر ہیں اور یہ انسان کے لئے باعثِ ننگ نہیں ہیں۔

(۲) فطری عنصر

مناظرِ فطرت اور حسنِ قدرت کا دخل عقیدہ یا ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ رہا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ انسان وحشی اور غیر متمدن تھا، اس کے پاس مذہبی سہارا نہ تھا اور نہ روحانی سرمایہ، وہ فطرت کے جمال میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھتا تھا، پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر اسے ایک وجود کی طرف متوجہ کرتی تھی، سورج کی خشگیں کرنوں میں چاند کی ٹھنڈک میں صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اسے آیاتِ الٰہی نظر آتی تھیں اور وہ اپنے عقیدے کا اظہار ان کی پرستش سے کرتا تھا۔ آج اگرچہ ان محدود اور مخصوص معنوں میں مظاہر پرستی دنیا میں نہیں پائی جاتی، لیکن فطرت کے حسین مناظر اب بھی دیکھنے والوں سے احترام اور عقیدت کا خراج وصول کرتے ہیں۔ سخت سے سخت دل پگھل جاتے ہیں اور بے حس لوگ بھی "فتبارک اللہ احسن الخالقین" پکار اٹھتے ہیں۔

اس ایمان آفریں احساس فطرت میں ہمیں تین قسم کے نفسی تجربات نظر آتے ہیں، احساس رحمت الہی، احساس توازن کائنات اور احساس حسن و جمال، یہ تینوں اجزا انسان کے دل میں ایمانی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کیفیت کو صوفیانہ کیفیت نفسی بھی کہتے ہیں۔

(۳)۔ اخلاقی عنصر

انسان کو عالم صغیر کہا گیا ہے اور عالم کبیر کی طرح یہ عالم صغیر بھی یعنی نفس انسانی بھی محل کون و فساد ہے۔ ایک طرف تو انسان کے طبعی تقاضا و ، خواہشیں جبلتیں اور جذبات ہیں جو آمادہ اظہار رہتے ہیں اور تسکین چاہتے ہیں، دوسری طرف عالم خارجی میں ایک عنصر ایسا موجود ہے جو ہمیشہ ان فطری تقاضاؤں کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ اس سے متصادم ہوتا رہتا ہے۔ یہ خارجی عنصر کیا ہے، ملک یا جماعت کا اخلاقی قانون، اولاً جب کوئی انسان، اپنے نفس میں متضاد جذبات و خواہشات کی ہنگامہ آرائی دیکھتا ہے، کچھ رجحانات ایسے پاتا ہی جو اسے اتباع قانون کی طرف مائل کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اسے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی پر آمادہ کرتے اور ابھارتے ہیں تو وہ بر خود تیاسی کے تقاضے سے مجبور ہو کر، جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، تائیدی رجحانات کو "خیر" اور تردیدی خواہشات کو "شر" سمجھتا ہے اور انھیں دو علٰحدہ علٰحدہ قوتوں سے منسوب کرتا ہے، یعنی رحمانی خیالات اور شیطانی خیالات دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انسان اس تصادم کے احساس ہی سے فطری طور پر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس اخلاقی دار و گیر میں انسان کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے اور شر سے بچانے کے لئے ایک اعلیٰ مقنن کا وجود ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی جماعت کا اخلاقی قانون اور عدالت کے تادیبی قوانین ایک حد تک انسانی کردار کی نگرانی کرتے ہیں لیکن صرف انھیں کا اثر انسان کو خیر پر قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ان قوانین سے زیادہ سے زیادہ وہ اخلاق پیدا ہو سکتا ہی جسے انگریزی میں Daylight Morality "اجالے کا اخلاق" کہتے ہیں، یعنی اگر کوئی دیکھتا نہ ہو، اگر اپنا خود ذہن پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو، قانونی شکنجے سے بچنے کا موقع ہو تو پھر انسان بدی کر سکتا ہی۔ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الطبع شخص اس اخلاق کو اچھا نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے وہ تقاضائے فطرت سے اس عقیدے پر مجبور ہوتا ہے کہ

صحیح معنوں میں ضبط اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے ہو سکتا ہے، یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خبیر ہستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف ہر انسان کو آخر میں جانا ہے۔ بعض طبائع اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے تمام افعال کا سرچشمہ محبت الہی ہوتی ہے، اور بعض طبائع میں حاسۂ مذہبی کی محرک خشیت الہی ہوتی ہے۔ کسی کو شان رحیمی و کریمی کے تصور میں ایمانیت کا لطف آتا ہے تو کسی کو جباریت اور قہاریت کے تصور میں۔ کسی کی مذہبیت میں تولا، غالب ہوتا ہے تو کسی کے یہاں تورع۔ کوئی پابندی شریعت سے تسکین قلبی حاصل کرتا ہے تو کسی کو جادۂ طریقت میں اپنا مطلوب مل جاتا ہے۔ غرض تفقہ، شریعت اور تورع میں اخلاقی عنصر نمایاں ہوتا ہے، یعنی ذات باری تعالیٰ کو ایک اعلیٰ مقنن سمجھنا عقوبت الہی کے خوف کو ہر وقت سامنے رکھنا امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تصوف، طریقت اور تولا میں تاثری عنصر غالب ہوتا ہے، یعنی محبت الہی اور عشق حقیقی کے جذبات قلب پر وارد کرنا، ایمانیت کا جزو دونوں میں ہے۔ فرق صرف طریقے میں ہے

(۴) داخلی تاثری عنصر۔

مذکورہ بالا بحث ہمیں خود بخود مذہبیت کے داخلی تاثری عنصر کی بحث کی طرف لے جاتی ہے۔ نفسیات میں تاثرات کی اصطلاح، جذبات، وجدانات اور حسی حیلیات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ فلسفۂ مذہب، یا الہیات کے نام سے، مذہب میں عقلی عنصر داخل کرنے کی کوشش ہمیشہ کی گئی ہے اور جب تک انسان، انسان ہے اور اپنے یقین اور عقیدے کے لئے دلیلیں ڈھونڈتا رہے گا، اس وقت تک یہ کوشش بھی جاری رہے گی، لیکن مذہبیت کو علمیت اور فلسفے کی خراد پر چڑھانے کی اس کوشش کے باوجود، نفسیات مذہب کا مطالعہ انسان کو جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ حاسۂ مذہبیت، ہمیشہ ہر شخص کی جذبی اور تاثری حیات شاعرہ کا ایک راز ہے، اور سراسر ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے، مذہبیت کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں فلسفہ اور الہیات کی حیثیت مذہبیت سے زیادہ وہی ہے، جو ایک متن کے کسی غیر زبان میں ترجمہ کی ہوتی ہے۔

غرض مذہب کا اساس "سوز و گداز" ہے اور چونکہ اسی کو اصطلاح میں تصوف کہتے

ہیں، اس لئے اس حصے میں ہماری بحث خاص طور پر تصوف ہی سے ہوگی۔

اگر ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ انسانی زندگی کی خاص الخاص غرض اس کی سب سے بڑی قوت محرکہ کیا ہے، تو جواب ملے گا کہ خوشی کی تلاش، خوشی کس طرح حاصل کیا جائے، کہاں ڈھونڈھی جائے، کس طرح قائم رکھی جائے ۔ یہی خواہش از آدم تا ایں دم، بنی نوع انسان کے تمام افعال کی اصلی محرک رہی ہے جس حد تک کہ خدا سے لو لگانا، اور اس کی رضا جوئی انسان کے غمگین دل کو، جو عقلی جستجو اور کاوش فکری کا زخم خوردہ رہا ہو، مسرت سے مالا مال کر سکتی ہے، اس حد تک وہ ایمان باللہ پیدا کرنے میں موثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جذبہ مسرت کا عکس یعنی غم کا تاثر بھی انسان کے حاسہ مذہبی کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ دنیا گزشتنی و گزاشتنی ہو مایا جال ہے۔ یہاں قدم قدم پر کلفت اور مصیبت ہو، یا زنجیر انسانیت کے دم توڑنے کا نظارہ ہو، وار دگیر ہے۔ رستخیز ہے۔ یہ خیال بھی انسان کو حقیقی اور باقی مسرت کے سرچشمہ کی طرف لے جاتا ہے، وہ نجات کی تلاش کرتا، اور خدا کو پا لیتا ہو اگرچہ بادی النظر میں یہ دونوں پہلو، مسرت اور غم، رجائیت اور قنوطیت ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں۔ لیکن حاسہ مذہبیت کے بیدار کرنے میں دونوں یکساں طور پر موثر ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ہمیں یہ دونوں اجزا سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دو اساسی تاثرات کا جو اثر مذہبیت پر پڑتا ہے۔ اس کی اس مختصر بحث کے بعد اب ہم ان تاثرات سے بحث کرتے ہیں جو تصوف کی کیفیت نفسی میں پائے جاتے ہیں۔

تصوف | اصطلاح تصوف کی تعریف کی کوشش میں نہیں کروں گا۔ اس سے میری مراد نفس کی وہ تاثری کیفیت ہے جب عبد اور معبود کے درمیان وجدانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے، اب خواہ اس کیفیت میں رقت و سوز و گداز کا پہلو نمایاں ہو، یا مسرت آمیز وجد و حال کا۔ اس صوفیانہ کیفیت نفسی کی بہترین مثال اگر کچھ ہو سکتی ہو تو وہ عشق کی کیفیت ہو۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عشق مجازی کا معروض مادی اور محسوس ہوتا ہے اور عشق حقیقی کا معروض ایک تصور ہوتا ہے جس میں محسوسات کی کیفیت پائی

جاتی ہے۔ اگر صوفیانہ واردات قلب کی نفسیاتی تشریح کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان میں حسب ذیل چار خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ صوفیانہ کیفیت نفسی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ناقابل اظہار اور ناقابل بیان ہوتی ہیں۔ وہ

دل من داند و من دانم و داند دل من

کا مصداق ہوتی ہیں۔ انسان اگر اسی نفسی حالت کو بیان کرنا چاہے تو صرف مثالوں سے اپنا مطلب سمجھا جا سکتا ہے، بقول غالب

بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

جس طرح سے موسیقی سے کوئی کن رس ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے، یا عشق کی کیفیت کو کوئی عاشق ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح صوفیانہ کیفیات نفسی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسی قسم کے واردات قلب پر طاری ہوئے ہوں۔

۲۔ دوسری خصوصیت صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہوتی ہے کہ ان میں کسی قدر وقوفی یا ادراکی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی ایک خاص قسم کی بصیرت افروزی و بدۂ دل وا ہو جاتا ہے، اور بہت سے رازہائے راز کے محرم ہو جاتے ہیں۔ ان حالتوں میں غایت درجہ کی تجلیت اور معنویت ہوتی ہے جس کا اثر اس کیفیت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ان بصیرت افروز لمحات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کوئی عقلی دلیل یا منطقی بحث ان پر حقیقت لمحات زندگی کی معنوی قدر و قیمت کو کم نہیں کر سکتی۔

۳۔ تیسری خصوصیت، صوفیانہ کیفیت نفسی کی یہ ہے کہ وہ عارضی اور خواب آسا ہوتی ہیں، وہ بجلی کی طرح کوند کے غائب ہو جاتی ہیں اور انسان ہی لب تشنۂ تقریر ہی رہ جاتا ہے۔

۴۔ سب سے آخری خصوصیت ان کی اضطراریت اور انفعالیت ہے۔ اگرچہ خارجی ذرائع سے انسان اپنے نفس کو ان کیفیات کے نزول کے لئے تیار کر سکتا ہے، مثلاً بعض جسمانی ریاضتوں یا

آسنوں سے، یا موسیقی اور بخور کی مدد سے، یا دمیان اور سماوی کے ذریعے سے لیکن جب ایک مرتبہ یہ حالت طاری ہوجاتی ہے تو اس وقت نفس کی کیفیت سراسر انفعالیت کی ہوتی ہے۔

رشتہ در گردنم، افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

وہ ایک باطنی قوت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوتا ہے، خیالات پر بھی اسی قوت کی حکمرانی ہوتی ہے، قوت ارادی سلب ہوجاتی ہے۔ اکثر تو شدت تاثر کی وجہ سے بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ چونکہ اکثر دماغی امراض میں بعینہ وہی مظاہر نظر آتے ہیں جو صوفیانہ کیفیات نفسی میں مثلاً التباس کی حالت میں آدمی نئی نئی شکلیں دیکھتا ہے، اور نئی نئی آوازیں سنتا ہے صرع کی حالت میں بھی خاص خاص احساسات ہوتے ہیں، ہسٹریا کی حالت میں رقت قلب بڑھ جاتی ہے اور فقدان حس (Anaesthesia) کی صورت میں اعضا جسمانی معطل ہوجاتے ہیں، اس لئے معترضین کے لئے اس سے زیادہ آسان اور کوئی بات نہیں ہے کہ وہ صوفیانہ کیفیات نفسی کو بھی خاص خاص اعصابی امراض سے منسوب کردیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ گویا ایسا کرنے سے ان کیفیات نفسی کی ساری معنویت غلط ثابت ہوجائے گی۔ پروفیسر ولیم جیمس نے جو باتفاق رائے امریکہ کے اس صدی کے سب سے زیادہ مستند اور متبحر عالم نفسیات ہیں، اپنی کتاب . Varieties of Religious Experience (تجربات مذہبی کی گوناگونی) میں جس سے میں نے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اس طرز خیال کا نام "طبی مادیت"، رکھا ہے، اور اعتراضات پر گہری نظر ڈالی ہے، میں انھیں کے الفاظ آپ کے سامنے بیان کئے دیتا ہوں اور چونکہ یہ کسی "صوفی" کے نفظ نہیں، بلکہ ایک مشہور روزگار فلسفی اور ماہر علم النفس کے الفاظ ہیں، اس لئے امید ہے کہ ہمارے معترضین ان پر غور کریں گے، وہ لکھتے ہیں:-

"طبی مادیت سینٹ پال کی مذہبیت کا خاتمہ یہ کہہ کے کردیتی ہے کہ دمشق کی سڑک پر جو مکاشفہ کی حالت ان پر طاری ہوئی تھی وہ "قفن موخری" کے ناسور کی وجہ سے تھی اور وہ صرع کے مریض تھے، سینٹ ٹریسا (St. Teresa) کے تقدس کا چراغ یہ کہہ کر گل کردیتی ہے کہ وہ ہسٹریا کی مریضہ تھیں، سینٹ فرانسس کو یہ کہہ کر ختم

کردیتی ہو کہ اسفل کی طرف راجع ہونے کا میلان ان میں موروثی تھا۔ جارج فاکس (George Fox) کو اپنے زمانے کی جھوٹی بناوٹ اور تلبیسات کی طرف سے جو نفرت تھی اور روحانی صداقت کے لئے اس میں جو بے چینی پیدا ہوگئی تھی اسے اختلال اعشار بتاتی ہو۔ کارلائل کے اقوال میں قنوطیت اور مایوسی کے جو ثمر پائے جاتے ہیں ان کی وجہ امعاء کا اختلال قرار دیتی ہو اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس قسم کے تمام نفسی ہیجانات جسم کی مرض پذیری کے نتائج ہیں اور بعض غدود کے غیر طبعی فعل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد طبی مادیت بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کہتی ہو کہ دیکھا میں نے ان تمام بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں کی قلعی کھول کے رکھدی نا!"

اس کے بعد پروفیسر ولیم جیمس فرماتے ہیں :۔

" اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ واردات ذہنی کے اس طرح محض واقعاتی بیان سے ان کی روحانی معنویت پر کسی قسم کا بھی اثر پڑتا ہے ؟ ویسے تو ہمارے ذہن کی کوئی حالت ارفع ہو یا اعلیٰ، صحیح الدماغی کی وجہ سے ہو یا عصبی امراض کی وجہ سے، انبساطی ہو یا حزنیہ ایسی نہیں ہے کہ کوئی نہ کوئی جسمی تغیر اس کی وجہ نہ ہوا ہو۔ علمی نظریے بھی ان جسمی تغیرات کا اسی طرح نتیجہ ہوتے ہیں جس طرح کہ مذہبی تاثرات، اور اگر واقعات کا پوری پوری طرح علم ہو جائے تو شاید ہم کو کٹر دہریے کے دہریت آمیز خیالات میں بھی جگر کے فعل کی خرابی اسی طرح نظر آئے جس طرح کہ آج (طبی مادیت کو) اس میتھوڈسٹ میں نظر آتی ہو جو اپنی روحانی نجات کے لئے بے چین ہے! "

آخر میں وہ اپنی قطعی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں :۔

" الغرض نفس کے کسی مذہبی تاثر کی جسمی وجہ بیان کرکے یہ دعویٰ کرنا کہ اس طرح اس کی اعلیٰ روحانی قدر و قیمت میں فرق آگیا ہو۔ سراسر ایک بے تکی اور غیر منطقی بات ہو۔ اگر یہی صحیح ہوتا تو پھر تو ہمارے کسی خیال اور کسی تاثر میں حتّٰی کہ کسی علمی نظریے میں بھی

کسی قسم کی حقیقت باقی نہ رہتی، اس لئے کہ ان سب پر یکساں طور پر انسان کے جسم کی حالت کا اثر پڑتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پس ہمیں چاہئے کہ اس کل معاملے پر دیانت کے ساتھ غور کریں۔ جب ہم کسی نفسی کیفیت کو دوسری نفسی کیفیتوں پر ترجیح دیتے ہیں تو کیا اس وجہ سے کہ ہمیں اس کے جسمی مقدمات معلوم ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ ہماری اس ترجیح کے صرف دو وجوہ ہوتے ہیں اولاً تو یہ کہ ہمیں ان نفسی کیفیات سے فوری مسرت ہوتی ہے یا پھر کہ ہم سمجھتے ہیں کہ انجام کار ان کے نتائج ہماری زندگی کے لئے بارآور ثابت ہوں گے ۔۔۔۔۔۔۔۔ الغرض صرف باطنی مسرت کا احساس یا ان نفسی کیفیات کا ہماری رایوں کے مطابق ہونا یا ان سے ہماری ضروریات کا پورا ہونا یہی وہ معیار ہیں جن سے کسی خیال یا اثر کی بھلائی برائی جانچی جاتی ہے۔"

صوفیانہ حالت کی بسیط ترین مثال تو وہ کیفیت ہے جو کسی شعر یا قول کو سن کر ہم پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ شعر ہم پہلے بھی سن چکے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ دل میں ترازو ہو کر نفس کے تاروں کو ایک خاص انداز سے چھیڑ دیتا ہے۔ اس شعر کی معنویت جیسی اس حالت میں ہم پر منکشف ہوتی ہے، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک نیا ہی جہان معنی ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح سے بعض مناظر قدرت، خوشبوئیں، روشنی اور اندھیرے کا سنجوگ، سطح سمندر پر دھوپ چھاؤں کا نظارہ، پھولوں کا کھلنا، یہ سب باتیں بھی نفس انسانی کے کل پرزوں میں کوک بھر سکتی ہے۔

اس کے بعد دوسری منزل یہ ہو سکتی ہے کہ ہم پر بعض اوقات دفعتاً اور بغیر ہمارے علم اور ارادے کے ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہم ایک نئے مکان میں داخل ہوتے ہیں، یا ایک اجنبی شخص سے ملتے ہیں، یا ایک بالکل ہی نئی بات سنتے ہیں، لیکن ذہن میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ جیسے ہم اس مکان یا شخص کو پہلے کہیں ضرور دیکھ چکے ہیں یا اس بات کو پہلے کہیں ضرور سن چکے ہیں۔ آپ میں سے اکثر حضرات اس کیفیت نفسی کا تجربہ کر چکے ہوں گے۔ اس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا، بس یوں سمجھے کہ

انچہ می بینم ، بہ بیداری است یارب یا بخواب

کی سی حالت ہوتی ہے جس میں ذرا دیر کے لئے ہی سہی لیکن ہمارا ادراک غیر معمولی طور پر وسیع ہو جاتا ہے۔ چارلس کنگسلے نے اپنے متعلق لکھا ہے :-

"جب میں میدانوں میں ٹہلنے کے لئے نکلتا ہوں تو اکثر یہ باطنی تاثر میرے نفس پر غالب ہوتا ہے کہ ہر چیز جو مجھے نظر آ رہی ہے کچھ نہ کچھ معنی ضرور رکھتی، بشرطیکہ میں اسے سمجھ سکوں اور بعض اوقات یہ احساس کہ میرے گرد و پیش حقائق و معارف ہیں جنھیں میں سمجھ نہیں سکتا، اکثر مجھ پر ایک ناقابل اظہار ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ تمھاری اصلی روح تمھارے نفس کی آنکھوں سے بجز صرف چند مقدس لمحات کے پوشیدہ رہتی ہے"

اس کے بعد خالص تصوف مذہبی کی منزل آتی ہے، ہر مذہب میں ہمیں صوفیانہ خیالات نظر آتے ہیں، اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان میں عجیب و غریب یک رنگی نظر آتی ہے۔ سینٹ ٹیرلیسا کے واردات قلبی پڑھیے جو ان کی کتاب .The Interior Castle میں بیان کئے گئے ہیں اور پھر ان کا موازنہ و مقابلہ مسلمان صوفیہ اور ہندو یوگیوں کے تجربات سے کیجئے تو ایک ایسی یکسانی اور مشابہت نظر آتی ہے کہ انسان اس اعتراف پر مجبور ہوتا ہے کہ ان لمحات زندگی میں واقعی ایک عجیب و غریب روحانی معنویت پائی جاتی ہے۔

اسلام میں تصوف کے مختلف مدارج کے متعلق آپ حضرات کے سامنے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں صرف حضرت امام غزالیؒ کی خود نوشتہ سوانح عمری سے ان کے ان ذاتی تجربات کو آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں جو صوفیانہ کیفیت نفسی پیدا کرنے کی کوشش میں انھیں ہوئے۔ چونکہ مسلمان صوفیہ میں اس قسم کی خود نوشت سوانحعمریاں بہت کم پائی جاتی ہیں، اس لئے امام غزالیؒ کے واردات قلب کی تشریح خود ان کی زبان سے سننا خالی از منفعت نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں :-

"تصوف کی غایت یہ ہے کہ دل ماسوا اللہ سے ہٹ کر صرف باری تعالیٰ کے تصور میں محو ہو جائے، چونکہ میرے لئے نظریہ عمل سے زیادہ آسان تھا اس لئے میں نے شروع میں تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور جو کچھ کتابوں کے پڑھنے یا سننے سے حاصل ہو سکتا تھا، وہ سب حاصل کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ طریقۂ صوفیہ کا خاص الخاص جزو ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کسی مطالعے سے نہیں، بلکہ صرف وجد وحال اور قلب ماہیت سے آشکارا ہو سکتی ہے۔ مثلاً غور کرو کہ صرف صحت اور شکم سیری کی تعریفوں کو جاننا اور ان کے اسباب وعلل سے واقف ہونا، خود صحیح الجثہ یا شکم سیر ہونے سے کتنا مختلف ہے؟ اور صرف یہ علم رکھنا کہ نشے کے اسباب کیا ہیں یعنی معدے سے ابخرات اٹھتے ہیں اور نشہ پیدا کرتے ہیں اور فی الواقع حالت نشہ میں ہونے میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ انسان جو نشے میں ہوتا ہے وہ نہ تو نشے کی تعریف جانتا ہے اور نہ اسے اس سے سروکار ہے کہ نشے کو علمی بحثوں سے کیا تعلق ہے۔ لیکن طبیب اگرچہ نشے میں نہیں ہوتا مگر اس کی ماہیت اور علامات سے واقف ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی فرق ترک لذات کی ماہیت سے واقف ہونے اور خود تارک لذات ہونے میں ہے غرضکہ جہاں تک کہ الفاظ سے تصوف کی ماہیت معلوم ہو سکتی تھی، وہ میں نے حاصل کر لی، لیکن جو کچھ باقی تھا وہ ایسا تھا جو کسی مطالعہ یا قال سے حاصل نہ ہو سکتا تھا، بلکہ صرف خود کو وقف حال کرنے اور تقوے کی زندگی بسر کرنے سے اس کی حقیقت کھل سکتی تھی۔"

سطور بالا سے آپ حضرات کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ نفسیات میں تصوف کی اصطلاح کسی خاص محدود معنی میں نہیں، بلکہ وسیع ترین معنوں میں استعمال ہوتی ہے، مذہبی اور غیر مذہبی ہر قسم کی صوفیانہ کیفیات نفسی اس کے مفہوم میں داخل ہیں، یعنی ایسی تمام کیفیات نفسی جو اپنی بصیرت افروزی، انفعالیت، ناقابل بیان ہونے کی خصوصیت اور عارضیت کی وجہ سے دوسری کیفیتوں سے متمائز ہوں۔ یہ حالت کسی خاص طبقے یا ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہندویت ہو، یا اسلام

بودھ مت ہو یا عیسائیت ہر مذہب کے صوفیانہ تاثرات میں ہمیں ایک سی کیفیت نظر آتی ہے، جو ایک اس وجہ سے ہے کہ اس کی قدر مشترک یعنی ایمان باللہ وہی ایک ہے۔

(۵) عنصر عقلی

اب ہم ایمانیت کے عناصر خمسہ میں سے پانچویں عنصر، یعنی عنصر عقلی سے بحث کرتے ہیں، اگرچہ مذہبیت سراسر ایک کیفی اور تاثری چیز ہے، تاہم عنصر عقلی کا دخل بھی اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ اور اگر ایمان آفرینی میں نہیں تو کم از کم ایمانی کیفیت کی توجیہ میں عقل و استدلال سے ضرور کام لیا جاتا ہے عقلی استدلال کی بھی اکثر صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انسان وجود باری تعالیٰ کا ثبوت پاتا ہے، یا اگر ثبوت نہیں پاتا تو لاادری کہہ کر چپ ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سلبی شکل ہی ہے بقول حالی۔

سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے — جس قوم نے رکھا ہے، انکار روا تیرا۔

سب سے پہلی دلیل جو وجود مطلق کی پیش کی جاتی ہے وہ ایک استخراجی قیاس منطقی ہے فلاسفہ میں سے ڈیکارٹ (Descartes) اور لائب نٹز (Leibnitz) نے اس قیاس سے اثبات واجب الوجود کے متعلق استنباط کیا ہے۔ ڈیکارٹ کی دلیل مختصراً یہ ہے۔

تصور الٰہی ایک مکمل ہستی کا تصور ہے۔

وجود ایک کمال ہے اور عدم وجود ایک نقص۔

ایک کامل ہستی میں صفت وجود کا ہونا ضروری ہے۔

پس خدا موجود ہے۔

دوسری عقلی دلیلیں تجربات انسانی سے ماخوذ ہیں، مثلاً علت و معلول کے سلسلے سے وجود باری تعالیٰ کا ثابت ہونا، دنیا میں کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا اور ہر علت کے لئے بھی کوئی نہ کوئی سابقہ علت ضرور ہونی چاہئے، اور اس طرح یہ سلسلہ علت اول یعنی خدا پر جا کر ٹھہرتا ہے۔ ایک اور دلیل یہ ہے کہ اشیاء عالم کی ہیئت ترکیبی ایک خالق کے وجود کا پتہ دیتی ہے، مثلاً ذوی الحیات کی ہیئت

ترکیبی میں ہمیں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جن کی توجیہہ محض طبعی قوانین سے نہیں ہوسکتی [illegible] کی زندگی اور ان کی جبلتیں، ان کے وجود کا منشا نظام کائنات میں صرف اپنے بقائے ذات کے علاوہ اور کچھ ضرور ہے تمام اشیا میں ایک واحد نظام کارفرما نظر آتا ہے۔ کثرت کے لباس میں وحدت جلوہ گر ہے، غرضکہ ان مختلف صورتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اشیاء کا کوئی نہ کوئی صانع ضرور ہے سب سے آخر میں اثبات واجب الوجود کی اخلاقی دلیل کا ذکر کروں گا جس کی تفصیل پہلے عنصر اخلاق کے ضمن میں کی جا چکی ہے یعنی اخلاقی تصادم سے خیر و شر کا تصور پیدا ہونا اور انسان کا خیر پر قائم رہنے کے لئے خدا کے وجود کو ضروری سمجھنا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ان دلائل کے بیان کرنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ فلسفیانہ حیثیت سے بھی یہ دلیلیں قابل قبول ہیں یا نہیں، میرے اس مقالے کے موجودہ حصے میں وہ ایک خالص نفسیاتی مسئلہ ہے، یعنی یہ کہ ایمانیت پر استدلال اور عقلیت کا اثر کیا ہوتا ہے؟ مجھے امید ہے کہ سابقہ بحثوں سے میرے سامعین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کے عقیدے پر زیادہ تر اثر ہمارے تاثرات و جذبات کا پڑتا ہے اور بہت کم عقل و استدلال کا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عقل کا حصہ بالکل ہوتا ہی نہیں ہے۔ معتقدات کی بنیاد خواہ تاثرات ہوں یا جذبات، لیکن ان کی جرح و قدح نقد و نظر میں زیادہ تر عنصر عقلی ہی کا دخل ہے بے ربط عقائد و خیالات کو کوئی ذہن قبول نہیں کر سکتا ایسے عقائد جو ہمارے مجموعی علم سے میل نہ کھائیں، درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ عقلیت کے معیاروں کے خاص خاص صورتوں میں مفید ہونے میں کسے کلام ہوسکتا ہے، ہمارا سارا فلسفہ اور ہمارے تمام علوم صحیحہ عقلیت کے معیاروں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

کیا فرض ہے کہ انسانی زندگی کی سی ایک پیچیدہ اور مختلف الحیثیات چیز بھی انھیں معیاروں سے جانچی جائے۔ اگر مجموعی حیثیت سے انسان کی حیات نفسی پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عقلیت اور منطقیت صرف اس کے ایک جزو کی تشفی کر سکتی ہے اور بس، یعنی صرف قوائے استدلالیہ کی، ان

قوتوں کی یہ بے زبان ہیں، دلیل بازی خوب کرلیتی ہیں، منطق بگھار لیتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ نفس کی دوسری خاموش لیکن طوفانی کیفیتیں بھی ہوتی ہیں یعنی آپ کی پوری غیر شعوری زندگی، آپ کے رجحانات، معتقدات، الہامات فطری، تاثرات اور وجدانات ان سب کے متعلق عقلیت کسی قسم کا ادعا نہیں کرسکتی۔ اس کے مقدمات صغرٰی و کبرٰی لے، جب تک کہ پہلے ان بے زبان قوتوں سے سند قبولیت نہ پالیں، تسلیم ہی نہیں کئے جاسکتے۔

حضرات، یاد رکھئے کہ جس طرح عقلیت عقیدے کی بنیاد کو متزلزل نہیں کرسکتی، اسی طرح سے محض عقلی دلیل اور منطق سے عقیدے قائم بھی نہیں ہوتے۔ اثبات واجب الوجود کے متعلق منطقی دلیلوں سے کسی کو اس کا یقین نہیں پیدا ہوسکتا۔ نری منطقی بحثیں ایمانی کیفیت نہیں پیدا کرسکتیں۔

ہندوستان میں جب سے انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس کا رواج ہوا، ایک تعلیم یافتہ طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جسے اس وقت تک چین ہی نہیں آتا جب تک کہ وہ صحف سماوی سے نیوٹن کا کلیہ کشش ثقل اور ڈارون کا نظریہ ارتقا ثابت نہ کردے، حاسہ مذہبی اور ایمانیت کو ان کوششوں پر ہنسی آتی ہے، اس کے تاثرات اور وجدانات ہی اس کے لئے کافی شہادتیں ہیں۔ وہ ان مخلص لیکن گم کردہ راہ عقل و دانش کے پتلوں سے اکبر کی زبان میں کہتی ہے۔

شعر میں کہتا ہوں، ہے تم کرو

سائنس کو صرف کلیات اور تعمیمات سے مطلب ہے، وہ ابر رحمت کو عمل حرارت و تقطیر کہتی ہے، اسے اس سے کیا بحث کہ غریب کسان اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ سراسر غیر شخصی ہے سائنس کا خدا صرف عمومی قوانین کا خدا ہے، بقول جیمس کے، وہ تھوک فروشی کرتا ہے، خوردہ فروشی نہیں کرتا غرض دنیائے مذہب میں سائنس ہو یا عقلیت، دونوں کے پاؤں "پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود" کے مصداق ہیں، حاسہ مذہبی ایک شخصی راز ہے، اور زیادہ تر شخص کے جذبات اور تاثرات پر منحصر ہے، اور یہ دل کی انجان گہرائیوں میں پرورش پاتے ہیں، اور انسان

کے حل پیا پیار نگ چڑھاتے ہیں

نفس انسانی کا مطالعہ ہمیں جس نتیجے پر پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نفس کی کچھ باطنی مشکلات ہوتی ہیں اور وہ ان کا حل تلاش کرتا ہے، حاسہ مذہبی، یا ایمانیت ہی ایک ایسا جامع الحیثیات حل ہے جو روح کے اکثر امراض کے لئے نسخہ شفا کا حکم رکھتا ہے، انسان اپنی ترکیب نفسی کے اعتبار سے بلکہ اپنی باطنی ضروریات کے تقاضے سے اس حل پر پہنچنے پر مجبور ہیں۔ چاہے نام مختلف ہوں ارکان وعبادات میں فرق ہو، نظریے الگ الگ ہوں لیکن ہر مذہب کی قدر مشترک، یہی حاسہ مذہبی ہے یہ جس کسی میں اور جہاں کہیں پایا جائے، کم از کم اتنا ہی قابل قدر ہے، جتنا کہ کوئی اور جذبہ۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں، تو ہم میں دوسروں کے مذہبی عقائد کے متعلق ایک ایسی بصیرت پیدا ہو سکے گی کہ خواہ ہم ان کے ہم خیال نہ ہوں لیکن ہمارے دل میں ان کے حاسۂ مذہبی کا احترام ضرور پیدا ہو جائے اور ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط
قاضی عبدالغفار صاحب کے نام

برادرم السلام علیکم - خدا انہیں تندرست رکھے اور خوش اور اسی طرح صداقت و صبر پر قائم - اگست میں چند دن کے لئے ایک دور سنسری پر لطف گرفت و مقابلہ طلب آگیا تھا - اسی زمانہ میں تم کو بھی شکایت کا موقعہ ملا تھا - میں نے اس کے بعد ہی تم کو ایک مفصل و مشرح خط یہاں کے حالات کا لکھا تھا جس میں ان سنسر صاحب کے عہد نظامی کے حالات بھی شامل تھے - مگر پھر اس خیال سے پھاڑ ڈالا کہ نئے سنسر صاحب کا طرز عمل بالکل مختلف تھا اور جب حالات ماضیہ بدل گئے تھے تو پھر ان کا تذکرہ بھی عبث تھا - اس کے بعد تم کو خط لکھتا مگر بھائی مجھے اس "شفاخانہ امن" کی "مس فلارنس نائٹنگل" بننا پڑا - بیگم صاحب پہلے علیل ہوئیں پھر گلنار کو انٹرک[1] ہوا - پھر جس دن وہ اچھے ہوئے اسی دن بیگم صاحبہ پھر علیل ہوئیں اور سخت تر - خدا خدا کرکے ان کو شفا ہوئی تو منظم کے ہمراہ ان کے دونوں بھائی آئے ہوئے تھے - ان میں سے بیچارہ مسعود اپنے ساتھ ساتھ انٹرک لایا - اس عمر میں یہ مرض نہایت خطرناک ہوتا ہے اور سوائے نرسنگ کے کچھ علاج ہی نہیں - چنانچہ اپنا سارا تجربہ تیمارداری کا کام میں لانا پڑا - شوکت صاحب بھی حرارہ لائے - پیر میں پھڑیا نکلی - جوش میں آ گئے - ہم نے لاکھ کہا کہ ہمارا مرہم لگاؤ - اچھے ہو جاؤ گے مگر نہ مانا - نتیجہ یہ ہوا کہ نہ جذبات تراوش کئے بغیر نہ رہے اسسٹنٹ سرجن سے چیرا لگوایا - اس میں لیکن کچھ مادہ فاسد داخل ہو گیا - (؟ Esithemia) میں مبتلا

---

(۱) میعادی بخار

ہوگئے۔ آج مادہ ٹخنے کے پاس ہو تو کل ران پر اور پرسوں گھٹنے میں یا پنڈلی میں۔ ڈاکٹر نے دس بارہ مسہل دیئے تب جا کر بخار اور (Casithemia ؟) سے نجات پائی۔ سو وہ بھی بفضلہ تعالیٰ اچھا ہوگیا۔ مگر بیچارے مظہر کی درگا پوجا تباہ ہوگئی۔ چنانچہ یہ کیا گیا ہے کہ میری بیوی بچے جو سال بھر سے یہاں پڑے سڑ رہے تھے اور پے در پے علالتوں کے باعث تبدیل آب و ہوا کے مستحق تھے۔ رام پور جانے والے تھے۔ انہیں میں نے بانکی پور بھیجدیا ہے ۵ اپریل ۱۹ تک ان شاء اللہ وہاں رہکر گھر چلے جائیں گے۔ جب تک ہمدرد جاری تھا ایک ذریعہ آمدنی موجود تھا۔ سنسر صاحب کی عنایت نے اسے بھی بند کرا دیا۔ پریس بھی بند کر دیا گیا۔ مکان کا کرایہ اب تک دینا پڑتا ہے۔ اب صرف (sub sistence allowance. (۱)) ہی ذریعہ معاش رہگیا ہے اس لئے کہ جائداد موروثی کو تو مدتوں سے شوکت اور میں ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور اس کی آمدنی محض ان اعزا کے لئے چھوڑ دی تھی جن کی کوئی دوسری آمدنی نہ تھی۔ ہاں ہمدرد و کامریڈ کی بدولت تینتالیس ہزار کی جائداد پہلے رہن رکھدی تھی۔ اب نظر بندی کے زمانہ میں شوکت فیکٹری کے سود کی بدولت یہ ہو رہا ہے کہ ساٹھ ہزار کی جائداد فروخت کر رہے ہیں تاکہ سب قرض ادا ہو جائے۔ یہ جائداد جیسا کہ تم جانتے ہو۔ دادا صاحب مرحوم کو ملی تھی۔ غدر میں گورنمنٹ کو صوبجات متحدہ میں انہوں اور ان کے آقائے نامدار نے بچا دیا تھا۔ شکر ہے کہ جو صلہ اس وقت ملا تھا وہ آج پوتوں کی طرف سے اسی گورنمنٹ پر تصدق کیا جا رہا ہے۔ ہَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ۔ شرمندگیِ احسان دور ہو جائے گی۔ یہ بارِ خفت گراں تھا۔ خدا نے خوب سبکدوش کیا۔ گورنمنٹ کو اطلاع دیدی ہے کہ اب کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ الاونس جب صرف اپنے اخراجات کے لئے مقرر ہوئی تھی ناکافی تھی۔ مگر خدا کا دیا بہت کچھ تھا اس لئے علاوہ اصول کی بحث کے کہ نظر بندوں کو الاونس ملے یا نہ ملے کچھ نہ کہا گیا۔ سال بھر سے یہ اندھیر کہ بیوی بچوں کے

---

(۱) روزینہ جو بہ حالت نظر بندی مولانا کو ملتا تھا۔

لئے بھی اسی میں سے نکالا جاتا ہے۔ تمہارا تعذر کیا ہے۔ خود گورنمنٹ کے عہدہ دار اس کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ شوکت (جنہیں علاوہ رامپور کے گاؤں کے ٹھیکہ کے جس میں سے چار سو ماہوار ملتا تھا گورنمنٹ خود چھ سو کے قریب ماہانہ دیتی تھی) اور میرے لئے مع متعلقین کے یہ ڈھائی ڈھائی سو کہاں تک کافی ہو سکتے ہیں۔ امید ہے کہ جس رزاق نے رزق میں پہلے فراخی عطا فرمائی تھی وہی آج بھی عطا فرمائے گا۔ اور الاؤنس میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور سفر خرچ گورنمنٹ ادا کرے گی۔ بغیر (separation allowance[1]) کے سخت مشکل ہو گی۔ مگر ہم آخر پیدا ہی کس لئے کئے گئے ہیں جانتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں ہمارے بھائی ہیں جنہیں ہماری اسیری کی روزی اور رزق قارون کا خزانہ معلوم ہوتا ہے اگر وہ زندہ رہ سکتے ہیں اور خدا کا شکر بجا لاتے ہیں تو ہم یہ کیوں نہیں کر سکتے۔

جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ خود لارڈ چانسلر سابق قانون تحفظ ہند کو گورنمنٹ اور کونسل واضع آئین و قوانین کے اختیارات قانون سازی کے باہر سمجھتے ہیں۔ اور انڈیا آفس کو خود اس کا اعتراف ہے خیال ہوا ہے کہ اس کے متعلق کچھ کارروائی کروں چنانچہ مظہر کو بلایا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے احتیاطاً گورنمنٹ سے بھی استصواب کر لیا ہے۔ اور گورنمنٹ نے انہیں اطلاع دیدی ہے کہ مظہر شوق سے آ سکتے ہیں۔ نہ معلوم بیچارہ کو فرصت بھی مل سکے گی یا نہیں۔ اگر محرم میں آ گئے تو اچھا ہو گا۔ ارکو بال بچے بانگی پور گئے۔ آج شب کو والدہ آ رہی ہیں۔ ارہی کو حیات آ گیا۔ اس لئے دل نہیں گھبرایا اور یہاں تو عقیدہ ہے کہ

انساں بجائے خود بھی ہے اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اب زیادہ نہیں لکھتا۔ اب سلسلہ پھر جاری ہو گیا ہے اس لئے متوقع رہو کہ مزیدار خطوط پھر آیا کریں گے۔ کہو (Times[2]) تو شاید اب نہ آتا ہو۔ کیا (Near East[3])

---

(۱) گھر بار سے علیحدگی کا الاؤنس (۲) اخبار لندن ٹائمز (۳) اخبار نیر ایسٹ۔

بھی بند ہوگیا۔ اخبار اور رسالے جو ضرورت سے زائد ہوں بھیجدیا کرو۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ خوب کام کر رہے۔ واللہ بسا اوقات رشک آتا ہے۔ اگر اپنی تعلی نہ سمجھو تو کہوں کہ اردو کے محمد علی ہو۔ یہ مجھے ختم ہوں گے تو نہ معلوم اخبار کی پھر ضرورت بھی رہے یا نہیں لیکن اگر سب کچھ نکالنے کے بعد پھر بھی اخبار نکالنا پڑا تو ہمدرد ہوگا اور تم۔ میں تو پنشن لے لوں گا اور صرف زبان کے چٹخارے لیا کروں گا۔ حیا تو سلام کہتا ہے۔ شوکت جہاں فرماتے ہیں کہ میرے سر پر قرارۃ آمین کا بھوت سوار ہے۔ خدارا کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے اس کا کلام بھجوا دو۔ صداقت کے چند مدّاح یہاں موجود ہیں۔ سب شوق ملاقات کا اظہار کرتے ہیں۔ میاں حسرت کی غزل کیا خوب درج کی ہے۔ سب مرصع ہے۔ مگر ہمارے (Taste[1]) کے چند اشعار مع مقطع کے لاجواب ہیں۔ شوکت کا ارادہ ہے کہ بھائی رضا علی (بھائیو سلام علیکم") کو ایک کارڈ لکھیں۔ بجواب ان کی تکملی چٹھی کے کہ میری رائے ہے کہ بہتر تو یہ ہو کہ آپ سرے سے کلکتہ جائیں ہی نہیں۔ اور اگر "علمی بحث" کا اس قدر شوق ہے تو یہاں چلے آیئے۔ ہم دونوں بھائی کافی مسالہ فراہم کر دیں گے۔ اچھا رخصت تمہارا

محمد علی

---

(۱) مذاق۔

ایران جدید

ہندوستان کی افسوسناک فرقہ وارانہ کشمکش نے دہ تسکین حاصل کرنے کیلئے جس کی
ے قلب کو ضرورت تھی مجھے اس موسم گرما میں ایک ہمسایہ قوم کے آغوش میں پہونچا دیا مجھ
ں پہونچکر مایوس نہیں ہونا پڑا۔ ایرانی اپنے ملکی مراحل کو طے کرنے میں ایسی ہوشمندی اور
ن نظر سے کام لے رہے ہیں جو ہم سب کے لئے ایک اچھی خاصی مثال بن سکتی ہے، مذہبی
رقہ وارانہ اختلافات جن کی وجہ سے ہندوستان میں آپس کے مناقشات روز بروز
تے ملتے ہیں ان کا ایران میں نام بھی نہیں، وہاں تمام فرقے بہ حیثیت ایرانی باشندے
ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کو استوار کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ایرانی
ن ازدواج ہے جو کہ گذشتہ ستمبر میں پاس کیا گیا ہے، یہ قانون تمام ایرانیوں کے لئے
جس میں مسلمان، پارسی، عیسائی اور یہودی سب شامل ہیں اور تمام ملک نے اس کو
ہسے قبول کر لیا ہے۔ نابالغوں کے لئے جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو جسمانی لحاظ سے
دی کے قابل نہیں شادی کرنا قانوناً جرم قرار دیدیا گیا ہے، علاوہ ان نابالغوں کے
ں کی شادی ہو، تمام وہ اشخاص جو اس قسم کی شادیوں کے ذمہ وار ٹھہریں سزائے قید
ستوجب قرار پاتے ہیں جس کی میعاد ۳ سال تک رکھی گئی ہے۔ نکاح اور طلاق کی
ٹری کرانا ضروری ہے اور اس کی فروگذاشت کے جرم میں شوہر کو چھ ماہ کی سزائے قید
ملتی ہے۔ شادی کے وقت شوہر اور زوجہ کو حق حاصل ہوتا ہے کہ نکاح نامہ میں ایسے
رائط تحریر کرالیں جن کے مطابق فریقین کے آیندہ تعلقات کا فیصلہ ہوا کرے گا۔ جانبین
اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملت اور شریعت کے قدیم روایات پر قائم رہیں یا کوئی جدید
تیار کریں۔ بجز اس صورت کے کہ نکاح نامہ کے شرائط خود ازدواجی تعلقات کے منافی

جہاں ان عثرالکا کا نفاذ سرکاری عدالتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے جن میں علمار کے طبقہ کو
کوئی دخل نہیں ہو، نکاح کے رسم ورواج کا تعلق جہاں تک قانون سے ہو اس کو طبقہ علمار کے
ہاتھ سے قریب قریب بالکل نکال لیا ہے۔ اور یہ تعلیمیافتہ ایرانیوں کی عین خواہش ہو کہ ایسا ہی ہونا
چاہیئے۔ لارڈ کرزن جیسے سیاحوں کی رائے ہو کہ ایرانی فریبی اور ناقابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن یہ
ان کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے۔ ایرانی لوگوں کی تعریف کرنے میں الفاظ کا طومار باندھ دیتے
ہیں لیکن یہ محض ان کی خوش خلقی کا ایک راز ہی۔ ورنہ ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آپ
کو مشکل سے کوئی قوم ملے گی جس کے ہر طبقہ کے لوگوں میں یکساں طور پر تہذیب اور تمدن شائستگی
اخلاق اور مروت اس قدر پائی جاتی ہو جتنی کہ ایرانیوں میں ہے۔ بازاروں میں یا سڑکوں پر
کہیں گالی گلوج بیہودہ الفاظ سننے میں نہیں آتے۔ اگر ایران کی معاشرتی زندگی کا ہم اپنے
معاشرتی زندگی سے مقابلہ کریں تو دو باتوں میں نمایاں فرق پائینگے۔ اولاً یہ کہ وہاں نہ ذات پات
کا فرق ہے، نہ مختلف طبقوں میں نیچ اونچ۔ نہ بڑے بڑے امرا کا کوئی طبقہ ہو جو دولت سے سرشار
ہو، نہ فاقہ مستوں کا کوئی طبقہ ہو جو بالکل تباہ حال ہو۔ اس لحاظ سے ایرانیوں میں جتنی یک رنگی ہو
اتنی مشرق کے کسی دوسری قوم بلکہ شاید دنیا کی کسی قوم میں نہ ہوگی۔ مسلمانوں کے ورود
سے قبل ایران میں ذات پات کی خفیف سی جھلک پائی جاتی تھی۔ لیکن سامیوں کی فتوحات نے
اس کی بھی پوری طرح بیخ کنی کر دی، اس کے بعد پھر کبھی ذات پات کا رواج نہ ہو سکا۔ اب
وہاں کے تعلیمیافتہ طبقہ اور عوام الناس کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں۔ تمام ایرانی اپنے ملک کے
ہر باشندہ کو اپنا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں اور مساوات کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ اسی قسم کی سوسائٹی میں تعلیم یافتہ
طبقہ کے خیالات نہایت سرعت کے ساتھ عوام الناس تک پہنچ کر ان میں خود بخود اثر کر جاتے
ہیں اس کے علاوہ بخلاف ہماری قوم کے ایرانی جدید روشنی اور خیالات کو قبول کرنے اور اختیار
کرنے پر بالطبع بہت زیادہ مائل ہیں کسی نئے خیال کے وہ اتنے ہی گرویدہ ہوتے ہیں جتنے ہم اس سے متنفر
ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تاریخ ایران مسلسل تغیرات سے پر ہی جس کی کوئی مثال ہمارے ملک

کی تاریخ میں مشکل ہے۔ قرون وسطیٰ کا ابتدائی زمانہ تصوف کی نشو و نما میں گذرا اور اس کے بعد صفوی خاندان کی شہنشاہیت کا دور دورہ رہا بالآخر دونوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اور اب ان کا کوئی نام اگر کہیں باقی ہے تو صرف تاریخ و ادب کی کتابوں میں۔ ورنہ آج کل تو قوم پرستی یا ملت پرستی کا دور ہے ۱۹۲۱ء۔ ۲۰-۲۱ فروری کی درمیانی شب میں آدھی رات گذر چکی تھی کہ رضا خاں پہلوی نے (جو کہ اب اعلیحضرت پہلوی اول کے نام سے مشہور ہیں) طہران پر تسلط حاصل کر لیا۔ ایران کے اکثر مورخین تاریخ جدید کا آغاز اسی دن سے کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا جس کو ایرانی انقلاب کے نام سے یاد کرتے ہیں ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ایک مستقل دولت ملیہ کی تاسیس و تشکیل کی گئی۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی طرز زندگی اور خیالات میں ایک نیا نقطہ نظر نمایاں طور پر پیدا ہو گیا جسے ہم اصطلاحاً مغربیت کہہ سکتے ہیں۔ سلطنت پہلوی کی گذشتہ گیارہ سال کی حکومت میں تقریباً وہ تمام باتیں جن کا تعلق قرون وسطیٰ سے تھا یا تو معدوم ہو گئیں یا نہایت سرعت کے ساتھ معدوم ہو رہے ہیں۔ علماء یا مجتہدین جنہیں ایرانی اخوند کہتے ہیں۔ ان کا سیاسی بساط سے غائب ہو جانا تمام اصلاحات کے لیے سب سے پہلی اور ناگزیر شرط تھی۔ ۱۹۰۶ء کے دستور اساسی اور اس کے بعد ۱۹۰۷ء کے ضمنی دستور (— Constitution) دونوں نے مجتہدین کی حیثیت کو مستحکم کر دیا تھا تمام ملک کے اخوندوں کو حق دیدیا گیا تھا کہ وہ اپنی جماعت سے ۲۰ اشخاص منتخب کر دیا کریں مجلس ان ۲۰ منتخب شدہ اشخاص میں سے ۵ ممبران کی ایک مذہبی کمیٹی مقرر کر دیتی تھی جس کو اختیار حاصل تھا کہ وہ مجلس کے منظور کردہ قوانین کو مذہبی مصالح کی بنا پر مسترد کر دے۔ اس کے باوجود بھی اکثر اخوندوں نے خود دستور کو غیر مذہبی اور حرام قرار دیا بعد میں ان کے سرگروہ لوگوں سے دستور پر جبریہ دستخط کرائے گئے، مذہبی کمیٹی کا تجربہ ناکامیاب اور اس سے حکومت کے معطل ہو جانے کا اندیشہ ہوا اس لئے اس کو توڑ دینا پڑا ۱۹۲۴ء میں جمہوریت کی تحریک ایران میں نہایت شد و مد کے ساتھ اٹھائی گئی لیکن اخوند نے فتویٰ دیا کہ یہ بھی حرام ہے آخر مجلس نے اس مشکل اور کشمکش کو یوں حل کیا کہ قدیم خاندان شاہی کو ختم کر کے رضا شاہ کے سر پر تاج حکومت رکھ دیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب تک ان مسائل میں اخوندوں کا

اسوقت تک ایران نئی روشنی کے مطابق نہیں ہوسکتا تھا یہ بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہو کہ اس زمانہ میں سرکاری عدالتیں قریب قریب بالکل اخوندوں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن ان عدالتوں کا طریق کار اس قسم کا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ رشوت ستانی اور بدکرداریوں کی کوئی حد نہ تھی ان عدالتوں کے ضابطے اور شہادت کے اصول نہایت ہی قیانوسی تھے۔ گواہ کے قابل اعتبار ہونیکا انحصار اس قسم کی باتوں پر تھا کہ وہ کتنے تحائف دیسکتا ہے یا اس کی ڈاڑھی کتنی لمبی ہے۔ علاوہ بریں رویت ہلال معاہدہ اور قتل وغیرہ مختلف النوع معاملات کے لئے ایک ہی قسم کی عینی شہادت درکار ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں حالات زمانہ نے ایرانیوں کو مجبور کردیا کہ وہ ایک فیصلہ کن صورت اختیار کریں چنانچہ انہوں نے ایک نہایت عاقلانہ اور دلیرانہ فیصلہ کرلیا۔ رضا شاہ اور ان کی گورنمنٹ کی خواہش ہوئی کہ غیر ملکی سفارتوں کے عدالتی اختیارات کا خاتمہ کردیا جائے۔ لیکن دول خارجیہ نے معقول وجوہ کی بنا پر اس سے انکار کیا اور کہا کہ ہم اس وقت تک اس تجویز پر راضی نہیں ہوسکتے جب تک ایرانی عدالتوں کو مذہبی طبقہ کے ہاتھوں سے بالکل نکال نہ لیا جائے۔ ظاہر ہو کہ ان کے لئے اس امر پر راضی ہوجانا ناممکن تھا کہ غیر ایرانیوں کے مقدمات بھی اسی قانون کے ماتحت فیصل ہوا کریں جو اخوندوں یا مذہبی پیشواؤں کا بنایا ہوا تھا۔ عام اس سے کہ وہ قانون اچھا ہو یا برا۔ قانون اور عدالتوں کا از سر نو ترتیب دینے کا نازک اور مشکل کام شاہ نے ایک قابل ترین ایرانی یعنی وزیر عدلیہ آغا اختر علی خان کے سپرد کیا۔ مذہبی عدالتیں اب بھی باقی ہیں کیونکہ از روئے آئین ان کو کسی وقت توڑا نہیں جاسکتا لیکن ان کے تمام قانونی اختیارات سلب ہوگئے۔ اب ایران میں ایک درجن سے زیادہ مرتب شدہ قوانین اور ضابطہ جات نافذ ہیں بالعموم کہا جاسکتا ہے کہ نفس امری قوانین کے اصول اسلامی شریعت سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ قانون شہادت اور ضابطہ عدالت کی ترتیب میں فرانسیسی قوانین کی تقلید کی گئی ہے۔ اخوندوں کی جگہ قانون جدید کے ماہرین حاکمان عدالت کے عہدوں پر مامور کئے گئے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تمام تبدیلیاں عوام الناس کو اپنی مرضی کے خلاف زبردستی ماننا پڑیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے

ان کے کسی ایک باشندہ کو بھی اپنے مذہبی پیشواؤں کے طبقہ پر اعتماد باقی نہیں۔ اگر ان مذہبی
ن کا بس چلتا تو یہ شرارت آمیز فتوے جاری کر دیتے۔ لیکن نہ ان میں اتنی ہمت ہو اور نہ انہیں
موقع ہو۔ ان میں سے بعض نظر بند کر دیئے گئے ہیں اور باقی خاموش ہیں۔ بجز المدرس کے علماء
بقہ نے اپنے اس سخت ترین آزمائش کے وقت کوئی جری آدمی پیدا نہیں کیا اور سب ملکوں کی طرح
ن میں بھی ایسے لوگوں کی کوئی عزت نہیں کی جاتی جو اپنے عقائد کی خاطر مصائب برداشت کرنے کی
نہیں رکھتے۔

مذہبی علماء کے طبقہ کے فنا ہو جانے کے بعد ایران کو اس بات کا موقع ملا کہ ملکی معاملات
ترقی کی جدید راہ پر چل سکے۔ ملک کے مالی انتظامات کو ڈاکٹر ملس پاف اور ان کے امریکن ساتھیوں
۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک از سر نو ترتیب دیا اور اب یہ کام ایک نہایت قابل وزیر مالیات آغا
تقی زادہ کے ہاتھوں میں ہے جو کئی سال کی جلا وطنی کے بعد اپنے ملک کی خدمت کے لئے
گئے ہیں۔ اسی طرح نظام حکومت کا قریب قریب ہر شعبہ از سر نو درست کیا گیا ہے۔
شاہ نے پہلے اپنی وزارت جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد عہد بادشاہت میں سالہا
کی جد و جہد سے خود سر قبیلوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا۔ اور ملک کے ایک گوشہ سے
دوسرے گوشہ تک امن اور سکون پیدا کر دیا۔ تمام ملک میں جا بجا پولیس کی چوکیاں قائم
اور ایران کی پولیس نہ صرف اپنے کام میں مستعد ہے بلکہ شائستہ اور خوش خلق بھی ہے
اپنے کو اہل ملک کا ملازم سمجھتی ہے نہ کہ مالک و مخدوم۔ حکومت ایران بھی اور قومی حکومتوں کی
باشندگان ملک کی نجی زندگی میں بہت زیادہ دخیل ہے۔ اس لئے کہ نظام حکومت کے
قوم کی اصلاح مد نظر رہتی ہے۔ چنانچہ ہر ایرانی کے لئے اپنے نام کے ساتھ ایک
خاندانی نام کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اور اسے ہر وقت اپنے پاس پروانۂ شہریت رکھنا پڑتا ہے
میں پولیس اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات یعنی پیدائش، نکاح، طلاق، موت وغیرہ
باقاعدہ اندراج رکھتی ہے۔ لوگوں کی پوشاک کے متعلق بھی خاص خاص قاعدے ہیں جن کی

پابندی مفروضی ہے۔ ۱۹۲۹ء کے قانون کے بموجب ہر ایرانی مرد خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو ایران کی قومی پوشاک پہننے پر مجبور ہے جس سے مراد پہلوی ٹوپی اور یورپین کوٹ ہے۔ کالر اور ٹائی لگانا لازمی نہیں جو شخص اس قانون کے خلاف ورزی کرتا ہے اس کو ایک ہفتہ کی سزائے قید ہوسکتی ہے۔ یہ کہنا بے سود ہے کہ اس قانون کی ہر شخص پابندی کرتا ہے۔ دیہاتوں میں یہ پوشاک یورپین پوشاک کی ایک نہایت بدنما نقل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن طہران اور ارد گرد کے شہروں میں مردوں کے لباس کا معیار اسی قدر بلند ہے جتنا کہ یورپ کے دارالسلطنتوں میں۔

ایران کے مصلحین اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ وہ ترقی کی راہ میں رائے عامہ سے آگے نہ بڑھ جائیں اسی وجہ سے اگرچہ ایران میں گذشتہ ۱۰ سال کے اندر نہایت سرعت کے ساتھ اصلاحات رونما ہوئیں لیکن ان اصلاحات کا ردعمل کسی جگہ ظہور میں نہیں آیا نہ اس کا کوئی خطرہ پیدا ہوا حکومت کی طرف سے اصلاحی پالیسی کا یہ رخ آزادی نسوان کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے پردے کا جو مفہوم ہم سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ سے عورت کو بغیر سماعت مقدمہ تمام عمر کی سزائے قید دیدیجاتی ہے وہ مفہوم ایران میں کبھی نہیں سمجھا گیا۔ وہاں عورتوں کو شہر میں نکلنے، خرید و فروخت کے لیئے باہر اور ایک دوسرے کے مکان پر جانے آنے کی ہمیشہ اجازت رہی۔ قاچار کے عہد میں زمانہ صفوی کی قدیم خوبصورت نسوانی پوشاک کے بجائے مغربی رقص خانون کی پوشاک رائج ہوگئی، جو حد درجہ حیا سوز اور ناشائستہ تھی۔ گذشتہ چند سال کے اندر اصلاحات کے سلسلہ میں معمولی مغربی پوشاک اختیار کرلی گئی قبیلوں اور گاؤں کی عورتیں اب بھی قدیم پوشاک میں نظر آتی ہیں یہ ہندوستانی لہنگے کے ماتند ایک گھاگھرا ہوتا ہے۔ قصبات اور بڑے بڑے شہروں میں عورتیں فراک اور موزے پہنتی ہیں اور باہر نکلتے وقت ایک سیاہ برقعہ جس کو چادر کہتے ہیں ڈال لیتی ہیں۔ چہرہ اکثر کھلا رہتا ہے یا ایک سی نقاب پڑی رہتی ہے۔ اسی سلسلہ کے متعلق آیات قرآنی کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ ان میں چہرہ چھپانے کا حکم نہیں ہے، بلکہ عورت کی زینت یعنی جسم اور کپڑے چھپانیکا ہے، آزادی نسواں کی رفتار بہت تیز ہے طہران میں عورتوں کی ایک بہت قلیل روشن خیال جماعت نے چادر بھی ترک کردی ہے۔ آیندہ پانچ سال کے اندر یا شاید اس سے بھی پہلے قدیم طرز معاشرت کا بالکل

نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔

اب ہمیں ایران کی موجودہ قومی حکومت پر نظر ڈالنا ہے ۱۹۰۶ء میں مظفر الدین نے ایران کے دستور اساسی کے بنیادی قوانین پر دستخط کئے اور دوسرے سال ان کے بیٹے محمد علی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دستور اساسی کے اس ضمیمہ پر دستخط کریں جس میں علاوہ دیگر امور کے اس کا بھی اعلان تھا کہ فرمانروائی جمہور کا حق ہے محمد علی شاہ نے دستور اساسی کی خلاف ورزی کی متواتر کوشش کی جس کا انجام ان کے اخراج کی شکل میں نمودار ہوا اور ان کے بیٹے احمد شاہ کے زمانہ صغر سنی میں تمام اختیارات تمام دفاتر دستوری قائدین کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یہ زمانہ ایران کے لئے بہت خوشگوار تھا۔ روس اور انگلستان کے غالب اثرات نے آزادی ایران کو حرف غلط بنادیا۔ ملک کے نظم ونسق میں ابتری پیدا ہوگئی اور عمال حکومت کی حالت بگڑ گئی، باقاعدہ فوج کی تعداد کبھی مشکل سے ۳ ہزار تک پہونچتی ہوگی۔ مالیہ ایران کی نصف رقم ہضم کرلی جاتی تھی صوبجات میں مرکزی حکومت کے احکام ٹھکرادیئے جاتے اور ان سے اغماض برتا جاتا تھا۔ محصولات کا وصول کرنا دول خارجہ کے اثرات کی وجہ سے مشکل ہوگیا تھا۔ اور موروثی گورنران اور سرداران قبائل سرکاری مطالبات کا ایک حصہ بھی مشکل سے ادا کرتے تھے اور رہنمایان قوم بجائے اس کے کہ نظم ونسق میں اصلاح کی کوشش کرتے، اپنی جیبیں بھرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ مصائب ایران کا کسی کو بھی غم نہ تھا، کوئی مدبر اتنا دیانت دار نہ تھا کہ دوسرے کی قلعی کھول سکے۔ مدبرین کا یہ گروہ جس میں صرف یہی ایک خوبی تھی کہ وہ تمام بداعمالیوں کو سراہتا رہتا تھا برابر برسر اقتدار رہا یہاں تک کہ موسم سرما میں ایک رات ان میں کا ہر ایک اچانک گرفتار کرلیا گیا۔ رضا شاہ نے جو انقلاب برپا کیا اس کی تمامتر اہمیت اس میں مضمر ہے کہ اس نے پرانے مدبرین کے جتھے کو توڑدیا اور اس کی جگہ قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ ملک کی دستوری حکومت کے بادشاہ احمد شاہ ۵ سال اور رہے لیکن تمام اختیارات جدید پارٹی نے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھے۔ رضا شاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ فوج اور پولیس کی از سر نو تنظیم کی اور ان کے ذریعہ سے باغی سرداروں کو دبانا

شروع کیا اور ملک میں پھر امن و امان قائم کیا یہ کام انہوں نے غیر معمولی قابلیت سے انجام دیا اور دولت ایران یعنی مرکزی حکومت کا عاملانہ اقتدار سب پر قائم کیا، گذشتہ ۱۱ سال کے اندر دولت ایران کی تشکیل جدید طرز پر کی گئی جس میں مذہبی طبقہ کا کوئی دخل نہ رہا۔

ایران کے دستور اساسی کی تعریف میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہو سوا ان مذہبی تحفظات کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، یہ دستور بالکل بلجیم کے دستور اساسی کی نقل ہو، اس کی بہت سی دفعات ناقابل عمل ثابت ہو چکی ہیں۔ ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں جس کمیٹی نے یہ دستور مرتب کیا تھا اس کو کوئی سابقہ تجربہ اس کا نہ تھا۔ اس لئے قدرۃً اس نے مغربی ممالک سے وہ دستور منتخب کرلیا جو اس کے نزدیک جدید ترین اور بہترین تھا ۱۹۱۲ء کے آئینی دور میں اس دستور کی بہت سی دفعات جان بوجھ کر پس پشت ڈالدی گئیں اور جنگ عظیم کے زمانہ میں اس دستور کا عملاً خاتمہ ہوگیا۔ سابق حکومت کے مقابلہ میں پہلوی حکومت کو بعض اوقات (ڈکٹیٹر شپ) کہا جاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اولاً تو رضا شاہ اور ان کے عمال نے اپنے تمام اختیارات اسی طریقہ پر حاصل کئے۔ کیونکہ مجلس نے ان کو تخت شاہی پر بٹھایا اور دستور اساسی کی ان ترمیمات کا جن کی روسے بادشاہت نئے خاندان میں منتقل ہوئی یہ مفہوم بھی تھا کہ رضا شاہ اپنی اصلاحات کا کام شروع کریں گے دوسرے یہ کہ سوا دستور اساسی کی ان دفعات کے جن کو آئینی حکومت نے ناقابل عمل قرار دیکر رد کر دیا تھا، مثلاً سینیٹ ضلعے اور صوبے کی کونسلوں کا قائم کرنا، رضا شاہ نے اپنے تمام زمانہ حکومت میں بنیادی قوانین کی حرفاً و معناً نہایت دیانت داری کے ساتھ پابندی کی ہے جس بات سے دولت ایران پر ڈکٹیٹر شپ کا الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہو کہ مجلس کے لئے انتخابات کا طریقہ ایک بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔ دستور اساسی میں مجالس واضع قوانین کے دو ایوانوں کی شرط تھی۔ ایک سینیٹ ۶۰ ممبروں کی جن میں سے نصف تعداد بادشاہ کی نامزدگی کے لئے معین تھی اور نصف قوم کے انتخاب کے لئے۔ اور دوسری منتخب شدہ مجلس شوریٰ ملی جس کے ممبروں کی تعداد دو سو تھی۔ سینیٹ کبھی وجود میں نہیں آئی۔ اور فی الحقیقت ایک ایسے ملک

ہیں جہاں جماعت امرا اور اس کا احترام دونوں مفقود ہیں۔ دوسرے ایوان کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ مجلس کے ممبروں کا انتخاب دو سال کے لئے ایک یا متعدد حلقہ ہائے انتخاب سے عمل میں آتا ہے۔ موجودہ مجلس جو آٹھویں مجلس ہے، ۱۱۰ ممبروں پر مشتمل ہے۔ دستور اساسی نے مجلس کو وہ اختیار دے رکھے تھے جو دوسرے ملکوں میں مجالس واضع قوانین کو عموماً نہیں دیئے جاتے بلکہ وزیروں اور انتظامی افسروں کے سپرد ہوتے ہیں۔ کسی دوسری حکومت سے کوئی صلحنامہ بغیر مجلس کی منظوری کے جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تمام منشورات جو دربارہ ملازمت سرکاری صنعت و حرفت و معاشی رعایات بحق اشخاص غیر ملکی یا باشندگان جاری ہوں تاوقتیکہ ان کو مجلس منظور نہ کرے، ناجائز سمجھے جاتے تھے۔ حکومت کسی غیر ملکی شخص کا تقرر بغیر منظوری مجلس عمل میں نہیں لاسکتی۔ یہ کہنا ہی بیکار ہے کہ مجلس کو مالیہ پر پورا اختیار حاصل ہے۔ اور وزرا مجلس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ارکان مجلس کو اس وقت بشرح ۳۰۰ تومان (قریب ۶۰۰ روپیہ کے) مشاہرہ ملتا ہے لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے۔ کہ ایران میں سرکاری ملازمت کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ صرف ۳۱۲ تومان ہے البتہ اسمبلی کے صدر کی تنخواہ ۶۰۰ تومان ہے اور وزرا کی ۷۰۰ تومان (۱۴۰۰ روپیہ) مجلس کا عام اجلاس قریب قریب دو بار ہر ہفتہ میں ہوتا ہے۔ اجلاس بہت مختصر ہوتا ہے جو کبھی شاذ و نادر ۳ گھنٹہ سے تجاوز ہوتا ہوگا۔ تقریریں بھی بہت مختصر ہوتی ہیں لیکن اگر کوئی ممبر اعداد و شمار اور واقعات سے مسلح ہو کر طویل تقریر کرے تو یہ آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ ایران کی مجلس کے محاسن و معایب کے بارے میں جو بھی خیالات ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ مجلس اپنے زرق برق لباس و حسن اخلاق کے لحاظ سے دنیا میں بہترین مجلس ہے۔ ایوان مجلس کے باہر اکثر ارکان مجلس آپ کو تبسم آمیز احساس ذمہ داری کے ساتھ عالیشان باغ بہارستان کے قریب چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئیں گے مجھے صرف ایک ہی بار ممبروں کی جماعت سنجیدہ انداز میں گفتگو کرتی ہوئی دکھلائی دی اور میں پس و پیش کے بعد ٹہلتا ہوا ان کے پاس پہونچا۔ موضوع بحث مولانا جامی رحمۃ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مسودہ تھا جو حال ہی میں برآمد ہوا تھا۔ ایوان مجلس کے اندر مباحثے کوئی جوش نہیں [illegible]

مجلس وضع قوانین میں یا خود ملک میں، کوئی مخالف پارٹی نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کا مچو یا ٹھونگی نوبت نہیں آتی مطبوعہ مذاکرات (کارروائی) کا ایک ثلث حصہ صرف آداب والقاب پر مشتمل ہوتا ہے مجلس کا عام اجلاس نمائشی ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بس ان فیصلوں کو جو ہیں اور کئے جا چکے ہیں صرف درج کارروائی کر دیتا ہے مجلس ہر چھٹے مہینہ اپنے ممبروں سے ہر وزارت کے لیے اٹھارہ ممبروں کی ایک کمیٹی یا کمیشن مقرر کرتی ہے۔ اور ممبران کمیٹی یا بالفاظ دیگر کمشنران تمام سرکاری محکمہ جات کے تیار کردہ قوانین وضوابط پر بحث ومباحثہ کرتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کی سفارشات کو مجلس کا اجلاس عام منظور کر لیتا ہے۔ ممبروں کو مزید تقریر کرنے کے مواقع دینے کے لئے پارٹی کے جلسے منعقد کرنے کا حال میں انتظام کیا گیا ہے۔ پارٹی کا جلسہ بند کمروں میں ہوتا ہے لیکن اس کے گرد وپیش سے نمائشی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ حکومت قریب قریب ہر موقعہ پر اپنی رائے منوا لیتی ہے۔ ترکوں کی قوم پرور جماعت کے مانند ایرانیوں کی کوئی جماعت نہیں ہے ہم لوگوں کو ایرانی انتخابات عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ کل بالغ اشخاص کو ووٹ دہی کا حق حاصل ہے۔ البتہ سنگین جرائم کے سزا یافتہ لوگ اور دیوالئے جو ان افعال کی وجہ سے اس نوبت کو پہنچے ہوں۔ اور سیاسی مجرم حق ووٹ سے محروم ہیں لیکن قانون کی یہ فیاضی بیکار ہو جاتی ہے اس لئے کہ پہلے سے کوئی فہرست انتخاب کنندگان کی تیار نہیں کی جاتی۔

ہر حلقہ انتخاب میں انتخاب کا انتظام ایک مجلس کے متعلق ہوتا ہے جس کو مجلس نظارت کہتے اور یہ حکومت کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے۔ مجلس نظارت مختلف حلقوں میں ماتحت کمیٹیاں ووٹ جمع کرنے کے لئے مقرر کر دیتی ہے۔ امیدواران انتخاب کی باقاعدہ نامزدگی کا کوئی طریقہ وہاں رائج نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر سرکاری حکام اور مجلس نظارت رائے دہندوں کو ہدایت نہ کریں۔ تو ان کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کتنے امیدوار مقابلہ کے لئے کھڑے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ رائے دہندہ وقت مقررہ پر حاضر ہو جاتا ہے۔ اپنے ساتھ ایک سفید کاغذ کی پرچی لاتا ہے جس پر اس امیدوار کا نام پہلے سے لکھ دیا جاتا ہے جسے وہ منتخب کرانا چاہتا ہے۔ ہر شخص کے حق رائے دہندگی

کا فیصلہ مجلس نظارت اسی وقت اور اسی جگہ کر دیتی ہے اور اس کے بعد رائے دہندگان اپنی پرچی بکس میں ڈالدیتے ہیں۔ بالآخر رائے شماری ہوتی ہو اور کامیاب امیدوار کو ایک سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے جس میں یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ کل کتنے ووٹ آئے اور اس میں سے کامیاب امیدوار کو کتنے ووٹ ملے۔ اس قسم کے طریق انتخاب پر تنقید کرنا عبث ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کنندگان کی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے اس کا موقع نہیں رہتا ہے کہ اگر کسی شخص کو اسپر کوئی اعتراض یا قانونی چارہ جوئی کرنی ہو تو کرسکے یعنی یہ شہریوں کو ان کے ایک ایسے حق سے محروم کر دیا گیا ہے جو قانونًا ان کو حاصل ہو۔ پھر چونکہ امیدوار باضابطہ نامزد نہیں کئے جاتے۔ اس لئے عملاً گویا کہ رائے عامہ کا اظہار نہیں ہوسکتا۔ مجلس نظارت اپنے فرائض بیحد جوش اور قابل تعریف عملن پرستی کے جذبہ سے انجام دیتی ہو کہ بکس سے جو پرچیاں نکلتی ہیں ان کی تعداد عمومًا ان لوگوں کی تعداد سے کئی گنی زیادہ ہوتی ہو جو رائے دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ یہ اس وجہ ہو کہ قانون کے مطابق کوئی امیدوار بغیر کلی اکثریت کے منتخب نہیں ہوسکتا چنانچہ اگر مجلس نظارت کافی توجہ نہ کرے تو کوئی امیدوار کبھی منتخب ہی نہیں ہوسکتا۔ امیدوار کی نامزدگی کا کوئی طریقہ نہ ہونیکی وجہ سے ایک وقت سو سو امیدواروں کو ایک ایک حلقہ سے ووٹ دیئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے مجلس کو وہی کرنا پڑتا ہے جس کی اس صورت میں ضرورت پڑتی ہو یعنی فرضی اشخاص کی طرف سے پرچیاں بکس میں ڈالدی جاتی ہیں اور مجلس ان کو نظر انداز کر دیتی ہو یہاں تک کہ رائے شماری کا وقت آجاتا ہے۔ پھر پرچیوں کے شمار میں البتہ پوری دیانتداری سے کام لیا جاتا ہو اکثر تعلیمیافتہ لوگ اس قسم کے انتخابات کو تسلیم کرتے ہیں مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کسی تبدیلی کے خواہاں ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ انتخابات کے لئے ایک صحیح نظام قائم کرنے کی راہ میں بہت بڑی دشواریاں بھی ہیں۔ ایران کی آبادی بہت تھوڑی اور بکھری ہوئی ہو تقریبًا ۱۱ اشخاص فی مربع میل اوسط ہوتا ہے اس لئے عام رائے دہندگان کے لئے عملاً یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ مقام انتخاب تک پہونچ سکیں اکثر لوگوں کو تین یا چار دن کا سفر پیدل یا خچر پر طے کرنا پڑے گا اور

علاوہ یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر انتخاب کا کام باقاعدہ طور پر ہو تو کہیں سیاسی تجار کو آگے بڑھنے کا موقعہ نہ ملجائے اور یہ لوگ بآسانی بیرونی طاقتوں کے ہاتھ بک جائیں ۔ برخلاف اس کے قومی حکومت اس بات کی کوشش کرتی ہو کہ جن امیدواروں کو وہ منتخب کرائے وہ اپنے انتخاب کے بعد حب الوطنی۔ اور وطن دوستی کا ثبوت دیں ۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلوی حکومت قائم ہی اس وجہ سے ہوئی کہ ایران اصلاحات اور جدید تہذیب اور ترقیات کی راہ پر گامزن ہو جس قوم نے [illegible] میں اپنی مجلس موسسہ میں رضا شاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے لائحہ عمل کی تکمیل کے لیئے کوشش جاری رکھیں اس قوم نے اگر رضا شاہ کے مطلوبہ قوانین کی منظوری دی تو یہ کسی طرح قابل اعتراض نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک دور اصلاحات ختم نہ ہو جائے جمہوری اصول پر منتخب کردہ مجلس سے بجائے مدد ملنے کے رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ موجودہ رفتار اگر اسی طرح جاری رہی (اور اس رفتار کی سرعت کچھ کم نہیں) تو حکومت نے جو اصلاحات شروع کی ہیں ان کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں کم از کم دس سال صرف ہوں گے۔ ایران کی غیر ذمہ دار اور نیم دستوری حکومت نے ملک کو جو فائدہ عظیم پہنچایا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایران کے اکثر ادارات اس سے بالکل مطمئن ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ اصلاحات کا دور جب ختم ہو جائے گا تو موجودہ حکومت کی بجائے انگریزی نمونہ پر ایک آئینی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔

انقلاب سے پہلے اردو شاعری کی حالت

یہ ایک باب ہے عبدالقادر صاحب سروری کی کتاب "جدید اردو شاعری" کا جو عنقریب طبع ہو کر شائع ہونیوالی ہے

ادبیات کا تعلق قوم کی زندگی کیساتھ اسقدر گہرا ہو کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ قوموں کی حیات پر جتنے انقلاب آفریں واقعات گذرتے ہیں ان سے قومی شاعری بھی متاثر ہوتی ہے یہی سبب ہو کہ ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان کی شاعری مختلف زمانوں میں جداجدا رنگ رکھتی ہے انگریزی شاعری کے ارتقا کا مطالعہ کیجیے تو چاسر کے زمانے سے کچھ سال بعد سے لے کر سولھویں صدی کے وسط تک کا زمانہ بہت ہی بنجر اور قحط سالی کا دیگا مگر اس کے بعد ملکہ الزبتھ کی حکومت کا زمانہ آتا ہے جو انگریزی ادبیات کا زرین دور ہے پھر ۱۶۶۰ سے ۱۷۹۸ء تک انگریزی ادب اور شاعری کا معیار پست ہونے لگا تھا۔ اسی طرح اطالوی ادب میں بھی سولھویں صدی کے وسط کا زمانہ تاسو۔ ماریوتی اور چند دوسرے شاعروں سے قطع نظر کرکے شاعرانہ قابلیتوں کی خوابیدگی کا زمانہ ہے۔ اردو شاعری پر بھی اس کی مختصر حیات کے دوران میں کئی موافق اور ناموافق زمانے آتے جاتے رہے۔ اور اسی تعلق کی وجہ سے اردو شاعری اور ادب کا معیار گھٹتا بڑھتا رہا۔

اردو شاعری نے اپنی پیدائش سے لیکر اب تک کئی لباس بدلے۔ نہایت سرسری اور عام مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم تین دور اس شاعری کے گذرے ہیں سب سے پہلے اپنی پیدائش میں یہ زیادہ تر ہندی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی سرزمین اور اسی معاشرہ کے آب و گل سے اس کا خمیر ہوا ہے۔ بعد میں حاکم مغلوں کی زبان یعنی فارسی سے یہ اس قدر متاثر ہوئی کہ ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے یہ فارسی شاعری کا مثنیٰ معلوم ہونے لگی۔ پھر جب انگریزوں کا تس

ہندوستان پر ہوا تو مغربی شاعری کی طرف یہ زیادہ سے زیادہ مائل ہوتی گئی۔ گویا اردو شاعری کے بھی وہی تین دور ہیں جو خود ہندوستان کی تاریخ کے سمجھے جاتے ہیں۔

اردو شاعری پر موجودہ انقلاب آنے سے پہلے، اس کی جو حالت تھی اس پر ہم یہاں تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس باب کا مطالعہ موجودہ دور میں اردو شاعری کی اصولی تبدیلی کے اسباب، قارئین کرام پر اچھی طرح ظاہر کر دیگا۔ اور اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ ہم انقلاب سے قبل کی شاعری کا موازنہ جدید شاعری کے ساتھ بآسانی کر سکیں گے۔

اردو شاعری کا یہ دور انیسویں صدی کی ابتدا سے لیکر تقریباً ستر سال بعد تک ہے۔ اس زمانہ میں اردو شاعری کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ سے رہا جہاں غدر سے پہلے تک شاعروں کو شاہی درباروں کی سرپرستی نصیب ہوتی رہی۔ اس دور کی بیشتر شاعری درحقیقت قدیم اردو شاعری کے تنزل کا نمونہ ہے۔ دہلی کی شہنشاہی کے خاتمے نے ایک پژمردگی کی رو ساری ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی فضا میں دوڑا دی تھی۔ اس پستی سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوئی۔ اس زمانے میں بھی اردو کے بہت سے قابل قدر شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن چند مستثنیٰ مثالوں کے سوا جن کی ذاتی قابلیت مروجہ شاعری کے تمام معین، مصنوعی اور رسمی اصولوں کو توڑ کر بلند ہو گئی۔ شاعری کی پست ہمتی اور بیچ پوچ خیالی ہونیکی ایک مسلسل داستان ہے۔ رنگین، سلیمان، ظفر، قائم، منت، ممنون، حسرت، قدرت، بیداد، ہدایت، فراق، ضیا، بقا، حزیں، بیان، راسخ، نظیر، ناسخ، برق، محب، آباد، وزیر، رشک، قہر، منیر، سعادت، اختر (واجد علی شاہ)، اسیر، امانت، قلق، ذکی، درخشاں، انس، انیس، دبیر، عشق، تعشق، صابر، رشید، اوج، غالب۔ ذوق، مومن، مجروح، نیر، شیفتہ، داغ، اس دور کے جلیل القدر شعرا ہیں، غیر مشہور شاعروں اور رذل نگاروں کا شمار تو حساب سے باہر ہے۔ اس عظیم الشان فہرست کے ناموں پر نظر ڈالیں تو ہم ان کی کثرت سے متاثر ہوئے نہیں رہ سکتے۔ اور اگر ہر شاعر کے کلام کو انفرادی طور پر جانچیں یا ان کا تقابلی مطالعہ بھی کریں تو [illegible] کی مخصوص نزاکت، کلام کی کثرت اور اس کے صوری تنوع سے بے حد مرعوب ہوتے ہیں

میر انیس، دبیر، غالب، ذوق، داغ کو چھوڑیئے۔ یہ فلک کے ہیرے ہیں۔ اور انہیں کو اس غزل کے دور کی شاعری زندہ ہے لیکن اس طویل فہرست کے کسی دوسرے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام کو آپ میر، درد، سودا، سوز، اثر نہیں بلکہ انشا، مصحفی، جرأت اور شاہ نصیر ہی کے کلام کے سامنے رکھئے، اس کا جادو کیا غائب ہو جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس دور کے شاعر قدما کی جہاں سے نزد تھے، انہیں کی ہم نامی اور ہم نوائی کے طفیل میں شاعر مشہور ہوئے۔ ورنہ اکثر صورتوں میں شہرت ان کے کلام سے کوسوں دور ہے۔

غزل گوئی اردو کے قدیم اور جدید شاعروں کا بڑا مقبول مشغلہ رہا ہے، غزل کے ارتقا کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے لیکر میر اور سودا تک اس میں جو ترقی ہوئی، وہ انہیں پر ختم ہو گئی۔ انشا، جرأت اور مصحفی میر کا اتباع کرتے ہیں، اس لئے ان کی غزلیں بھی کم و بیش غزل کے تمام اوصاف سے پر ہیں۔ غزل اور قصیدہ کو میر اور سودا نے انتہائے کمال تک پہنچایا تھا تاہم ان کے بعض معاصر شعرا جیسے درد، سوز، اور اثر وغیرہ یا ان کے بعد ہی آنے والے شاعر جیسے انشا، جرأت، مصحفی، شاہ نصیر میں سے ہر ایک نے اگر غزل کو ترقی دینے میں کامیابی حاصل نہیں کی تو کم سے کم اس کو اپنی جگہ برقرار رکھنے میں انہیں بہت کامیابی ہوئی۔ درد بھی اگر میر ہی کی طرح مطلقاً غزل گوئی اختیار کرتے تو نہ اس صنف میں وسعت پیدا ہوتی اور نہ خود ان کا رنگ میر کے مقابلہ میں جم سکتا۔ تصوف کو اپنی غزل کا موضوع بنا کر درد نے شاعری کا تنوع اور اپنی انفرادیت قائم کر دی جس کا احساس خود ان کو تھا چنانچہ کہتے ہیں، ہووے گا اس زبان میں بھی گلزار معرفت۔ میں یاں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا۔ یہی حال انشا، جرأت، مصحفی اور شاہ نصیر کا بھی ہے جنہوں نے غزل کو صرف میر ہی کے معیار پر لکھنے کی کوشش کی چنانچہ ان کے کلام میں سادگی، اثر، عمق، درد اور غرض غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ فرق صرف صناعی کا ہے۔ میر کا سا اعلیٰ دماغ انہیں بہر فیاض کی طرف سے عطا نہیں ہوا تھا لیکن اس قابل تحسین جماعت کے ہاتھ سے نکل کر غزل جب مذکورہ بالا گروہ کے شعرا کے ہاتھ میں پہنچی تو وہ نہ صرف اپنی بنیادی صورت

سے عاری ہو گئی بلکہ بسا اوقات اس میں شعریت کا کوئی جزو بھی باقی نہ رہا۔ خیالات اور موضوعات کا غزل میں بہت کم اضافہ ہوا لیکن اپج کا مادہ ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے۔ اس کی بدولت ہماری شاعری کو فائدہ پہنچنے کی بجائے اکثر نقصان پہنچا۔ کیونکہ متاخرین کے اس گروہ نے جب میر، سودا اور ان کے معاصرین اور تابعین کو انہیں کے میدان میں شکست دینے کی سکت اپنے آپ میں نہ پائی تو ان کی اپج کا فطری مادہ اسالیب کے تغیر کی طرف مائل ہو گیا اور ان کی پستی کا نامعلوم احساس ان کی غزل میں رعب و ادب کی شکل میں ظاہر ہونے لگا رفتہ رفتہ غزل کے شعر معموں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ آتش، ناسخ، مومن وغیرہ کی شاعری اور غالب کا ابتدائی کلام اس کا ثبوت ہے۔

ایک طرف تو غزل میں اپج اور جدت طرازی کا فطری مادہ یہ کام کر رہا تھا۔ دوسری طرف بعض شاعروں نے میر اور سودا کے ریختہ کے مقابلہ میں ریختی ایجاد کی۔ بعض جنگجو اپنی طبعی قوت کے وسیلے سے حریف پر غلبہ پانا مشکل دیکھتے ہیں تو پھر وہ عورتوں کے ذریعہ انہیں مغلوب کرتے ہیں۔ غالباً ریختی نگاروں کا بھی یہی مقصد تھا۔ لیکن ریختی گویوں کا یہ نشتر بھی ریختہ گویوں کے مقابلے میں کارگر نہ ہو سکا کیونکہ اس کے موجدوں ہی نے اس کو اپنے ادنے اور شہوانی جذبات کے اظہار کا آلہ بنا لیا۔ انشا سے لیکر آجتک کسی ریختی گو کا کلام اس طرح کے حیوانی جذبات سے خالی نظر نہیں آیا۔ اسی وصف نے ریختی کو اردو شاعری کی کوئی مستند صنف نہ بننے دیا۔ اور یہ جدت طرازی اس طرح ضائع ہو گئی۔ ورنہ فی نفسہ ریختی کوئی بری صنف نہ تھی۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کی علیحدگی اور پردہ داری کی رسم نے عورتوں کی زبان میں چند مخصوص صفت پیدا کر دیئے ہیں جو مردوں کی بول چال میں نہیں آ سکتے۔ ریختی کی ایجاد بھی اگر فحش سے نہ ہوتی تو کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ ہندی شاعری کی حریف تھی۔ غزل تنزل کے اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد ہمارے ادب کے لئے ایک بھولی ہوئی صنف ہو جاتی اگر جدید احساس پیدا ہونے سے پہلے ہی میں قدیم شائستگی کے چند علمبردار جیسے ذوق، غالب اور داغ نہ پیدا ہو جاتے۔ ان

شاعروں نے غزل کا احیا کیا۔ ذوق نے اپنی سادگی اور سلاست سے۔ داغ نے اپنی اعلیٰ صناعی اور لطافت کے ذریعہ۔ اور غالب نے اپنی بلند آہنگی کی بدولت غزل کو پھر میر اور سودا کے زمانہ کی سی مقبولیت بخشی۔ خس و خاشاک سے پاک کر کے انہوں نے اس صنف شعر کو ایسے بلند رتبہ تک پہونچا دیا کہ اس کا عشر عشیر بھی آج تک کسی شاعر کو نصیب نہ ہوسکا۔ غزل کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے گویا یہ اس کا سنبھالا لیتا تھا۔

قصیدہ اپنی اصلی خصوصیات کے ساتھ اردو میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ فارسی شاعری کے قصیدے جو بادشاہوں اور امیروں کی مبالغہ آمیز مدح میں لکھے گئے تھے۔ ہمارا اصول راہنما ہو اگر ہم اسی قسم کے قصیدوں کو اپنا معیار سمجھیں تو سودا کے قصیدے لازوال شہ پارے ہیں۔ ان کے بعد سے دلی کے آخری شاعر داغ تک اس معیار کے قصیدے لکھے ہی نہیں گئے۔ قصیدے کا ارتقا اردو ادب میں، فارسی کے برخلاف بہت ہی کم ہوا۔ اس میدان میں اس سرے پر سودا ہیں اور دوسرے سرے پر ذوق۔ درمیان میں تقریباً ایک صدی کا طویل وقفہ ہے۔ جس میں قصیدہ گوئی بالکل خوابیدہ رہی۔ اس اثنا میں قصیدہ گوئی کے ذوق نے ایک اہم کام ضرور انجام دیا۔ یہ ہجو نگاری کی ترقی ہے۔ ہجو درحقیقت قصیدے کی فرع ہے۔ ہجو کے سرتاج بھی سودا ہی ہیں۔ لیکن نقاد سودا کی شاعری کے اس پہلو کو ہمیشہ تاریک پہلو سمجھتے رہے۔ مدح سرائی کی طرح شاعروں نے مذمت میں بھی حد اعتدال کا خیال بالائے طاق رکھدیا ہے۔ اور اکثر فحش پر اتر آئے ہیں۔ اس لئے ہجو نگار شعرا نے جس قدر موشگافیاں کی ہیں وہ ضائع گئیں۔

رباعی اردو شاعری میں، فارسی شاعری کی طرح زیادہ رواج نہ پا سکی۔ قدیم شعرا نے بھی صرف تنوع صنف کی خاطر اس میں اظہار خیال فرمایا تھا۔ اس لئے اس صنف کا ارتقا پہلے ہوسکا نہ اب ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن قدیم اصناف سے مثنوی کو اس دور میں خاص

---

۵ مقدمہ شعر و شاعری

طور پر فروغ نصیب ہوا۔ قدیم اردو میں مثنوی بہت مقبول صنف تھی چنانچہ اکثر مذہبی تعلیمات اور اخلاقی یا عشقیہ قصے، قدیم زمانہ کے شعرا مثنوی ہی میں لکھتے تھے۔ انہیں شعرا نے مثنوی کی ایک شکل بھی معین کر دی تھی۔ شمالی ہند میں جب شاعری شروع ہوئی تو اس صنف کا رواج کچھ دنوں کے لئے کم ہو گیا تھا۔ میر اور سودا کا عصر دراصل غزل اور قصیدے کا عصر ہے، انہیں دو صنفوں کو ان شعرا نے اور ان کے مقلدین نے خوب ترقی دی۔ میر اور سودا کی مثنویاں نہ تو فارسی مثنوی کا تتبع ہیں، اور نہ قدیم اردو شاعروں کی مثنویوں کی تقلید میں لکھی گئی ہیں بلکہ یہ عموماً مختصر سی ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ میر اور سودا کے عصر میں یا اس کے قریب زمانہ میں، میر اثر کی مثنوی "خواب وخیال" سے بہتر کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ اردو مثنوی کی جو شکل بعد میں میر حسن نے قائم کی، وہ بڑی حد تک خواب وخیال سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ "خواب وخیال" کے زمانے سے لیکر "سحر البیان" کے لکھے جانے تک جو عرصہ گذرا اس میں کوئی قابل ذکر مثنوی نہیں گئی۔ اردو مثنوی کو میر حسن نے مقبول بنایا۔ ان کی مثنوی "سحر البیان" اردو کی مثنویوں میں سب سے بلند رتبہ ہے۔

ہمارے پیش نظر دور میں جتنی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ وہ سب "سحر البیان" کی تقلید ہیں۔ ان میں بعض مثنویاں جیسے مرزا محمد تقی خاں ہوس کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار ارم" اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں بے حد قابل قدر ہیں لیکن "سحر البیان" سے ان کو کوئی نسبت نہیں۔ نازک خیالیوں اور زبان کے چٹخاروں نے ان مثنوی کو کتنا ہی مقبول کیوں نہ بنا دیا ہو "سحر البیان" کی سادگی، صفائی اور سب سے بڑھ کر اس کی شعریت ان میں کم پائی جاتی ہے۔ "سحر البیان" ہر مذاق کے لئے ہے۔ اور ان مثنویوں سے خاص مذاق ہی متاثر ہوتے ہیں۔ بلند پایہ ادبی کارنامے مقام اور زمان کی قید سے اعلیٰ و ارفع ہونے چاہئیں۔

"واسوخت اور سہرا" اس عصر کی مخصوص منظوم اختراعات ہیں۔ واسوخت خیالی اور تقلیدی شاعری کی ایک فرع ہے۔ اس نوع کی شاعری کا نہ تو مقصد ہی اعلیٰ ہوتا ہے اور نہ اس کی صنف نئے ہی پیدا ہوتے۔ اس لئے واسوخت کو نہ جب فروغ نصیب ہو سکا اور نہ اب ہو سکیگا۔

واسوخت کے موجدوں نے ریختی گویوں کی طرح، اس کی بنیاد بھی ایسے رذل و دنی جذبات پر رکھی تھی کہ جلد ہی یہ صنف متروک ہوگئی، اور اب صرف تاریخ ادبیات کی زینت ہے۔ "سبھا" یقیناً قابل قدر اختراع تھی۔ اور اگر اس عصر کا اصل اصول تقلید نہ ہوتا یا کم سے کم زمانہ اسقدر جلد بدل جاتا، تو توقع تھی کہ امانت نے "اندرسبھا" کی شکل میں جس فن کی بنیاد ڈالی تھی، اسے ارتقا نصیب ہوتی اس زمانے کی تقلیدی ذہنیت کا یہ حال تھا کہ مداری لال نے جب "اندرسبھا" کو سامنے رکھکر اپنا ناٹک لکھا۔ تو اس سے آگے بڑھنا تو درکنار، خود اس کی حد تک بھی نہ پہنچ سکے اور پھر ظاہر کے لحاظ سے امانت کی "اندرسبھا" اور مداری لال کی "اندرسبھا" میں کچھ فرق نہیں۔ ان سبھاؤں کی قدر اس زمانے میں بہت ہوئی۔ مگر اس لئے نہیں کہ یہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھیں، بلکہ صرف اس لئے کہ یہ ایک جدت تھی۔ یہ ساون کی گھاس کی طرح پیدا ہوئیں اور ابھی نشو و نما بھی نہ پائی تھیں کہ سیاسی انقلاب نے انہیں فنا کردیا۔

اس دور کی ادبی قحط سالی پوری ہوجاتی، اگر اس میں مرثیہ جیسی قابل قدر صنف کی شاعری کا نشو و نما نہ ہوتا۔ مرثیہ اپنی موجودہ شکل میں درحقیقت اسی عصر کی پیداوار ہے اس کے موضوع میں اس قدر تنوع اور اس کے معمار ایسے صناع تھے کہ ان سے نہ صرف رزمیہ منظومات کی کمی پوری ہوتی ہے، بلکہ واقعات نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری کے کئی ایک قابل قدر پہلوؤں کا اردو شاعری میں اضافہ ہوجاتا ہے جب تک اردو شاعری باقی ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے نام دنیا میں استحسان کے ساتھ لئے جائیں گے۔ لیکن مرثیہ سے متعلق دو امر خاص طور سے توجہ طلب ہیں ایک تو یہ کہ انیس اور دبیر کے بعد ان کی آدھی قابلیت کے مرثیہ نگار بھی اردو میں پیدا نہ ہوسکے۔ اور اسی لئے اس کے موجد، اس کے خاتم بھی بن گئے۔ دوسرے مرثیہ شاعری، درحقیقت مروجہ شاعری سے بیزاری کا ایک بدیہی نتیجہ ہے۔ نیز مرثیہ کی شاعری کے عروج کا زمانہ جدید شاعری کے آغاز سے اس قدر متصل ہے کہ ہم اگر اس کو جدید شاعری کی ابتدا نہ بھی سمجھیں، تاہم قدیم شاعری سے دل برداشتگی کے آثار اس میں ضرور دیکھیں گے۔

مرثیہ سے ہٹ کر اس دور کی شاعری میں ہم کو کوئی چیز ایسی نہیں ملتی، جسے ہم اردو شاعروں میں شعری احساس کی ارتقا، کا ثبوت سمجھ سکیں، ہاں اس احساس کے تنزل کا پتہ بہت آسانی سے چل جاتا ہے۔ اس لئے دور جانے کی ضرورت بھی نہیں، ہزل، زٹل، ہر سیہ وغیرہ، بیسیوں چیزیں اس زمانے میں شعر کے نام سے پھیلی ہوئی ملتی ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی لغویات ان میں کتنی ہی اپچ کیوں نہ ہو، شاعری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔ اور اگر ہم انہیں شاعری میں داخل کرنے لگیں تو ہم اپنی ادبیات کی بدنامی کے ذمہ دار ہوں گے۔

غرض انقلاب سے پہلے کی اردو شاعری پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صنف شعر کی پیدائش سادگی پر ہوئی۔ بعد میں ان کا ارتقا مضامین کے اعتبار سے بہت کم ہوا، اسلوب اور زبان کے لحاظ سے ان میں الجھاؤ اور ظاہری شان و شوکت بڑھتی گئی، سادگی سے پیچیدگی کی طرف ترقی اردو شاعری کا عام اصول معلوم ہوتا ہے۔ غزل جو میر، سودا، درد کے یہاں سادہ تھی آتش، ناسخ، اور مومن اور ایک حد تک غالب کے ہاتھوں میں بیحد مصنوعی آرٹ کا نمونہ بن گئی مثنوی میں میر حسن کے سادی سیدھی صناعی کی جگہ پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ کے اعلی دقیق تصنع نے لے لی۔ قصیدے میں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ سودا کے قصیدے کتنے ہی پر شکوہ کیوں نہ ہوں لیکن ان میں سادگی ہے، اور ذوق کے قصیدوں کی سی دقت نظر کا ان میں پتہ نہیں۔ خود مرثیہ پر بھی یہ اصول ایک حد تک صادق آتا ہے۔ انیس اور دبیر دونوں معاصر ہیں اس کے باوجود میر انیس کی سادہ پرکاری کے مقابلہ میں مرزا دبیر کی فلک پیمائی قابل غور ہے۔

لیکن زندہ زبان اور زندہ ادب مخالف ماحول اور ہمت شکن فضا میں بھی کہیں کہیں اپنی حیات کا ثبوت دینے پر مجبور ہے۔ رسمی مضامین اور معین اسالیب کے درمیان سے میاں نظیر اکبرآبادی کا اٹھنا، غزل کی رونق جب بگڑ چکی تھی، غالب اور داغ جیسے باکمال غزل گو شعرا کا پیدا ہونا اور جب اردو شاعری کی قلمرو قطعا محدود نظر آرہی تھی، انیس اور دبیر کا مرثیہ کی رزمیہ شاعری کا علم بلند کر کے اٹھ کھڑا ہونا، ہماری زبان اور ہماری شاعری کی زندگی کے منتشر ثبوت ہیں۔ اگر زیر

ار دوران شاعروں سے خالی ہوتا تو پھر اس میں پائیدار اہمیت کا ادب لاپتہ تھا، دوسرے اور تیسرے درجہ کے شاعر تو اس عصر میں بہت سے ہیں، قومی پژمردگی سے اردو شاعری اس دور میں جس قدر متاثر ہوئی۔ شاید ہی کبھی ہوئی ہو، ہر شاعر کا کلام اکثر و بیشتر یاس انگیز جذبات سے بھرا، اور اس طرز کو متصوفانہ خیالات سے بڑی مدد ملی۔ تصوف ناواقف کے لئے بہت ہی مبہم چیز ہے اس لئے اس دور کے شاعروں کے لئے اس رنگ میں شاعری کرنے سے بڑی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔

قدیم شائستگی اور تمدن کے اس آخری دور میں ہماری ادبیات اور شاعری میں اعلیٰ پایہ اور مکمل کارناموں کی پیدائش کا عدم تسلسل اور بلند سے بلند تر شعری احساس کی طرف ہماری رفتار کا منقطع ہوتا جانا اور پائدار شاعروں کا وقفوں وقفوں سے ابھرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس کو کسی قوت محرکہ کی ضرورت ہے۔

غزل

از مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری

خودسراپا ناز کہہ لوں اس ستم آرا کو میں
کس طرح قائل کروں گا لیکن اک دنیا کو میں

حسن نے کر دیں نمایاں عشق کی مجبوریاں
کھا گیا غش۔ دیکھ کر اس چہرۂ زیبا کو میں

ہے بیابانوں سے میری وحشت دل بے نیاز
خود جنوں کی جیب میں رکھتا ہوں اک صحرا کو میں

ہوں وہ مجنوں بس مرا چل جائے دنیا میں اگر
جتنے زیور ہیں پہنا دوں لا کے سب لیلیٰ کو میں

آرزو یہ ہے کہ سینہ میں سمائے جس قدر
دل کے بدلے بھر لوں خاک یثرب و بطحا کو میں

جسم عالم میں اسی سے ہے رواں روح نشاط
دل سمجھتا ہوں جہاں کا قبۂ خضرا کو میں

کاش ہو اس کے قدم تک بھی رسائی ایک دن
پوجتا رہتا ہوں اسلم جس کے نقش پا کو میں

مکالمہ عالم ارواح

ہندوستان کا تعلیمیافتہ طبقہ خصوصًا علماء عربی داں جرجی زیداں صاحب مصنف تمدن اسلام اور ان کے رسالے الہلال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جرجی زیداں صاحب کا انتقال ہوگیا ان کے صاحبزادہ امیل زیداں صاحب نے ایک مضمون اپنے مشاہدات ومکالمہ عالم ارواح پر لکھا ہے۔ خود مرحوم جرجی زیداں کو عالم ارواح سے بلاکر امیل صاحب نے گفتگو فرمائی ہے یہ مضمون کا اقتباس اور کل گفتگو کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش ہے

یہ موضوع عرصہ سے ہندوستان میں بھی اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے اکثر اکثر اصحاب اسکو یقینی خیال کرتے ہیں اور ان کے پاس اس کے تیقن کے کافی مشاہدات اور دلائل ہیں۔ اکثر اس کو دھوکا خیال کرتے ہیں۔ اکثر شیاطین سے اسکو منسوب کردیتے ہیں لیکن دلچسپی ہر شخص لیتا ہے اور اس فکر میں نظر آتا ہے کہ اگر واقعی یہ صحیح ہو اور اس پر بھی اسی طرح یقین ہوسکے جس طرح سائنس کے دیگر مسائل صحیح اور قابل یقین ہیں تو انسان کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوجائے۔

خاکسار مترجم

مضمون

کیا ارواح ہم سے کلام کرسکتے ہیں اگر ایسا ہے تو کس طرح؟ کیا انسانی جسم کے فنا ہونے پر کل چیزیں فنا ہوجاتی ہیں؟ یا روح جسم سے نکل کر بھی زندہ رہتی ہے کیا اس کی زندگی مستقل ہے؟ کیا حوادث ان کو اس زمین پر پیش آتے رہتے تھے وہ اس کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں؟

اگر روح کا وجود آئندہ فرض کرلیا جائے۔ اور اس کی مستقل زندگی بھی تسلیم کرلیجائے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس سے گفتگو اور ملاقات کرسکیں۔

یہ مسائل ہیں جو عرصہ سے عقلاء کرۂ ارضی کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ میں بھی ایک عرصہ تک
ب زمانہ میں ایسی فکر میں مبتلا رہا تھا۔ اب ایک عرصے سے میں نے یہ خیال کرکے کہ اس کا قطعی
وت نہیں ہے، بالکل اس کی طرف سے اپنے خیال کو ہٹا لیا تھا لیکن چند سال کے بعد اتفاق سے
یسے مشاہدات پیش آئے کہ میں مجبور ہو گیا کہ اس کو پھر ایک مضمون کی شکل میں پیش کروں۔

میرے نزدیک دنیا میں انسان کے لئے اس موضوع سے بڑھ کر کوئی موضوع نہیں۔ اگر یہ خاط
دراہ حل ہو جائے تو جو کچھ ترقی اس وقت حاصل ہوئی ہے اس مسئلہ کے حل کے بعد یہ اسکی اس آئنا
رتی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

میں جب یہ مضمون لکھ رہا تھا تو خود بھی متردد تھا کہ اس کو لکھوں یا نہ لکھوں مجھے یقین ہے کہ اس
مضمون پر کہیں شک کیا جائیگا اور کہیں تکذیب کیجائے گی۔ میرے معلومات اور مشاہدات اس وسیع
میدان میں نہایت درجہ حقیر ہیں۔ یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ میرے خیال و وہم سے بھی زیاد
اس میں وسعت ہے۔ میں اسکو کسیطرح عبور نہ کرسکوں گا۔

میں اسی پس وپیش میں تھا کہ آخر کار میں نے یہ فیصلہ کرکے قلم اٹھایا کہ ہرچہ بادا باد میں نے
جو کچھ خود دیکھا ہے وہ ضرور لکھوں گا خواہ یقین کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس مضمون کو لکھتے وقت میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح
ہیں اور ان میں اب بحث و مزید تحقیقات کی گنجائش نہیں ہے میں نے برسوں پہلے بھی ان امور پر
غور کرکے چھوڑ دیا تھا لیکن اب جو تجربے میرے سامنے ہوئے ان کو میں ضروری سمجھتا ہوں کہ
کے سامنے پیش کردوں۔ بہت سے بڑے بڑے علماء روحانیات کے قائل ہو گئے ہیں۔ اگرچہ [illegible]
ہیں جو اس پر یقین نہیں کرتے۔ جو لوگ روحانیات کے قائل ہیں ان میں سے یہ لوگ جیسے [illegible]
اولیور لاج۔ سر ولیم کروکس۔ سر ولیم جیمس وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ روح کے
قائل ہیں اور انہوں نے کافی غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ جسم کے فنا ہونے کے بعد
[illegible]

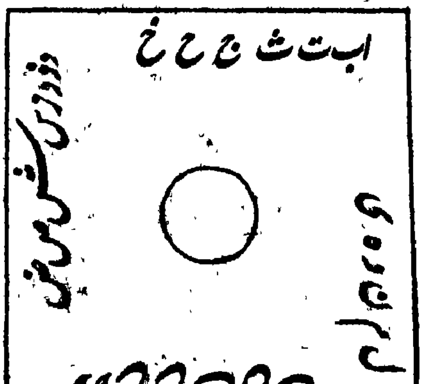
ان مسائل میں روزانہ تحقیقات اور معلومات جدید ہورہی ہیں۔ اور لوگ کثرت سے اب اس طرف متوجہ ہورہے ہیں۔ اگرچہ اس کے اصول ابھی اس طرح مدون نہیں ہوئے جس طرح ریاضی وطبیعیات کے اصول مدون ہوسکے ہیں۔ نہ ان پر ابھی اس طرح یقین کیا جاسکتا ہو جیسا کہ سائنس کے دیگر اصولوں پر یقین کیا گیا ہے۔ جب ہم ان اصولوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہو کہ دنیا میں جس قدر اصول علمی مروج اور مسلمات ہیں سو ہیں وہ سب شروع میں نظریات ہی تھے۔ رفتہ رفتہ تجربوں اور علوم نے ان کی صداقت تسلیم کی۔ اور اب وہ مسلمات سمجھے جاتے ہیں۔ ممکن ہو کہ کوئی وقت ایسا بھی آئے جبکہ روحانیات کے نظریات بھی مسلمات تسلیم کرلئے جائیں اور ممکن ہو کہ ان کے اصول بھی اسی طرح ناقابل تردید ہوجائیں جس طرح آج کل طبیعیات وریاضی کے اصول ناقابل تردید ہوگئے ہیں۔ ان تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے اگرچہ میں اپنے مشاہدات کو بالکل علمی تحقیقات کا نتیجہ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کو محض خرافات اور من گھڑت یا شعبدہ بازی بھی نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہو کہ علماء روحانی ترقی کرکے کوئی مفید اور ضروری مسئلہ ایسا حل کرلیں کہ دنیا کو مفید ہو۔ میں نے تو صرف اس موضوع پر مضمون لکھ کر اس دروازہ کو کھولدیا ہو جو اب تک مقفل تھا۔ ممکن ہو کہ ایک وقت ایسا بھی آئے کہ یہ سب محض تفریح ہی ثابت ہو۔ بہرحال یہ ضرور ہو کہ کچھ نہ کچھ علماء کی توجہ سے اسپر گفتگو ہوگی اور کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ اور وہ نتیجہ حقیقت میں علم کی ہر طرح خدمت ہی ہوگا۔

اس تمہید کے بعد میں اپنا اصل مضمون شروع کرتا ہوں۔

لبنان شام میں ایک موسم گرما کے چند ہفتے میں نے گذارے۔ میرے بعض دوست بھی اس زمانہ میں وہاں تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے مشاہدات اور مکالمہ ارواح کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج کل ان امور کی تحقیقات میں مصروف ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ان حالات کو دیکھوں انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اپنے والد مرحوم کی روح کو آپ بلائیں اور ان سے گفتگو کریں ایسے اخبار اور امور بصراحت آپ دونوں کے علم میں ہوں گے ظاہر ہو جائیں گے۔ اس طرح آپ کو شک نہیں رہے گا۔ آپ کو [illegible] توقع ہو لیکن جب ایسا ثبوت بین موجود ہو۔ تو کم سے کم آپ کو اسپر توجہ کرنا

ہوگی کہ یہ کیا کرشمہ ہے۔ اور یہ اسی وقت زیادہ بہتر ہوگا جبکہ آپ اپنے والد صاحب کی ہی روح کو بلاکر شرف مکالمہ حاصل کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ دھوکا دیتے ہیں یا یہ باتیں کچھ قابل لحاظ بھی ہیں میں ان کے اصرار پر ایسے جلسے میں شریک ہونے پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ میں ان کیساتھ جلسوں میں مجلسوں میں جہاں ارواح کو بلایا جاتا، اور ان سے گفتگو کیجاتی تھی گیا۔ چند جلسوں میں تو میں کچھ نہیں سمجھا۔ یا یہ کہنا چاہئے کہ نہ سمجھ سکا۔ بعد میں مجھے بعض بعض باتیں معلوم ہونے لگیں۔ میرے دوست جو اس مشاہدہ کے محرک تھے ایک سال سے اس کام کو کر رہے تھے۔ انہوں نے بعض بعض مشاہدات اور تجربے ایسے ایسے مجھے بتائے کہ عقل حیران ہوتی تھی اب مجھے ان کے فریب دینے یا دھوکہ باز جھوٹا ہونے کا گمان تک بھی نہیں ہے۔ مگر میں صرف اپنے ہی مشاہدات ہدیہ ناظرین کرونگا۔

جو طریقہ عموماً مروج ہے وہ یہ ہے کہ ایک مربع شکل کی تختی جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔



نہایت عمدہ سنگ مرمر کی ہوتی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف حروف مفردات لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی پیالی ہوتی ہے۔ جو آسانی سے پھسل سکتی ہے۔ اس تختی کے سامنے دو آدمی جو واسطے کہلاتے ہیں، بیٹھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے روح سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں اپنی انگلیاں اس پیالی پر رکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اہل جلسہ جس روح کو طلب کرنا چاہیں وہ ان سے کہدیتے ہیں اور وہ روح کسی ایسی روح کے توسط سے طلب کیجاسکتی ہے جس سے پہلے ان واسطوں کی ملاقات ہو یعنی وہ ان کی طلب پر پہلے آچکی ہو۔ اسی ملاقاتی روح کو پہلے طلب کیا جاتا ہے اور اس سے درخواست کیجاتی ہے کہ ہم فلاں روح سے ملنا چاہتے ہیں۔ جب یہ درخواست ملاقاتی روح سے پیش کردیجاتی ہے۔ اسوقت جملہ حاضرین خیال کرتے ہیں کہ وہ روح جو طلب کی گئی تھی آگئی۔ تھوڑی دیر میں واسطوں کو معلوم ہوتا ہے کہ پیالی حرکت کر رہی ہے۔ [illegible]

کے آنے کی اطلاع دیتے ہیں۔ اور جو سوال کیا جاتا ہے اس کا جواب پیالی کی حرکت سے اس طرح ملتا ہو کہ پیالی صرف مفردات پر حرکت کرتی ہے۔ اور مفردات سے کلمہ اور کلموں سے جملے بنتے رہتے ہیں اور جواب پورا آجاتا ہو۔ حاضرین جلسہ صرف پیالی کی حرکت دیکھ سکتے ہیں اور کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔ اس تفصیل کے بعد میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ واسطے پیالی پر کچھ قدرت نہیں رکھتے۔ وہ جس طرف حرکت کرے گی یہ محض اس کی اتباع کریں گے۔ اس کی مدافعت و مخالفت نہیں کر سکتے۔ جو سوال کئے جاتے ہیں واسطے اس کو نہیں جانتے اور اس کا معقول بلکہ ایک حد تک درست جواب آتا ہے بعض بعض سوال ممکن ہو کہ واسطے اور حاضرین میں سے کچھ لوگ جانتے ہوں لیکن بعض سوال ایسے بھی ہوتے ہیں جو کوئی بھی نہیں جانتا۔ سوال کرنیوالے یا محض وہ روح جو طلب کی گئی ہے جانتی ہے بعض کا خیال ہے کہ مقناطیسی قوت یا قوت نفس یا بجلی کا یہ کرشمہ ہے لیکن یہ غلط ہو اس قسم کا کوئی شائبہ بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ یہ لوگ بجلی کی روشنی میں رہتے ہیں ان واسطوں کی حسن نیت اور پرہیزگاری کا قائل ہوں۔ میں ان کو دغاباز فریبی نہیں سمجھتا۔

اب میں اس تفصیل کے بعد وہ مکالمہ درج کرتا ہوں جو میرے اور والد مرحوم کی روح کے درمیان ہوتا رہا۔ میں نے وہ حصہ اس اشاعت سے حذف کردیا ہو جس کا تعلق میری ذات سے اور خانگی امور سے تھا۔ کیونکہ اس سے دنیا کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمام جوابات ہمیشہ سوال کے مطابق اور بالکل ٹھیک آتے ہیں۔ میں نے پیالی کو چلتے ہوئے حروف پر حرکت کرکے جملے کلمات بناتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ پھر میں نے والد صاحب کی روح سے اپنی خانگی زندگی اور اپنے ذاتی حالات کے سوالات کئے جن کی اشاعت میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔

میں۔ (والد صاحب کی روح سے) میرے خیال میں مناسب ہو کہ میں ایک مضمون اثبات حالات ارواح پر لکھوں کیا جناب مجھے اس ترتیب میں مدد دیں گے۔ جناب بیان

فرمائیں کہ روح جسم سے جدا ہو کر کس طرح منتقل ہوتی ہے۔

والد صاحب کی روح۔ جب روح اپنے مسکن ارضی کو چھوڑتی ہے تو کچھ عرصہ تک ایک وقت تک زمین ہی کے اطراف رہتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اپنے استحقاق کے بموجب ترقی و بلندی حاصل کرتی ہے۔ عموماً سات درجے ہیں۔ ساتواں درجہ قرب باری تعالیٰ کا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نیچے کے درجوں میں نہیں رہا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان درجوں میں راحت نہیں ملتی۔ اور نہ ایک سیکنڈ عذاب ضمیر سے رہائی ملتی ہے۔

میں۔ آپ کس درجہ میں ہیں اور کیا آپ اس درجہ میں پہلی ہی دفعہ پہنچ گئے ہیں

وہ۔ الحمد للہ میں چھٹے درجے میں ہوں۔ اور یہ انسان کے لئے بڑی کامیابی ہے۔ یہاں نہ تو عذاب ضمیر ہے اور نہ فکر و غم ہے۔ بلکہ یہاں عمدہ پرسکون زندگی ہے۔ البتہ میں دو درجے اس درجہ میں آنے سے پہلے ہی گذار کر آیا ہوں۔

میں۔ ان درجوں میں کیا فرق ہے۔

وہ۔ جب ایک درجہ سے انسان گذر کر دوسرے درجہ میں جاتا ہے تو عذاب ضمیر میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

میں۔ کیا آپ نے اپنے بعض دوستوں سے بھی ملاقات کی جو مر چکے ہیں۔

وہ۔ بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔

میں۔ مثلاً کون کون۔

وہ۔ مخدوم (مخدوم سے مراد مرحوم مخدوم بیگ شغیر سے تھی اور دوسرے جلسہ میں ڈاکٹر یعقوب صروف و جبران خلیل جبران اور اپنے بعض خاندانی افراد کا بھی ذکر کیا)

میں۔ کیا روحیں آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔

وہ۔ ہاں روحیں گفتگو کیا کرتی ہیں۔ ملتی جلتی ہیں۔ آپس میں بحث کرتی ہیں۔ [illegible] ہوتا ہے۔ ہم تم کو دیکھتے ہیں۔ تمہاری ملاقات سے خوش [illegible]

لیکن ہمارے رنج اور اہل دنیا کے رنج میں فرق ہے۔ وہاں کا رنج یہاں کے رنج کی طرح نہیں ہے

میں۔ آپ کو رنج کس طرح کا ہوتا ہے اور اس کا کیا اثر ہوتا ہے

وہ۔ ہمیں تمہارے رنجوں کا احساس ہوتا ہے اور اس احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔

میں۔ کیا آپ تکان کو بھی جانتے ہیں۔

وہ۔ ہاں۔

میں۔ جناب کو علم ہے کہ الہلال اپنے چالیسویں سال میں گذر رہا ہے۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ الہلال کے قارئین تک آپ کا مکالمہ پہونچا دیا جائے

وہ۔ ہاں ضرور لکھو۔ میں اپنی زندگی اس کی ترقی میں گذارتا رہا ہوں۔ اور موت کے وقت بھی مجھے خیال رہا اور اس کی ترقی کی آرزو کرتا رہا میرا جیسا کہ گمان تھا ویسے ہی حالات الہلال پر آتے رہے (یہاں کچھ جملہ معترضہ تھے، جو غالباً بعض دوستوں کے جو حاضر جلسہ تھے اور ان کا نتیجہ ہوں، پھر مجھے خطاب کرتے ہوئے روح نے کہا "ایل میری یہ تمام تقریر ایسی ہے کہ جو باپ اپنے اولاد سے کیا کہتے ہیں لیکن میری مرضی ہے کہ تم ضرور لکھو۔ مجھے الہلال پر فخر ہے اور یہ یاد رکھو کہ میری روح ہمیشہ زندہ ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں (اسکے بعد جو الفاظ کہے گئے ان کی اشاعت سے میں معذور ہوں)

میں۔ اپنے عالم کی کچھ معلومات سے ہمیں مستفید فرمائیے۔

وہ۔ جب انسان کی ارضی حیات ختم ہوتی ہے۔ اس وقت سے حیات سماوی شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ حیات ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ حیات یا تو جنت کی سمت ہوتی ہے یا جہنم کی۔ [illegible] اعمال پر منحصر ہے جو دنیا میں کئے گئے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ روح موجود ہے، عذاب ان لوگوں [illegible] جو حیات بعد کے قائل ہیں۔ روحیں اپنے دوستوں کے اعمال

واقعات سے باخبر بھی رہتی ہیں۔

دوسرا جلسہ

میں۔ پہلی مرتبہ جب جناب نے تکلیف فرما کر معلومات فراہم کئے تھے۔ وہ میں
قلمبند کئے ہیں کیا جناب براہ کرم اس مضمون کو مکمل فرمائیں گے۔
وہ۔ قارئین کرام کو تعجب ہوگا جب وہ میرا نام جرجی زیدان دیکھیں گے لیکن میں
ان کے تعجب کو رفع بھی کر دینا چاہتا ہوں۔ قارئین کرام یاد رکھیں۔ میں جرجی زیدان ہوں
تم کو تاکید سے کہتا ہوں کہ روح جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی زندہ ہے۔ میرے پاس اس
بہت کافی دلائل ہیں لیکن یہ دلائل صرف ان ہی کو فائدہ دے سکتے ہیں جو ان کو سنیں
اور سمجھیں۔ میں تم کو وہ امور یاد دلاتا ہوں جو بالکل بھلا دیئے گئے ہیں میں یہی خواہش کرتا ہوں
کہ تم کو روح کی آئندہ زندگی کا یقین ہو جائے اور یہ ہوش آجائے کہ جس قدر اعمال دنیا
کئے گئے ہیں بلا کم و بیش سب کا نتیجہ دوسری دنیا میں ملنے والا ہے۔
عذاب و مصائب ان ہی لوگوں پر ہوتے ہیں جو حیات ابد کے قائل نہیں ہیں قارئین
الہلال شاید ان سے فائدہ اٹھائیں۔
میں۔ روحیں مختلف لوگوں سے جبکہ ان کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف
ہیں کس طرح گفتگو کرتی اور ایک دوسرے کی بات کس طرح سمجھتی ہیں
وہ۔ آپس میں سب ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ بات زبان سے نہیں کی جا
بلکہ انتقال فکر سے ایک دوسرے کا مفہوم ایک دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے۔
میں۔ کیا مرد و عورت کی شناخت بھی روحوں میں ہوتی ہے۔
وہ۔ بیشک بلکہ جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ بھی قائم رہتی ہیں۔
میں۔ دنیا میں جو مختلف مذاہب ہیں ان کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔
وہ۔ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے اپنے اعمال کی سزا سبھی کو بھگتنا

میں۔ کوئی مذہب سب سے زیادہ اچھا اور سچا سمجھا گیا ہے۔

وہ۔ تمام مذاہب جو خدا کے قائل ہیں ایک ہیں۔

میں۔ لو فرضاً اگر انسان خدا کا قائل نہ ہو۔ بلکہ خدا کا منکر ہو تو۔

وہ۔ اللہ واحد کا اعتقاد تو ضروری ہے۔

میں۔ اگر اس کی عقل اس کو خدا کے وجود کا قائل کر دے لیکن اعتماد کلی نہ ہو۔

وہ۔ تو کیا پھر قائل ہونے کے بعد کہیں اعتقاد ضائع ہو جایا کرتا ہے۔

میں۔ اور بت کے پجاری۔

وہ۔ ہلاک ہوتے ہیں۔ (یعنی عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔)

میں۔ فرض کیجئے کہ انھوں نے کبھی خدا کی بابت کہیں کچھ نہیں سنا۔

وہ۔ سزا تو اس کو ہوگی لیکن اس کا انتقال ترقی کیطرف جلد شروع ہو جائیگا۔

میں۔ کیا آپ خالق کے اوصاف بیان کر سکتے ہیں۔

وہ۔ آجتک کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

میں۔ کیا کبھی امید زیارت ہے۔

وہ۔ یقینی اور وعدہ بھی ہے۔

میں۔ کیا آپ کو مستقبل کی بابت بھی کچھ معلومات ہوتی ہے۔

وہ۔ ہم اس کی بابت کچھ کہہ نہیں سکتے۔

میں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو کچھ معلومات ہے یا نہیں۔

وہ۔ کچھ معلومات ہے سب ممکن نہیں لیکن ہم کچھ بھی اس کی بابت بیان نہیں کر سکتے۔

میں۔ کیوں؟

وہ۔ ہمیں حکم نہیں ہے۔

میں۔ کیا حیوانات کی بھی روحیں ہوتی ہیں۔

وہ۔ بیشک روحیں ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی مقام مقرر نہیں ہے۔

میں۔ پھر وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔

وہ۔ فضائے بسیط میں منتشر ہوجاتے ہیں نہ پھر ہم ان کو دیکھتے ہیں نہ ہمیں ان کی نسبت کوئی علم ہوتا ہے۔

میں۔ کیا آپ کا کوئی مقررہ مرکز ہے۔

وہ۔ ہے لیکن ہمیں علم نہیں وہ کہاں ہے اور اس زمین سے کس قدر فاصلہ پر ہے۔ لیکن ہے بہت فاصلہ پر۔

میں۔ کیا میرے علاوہ کسی نے آپ کو دنیا میں طلب کرکے کچھ معلومات کی ہے۔

وہ۔ نہیں تم ہی پہلے شخص ہو جس نے مجھے بلایا۔ مدت تک ہمیں گفتگو کرنے کی قابلیت نہیں تھی۔ اب مجھے عالم ارواح میں واپس ہونا چاہئے۔

یہ مختصر نمونہ اس گفتگو کا ہے جو مجھ سے اور والد صاحب مرحوم کی روح سے ہوئی۔ میں نے تفصیلات کچھ چھوڑ کر صرف مختصر حالات اس مضمون میں درج کئے ہیں اور قارئین کرام کے لئے یہ بحث چھوڑتا ہوں کہ وہ خود غور و فکر سے کام لیں اور سمجھ لیں کہ اس کی کوئی اصلیت حقیقت میں ہے یا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں ان لوگوں کا نام بھی ظاہر کردوں جو ان امور کو صحیح اور یقینی تصور کرتے ہیں لیکن ابھی تک میں خود ان کو ایسا یقینی نہیں سمجھتا جیسا دیگر علوم کے نظریات یقینی سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے میں ان کے نام بھی ظاہر نہیں کروں گا۔ میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ بعض ارواح اپنے مکالمات میں کچھ غلطیاں بھی کرتی ہیں کچھ بھول بھی جاتی ہیں تاہم جن لوگوں کو ان امور سے دلچسپی ہو ان کو چاہئے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں ممکن ہے کہ ہم کسی خاص نتیجہ پر جو آئندہ دنیا کے لئے مفید ہو پہنچ سکیں۔ تمام ترقیات اسی اصول پر ہوتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد بھی اگر ایسے امور پیش آئے اور کہیں مکالمہ کا مجھے شرف حاصل ہوا تو میں ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔

غریب خانے میں

ابھی رات زیادہ نہیں آئی تھی، لیکن فضا تیرہ و تار ہو رہی تھی، بادل چھائے ہوئے تھے، ستارے چادرِ ابر میں روپوش تھے، زور شور کی بارش ہو رہی تھی، بیچارہ محمود کا غریب خانہ بھی، جب تک چراغ مشعلِ راہ نہ ہو، نظر نہیں آسکتا تھا۔

محمود کی جھونپڑی میں بھی کچھ نظر نہیں آتا، ہاں ایک چراغ تھا جو بیچارا اپنی بساط کے موافق اس تاریکی سے جہاد کر رہا تھا، ایک انگیٹھی تھی جس کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی، صرف چند چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں جو عنقریب افسردہ ہونیوالی تھیں۔

اس تاریکی میں چند جھروکے اس طرح چمک رہے تھے جیسے شب تار میں بھیڑیوں کی آنکھیں ادہر اُدہر دیکھنے سے ایک فرش نظر آتا تھا، جس پر تین بچے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے دراز تھے۔ پاس ہی ایک عورت بیٹھی تھی، جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، دل ہی دل میں زبانِ حال سے وہ دعا مانگ رہی تھی کہ اس کا شوہر بخیر و عافیت واپس آجائے۔ کیونکہ حسب عادت آج بھی وہ شکار کے لئے گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

بارش اب اور تیزی سے ہونے لگی، ہوا بھی بہت تیز چلنے لگی۔ جس کے اثر سے جھونپڑی بھی لرزہ براندام ہو رہی تھی، بچے چادر میں سکڑے پڑے تھے، لیکن اس عورت کا دل خوف سے کانپ رہا تھا، اس نے خیال کیا کہ بارش کا یہ تسلسل، بجلی کی یہ کڑک، ہوا کی یہ سنسناہٹ چھپر اڑا دیگا اور دل کا دھڑا دھڑ گرنا۔ کوئی اچھی علامت نہیں ہے، اپنے شوہر کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک و اوہام کا ایک دریا لہریں مارنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں خیال کرنے لگی کہ میں ایک غریب اور دکھیا عورت ہوں، میرا کوئی والی ہے نہ وارث، یہ چھوٹے چھوٹے بچے ابھی اس قابل بھی تو نہیں ہیں کہ اپنی معاش کا کچھ

اپنا پیٹ پال سکیں، زمانہ کا سرد گرم برداشت کرسکیں۔ اے اللہ، تو مجھ ضعیف و ناتواں کے لئے اور ان معصوم بچوں کے لئے اسے بچالے جو تیری سپردگی میں ہے۔ جو اپنی زندگی تجھے سونپ کر رزق کی تلاش میں نکلا ہے تاکہ اس چھوٹے موٹے خاندان کا کچھ انتظام کرے .... اب تک وہ واپس نہیں آیا، نہ معلوم قسمت اس کے ساتھ کیا کرنیوالی ہے، اور کسے معلوم کہ کیا کرچکی ہے؟ .... ہم شکاریوں کے بال بچوں کی زندگی کتنی الم ناک اور کس قدر اندوہ افزا ہوتی ہے، وہ ہمیں تنہا چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دکھ کے اس اتھاہ ساگر میں ہاتھ پیر مارنے لگتے ہیں جس کی نہ کوئی حد ہے نہ پایاں، اور نہ اس کے خطرات و ہلاکت سے نجات کی کوئی صورت، اسی کمبخت روزی کی تلاش میں وہ ان اٹھتی ہوئی موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں، جو بھوکے بھیڑیئے کی طرح جھپٹتی ہیں، جیسے وہ گوشت کے ٹکڑے پر جھپٹتا ہے .... اور ہم جو قسمت سے ڈر رہے ہیں کہ جانے کیا ہو؟ تو کہیں کچھ ہو نہ چکا ہو؟ کیا قسمت سے لکڑی کے چند وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچا لینگے جنھیں چپو کہتے ہیں؟ تھوڑی دیر تک موجوں کے ساتھ کشمکش ہوگی اور آخر کار وہ بے حد و نہایت غار میں ہمیشہ کے لئے گر جائیں گے۔ تاکہ مچھلیوں کا شکار بنیں۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ خود مچھلیوں کی تاک میں تھے۔

اب بارش ذرا کم ہوگئی تھی، ہوا بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، وہ عورت چراغ اٹھا کے دروازے کے سامنے دیکھنے لگی کہ اب صبح ہونے میں کتنی دیر باقی ہے؟ لیکن تاریکی پورے طور سے مسلط تھی، اور بارش بھی کچھ نہ کچھ ہو رہی تھی، چراغ کی روشنی ایک اور جھونپڑی پر پڑی، جس میں نہ روشنی تھی نہ حرکت، اسے یاد آگیا کہ یہ غریب جمیلہ کی جھونپڑی ہے جس کا شوہر چند مہینے ہوئے، ڈوب کر مر گیا تھا، اور زمانہ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کے لئے دو بچے چھوڑ گیا تھا، اس کے جی میں آیا کہ لاؤ ذرا جمیلہ کی خبر لے آؤں؟ اس نے

کہ اسے علم تھا کہ جمیلہ مرض الموت میں مبتلا ہے، وہاں پہونچ کر جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو کوئی جواب نہ پاکر خود اس نے دھکا دیکے دروازہ کھول لیا، اپنے چراغ سے وہ پاس کی چیزیں دیکھ سکتی تھی، اپنے سامنے اسنے جو کچھ دیکھا اس سے اس کا دل دھڑکنے لگا، خون خشک ہو گیا، اور وہ سر تا بہ قدم کانپنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ جھونپڑی ہوا کی شدت سے ہل رہی ہے، اور بارش کے پانی نے اندر داخل ہو کر تمام چیزوں کو تر کر دیا ہے جمیلہ بالکل ساکت وصامت فرش پر دراز ہے، جب اس نے پاس سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا تو کام تمام ہو چکا ہے، پانی کے قطرے اس کے سر سے اور ماتھے سے ٹپک رہے ہیں، پہلے تو چپ چاپ وہ یہ دلدوز منظر دیکھا کی، ایک بارگی یک وہ چیخ اٹھی۔

"خدا کی اس زمین پر یہ ہے، غریبوں اور بیکسوں، مسکینوں اور لاوارثوں کا عالم! یہ ہے وہ مرتبہ رفیع جہاں زندگی کے شدائد و نوائب اور مہالک و مصائب کا مقابلہ کر کے پہونچتے ہیں، اس کارزار عالم میں وہ مجہول ومطرود زندگی بسر کرتے ہیں، نہ ان کا کوئی شناسا ہوتا ہے، نہ واقف کار نہ نوحہ خوان ہوتا ہے نہ تیماردار، اب وہ ایسی جگہ جاتے ہیں، جہاں نہ کوئی "ہم سخن" ہو نہ "ہم نشین"، نہ ان کے جانے کا کسی کو ملال ہے نہ تعلق رکھنے والے عزیز و اقربا بھی بے پروا ہیں۔

کیا عجب ہو کہ میرا اور میری اولاد کا بھی کل یہی حشر ہو جو آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں؟ اسوقت تو کوئی ایسا بھی نہ ہوگا جو اس حال زار پر چند آنسو بہا لے۔ جس طرح ان مسکینوں کے لئے میں ماتم کناں ہوں کل میرا ماتم کرنے والا تو کوئی بھی نہیں۔"

پھر اس نے اپنی چادر جمیلہ کی لاش پر ڈال دی، اور چراغ لے کے ادھر ادھر جو دیکھا تو بچے فرش خاک پر آسودۂ خواب نظر آئے، ایک کے منہ پر ایک کا منہ تھا، اور ایک معصومانہ تبسم ان کے لبوں پر کھیل رہا تھا، گویا وہ موت سے جو ان کے چاروں طرف منڈلا رہی تھی بالکل

بے پرواتھے۔ اس نے بچوں کے سر پر جمیلہ کی چادر دیکھی، اسے خیال ہوا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے اس مسکین عورت نے اپنے مرض الموت میں دیکھا ہوگا کہ پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، بچوں کے اعضا اکڑ رہے ہیں تو اس نے مجبوری سے مجبور ہو کر بچوں کے جسم پر یہ چادر ڈالدی ہوگی حالانکہ سب سے زیادہ وہ خود اس چادر کی حاجتمند تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تاب نہ لاسکی، اور جاں بحق ہوگئی۔

محمود کی بیوی اس ہیبت ناک اور دلدوز منظر کو دیکھنے لگی، ہوا اس وقت بھی چل رہی تھی، بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی، اور پانی کے قطرات جمیلہ کے ماتھے سے گالوں پر اس وقت بھی ڈھلک کر آرہے تھے، گویا اپنے بچوں کے فراق میں وہ آنسو بہا رہی تھی،

اب آثار صبح ظاہر ہونے لگے تھے، جب کچھ کچھ روشنی آنے لگی تو اس نے چراغ بجھا کر ایک کونے میں رکھدیا میت کے لئے دعا مانگی، پھر بچوں کی جانب بڑھی، ان پر وہ روئی اور ان دونوں کو نہایت رقت وسکون سے اپنی گود میں اٹھالیا، اور اپنی جھونپڑی میں لے گئی اپنے بچوں کے ساتھ انہیں بھی لٹادیا۔ اور سب پر ایک ہی چادر ڈالدی،

اس کام سے فارغ ہو کے وہ ایک جانب بیٹھ گئی، اور دل ہی دل میں کہنے لگی نہ معلوم میں نے ان بچوں کو لاکر کوئی اچھا کام انجام دیا ہے، یا برا، میں جانتی ہوں کہ اللہ نے عورت کا دل یکسر رقت ومحبت سے بنایا ہے، وہ اسے نہیں برداشت کر سکتی کہ اس کے سامنے دو معصوم بچے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں فرش خاک پر دراز ہوں، وہاں سوا ان کی ماں کی نعش کے ان کا کوئی رفیق نہ ہو، کوئی عورت اس حال میں ان تنہا انہیں نہیں چھوڑ سکتی وہی کرتی جو میں نے کیا ہے، بغیر اسے معلوم کئے کہ اس کارروائی کا اس کی ذات پر کیا اثر ہوگا اور پھر جبکہ وہ یہ بھی جانتی ہو کہ اس کس مپرسی میں چھوڑ جانے کا انجام کیا ہوگا؟

یہ منظر جو میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے عواقب ونتائج سے بے نیاز کر دیا ہے، اگرچہ کچھ حصہ

ے بعد مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ میں نے غلطی کی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ اس غلطی سے
سانچ بھی سکتی تھی، میں اس کی مرتکب ہوئی، کیونکہ میرا دل گوشت اور خون کا ہے، فولاد اور
ر کا نہیں،

میں جانتی ہوں کہ میرا شوہر نادار ہے، قلاش ہے، فاقہ مست ہے، اور میرے بچے
و نان شبینہ کے محتاج ہیں، اب اس فقر و فاقہ کے عالم میں اپنے بچوں پر ان ذو جدید بچوں
اضافہ کسی طرح بھی مناسب نہیں، لیکن یہ بھی کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اپنے راحت نفس کے
ابلہ میں ان سے بخل کریں اور ان ننھے بچوں کو اپنے سامنے بھوک اور سردی کی وجہ سے
نے دیں۔

یہ ہیں میرے خیالات جنھیں ابھی ابھی اپنے شوہر کی واپسی پر میں اس کے سامنے دہراؤنگی
نے اس فعل پر نہ میں متوحش ہوں نہ خوف زدہ، کہ وہ مجھ پر خفا ہوگا، یا مجھے حکم دے گا کہ میں
ہیں نکال باہر کر دوں۔

یہ کہتے کہتے وہ دفعتاً رک گئی، کیونکہ دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز آئی، اس سے وہ
ف زدہ ہو گئی، لیکن معلوم ہوا کہ یہ ہوا کی سنسناہٹ تھی، تھوڑی دیر تک وہ اپنا سر جھکائے
ں، سر جھکائے ہوئے، وہ عالم خیال میں پہونچ گئی، اس بزم تخیل میں ایسے ایسے مناظر اس
سامنے آئے کہ کبھی وہ رونے لگتی، کبھی ہنسنے لگتی، کبھی غضبناک ہو جاتی، اور کبھی مطمئن کبھی
ں کا چہرہ کسی امید سے چمکنے لگتا، کبھی مایوسی کی شکنیں اس کے ماتھے پر پڑ جاتیں، کبھی اپنے شوہر
متعلق اچھے اچھے خیالات اس کے دل میں موجزن ہوتے، کبھی طرح طرح کے وسوسے پیدا
جاتے، غرض اسی امید و بیم اور اسی کشمکش آلام و افکار میں اس کا دل ہچکولے کھا رہا تھا کہ
نے میں اس نے کوئی سیاہ سی چیز اپنے سامنے آتے ہوئے دیکھی، اس کا دل خوف اور وہم
زور زور سے دھڑکنے لگا، لیکن وہ دیکھتی کیا ہے کہ اس کا شوہر کاندھے پر جال ڈالے،
پہاس کی ... سے چلا آرہا ہے، اور پانی اس سے ٹپک رہا ہے، اپنے شوہر محمود کو دیکھکر

ڑی ہوگئی، اس نے اس کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی، کچھ سمجھ کر آنکھیں جھکا لیں، پھر وہ پوچھنے
لی: رات کیسی گذری"؟ محمود نے اپنا جال اور اس کی چھڑ ایک طرف رکھ کے کہنا شروع
یا،

ایسی رات! توبہ میں نے تو آج تک ایسی رات دیکھی ہی نہیں، اور شکار کو کیا پوچھتی ہو؟
ہی خالی ہاتھ آیا ہوں، اگر خدا کا مجھ پر اور تم پر فضل نہ ہوتا تو میرے ہلاک ہونے میں رہ کیا گیا
ا، لیکن غم مجھ پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکتا جب تک میں تم لوگوں کو بخیر و عافیت پاتا
ں، بچوں کا کیا حال ہے؟

یہ سنکر وہ کانپنے لگی اور ٹالنے کے طور پر جواب دیا "اچھے ہیں"۔

محمود۔ آج کیا بات ہے کہ میں تمہیں اس قدر آشفتہ خاطر اور مضمحل دیکھ رہا ہوں، اچھا
ت کیسی گذری"؟

اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کہا

"رات کو تو ان بچوں کی قسمیں سیتی رہی، اس طوفان ابر و باد کی کڑک اور گرج جب
تی تھی تو تمہاری طرف سے قسم قسم کے وہم آنے لگتے تھے، لیکن اب تو الحمدللہ کچھ نہیں ہے، اچھی
ں"۔

یہ کہہ کے اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کہہ نہ سکتی تھی، الفاظ
ٹ پر آ کے رہ جاتے تھے، آخر بہت کوشش کے بعد وہ کچھ کامیاب ہوئی، اور کہنے لگی،
"لیکن ایک دوسری بات ہے جس نے مجھے مضطر کر رکھا ہے"۔

"وہ کیا"؟

"تمہارے آنے سے کچھ پیشتر ہماری پڑوسن جمیلہ کا انتقال ہوگیا، اپنے پیچھے وہ دو
چھوڑ گئی ہے جن کا اس عالم میں نہ کوئی پرسان ہے نہ خبرگیر"۔

یہ سنتے ہی محمود پر ایک اضطراب و اضطرار کی کیفیت طاری ہوگئی، وہ اپنی جگہ سے

ٹھہرا ہوا، پھر اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی بستر پر ڈال دی، سر پر کبھی کبھی ہاتھ پھیرتا کبھی بالوں سے شغل کرنے لگتا۔ اس کی بیوی اس پر نظر جمائے اس کے خیالات و جذبات کا اندازہ کر رہی تھی آخر وہ فرش پر بیٹھ گیا جو جھونپڑی کے وسط میں بچھا ہوا تھا، اور آہستہ آہستہ کہنے لگا،

خدایا! اگرچہ میں علم سے بے بہرہ ہوں، جاہل ہوں، میرا یہ منصب نہیں کہ میں تیری حکمتوں کو سمجھ سکوں، اور یہ جان سکوں کہ یہ غریب بچے اپنی ماں جیسی نعمت سے کیوں محروم کر دیئے گئے؟ لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کے وجود سے انکار کروں، شاید وہ لوگ جو مجھ سے زیادہ علم و بصیرت رکھتے ہیں، تیری ان مصلحتوں اور حکمتوں کو اس سے زیادہ سمجھ سکیں، جتنا میں سمجھ سکتا ہوں،

بلاشبہ میں تہی دست و نادار ہوں، بے نوا اور بے مایہ ہوں، مفلس اور فقیر ہوں، میری زندگی مصادفات و اتفاقات کی رہین منت ہے، اگر مل گئی تو روزی ورنہ روزہ۔ مجھ پر اور میرے بچوں پر ایسے کڑے دن گذرتے ہیں کہ ہمیں قوت لایموت بھی میسر نہیں آتا ہے لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، وہ ان یتیموں پر اس سے زیادہ کڑھتا ہے جتنا فقر و فاقہ کے عالم میں وہ دکھ محسوس کرتا ہے۔

پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا،

"میں سخت متاثر ہوں، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیلہ کی روح کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے، اور ہم سے بالحاح و زاری کہہ رہی ہے کہ ہم اس کے بچوں کی سرپرستی کریں، ان کفالت کریں........ لیکن میرے اللہ یہ ممکن کیونکر ہے؟ میں کروں تو کیا کروں؟

اب گویا اس کی بیوی کو ایک موقع مل گیا، اس نے کہا،

"اور مجھے تو ایسا سنائی دیتا ہے کہ وہ کہہ رہی ہے، محمود! میری مصیبت تمہاری مصیبت سے زیادہ ہے، تم اس عالم میں ہو کہ کچھ نہ کچھ کر سکتے ہو، میں اس دنیا میں ہوں کہ میرے لئے یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا بیٹھے بیٹھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر
نے کہا،
"کیا گذشتہ سال ہمارے دو بچے نذرِ اجل نہیں ہو چکے ہیں"؟
"کیوں نہیں"۔
"اگر آج وہ دونوں زندہ ہوتے تو ہم کیا کرتے"؟
"سوا اس کے کہ ہم اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیتے، اور اس سے استعانت چاہتے،
کیا کر سکتے تھے"؟

تو ہم ان دونوں یتیموں کا معاملہ بھی خدا کو سونپتے ہیں، اور اسی سے استعانت
چاہتے ہیں، ہم یہ سمجھ لیں گے کہ ہمارے وہ دونوں بچے زندہ ہیں، یا یہ جان لیں گے کہ
نے انہیں ازسرِ نو زندہ کر دیا ہے .... جاؤ ان بچوں کے پاس جاؤ اور
یہاں لے آؤ، ممکن ہے وہ بچے جاگ گئے ہوں، اور اپنی ماں کا یہ حادثہ دیکھ کر
وحشت سے وہ بیچارے بھی ختم ہو جائیں،
دیکھو! انھیں رفق و محبت سے لانا، اس طرح لانا کہ وہ جاگنے نہ پائیں، اور یہاں
اپنے بچوں کے پاس لٹا دو، وہ منظر بھی کتنا عجیب و غریب ہو گا جب وہ بیدار ہوں گے
ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھے گا............. آج سے میرے اوپر نبیذ* اور
حرام ہے، جب تک میں اس خاندان کے کھانے پینے کا انتظام نہ کر لوں، جس کا
و اتفاق سے میں ہی سردار ہوں، اللہ نے چاہا تو ان پاک اور معصوم بچوں کے طفیل
گھر روٹی اور چربی سے بھر جائے گا، ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں گے، لیکن سامان
ختم نہیں ہو گا"۔

*احناف کے ہاں علماء عراق نے نبیذ کی حلت کا فتویٰ دیا ہے، اس لئے کہ اس کا نشہ ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی کو بدحواس
کر دے، بلکہ زیادہ سے زیادہ خمار پیدا کرتا ہے۔ مترجم

یہ سنکر جمیلہ کا چہرہ وفور مسرت سے جگمگانے لگا، وہ بچوں کی خوابگاہ کی طرف گئی
بچوں کے چہرے سے چادر اٹھائی، اور چپ چاپ محمود کی طرف دیکھنے لگی،

محمود نے جو یہ دیکھا کہ بچے تو یہاں پہلے ہی سے موجود ہیں، تو ہجوم مسرت اور فرط محبت
سے اس نے جمیلہ کو گلے لگالیا، اور کہا ”تمہارا دل کتنا بلند، کتنا ارفع، اور کتنا اعلیٰ ہے، تم اس
قابل ہو کہ تمہاری پرستش کی جائے“

جمیلہ نے یہ سنا، اور محبت بھری نظروں سے محمود کو دیکھنے لگی،

قرآن حکیم سے موجودہ مسلمانوں کا برتاؤ

(جناب شوق دہلوی از مکہ معظمہ)

کچھ اسے زینت منزل سمجھے — اور کچھ گرمیٔ محفل سمجھے
کچھ تو سمجھے ہیں اسے طب کی کتاب — اور کچھ جادوِ بابل سمجھے
کچھ اسے رٹتے ہیں طوطی کی طرح — اس کا بس وہ یہی حاصل سمجھے
یہ تو آیا تھا ہدایت کے لئے — اس کا مقصد ہی نہ غافل سمجھے
اب عمل اور کتابوں پہ ہے — اس کو سب ترک کے قابل سمجھے
کاسہ لیسان حریفان حق — اس کی تعلیم کو باطل سمجھے
منطق و فلسفہ کے سودائی — درس کے اس کو نہ قابل سمجھے
عقل پہ جن کی پڑے ہیں پتھر — فہم کو اس کے وہ مشکل سمجھے
ہائے اس نعمت عظمیٰ کی قدر — خاک بھی تو نہ یہ جاہل سمجھے

اے خدا ہم کو عطا کر وہ دل — جو اسے رہبر کامل سمجھے
اور دے شوق عمل بھی ایسا — کسی مشکل کو نہ مشکل سمجھے

تنقید و تبصرہ

کتب

مبادی فلسفہ حصہ اوّل یا فلسفہ کی پہلی کتاب۔ اشارات تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن۔ کتاب التوحید۔ نبیوں کے قصے

مبادی فلسفہ حصہ اول فلسفہ کی پہلی کتاب | از مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی۔ تقطیع چھوٹی، حجم ۱۰۵ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ نفیس مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، قیمت درج نہیں۔

فاضل مصنف کے فلسفیانہ مقالات کا یہ مجموعہ ایک دیباچے اور چھ مضامین پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) فلسفہ و مذاہب فلسفہ پر ایک نظر۔

(۲) مِل کی منطق۔

(۳) مقدمہ مکالمات برکلے۔

(۴) عادت و فلسفۂ عادت۔

(۵) نفس و مفردات نفس۔

(۶) ماہیت جذبات۔

اردو زبان ابھی تک فلسفیانہ مباحث سے خصوصاً فلسفۂ جدید سے بالکل غیر مانوس ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی بدولت چند کتابوں کا ترجمہ تو اردو میں ہو گیا ہے مگر مستقل تصنیف کا حوصلہ سوائے مولوی عبدالماجد صاحب کے اور کسی کو نہیں ہوا۔ اسے فلسفے کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے کہ اسے اردو دانوں سے روشناس کرنے کے لئے ایسا شخص ملا جس کا قلم الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں، خشک مضامین کو دلچسپ بنانے میں خاص شہرت رکھتا ہے [illegible] یہ امید ہوتی ہے کہ لوگ جنہیں فلسفے کے نام سے وحشت ہوتی تھی اب اس سے مانوس ہو جائیں گے [illegible] فلسفے سے رسم و تعارف کا کام تو نہیں دے سکتا لیکن

پڑھنے والوں کے دل کو بے ساختہ اس موضوع کی طرف مائل کر دیتا ہے اور یہی طلب علم کی سب سے پہلی اور سب سے اہم منزل ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتاب طالب علموں کے لئے جن میں صرف مدارس کے متعلمین ہی نہیں بلکہ کل علم دوست حضرات شامل ہیں بے حد مفید ثابت ہو گی۔

اشارات | مصنفہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی بالقابہ۔ تقطیع کلاں، تعداد صفحات ۱۳۶، کاغذ چکنا دبیز، لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ درجے کی، مجلد، خوبصورت۔ قیمت صرف ۱۲/
ملنے کا پتہ :۔ ناظم دفتر تذکرہ، کڑہ شیر سنگھ، امرت سر (پنجاب)۔

آج سے سات سال پہلے رسالہ جامعہ میں علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی مشہور کتاب "تذکرہ" پر تنقید لکھی گئی تھی۔ اس طویل خاموشی کے بعد اب انھوں نے یہ اپنی عملی کتاب "اشارات" شائع کی ہے، جس میں مسلمانوں کی اصلاح نفس کے لئے خدمت خلق کی تجویز اور اس کا طریقہ بیان کیا ہے اور ہر مسلمان کو یہ صلاح دی ہے کہ وہ بطور علامت خدمت بیلچہ یعنی کدال اپنے پاس رکھے۔ پھر ہر بستی کے مسلمان شام کے وقت ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے اپنے اپنے منتخب سرداروں کی قیادت میں خاکی لباس پہن کر اور بیلچے لے کر باقاعدہ قواعد کریں۔ پھر بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کی جس قدر ہو سکے خدمت بجا لائیں اور غروب کے بعد سب ایک ساتھ باجماعت مغرب کی نماز ادا کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

اس تحریک کا نام انھوں نے تحریک خاکساران رکھا ہے اور غالباً منجملہ دیگر وجوہات کے ایک وجہ خاکی لباس اختیار کرانے کی یہ بھی ہے کہ خاکساری اس کے اندر مضمر ہے۔

اشارات میں علامہ موصوف نے اس تحریک کا مغز اور لب لباب تفصیل کے ساتھ نہایت بلند نظری اور خوبی سے سمجھایا ہے جس سے ہر شخص اس یقین پر پہونچ سکتا ہے کہ یہ عملی تحریک مسلمانوں کی اصلاح اور ان کو منظم اور کارکن جماعت بنانے کے لئے کس قدر صحیح اور بر وقت ہے۔ اس میں نہ کسی مذہب سے پرخاش ہے نہ کسی قوم سے عداوت ہے، نہ حکومت سے نزاع ہے نہ سیاسی شائبہ ہے بلکہ خالص اصلاحی اور اخلاقی تحریک ہے جس میں ہر مسلمان بلا کسی پس و پیش کے حصہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے علامہ موصوف کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جملہ انجمنیں اور سوسائٹیاں توڑ کر صرف اسی ایک تحریک میں شامل

ہو جانا چاہیئے۔ ان کو یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے عام طور پر اس تحریک میں عملی حصہ لیا تو پانچ سال کے اندر اندر ان کو حکومت اور سلطنت مل جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند ایک مدت سے بے عمل اور غافل ہیں اور اجتماعی اعمال اور مشاغل جو کچھ کر بھی رہے ہیں وہ عدم مرکزیت کے باعث غیر صالح ہیں جن سے کسی اچھے نتیجے کی امید نہیں ہے۔ یہ دانشمندانہ تحریک جس میں کسی طرف سے رکاوٹ کا اندیشہ نہیں ہے اگر چل گئی تو ساری ملت کو ایک مرکز پر لا کر متحد کر سکتی ہے جس سے توقع ہے کہ ہماری اجتماعی قوت درست ہو جائے گی۔

یہ کتاب ہر صاحب نظر اور دردمند مسلمان کو ضرور پڑھنی چاہیئے جس کی قیمت اسی وجہ سے اس قدر کم رکھی گئی ہے کہ اس کے صرفے سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کے مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ اس تحریک کی بنیاد عقل، اخلاق اور خالص دین پر ہے نہ کہ کسی ہنگامی یا نفرت یا عداوت کے جذبے پر۔ اگر یہ تحریک مسلمانوں نے قبول کر لی تو کچھ بعید نہیں کہ اس کے نتائج وہی ہوں جو مصنف نے لکھے ہیں۔

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن | مصنفہ مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری سردار جماعت اہلِ حدیث، بزبان عربی، تقطیع کلاں، صفحات ۴۰۲، قیمت چار روپئے۔ ملنے کا پتہ:۔ نیجر اخبار اہلِ حدیث۔ امرتسر۔

عربی زبان میں سینکڑوں تفسیریں کلام الٰہی کی لکھی گئی ہیں لیکن ہر ایک میں انسانی تفسیر ہے یعنی آیات کے مطالب جو ائمہ اور بزرگانِ دین نے سمجھے یا جو رسولِ پاک سے روایت کئے گئے (جو اکثر حالتوں میں صحیح نہیں ہیں) مندرج ہیں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس تفسیر میں کوشش کی ہے کہ آیات کے مطالب خود قرآن کی آیات سے حل کئے جائیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ راہ بالکل اچھوتی ہے جس پر مولانا سے پہلے کوئی دوسرا نہیں چلا تھا۔ اس لئے ان کو اس میں جو دشواریاں اٹھانی پڑی ہیں ان کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ ایک معتدبہ حصہ ہم نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ مصنف نے کس مشکل سے اپنا راستہ آپ نکالا ہے۔ یہ اس قسم کی پہلی کوشش ہے جس میں اس سے زیادہ کامیابی حاصل کرنی مشکل تھی۔ ہاں اب راستہ نکل گیا ہے اس لئے آئندہ آنے والے اس قسم کے مفسر کے لئے آسانیاں ہو گئی ہیں کہ وہ اس داغ بیل پر خوشنما عمارت کھڑی کر سکے۔

[illegible] کا یہ ہوا کہ اس تفسیر پر مولانا ہی کی جماعت کے چند سلف پرست حضرات نے طوفان بپا

کر دیا اور چالیس اعتراض کرکے جو اکثر بزرگوں کے اقوال پر مبنی تھے اربعین نامی رسالے میں شائع کیا یہاں تک کہ اس کا جھگڑا سلطان نجد و علمائے وہابیہ تک پہونچا اور وہاں طے ہوا۔ چنانچہ وہ فیصلہ اس تفسیر کے آغاز میں شامل ہے۔ ۱۳۵۳ھ میں ہمارے سامنے پھر سلطان کی خدمت میں اس جماعت کے لوگوں نے اس ذکر کو چھیڑا تھا لیکن انھوں نے سننا پسند نہ کیا اور موضوعِ سخن بدل دیا جس سے ہم نے یہ اندازہ کیا کہ وہ وسیع القلب ہیں اور اس قسم کے جزئی اعتراضات سے علماء سے بدظن نہیں ہو جاتے۔

کتاب التوحید | مترجمہ مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ ضخامت ۱۰۰، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت ۸/ مصنف سے قرول باغ دہلی کے پتے سے مل سکتی ہے۔

کتاب التوحید علامہ محمد بن عبدالوہاب بانیٔ تحریک نجدیہ کی وہ مشہور کتاب ہے جس نے نجدیوں کے دلوں میں اسلامی توحید نقش کرکے ان کو پکا ایماندار، متقی، ماحیٔ شرک اور حامیٔ اسلام بنا دیا۔ یہ کتاب دراصل اس قابل ہے کہ عالم کے جملہ مسلمانوں کو اچھی طرح پڑھائی جائے تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اسلام کس قسم کی توحید سکھلانے آیا ہے اور یہ توحید کس قدر عظیم الشان نتائج پیدا کرتی ہے اور کتنی انقلاب انگیز ہے۔ سب سے پہلے یہ کتاب غالباً ۱۳۱۱ھ میں دہلی میں شائع کی گئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم میاں مولانا سید نذیر حسین کی خدمت میں حدیث پڑھتے تھے۔ ان کو اس قدر پسند آئی کہ اس کا ترجمہ کرکے شائع کیا۔

اب مولانا سورتی صاحب نے اس کا عمدہ عالمانہ ترجمہ کیا ہے جو متن کے مقابل میں درج ہے۔ آغاز کتاب میں توحید کی حقیقت اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے جس سے کتاب کے متعلق بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ جا بجا حاشیے میں توضیح مطلب الفاظ اور معانی کی تشریح بھی کر دی ہے۔ ترجمہ بھی سادہ اور عام فہم ہے۔ اب یہ کتاب اس قابل ہو گئی ہے کہ عام طور پر اردو خواں طبقہ اس سے نفع حاصل کر سکے اور مدارس اور اسکولوں کے طلباء کو پڑھائی جا سکے بلکہ میرے خیال میں ہر مسلمان کے گھر میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

نبیوں کے قصے | مرتبہ خواجہ عبدالحی صاحب استاذ تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ تقطیع خورد، حجم ۵ جزو، لکھائی

چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۱۰؍ - ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ، قرول باغ، دہلی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں خواجہ صاحب موصوف نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسےٰ علیہ السلام تک ان انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان کئے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اسی قدر بیان کیا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ انسانی روایات نے ان قصوں پر جو اضافے کئے ہیں اور جن میں سے بڑا حصہ بے بنیاد بلکہ محض افسانہ ہے ان کو چھوڑ دیا ہے اور چونکہ یہ رسالہ تعلیمی ہے اور چھوٹے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اس لئے زبان نہایت سلیس اور سادہ رکھی ہے۔ بیان میں پیچیدگی مطلق نہیں ہے اور عبارت آسان ہے تاکہ بچے سمجھ سکیں۔

قرآن کریم میں انبیاء کے ذکر کی اللہ نے مدح فرمائی ہے اور کہا ہے "ھٰذا ذکر" (اس کا نام ہے ذکر) کیونکہ ان برگزیدہ اور مقبول بارگاہ حضرات کے حالات سراسر ہدایت، عبرت اور نصیحت ہیں اس لئے مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دل میں شروع ہی سے انبیاء کی مثال نقش کرائیں تاکہ ان کے اندر ایمان، سچائی، تقویٰ اور صبر پیدا ہو، دنیا کی بڑی بڑی مشکلوں کا مقابلہ کرسکیں اور حق کے حامی اور مددگار بن جائیں۔ اس لئے اس کتاب کا بچوں کو پڑھانا نہایت مفید ہوگا۔ اسی غرض کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور جامعہ کے بچے اس کو پڑھتے ہیں۔

دنیا کی رفتار

(الف) ہندوستان

گول میز کی دستوری کمیٹیاں | پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر یہ حقیقت برطانوی مدبرین پر اچھی طرح روشن ہوگئی تھی کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی شرکت کے بغیر آئندہ دستور اساسی کے متعلق تمام فیصلے بے سود اور بے نتیجہ ہوں گے۔ چنانچہ حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی، گاندھی اردن سمجھوتے پر دستخط ہوئے اور کانگریس نے چند شرائط کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شرکت منظور کی۔ کانگریس کا واحد نمائندہ جب کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان روانہ ہوا تو بعض حلقوں میں یہ امیدیں قائم کی گئیں کہ سیاسی گتھیاں شاید اب سلجھ جائیں۔ گول میز کانفرنس کا مقصد یہ سمجھا گیا تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ تعلقات اور ہندوستان کے ایک آزاد دستور اساسی کے متعلق گفت و شنید کرکے کچھ طے کریں گے لیکن جب کانفرنس منعقد ہوئی تو معلوم ہوا کہ مختلف جماعتوں، فرقوں اور طبقوں کے نمائندے ہندوستان کے مال غنیمت میں سے گویا اپنا اپنا حصہ بٹانے کے لئے مجتمع کئے گئے ہیں۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ بہت زیادہ غیر متوقع نہیں ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ ہندوستان کے اہم سیاسی مسائل کو طے کرنے کے لئے برطانوی تدبر نے گول میز کانفرنس کا جو طریقہ سوچ کر نکالا تھا وہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

... ...

لیکن وزیر اعظم برطانیہ نے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو کانفرنس کے اختتامی جلسے میں کانفرنس کی ناکامی پر ایک خاص اعلان کے ذریعے سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور یہ اعلان کیا گیا کہ چونکہ بعض اہم امور مقامی طور پر تحقیقات طلب ہیں اس لئے کانفرنس تو نامعلوم مدت کے لئے ملتوی کی جاتی ہے لیکن اس عرصے میں کانفرنس کی ایک مجلس عاملہ کانفرنس کے تمام کاموں کو جاری رکھے گی اور تین کمیٹیاں مقرر کی جائیں گی جو ہندوستان جاکر ضروری تحقیقات کرکے آئندہ کانفرنس کے سامنے اپنی رپورٹ آخری منظوری کے لئے پیش کریں گی۔

مجلس عاملہ اور تینوں کمیٹیوں کے ارکان کے نام بھی شائع ہو گئے ہیں اور یہ کمیٹیاں اب ہندوستان میں اپنا کام کر رہی ہیں۔ مجلس عاملہ کی صدارت وائسرائے ہند کو دی گئی ہے اور ارکان میں ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، مسٹر جیکر، ڈاکٹر مونجے، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں وغیرہ شامل ہیں۔ کمیٹیوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ فرنچائز کمیٹی:- حق نیابت، حق رائے دہندگی اور متعلقہ امور کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئی ہے۔ اس کے صدر مارکوئس آف لوتھین ہیں، اور اراکین میں منجملہ دیگر انگریز اور ہندوستانیوں کے سر محمد یعقوب، ڈاکٹر امبیڈکر، سر سندر سنگھ مجیٹھیا بھی شامل ہیں۔

۲۔ فیڈرل فائننس کمیٹی:- اقتصادی معاملات کی صحیح صورت حال دریافت کرنے کے لئے۔ اس کے صدر رائٹ آنریبل یوسٹس پرسی رکن پارلیمنٹ ہیں اور اراکین میں سر اکبر حیدری اور لفٹنٹ کرنل ٹاسکر کے نام قابل ذکر ہیں۔

۳۔ انڈین اسٹیٹس فائننس کمیٹی:- یہ کمیٹی دیسی ریاستوں کے اقتصادی معاملات کی تحقیقات کرے گی اور اس کے صدر رائٹ آنریبل جے۔ سی۔ سی۔ ڈیوڈسن ہیں۔ اس کمیٹی کے تمام اراکین انگریز ہیں اور تعجب ہے کہ کوئی ہندوستانی اس میں شامل نہیں کیا گیا۔

... ...

ہر کمیٹی کے صدر کے نام وزیر اعظم نے ایک مکتوب بھیجا ہے اور اس میں کمیٹی کے دائرہ عمل کے متعلق ضروری ہدایات دی ہیں مثلاً لارڈ لوتھین صدر فرنچائز کمیٹی کو لکھا ہے کہ گول میز کانفرنس کی فرنچائز سب کمیٹی کی سفارشات کو پیش نظر رکھ کر ایسی صورتیں دریافت کی جائیں کہ کم سے کم دس فیصدی اور زیادہ سے زیادہ پچیس فیصدی آبادی کو حق رائے دہندگی آئندہ دستور اساسی میں حاصل ہو جائے۔ وزیر اعظم کے تینوں مکتوبات میں بار بار اراکین گول میز کانفرنس کی اکثریت کا حوالہ دے کر اسی کی بنیاد پر مزید تحقیقات کی ہدایت کی گئی ہے حالانکہ گول میز کانفرنس میں نمائندگی آبادی کے لحاظ سے نہ تھی اور یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ کوئی فیصلہ نمائندگان کی اکثریت کے لحاظ سے نہ کیا جائے گا بلکہ آپس کے سمجھوتے اور گفت و شنید سے تمام باتیں طے پائیں گی ورنہ وزیر اعظم بخوبی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اور سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ آئندہ دستور میں ہر بالغ کو حق رائے دہندگی ملنا چاہئے، پھر ایک ایسے

سے زیادہ پچیس فی صدی آبادی تک محدود کر دینا کہاں تک حق بجانب ہے۔

... ...

ہر چند کہ گول میز کانفرنس کی کارروائیاں باشندگان ہند کے لئے صد درجہ مایوس کن تھیں لیکن چونکہ کانگریس کے واحد نمائندے نے وزیر ہند اور وزیر اعظم سے گفتگو کے بعد ان کمیٹیوں کے ساتھ آخر وقت تک تعاون کا وعدہ کر لیا تھا اس لئے پھر بھی قوم کی کچھ نہ کچھ توقعات ان کمیٹیوں سے وابستہ تھیں لیکن گاندھی اِرون سمجھوتے کے ختم ہو جانے کے بعد اب ملک کی موجودہ صورت حال پھر وہی ہو گئی ہے جو دسمبر سنہ ۳۰ء اور جنوری سنہ ۳۱ء میں تھی۔ گزشتہ سال وزیر اعظم، حکومت ہند اور انگلستان کی تمام سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق تھیں کہ بہتر سے بہتر دستور مرتب کر لیا جائے لیکن بیکار ہے جبتک کہ ملک کی فضا اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو! سائمن کمیشن نے بڑی محنت و کاوش سے ایک دستور مرتب کیا تھا لیکن اس کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہے! پہلی گول میز کانفرنس بھی دستور اساسی کے متعلق تمام مسائل ہمہ طے کر سکتی تھی لیکن آخرکار یہی محسوس کیا گیا کہ کانگریس کی نمائندگی کے بغیر کوئی فیصلہ مناسب نہ ہوگا۔ آج کل سال بھر کے بعد پھر وہی صورت درپیش ہے لیکن ع

کل جو عریاں تھی حقیقت وہی مستور ہے آج

... ...

گاندھی اِرون سمجھوتے کے ختم ہو جانے کے بعد اب حکومت کا یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں اور اقلیتوں کی مدد سے دستور مرتب کیا جائے اور اس کا نفاذ کیا جائے لیکن صورت حال ایسی بگڑتی جا رہی ہے کہ لبرل جماعت کا ایک گروہ جو بمبئی سے تعلق رکھتا ہے اس وقت بھی عدم تعاون کئے ہوئے ہے بقیہ لوگوں نے بھی الہ آباد میں ایک جلسہ منعقد کر کے حکومت کی موجودہ پالیسی سے اپنی بیزاری ظاہر کی ہے۔

اقلیتوں میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ پہلے ہی سے کانگریس کے ساتھ شریک ہے جداگانہ طریق انتخاب کے حامی مسلمان گول میز کانفرنس میں شریک تھے لیکن [illegible] جماعت میں بھی حکومت کے موجودہ طرز عمل سے بے اطمینانی پیدا ہو رہی ہے اور ایک بہت بڑا گروہ [illegible] کوششوں

[illegible]

اندیشہ ہے کہ اگر جلد سے جلد حکومت نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا خاطر خواہ فیصلہ نہ کر دیا تو علاوہ دستوری کمیٹی کے چند ارکین کے اور باقی تمام مسلمانوں کو بھی کمیٹیوں سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ غرض جملہ حیثیت سے صورت حال کسی طرح بھی خوشگوار نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ دستوری کمیٹیوں کا حشر سائمن کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ نہ ہو۔

صوبہ سرحد اور اصلاحات | گول میز کانفرنس کے آخری جلسے میں وزیر اعظم نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ آئندہ دستور اساسی میں صوبہ سرحد کو دیگر صوبجات کے مساوی اختیارات حاصل ہوں گے نیز چونکہ نئے دستور کی ترتیب اور نفاذ میں ابھی زمانہ لگے گا اس لئے فی الفور موجودہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت اصلاحات کا وہاں نفاذ کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد ہی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ضروری انتظامات ع کر دیئے گئے تھے اور ۱۹؍ فروری سنہ ۳۲ء کے ایک سرکاری بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ضروری امات مکمل ہو چکے تھے، اپریل کے دوسرے ہفتے میں کونسل کے انتخابات ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد صوبہ سرحد کی پہلی مجلس آئین ساز کا اجلاس منعقد ہوگا۔

مجلس آئین ساز کل چالیس ارکان پر مشتمل ہوگی جس میں سے ۲۸ ارکان منتخب شدہ ہونگے اور بارہ د۔ اٹھائیس منتخب نشستوں میں سے بیس نشستیں مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں، پانچ غیر مسلموں لئے، ایک سکھوں کے لئے اور دو زمینداروں کے لئے۔ نامزد ارکان میں سے ۶ سرکاری رکن ہونگے ۶ غیر سرحدی۔ گورنر کی اگزیکیٹو کونسل کا رکن منجملہ سرکاری ارکان کے ہوگا، ایگزیکیٹو کونسل میں صرف ایک رکن ہوگا اور وزیر بھی ایک ہی ہوا کرے گا جس کا تقرر حسب دستور منتخب اراکین کونسل میں سے کیا جائے گا۔

...

یہی اصلاحات اگر چند سال قبل نافذ کی جاتیں تو شاید ان کا خیر مقدم کیا جاتا حالانکہ مڈی مان کمیٹی کو ات کے بعد بھی طرح روشن ہو گیا ہے کہ صوبجات کا موجودہ دو عملی نظام حکومت بہت ناقص ہے، وقت ان اصلاحات کے نفاذ کے لئے اور بھی موزوں نہ تھا جب کہ وائسرائے کے ں نے تمام آئینی دستور کو معطل کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرزمین بے آئین میں آئینی [illegible] کیا جا سکے۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ سرحد کے ساتھ اب تک بڑی ناانصافیاں کی گئی ہیں اور جلد سے جلد وہاں آئینی نظام حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ملک نے گزشتہ دس سال کے اندر سیاسی تعلیم اور سیاسی بیداری کے مدارج اس قدر جلد طے کر لئے ہیں کہ کوئی صوبہ اس فرسودہ دو عملی نظام حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ صوبجات میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا فیصلہ خود حکومت نے کر لیا ہے، ایسی صورت میں اگر حکومت واقعی صوبہ سرحد کی شکایات کو حق بجانب سمجھ کر تلافی مافات کرنا چاہتی ہے تو مکمل ذمہ دار حکومت کا نظام مرتب کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ایک طرف بجائے اس کے نصف آزادی دینے والے اصلاحات نافذ کرنے میں حکومت غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے اور دوسری طرف آرڈیننس کے عملدرآمد میں اس قدر سختی ہے کہ اس کی وجہ سے تمام ملک میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے، ایسی فضا میں اصلاحات کیوں نافذ کی جا رہی ہیں یہ سمجھنے سے تاریخ و سیاست کا ہر طالب علم قاصر ہے۔

برطانوی تجارت اور بائیکاٹ | برطانوی ٹریڈ کمشنر مقیم ہندوستان اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک ہندوستانی منڈیوں کا تعلق ہے برطانوی تجارت پر ایسا نازک وقت گزرا ہے کہ اس کے اثرات ایک عرصے تک محسوس کئے جائیں گے۔ برطانوی مال تجارت کی درآمد میں ۶ر۵ فی صدی تخفیف ہو گئی ہے اور ٹریڈ کمشنر کی رائے میں یہ تخفیف اس قدر غیر معمولی ہے کہ اس کی وجہ صرف تحریک بائیکاٹ قرار دی جا سکتی ہے۔

گزشتہ سال تحریک سول نافرمانی کا یہی عنصر تھا جس کو تنگ نظر مدبرین انگلستان نظر انداز کرنا چاہتے تھے لیکن سابق وزیر ہند اور وائسرائے نے اسی عظیم الشان تجارتی نقصان اور اس کی اہمیت محسوس کر کے قوم پرست جماعت کے ساتھ سمجھوتا کیا تھا۔ ایک تو عام کساد بازاری نے تمام کاروبار کو تباہ کر رکھا ہے اس کے علاوہ بائیکاٹ کی قومی تحریک نے برطانوی تجارت کو شدید ترین نقصان پہونچایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ دستور اساسی کے تمام تحفظات اس تجارتی نقصان کو روک سکتے ہیں! اگر برطانیہ اور ہندوستانی قوم کے تعلقات آئندہ اسی قدر کشیدہ رہے تو کیا وہ تحفظات جو لارڈ ریڈنگ اور سر سموئل ہور مجوزہ دستور اساسی کے لئے تجویز کر رہے ہیں کسی صورت میں بھی برطانوی مفاد اور برطانوی تجارت کی حفاظت کر سکیں گے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد اور خوشگوار

تحفظات ہی سب سے بہتر ضمانت اور سب سے عمدہ تحفظات ہیں۔

کلکتہ بمبئی اور کراچی سے درآمد و برآمد کے جو اعداد و شمار شائع ہوتے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ میں پچھلے مہینوں کے اندر معتدبہ کمی ہوگئی ہے۔ اس کا اثر سرکاری مالیات پر پڑنا لازمی ہے۔ اسی لئے بہی خواہان حکومت نے بھی گاندھی ارون سمجھوتے کے ختم ہو جانے پر پرزور احتجاج کیا تھا لیکن معاملات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ فی الحال سیاسی فضا درست ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بائیکاٹ کی قوت برابر زور پکڑتی جا رہی ہے جو بالآخر برطانوی تجارت کے لئے بہت زیادہ نقصان رساں ثابت ہوگی۔ جرمنی کے تاوان جنگ کے مسئلہ نے برطانوی مدبرین کو پریشان کر دیا ہے اس لئے کہ اس کا مضر اثر برطانوی ساکھ پر پڑ رہا ہے لیکن برطانوی مال کے بائیکاٹ کا مسئلہ بھی برطانیہ کے لئے کچھ کم اہم نہیں، برطانیہ کی ساکھ تجارت ہی کے ذریعے قائم رکھی جا سکتی ہے۔ حکومت کو جلد یا بدیر اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

<u>شمع زندگی</u> | ہندوستان کی مخصوص آب و ہوا میں عمر کا اوسط دیگر ممالک کے مقابلے میں یوں بھی کچھ کم نہ تھا لیکن اصول حفظان صحت کی طرف سے بے توجہی نے اوسط عمر گھٹا کر ۲۵ سال سے ۲۲ سال کر دیا ہے، اس کے مقابلے میں دیگر ممالک کا اوسط عمر برابر بڑھ رہا ہے جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے:۔

۱۔ نیوزی لینڈ میں ۶۵ سال ہے

۲۔ امریکہ میں ۵۶ سال سے بڑھ کر ۵۸ سال ہوگیا ہے۔

۳۔ انگلستان میں ۴۹ سال سے ۵۰ سال ہوگیا ہے، اور

۴۔ جاپان میں بھی ۴۷ سال سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ہندوستان میں بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ہر سال ہیضہ، طاعون، بخار اور چیچک میں ضائع ہوتی ہیں اور اب کچھ عرصے سے تپ دق کا مرض بھی روز بروز بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ اس مرض کے ایک بہت اچھے ماہر ڈاکٹر موصوف نے اندازہ لگایا ہے کہ کم از کم دس لاکھ جانیں ہر سال تپ دق کی بدولت ضائع جاتی ہیں اور اس مرض میں جو مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے زیادہ تعداد نوعمروں اور نوجوانوں کی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر متو ایک عرصے سے اس مرض کے انسداد کے لئے بہت کوشاں ہیں اور آپ نے ایک بہت بڑی صحت گاہ مدراس کے قریب بمقام تمبرم قائم کی ہے جہاں دق کے مریضوں کا علاج خاص ان کی نگرانی میں کیا جاتا ہے۔ لیکن جس تیز رفتاری سے یہ مرض اس ملک میں ترقی کر رہا ہے اس کو محسوس کرکے ڈاکٹر موصوف نے ارادہ کیا ہے کہ اس صحت گاہ کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا جائے کہ (۱) سند یافتہ ڈاکٹر وہاں رہ کر اس مرض کی تشخیص اور علاج کے متعلق تجربات کریں (۲) مریضوں کے اعزا اور تیمارداروں کو حفظان صحت کے اصول اور عمدہ غذا تیار کرنے کے طریقے بتلائے جائیں اور (۳) عام تقاریر اور تصاویر کے ذریعے سے اس مرض سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہدایات اور معلومات عوام تک پہونچائی جائیں۔

ڈاکٹر متو کی یہ کوشش قابل مبارکباد ہے اور ضرورت ہے کہ دیگر مقامات پر بھی اسی قسم کی تدابیر اس نامراد مرض کے انسداد کے لئے اور عامۃ الناس کو از خود موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لئے اختیار کی جائیں ورنہ اس طرف سے بے توجہی خودکشی کے مرادف ہوگی۔

(ب) عالم اسلامی

انتداب عراق کا خاتمہ | سیاسی حلقوں میں ایک مدت سے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ عراق میں برطانوی انتداب کا زمانہ عنقریب ختم ہو جائے گا۔ رائٹر کی تازہ ترین اطلاعوں نے اس خیال کی تصدیق کر دی ہے۔ اس لئے کہ انجمن اقوام نے "اصولاً اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے کہ عراق میں انتدابی حکومت کو ختم کر دیا جائے لیکن اس وقت جب مستقل مجلس انتدابات کی تجاویز کے مطابق دولت عراق انجمن اقوام سے چند ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کرے"۔ یہ ذمہ داریاں یا ضمانتیں کیا ہونگی اس کا پتہ مجلس انتدابات کی روئداد سے چلیگا۔ جب مجلس مذکور کی یہ روئداد تیار ہو جائے گی تو پھر انجمن اقوام کے بعض نمائندے برطانوی نمائندوں سے ملکر اس اعلان کا مسودہ تیار کریں گے جن میں مجلس کی سفارشات کا تذکرہ ہوگا۔ اس کے لئے حکومت عراق سے گفت و شنید کی ضرورت پڑے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس روز یہ تمام امور طے ہو گئے اسی روز انتداب عراق کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اول تو یہ دیکھنا باقی ہے کہ انجمن اقوام حکومت عراق کی ضمانتوں کو کس نظر سے دیکھتی ہے [illegible] اگر انجمن اقوام نے عراق کی ضمانتوں کو [illegible] انتداب کا خاتمہ [illegible]

جب حکومت عراق باقاعدہ انجمن اقوام میں شریک ہو جائے گی۔

اب ذرا یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ان ضمانتوں کا تعلق جن پر انجمن اس درجہ اصرار کر رہی ہے کن امور سے ہے۔ ایک تو انجمن کو اقلیتوں کی حفاظت مقصود ہے۔ دوسرے اس کی یہ خواہش ہے کہ عدالت کا نظم و نسق اعلیٰ پیمانے پر ہو اور انتدابی حکومت کے دوران میں عراق پر جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا احترام کیا جائے۔ علاوہ ازیں ان بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی ضروری ہے جن میں عراق نے بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لیا ہے۔ یہ مسائل ہیں جو اس وقت سر فرانسس ہمفری ہائی کمشنر عراق اور نوری پاشا وزیر اعظم عراق کے زیر غور ہیں۔ دونوں حضرات اس وقت جینیوا ہی میں مقیم ہیں اور خیال ہے کہ انجمن اقوام کے اجلاس مئی میں اس اعلان کا مسودہ پیش کر دیا جائے گا جس کو نوری پاشا اور سر فرانسس عراق کی طرف سے تیار کر رہے ہیں۔

عراق کی آزادی کا مسئلہ ختم انتداب کا پابند ہے لیکن اس امر پر بجائے خود اس قدر شرائط عائد کر دی گئی ہیں جن کے پورا کرنے کے لیے ایک مدت چاہیے۔ مزید براں ختم انتداب کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان ضمانتوں کی موجودگی میں آزادی عراق کی صحیح نوعیت کیا ہوگی۔ بہر حال جن لوگوں کو انجمن اقوام پر اعتماد ہے اور جو لوگ مغرب کی سیاسی کارروائیوں کے متعلق حسن ظن سے کام لیتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ دولت عراق کو اپنے سیاسی مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو رہی ہے۔ امیر فیصل نے ایک تار میں تاجدار برطانیہ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اگر گزشتہ دس سال میں دولت برطانیہ کی اعانت ان کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوتے اور ملک معظم نے اس عظیم الشان کامرانی پر انھیں مبارکباد دیتے ہوئے یقین ظاہر کیا ہے کہ عراق و برطانیہ کا سلسلۂ محبت و مودت اسی طرح جاری رہے گا۔

<u>سیاسیات شام</u> | شام کے انتخابات عنقریب مکمل ہو جائیں گے۔ پچھلے مہینے وطن پسندان شام کے رویے نے حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ دمشق، حمص اور حماہ میں انتخابات کا سلسلہ یک قلم موقوف کر دیا جائے لیکن اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ جماعت وطنیین کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہو گئی ہے اور حکومت کا خیال ہے کہ انتخابات کا نتیجہ اس کی توقعات کے مطابق ہوگا۔ انتخابات کا معاملہ ختم

ہو جائے تو مجلس مقننہ کو نئے دستور پر غور کرنا ہوگا اور پھر اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ آیا شام میں جمہوریت قائم کی جائے یا بادشاہت۔

معلوم ہوا ہے یہ امر بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ فرانسیسی حکومت نے شامی معاملات کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس سے ہم احرار شام کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہنوز ہنگامۂ انتخابات اختتام کو نہیں پہنچا۔ انتخابات کا سلسلہ جاری تھا کہ حماۃ، حمص اور دمشق میں ان کو یک قلم موقوف کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وطن پسندان شام کا رویہ کچھ بہت زیادہ مستحسن نہیں تھا۔ گویا حکومت انتداب نے ایک طرف آئین و دستور کی نمائش قائم کر رکھی ہے۔ دوسری طرف وہ یہی چاہتی ہے کہ احرار شام کے رستے میں ہر ممکن عذر کی بنا پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کر دے اور انتخابات کے خاتمے پر بہرحال اس کی اکثریت قائم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ مجلس مقننہ میں جدید دستور کی تصدیق و عدم تصدیق اور شام میں جمہوریت یا بادشاہت کے قیام کا فیصلہ بھی حکومت ہی کے ایما پر ہوگا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلے کے متعلق احرار شام کی رائے کیا ہے۔ بہرحال قارئین جامعہ انہیں صفحات میں پڑھ چکے ہوں گے کہ امارت شام کے لئے اس سے قبل امیر فیصل تاجدار عراق کا نام لیا جاتا تھا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ ممکن ہے عراق و شام کے الحاق سے ایک متحدہ ریاست قائم کر دی جائے۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ عباس حلمی پاشا معزول خدیو مصر اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں شام کا تخت حاصل ہو جائے۔ پچھلے مہینے عباس حلمی پاشا نے قدس اور ماورائے اردن کا سفر کیا۔ جہاں عمان میں انہوں نے امیر عبداللہ سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہونچے کہ امیر فیصل کے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش نہیں کہ وہ شام پر حکومت کریں۔ یہاں سے عباس حلمی بیروت آئے اور اب قسطنطنیہ کا عزم رکھتے ہیں تاکہ وہ اس گفت و شنید کا حال معلوم کریں جو حکومت فرانس اور ان کے نمائندے کے درمیان اس بارے میں ہو رہی ہے۔

غالباً یہاں اس امر کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ خدیو معزول جریدہ ٹائمز کے خلاف ایک دعویٰ دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بنائے دعویٰ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ٹائمز نے سر ویلنٹائن چرول کی کتاب "مسئلہ مصر" شائع کی جس میں ان کے متعلق بعض ایسے بیانات موجود ہیں جن پر خدیو موصوف کو اعتراض ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ عباس حلمی پاشا اب تک اس معاملے میں کیوں خاموش رہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور شاہ مصر سے ان کے تعلقات حال ہی میں ٹھیک ہوئے

ہیں چنانچہ جنگ کے بعد وہ پہلی دفعہ پچھلے سال لندن تشریف لے گئے ہیں اور غالباً اسی زمانے میں انھوں نے ٹائمز کے خلاف اپنے دعوے کے انتظامات مکمل کئے ہیں۔

اتحاد طہران و انگورہ قاہرہ کا ایک پیام مظہر ہے کہ توفیق رشدی پاشا وزیر خارجۂ ترکی طہران و بغداد کا عزم رکھتے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ پاشائے موصوف سفر طہران سے فارغ ہو کر اب بغداد تشریف لے آئے ہوں گے۔

ایران و ترکی کی باہمی رقابت اور عداوت کا افسانہ ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے۔ سیاسی انقلابات کی بدولت یہ دو عظیم قوتیں جو اپنے مذہبی تعصب اور بے بصر سیاست کی وجہ سے صدیوں تک باہم حریف بنی رہیں اب ایک دوسرے کو صلح و آشتی کا پیام دے رہی ہیں۔ ان کی سیاسی بے خبری، تدبر و مصلحت اندیشی اور مذہبی جنون وطنیت سے بدل چکا ہے۔ بایں ہمہ انگورہ اور طہران کے تعلقات ابتک کچھ بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں تھے۔ خیال یہ ہے کہ دولت ایران کردوں کے جذبۂ آزادی کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ کردستان ایران و ترکی کی سرحد پر واقع ہے اور باغی کرد جب چاہتے تھے ایرانی علاقے میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے لیکن جب سے رضا شاہ پہلوی کی حکومت نے ملک کے اندرونی نظم و نسق کی طرف قدم اٹھایا ہے کردی قبائل کی آزادانہ نقل و حرکت میں بہت کچھ کمی واقع ہو گئی ہے بلکہ گزشتہ دو سال کی جنگی کارروائیوں کے بعد اب ایران کی کردستانی سرحد تمام قبائلی مفاسد سے پاک ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران و ترکی کے باہمی اتحاد کی تکمیل کے لئے اب توفیق رشدی پاشا طہران گئے ہیں۔ قرارداد یہ ہے کہ ترکی سرحد کے بعض اضلاع ایران کو دیئے جائیں اور ان کی بجائے ارارات اصغر پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ یہی علاقہ کردی باغیوں اور رہزنوں کا آماجگاہ ہے۔ حکومت ایران نے اگرچہ اس کے متعلق اپنی رضامندی کا باقاعدہ اظہار نہیں کیا لیکن توفیق رشدی پاشا کے اس سفر سے غالباً اس قسم کی کوئی مفاہمت بآسانی عمل میں آجائیگی۔

البتہ بغداد کا سفر ایک دوسرے مقصد کا پابند ہے۔ قارئین جامعہ انہی صفحات میں عراق و انگورہ کے خوشگوار تعلقات کا حال ملاحظہ کر چکے ہیں۔ امیر فیصل کے سفر قسطنطنیہ کے بعد نوری پاشا وزیر اعظم عراق براہ حلب قسطنطنیہ تشریف لے گئے تاکہ عراق و ترکی کے اتحاد کا رشتہ زیادہ مضبوطی سے

ظاہر ہوتے ہیں۔ اب ان دوستانہ روابط کے قیام کے بعد [illegible] [illegible] [illegible]
وطن اور ترکی میں تجارتی تعلقات بھی قائم ہو جائیں۔ ترکوں کی خواہش ہے کہ ایرانی [illegible] میں [illegible]
بھی اہمیت قائم کر لیں۔ آج سے آٹھ دس سال پہلے یہ خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ ترک خود طور سے تجارتی
معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اہمیت نہیں رکھتے لیکن اب کچھ سال سے ترک نہایت کامیابی کے
ساتھ بہت سے بینک چلا رہے ہیں جن میں ترکوں کے علاوہ کسی [illegible] قوم کا تعلق [illegible] نہیں [illegible] تھا
اپنے ساتھ ترکی بینکوں کے افسر اعلیٰ کو بھی لے گئے ہیں۔ [illegible] اور واقف روم کی شرکت [illegible]
ایران تک پہنچ جائے گی لہٰذا ترکوں کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے بینک کی ایک شاخ طہران میں کھول دیں
اور اس طرح دونوں ہمسایہ ممالک میں تجارتی روابط قائم ہو جائیں۔ پاشائے موصوف کا بغداد تشریف لیجانا
بھی اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔

حکومت انگورہ کی مالی مشکلات

گزشتہ چند [illegible] سے انگورہ کی مالی مشکلات نے ایک نازک صورت اختیار کر رکھی ہے۔
دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ترکوں کو بھی یہ دشواری پیش ہے کہ وہ اپنے میزانیہ
میں کمیوں کر توازن قائم کریں۔ لیکن ترکی میں جو کچھ ہوتا ہے پوشیدہ طور پر ہوتا ہے اور اکثر یہ پتہ نہیں چلتا کہ
حکومت کے [illegible] کیا ہیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے مجلس ملیہ کے افتتاح پر یہ اعلان کیا تھا کہ اس امر
کے متعلق حکومت غیر معمولی ذرائع اختیار کرے گی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے ہر شخص کی آمدنی پر خواہ
وہ ترک ہو یا غیر ترک ۔۔ فی صدی ٹیکس عائد کر دیا ہے البتہ عمال حکومت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مجلس ملیہ اس
امر پر غور کر رہی ہے کہ غیر ملکی آبادی کو ترکی حدود میں کسی کام کاج کی اجازت نہ دی جائے [illegible]
مہینے کے اندر اندر ان سب لوگوں کو اپنے کام کاج سے دستبردار ہونا پڑے گا [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] حکومت
میں حکومت [illegible] [illegible] کی اجازت [illegible]

اس سے قبل حکومت ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] کے لئے تعین کر دیا کرے [illegible] مصنوعات جو ترکی میں تیار ہوتی ہیں [illegible]
[illegible] اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی [illegible]

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۳

بابت ماہ مارچ ۱۹۳۲ع

جلد ۱۸

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہوار

جامعہ

دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۲۱ بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء نمبر ۳

فہرست مضامین

		صفحہ
۱- جمال الدین افغانی	جناب قاضی عبدالغفار صاحب	۱۹۰
۲- مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط	....	۲۰۴
۳- گیتا کے فارسی تراجم	جناب مہیش پرشاد صاحب	۲۱۹
۴- رام پور کا ایک ملک الشعرا	جناب رئیس احمد صاحب جعفری ندوی	۲۲۹
۵- غزل	حضرت اصغر گونڈوی	۲۵۸
۶- بدچلن بیوی		۲۵۹
۷- تنقید و تبصرہ	ایڈیٹر	۲۶۳
۸- دنیا کی رفتار:- عالم اسلامی	ن۔ن	۲۷۱
ہندوستان	ن۔ن	۲۷۵
ممالک غیر	ذ۔ح	۲۸۲
۹- شذرات	ایڈیٹر	۲۸۹

(محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا)

جمال الدین افغانی

(یہ قاضی عبدالغفار صاحب کے اس مقالے کا آخری حصہ ہے جو موصوف نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۲۱ فروری کو پڑھا تھا۔)

ایران میں شیخ کی عملی زندگی کا اہم ترین زمانہ ۹ھ سے شروع ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کے مہمان ہو کر گئے تھے لیکن ان کے افکار و عزائم شاہ کے اثرات سے بہت دور تھے۔ وہی ایک جذبہ جوان کو مصر اور روس لے گیا تھا یا نجد و خلیج فارس کی طرف لے گیا وہی جذبہ ان کو ایران میں کھینچ کر لایا تھا اور کچھ ہی عرصے بعد اس جذبے کے مظاہرے شروع ہو گئے۔

شیخ کا بہت بڑا کارنامہ جو مصر و ایران میں ان کی زندگی کا نشان ہے یہ تھا کہ جو جماعت یعنی جماعت علما، شہنشاہیت کی پرستار اور مددگار تھی اسی سے انھوں نے شہنشاہیت اور مطلقیت کے فنا کرنے کا کام لیا۔ تاریخ اسلامی کے اس دور میں قدامت پسند علما کا گروہ حقوق انسانیت کا حامی نہ تھا بلکہ مخالف تھا تاہم شیخ ہی کا وہ جادو تھا جس نے اس استبداد پسند جماعت کے قلوب کو بدل دیا اور حقوق ملت کے چوروں ہی کو "آدمیت" اور انسانیت کا محافظ و پاسبان بنا دیا۔ شیخ کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے بڑا معجزہ تھا!

ناصرالدین شاہ کی زندگی کے آخری چند سال ایران کے قومی مصائب اور ایرانی شہنشاہیت کے بدترین چند سال تھے۔ شاہ کو یورپ کی دلچسپیوں اور عیاشیوں نے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کی دولت یورپ کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ ناصرالدین شاہ کا تیسرا اور آخری سفر یورپ وہ تھا جب وہ یورپ سے اپنی شہنشاہیت کے سخت ترین دشمن کو مہمان بنا کر ساتھ لایا تھا جس طرح فرعون کے محل میں موسیٰ لائے گئے تھے۔ ناصرالدین نہ صرف اپنا خزانہ خالی کر چکا تھا بلکہ اس کی رعایا کی جیبیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔ اب مصر کی طرح یہاں بھی یورپ

کے ساہوکار قبضہ جما رہے تھے۔ مشرقی تاجداروں کے تاجوں کو گرو رکھنے کے لیے یورپ کا بنیا ہمیشہ تیار رہتا ہے اس لیے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ تاج کے ساتھ تخت بھی اس کے گھر آئے گا۔
ناصرالدین کی تنگدستی نے اس کو قرضے لینے اور یورپین سرمایہ داروں کو اپنے ملک میں ہر قسم کی مراعات دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں برطانوی سرمایہ داروں کو طہران میں شاہی بنک قائم کرنے کا ٹھیکہ دے دیا گیا اور اسی کے چند روز بعد تمباکو کے اجارے کا قصہ پیش آیا، جس نے بالآخر انقلاب کے دروازے کھول دیے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو شاہ سفر یورپ سے واپس آئے، شیخ ان کے ہمراہ تھے۔ چند ہی روز بعد اہواز سے طہران تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا گیا۔ ۸ مارچ ۱۸۹۰ء کو ایک انگریز ہی کو تمام ایران کے تمباکو کی کاشت کا اجارہ دار بنایا گیا۔ تقریباً دس کروڑ کے سرمایے سے اس کمپنی نے اپنا کام شروع کیا۔ اس اجارے کے خلاف سب سے پہلے شاہزادہ مالکم خاں نے، جو لندن میں ایرانی سفیر تھے احتجاج کیا اور اسی بنا پر شاہ نے ان کو سفارت کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ مالکم خاں کی زبردست شخصیت نے اس موقعے پر اپنے تمام ذاتی اثرات کو حکومت کے خلاف نکتہ چینی میں صرف کر دیا۔ وہ اپنے عہدے سے برطرف ہو کر لندن ہی میں مقیم رہے۔ انھوں نے اخبار "قانون" جاری کیا۔ اس اخبار نے ایرانی شہنشاہیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ شیخ کے مضامین بھی "قانون" میں شائع ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ راز ظاہر ہو گیا کہ شیخ مالکم خاں کی اس تحریک سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کی زبردست آواز خط کے لفافے میں طہران سے لندن جاتی تھی اور لندن سے "قانون" کے پردے میں طہران واپس آ کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جاتی تھی۔ شاہ ان کے اصلی رنگ سے واقف ہو چکا تھا اور وہ بھی کھل کر میدان میں آ گئے تھے۔ جانفروشوں کی ایک جماعت ان کے حلقے میں داخل ہو چکی تھی۔ شیخ علی قزوینی جو بعد کو قاضی عدلیہ ہوئے، مرزا آقا خاں جنھوں نے بعد کو قسطنطنیہ سے اخبار اختر جاری کیا اور پھر تبریز میں خفیہ طور پر قتل کر دیے گئے، شیخ احمد کرمانی، مرزا رضا کرمانی جس نے ناصرالدین شاہ

ل کیا اور طہران میں پھانسی پائی، مرزا محمد علی خاں طہرانی، اور ایسے ہی بہت سے نام شیخ کے
ید تمندوں کی فہرست میں تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ نام تھے جو آج بھی تاریخ انقلاب ایران
ے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش آتا ہے
ومت کے بلند مقام اراکین شیخ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو گوارا نہ کر سکے اور وزیر اعظم امین السلطنۃ
ے بہت جلد شاہ کو شیخ کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس عرصے میں بہت سی خفیہ انجمنیں ملک
ں قائم ہو چکی تھیں اور شاہ اپنے کو سخت خطرے میں پاتا تھا۔ شیخ بھی اب امین السلطنۃ اور
ا ہ کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھے، چنانچہ انھوں نے شاہ سے اجازت چاہی کہ طہران کے
ہر شاہ عبد العظیم کی خانقاہ میں اقامت اختیار کریں اور شاہ نے بھی اس خیال سے کہ یہ فتنہ
ص دار السلطنت سے دور ہو جائے ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب وہ
اہ عبد العظیم میں جا کر بیٹھے تو وہاں بھی مشاہیر، علماء اور عوام ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہونے
لے اور شیخ کی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۸ مہینے اس طرح گذرے اور اس ۸ مہینے
ں داعی حریت کی آواز ایران کے ہر گوشے میں سرایت کر گئی اور وہ ملت ایرانی کے ایک
صلح اعظم سمجھے جانے لگے۔ اسی زمانے میں شیخ نے ایک مکتوب شاہ کو بھیجا اور دریافت کیا
وہ کیوں ان سے بدگمان ہیں۔ لیکن اس مکتوب کے جواب میں شاہ نے شاہ عبد العظیم میں شیخ
ان کے بستر علالت پر گرفتار کرا لیا اور وہیں سے ۵۰ سواروں کی نگرانی میں عثمانی سلطنت کی
سرحد پر بھیج دیا۔ شیخ کے خارج البلد کئے جانے کی خبر نے تمام ملک میں آگ لگا دی اور شاہ کو
پنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ بلاشبہ شیخ کا ایران سے جانا شاہ کی موت کا آنا تھا۔

شیخ نے ایران سے نکلتے ہی مجتہدین عراق و کربلا اور علمائے ایران کی دبی ہوئی آگ
و بھڑکا دیا اور جو زمین وہ تیار کر چکے تھے اس پر اپنا کام شروع کر دیا۔ جو خطوط شیخ نے علماء و
مجتہدین کو لکھے ان میں سے ایک کا کچھ حصہ ان اوراق میں اس لئے پیش کرتا ہوں کہ شیخ کے
ان جذبات سے آپ روشناس ہو جائیں جو ایران کے متعلق ان کے قلب کو بے چین کر رہے

نے ۔ سامرہ کے مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کو لکھتے ہیں :-

"میں حق کہتا ہوں، یہ خط شریعت اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں۔ جہاں کہیں وہ شریعت جاری ہو اور قائم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو میں تمام حق پسند روحوں سے کرتا ہوں جو شریعت پر ایمان رکھتی ہیں اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں یعنی میں اپیل کرتا ہوں علماء اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علماء سے کرتا ہوں حالانکہ میرے مخاطب ان میں سے ایک بھی نہیں ......

خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے تاکہ آپ حقیقت عظیمہ کے نمائندے ہوں اور خدا نے ملت بیضا سے آپ کو منتخب کیا ہے کہ آپ انسانوں کی باگ ہاتھ میں لے کر شریعت اسلامی کی حفاظت و نگرانی کریں۔ اہل ایران اب ظلم و ستم کے اندر اپنے بیت الدین کو دیکھ کر بیتاب ہوگئے ہیں جو اغیار و کفار کے ہاتھ فروخت کردیا گیا ہے اور جس پر ان اغیار و کفار کا قبضہ قائم ہوگیا ہے۔ مگر کسی لیڈر کے نہونے کی وجہ سے اہل ایران پریشان ہیں، منقسم ہیں اور معطل ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں، ان کا ایمان متزلزل ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مجتہدین کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا لیڈر سمجھتے ہیں اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ تیرا ایک لفظ ان کو متحد کردے گا اور تیری ہی حجت فیصلہ کن ہوگی، تیرا ہی حکم باثر ہوگا اور کسی کی مجال نہ ہوگی کہ تیرے حکم پر حرف زنی کرسکے اور اگر تو چاہے گا تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد کرادے گا اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف خدا پیدا کردے گا اور کفار کے ظلم سے اہل ایران کو بچائے گا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت و ابتلا کا خاتمہ کردے گا جس میں اہل ایران گھرے ہوئے ہیں اور ان کو زندگی کی سختیوں سے نجات دے کر راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت ہوجائے گی اور اس دین کے

حلقہ بگوش اس کو سنبھال لیں گے اور اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا..... اے امام اعظم! بے شبہ بادشاہ کی قوت ارادی کمزور ہے، اس کی سیرت خراب ہے اور اس کا دل گندہ ہے۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہل ملک کے معاملات کو سدھارنے کے قابل نہیں ہے اور اس نے حکومت کی باگیں ایک بے دین ظالم اور غاصب کی سپرد کر دی ہیں جو رسول پر علانیہ استہزا کرتا ہے اور شریعت حقہ کی پروا نہیں کرتا، جو امرائے شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علماء پر لعنت بھیجتا ہے، اہل زہد و تقویٰ کو ذلیل کرتا ہے اور سادات کی تحقیر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کفار کے ملک سے واپس آنے کے بعد وہ بالکل قابو سے باہر ہو گیا ہے، علانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت گذارتا ہے۔ یہ ہے اس کا چلن۔ مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ مع اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ (اشارہ ہے معدنیات کی طرف) یہی نہیں بلکہ سڑکیں، کارواں سرائیں، باغات، کھیت سب ہی کچھ اس نے وقف کر ڈالے .... تمباکو کی تمام زراعت مع زمین و عمارات کے، انگور کی فصل مع کارخانوں اور سامان تجارت کے، صابون، موم بتیاں اور شکر کے تمام کارخانے غرض سب کچھ مع متعلقات اس نے کفار کی نذر کر دیا ہے، انتہا یہ ہے کہ بنک۔ آپ کیوں کر سمجھیں گے کہ بنک کیا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ دشمنان اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی۔ .... اب جو کچھ رہ گیا ہے اس نے روس کے سامنے پیش کر دیا تاکہ روس خاموش رہے یعنی مندب رشت، دریائے طبرستان، سڑک انزلی و خراسان مع تمام مکانات و سراؤں اور متعلقہ اراضیات مزروعہ کے، مگر روس نے ناک بھوں چڑھائی اس لئے کہ وہ تو کل خراسان، آذربائیجان اور مازندران کی فکر میں ہے .... یہ ہے پہلا نتیجہ اس پاگل کے طرز عمل کا .... اور تو اے حجۃ الاسلام کیا تو اس قوم کی مدد کے لئے نہ اُٹھے گا اور ان کو متحد نہ کر دے گا اور شریعت مطہرہ کی

قوت ہے اس ملک کو اس گنا ہگار کے ہاتھ سے نجات نہ دلوائے گا؟ بلاشبہ بہت جلد
یہ اسلامی مملکت اغیار کے زیر اقتدار ہوگی جو وہاں جس طرح چاہیں گے حکومت کریں گے
اگر تو نے یہ موقع جانے دیا' اور اے امام! اگر یہ واقعہ تیری زندگی میں پیش آگیا تو لاریب
تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑ جائے گا!"

اس کے بعد شیخ نے ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو ان کے رفیقوں پر اور خود ان پر کیے گئے۔
انھوں نے اپنے ایران سے نکالے جانے کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

"اب میری داستان اور جو کچھ اس ناشکر گذار ظالم نے میرے ساتھ کیا وہ بھی
سن لیجئے۔ اس مردود نے طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ذلت کے ساتھ
میرے گھسیٹے جانے کا حکم دیا جبکہ میں خانقاہ عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھا اور بہت بیمار
تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے ذلیل خادموں نے مجھے باوجود میری علالت کے
ایک باربردار ٹٹو پر سوار کرایا اور زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب اس وقت کیا گیا
جب جاڑوں کا موسم تھا' برف کے طوفان آرہے تھے اور بہت سرد ہوائیں چل رہی تھیں
اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خانقین پہنچایا گیا جہاں پہلے ہی ترک والی سے
طے کر لیا گیا تھا کہ مجھے بصرہ بھیج دیا جائے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر
مجھے آزاد چھوڑا گیا تو میں سیدھا تیرے پاس آؤں گا' اے امام! اور تجھے اس کے
مظالم سناؤں گا اور مملکت ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے اے حجۃ الاسلام
مدد چاہوں گا!"

شیخ کا یہ زبردست اپیل ایک بجلی کی طرح ایرانی مجتہدین کی جماعت میں سرایت کر گیا اور
ایران میں تمباکو کے اجارے کے خلاف وہ شدید اور خوفناک آگ بھڑکی جس نے ناصر الدین شاہ
کا جامۂ ہستی جلا ڈالا۔ اپنے جلاوطن ہونے سے پہلے شیخ نے ایران کی سرزمین پر شہنشاہیت کے
خلاف اس قدر بارود پھیلا دی تھی کہ ان کی جلاوطنی کے چند ہی روز بعد "انقلاب" کی آواز

ایران کے کوچہ و بازار میں گونجنے لگی۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے بظاہر اسباب شیخ کی تعلیمات خود مختار بادشاہوں کی جان کی دشمن معلوم ہوتی تھیں اور یہ شبہ کچھ بیجا نہیں کہ شیخ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے شدید ترین آلات حرب استعمال کرنے کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ ان کے اس سیاسی مذہب سے کتنا ہی اختلاف کیا جائے لیکن ان کی بے مثال قربانیوں اور ان کے اعلیٰ انتہائے خیال کے متعلق دنیا کا کوئی وطن پرست ایک حرف نہیں کہہ سکتا۔ جیسا کہ مصر کے حالات میں ظاہر کیا جاچکا ہے ان کی سیاسیات کا وہی رنگ ایران میں بھی تھا۔ علماء کے طبقے میں آگ لگا کر انھوں نے گویا ناصرالدین شاہ کی شہنشاہیت کو آگ لگا دی اور گو وہ خود اس ملک سے نکال دیے گئے لیکن اپنے بعد وہاں بہت سے سرفروش چھوڑ کر جن میں سے ایک نے بالآخر ناصرالدین سے اس کے مظالم کا خوفناک بدلہ لے لیا۔ مرزا رضا کرمانی نے اپنی گرفتاری کے بعد اور پھانسی پانے سے پہلے جو بیان عدالت میں دیا اس کی ایک معتبر نقل ہم کو براؤن کے ذریعے سے ملی ہے۔ مرزا رضا خاں کے الفاظ اس کے جذبات اور ان جذبات سے شیخ کے تعلق کی ایک دلچسپ تصویر ہیں:۔

" سید جمال الدین، اولاد رسولؐ نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو شاہ عبدالعظیم کی محترم خانقاہ سے اس طرح ذلت کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا کہ ان کے جسم کے کپڑے تک پارہ پارہ ہوگئے۔ یہ تمام ذلت ان کو برداشت کرنا پڑی مگر انھوں نے کیا کیا تھا سوائے حق کے؟ ....۔ جو لوگ میرے عقائد و خیالات سے اس ملک میں متفق ہیں ان کی تعداد بہت ہے اور وہ ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ علماء کی جماعت میں، امراء میں، اہل حرفہ اور سوداگروں میں بہت سے میرے ہم خیال ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب سید جمال الدین اس شہر میں آئے تھے تو طہران اور شاہ عبدالعظیم میں ہزارہا آدمی ان کے خطبات اور مواعظ سنتے تھے اور چونکہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ خدا کے لئے تھا اور محض مفاد عامہ کی خاطر، ہر شخص کو ان کے خطبات سے فائدہ

ہوتا تھا اور ان کے مواعظ کا ہر شخص گرویدہ تھا۔ اس طرح انھوں نے بلند خیالات کا بیج لوگوں کے دلوں کی زمین میں بویا اور انسان جاگے اور ہوش میں آگئے۔ اب تو ہر شخص وہی خیالات رکھتا ہے جو میرے ہیں۔ لیکن میں قسم کھاتا ہوں اس خدا کی جس نے سید جمال الدین اور تمام انسانوں کو پیدا کیا کہ سوائے میرے اور سید جمال الدین کے شاہ کے قتل کے ارادے کی خبر کسی کو نہ تھی۔ سید تو اب قسطنطنیہ میں ہیں جو تمھارا جی چاہے کرو۔"

ناصرالدین شاہ یکم مئی ۹۶ء کو قتل کیا گیا یعنی شیخ کے ایران سے نکالے جانے کے ۶ سال بعد۔ لیکن ایران کا یہ سارا دور وہ تھا جب شیخ کا ڈالا ہوا تخم بارآور ہو رہا تھا اور شیخ قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اپنی کوششوں کے نتائج دیکھ رہے تھے۔ مرزا رضا خاں کا بیان یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاہ کے قتل میں شیخ کا اشارہ موجود تھا۔

ایران سے نکل کر شیخ بصرہ پہنچے اور حاجی علی اکبر شیرازی سے جو خود ایک ایرانی مہاجر تھے مشورہ کر کے لندن چلے گئے جہاں مالکم خاں نے ایرانی شہنشاہیت کے خلاف بہت زیادہ زمین تیار کر لی تھی۔ غالباً لندن جانے کا اصلی باعث وہاں مالکم خاں اور بلنٹ کی موجودگی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں وہ لندن پہنچ گئے اور براؤن کہتا ہے کہ اس کی ملاقات پہلی مرتبہ شیخ سے ہالینڈ پارک میں مالکم خاں ہی کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے چند جلسوں میں" ایران کے خوفناک عہد" کے عنوان سے زبردست تقریریں کیں اور اسی زمانے میں ضیاء الخافقین کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے بہت سے اقتباسات بعد کو المنار میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ تمباکو کے خلاف علماء کا فتوی ایران میں شائع ہو چکا تھا اور اس فتوے کا یہ اثر ہوا تھا کہ خود شاہ کے محل میں شاہی قلیان کے لئے تمباکو میسر نہ آتا تھا۔ شاہ کو پہلی دفعہ پبلک کی آواز سے مجبور ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ کرنا پڑا اور بلاشبہ شیخ کی یہ پہلی فتح تھی۔ علاوہ ازیں یہ فتح علماء کے لئے بھی تھی۔ ضیاء الخافقین کے صفحات پر شیخ اپنے شدید ترین جذبات کا اظہار

کررہے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ طہران میں شیخ کی آواز کی گرج شاہ کو لرزا رہی تھی یکم مارچ ۱۸۹۱ء کی اشاعت سے شیخ کی چند سطریں نمونتاً پیش کی جاتی ہیں۔

"جب یہ بادشاہ' یہ زہریلا سانپ' یہ گناہگار سلطنت ایران پر مسلط ہوا' اس نے آہستہ آہستہ علماء کے حقوق میں دست اندازی کرنی شروع کی' ان کے رتبے کو گرانے لگا اور ان کے اثرات کو کم کرنے لگا تاکہ خود مطلق العنان ہو کر حکومت کرے اور اپنے ظلم و تعدی کے دائرے کو وسیع کر سکے .... مگر حق باطل کے مقابلے میں بلند ہوا اور اس نے شاہ کے ظلم کو کچل ڈالا جس طرح کہ ہر ظالم کا ظلم کچلا جاتا ہے۔

اے اسلام کے رہنماؤ' میں سچ کہتا ہوں کہ تم نے اپنے عزم و استقلال سے اسلام کے وقار کو بڑھا دیا ہے' تم غیر ملکیوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اصل طاقت تمھاری ہے جس کو وہ نہ دبا سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں مگر خطرہ سخت ہے اور حالت نازک ہے اس لئے کہ شیطانوں نے اتحاد کر لیا ہے اور اب وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اس پر تلے ہوئے ہیں کہ اس گنہگار (شاہ) کو بہکا کر علماء کو خارج البلد کر دیا جائے۔"

یہ مضامین وہ عموماً "سید" یا "حسینی سید" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ الفاظ کی سختی' درشتی اور تلخی میں ان کا قلم کچھ کفایت شعار نہ تھا! ان کے عزم اور حوصلے کی اب یہ حالت تھی کہ ایک موقعے پر انھوں نے صاف کہدیا تھا کہ "ان بادشاہوں کا تخت سے اتارنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ پاؤں سے جوتے اتارنا۔"

تقریباً ڈیڑھ سال تک اس طرح لندن میں مشغول رہ کر وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں داخل ہوئے یعنی ۱۸۹۲ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت پر لندن سے قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں سلطان نے شیخ کے لئے ۷۵ پونڈ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا اور ان کی مدارات میں بہت زیادہ توجہ کا اظہار کیا لیکن عبدالحمید کا شیخ کو قسطنطنیہ بلانا ایک خاص پالیسی کے ماتحت تھا۔ عبدالحمید خاں اپنے تخت و تاج کی حفاظت کے لئے اتحادِ اسلامی کا ایک قلعہ تعمیر کرنا

چاہتا تھا اور خلافت اسلامی کا اشتہار دے کر وہ دنیا کی عقیدتمندی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ یورپین دول کی جانب سے جو خطرات اس کے گرد و پیش بڑھتے جاتے ہیں انکا علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ ان ہی منصوبوں کے تحت میں اس نے شیخ کے اثرات سے کام لے کر مکہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھوا دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ شیخ کو اپنے زیر اثر رکھ کر ان کے اثرات کو جو عالم اسلامی میں مسلمہ تھے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں جب شیخ کے ساتھ اس کی توقعات بہت زیادہ وابستہ تھیں، عبدالحمید خاں ہر موقع پر ان کے بہت بڑے حامی و مددگار کے بھیس میں دنیا کے سامنے آتا تھا۔ جب ناصر الدین شاہ نے چاہا کہ شیخ کی آواز اس کے خلاف بند ہو تو اپنے سفیر کے ذریعے سے بار بار دربار خلافت میں اس امر کی تحریک کی کہ شیخ کو ان کی جدوجہد سے روکا جائے۔ چنانچہ عبدالحمید خاں نے ایک دن شیخ سے کہا کہ شاہ ایران کی مخالفت اب ترک کر دو اور "شاہ ایران آپ سے بہت خوفزدہ ہیں" اور شیخ نے بھی سلطان کی خاطر سے کہہ دیا کہ "اچھا خلیفۂ وقت کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے میں شاہ ایران کو معاف کرتا ہوں" لیکن تیر شیخ کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا اور وہ شرارہ ایران میں گر چکا تھا جس نے ناصر الدین کی خرمن ہستی کو جلا دیا۔ تاہم اس واقعے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شیخ اور خلیفہ کے تعلقات اس وقت کیسے تھے۔ اس کے بعد بھی جب ناصر الدین شاہ قتل کر دیا گیا تو حکومت ایران نے شیخ اور بعض دیگر اشخاص کو ترکی سے گرفتار کر کے لیجانا چاہا لیکن سلطان عبدالحمید خاں نے اوروں کو تو گرفتار کرا دیا لیکن شیخ کی گرفتاری کی اجازت نہ دی۔ شیخ نے اس موقع پر خلیفہ کی حکومت سے پناہ نہیں مانگی نہ انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ اس لئے مطمئن بیٹھے رہے کہ وہ سلطان عبدالحمید خاں کے منصوبوں سے بیگانہ نہ تھے اور جانتے تھے کہ سلطان کو ابھی ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ مکہ کی انجمن ام القریٰ کو سلطان اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے اور حجاز و عراق میں شیخ کے اثرات سے کام لیا جا رہا تھا۔ لیکن بہت جلد سلطان عبدالحمید خاں کو شیخ کی رفاقت

سے مایوس ہو جاتا تھا۔ درحقیقت شیخ کا سیاسی مذہب عبدالحمید کی پالیسی کا بالکل مخالف تھا عبدالحمید خاں خلافت کے نام سے عالم اسلامی کی ہمدردیاں اپنے تخت و تاج کے ساتھ وابستہ کرکے ٹرکی کو یورپین دول کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور شیخ اول ہی سے ہر ایک تاج و تخت کے دشمن تھے۔ ان کا اتحاد اسلام بالکل دوسرے معنی رکھتا تھا۔ وہ ہر جگہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف جذبات ملی کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور ممالک اسلامی کی بیداری کو اپنے عالمگیر اتحاد اسلام کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک تمام اسلامی ممالک شخصی حکومتوں کے جبر و ظلم سے آزاد نہ ہوں گے آپس میں ایک دوسرے سے کوئی عملی ہمدردی نہیں کر سکتے، اس لئے ان کو کوئی دلچسپی عبدالحمید خاں کی تحریک کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یورپ نے جس چیز کا نام پین اسلامزم رکھا وہ عبدالحمید خاں کا تیار کیا ہوا ایک بھوت تھا جس نے اس وقت کی سیاسیات کے لحاظ سے بعض یورپین دول کے دفاتر خارجہ کی نیندیں حرام کر دیں۔ مگر یورپ میں جمال الدین کے پین اسلامزم پر کوئی عمیق نظر نہیں ڈالی گئی بلکہ ان کو صرف اسلامی ممالک کا ایک فتنہ پرداز، یورپین اثرات کا دشمن اور بادشاہوں کی بادشاہت کا مخالف سمجھا گیا۔ اس کے آگے بہت لوگوں کی نظر گئی اور مجھے شبہ ہے کہ خود براؤن اور بلنٹ بھی شیخ کی پرواز خیال کے ساتھ دور تک نہیں چل سکے۔ بہرحال یورپ کی اصطلاح میں خلافت اور پین اسلامزم کا جو مفہوم سمجھا جاتا تھا شیخ اس سے بہت بلند، بہت دور اور بہت الگ جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عبدالحمید خاں بہت جلد ان سے مایوس اور بدگمان ہو گئے اور شیخ کی زندگی کا آخری زمانہ قسطنطنیہ میں ایک نام قیدی کی طرح گذرا۔

"بیوک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی" کے عنوان سے اخبار وطن (قسطنطنیہ) میں چند ل ہوئے شیخ کی سیرت پر ایک مضمون شائع ہوا تھا گو شیخ کے سوانح نگاروں نے ان کی ربندی کی تفصیلات بیان نہیں کیں لیکن اس مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کو عبدالحمید خاں ل ،اس بنا پر قید کر دیا تھا کہ خلیفہ کے صیغہ جاسوسی نے اس کو یہ اطلاع دی تھی کہ شیخ سلطان

لاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ عبدالحمید خاں
یاست کا اس زمانے میں یہی رنگ تھا کہ وہ اپنے سایے سے بھی ڈرتے تھے اور شیخ کے
ن شبہات کا نہ پیدا ہونا پیدا ہونے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ بہرحال اس زندگی کی مختصر روداد
رتی ہے۔ میں نے شیخ کے علم و فضل، قرآنی مشاغل، فلسفیانہ خیالات، عقائد مذہبی اور ان کی
ت کے بہت سے ضروری پہلوؤں کے لئے ان مختصر صفحات میں گنجائش نہ پائی اور نہ میں اپنے
ِ والوں کو بہت زیادہ تھکانا چاہتا ہوں۔ وہ خبریں سب اپنے موقع پر بیان ہوں گی، بار بار
ں ہوں گی، ہزار دفعہ بیان ہوں گی، شاید کہ شیخ کی زندگی کا کوئی ایک نکتہ کسی حق شناس تک
جائے! میرے پاس ان کے مضامین اور ان کے خطوط کا ایک اچھا مجموعہ ہے جو بجائے خود
، دلچسپ علمی دعوت کا سامان مہیا کرے گا، لیکن اس کے لئے کوئی دوسری فرصت درکار ہے۔

ایران میں جو جسمانی سختیاں شیخ نے برداشت کی تھیں ان کا بہت زیادہ اثر شیخ کی صحت
چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایران سے آنے کے بعد پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی صحت کبھی حاصل نہ کر کے۔
طنطنیہ میں وہ اکثر بیمار رہتے تھے اور بالآخر دوران نظربندی میں ان کو سرطان کا لاعلاج عارضہ
ں ہوا۔ اس مرض کے سلسلے میں تین مرتبہ ان کے چہرے اور گردن پر عمل جراحی کیا گیا، لیکن
ِ رب کے پیام پر لبیک کہنے کا وقت آچکا تھا۔

۹ مارچ ۹۷ء کو اس مجاہد کی زندگی کا کام ختم ہو گیا اور قسطنطنیہ کی سرزمین پر اس نے
آخری منزل کو پا لیا۔ اب یہ بحث دور از کار ہے کہ جمال الدین کو عبدالحمید خاں نے زہر
دیا تھا یا نہیں۔ جتنا کام قسام ازل نے ان کی سپرد کیا تھا وہ اس کو انجام دے گئے، دنیا والے
جس قدر جی چاہے اس پر تنقید و تبصرے کے دریا بہا دیں، لیکن بیداریٔ مشرق کے اس بہت
ے پیامی کا نام اس وقت تک دنیا میں روشن رہے گا جب تک کہ دنیا آباد ہے۔ اہل نظر کے
ٔ یہ ایک سبق آموز داستان ہے۔

نشانِ طاش کے قریب ایک قبرستان میں شیخ کی قبر عرصے تک بے نشان رہی، انکے

جنازے کے ساتھ بھی ۲۰ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے لیکن دنیا ان کو بھولی نہ تھی۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا کہ ہم خود اپنے ملک کے مشاہیر کو مرنے کے بعد ایک ہفتے کے اندر بھول جاتے ہیں لیکن تعجب تو یہ ہے کہ شیخ کی زندگی کا زیادہ سرمایہ مغرب میں محفوظ رہا اور عبدالحمید کے بعد ترکوں نے انکی آخری آرام گاہ کو پھر ڈھونڈھ نکالا۔ ایک امریکن کروڑپتی نے ان کی قبر کے لئے سنگ مرمر کا ایک خوبصورت پتھر تیار کراکر بھیجا تو ایک نوجوان ترک نے ایک غیر ملکی کی اس فیاضی سے متا ہو کر قسطنطنیہ کے ایک اخبار میں لکھا کہ :-

"میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ ایک امریکن مسٹر کرآین نے اس بڑے مسلمان عالم کے لئے ایک نہایت شاندار سنگ مرمر کا مزار بنایا ہے۔ یہ امریکن کروڑپتی ہے مگر اس کی تازہ ترین قدرشناسی نے نہ معلوم کیوں میرے دل میں مسرت اور افسوس سے ملی ہوئی ایک حس پیدا کی۔ جمال الدین افغانی کے لئے ایک محتشم و شاندار مزار کا بنایا جانا حقیقتاً ایک ایسا اچھا کام ہے جس سے روح تسلی پاتی ہے۔ جمال الدین اپنی تمام زندگی میں دنیا دی جاہ وجلال سے بے پروا رہا اور اپنی متواضع زندگی کے شایان اسی کو سمجھا کہ اپنی قبر کے لئے دو گز زمین سے زیادہ نہ لے۔ اس میں فراعنہ مصر کا غرور نہ تھا کہ اپنی لاش کی حفاظت کے لئے اہرام بنوائے۔ اس لحاظ سے ایک محتشم مزار کا بنایا جانا اس کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں کرتا مگر انصاف شرط ہے۔ کیا اس کی یادگار کی مرمت کے لئے اس قدر اہتمام بھی اس کے مداحین پر لازم نہ تھا؟...

.....میں اس سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اس کی ایک مادی یادگار ہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور معزور گوشے میں ایک خفیف ٹھیس لگتی ہے اور میرا دل سوال کرتا ہے کہ جمال الدین کے مزار کو ایک ترک ایک افغان یا ایک ایرانی نے (جسے جمال الدین کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا ہے) کیوں تعمیر نہ کرایا۔"

یہ تو ایک ترک کا جذبہ تھا، میں اپنے ہم وطنوں سے کیا کہوں۔ ان میں سے کتنے ہیں جو قسطنطنیہ جاتے ہیں اور وہاں کبھی جمال الدین کی قبر پر دو پھول چڑھانے کا ارادہ کرتے ہوں۔

اپنے آخری لمحوں میں جب زبان بند تھی اور چند آنسو بہانے والے دوست بستر مرگ کے قریب بیٹھے تھے، اس نے ہاتھ کے اشارے سے حلقہ بنا کر کہا تھا کہ "میں مرجاؤں گا اور میری آنکھیں اسی طرح کھلی رہیں گی جس طرح تم دیکھتے ہو۔" جو الفاظ شیخ نے اپنے مرنے سے چند روز پہلے اپنے محبس سے ایک دوست کو لکھے ان ہی کو میں ان سطور کا خاتمہ بناتا ہوں کہ وہ ان کے آخری جذبات کا بہت دردناک مرقع ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ:۔

"من بسر موقعے ایں نامہ را بدوستِ عزیز خود می نویسم کہ در محبس محبوس و از ملاقات دوستان خود محرومم، نہ انتظار نجات دارم، نہ امید حیات۔ نہ از گرفتاری متالم نہ از کشتہ شدن متوحش، خوشم برایں حبس و خوشم برایں کشتہ شدن جسم برائے آزادیٔ نوع، کشتہ می شوم برائے زندگیٔ قوم۔"

مجاہد حق کی یہ آواز حق تھی اور یہ جذبۂ عالی تھا جو آندھی بن کر اٹھا، بجلی بن کر چمکا اور اس طرح گرجا کہ مشرق کی سوتی ہوئی دنیا کروٹیں لینے لگی۔ آج وہ نہیں ہے مگر اس کا پیام باقی ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط

(قاضی عبدالغفار صاحب کے نام)

Chhindwara,
(C. P.)

۱۵ر دسمبر ۱۹۱۵ء

برادر عزیز - السلام علیکم -

زندہ رہو - خوش رہو - تمھارا کلام روز دل کو خوش کرتا ہے -

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
دا تا رکھے آباد اں ساقی تری محفل کو

پہلے تمھارے سوالات کا جواب دیتا ہوں پھر راستے کی مختصر سی سرگذشت سناتا ہوں،
یہاں بھی بجنسہٖ وہی ہیں جو لینسڈون جاتے وقت غازی آباد اسٹیشن پر صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ
طرف سے موصول ہوئے تھے - یہاں کی آب وہوا اچھی ہے مگر ہم جب یہاں پہنچے تو خلاف
کچھ بارش ہو رہی تھی - غالباً اسی کے باعث میرے اعضا میں پھر درد ہو گیا اور گو اب کم ہے مگر
میں اور کسی قدر کمر میں باقی ہے - حکیم صاحب نے حبوب گل آکھ کا استعمال بتایا تھا - اسے
جاری کیا ہے مگر بظاہر اس سے فائدہ نہیں ہوا - چند دنوں بعد پھر رجوع کروں گا - پیشاب
تو کم آتا ہے، فجر اور ظہر کے درمیان ایک یا دو بار، ظہر سے مغرب تک اور بعض دن عشا تک
نہیں ہوتی - شب کو البتہ کوئی تین بار آتا ہے مگر دو بار تو معمول بھی تھا - بظاہر شکر نہیں آ
کلکتے کی زندگی کے متعلق جو تم لکھتے ہو اس پر مجھے ذرا تعجب نہیں - عجب ملک ہے
میں سخت نااتفاقی ہے - حسد اور کینے کی شدت ہے - محسنوں کا احسان ماننا کجا الٹا

رہتے ہیں۔ مدرسے اور کالج والے پھر بھی ہونہار ہیں۔ ان سے ضرور ملتے رہنا اور چونکہ ہمارا انحصار زیادہ تر آئندہ نسلوں پر ہے اس لئے ان کو قومی سانچے میں ڈھالتے رہنا۔ محسن فنڈ کے متعلق واقعات سے اپنے کو کما حقہ آگاہ کر لو اور مسلمانوں کے مجوزہ کالج کی گذشتہ تاریخ سے۔ افسوس ہے کہ شمس الہدیٰ نے ابتک کچھ نہیں کیا اور اس کم بخت دہلی والے مولوی کو رکھ کر مدرسہ بھی تباہ کیا۔ ہوگلی کالج میں فدا علی خاں رام پوری کالج کے ایم۔ اے میرے کلاس فیلو اور عزیز دوست عربی کے پروفیسر ہیں ان سے چنسورہ جا کر گاہے گاہے مل لیا کرو یا اتوار کو انھیں بلا لیا کرو۔ سلطان معقول شخص ہے اس سے ضرور دوستی ہوگئی ہوگی۔ مگر بہاری ہے کلکتے کو اس پر کیا فخر۔ رسول اصول کا پکا ہے اور مجیب الرحمٰن بھی مگر یہ لوگ بھی کلکتے کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں۔ بہرحال ان سے مدد ملے گی۔ میرا ایک دوست محسن عجائب خانے میں ہے اس سے غالباً ملاقات ہوئی ہوگی۔ معین الدین مرزا گھاگرے والے کالج کے پرانے طالب علم ہیں ان سے ملتے رہنا۔ خدا کرے کم بخت .... کا اس پر زیادہ اثر نہ پڑا ہو۔ مولوی نجم الدین صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر نہایت سچے مسلمان ہیں ان سے ملتے رہنا۔ ان کے بھتیجے قطب الدین پر لوگ شبہ کرتے ہیں مگر مولانا خود بالکل غیر مشتبہ ہیں۔ کولوٹولے میں حاجی اسمٰعیل صاحب دہلوی معروف بہ پٹنے والے ان بزرگوں میں ہیں کہ اگر ہندوستان میں ایسے دس بیس ہوتے تو ہماری حالت اس قدر زبوں نہ ہوتی۔ اس قدر فیاض، سیر چشم، محب قوم بلکہ ہمدردِ بنی نوع انسان بہت کم لوگ ہیں۔ اللّٰہم زد فزد۔

Hasnoo Bhayya اور Uncle Sharaf سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔ دونوں ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ حسنو تو سنا ہے جنوری میں مستعفی ہو کر پٹنے میں پریکٹس کریں گے خیر جی ہیں دھاک خوب بٹھا دی ورنہ ہر سال ساٹھ ستر ہزار کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مسٹر جسٹس شرف الدین بیچارے زیادہ قابل نہیں مگر وضع کے پابند اور بہت خلیق ہیں۔ یہ پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہو کر جائیں گے۔ حسنو نے اس شرط پر جج قبول کی تھی کہ پٹنے میں ہائی کورٹ ہو تو ضرور بھیجا جاؤں۔

مگر نہ ان کے ساتھ وعدے کا ایفا ہوا نہ علی آمام بھائی کے ساتھ ۔ مؤخرالذکر کو میرے علم میں تمنو نے چیف جسٹس کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ مگر اب ہارڈنگ نے بھی باوجود اس قدر دوستی کے اور باوجود ان خدمات کے جو علی آمام نے دکھائیں صرف جی پیش کی ۔ لطف یہ ہے کہ خود ان کے ...... نے ان کے خلاف کارروائی کی ۔ یہ وہ شخص ہے جسے انھوں نے اپنے سے پہلے Knighthood دلوادی تھی ۔ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان ۔

راستے کی کیفیت سنو ۔ پہلے اطلاع شروع نومبر میں ملی تھی کہ تیار رہو ۔ ایک دن پہلے اطلاع دی جائے گی ۔ اسی وقت روانہ ہونا پڑے گا ۔ ہم نے شروع اکتوبر ہی میں لکھ دیا تھا کہ ہمارا الاؤنس بے باق کر دینا ہوگا اور زاد راہ کا انتظام کرنا ہوگا ورنہ ہم وقت مقررہ پر نہ چل سکیں گے ۔ اب اطلاع پاتے ہی پھر اس کے متعلق یاددہانی کر دی مگر باوجود سرکاری تار کے اور ہمارے تار کے ہمارا الاؤنس ۲۰ دن کا ۲۰ نومبر تک نہ مل سکا ۔ دو دن بعد لینسڈون پہنچا اور وہاں سے یہاں آیا ۔ بھلا ہو ایک Old boy کا کہ ان سے قرض لے کر وہاں کے حسابات چکائے اور وہاں کے نوکروں کی تنخواہ ادا کی ۔

سفر خرچ کی کیفیت سنئے کہ حکم ایسے خزانے کے نام دیا گیا جو عالم وجود میں بھی نہ آیا تھا یعنی Lansdown Treasury ۔ خزانہ پاؤڑی میں ہے جو ضلع گڑھوال کا صدر مقام ہے اور پیدل کم از کم دو دن کی راہ ہے ۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو جس کے متعلق ہماری ڈاک کا دیکھنا تھا فوجی افسروں کی معرفت بنیے سے روپیہ قرض لینا پڑا ورنہ ہم لوگ چل بھی نہ سکتے ۔

اس خوش انتظامی کے صدقے جائیے ۔ مقام کا نام پہلے سے نہیں بتایا گیا تھا ۔ ہم نے جب لکھا کہ موسم کے متعلق تک ہم کو علم نہیں ہے ۔ جاڑوں وغیرہ کے کپڑے سب دہلی یا رام پور ہیں، دوسرے اس کا فیصلہ کرنا ہے کہ معہ اہل و عیال کے جائیں یا بلا ان کے ۔ اس کا انحصار مقام کی نوعیت اور دوری پر ہے ۔ تو جواب ملا کہ موسم ایام سرما میں دہلی جیسا ہے ۔ اس سے خیال ہوا کہ مقام کو سات پردوں میں رکھا جائے گا ۔ لیکن یکایک ۱۳ نومبر کو اطلاع ملی کہ ۱۸ نومبر

کو چند دائرہ جانا ہوگا۔ نہ معلوم وہ رازداری اور تعجیل (۲۴ گھنٹے کا نوٹس) کہاں سے چلا ہے۔ اس
اطلاع کے ملنے پر ہم نے چند کارڈ دوستوں کو ڈال دئے کہ فلاں راہ سے فلاں وقت گذریں گے
سنسر نے بلا استثنا سب کو بھیج دیا اس لئے کہ اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ الہ آباد میں
گاڑی سات گھنٹے بعد ملتی تھی اس لئے بھائی ظہور احمد صاحب کو لکھ دیا کہ برادرانم کھانا
تمہارے ساتھ کھائیں گے۔ والدہ، بیوی اور بچوں کے لئے ایک گاڑی کا انتظام کر دینا کہ الہ آباد
جو انہوں نے نہیں دیکھا ہے دیکھ لیں۔ چنتامنی کو لکھ دیا کہ تم سے، سپرو سے اور پنڈت جی سے
بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چلنے سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ جو سب انسپکٹر ہمراہ جائیگا اُسے
ہدایت ملی ہے کہ ہماری پارٹی کا کوئی متنفس کسی اسٹیشن کے باہر نہ جائے۔ گو ہمارے نام کوئی حکم
نہیں آیا تھا یعنی جو حکم آیا تھا اس میں یہ شرط نہ تھی۔ اس لئے اس پر کاربند ہونا لازمی نہ تھا ا
ہم نے صاف کہہ دیا کہ گورنمنٹ نے ہم کو نظر بند کیا ہے ہمارے متعلق ہدایات جاری کی جا سکتی ہیں
مگر ہمارے متعلقین بفضلہ تعالیٰ آزاد ہیں، وہ کسی شرط کو نہیں مان سکتے۔ تاہم ہم نے ارادہ کر لیا
الہ آباد اسٹیشن پر رہیں گے باہر نہ جائیں گے۔

ہم ۲۰ کو ۱۰ بجے صبح کے روانہ ہو کر تانگوں میں چلے اور ۲ بجے سہ پہر کو کوٹ دوارہ پہنچے
یہاں صبح ہی سے میری ہمشیرہ (والدہ فاروق) مع عثمان کے اور شوکت کے بچوں کے ملیں۔ د
سے صادق اور سید علی بھی آئے تھے۔ ہمارے ماموں صاحب کے خلیفہ نوشہ میاں صاحب ا
ہمارے ماموں زاد بھائی بھی آ گئے تھے۔

۶ بجے شام کو ریل چلی۔ ۷ بجے نجیب آباد پہنچے۔ حالانکہ ہم نے کسی کو اطلاع نہ دی تھی
لوگوں کو معلوم ہو گیا تو رات کے ۲ بجے تک لوگ جوق کے جوق آتے رہے اور ملتے رہے نجیب آباد
میں چند اور اعزا اور احباب دہلی اور علی گڑھ سے آ گئے۔ ۲ بجے صبح کے ان کی معیت میں مراد آباد
کی طرف روانہ ہوئے۔ ۴ کے قریب پہنچے۔ وہاں آنریبل سید رضا علی، یعقوب، مسعود، عبدالس
وغیرہ تمام احباب ملنے آئے۔ رام پور سے میری اہلیہ مع [illegible] گلناد اور زاہد کے آ گئے تھے

شریک سفر ہوئے۔ ان کے علاوہ رام پور سے بہت سے عزیز اور دوست آگئے تھے۔ حق وملو آئے لوٹ دوبارہ ہی پر اترنا شروع ہوگیا تھا۔ مراد آباد پر اور نازل ہوا۔ رام پور صبح کے ۵ بجے پہنچے۔ وہاں پر بھی ہجوم تھا۔ حالانکہ گاڑی تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہمارے لئے ایک Composite Carriage تھی اس میں تو ہم نے عورتوں کو سوار کرادیا تھا۔ خود معہ احباب کے ایک انٹر کی خالی کیرج کو لبالب بھر دیا تھا۔ بریلی پر علی گڈھ کے احباب رخصت ہوئے۔ انصاری رام پور سے مراد آباد آگئے تھے۔ ڈاکٹر عبد الرحمن دہلی سے نجیب آباد آگئے تھے اور مراد آباد میں انصاری کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ بریلی میں بھائی دودو وغیرہ چائے لے کر آئے تھے شاہجہانپور میں بھی احباب ملے اور سندیلہ میں بھی۔ لکھنؤ پہنچے تو گاڑی خلاف معمول پل کے اس طرف پلیٹ فارم پر رکی مگر اس کے رک جانے کے بعد بہت سے احباب مع تقدس مآب مولانا عبد الباری صاحب قبلہ ومولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی مدظلہ تشریف لائے۔ قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ معلوم ہوا کہ خواہش نہ تھی کہ لوگ کثرت سے ملیں مگر چونکہ یہ منشا رنہ ہمارا تھا نہ ہمارے دوستوں کا تھا کہ ایک جم غفیر کو نمائش کے لئے جمع کیا جائے اس لئے وہی اصحاب آئے تھے جن کو ہم نے اطلاع دی تھی یا دلوائی تھی۔ کانپور سے، علی گڈھ سے اور بارہ بنکی سے احباب آئے تھے۔ راستے کے لئے کھانا، میوہ اور مٹھائیاں اس کثرت سے آئیں کہ دونوں درجے لبالب بھر گئے اور بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ بلا مبالغہ تین چار سو آدمیوں کے لئے کھانے کا سامان کافی تھا۔ راستے بھر لوگوں کو کھلاتے آئے پھر بھی ختم نہ ہوا اور یہاں تین چار دن کھایا اور بعض چیزیں تو اب تک ساتھ دے رہی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ کھانوں کی نوعیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض رسماً تیار نہیں کرائے گئے تھے، بلکہ سوچ سوچ کر یہ مزے کی چیزیں خود تیار کی تھیں۔ مولانا عبد الباری صاحب قبلہ معہ متعدد احباب لکھنؤ، بارہ بنکی و علی گڈھ کے راستے بریلی تک ہمراہ تشریف لائے۔ مولانا الہ آباد کا قصد رکھتے تھے مگر وہاں جاتے تو ایک دوست چند دن رکھے بغیر نہ چھوڑتے اس لئے راستے ہی سے واپس ہوگئے کیونکہ زیادہ قیام کے لئے وقت نہیں بچا سکتے تھے۔ مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے سے بزرگ ہیں۔ ان پر عجب کیفیت طاری تھی۔ ان بزرگوں کی تحسین ہر لمحہ ہم کو شرمسار کرتی تھی۔ برادرم ہزاروں سپاہی اور افسر اپنی اپنی قوم اور ملک کے لئے بے دریغ جانیں دے رہے ہیں۔ جو اپنے ملک و قوم اور مذہب کے لئے سربکف نہیں ہیں وہ بھی ایک حقیر سے مشاہرے کے لئے جانیں دے رہے ہیں۔ ہم نے جن کا اس قدر غلغلہ چار دانگ عالم میں ہے ابھی کیا کیا ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب جیسے بزرگ ہمارا استقبال فرمائیں اور تحسین و آفریں کریں یا ہمارے بے شمار دوست اتنی محبت کا اظہار کریں۔ صرف یہی تو ہوا ہے کہ اپنے وطن اور کاروبار کو خیرباد کہنا پڑا لیکن یہ سنت رسولؐ ہے۔ فجر کے فرضوں سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا تو ہر مسلمان اپنے اوپر لازم سمجھے اور ہجرت کو گوارا نہ کرے، یہ کس قسم کا اسلام ہے۔ اور خصوصاً اس حالت میں جبکہ ہمارا پروردگار ہم کو تشفی و تسلی دے کہ وَاللہ علیٰ نصرہم لقدیر الذین اخرجوا من دیارہم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (پروردگارا تو نے سچ فرمایا ہے۔ تو ہی ہمارا مولیٰ ہے اور تو ہی خیر الناصرین ہے)۔ برادرم اس سفر سے پیشتر بھی اور اس سفر میں اور ہر جگہ جو خاطر و مدارات ان نظربندوں کی ہوئی ہے اس کے بعد کس کو شک ہو سکتا ہے کہ علاوہ اس اجرِ عظیم کے جس کی بشارت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم (روحی فداک یا رسول اللہ) دینے ہم کو آئے تھے جو ہر عاقبت اندیش کو ملے گا خود اس دنیا میں عزت و آرام بھی پابندئ قرآن و حدیث میں ہے۔ مسلم کے والد (میرے خسر) نے کیا خوب کہا ہے ؎

عظمت بڑے بڑے ہیں مزے راہِ عشق میں
چل تو سہی۔ بڑھا تو قدم۔ دیکھ تو سہی

ناظر، وسیم، ولایت کو ہم الہ آباد تک لے گئے کہ ۲ گھنٹے وہاں بھی خوب گذریں گے۔ اتفاقاً راستے میں آنریبل ڈاکٹر سپرو سے بھی ملاقات ہو گئی کیونکہ وہ ہم سفر تھے اس طرح (الہ آباد کی) قدم بندی کا بھی صدمہ نہ ہوا۔ الہ آباد سے چند اسٹیشن آگے مولانا رؤف صاحب (والد ظہور) سے ملے اور چند اور احباب بھی ملے۔ آگے چل کر خود ظہور اور لکھنؤ کے سید ظہور احمد صاحب بھی ملے۔ آگے چل کر

معلوم ہوا کہ الہ آباد کے اسٹیشن پر جاتے ہوئے پرندوں کے پر جلتے ہیں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ بند اور اسٹیشن خالی ہے اور غالباً ہم کو ۲ گھنٹے سے قبل ہی وہاں سے کہیں اور لے جائیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ پولیس کے سو سوا سو آدمی پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے لوگوں نے اسٹیشن پر ہمیں garden party دینے کی اجازت چاہی تھی مگر اجازت نہ ملی۔ مجبور ہو کر ظہور کچھ میوہ اور کھانا اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کو دے آئے کہ اسے دیکھ بھال لو۔ اگر کوئی چیز خلاف قانون دستیاب نہ ہو تو ان نظر بندوں کو دے دینا۔ الہ آباد کے اسٹیشن کو سوائے پولیس کے وردی والے و بلا وردی کے خالی پایا۔ پولیس کے دو افسر ایک وردی میں ایک بلا وردی کے طبقۂ یورپین یا یوریشین سے موجود تھے۔ دونوں شوکت کے شناسائی اور ایک تو دوست نکلے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ذات شریف نہایت کر و فر کے ساتھ تشریف لائے اور پہلے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ ان لوگوں کو اسٹیشن سے نکال دو۔ یہ لوگ ڈاکٹر ناظر الدین حسن، مسٹر محمد وسیم، مسٹر ظہور احمد بیرسٹر ان و سید ظہور احمد صاحب بی۔ اے وکیل و شیخ ولایت علی صاحب بی۔ اے وکیل تھے۔ میں ان کی سلامت روی اور متانت کی تعریف کرونگا کہ باوجود سخت غصے اور مایوسی کے وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ چلنے سے پیشتر والدہ نے انھیں بلایا اور گلے لگایا اور کہا کہ بیٹا ان باتوں سے آزردہ خاطر نہ ہونا۔ مرد ان آزمایشوں میں سے ہنستے بولتے گذر جاتے ہیں۔ ہم بھی ان سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد وہ ذات شریف ہماری طرف تشریف لائے اور کہا کہ آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ یہ درخواست شوکت کے دوست پہلے ہی کر چکے تھے مگر ناکام رہے تھے۔ شوکت نے کہا کہ اس کی آخر کوئی وجہ۔ کہا میں آپ سے کہتا ہوں آپ ایسا ہی کریں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم وہیں تک پابند ہیں جہاں تک گورنمنٹ کے احکام موصول ہو چکے ہیں ورنہ ہم بالکل آزاد ہیں اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اتنے لانبے سفر کے بعد ایک تنگ کمرے میں مقید ہو کر بیٹھ جائیں۔ ہمیں یہاں سات گھنٹے قیام کرنا ہے۔ اس پر صاحب موصوف بولے کہ نہیں آپ کو ساڑھے پانچ بجے کی ایک گاڑی میں یہاں سے ستنہ جانا پڑے گا اور وہاں چند گھنٹے تک شب کی گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا جو یہاں سے جبلپور کو شروع جاتی ہے۔ ہم نے

لہا کہ ہمارے احکام میں یہ داخل نہیں ہے۔ ہمیں احکام ملے ہیں کہ تین بجے کی گاڑی میں الہ آباد پہونچیں اور شب کے دس کی ٹرین میں جبلپور جائیں۔ اس پر وہ بولے کہ نہیں گورنمنٹ نے احکام بدل دئے ہیں۔ آپ کو ابھی جانا ہوگا۔ اس پر ہم نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی احکام اس قسم کے موصول نہیں ہوئے ہیں۔ جو حکم ہم کو ملا ہے اگر ہم اسکی خلاف ورزی کریں گے تو ہم تین برس کی قید باشقت اور ایک ایک ہزار روپیہ جرمانے تک کے مستوجب ہوں گے۔ اس پر فرمایا کہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہی احکام گورنمنٹ کے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضور والا کی شناسائی کا بھی ہم کو شرف حاصل نہیں ہے۔ پھر ہم تحریری اور مہر حکومت سے مزین احکام کی عوض محض آنجناب کی زبانی ہدایت کو کیوں کر قبول کرلیں۔ فرمایا کہ میرا نام Murray ہے اور میں یہاں D.T.S. ہوں اور اس اسٹیشن کا چارج میرے پاس ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں آپ سے مل کر محظوظ ہوا مگر اس شرف نیازمندی کے حصول کے بعد بھی ہم سرکاری احکام پر آپ کے ارشادات کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ اس پر تیکھے پن سے فرمایا کہ کیوں بے فائدہ بدمزگی پیدا کرتے ہو۔ میں نے تم سے نہایت نرمی سے کہہ دیا کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ اس میں بدمزگی کا سوال کچھ بھی نہیں ہے اور میں نے اس قدر نرمی سے آپ سے کہہ دیا کہ ہم گورنمنٹ کے احکام کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے۔ اس پر نہایت تند و ترش ہوکر فرمایا کہ کیوں اسی راگ کو الاپے جاتے ہو۔ اس پر شوکت نے آنکھیں دکھا کر کہہ دیا کہ بس اس لہجے میں گفتگو نہ کیجئے۔ اس پر ذرا ہوش میں آئے اور پھر کہا کہ بدمزگی کیوں پیدا کرتے ہو میں تو نہایت نرمی سے کہتا ہوں کہ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ شوکت نے کہا کہ آپ کی درخواست معقول نہیں ہے میں بھی آپ سے نرمی سے کہتا ہوں کہ ہم سے تعرض نہ کیجئے اور یہاں سے چلے جائیے۔ اس پر حاکمانہ انداز سے فرمایا کہ تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں اپنے احکام کی تعمیل بجبر کراؤں۔ شوکت نے کہا شوق سے آپ ضرور کوشش کریں مگر برادرم ساڑھے تین من کی لاش اور سوا چھ فٹ کے قد اور ڈیڑھ گز کے سینے والے سے جبریہ تعمیل احکام کرانا آسان نہیں۔ دیکھ کر بولے کہ میں سمجھا تھا کہ آپ لوگ gentlemen ہیں۔ اس پر میں نے عرض کی

کہ ہم سمجھتے تھے کہ آپ بھی gentleman ہیں مگر....... اس "مگر" کے اضافے نے ان بزرگوار
کو چکرا دیا۔ پھر کہنے لگے کہ اب میں جبریہ تعمیل کراؤں گا۔ شوکت نے کہا کہ ہم تو کہی رہے ہیں کہ شوق
سے کوشش فرمائیے۔ اس قدر گفتگو کے بعد دوسرا پولیس انسپکٹر جو وردی میں تھا آیا اور اس نے کہا
کہ جناب والا اس مسئلہ کو آپ ہمیں پر چھوڑ دیجئے۔ مسٹر Murray جن کے initials "P.G."
ہیں اور جن کو بقول پولیس انسپکٹر کے Pig Murray کے لقب سے لوگ ملقب کیا
کرتے ہیں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بیک بینی و دوگوش جدھر سے تشریف لائے تھے ادھر کو
واپس تشریف لے گئے۔ ہم سے پولیس انسپکٹر نے کہا کہ کچھ مضائقہ ہے اگر آپ انھیں کا کہا کر لیں
یہ بھی شوکت کا شناسائی تھا۔ شوکت نے جو جواب پہلے انسپکٹر کو دیا تھا وہی اس کو بھی دیا کہ بھائی
یہ معاملہ ہمارے تمہارے نج کے تعلقات کا نہیں ہے۔ سرکاری احکام کا ہے۔ ہم معذور ہیں او
جو آزادی اس نظربندی میں باقی رہ گئی ہے ہم قدرتی طور پر اس کی پہلے سے بھی زیادہ قدر کرتے
ہیں۔ ہم ہرگز بلا حکم سرکار کوئی کام اپنے خلاف مرضی نہیں کریں گے۔ دوسرے ہمارے معزز تر ی
احباب کو جس پاجی پن کے ساتھ اس شخص نے یہاں سے جانے کے لئے کہلوایا ہے اس کے ا
ہم سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے مشہور ترین رہنما اور قائم مقام ہیں۔ جو صد
ان کو ہوا ہوگا وہ ہمیں محسوس کر سکتے ہیں۔ اس پر پولیس کے دونوں افسروں نے اعتراف کیا ک
شخص کا طرز عمل نہایت پاجیانہ تھا اور علاوہ ازیں اسے اس امر سے کچھ بھی سروکار نہ تھا۔ بلا د
گھس پڑا اور حکومت جتانے لگا۔ جو پولیس انسپکٹر (Garvin) ہمارے ہمراہ کوٹ دوا
سے آیا تھا جب وہ موقع پر آیا تو اسے بھی بہت برا معلوم ہوا کہ بلا اس کی اطلاع و مشورے
مسٹر Pig Murray نے دست اندازی کی اور سب خوش تھے کہ خوب منہ کی کھائی ہم
بعد ہم waiting-room گئے اور وضو کر کے ظہر اور بعد ازاں عصر پڑھی۔ نماز سے فارغ
ہوئے تو اطلاع ملی کہ شوکت کے پرانے دوست اور میرے بھی کلکتے کے "گھر سے شناسا"
Fremantle کلکٹر الہ آباد ملنا چاہتے ہیں۔ ہم گئے تو ہم سے کہا کہ یہ کیا جھگڑا ہے

نے تمام کیفیت سنائی ۔ اس پر کہا کہ مجھے دو تین دن سے معلوم تھا کہ تمہارے سفر کا پروگرام یہاں سے بدلا جائے گا ۔ نہ معلوم تمہیں احکام کیوں نہیں دئے گئے ۔ بہرحال میں گھر سے چلتے وقت Burn (چیف سکریٹری) سے ٹیلیفون پر پوچھ آیا ہوں ۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو ساڑھے پانچ ہی پر چلنا ہوگا ۔ ہم نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کے احکام کی خلاف ورزی کا کون ذمہ دار ہے ۔ ہم برن کے تحریری اور مہردار احکام مانیں یا زبانی احکام جو آپ سے سننے میں آئے ہیں ۔ اس پر کہا کہ برن کہتے ہیں کہ پروگرام تو احکام کا جزو نہ تھا صرف تمہاری سہولت کے لئے ہم رشتہ کر دیا گیا تھا ۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر وہ جزو احکام نہیں ہے تو ہم بیل گاڑی یا گھوڑے پر چھندواڑہ جا سکتے ہیں اور پانچ چھ ماہ کے عرصے میں پہنچ جائیں تو مضائقہ تو نہیں ، اس لئے کہ اگر پروگرام جزو احکام نہیں ہے تو ہمیں صرف اس قدر حکم ملا ہے کہ ۲۰ کو لینسڈون سے بلا سفر توڑے ہوئے چھندواڑہ پہنچ جاؤ ۔ یہاں بھائی Freemantle پھر قائل ہوئے اور کہا کہ بہرکیف اب تو یہی حکم ہے ۔ شوکت نے کہا کہ قاعدے کی رو سے چیف سکریٹری کا دستخط شدہ حکم ملنا چاہیئے لیکن چونکہ میں تم سے واقف ہوں اس لئے تسلیم کئے لیتا ہوں کہ تم وہی کہتے ہو جو چیف سکریٹری نے تم سے ٹیلیفون پر کہا ہے تاہم اسے ضبط تحریر کر دو تاکہ برن تین برس کی قید کرانا چاہیں تو سند ہو اور وقت ضرورت کے کام آئے ۔ کہا ہاں مضائقہ نہیں ہے میں لکھ دوں گا کہ برن نے مجھے ہدایت کی ہے ۔ اس پر میں نے کہا یہ لکھئے کہ گورنمنٹ نے ہدایت کی ہے ۔ کہا ہاں چیف سکریٹری ہی کے دستخط سے گورنمنٹ کے احکام جاری ہوتے ہیں ۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ درست ہے مگر یہاں تو احکام آپ کے دستخط سے جاری ہوں گے ۔ کم از کم حکم لفٹنٹ گورنر کا ہونا چاہئے ۔ برن کو بحیثیت چیف سکریٹری گورنمنٹ کے احکام پر دستخط کرنے کا حکم ہے مگر وہ خود حکم دینے کے مجاز نہیں ہیں ۔ پچھلا حکم ان کا دستخطی گورنمنٹ کی مہر والا بھی مظہر ہے کہ لفٹنٹ گورنر کی پیشگاہ سے یہ حکم صادر ہوا ہے ۔ اس پر کچھ عرصے بعد غالباً برن سے ٹیلیفون پر پوچھ کر ایک حکم لکھ کر لائے کہ پروگرام بدل دیا گیا ہے ۔ آپ لوگ بجائے دس بجے شب کے آج شام ہی کو ساڑھے پانچ پر روانہ ہو جائیں ۔ یہ حکم ملنے پر ہم نے والدہ اور بچوں کو اطلاع کرا دی کہ گاڑی ابھی جائے گی ۔

ہماری ہی گاڑی جو shunt کرکے ایک siding پر بھیج دی گئی تھی آکر ٹرین میں لگ گئی۔ نوکروں نے سامان اپنے درجوں میں سے جو نکالا تھا وہ انسپکٹر سے کہہ کر بھروا لیا۔ مگر بیچارہ سب انسپکٹر (ہرسروپ) جولینسڈن میں ہمارے سنسر صاحب کو خط پڑھنے میں مدد دیتا تھا اور ہمراہ جبل پور تک معہ انسپکٹر (Garvin) کے آیا بقضائے حاجت گیا ہوا تھا بڑی مشکل سے چلتی گاڑی میں بیٹھا

اب اس کے بعد فرنٹیل سے "دوستانہ گفتگو شروع ہوئی۔ جنگ کا ذکر آیا، ترکوں کی پالیسی، مصر کے واپس دینے یا نہ دینے کا مسئلہ۔ یہ سب معرض بحث میں آئے۔ ہم نے کہا کہ ہم نہ کہتے تھے۔ چار برس سے کامریڈ نے ہمیشہ گورنمنٹ کو یہی سمجھایا تھا کہ دیکھو مسلمان ۴۰ کروڑ ہیں، ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے نہ بگاڑو۔ ان کے مذہب سے استہزا نہ کرو۔ ان کے مقدس مقامات کی طرف رخ نہ کرو۔ خلیفۃ الرسول خادم حرمین شریفین کی محبت و عظمت ہر مسلمان کے دل میں ہونا لازمی ہے اور ہے۔ ان سے اچھا سلوک کرو اور ان کے دل کو موہ لو تو مسلمانان عالم کے دل تمہارے ہیں۔ کیا یہ بہترین صلاح و مشورہ نہ تھا۔ مگر سر ایڈورڈ گرے پر گلیڈ اسٹون کا بھوت سوار تھا۔ علاوہ ازیں جرمنی کے خوف نے انھیں بوکھلا دیا تھا۔ اس نے ان دونوں باتوں سے فائدہ اٹھایا اور آخر ش نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کو تو جنگ سے روک نہ سکے مگر ترکوں کو ہاتھ سے کھو بیٹھے اور عالم اسلام کو آج ایک سخت ہیجان میں ڈال دیا۔ اگر بجائے کامریڈ کی ضمانت ضبط کرنے کے ہم میں سے چند مخلصین کو مقام خلافت کو بھیجا گیا ہوتا اور ترکوں کے ساتھ رشتۂ الفت و اتحاد پھر قائم کیا گیا ہوتا اور مصر انھیں واپس دے دیا گیا ہوتا تو آج دردانیال، مصر، ایران، عراق و یمن میں یہ حالت کیوں ہوتی، سرحد پر کیوں شورش ہوتی اور افغانستان کی طرف سے کیوں کھٹکا لگا رہتا۔ ترک اگر ساتھ بھی نہ دیتے تب بھی خلاف نہ ہوتے اور روس کو سامان جنگ پہنچانے اور وہاں سے غلہ حاصل کرنے میں دقت نہ پیش آتی۔ روس کو قفقاز میں مشکل کا سامنا نہ ہوتا۔ منہ سے جرمنی رہتا۔ فرانس کو الجیریا و ٹیونس سے فوجیں منگانے میں سہولت ہوتی۔ انگریزوں کو مشرق میں یکسوئی رہتی اور مغرب میں دشمن کا مقابلہ آسان ہوتا۔ اسی سلسلے میں ہندوستان کی سیاست کا ذکر چھڑ گیا۔

سول سروس کی خود غرضیوں پر ویزیک مباحثہ ہوا اور خصوصاً ان قوانین و افعال کے متعلق جن کا جواز محض جنگ کی وجہ سے ہوا مگر جن کے ذریعے سے سول سروس نے اپنے معترضین سے بدلہ لیا۔ اسی مباحثے میں میں نے کہا "The war has been a godsend to the civilian". اس پر آبدیدہ ہو کر کہا:-

It is not very generous of you. It is very unkind when you know we are losing our brothers and cousins in such large numbers. Sir Duncan ? has lost 3 sons.

اس کے جواب میں میں نے یقین دلایا کہ میرا اشارہ یورپ کی جنگ کی طرف نہ تھا، بلکہ ان واقعات کی طرف جو سول سروس کی طرف سے ظہور میں آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ ان کو میرا مفہوم سمجھنے میں کیونکر مغالطہ ہو سکتا تھا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے مگر آپ کو ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو جنگ میں پیش آرہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ ہمارے لئے کچھ بھی allowance نہیں کرتے۔ شوکت نے اس پر کہا کہ بھائی جان تم نے بھی کبھی ہمارے لئے allowances کیں۔ تم ہمیں نظر بند کرتے ہو مگر کبھی اس کا بھی خیال کیا کہ اس کا ہماری ماں پر، محمد علی کی بیوی پر اور ہماری بہن اور بچوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ محمد علی کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے سخت بیمار ہوئیں اور بچنے کی امید نہ تھی مگر ان سے ملنے تک کے لئے نہیں جانے دیا گیا۔ ہمارا بزنس تباہ کر دیا گیا اور اس کے بدلے ڈھائی سو ایک کو اور سو روپے ایک کو دے گئے۔ اس وقت ہمارا اور ہمارے بچوں کا خیال نہ آیا۔ جنگ تو تمہاری اپنی تھی پھر سول سروس نے اتنی بے حیائی کیوں روا رکھی کہ رخصتیں نہ منظور ہونے کے باعث جو acting allowances کا موقع ہاتھ نہ آیا تو اس کا بھی معاوضہ مانگا اور وصول کیا۔ اسی دوران میں Choice of the Turks کے مضمون پر بھی گفتگو ہوئی اور میں نے بتایا کہ جب گورنمنٹ ضمانت ضبط

کر رہی تھی میں اسی دن انگلستان کے مشہور ترین Tory اخبارات Morning Post and Daily Telegraph اسی مضمون کی Loyalty کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ سول سروس کمیشن اور ہندوستانیوں کو ۵ فی صدی سے کم جگہیں سول سروس میں ملنے پر گفتگو رہی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ اگر حکومت ہمارے ہی ہاتھ میں رہے تو ہمارا عنصر غالب ہونا چاہیے۔ اس پر ہم نے کہا کہ Self-government نے کیا نقصان کیا ہے جو ابدالآباد تک حکومت آپ ہی کے ہاتھ میں رہے۔ کہا کہ ہندوستانی ابھی اس قابل نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ تم ایسا تو کہو کہ تم ان کو اس قابل کرنا چاہتے ہو کہ وہ خود حکومت کر سکیں۔ ہم بھی انتظار کے لئے تیار ہیں مگر جہاز کی سست رفتاری کا مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس کا رخ بندرگاہ مقصود کی طرف ہو۔ افسوس تو اس کا ہے کہ سول سروس ہماری پالیسی کی مخالف ہے اور خود کوئی پالیسی نہیں رکھتی۔ کچھ لوگ کھلم کھلا ہندوستانیوں کے مخالف ہیں اور کچھ ٹالے بالے کرتے ہیں۔ پھر ہم لوگوں کا ذکر آیا۔ کہا تم چند نفوس ہو۔ تمہاری آواز ملک کی آواز نہیں ہے You represent only yourself۔ اس پر میں نے کہا کہ کرمی اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ ڈیڑھ سو سپاہی پہرے چوکی کے لئے تم نے کیوں جمع کر رکھے ہیں اور الٰہ آباد کے ہزاروں آدمیوں کو ملنے سے کیوں روکتے ہو۔ قائل ہوئے مگر کہا کہ تم لوگوں کو گمراہ کرتے ہو۔ ہم نے کہا کہ خیر تم اس کے تو قائل ہوئے کہ لوگ ہمیں رہنما سمجھتے ہیں۔ اب سوال بے راہ روی اور سچی ہدایت و رہنمائی کا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ کون کرے۔ ایک فریق خود غرض تم ایک ہم۔ خود غرضی میں زیادہ سے زیادہ دونوں یکساں۔ مگر ہم ملک کی حالت سے واقف ہیں کیونکہ رات دن کا لوگوں کا ساتھ ہے اور تم ایک دوسری دنیا میں رہتے ہو نا واقف ہو۔ اس لئے تمہارا قول تو کسی طرح معتبر ہو نہیں سکتا۔ غرض اسی طرح گفتگو رہی یہاں تک کہ گاڑی روانہ ہوئی اور ہم رخصت ہوئے۔ سب افسر لیس کے لوگ، انگریز ہندوستانی اور ہمارے دوست مسٹر قمر احمد بی اے، ایل ایل۔ بی (علیگ) ن کی طرف بعض لوگ وہ شعر منسوب کرتے ہیں "ہو گئے پاس ایل ایل بی میں اگر ہم اب کے" لئے جو غازی پور سے ملنے آئے تھے اس دلچسپ مباحثے سے مستفیض ہوئے۔

رات کو ہم بارہ بجے ستنہ پہنچے۔ گاڑی وہیں تک جاتی تھی۔ نوکر اتر گئے ہم سوتے رہے جب
دس بجے والی گاڑی الہ آباد سے آئی تو ہم پھر روانہ ہوئے۔ صبح کو جبلپور پہنچے۔ اسٹیشن پر Latham
Supdt Police ملے اور C.P. Government کے احکام دئے۔ وہ بھی چاہتے
کہ ہم اسٹیشن ہی پر اور اپنی گاڑی ہی میں رہیں لیکن ہم نے کہا کہ ہمیں اس قدر آزادی ضرور حاصل ہے
کہ جبل پور کی سیر کریں اور جب تک اس کے خلاف حکم نہ ہوگا ہم اپنے حقوق کا استعمال کریں گے
شخص نہایت معقول ہیں۔ خود ہی ایک نہایت نفیس موٹر منگائی جو "کنبہ پرور" تھی۔ ہم آٹھ دس
بھر گئے۔ ہم نے خود ہی درخواست کی کہ کوئی پولیس کا افسر ہمارے ساتھ چلے تاکہ رہنمائی بھی ہو اور آ
کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ کہیں جاکر "بغاوت" پھیلائی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہما
D.S.P بلا یونی فارم کے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم کو عذر نہیں اگر وردی پہنے ہوئے بھی کوئی شخ
ہمارے ساتھ ہو) اور وہ آپ کو جانتے بھی ہیں۔ علی گڈھ کے پرانے طالب علم ہیں۔ وہ ساتھ چلے
یہ میرے ہم جماعت نکلے۔ خوب سیر دکھائی۔ راستے میں مرزا اکرم خاں بی۔ اے (علیگ) بلاسپو
D.S.P. جو Hockey کھیلنے اپنی ٹیم کے ساتھ آئے تھے مل گئے۔ وہ بھی موٹر پر آگئے۔ خو
گپیں ہوئیں اور ہمارے ساتھ ہی رہے جب تک کہ ہم رخصت ہوئے Mr. Latham
ہمیں رخصت کرنے آئے۔ ان سے بھی گفتگو رہی۔ مگر آدمی لائق اور خلیق ہیں اور معقول پسند۔ ر
میں ایک مقام Nainpur پر گاڑی بدلی جاتی ہے۔ یہاں چند لوگ ملے جو ndla
ضلع سے ہم سے ملنے آئے تھے۔ ترجمان میں جو پروگرام چھپا تھا اس کے باعث جبلپور بھی لو
اسٹیشن پر آئے اور ملے۔ راستے میں متعدد اسٹیشنوں پر لوگ جوق جوق آئے۔ شب کو یہاں پہنچ
محمد عبدالولی خاں "مجاہد طرابلس" جو یہاں نظر بند تھے ملے اور چائے پلائی۔ چونکہ کوئی شخص حکام
رہنمائی کے لئے نہ تھا اس لئے شب کو ہم نے اور ہمراہی یوروپین انسپکٹر نے جو جبلپور سے آیا تھا
ہی میں آرام کیا۔ صبح کو ایک پولیس جمعدار کے کہنے پر کہ بنگلہ تیار ہے اور سب سامان سے آراستہ
یہاں آئے تو بنگلہ خالی پایا۔ صرف دو کرسیاں اور ایک میز استقبال کے لئے موجود تھیں۔

ڈاک بنگلہ گئے ۔ اتفاقاً دو کمروں میں سے ایک کمرہ کھلا ہوا تھا ۔ ایک میں یہ سارا کنبہ جا پڑا ۔ یہاں سب سے پہلے اشتیاق علی صاحب E.A.C سے ملاقات ہوئی ۔ معذرت کرتے تھے کہ ہم کو بالکل خبر نہ تھی یہاں کے ڈپٹی کمشنر میرے شناسا نکلے ۔ مسٹر گنگادھر چٹنویس کے سگے بھائی ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو علم تو تھا مگر گورنمنٹ ہند کی طرف سے ایک ڈیڑھ مہینہ ہوا کہ عبدالمجید C.I.D کا D.S.P. شملہ سے آکر مکان کا انتظام کر گیا تھا ۔ اس کے علاوہ ہمیں کوئی حکم نہ ملا تھا ۔ بہرحال مسٹر چٹنویس نے بہت عنایت کی اور ہم ان کے سخت مشکور ہیں ۔ C.P. Government نے سامان کے لئے فوراً منظوری ان کے لکھنے پر دیدی اور کلکتے سے فرنیچر اور کانپور سے دریاں آرہی ہیں ۔ پلنگ وغیرہ عاریتاً مل گئے تھے اب یہاں مسہریاں تیار ہو گئی ہیں ۔ فرنیچر بھی جلد آجائے گا ۔ بہرحال مردہ بدست زندہ اگر یہ نہ بھی ہوتا تو ہم شاکر و صابر رہتے ۔ یہاں لوگوں کو اسلامی حمیت سے پُر پایا ۔ ہندو اور مسلمان سب ہم سے اچھی طرح ملتے ہیں ۔

برادرم ۔ غربت میں وطن کا مزا ہے ۔ باقی آئندہ ۔

تم آؤ تو ناگپور ہو کر آنا ۔ وہاں سے صبح کو ۸ بجے گاڑی چل کر شام کو ۵½ یہاں پہنچ جاتی ہے ۔ واپس ہو کر ناگپور سے بمبئی چلے جانا ۔ شوکت اور بچوں کا سلام ۔ والدہ کی دعا ۔ میری اہلیہ سلام کہتی ہیں ۔ والسلام ۔

تمہارا خیر طلب اور مداح

محمد علی

گیتا کے فارسی تراجم

گیتا یا بھگوت گیتا کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں حقائق و معارف کی جو باتیں ہیں وہ درحقیقت میرے قلم سے توضیح کی محتاج نہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے تراجم سے قطع نظر کرکے جرمنی، فرانس اور انگلستان جیسے غیر ممالک کی زبانوں میں بھی اس کے تراجم کی تعداد کچھ کم نہیں۔

ہندوستان میں مدتوں فارسی کا زور رہا ہے۔ اس عرصے میں بہت سے ارباب علم کی بدولت بے شمار سنسکرت کتابوں نے فارسی کا جامہ زیب تن کیا۔ اور بعض کتابوں کے متعدد تراجم ہوئے۔ گیتا جیسی مشہور و معروف کتاب کے جو مختلف فارسی ترجمے میری نظر سے گذرے ہیں فی الحال ان ہی کا مختصر بیان ہدیۂ ناظرین ہے۔

(۱) ترجمۂ فیضی

اکبری دربار کے ملک الشعراء شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی صاحب کمال شاعر کا ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ شری بھگوت گیتا ہے۔ سنسکرت نسخے میں ۱۸ ادھیائے (باب) ہیں۔ اسی طرح اس فارسی نسخے میں بھی ۱۸ باب قائم کئے گئے ہیں اور سنسکرت کے ۷۰۱ اشلوکوں (اشعار) کا مضمون فارسی کے ۱۲۸۲ اشعار میں ادا کیا گیا ہے چنانچہ ہر ایک ادھیائے کے اشلوک اور فارسی اشعار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ادھیائے	تعداد اشلوک	تعداد اشعار
۱	۴۷	۷۴
۲	۷۲	۱۱۷

ادھیائے	تعداد اشلوک	تعداد اشعار
۳	۴۳	۷۵
۴	۴۲	۴۳
۵	۲۹	۵۸
۶	۴۷	۶۴
۷	۳۰	۵۹
۸	۲۸	۵۴
۹	۳۴	۸۲
۱۰	۴۲	۷۶
۱۱	۵۵	۹۱
۱۲	۲۰	۳۲
۱۳	۳۵ [۱]	۷۸
۱۴	۲۷	۴۶
۱۵	۲۰	۴۳
۱۶	۲۴	۶۳
۱۷	۲۸	۵۶
۱۸	۷۸	۱۷۰
	۷۰۱	۱۲۸۲

---

۱ سنسکرت کے بعض نسخوں میں صرف ۳۴ ہی اشلوک شمار کئے گئے ہیں۔ اس حساب سے تمام سنسکرت اشلوکوں کی مجموعی تعداد صرف ۷۰۰ ٹھہرے گی۔

ادا کرنے میں بعض اوقات تفصیل اور بعض اوقات اختصار سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے یہی سبب ہے کہ سنسکرت اشلوکوں اور فارسی اشعار کی تعداد میں کوئی خاص تناسب نہیں ہے۔

اب سنسکرت کے ابتدائی ۵۰ اشلوکوں کا ماحصل ذیل میں علیحدہ علیحدہ دیا جاتا ہے اور ہر ایک کے پہلو میں فارسی اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین ملک الشعرا فیضی کے ترجمے کی صحت اور قادر الکلامی کا کم و بیش اندازہ لگا سکیں۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
(۱)	دھرتراشٹر[1] نے سنجے سے پوچھا کہ جب کوروں اور پانڈوں کو رکشیتر کے میدان جنگ میں صف آرا ہوئے تو کیا ہوا۔	طراز ندۂ داستان کہن بدیں سال بفگند طرح سخن کہ پرسید دھرتراشت[2] از سنجے ایں کہ کُرکھیت رشک بہشت بریں بود مزرعۂ آخرت در جہاں در آں جا رسیدند چوں کوروان دگر پانڈواں از پے کارزار چہا نست ایں قصہ اے ہوشیار
(۲)	سنجے نے جواب دیا کہ دریودھن نے جب پانڈوں کی صف آرائی	جوابش چنیں گفت کاے بادشاہ بہ بستند از ہر دو سو صف سپاہ

[1] دھرتراشٹر اور ان کے علاتی بھائی پانڈو کی اولادوں کے درمیان مہا بھارت نامی جنگ عظیم واقع ہوئی ہے جس پر درحقیقت گیتا کا دارومدار ہے۔ دھرتراشٹر کی اولاد کوروں کے نام سے موسوم ہے۔ ان میں سب سے بڑا دریودھن ہے اور پانڈو کی اولاد پانڈوں کہلاتی ہے جو یدھشٹر، بھیم، ارجن وغیرہ پر مشتمل ہے۔

[2] اصل سنسکرت لفظ دھرتراشٹر ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سے اسمار اکثر فارسی تراجم میں اپنے ڈھنگ پر مناسب قالب میں ڈھال لئے گئے ہیں۔

نمبر اشلوک	اشلوک کا خلاصہ	اشعار فیضی
	ایک خاص وضع پر دیکھی تو اپنے پیر و مرشد درونا چارج کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔	چو فرزند تو فوج دشمن بدید به نزد درونا اچارج رسید
(۳)	محترم استاد آپ کے شاگرد رشید نے جس خاص وضع پر صف آرائی کی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔	بگفتش بریں لشکر پانڈواں نظر کن که ترتیب دارد چساں در شتد دمن هست سالار فوج جگر داریش رونق کار فوج
(۴)	اس جنگ میں بھیم اور ارجن ایسے عدیم المثال تیر انداز ہیں۔ یودہان براٹ اور دروپد ایسے سرداران لشکر ہیں۔	یلے ہمچو بھیمے بہ پہلوئے او دگر نکل و سہدیو بازوے او دگر ارجن آں چناں پہلواں که لرزد بخوفش بخود آسماں سرجا دواں سانک نامدار قوی پنجہ براٹ دشمن شکار دگر راجہ مجدتھاں بفوج گراں مہیائے کیں ہمچو شیر ژیاں دروپدیل عرصۂ رزمگاہ کند گرد فوجش جہاں را سیاہ
(۵)	دھرشٹ کیتو۔ کاشی راج۔ کنت بھوج۔ پرجت اور شیو سرداران	رئیس رئیساں دگر کاشی راج شہاں را ازو چشم اکلیل و تاج

لہ مراد یودھان۔

اشعار فیضی	اشلوک کا خلاصہ	ر اشلوک
دگر گنت بھوج و دگر شیو یار دگر ابھمن[1] مرد میدان کار بصد زور و طاقت دگر پرجت است بدلہائے شیراں از و ہیبت است جہاں پہلواں اُتموجا[2] دلیر دگر دھرشٹ کیت است مانند شیر	لشکر ہیں۔	

دوسرے ادھیائے کے اشلوک ۱۴ لغایت ۴۲ کا مبحث یہ ہے کہ جسم فنا ہو جاتا ہے
ح فانی نہیں۔ جس طرح کوئی شخص بوسیدہ لباس کو ترک کرکے نیا لباس پہن لیتا ہے
ی طرح یہ روح بھی درحقیقت ایک جسم کو چھوڑ کر دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ روح
ات حرب سے کاٹی نہیں جا سکتی، یہ نہ تو پانی میں گل سکتی ہے اور نہ ہوا میں سوکھ سکتی ہے
نیرہ۔

مذکورہ بالا خیال کو ملک الشعرا نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

تغیر بجسم است و جاں فارغ است — حوادث بریں است و آں فارغ است
بگرمی و سردی تنت آشنا ست — نہ جانت کہ فارغ ز ہر دو سراست
بوقت معین اجل میرسد — بہر نیک و بد بے خلل می رسد

---

[1] مراد ابھمنو پسر ارجن۔ یہ نام اصل پانچویں اشلوک میں نہیں آیا مگر حق یہ ہے کہ اس نے میدان
زار میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

[2] اُتموجا نام چھٹے اشلوک میں آیا ہے۔

بے پادشاہان لشکر کشاں ۔ بخاک اوفتادند از دست شاں
زمانہ بیک وضع بودے اگر ۔ نمی یافت فرزند جائے پدر
غم ایں عزیزاں چرا مے خوری ۔ چرا پردۂ راز را مے دری
تن ہر کسے ہم چو جامہ بود ۔ شود پارہ ہر گاہ کہنہ بود
بپوشندۂ جامہ جانست نام ۔ خیال فنا گشتنش ہست خام

القصہ میں نے سنسکرت کے جستہ جستہ مقامات کا مقابلہ فارسی سے کیا اور یہ نتائج نکلے:-

(۱) ملک الشعراء نے سنسکرت گیتا کو کما حقہ سمجھا تھا۔

(۲) فارسی میں کہیں کہیں اصل سنسکرت کے بعض مؤخر امور کو مقدم یا یوں کہنا چاہئے کہ بعض مقدم امور کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ جس طرح کوئی سنسکرت داں سنسکرت گیتا سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اسی طرح ہر ایک فارسی داں فارسی نسخے سے صحیح معنوں میں مستفید ہو سکتا ہے۔

پھر یہ امر بھی کچھ کم اہم نہیں کہ فیضی نے جس بحر میں گیتا کو نظم کیا ہے وہ اس کے لئے نہایت موزوں ہے اور جس دلکش اور زوردار پیرایے میں تمام کتاب ہے اس کی بنا پر میرا یہ قیاس ہے کہ اگر کوئی صاحب ذوق کتاب کو شروع کرے تو اس کو ختم کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔

فیضی نے گیتا کو اس شعر پر ختم کیا ہے۔

بکن سجدۂ شکر پروردگار
کہ آمد ز دست تو ایں گونہ کار

فیضی نے یہ عدیم المثال ترجمہ کب کیا تھا اس امر کا صحیح پتہ نہ تو اس کتاب سے لگتا ہے اور نہ اب تک اس بارے میں دوسرے ذرائع سے کوئی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اپنی ہر دلعزیزی کے باعث یہ ترجمہ مختلف مطابع سے شائع ہو چکا ہے چنانچہ مفصلہ ذیل

مطابع کے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔

۱۔ مطبع آئینی الہ آباد۔ سنہ طباعت درج نہیں۔

۲۔ مطبع ست دھرم پرچارک جالندھر سنہ ۱۹۰۱ء۔

۳۔ جارج اسٹیم پریس لاہور۔ سنہ طباعت درج نہیں۔

ان کے سوا دو اور نسخے بھی بتائے جاتے ہیں:۔

۱۔ عالیجاہ دربار پریس گوالیار سنہ ۱۹۲۴ء۔

۲۔ ہندوستان پرنٹنگ ورکس دہلی سنہ ۱۹۲۶ء۔

(۲) ترجمۂ ابوالفضل

اہل ہنود کا عقیدہ ہے کہ کاشی میں مرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اسی خیال سے بہت سے لوگ آخری عمر میں کاشی آجاتے ہیں اور بقیہ عمر کو زیادہ تر مذہبی مشاغل میں صرف کرتے ہیں چنانچہ جو فارسی داں اصحاب یہاں آئے ان کی بدولت اکثر مذہبی کتابوں کی نقلیں یا ترجمے کاشی میں پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک گیتا کا ترجمہ ہے جو ملک الشعرا فیضی کے برادر خورد شیخ ابوالفضل الملقب بہ علامی کا کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور مذہبی کتابوں کے بھی قلمی نسخے دیکھنے میں آئے ہیں جن کا ذکر آیندہ حسب موقع کیا جائے گا۔

شیخ ابوالفضل کے ترجمے کا نام "ارجن گیتا" ہے۔ اس کے شائع ہونے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی اور نہ غالباً اس کا ذکر کسی کتاب میں آیا ہے۔ اسی سبب سے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ میں نے اس نایاب ترجمے کا ایک قلمی نسخہ بنارس کی 'مالتی سدن' نامی لائبریری میں دیکھا ہے جس کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

یہ نسخہ تقریباً ۹۲ صفحات تقطیع ۱۰ × ۶½ انچ پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں تقریباً ۲۳ سطریں اور ہر سطر میں ۲۴ الفاظ کا اوسط ہے۔ خط معمولی ہے۔

کاتب کا نام و پتہ یہ ہے "کنور سنگھ ولد گلزاری مل ابن پرتھی مل قوم اگروالہ، ساکن شاہجہاں آباد"۔

کاتب موصوف مرزا شگفتہ بخت بہادر ولد مرزا جاندار شاہ بہادر کے یہاں ملازم تھے۔

مقام و وقت کتابت بہارج دواجی ٹولہ شہر بنارس تاریخ سلخ صفر المظفر ۱۲۱۴ھ مطابق ۴۲ سنہ جلوس والا بادشاہ شاہ عالم غازی۔

کاتب موصوف نے اس ترجمے کو جس نسخے سے نقل کیا تھا اس کا کوئی حوالہ درج نہیں۔

اس نسخے کے متعلق ضروری امور ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

۱۔ ابتدا میں ایک مختصر مقدمہ منجانب فاضل مترجم ہے جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں:-

"این نسخۂ گیتا کہ در انکشاف سرایر قدرت ذوالجلال و اشکشاف حقیقت معرفت لایزال است آں را باجازت سلطان عادل و برہان کامل دلیل قاطع خدا دانی حجت ساطع رحمانی قافلہ سالار راہ حقیقی و مجازی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ شیخ ابوالفضل از زبان سنسکرت ترجمہ بعبارت فرس و عربی نمود"

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ ترجمہ دراصل شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوا تھا۔

۲۔ نفس مضمون کی ابتدائی عبارت یوں ہے:-

"دھرتراشٹ پرسید کہ اے سنجے مردم ما و جماعت پانڈواں در وقت روبرو شدن اول بچہ کار مشغول شدند۔ سنجے گفت کہ جر جودھن فوجہائے پانڈواں ایستادہ دید نزد درونہ چارج آمدہ گفت اے استاد این لشکر عظیم کہ پانڈوان آراستہ اند عمدۂ این سپاہ بھیم و ارجن اند"

مذکورہ بالا اقتباس و ترجمے کی دیگر عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ منثور فارسی گیتا درحقیقت منظوم سنسکرت گیتا کا چربا ہے۔

۳۔ تمام ترجمے میں فاضل مترجم کے مخصوص طرزِ ادا کا رنگ ہے مگر کہیں کہیں کسی سنسکرت لفظ کو بعینہٖ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً دوسرے باب میں آیا ہے :۔

"چوں سری کرشن ارجن را با دیدۂ پر آب دید ندازروئے مہربانی فرمودند کہ اے ارجن ترا درچنین محل مشکل اندیشہ کہ از نقصان عمل خبر می دہد از کجا پیدا شد و ایں روش بسرگ[1] لوک نمی رساند۔"

۴۔ ترجمے کا بیشتر حصہ نثر میں ہے مگر کہیں کہیں اشعار بھی ہیں چنانچہ ایک شعر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

ہر کہ آمد بجہاں اہلِ فنا خواہد بود
وانکہ پایندہ و باقیست خدا خواہد بود

(۳) مترجمہ مول چند

یہ ترجمہ موسوم بہ "سری بھگوت گیتا" رائے مول چند صاحب متوطن ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہے۔ مطبع کوہ نور لاہور سے ۱۸۶۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مترجم کون تھے۔ انھوں نے کب ترجمہ کیا۔ ان امور کا ہنوز مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔

پورا مطبوعہ نسخہ معمولی تقطیع کے ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سیدھی سادی فارسی نثر میں ہے مگر ترجمے میں سنسکرت الفاظ کا بعینہٖ استعمال جا بجا کیا گیا ہے۔ اب بطور نمونہ اس گیتا کی تھوڑی سی ابتدائی عبارت ذیل میں دی جاتی ہے۔

"آغاز سری بھگوت گیتا

دھرتراشٹ پرسید اے سنجے مردم من و جماعت پانڈواں در زمین

---

[1] سرگ لوک سے مراد بہشت بریں۔

دھرم کھیتر کورکھیتر بقصد جنگ جمع شدہ چہ کردند۔ سنجے گفت کہ درجودھن فوجہا
پانڈوان را استادہ دیدہ نزد درونا چارج آمد و گفت اے اوستاد ایں
لشکر عظیم پانڈواں را درشٹدمن ورید کہ شاگرد خردمند تست بہ صفوف
آراستہ نیک ملاحظہ کن۔"

آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ گیتا جیسی گراں بہا کتاب کے دوسرے ترجمے بھی ہوئے ہوں جو میری نظر سے نہیں گذرے۔ پس اگر کوئی صاحب ذوق کسی دیگر نسخے یا نسخوں کا حال تحریر فرمائیں یا مجھے ان کا پتہ دیں تو میں بہت ممنون احسان ہوں گا۔

رام پور کا ایک ملک الشعرا

ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی ہستی ایک ہی وقت میں صاحب افسر و دیہیم بھی ہو اور صاحب قرطاس و قلم بھی، انتظام مملکت اور کشور آرائی کے مراحل بھی درپیش ہوں اور افواج معانی کی سپہداری بھی ہو رہی ہو، دنیا دی دبغمرپیاں "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت دے رہی ہوں اور فقر و قناعت کے بوریے پر لطف درویشی بھی حاصل کیا جا رہا ہو، ایک طرف نگار ہائے شوخ و شنگ "دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش" ہوں اور دوسری طرف چشم بینا "جائزہ ہستی کی تینوں" کو نمایاں کرکے بساط عیش برہم کر دیتی ہو، کسی وقت مطرب و ساقی، نغمہ و مے، چنگ و رباب کیفیت سرور میں محو کر دیں، تو کبھی کبھی حقیقی جذبات کی تراوش وہ درد بھی پیدا کر دے کہ "نغمۂ شادی" "نوحۂ غم" میں بدل جائے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم فرماں روائے "دارالسرور رام پور" انہی مستثنیات میں تھے وہ صاحب تخت و اورنگ بھی تھے اور ایک جادو نگار شاعر بھی، وہ مالک چتر شاہی بھی تھے اور اقلیم سخن کے تاجدار بھی۔

ان کے ماحول پر نظر ڈالئے تو اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کے دل میں جذبات کا یہ ترفع، تخیل کی یہ قدرت، انداز بیان کی یہ پاکیزگی پیدا کیوں کر ہوئی! جس شخص کو بگاڑنے کے لئے مصاحبوں اور ندیموں کا جمگھٹ ہو خوش باشوں اور خوشامدیوں کا اجتماع ہو، بڑے سے بڑے نقاد فن اور ماہر زبان کی زبان بھی جس کے حضور میں گنگ ہو جاتی ہو، تعریف و توصیف، مدح و ستائش، اور "عمرت دراز باد" کے نعرے جس کے کانوں میں ہر وقت گونجتے ہوں، اگر اسے اپنے متعلق "غلط فہمی" نہ ہو تو کس کو ہو؟ وہ اپنے ہر عیب کو ہنر نہ سمجھے تو کون سمجھے؟ اگر اس پر بھی کسی شخص کو عیب و ہنر میں تمیز باقی رہے تو اس سے بڑھ کر عاقل و فرزانہ کون ہے؟

ناظم اگرچہ ایک فرمانروا تھے، اظہار خیال میں بے باک تھے، نہ ان کی کوئی گرفت کرسکتا تھا نہ صحیح مشورہ دے سکتا تھا، لیکن باایں ہمہ انھوں نے وہ حسن ذوق اور کمال فن پیدا کیا کہ ان کا کلام صاحب ذوق سلیم کو وجد وکیف میں سرشار کردیتا ہے۔

ان کا اشہب قلم اصناف شاعری کے ہر میدان پر یلغار کرتا ہے، لیکن تغزل ان کا حصہ ہے، اس کی آپ جتنی تحلیل کرسکتے ہوں کر لیجیے، پھر ناظم کو اس کسوٹی پر کسیے، تو آپ اسے اپنے معیار سے زیادہ ہی پائیں گے، بالخصوص محاکات اور حسن بیان میں تو اسے یدطولیٰ حاصل ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس انداز سے کہتا ہے کہ گویا سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، وہ جب درد والم کا اظہار کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی ترجمانی ہو رہی ہے، وہ جب کسی کی بے اعتنائیوں اور تنک مزاجیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس حسرت وتاسف سے کہ اگر پتھر کا دل ہو تو وہ بھی موم ہو جائے، اور چونکہ وہ ایک باعظمت وجبروت شخصیت کا مالک ہے، صاحب اقتدار وصاحب اختیار ہے، حرم سرا بھی رکھتا ہے اور محلات بھی اس لیے کبھی کبھی شاہانہ تمکنت کا اظہار بھی زبان شعر سے ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جب ناظم ایک عاشق ناکام نہیں تھے، فراق زدہ نہیں تھے، جور فلک کے شاکی نہیں تھے، "کسی" کے شکوہ سنج جور وستم نہیں تھے۔ تو ان کے ہاں اس درد واثر، سوز وگداز اور بے تابی وبے قراری کے کیا معنی؟ انھیں تو امراء القیس کی طرح "شب وصل" کا نقشہ کھینچنا چاہیے تھا، اپنی لغزش رندانہ کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرنی چاہئے تھیں، لیکن یہ عنصر تو کم ہے، ہے تو درد وغم کی داستان، "بے قراری ہائے فرقت کا بیان"۔ اسے اگر آورد نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

یہ خیال صحیح نہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ ناظم اگر رام پور کے فرماں روا تھے تو کشور دل بھی تسخیر کرچکے تھے؟ ہوسکتا ہے کہ دل پر ایسی چوٹ لگی ہو جس نے ان سے نشاط ومسرت کے جذبات چھین لیے ہوں، دربار میں، حرم سرا میں، مصاحبوں کے مجمع میں، کاروبار سلطنت میں وہ اپنا

درد نہاں بھول جاتے ہوں، لیکن جب رات کی تاریکی مسلط ہوتی ہو تو وہ اپنے دل میں ایک خلش محسوس کرتے ہوں، جب لوگ مصروف خواب ہوتے ہوں، وہ کروٹیں بدلتے ہوں، جب فانوس کی روشنی کاشانۂ سلطانی کو بقعۂ نور بنا دیتی ہو، تو پریم کی "اندھیری نگری" میں یاس و حسرت کے بادل چھا جاتے ہوں، جب شب ماہ کی کرنیں بام و در کو جگمگا دیتی ہوں تو ان کا دل ویران و سنسان رہتا ہو اور اس وقت ہجوم جذبات میں ان کے منہ سے نالۂ موزوں نکلنے لگتا ہو جو ہر سننے والے کے لیے دعوت درد و اثر ہو۔ میرے اس خیال کی اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کا کلام اٹھا کر دیکھیے تو جس جگہ وہ دل کی بیتی بیان کرتے ہیں، سماں بندھ جاتا ہے، سننے والا یا پڑھنے والا ایک عجب خلش محسوس کرنے لگتا ہے، ورنہ اگر خالی خولی الفاظ ہوتے جیسے

طلوع صبح محشر چاک ہے میری گریباں کا

تو آپ لاکھ بار سنتے اور کچھ اثر نہ ہوتا، "استادانہ پختگی" "بلند پروازی" اور اسی قبیل کے دو چار الفاظ آپ کے منہ سے یہ سمجھ کر نکل جاتے کہ یہ ناسخ کا مطلع ہے، اس لئے ضرور لاجواب ہوگا۔ لیکن اگر کوئی ایسا شعر سنیے کہ سنیے اور سر دھنیے، تو اسے آپ آورد کیسے کہہ سکتے ہیں؟

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے اصل موضوع پر توجہ کرتا ہوں اور کلام ناظم کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

عام عاشقانہ مضامین ناظم کا کلام بھی ان جذبات و خیالات سے معریٰ نہیں ہے جو "قدر مشترک" کے طور پر تقریباً ہر شاعر کے ہاں باختلاف قوافی و ردیف ملے گا۔ اس ذیل میں ان کے جو اشعار آتے ہیں ان میں کوئی خاص بات سوا اس کے نہیں ہے کہ وہ موزوں ہیں۔ ہر شاعر کے ہاں "مزخرفات" کا ایک جزو ضرور ہوتا ہے۔ فی البدیہہ کہنے سے، فرمایشی اشعار کہنے سے، خواہ مخواہ طبیعت پر زور ڈال کر کہنے سے دیوان تیار ہو رہا ہو اور کوئی ردیف اس وقت تک نہ کہی گئی ہو تو اس کی "خانہ پری" کرنے سے ایک مجموعہ تیار ہو جاتا ہے جسے حذف ہی کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجیے۔ ہمارے ہاں کا دستور یہ ہو گیا ہے کہ موزوں صورت میں جو کچھ، جس موقع پر بھی زبان سے نکل جائے اُسے

"زیب کلیات" ضرور بنایا جائے۔ غالب بیچارے نے شارع عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی تھی کہ اپنے اشعار کا انتخاب شائع کرایا' باقی غیر ضروری اشعار حذف کر دیے لیکن وہ حذف شدہ اشعار اتنے سخت جان نکلے کہ ہنگامۂ غدر میں بھی صحیح سلامت رہے۔ بالآخر نواب صاحب بھوپال کے کتبخانے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم اس "مجموعۂ بے رنگ" کو بھی نکال ہی لائے اور ستم یہ کیا کہ شائع بھی کر دیا۔

حاصل کلام یہ کہ ناظم کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتے مثلاً:۔

آنے کو کہا ہے اس نے ناظم کچھ تم کو ہی اعتبار ہوگا

سنا بھی تم نے تو کس سے سنا خدا کی پناہ کہا ہے غیر نے جو کچھ وہ میرا حال نہیں

اک جہاں تشنۂ انداز خود آرائی ہے آپ جو چاہیں کریں آپکی بن آئی ہے

آگے ہی کا سا طور ہے کیا اب کی بار بھی باندھا ہے تم نے عہد یہ ہے استوار بھی؟

ملے گی محشر میں داد ہم کو' بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کرینگے؟

جلد جم جاتا ہے ہر شخص کا نقشہ کیسا سادہ دل ہے وہ بت آئینہ سیما کیسا؟

مایوسی | لیکن ان مہملات سے قطع نظر کر کے ان کے اصل کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیجیے' تو ناظم کی خصوصیات خاصہ آپ کو رفتہ رفتہ متاثر کرتی جائیں گی۔ درد و اثر' سوز و گداز اور وفا و جفا کے

سانے آپ نے شعرا کی زبان سے اکثر سنے ہوں گے، لیکن ناظم کی آہ جگر گداز بزم و انجمن میں صاعقے حکم رکھتی ہے اس کا درد دل جیسا بے نیاز دعا و دوا ہو جاتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے:-

عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا اچھا غم فراق کا بیمار ہو چکا
اب کیوں کمی کرے تجھے کس کا لحاظ ہے رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا

یہاں غم فراق نے جان پر بنا دی ہے، "اس کی کج ادائیوں اور سرد مہریوں نے یوس کر رکھا ہے، لیکن دل ہے کہ محبوب کی طرف سے "صفائی" پیش کر رہا ہے۔ آخر خود پنے تئیں مخاطب کر کے کہتے ہیں:-

ناظم غلط ہے مہر و محبت سے چشم داشت واقف نہیں ہو اس صنم حیلہ گر سے آپ

"اس نقش پا کے سجدہ" نے کیا کیا نہیں کرایا، آخر ناظم صاحب

شاعر بنے، ندیم بنے، قصہ خواں بنے پائی نہ انکے دل میں مگر جا کسی طرح

یہاں پر تو جان پر بنی ہوئی ہے مگر ناصح صاحب ہیں کہ "فلسفۂ عشق" پر تقریر فرمائے جا رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ

نصیحت کا نہیں اب وقت ناصح اٹھا ہاتھ ایسی باتوں سے دعا کر

اس "پاپ کی دنیا" میں ناظم کسی کو اپنا ہم زبان و ہم نشیں نہیں پاتے اور پائیں کیونکر جب صورت مسئلہ یہ ہو،

خدا بے نیاز اور بت سنگ دل کہو کس سے ہم راہ پیدا کریں!

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے، رنجوری عشق کا کتنا باکمال مرقع پیش کیا ہے،

قاصد شکستہ پا و کبوتر شکستہ بال جانے کا خط کے واں کوئی عنوان ہی نہیں

دل لاکھ لاکھ سمجھاتا ہے کہ محبوب کی سرد مہری وقتی ہے، اس کی کج ادائی التفات پنہاں کی غماز ہے، لیکن

توقع اس سے کیونکر غمگساری کی پڑے ناظم کبھی بھولے سے بھی جس نے نہ پوچھا ہو کہ "کیونکر ہو"

یہ حیات مستعار تو کشمکش اضطراب و اضطرار میں گزری، شاد کامی کا زمانہ ناکامی میں بسر ہوا، اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وہ"

پوچھنے آئیں گے پر جب کہ مجھے بات کرنے کی نہ طاقت ہو گی

"وعدۂ یار" شرمندۂ ایفا کب ہوا ہے؟ لیکن ناظم فریب میں آ گئے۔ محبوب ستم گار نہ اب آتا ہے نہ جب آتا ہے، آخر بے قرار ہو کے کہتے ہیں،

وہ اپنی ضد کے ہیں پورے نہ آئیں گے ہرگز بس ان کی راہ ہم اے غم گسار دیکھ چکے

ان کا حال زار دیکھ کر ہر شخص انھیں تسلی دیتا ہے، لیکن وہ بھی "اس کی طینت سے واقف ہیں" بالکل بجا طور سے جواب دیتے ہیں۔

یہ تیری سخن سازیاں ہیں ندیم کسی پر وہ کیوں رحم کھانے لگے

عرض حال | ایک ناکام تمنا حصول مقصد کے لئے ہر امکانی کوشش صرف کر ڈالتا ہے، ناظم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، انھیں بھی "کوچۂ رقیب" میں "سر کے بل" جانا پڑا، منت اعدا کرنی پڑی، اپنی خودداری کا خون کرنا پڑا، اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ کسی کے حریم ناز میں باریاب ہو سکیں، لیکن جب ان باتوں سے بھی کام نہ نکلا تو انھوں نے ایک بالکل نیا طریقہ نکالا جسے بظاہر کامیاب ہونا چاہئے تھا۔ اب یہ خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس میں کامیاب کہاں تک ہوئے؟ وہ طریقہ یہ کہ انھوں نے مختلف پیرایوں میں محبوب کے جذبات پر اثر ڈالنا شروع کیا، کبھی رقیب روسیہ کے معائب چن چن کے بیان کئے، کبھی اپنی وفاداریوں اور جاں سپاریوں کو شفیع لائے، کبھی حسن وفا پر لیکچر دے دئے کہ اس زمانے میں وفا عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ اگر کسی میں یہ گوہر نایاب پایا جائے تو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ کبھی کبھی رفع غلط فہمی کے خیال سے یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ اگر جفا کاریوں کا یہی عالم رہا تو ایسا مخلص اور بے ریا دل کاہے کو ملے گا؟ غرض ہر ہر طرح سے سب سے پہلے تو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کا "سکہ" یوں بٹھاتے ہیں،

دیکھ تو بھی کہ گلا ہے تہ خنجر لیکن تجھ کو اے یار کس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

"صفائی" دے رہے ہیں کہ میری زبان آلودۂ شکوہ سنجی نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی اپیل
جا رہے ہیں کہ میری حالت تو یہ ہے کہ بات بھی نہیں کر سکتا اور تم ہو کہ "شکوہ" کی
یت کر رہے ہو،

اس پہ کیجے گمان شکوے کا　　بات کرنے کی جس میں طاقت ہو

کنایہ ہے کہ ہم نے شکایت نہیں کی لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو کہ خواہ مخواہ رحم
ے۔

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو　　منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

یہ شعر ملاحظہ ہو،

جان دی گو تڑپ کے پر تم کو　　اک تماشہ دکھا دیا میں نے

محبوب پر احسان جتاتے ہیں

طعن عدو، ملامت احباب، جور خلق　　دیتے نہ تم کو دل نہ یہ آزار کھینچتے

ہمائی کا دم بھرتے ہو، سچ ایسا ہی ہے لیکن　　کبھی اپنے مریض غم کو بھی پوچھو کہ کیسا ہے؟

اپنی کارگزاریوں کو بھی وہ قیس و فرہاد سے کم نہیں سمجھتے اور بلا کسی انکسار کے صاف صاف
وض" کرتے ہیں۔

افسانۂ مجنوں سے نہیں کم مرا قصہ　　اس بات کو جانے دو کہ مشہور نہیں ہے

پوچھتے ہیں کہ بتلائیے سوا "خاکسار" کے اور

ہ کون ہیں کہ جو محبوب کے ستم سہہ کر　　زباں کو زمزمہ سنج دعا نہیں کرتے؟

سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ ناظم صاحب کی طرح

بذلہ سنج، نہ شاعر، نہ شوخ طبع رقیب　　دیا ہے آپ نے صحبت میں اپنی بار کسے؟

"احتیاطاً" کبھی کبھی یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ

جفا اُدھر سے اگر بے شمار باقی ہے　　اِدھر بھی دل پہ ابھی اختیار باقی ہے

ہوا و ہوس کے جتنے بندے تھے وہ تو جفائے یار سے آشفتہ خاطر ہو کر اٹھ گئے، لیکن ایک
ناظم صاحب کا دم تھا جو خلوص و وفا کا نام لئے بیٹھا تھا، اطلاعاً عرض کرتے ہیں،

سب اٹھ گئے ترے در سے خبر ہے ناظم کی　　ستم کشوں میں یہی دل فگار باقی ہے!

درد و اثر | درد و اثر، سوز و گداز، اور یاس و حرماں کے جذبات بھی کلام ناظم کا ایک مخصوص حصہ ہیں، جذبات جب حقیقی ہوں، درد دل جب سچا ہو، منہ سے جو لفظ نکلتا ہے اس میں درد و حسرت کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے، کیف و اثر کا ایک مے خانہ ہوتا ہے کہ اس شراب ناب کا ایک قطرہ بھی جس کے کام و دہن تک پہنچا وہ اپنے دل کی دنیا میں ایک انقلاب محسوس کرنے لگتا ہے۔

غالب کشورِ سخن کا فرماں روا تھا۔ جس زمین کو اس کی جولانیٔ سخن نے پامال کر دیا پھر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی قادر الکلام ہو اس کا تسخیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اس قسم کی جرأت اگر کسی سے ہو بھی تو اصل اور نقل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے، لیکن ناظم اپنے استاد غالب کی ایک مشہور و معروف زمین پر قدم رکھتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں انھوں نے کوئی ٹھوکر نہیں کھائی۔ ملاحظہ ہو،

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو　　ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جب نہ ہو کوئی جفاکش تو جفا کا کیا لطف　　کیا کرو گر نہ کرو ترکِ جفا میرے بعد

خط مرا پڑھ کے تمھیں رحم تو آیا لیکن　　یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

اس شعر میں گو توارد کی بو آتی ہے لیکن پھر بھی سن لیجئے،

کس نے اس حلقۂ کاکل میں پھنسایا دل کو　　کون اس چشم کا بیمار ہوا میرے بعد

یہ شعر طالب و مطلوب کی نفسیات کا صحیح مرقع ہے کہ

مل جاتے ہیں تو کہتے ہیں اچھی طرح تو ہو　　گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

درِ یار کی رسائی تک جب کوئی صورت نہیں نکلتی تو کہہ اٹھتے ہیں،

ن کی خلوت میں مجھے بار کہاں ہے ناظم ‏ قصہ خواں کاش سنادے مرے افسانے کو

ناصح کے طوفانِ تکلم سے ہر شخص واقف ہے۔ ناظم کو جب سابقہ پڑا تو یہ کہہ کے اپنا پیچھا چھڑاتے ہیں،

بکے جو اس طرح کون اس کو دانشمند جانیگا ‏ مجھے سودا سہی ناصح۔ یہ کیا تجھ کو بھی سودا ہے؟

ہجر و انتظار کی کتنی صحیح تصویر کشی کی ہے،

وہ اپنے وعدے کے سچے ہیں آئیں گے لیکن ‏ مجال صبر کسے تاب انتظار کسے؟

عاشق کے حال زار کا کس قدر دردناک نقشہ کھینچا ہے،

نہ دانش درست اور نہ بینش بجا ‏ دل و دیدہ دونوں ٹھکانے لگے

جفائے یار اور جور دلدار سہتے سہتے امید سو چلی تھی کہ وہ بت خود راہ راست پر آئے گا اور تلافی ستم کرے گا، عذر جفا کرے گا، پیمان وفا بندھے گا، محبت کے جام چلیں گے، الفت کے ساغر چھلکیں گے، لیکن نتیجہ نکلا تو یہ کہ

یاں آرزوئے عذر ستم اور وہاں ہنوز ‏ اپنے کئے پہ یار پشیمان ہی نہیں

ناظم کی وفا کیشیوں کا صلہ بارگاہ حسن سے ملا تو یہ کہ وہ اور زیادہ ہدف ستم بنائے گئے بعض لوگ ہیں کہ تسکین دے رہے ہیں کہ تمھارا خیال ہی غلط فہمی پر مبنی ہے، وہ صنم حیلہ گر اب آیا اور اب آیا، لیکن دل کی آواز کہہ رہی ہے،

مجھ سے بگڑے ہوئے مدت ہوئی ان کو ناظم ‏ بیچ والے ہیں ابھی بات بنائے جاتے

سہل ممتنع | شعر و شاعری میں ایک اہم چیز سلاست و روانی یا بالفاظ اصطلاح سہل ممتنع ہے۔ ناظم اس میدان کے بھی شہسوار، یکہ تاز اور مرد میداں ہیں۔ سہل ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ کلام روزمرہ سے اس قدر مرصع ہو کہ گمان یہ کیا جائے کہ اس سے بڑھ کر آسان اور سلیس کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ تو کیا ہے میں خود اس سے کہیں بہتر کہہ سکتا ہوں لیکن دعویٰ ثابت کرنے کے لئے جب ہاتھ قلم دوات سے آشنا ہوں تو معلوم یہ ہو کہ

دل کی بیتی دل سے کہنا سہل ہے پر آسان نہیں

خیال کر لینا جتنا آسان تغافل کر کے دکھانا اس سے کہیں مشکل ہے۔ دوسری سب سے اہم خصوصیت اس کلام کی یہ ہے کہ پانی کی طرح رواں ہو، تیر کی طرح بے پناہ ہو اور محبت کی طرح دل میں گھر کرتا ہو۔

کلام ناظم کا آپ مطالعہ کیجیے، تو محسوس کریں گے کہ ناظم اس میدان کا بھی مرد میدان ہے۔ گ وقظ کی ردیف بہت سخت ہے، بالعموم ایسی زمینوں میں طبع آزمائی اس وقت کرتے ہیں جب "خانہ پری" مقصود ہوتی ہے۔ لیکن ناظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ الفاظ وضع اسی ردیف اور ناظم کے لیے کیے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو

منہ پر واعظ کے کیا کرتے ہیں ناچار لحاظ ہم سے چھٹتی ہے کہیں بادہ پرستی ناظم

کیا غضب ڈھائے دیکھیے ناظم ہے بر اچشم خوں فشاں کا رنگ

یہ اشعار ملاحظہ ہوں،

وصال دائمی کا ہے تصور بہار بے خزاں ہے اور میں ہوں
مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا کہ اک دریا رواں ہے اور میں ہوں
تحمل کی نہیں اب تاب زنہار نبرد آسماں ہے اور میں ہوں

یہ سو راتفاق ملاحظہ ہو،

خوش ہو رہے تھے ہم کہ بنایا ہے ہم نے یار دیکھا تو ان کے در پہ وہ دربان ہی نہیں

یہ شعر بغیر کسی تشریح کے سنئے،

وہ سن کر درد دل کہتے ہیں پھر میں کیا کروں ناظم + خلاصہ آپ کی تقریر کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں" روانی کے ساتھ جذبات کی لطافت ملاحظہ ہو،

ہم نہیں چاہتے کہ دولت ہو کون ممنون بخت و قسمت ہو

آستیں بھی نچوڑ ڈالیں گے　　　اشک کے پوچھنے سے فرصت ہو

شاعرانہ مبالغے کے ساتھ جذبات کی یہ تصویر کشی کتنی خوب ہے،

شب غم کی درازی قصہ کوتہ یوں سمجھ لیجے　　　کہ یہ وہ شب ہے جس کے بعد صبح روز محشر ہو

باتوں باتوں میں کتنے پتے کی بات کہہ رہے ہیں،

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی　　　تم اچھے، ہم برے، قدرت خدا کی

جنون عشق کے باوجود یہ "حکمت عملی" کتنی داد طلب ہے ؟

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو　　　حال اپنا سنا دیا میں نے

بہ ذیل "خمریات" یہ شعر بھی خوب ہے،

ناظم ہمیں نظر نہیں آتا وگرنہ آج　　　اس کو بھی سوئے خانۂ خمار کھینچتے

ملا ہے مے کدے کا در کھلا ہوا ناظم　　　پھر اور کہتے ہیں تائید کردگار کسے ؟

قطعۂ ذیل روانی، سلاست، ہجوم جذبات اور وفور محبت کا کتنا کامیاب مرقع ہے !

کل کہا میں نے کہ اے نامہرباں تو　　　آدمی کو آدمی سے کام ہے
دیکھ تو کب سے یہ تیرا دردمند　　　عشق میں رسوائے خاص و عام ہے
جانتا ہے تو بھی آیا یا نہیں　　　کوئی تیرا عاشق ناکام ہے ؟
سن کے ساری داستاں بولے کہ "ہاں　　　آپ کا یوسف علی خاں نام ہے"

اشعار ذیل بھی اپنی سادگی اور کیف و اثر کی آپ ہی نظیر ہیں،۔

یوں تو چھیڑ ان کو ہر کسی سے ہے　　　پر عداوت فقط ہمی سے ہے
دوست بن کر ہمیں بناتے ہیں　　　دعویٰ دوستی ہنسی سے ہے
کیوں چھپاتا ہے حال رنجش غیر　　　ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے
میرا ان کا معاملہ ناظم　　　کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے

اپنے دل کی خود "مخبری" کرتے ہیں،

جانتا ہوں دل صد پارہ جہاں رہتا ہے　　　　نہ بیاباں نہ خیاباں کوئی کوچہ ہوگا

یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ادائگی مفہوم کے ساتھ بے تکلفی زبان کا اتنا نادر نمونہ شاید ہی کہیں مل سکے۔

جب کہوں کیوں خفا ہو کیا باعث؟　　　　کہتے ہیں "پوچھنے کا کیا باعث؟"

اس سلسلے میں یہ آخری شعر بھی سن لیجیے۔

کسے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے؟　　　　وہ کیا کہیں گے مگر یہ کہ "جا، نہیں کرتے"

زور زبان و حسن بیان | ناظم جب روانی و سلاست کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ غالب کے شاگرد نہیں معلوم ہوتے بلکہ میر تقی میر کے اسکول کے طالب علم یا میر درد کے حاشیہ نشیں، یا خواجہ آتش کے زلہ ربا معلوم ہوتے ہیں یا مومن کے رنگ سے ان کا رنگ مل جاتا ہے جس کے مختلف نمونے آپ سطور بالا میں ملاحظہ کر چکے ہیں لیکن جب وہ اپنی طاقت لسانی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، اپنی خطابت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں، اپنے جوش بیان اور زور زبان کا لوہا منوانا چاہتے ہیں تو ذوق و سودا کے ہم عصر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن باتوں کو وہ صاف، سادہ اور دلنشیں الفاظ میں ادا کرتے ہیں اسی مفہوم کو وہ پر جوش، زور دار اور خطیبانہ لب ولہجے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ بطور ثبوت ملاحظہ ہو۔

نوبت ہی تیری گردش چشم سیاہ کی　　　　دنیا میں دور گنبد دوّار ہو چکا

ہے ناوکِ نگہ کے مقابل خدنگ آہ　　　　اب میرا وار روک، ترا وار ہو چکا

چاہیئے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد ملول　　　　چاہیئے تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ

نہ تجھے حشر کا اے فتنۂ ایام خیال　　　　نہ تجھے خلق کا اے شوخ ستمگار لحاظ

کتنے پر شکوہ الفاظ ہیں۔ اپنے عشق کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں۔

ابتداء عشق میں ہوں منتہی میرا آغاز اور کا انجام ہے

اور لوگ کہے کم

ں تو لیتے ہیں نہ مانیں گرچہ بات کیوں نہیں سنتے ہو یہ کیا بات ہے ؟

اپنے محبوب سے مطالبہ کرتے ہیں؛

ستم کرو ہم پہ بے تحاشا، لحاظ کس کا ہے، خوف کیا ہے ؟

اگر ہے گریہ تو بے اثر ہے، اگر ہے نالہ تو نارسا ہے

رند تشنہ کام ساقی جرعہ بخش سے مخاطب ہے؛

م بھی ہوتا تو تسلی مری ہوتی ساقی بس یہی بادہ کہ کچھ شیشے میں کچھ جام میں ہے

افسانۂ غم ختم نہیں ہوتا تو کہتے ہیں؛

حکایت غم ہجراں ابھی سنے جاؤ شکایت تعب انتظار باقی ہے

اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں؛

عبث ہے اے دل فغان و زاری عبث ہے لے دیدہ اشکباری

عدو سے مانا کہ ہے لگاوٹ، مگر وہ کس سے وفا کریں گے ؟

بڑھا ہے درباں سے ربط باہم، یقیں ہے اب سب رفیق اپنے

گلی میں ان کی پھرا کریں گے، ہم ان کے در پر رہا کریں گے

ماکات ماہرین سخن اور نقادان فن کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ شاعری محاکات کا دوسرا ام ہے یا محاکات کو شاعری کہتے ہیں یعنی کسی واقعے کو بالخصوص کسی ایسے واقعے کو جو محبوب ے متعلق ہو اس طرح بیان کرنا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جائے، یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات و تفاصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں اور حظ حاصل ر رہے ہیں۔ ناظم محاکات کے بھی بادشاہ ہیں، وہ جذبات کے بھی بہترین مصور ہیں، وہ احساسات عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سماں پھر جاتا ہے مثلاً،

یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا ہوتے ہی درد دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے

آج پھر ان سے میں احوال دل زار کہوں گا کہتے ہوئے ڈرتا ہوں یہ ناچار کہوں گا
غصہ میں کہا ہوسے ہم اب کچھ نہ کہیں گے گر آپ سنیں گے تو میں سو بار کہوں گا
پہلے کہے دیتا ہوں تم آزردہ نہ ہونا دلچسپ لطیفے بھی میں دو چار کہوں گا

ایک بار ناصح اپنی رو میں ناظم کے سامنے اس غارتگر صبر و شکیب کا نام لے گئے ناظم ابل پڑے۔

رو کو تو سہی اب مجھے۔ لو۔ حضرت ناصح لینا ہی نہ تھا نام "کسی کا" مرے آگے

شعر ذیل دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے۔

کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

ناظم ایک بار حریم ناز میں باریاب ہوئے، وہاں جو کچھ پیش آیا ان کا موئے قلم اس کی نقاشی کرتا ہے۔

گیا تھا کہ ان کی خوشامد کروں وہ الٹا مجھی کو بنانے لگے
کبھی خیر مقدم، کبھی مرحبا زباں پر یہ الفاظ لانے لگے
کبھی میرے قربان ہوتے رہے کبھی مجھ کو پنکھا ہلانے لگے
.. ..
وہ محفل میں آئیں تو ناظم ضرور مغنی یہ اشعار گانے لگے

یہ سوال و جواب ملاحظہ ہوں،

کہئے اگر کہ طرز ستم ناپسند ہے کہتے ہیں واہ آپ کی بھی کیا پسند ہے

ظلم وہ کچھ اور پھر یہ عذر بدتر از گناہ کہتے ہیں مجبور ہوں ناظم تری تقدیر سے

اشعانہ فروگزاشتیں | عشق ومحبت کی دنیا ایک عالم ہے ماورائے عقل وہوش۔ ایک عاشق
کام جو ہجر وفرقت کے مصائب جھیلتا ہے، ہزمیت وپسپائی سے دوچار ہوتا ہے اور حسرت و
لم سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس وجذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا، عالم خیال میں اس کا صدر نشین
بزم تخیل بصد ناز و ادا جلوہ فرما ہوتا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ آلام ہجر کی شکایت یوں کرنا چاہیے، درد
رقت ایسے مؤثر انداز میں بیان کرنا چاہیے کہ اس کا دل بھی موم ہو جائے، دل کی بیتی کچھ اس طرح
یش کرنی چاہیے کہ " وہ " جفا کار بھی تڑپ اُٹھے لیکن حسن اتفاق سے جب وہ موقع حاصل
ہو جائے، جب حسرت تکلم پوری ہو رہی ہو، جب آنکھیں لطف دید سے آشنا ہو رہی ہوں، اس
وقت دماغ کے تیار کیے ہوئے سارے نقشے درہم برہم ہو جاتے ہیں، زبان گنگ ہو جاتی ہے،
اور بیان مدعا کی جرأت نہیں پڑتی لیکن اس منظر کے اختتام کے بعد پھر یاد آتا ہے کہ ہم نے
لیا کیا؟ صرف حسرت دید پوری کرتے رہے، زبان حرف شکایت سے آشنا نہ ہو پائی۔ یہ احساس
حد درجہ ہوش ربا اور تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن چونکہ " بعد از وقت" ہوتا ہے، اس لیے لا حاصل۔
یہ مواقع ناظم کو بھی پیش آئے اور اپنی حسرت کو انھوں نے بھی مختلف اسالیب سے
بیان کیا ہے مثلاً

کل ہم ان سے مل کے کہہ آئے سب اپنا دردِ دل
پھر بھی ناظمؔ شکوۂ بیداد درباں رہ گیا

رہ تو آیا اس سے لیکن ہم نشیں دل میں کہتا ہوں کہ ناظمؔ کیا کیا؟

وعدہ پر اس سے کیوں قسم مانگی مفت بگڑی بنی بنائی بات

بت سے ناخوش ہے تو کیوں اٹھ نہیں جاتا ناظمؔ

دیر میں تذکرۂ کعبہ و زمزم کب تک ؟

اس ستم گر کے ظلم سہہ سہہ کر — اور ظالم بنا دیا میں نے

ہوئے ہم ان سے گلہ کر کے شرمسار بہت — وہ عذر ہائے موجّہ سنے کہ کیا کہئے

محبوب سے اختلاف | اگرچہ جذبات محبت، والہانہ حد تک پہونچے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اپنے محبوب سے اختلاف بھی کر جاتے ہیں۔ اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیے، ان میں حسن بیان، لطف زبان، بے ساختگی الفاظ، اور واردات قلب کا جتنا مکمل نقشہ کھینچا ہے وہ تعریف و توصیف سے قطعاً بے نیاز ہے۔

تم دیدۂ گریاں کو کہا کرتے ہو ناسور — میں ضد سے اسے ابر گہر بار کہوں گا
آوارہ و سرگشتہ مجھے کہتے ہو اچھا — میں بھی تمہیں بے مہر و ستمگار کہوں گا
گھر بیٹھے ہوئے تم جو مجھے کہتے ہو مجنوں — میں تم کو نہ لیلیٰ سر بازار کہوں گا؟
تم چاند سے مکھڑے پہ کیا کیجیو نازش — میں کاکل مشکیں کو شب تار کہوں گا

ایک بار بزم محبوب میں جو پہونچے تو باز پرس ہوئی اور حکم دیا گیا کہ تشریف لے جائیے، ناظم رخصت ہونے سے پیشتر بالفاظ ذیل "صدائے احتجاج" بلند کرتے ہیں:۔

مجلس کو توڑ دیجئے میں سب کے ساتھ ہوں — لیکن مجھے نہ بزم سے تنہا اٹھائیے

شان عاشقانہ | ناظم کو اپنی عاشقانہ شان پہ پندار ہے، فخر ہے اور بلا کسی تامل کے وہ صاف صاف الفاظ میں ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ محبوب کو "غلط فہمی" نہ ہو اس لئے وعدہ خلافیاں اور اپنی انتظار آزمائیوں کو ظاہر کرتے ہیں،

وعدہ گر روز کئے جائیے گا — روز سمجھوں گا کہ آج آئیے گا

اپنے تعلق "صفائی" دیتے ہیں،

ہے خوفِ شکایت بس آکے مل جاؤ — رہے ہیں یاد ستم ہائے بے شمار کسے ؟

بزمِ حسن میں بلا اذن واجازت باریاب ہونا چاہتے ہیں، اس لئے چاہتے ہیں کہ تقریب
ت کے لئے کچھ فکر کریں، اسی کشمکش میں یہ شعر ہوگیا،

ے گی شغلِ حیلہ تراشی میں شب مجھے — جانا ہے بزمِ یار میں کل بے طلب مجھے

کہتے ہیں،

اری ہر بات دلنشیں ہے، کسی طرح کا گلہ نہیں ہے

جو داد دیجے تو آفریں ہے، جو ظلم کیجے تو مرحبا ہے

لے ہم بھی جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن — خوش آتی ہیں باتیں بنانی کسی کی

پھر رہا ہے وہ آج کچھ خوش خوش — تونے ناظم سے کیا کہا ہوگا ؟

لی | " اس کی ستم رانیوں اور جفا کاریوں کا جواب خود دیتے ہیں۔ جب ہم نشیں نہیں ملتا،
روو غم گسار نہیں ملتا، تو اپنے دل میں خود توجیہیں اور تاویلیں کرتے ہیں، اور دل کو مطمئن
تے ہیں۔ یہ توجیہہ وتاویل بھی اپنے اندر حسرت و الم کا نہایت ممتاز رنگ رکھتی ہے۔

خوبیٔ قسمت سے خبر ملی کہ وہ کشورِ دل کا خسرو بصد شان کجکلاہی آرہا ہے، دل بانسوں
اچھلنے لگا، ہوش وحواس رخصت ہوگئے، قوتِ فہم وفکر زائل ہوگئی، اور مبہوت سے ہوکر رہ گئے،
اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں کہ اس قدر اضطراب کی کیا بات ہے،

ے گھر وہ آئے ناظم تو یہ اضطراب کیا ہے — کوئی بادشاہ آیا کوئی شہریار آیا ؟

یہ مانا کہ نالہ نارسا ہے، آہ بے اثر ہے، لیکن

ناظم تم ان سے روز کہے جاؤ حالِ دل — کب تک نہ دیں گے ازرہِ شرم وحیا جواب

غلط سہی اثر آہ و نالہ پر ناظمؔ یہ ہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اچھا ہوا کہ موسم گل میں ہوئے اسیر چھوڑا ہے ہم نے باغ کو برگ و نوا کے ساتھ
رد و قبول خلق سے ناظمؔ غرض نہ رکھ اچھا ہے گر معاملہ تیرا خدا کے ساتھ

لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

خوف اثر تو نالہ سے ہے گو اثر نہیں سنتے ہیں ہم کہ ان کو ہمارا خیال ہے

شکوہ | زبان کبھی کبھی حرف شکایت سے بھی آشنا ہو جاتی ہے، لیکن نہایت بے کسانہ لب لہجے میں،

میں تو اٹھنے ہی کو تھا بزم سے کیا ہو جاتا جام مے غیر کو دیتے تم اگر میرے بعد

شکوہ بطور طنز

میری وفا کی داد نہ جرم عدو سے بحث کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو، مجھ سے کیوں پوچھو
کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیوں کر گزرتے

طنز | بایں دعوائے الفت و محبت، محبوب پر کبھی کبھی "چوٹ" بھی کر جاتے ہیں،

ان کو خیال تھا کہ نہیں گے خبر کبھی اور اچھا ہوا مریض محبت، برا ہ

خدا کا خوف ہو تو دل کی بیتابی پہ رحم آئے وگرنہ رقص مرغ نیم بسمل بھی تماشا۔

ی درد دل کا بیاں اُٹھ کھڑے ہوئے   یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا
ں بیٹھے ہو بزم میں آنے سے غیر کے   یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ناظم خفا گیا

آپ تو

ے پوچھنے مرے آنسو کدھر چلے   گھبرا گئے تراوش خون جگر سے آپ ؟

م فریب و تمنائے صلح جھوٹ   صحبت بگڑ گئی تو بناتے ہیں اب مجھے

باتیں | ناظم چونکہ ایک تجربے کار عاشق ہیں، راہ محبت کے گرم و سرد سے واقف ہیں،
ئے اس معاملے پر جو بات کہتے ہیں وہ اس شان سے کہ

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

ے امتحان وفا میں سزا ہنوز   ناظم اگرچہ تجربہ سو بار ہو چکا

دفائے وعدہ کی امید ہے کسے   مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا

ے معلوم کرنے کے لئے غم خوار ہیں   عاشق زار اس کے ہیں کہنے کو میرے یار ہیں
ہ دردیوں کو غلط کہتے ہو ناظم سادہ دل   ان کو بھولا کون کہتا ہے بڑے ہشیار ہیں

وہ تقریب فراق اور یہ تمہید وصال   وصل سے لطف سوا نامۂ و پیغام میں ہے

ہاڑ | ناظم ایک شوخ و شنگ طبیعت کے مالک ہیں، عشق و محبت میں یکسر بلکہ تمام تر فتادگی
ُش سے کام لینا پڑتا ہے، خوش طبعی اور پر لطف سخن آرائیاں اور زیادہ باعث کلفت

ہوتی ہیں، لیکن ناظم اس غم والم کی فراوانی کے باوجود کبھی کبھی ہنس کھ بھی نظر آتے ہیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ محبوب پر بھی کبھی کوئی فقرہ کس دیتے ہیں، کبھی کسی اور انداز سے لے چھیڑتے ہیں، غرض اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی نہ کوئی موقع نکال ہی لیتے ہیں، فرماتے ہیں،

دوست چپ بیٹھا ہے آخر شکوۂ بیجا کریں　　　اس بہانے سے وہ گرم گفتگو ہو جائے گا

دیکھیں اب منع کریگا ہمیں کیوں کر درباں　　　طرح سے خانہ پڑی ہے دردلدار کے پاس

اپنے مقصد کے لئے تو بھی مگر لائے رجوع　　　کاش مجذوب کہیں سب ترے دیوانے کو

تکلف کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو　　　طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھ کر ہو

رہا ناظم کوئی دن اور زندہ　　　ترے ناوک نے سنتا ہوں خطا کی

ناظم کبھی نہ کوچے میں تیرے قدم رکھے　　　بیچارہ کیا کرے کہ یہی رہ گزار ہے

کیوں چھپاتا ہے حال رنجش غیر　　　ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے

دیکھیو تو کہ وہ غصہ میں کیا کرتے ہیں ناظم　　　کیوں ان سے کبھی شکوۂ بے جا نہیں کرتے

شوخی | شعرا کا ایک اہم موضوع رندی و سرمستی، شوخی و بذلہ سنجی اور واعظ و ناصح کے ساتھ جنگ و جدل ہے۔ بلا استثنا ہر شاعر نے بقدر زور طبیعت واعظ و ناصح کی پگڑی اچھالی ہے، آوازے کسے ہیں اور ان بے چاروں کو ہر طرح آماجگاہ زور طبع بنایا ہے۔ ناظم بھی کسی سے

پیچھے نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنی رندی و سرمستی کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، انھیں بھی جب واعظ یا ناصح سے پالا پڑتا ہے تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے وہ فقرے کستے ہیں کہ شاید ناصح صاحب اور واعظ صاحب بھی ہنسے بغیر نہ رہتے ہوں۔ لیکن اس کا خیال رکھا ہے کہ ابتذال و سوقیت کی گرد اپنے دامن کو ہوا کبھی نہیں لگنے دی، حالانکہ اس میدان میں "بڑے بڑے شعرا" سے "بڑی بڑی" لغزشیں ہو چکی ہیں۔ درحقیقت یہ وادی بھی ہے بہت خارزار۔ ابتذال و شوخی میں بہت کم فرق ہے، یوں تو شوخی نہایت پسندیدہ چیز ہے لیکن ذرا ابتذال کا رنگ آیا کہ شعر نظر سے گرا، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شاعر نظر سے گرا۔

لیکن ناظم نے سنجیدگی اور ظرافت کو ساتھ ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، مثلاً

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا تبلاؤں
میں نے مے خانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

کل محتسب نے گھر کی تلاشی تو کیا ہوا
نکلا سبوئے کہنہ میں سرکہ بھرا ہوا

عزم حجاز حضرت ناظم سے تھا بعید
سنتا ہوں راہ میں سے پھر آئے بھلا ہوا

زاہد کو کیوں شراب کا یارب مزا پڑا
رسوائے شہر و کوچہ و بازار ہو گیا

مسکیں کا لین دین نہ تھا مے فروش سے
آخر گدائے خانۂ خمّار ہو گیا

معتقد ہوں کعبہ کا ناظم گر یہ واں جا کر مجھے
عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہو گیا

حرمت مے میں سنا کیجئے واعظ کا بیاں
بحث ناداں سے کیوں کیجئے دانا ہو کر

معقول سہی وجد کا حیلہ مگر اے شیخ — اچھا نہیں با ایں ہمہ تمکین وحیا رقص

معرفت عالم و عابد کو کہاں ہے ناظم — بس یہ اتنے ہیں کہ اوراد و مسائل جانیں

اس بت کا کوچہ مسجد جامع نہیں ہے شیخ — اٹھیے اور اپنا یاں سے مصلا اٹھائیے

پڑھتا ہے شراب پی کے لاحول — ناظم رندوں میں پارسا ہے

محروم کیوں رہیں گے شراب طہور سے — آخر خدا کے بندے ہیں ہم بادہ خوار بھی

آج ساقی یار کے گھر دعوت اغیار ہے — کیا مزا ہو گر خم مے میں نمک داں چھوڑ دے

حقائق | ناظم صرف ایک عاشق ناکام ہی نہیں ہیں کہ جن کا صحیفۂ زندگی عشق ومحبت کی داستانوں، ہوا و ہوس کی حکایتوں، اور رندی و سرمستی کے ولولوں سے لبریز ہو، بلکہ وہ صحیح معنوں میں ایک "شاعر" ہیں۔ ان کی نظر فطرت کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے اور وہ وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو ایک مفکر دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ حقائق و معارف، اسرار و نکات، اور حکمت و موعظت پر کچھ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ایک نکتہ رس اور دقیقہ سنج فلسفی ہے جو رموز فطرت کی گرہ کشائی کر رہا ہے۔ اس موضوع پر جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی حیثیت بالکل بدلجاتی ہے۔

مثلاً منصور و نعرۂ منصور پر تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے اور جس کی رسائی فکر جہاں تک ہو سکتی تھی وہاں تک اس نے اپنے خیالات اپنے اسلوب میں ظاہر کئے ہیں لیکن ناظم نے اس مسئلہ پر جو بات کہی ہے وہ نہ صرف اپنے انداز بیان، اور اسلوب ادا کے اعتبار سے بہت خوب ہے بلکہ نفس مسئلہ پر انھوں نے اپنی جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ان کی دقت نظر پر شاہد

ہے۔ کہتے ہیں،

اے نواسنج انا الحق ترا دعوے سچ ہے ۔۔۔ لیک دستور نہیں قطرہ کو دریا کہنا

اس موقع پر مجھے اکبر الہ آبادی کا بھی ایک شعر یاد آگیا۔ انھوں نے بھی بہت معقول بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں،

حضرتِ منصور "انا" بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں جو اتنا ہوش ہے

اکبر صاحب کہتے ہیں کہ منصور "حق" کے ساتھ "انا" بھی کہہ رہے ہیں جب ان میں اتنا ہوش ہے کہ "انانیت" اب تک باقی ہے تو وہ مستحق دار ہیں۔ یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے جس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں اور اتنا واصل بالحق ہو چکا ہو کہ وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ میں اس حقیقت سے مل گیا لیکن جو شخص اس منزل پر پہنچ جائے گا وہ "من و تو" کے امتیاز سے بیگانہ ہو جائے گا اور آپ جب ابھی اس منزل میں ہیں کہ آپ کو "انا" کا احساس ہے تو آپ دار تک تکلیف کیجئے۔

ناظم کہتے ہیں "انا الحق" کا دعوے صحیح ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ قطرہ کو دریا کہنا کب مناسب ہے۔ تمہاری حیثیت تو ایک قطرے کی ہے اور وہ "حقیقت" ایک بحر بے کراں، تو ایک قطرے کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ دریا میں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تم اپنی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔

اکبر و ناظم کی فکر کا یہ لطیف فرق ارباب نظر کے لئے یقیناً باعث لطف ہوگا۔ دوسری حقیقت ملاحظہ ہو،

یوں تو ہو جاتا ہے ہر اک عیش و عشرت کا شریک ۔۔۔ دوست کہتے ہیں اسے جو ہو مصیبت کا شریک

کون ہوگا کہ نہ ہو معتقد فصل بہار ۔۔۔ موسم اچھا ہے پہ کہئے کہ یہ موسم کب تک

جو خود برے ہیں کیوں مجھے اچھا کہیں گے وہ　　آئینہ کو فروغ نہیں زنگبار میں

تم اپنی چال سے بدنام ہو گئے ناظم　　یہ اہل صومعہ چھپ چھپ کے کیا نہیں کرتے

ہم تو پروانے کے قائل ہیں کہ چپکا جل جائے　　بلبل نغمہ سرا عاشق غوغائی ہے

عیش و سرمستی اوپر کہا جا چکا ہے کہ ناظم کی زندگی کا ماحول عیش و عشرت تھا، چنگ و رباب تھا، ساغر و مینا تھا لیکن اپنے اس ماحول سے بغاوت کرکے انھوں نے اپنی زندگی کے لئے ایک نئی "شاہراہ" نکالی تھی جو وادی نجد میں جا کر ختم ہوتی تھی، لیکن پھر بھی وہ زندگی جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی کبھی کبھی ان کے سامنے "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت بھی دیدیتی ہے اور وہ بعض بعض مواقع پر ان جذبات عیش و مسرت کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے، نمونہ:

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظم　　کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

مجلس اہل ورع نور کا دریا ہی سہی　　دل لگی صحبت رنداں مے آشام میں ہے

تسبیح و ورد و دلق و مصلے نہیں پسند　　چنگ و رباب و ساغر و مینا پسند ہے

قدرت تشبیہ تشبیہ و استعارے کو صحیح طور سے استعمال کرنا بھی ایک کمال ہے، بڑے بڑے شعرا نے اس میدان میں ٹھوکریں کھائی ہیں مثلاً آپ نے یہ زبان زد خاص و عام مصرعہ ضرور سنا ہوگا

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

لیکن اس کا پہلا مصرعہ سنیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تشبیہ و استعارے کو "استادوں" نے کس کس طرح استعمال کیا ہے،

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی　　جو بات کی...... الخ

ن ناظم پامال تشبیہ میں بھی ایک خاص بات پیدا کر دیتے ہیں،

، وہ ایسا ہی سہی پر ہے تنزل درپیش   بد شگونی ہے جو تجھ کو مہ کامل سمجھیں

د | ناظم کے کلام کا تمام و کمال مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے ار بھی ہیں جو غالب سے یا بعض اور شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ہیں۔ اب یہ آپ کی خوش فہمی صر ہے خواہ آپ اسے سرقہ سمجھیں، توارد سمجھیں، سینہ زوری سمجھیں، جو چاہیں سمجھیں لیکن یہ واقعہ ، کہ ان کے بعض اشعار دوسرے شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ضرور ہیں۔

ناظم کا شعر ہے،

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو   حال اپنا سنا دیا میں نے

اسی مفہوم کا ایک مشہور شعر یہ بھی ہے،

سناتے ہیں انھیں افسانۂ قیس   بہانے ہیں یہ عرض مدعا کے

ظم :۔ الفت بری بلا ہے کہ ناظم بایں تمیز + کرنی پڑی رقیب کی بھی التجا مجھے

من :۔ اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل + میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ظم :۔ لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی + سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

الب :۔ اشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف + عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ظم :۔ کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی + دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی

الب :۔ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے + تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

ناظم :۔ بار محفل میں نہ ملتا تھا کسی دن اور اب + روز دو چار گھڑی رہتی ہے خلوت مجھ سے

یر :۔ کئی بار آنا ادھر لطف سے + عطا پر عطا ہے کرم پر کرم

ناظم :۔ ملے گی محشر میں داد ہم کو بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو + ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کریں گے

غالب :۔ واے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو + اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائیگا

ناظم :۔ عاشق ہوا اس آفت جاں پر مرا ندیم + جب خوب میرا محرم اسرار ہو چکا

غالب:۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا • ہوگیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ایہام گوئی: ایہام گوئی یا رعایت لفظی کا اگر موقع سے استعمال کیا جائے تو لطف کلام دوبالا ہو جاتا ہے، لیکن آپ قدیم شعرا کے دواوین اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر شاعر نے اس "صنعت لطیف" سے اپنے کلام کو زینت دینا چاہی ہے۔ لیکن جب اس قسم کے اشعار کا استقصا کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ۹۵ فی صدی اشعار نہایت مہمل طور سے خراب ہو کے رہ گئے ہیں۔ ایک زمانے میں تو شاعری' رعایت لفظی' ضلع جگت اور پھکڑ بازی میں منحصر ہو کے رہ گئی تھی' لیکن اس دور نامسعود سے پیشتر اور بعد بھی جب شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر بالکل ناکام رہے اور جو معدودے چند کامیاب ہوئے وہ بھی صرف کسی حد تک' ورنہ ۹۵ فی صدی ان کے اشعار بھی

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں۔

لیکن ناظم اس معاملے میں فرد فرید ہیں۔ میں نے ان کے پورے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور اس موضوع پر ان کے جو اشعار میں نے جمع کئے ان میں عیب تلاش کئے لیکن اس کا اعتراف ہے کہ کم از کم میری نظر میں کوئی شعر نہیں کھٹکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ رعایت لفظی جیسی صنعت میں کسی شاعر نے سیکڑوں اشعار رکھے ہوں اور ایک بھی ایسا نہ ملے جو مہمل کہا جا سکے یا جس سے لطف زبان میں ذرا بھی رکاوٹ نہ پیدا ہوتی ہو۔ نمونتہً چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ الفاظ خط کشیدہ ہیں جن سے اس صنعت کو ظاہر کیا گیا ہے:۔

کیوں آئے ہو تربت پہ مری ساتھ عدو کے   میں مردہ ہوں مردہ کو جلانا نہیں اچھا

ناظم نہ رکھ اس آہوئے وحشی سے چشم لطف   جس میں نہیں ہے انس وہ انسان ہی نہیں

تھی نویدِ حق چشم و طالع کو مل گئی ہے دخل کس کو بخشش پروردگار میں

تم بھی بن جاؤ گے لیلیٰ کی نظیر نہ کہو قیس کا ہمسر مجھ کو

رخصتِ عرضِ حال کیا مانگوں کہہ نہ بیٹھیں کہیں کہ "رخصت ہو"

بیوفائی کا داغ کیسا ہے ہم نے مانا کہ ماہ طلعت ہو

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

وہ اُٹھے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر اور میں سمجھا کہ اُٹھتے ہیں مری تعظیم کو

تکلف کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو طریقِ ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھکر ہو

پھوٹی دیکھی جو صراحی مے کی میں نے جانا مری قسمت ہو گی

اس کو یوں خاک پہ لے محتسبِ شرع نہ پھینک حرمتِ بادہ بہت مشربِ اسلام میں ہے

بہت کہنے سے آجاتی ہے ضد انسان کو ناظم نہ کر تکرار ان سے گو مزا تکرار میں آئے

مردہ زندوں کو تری آن سے ہم دیکھتے ہیں زندہ مردوں کو تری تان سے ہم دیکھتے ہیں

خط مرا پڑھ کے تمھیں رحم تو آیا لیکن ٭ یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

متفرق اشعار: ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر شعر کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ضرور موجود ہے لیکن چونکہ منتخب اشعار کی تعداد کم ہے اس لئے کسی مخصوص عنوان کے ساتھ دو ایک شعر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ بہر حال وہ اشعار یہ ہیں:-

تم کرو ترک جفا کیا امکاں ہم کریں ترک وفا کیا باعث؟

کیا اس نے قتل اور میں نے معاف عبث اہل شہر اس کا چرچا کریں

خدا کو دینی ہے جان ہمدم، نہیں ہے مرنے کا مجھ کو کچھ غم
یہی ہے رونا کہ میں نہ ہوں گا تو پھر وہ کس پر جفا کرینگے

ڈرتے ہیں محتسب سے بھلا آئے تو سہی ابھی کہی کہ ساغر و مینا اٹھا۔

کرتے ہیں عبث غرور کیا آپ؟ ہیں کوئی جناب کبریا آپ؟

کل جو کچھ دل کی بیقراری کا تذکرہ ان سے ایک بار ہوا
ہنس کے کہنے لگے کہ کیوں صاحب دل کہاں تھا کہ بیقرار ہوا
اس میں وہ کیا کرشمہ ہے ناظم جس سے پھر تو امیدوار ہوا

وعدے نے ترے زیست کی توقیر بڑھائی مرتے ہیں یہ مرنے کی تمنا نہیں کر

ہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلم   پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

شعراسے کہتے ہیں کیا کتنا ہے ناظم واہ وا   اس غزل کو سن کے میں قائل تمہارا ہو گیا

خضر ہے وادیٔ محبت کا   کیوں نہ ناظم کے ہم قدم ہوں میں

چند اور اشعار | ناظم کی وہ مشہور نظم جو "میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط" سے شروع ہوتی ہے اور وہ غزل جس کا آغاز "وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے" سے ہوتا ہے طوالت کے خیال سے قصداً نظر انداز کردیں اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں بہت مشہور ہیں۔ یہاں یہ ضرورت نہیں تھی کہ ان کا مشہور کلام پیش کیا جائے۔ اس صحبت کا مقصد تو صرف غیر معروف اشعار کی رونمائی تھی اور بس۔

ختم کلام | کلام ناظم پر غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کی گئی تھی اور کلام ناظم کا انتخاب کیا گیا تھا وہ آپ کے سامنے پیش ہے۔

آخر میں جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں یہ اور عرض کروں گا کہ ناظم کے کلام اور غالب کے دیوان کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ناظم نے اگرچہ غالب سے استفادہ کیا لیکن ان کا رنگ طبیعت، رنگ شاعری اور طرز اسلوب غالب سے بالکل جدا ہے اور یہ فرق صرف زبان و بیان ہی میں نمایاں نہیں ہے بلکہ فکر و خیال میں بھی ایسا ہی اہم فرق نظر آتا ہے جیسا زبان و بیان میں دونوں کا رنگ ایک مستقل چیز ہے۔

غالب ایک فلسفی ہے، ایک خود دار عاشق ہے، ایک گدائے متکبر ہے، فارسی ترکیبیں اطلاق و پیچیدگی کے ساتھ اس کے کلام کا اہم جزو ہیں۔ اس کی رسائی فکر وہاں تک ہے جہاں تک ہر کہ و مہ پہنچ نہیں سکتا۔

برعکس اس کے ناظم ایک شاعر ہے، ایک سپر انگندہ عاشق ہے، ایک دل زدہ مظلوم ہے، ایک پیکر ترحم، ایک مجسمۂ حسرت ہے۔ اس کے ہاں نیائش و فتادگی ہے، جاں نثاری و جاں سپاری ہے، اور کبھی کبھی نغمۂ شادی ہے جو دیکھتے دیکھتے نوحۂ غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بس ان دونوں کا فرق صرف اسی قدر ہے کہ غالب اپنی "صریر خامہ" کو "نوائے سروش" سمجھتا ہے اور یہ بے چارہ "رخصت عرض حال" ہی کرتا رہ جاتا ہے۔

غزل

از حضرت اصغر گونڈوی

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنج اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بہار سبزہ و گل ہے، کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دنیا، میکدہ آباد ہوتا ہے

یہ سب ناآشنائے لذت پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں؟ اس چمن کا یا خزاں سمجھوں؟
زبان برگ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدۂ دل میں
یہ نظارہ ہے؟ یا ذوق نظر برباد ہوتا ہے!

قفس کی تیلیوں پر شاخ گل کا رنگ ہے اب تک
چمن سے چھٹنے والے کو چمن تو یاد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شور و شیون کا
یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

مگر کوتاہیِ ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغر
اب اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

بدچلن بیوی

ہم چائے خانے میں بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ بات میں بات نکل آتی ہے۔ کسی نے ان بھلکڑوں کا تذکرہ چھیڑ دیا جو اور باتیں تو ایک طرف خود اپنے ذاتی معاملات کو خواہ وہ کیسے ہی اہم کیوں نہ ہوں اس طرح بھول بیٹھتے ہیں کہ سن کر نہ صرف تعجب معلوم ہوتا ہے بلکہ بالکل یقین نہیں آتا۔ پھر کیا تھا ہر ایک نے اپنا اپنا تجربہ بیان کیا۔ سنی ہوئی مزے دار کہانیاں دہرائیں دیکھے ہوئے قصے سنائے۔

ان قصوں اور کہانیوں کی ایک عام خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ہیرو صرف یونیورسٹی کے پروفیسر، مشہور فلسفی اور سائنس داں ہی تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ علمی مسائل اور نظریوں پر غور و فکر کرنے کی عادت انھیں اپنے ماحول سے بالکل بے خبر کر دیتی ہے۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہماری نظریں بے اختیار پروفیسر عبدالکریم کی طرف اٹھیں۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ وہ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ہیں لہٰذا ہمیں امید تھی کہ اس خصوص میں جناب کے واقعات نہایت ہی دلچسپ ہوں گے۔

لیکن امین بیگ جو اتفاق سے ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا بڑا مسخرہ تھا اس نے پروفیسر صاحب پر دیدے لگا دئے اور لگا انھیں سر سے پیر تک گھورنے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عجیب الخلقت مخلوق کا نہایت ہی غور و خوض اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہے۔

پروفیسر صاحب ان تمسخر آمیز نظروں سے بہت گھبرا گئے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا۔ امین بیگ سے پوچھا "کیوں بھئی کیا بات ہے جو اس طرح گھور رہے ہو؟ مجھے دنیا کی کوئی نئی مخلوق تو نہیں سمجھ رکھا ہے جو اس طرح سر سے پیر تک کا جائزہ لیتے ہو؟ میرے سر پر دو سینگ تو نہیں ہیں؟"

امین نے جھٹ سے جواب دیا "نہیں جناب مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی۔ میں تو دیکھ

رہا تھا کہ کہیں آپ اپنی نکٹائی، کالر، بوٹ یا اور کوئی چیز تو نہیں بھول گئے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے سوٹ میں کسی قسم کی کمی نہیں۔ لہذا مجھے آپ کے تبحر علمی پر شک ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ ایسے ہی بڑے علامہ ہوتے جیسا کہ عام طور پر سمجھے جاتے ہیں تو آپ کی بھول کا کچھ نہ کچھ ثبوت ضرور ملتا۔

یہ سن کر پروفیسر صاحب مسکرائے اور فرمایا " اور تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ مجھے بھولنے کی عادت نہیں ہے ؟" پھر اپنا قصہ یوں بیان کرنے لگے۔

انسان پر بعض ایسے کڑے دن آتے ہیں کہ کسی طرح نہیں بھولتے۔ مجھ پر بھی یہی واردات گذری۔ ایک دن میں سویرے اٹھا۔ اس وقت مجھے کسی قسم کا رنج و ملال نہیں تھا، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس دن کے ختم ہونے سے پہلے مجھ پر ایسا صدمہ پڑے گا جس سے میرے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہو جائیں گی۔

میں نے ناشتہ کیا اور صبح کی ڈاک دیکھنے بیٹھا۔ اس میں مجھے ایک خط ملا جس کے بھیجنے والا کو میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے لفافے پر بہت غور کیا لیکن پھر بھی مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ لکھنے والا کون ہے۔ ڈاک تو مقامی ہی تھی لیکن خط اتنا برا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔

پھر میں نے اس کو کھولا اور کھول کر پڑھا ہی تھا کہ دم بخود رہ گیا۔ میرے حواس بگڑ گئے، دم چڑھنے لگا اور عقل غائب غلہ ہو گئی۔ غصہ کے مارے تھرانے لگا۔

خط کا مضمون یہ تھا :

" پیارے استاد،

مجھے یہ کہتے ہوئے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ آپ کی بیوی آپ سے بیوفائی کرتی ہے اور ایک شخص سے جس کا نام حسین بیگ ہے ناجائز تعلقات رکھتی ہے۔ شاید وہ آپ کا ملاقاتی بھی ہے۔ ان دونوں کے تعلقات قدیم ہیں اور گہرے ہیں۔ ان کی ملاقاتیں طاؤ نہ ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہیں۔ آپ کو کیا خبر کہ لوگ آپ پر ہنستے اور آپ پر ٹھٹھا اڑاتے ہیں۔ آپ تو ہمیشہ اپنے نظریات اور مباحث میں منہمک رہتے ہیں اور آپ کی عزت و آبرو ہے کہ بچے بچے کی زبان پر مسخرہ بنی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو

میری بات کا یقین نہیں ہوتا ہے تو آج دن کے گیارہ بجے "دلفروز باغ" جائیے اور عاشق و معشوق کو اپنی مجرمانہ غفلت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھئے۔"

'میری بیوی اور بدچلن'

اس کے دوسرے شخص سے ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ ملتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت لوگوں کو معلوم ہے اور مجھے نہیں۔ ہائے یہ بدقسمتی وائے یہ بدنصیبی!

اس دل دہلا دینے والے لمحے میں میرے سامنے خون کی ندیاں بہنے لگیں قتل و خونریزی وداروگیر اور کشت و خون کا سماں بندھ گیا۔ ہر قسم کی سزا کا خیال جو اور لوگ کر سکیں اور جو مجھے آ سکتا تھا آیا اور میں غصے سے تھرانے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس عزت ریزی کا مجھے ضرور ہی انتقام لینا چاہیئے۔ اس غدار، مکار اور بے وفا عورت کو ضرور ہی قتل کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ اس کے بدمعاش عاشق کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہیئے چاہے اس میں مجھے پھانسی پر ہی لٹکنا کیوں نہ پڑے۔

اتنے میں گھڑی نے دس بجائے اور اب ان بدمعاش عاشق و معشوق کی رذیل حرکات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے مجھے ایک ہی گھنٹہ رہ گیا تھا۔

فوراً میں اپنے کتبخانہ والے کمرے میں گیا۔ اپنا طپنچہ نکالا اور اس میں گولیاں بھر لیں۔ دنیا میری آنکھوں میں اندھیری ہو گئی۔ اب مجھے انسان کا خون بہانا بالکل آسان سی شئے نظر آنے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ایک مہذب اور شریف انسان کس طرح خون کرنے پر آمادہ ہوتا ہے اور تمام مظاہر انسانیت سے عاری ہو کر ایک خونخوار درندے کی طرح کیوں کر انسانی خون سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

لیکن اسی وقت مجھے ایک اور خیال پیدا ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خط بھی اسی مکارہ نے لکھا ہو تاکہ اس بہانے سے مجھے گھر سے چلا کے اپنے عاشق کو بلائے اور مزے اڑائے۔

'ہاں ہاں یہی ہے بیشک یہی ہے!'

یہ خط اسی کا بھیجا ہوا ہے کہ میں "دلفروز باغ" جا کے حیران و سرگرداں پھر تا رہوں اور وہ اپنے عاشق کے ساتھ خالی گھر میں گلچھرے اڑائے۔

لیکن وہ ایسا کیوں سمجھنے لگی کہ میں اس پر شک یا گمان کر رہا ہوں۔ کیوں وہ چپ رہ کر بھی اپنے آپ کو میرے شک و شبہ کا نشانہ بناتی؟

نہیں یہ خط میرے کسی مخلص دوست ہی نے لکھا ہے تاکہ میری آنکھیں کھلیں اور میں اپنی عزت ریزی کا بدلہ لوں۔

آخر شش میں نے جانے کا عصم ارادہ کر لیا اور کپڑے پہن لئے۔ لیکن غصہ و غضب سے میں کانپ رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ میں اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔

میں نے کپڑے پہن لئے۔ سر پہ ٹوپی رکھی اور نکلنے کا ارادہ کیا اور اس وقت ....

اور صرف اس وقت جبکہ میں کامل ایک گھنٹہ غم والم، یاس و نا امیدی اور غصہ و غضب کے دریا میں غوطے لگا چکا۔

اس وقت مجھے یاد آیا اور تب تک میں بھولا ہوا تھا کہ "ابھی میری شادی نہیں ہوئی"۔

تنقید و تبصرہ

کتب

تجلیات فرخ۔ مثنوی حسن فطرت۔ روح ظرافت۔ حفظ العلوم۔ میکدہ۔ احقاق حق۔ التجائے انوری۔ مغتنمات المعروف بہ خزینۂ صنعت۔ اسلامی نظام تعلیم۔ فضائل رمضان۔

تجلیات فرخ | مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ تجلیات فرخ کے نام سے فرخ بنارسی کا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے تقطیع چھبی۔ کاغذ سفید معمولی ہے۔ علاوہ نظموں۔ غزلوں اور رباعیات کے ایک تبصرہ اور ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔ تبصرہ مولانا رضی احمد صاحب رضی بدایونی اور مقدمہ جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے پروفیسر علی گڈھ نے لکھا ہے تبصرہ میں شاعرانہ نظر سے اور مقدمہ میں ناقدانہ حیثیت سے جناب فرخ کے کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس کی خوبیوں کو مثالیں دیکر پیش کیا ہے

جناب فرخ کے کلام میں علاوہ غزلیات کے نظموں اور رباعیوں کی معقول تعداد ہے اور ایک قصیدہ تقریب ولادت حضرت علی علیہ السلام خاص طور پر قابل ذکر ہے

پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا مقدمہ زبان اردو کی تاریخ اور اس کے دور ارتقائی سے بھی بحث کرتا ہے اور اس موقعہ پر وہ فرماتے ہیں کہ "یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ موجودہ تغزل پہلے کی نسبت واقعیت و اثر کے زیادہ قریب آگیا ہے" اسی بات کو دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے کہ "یہ دور در حقیقت حقایق پرستی کا دور ہے"۔ اور مزید تفصیل کے لئے فرماتے ہیں کہ "دور حال کے متغزلین کے خیالات درد مند دل اور وفا پرست روح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ از دل می خیزد بر دل می ریزد ...."

زبان و شعر میں جس قدر انقلاب گذشتہ پچاس سال میں ہوئے وہ اہل ذوق کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن زمانہ حال کے غزل گو شعراء کو۔ ان "صفات" سے یکسر بیگانہ قرار دینا جو قدماء کی خصوصیات سمجھی جاتی

تھیں اب بھی دشوار ہے اور گو یہ بحث جداگانہ ہے کہ وہ صفات بجائے خود اچھی تھیں یا بُری، ادب و شعر کے لئے ان کا وجود زینت و زیور تھا۔ یا ایک بدنما داغ، لیکن محض یہ واقعہ کہ ہمارے شعراء حال بھی تشبیہہ واستعارہ زبان و بیان میں انہیں اصولوں کے پابند ہیں بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ جسقدر عظیم الشان انقلاب کا رونما ہونا ظاہر کیا جاتا ہے وہ غالبًا مبالغہ شاعرانہ کے حدود میں داخل ہے۔

جناب فرخ کے کلام میں لطف زبان بھی ہے اور لطف بیان بھی۔ مضامین میں پستی و قدامت پسندی نہیں تخیل بلند ہے اور بالعموم غزل اچھی ہے بعض اشعار نہایت عمدہ ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں ان سے انتخاب منظور نہیں ہے

فرخ اجل نے کھول دئے عقدہائے زیست
تھا انکشاف حاصل اخفائے راز کا

... ...

پھر گئی چاک گریبان کی نگاہوں میں بہار
جلوۂ گل کس قدر فرخ جنوں انگیز تھا

... ...

بقدر ذوق سجود آستاں نہیں ملتا
زمیں ملے تو ملے آسماں نہیں ملتا

... ...

جرس کی آتی ہے کانوں میں دور سے آواز
تلاش میں ہوں مگر کارواں نہیں ملتا

... ...

کتاب بحیثیت مجموعی دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے قیمت عصر اور علی ہادی صاحب فرزند مصنف محلہ انصار اناؤ سے مل سکتی ہے۔

مثنوی حسن فطرت | مصنفہ جناب منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت مرحوم گورکھپوری مطبوعہ ایوان اشاعت

گورکھپور ۔

ملک کے نوجوان اہل قلم جناب مجنوں گورکھپوری کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں یہیں مثنوی حسن فطرت حاصل ہوئی ہے جو کئی حیثیتوں سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے ۔ چمکدار دبیز سفید کاغذ پر ۔ جیبی تقطیع اور عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے جناب مجنوں کا مقدمہ مثنوی کی خصوصیات پر ایک جامع مضمون ہے ۔ منشی گورکھ پرشاد صاحب گورکھپور کے ممتاز وکیل تھے ۔ ادب وزبان کا ذوق رکھتے تھے اور شعر سے خاص مناسبت تھی ان کا زمانہ حالی وآزاد کا زمانہ تھا تعلیم نے اس اثر کو اور پھیلا دیا چنانچہ مثنوی لکھی تو قدیم طرز کو چھوڑ کر تمثالیہ صورت اختیار کی اور حسن ۔ دل ۔ روح کی ایک دنیا بنالی اور انھیں کو قصہ کے افراد قرار دے کر ایک فسانہ بنا دیا

مثنوی کی بحر بھی جداگانہ ہے زبان نہایت صاف اور محاورات کا برمحل صرف پرلطف ہے

ہر ایک فتنہ کو دم دے کے وہ سلاتا ہے
وہ اپنی گوں پہ ہر اک شخص کو لگاتا ہے

... ...

مری نگاہوں میں تاریک سب خدائی ہے
جگر کی چوٹ ہے فرزند کی جدائی ہے

لیکن اس جدت طرازی سے قصہ کا لطف نہایت کم ہوگیا ۔ شاعرانہ حیثیت سے اس امر پر تنقید کرنا دشوار ہے اس لئے اس جدت طرازی نے اس کو قدیم طرز کی مثنویوں سے بالکل جداگانہ حیثیت دیدی ہے کتاب کی طباعت نہایت دیدہ زیب اور کاغذ قیمتی اور خوبصورت ہے ۱۲ر قیمت پر ایوان اشاعت گورکھپور سے حاصل ہوسکتی ہے

روح ظرافت | مرزا عظیم بیگ چغتائی ایم اے ایل ایل بی وکیل جودھپور اپنی ظرافت نگاری اور رسائل نوازی کے باعث مشہور اہل قلم ہیں ۔ آپ کی ظرافت کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وہ ہر قصہ اور ہر بات میں اس طرح چمک اٹھتی ہے کہ کثیر التعداد اردو قصے پڑھنے والے اس سے لطف اٹھاتے ہیں

کالج اور نوجوان طلبہ کے مذاق کی خصوصیت سے رعایت رکھتے ہیں. کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ اور بیان کا لطف کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا البتہ قصہ کی حیثیت سے نیز زبان اور ظریفانہ طرز کے اعتبار سے ان افسانوں میں ترقی کی بہت گنجائش ہے

حفظ العلوم | یہ کتاب اردو انسائکلو پیڈیا ہے جو پانچ پانچ سو صفحات کی ڈھائی سو جلدوں پر مشتمل ہو گی۔ اس کو میاں حفظ الرحمن صاحب برادر زادہ حاجی مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے نہایت کوشش اور صرف سے مرتب کرایا ہے اس کے اکثر حصے تیار ہو چکے ہیں اور علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی تحریک خاکساران کو دیدئے گئے ہیں علامہ موصوف ان جلدوں کو شائع کرانا چاہتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ اس کی پہلی جلد شائع ہو جائے جس کے لئے یا تو علم دوست حضرات بطور قرضہ کے تھوڑی تھوڑی رقم دیدیں. جو بعد فروخت کے واپس کر دی جائیگی یا پیشگی خریداری کی قیمت ادا کر دیں جس سے کتاب شائع کی جا سکے. پہلی جلد شائع ہو جانے کے بعد ملک اس کی ضرورت معلوم کرے گا اور پھر اللہ نے چاہا تو بقیہ جلدیں تجارتی طریقہ سے شائع ہوتی رہیں گی۔

آج دنیا کی متمدن اقوام کا ذکر چھوڑیئے. خود اسی ہندوستان میں بنگالی. گجراتی. مرہٹی. ہندی اور تامل زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا موجود ہیں مگر نہیں ہیں تو اس زبان میں جو ہندوستان کی زبان عام ہونے کا دعوی رکھتی ہے ۔جہاں تک قلم کا فریضہ تھا اس نے ادا کر دیا اور مبسوط انسائیکلو پیڈیا تیار ہو چکی اب دولت کا فریضہ ہے کہ اس کو شائع کرے

ہم نے خود ابھی تک اس کی کوئی جلد نہیں دیکھی ہے کہ اپنی رائے دے سکیں مگر اہل علم کی ان رایوں کا ضرور مطالعہ کیا ہے جو انھوں نے اس کے اوپر لکھی ہیں اور اس کی طباعت کے لئے پر زور سفارش کی ہے.

میکدہ | حکیم نیر صاحب دہلی کی چند نظموں کا مجموعہ. لکھائی. چھپائی اور کاغذ عمدہ. تقطیع خورد جلد خوبصورت حجم ۴۸ صفحے قیمت مجلد ۱۲ / غیر مجلد ۸ / ملنے کا پتہ. سید صفات احمد منیجر دیسی دواخانہ چوک چونے منڈی لاہور

حکیم صاحب نے اس مجموعہ میں چند قومی نظمیں درج کی ہیں اور چند ادبی. نیز چند غزلیں ہیں

س کے بعد میں طبی نظمیں ہیں پھر چند اشعار متفرق کلام ۔ میں جو ندرت اندیش ہستی ہے وہ نہایت تعریف کے قابل ہے زبان میں صفائی اور جدت دونوں کا لحاظ ہے ہم کو یہ نظمیں بہت پسند آئیں ۔ نہ صرف بیان کے لحاظ سے بلکہ مقبولیت کے لحاظ سے بھی

احقاق حق | مصنفہ مولوی محمد ادریس خانصاحب نجیب آبادی حجم ۹۸ صفحات کتابت وطباعت معمولی ۔ سائز جیبی قیمت ۵ آنہ ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ عبرت نجیب آباد

اس رسالہ میں مہاتما گاندھی کے مذہبی و اخلاقی خیالات و عقائد پر بحث و تنقید کی گئی ہے جناب مصنف کو مہاتما جی کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت کی بنا پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ان کے عقائد و خیالات یعنی تلاش حق کی اشاعت سے ایک جدید مذہب کی بنیاد پڑ سکتی ہے اس خطرہ کو محسوس کر کے انھوں نے اس تصنیف کی زحمت گوارا فرمائی ہے جناب مصنف کی اس تنقید میں بہت کچھ بحث و نظر کی گنجائش ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن یہ بات ہر آئینہ لائق ستائش ہے کہ اس کتاب کا اسلوب و لہجہ نہایت متین و سنجیدہ ہے اور بجز دو چار لفظوں مثلاً مہاتمائی لہجہ ۔ پیغمبرانہ لہجہ ۔ ہندی پیغمبر کے جناب مصنف نے خلق و مدارا کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے بحیثیت مجموعی کتاب مطالعہ کے لائق ہے ۔

التجائے نوری ۔ | مصنفہ نواب زادہ محمد سمیع اللہ ایس جنگ النوری حجم ۱۱ صفحے جیبی تقطیع کتابت و طباعت معمولی قیمت ۱ جناب مصنف سے الہ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے

ایک مسلسل نظم ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ادبار سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے

منتخبات المعروف بہ خزینہ صنعت ۔ | مرتبہ جناب بلقیس جہاں بیگم تقطیع کلاں حجم ۴۰ صفحہ کتابت وطباعت متوسط قیمت ۱۲ ؍ غالباً خود جناب مصنف سے آگرہ کے پتہ پر مل سکتی ہے ۔

دستکاری پر اردو میں بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی گھروں کی مردہ صنعتوں اور دستکاریوں میں از سر نو جان ڈالنے کی کوشش

کارزار ہفتہ وار اخبار ماڈل ٹاؤن لاہور سے پنجاب کے جواں عمر اور جواں کلام شاعر حضرت ابو الاثر حفیظ جالندہری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دلچسپ۔ دلکش اور سراسر محرک عمل۔ امید ہے کہ یہ اخبار پنجاب کے نوجوانوں میں ولولۂ کار اور جذبہ عمل پیدا کرے گا اور ان کو صحیح راستہ پر چلائے گا۔

اس میں سب سے زیادہ دلچسپ جو چیز ہوتی ہے وہ خود حضرت حفیظ کی نظمیں ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ فلسکیپ سائز ۱۲ صفحے۔ قیمت سالانہ تین روپے

دنیا کی رفتار

(الف) عالم اسلامی

۱۔ افغانستان کی رفتار ترقی۔ ہزہائینس احمد شاہ خاں وزیر دربار افغانستان نے ایک ملاقات کے دوران میں ذیل کا بیان دیا ہے۔ ہزہائینس اعلیٰ حضرت شہریار غازی کے چچازاد بھائی ہیں اور جلالت الملک سلطان ابن سعود سے ایک دوستانہ معاہدہ قائم کرنے کے لئے حجاز تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ شاہ غازی کی طرف سے فریضہ حج بھی ادا کریں گے۔ انہوں نے حال ہی میں نہایت ہی تحسن فیصلہ کیا کہ حکومت افغانستان کی طرف سے مکہ معظمہ میں ایک دار الحجاج تعمیر کیا جائے تاکہ افغانستان رعایا کو سفر حج میں سہولت ہو۔

ہزہائینس نے فرمایا کہ افغانستان نے اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی کے سایہ ہمایونی میں قابل رشک ترقی کی ہے۔ جس قلیل عرصہ میں اعلیٰحضرت نے ملک کو فتنہ و فساد سے پاک کر کے از سر نو شاہراہ کامرانی پر ڈال دیا ہے وہ بلاشبہ حیرت انگیز ہے گذشتہ خانہ جنگی کے زمانہ میں عمارتوں اور سڑکوں کو جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کی تلافی کر دی گئی ہے۔ اور خیال ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جدید ذرائع آمد و رفت ملک کے ہر حصے میں پھیلائے جائیں گے۔ ان طلبہ میں سے جو افغانستان کے نو قائم کردہ مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اکثر طلبا کو صنعت و حرفت سکھانے کے خیال سے یورپ اور امریکہ بھیجا گیا ہے تجارت کا حال نہایت اچھا ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ محکمہ محصولات کی آمدنی گذشتہ سال سے دگنی ہو گئی ہے حکومت کے زیر غور اب یہ امر ہے کہ ملک کی عظیم الشان معدنی دولت سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے۔

خارجی تعلقات کے متعلق ہزہائینس نے کہا کہ افغانستان کے تعلقات سب ممالک سے مساویانہ ہیں اور اس کے نزدیک کسی قوم کو دوسری قوم پر ترجیح حاصل نہیں نہ کسی قوم کو کوئی خاص مراعات دی گئی ہیں نہ اجارات۔

افغانستان میں پنچایتی طرز حکومت قائم ہے مجلس شورا کے دو ایوانوں پر مشتمل ہے اعلیٰ حضرت ان کے فیصلوں کی تصدیق کر دیتے ہیں لیکن اگر ایوانات کے درمیان کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہو تو آخری فیصلہ شاہ غازی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگرچہ اس کی اب تک نوبت نہیں آئی۔

۲۔ صدقی پاشا فلسطین میں | پچھلے مہینہ اسماعیل صدقی پاشا شام و فلسطین تشریف لے گئے اور ابتدائی حکومتوں نے آپ کا پرجوش مقدم کیا اس سفر کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ حکومت مصر نے شام اور فلسطین کی مصنوعات پر محصول میں حال ہی میں بہت کافی اضافہ کر دیا تھا لہٰذا ان ممالک کی یہ خواہش تھی کہ حکومت مصر اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرے لیکن اسماعیل صدقی پاشا کے سفر فلسطین کے متعلق ایک دوسری رائے قائم کی گئی ہے۔ خیال یہ ہے کہ حکومت مصر نے مفتی فلسطین کی سرگرمیوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور موتمر انعقاد سے بھی کوئی خوشگوار نتائج مترتب نہیں ہوئے اب جو صدقی پاشا فلسطین آئے ہیں تو اس سے مقصود یہ ہی تھا کہ دونوں حکومتوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کر دیا جائے۔ پچھلی مرتبہ جب ہائی کمشنر فلسطین قاہرہ گئے ہیں تو وہ خود ہی صدقی پاشا اور وزیر رسل و رسائل کو قدس آنے کی دعوت دے آئے تھے یہ گویا "سرکاری تعبیر ہے مصر و فلسطین کے باہمی تعلقات کی ورنہ ظاہر ہے کہ مصر یا فلسطین کے کسی مسلمان کو مفتی فلسطین یا موتمر اسلامی کی سرگرمیوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

بہرحال ان سیاسی خیال آرائیوں کے علاوہ فلسطین میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ریلوے کی تعمیر کا ہے۔ اس وقت جو لوگ مصر سے آتے ہیں ان کو قنطرہ سے کشتی میں سفر کرنا پڑتا ہے جس سے اکثر تکالیف کا سامنا ہوتا ہے حکومت فلسطین کی یہ خواہش ہے کہ ریل کے انتظامات میں جو خرابیاں ہیں ان کو جلد سے جلد دور کر دیا جائے

ادھر قاہرہ میں عنقریب عربی انجمن موسیقی کا اجلاس ہونے والا ہے جس کا مقصد فنی اور نظری دونوں حیثیتوں سے موسیقی کی اصلاح کرنا ہے اسکے پیش نظر اس کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جن کی تفصیل آئندہ اشاعت میں عرض کی جائے گی۔

دورہ خشنودی عراق | سیاسیات عراق میں اس وقت بہت سے اہم مسائل پیش ہیں ایک مسئلہ خاتمۂ انتداب کا ہے وہ مہاشامی سرحد کے تصفیہ کا ہے اس کے علاوہ حکومت نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ پرانے سکوں کی بجائے عراقی سکے سکوک کرائے جائیں لیکن اس وقت دو باتیں خاص طور سے توجہ کا مرکز بن رہی ہیں ۔ اول شاہ عراق کا سفر طہران اور ثانیاً نوری پاشا کی مراجعت جنھوں نے مجلس سندوین میں عراق کے سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق نہایت اہم بیانات دئے

نوری پاشا نے اس امر پر اظہار تیقن کیا ہے کہ عراق کو عنقریب مجلس اقوام کی رکنیت حاصل ہو جائے گی گو یا ختم انتداب کا معاملہ اب قطعی طور سے فیصل شدہ ہے ۔ نوری پاشا نے کہا کہ عراق اور ترکی کے ماتحت دوستانہ معاہدہ قائم ہو گیا ہے جس کا اثر اضلاع موصل پر نہایت اچھا پڑے گا لیکن ان سب بیانات میں سے حیرت انگیز اطلاع یہ تھی کہ پونڈ کی قیمت گر جانے کے باوجود حکومت کا مطالبہ یہ تھا کہ عراق پیٹرولیم کمپنی کو جو رقم ہر سال ادا کرنی پڑتی ہے اس کا تعین حسب سابق سونے کی قیمت کی لحاظ سے کیا جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی ایک لاکھ پونڈ کی زائد رقم ادا کرے یہ معاملہ مدت سے کمپنی اور حکومت کے درمیان مابہ النزاع تھا لیکن اب جو نوری پاشا لندن گئے ہیں اور کمیٹی کو جو مراعات اور شرائط حکومت کی طرف سے حاصل ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ حکومت عراق کا مطالبہ جائز ہے ۔ لہٰذا خزانہ حکومت میں عنقریب اس گراں بہا رقم کا اضافہ ہو جائیگا ۔

نوری پاشا نے یہ بھی کہا کہ وہ تیل کی ایک دوسری کمپنی سے بھی گفت و شنید کر رہے ہیں گو انھوں نے اس کمپنی کا نام نہیں لیا ۔ لیکن خیال ہے کہ ان کا اشارہ برٹش آئل کمپنی لمیٹڈ کی طرف ہے اس لئے کہ اس کے دو ڈائرکٹر حال ہی میں سفر بغداد سے یہاں آئے تھے ۔ نوری پاشا کا خیال یہ ہے کہ حکومت کو اس کمپنی سے تیل کے ہر ٹن پر چار شلنگ اور حاصل شدہ تیل کا بیسواں حصہ ملیگا ۔

امیر فیصل کا سفر طہران | امیر فیصل نے ارادہ کیا ہے کہ اپریل کے مہینہ میں طہران کا سفر کریں قیاس یہ ہے کہ اس سفر کا مقصد ان غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے جو حکومت ایران و عراق کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں بالخصوص اس لئے کہ حکومت عراق نے جعفر سلطان سردار باغیان کرد کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس کو طہران میں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ۔

جعفر سلطان جو کہ کردی قبیلہ کا سردار ہے وہ سرحد عراق و ایران کے دونوں طرف آباد ہے تمام

آزاد قبائل کی طرح یہ لوگ بھی کسی حکومت کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے اور حتی الوسع آزاد زندگی بسر کرتے ہیں سیاب کے سرا ہیں حکومت ایران نے ان کی سرکشی کا خاتمہ کرنے کے لئے فوج کشی کی تو شروع شروع میں جعفر سلطان نہایت کامیابی کے ساتھ لڑتا رہا لیکن بالاخر اسے عراق میں پناہ لینا پڑی۔ جعفر سلطان نے سلیمانیہ کے مقام پر اپنے آپ کو حکومت کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک سردار مذکور حکومت عراق کے زیر حراست موصل ہی میں نظر بند ہے۔ بایں ہمہ ایرانی حکومت حکام عراق کے اس طرز عمل سے خوش نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اب عراق در پردہ کرد باغیوں کے طرفدار ہیں یہی غلط فہمی ہے جس کو دور کرنے کے خیال سے شاہ عراق طہران جا رہے ہیں۔ اور امید کی جاتی ہے کہ اس کا اثر دونوں ہمسایہ حکومتوں کے باہمی تعلقات پر نہایت اچھا پڑے گا۔

مسلمانان بلغاریہ



اوپر کا نقشہ برلن اور سینٹ منٹن کے ماہوار رسالہ "مشرق تصاویر" میں شائع ہوا ہے۔ ای۔ ایم ہوپ جو صوفیا (دارالسلطنت بلغاریہ) میں رہتے ہیں اور جنہوں نے یہ نقشہ مرتب کیا ہے ان کا۔

خیال ہے کہ مسلمانان بلغاریہ کی کل تعداد آٹھ لاکھ ہے قارئین جامعہ نقشہ سے اندازہ کر سکیں گے کہ مملکت بلغاریہ کے مختلف اضلاع میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے

(ب) ہندوستان

سرکار کی مالی حالت

مرکزی حکومت ناظرین کو یاد ہوگا کہ حکومت ہند کا اصل میزانیہ گذشتہ ستمبر میں پیش کیا گیا تھا اور اس پر غور کرنے کے لئے ایک خاص اجلاس بماہ نومبر دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں اسمبلی نے میزانیہ کو نامنظور کر دیا تھا لیکن وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر مجوزہ میزانیہ کو یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء سے نافذ کر دیا تھا۔ اب ۲۸ فروری سنہ ۳۲ء کو وزیر مال نے ضمنی میزانیہ اسمبلی کے سامنے پیش کیا ہے اور اپنے بیان میں نہایت تفصیل سے حکومت ہند کی مالی حالت کے ایک ایک پہلو پر بحث کی ہے وزیر مال کا یہ بیان خلاف معمول اس قدر سلجھا ہوا ہے کہ ہر شخص اس کو دلچسپی سے پڑھ کر سمجھ سکتا ہے

اپریل سنہ ۳۱ء میں سال رواں سنہ ۳۲-۱۹۳۱ کیلئے حسب ذیل تخمینہ کیا گیا تھا

آمدنی	ایک ارب ۴۳ کروڑ ۸۷ لاکھ
خرچ	ایک ارب ۴۳ کروڑ ۸۶ لاکھ

لیکن دوران سال میں سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے تجارت درآمد اور برآمد گھٹ کر نصف رہ گئی ہے اس لئے تخمینہ کے خلاف محصول کروڑگیری نیز دیگر مدات میں آمدنی بہت زیادہ گھٹ گئی اور تخمینہ کیا گیا کہ اختتام سال تک ۱۹ کروڑ روپے کا خسارہ سنہ ۳۲-۳۱ کے میزانیہ میں ہوگا اور اگر مناسب تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو سنہ ۳۳-۳۲ء میں بھی تقریبًا ۱۹ کروڑ کا خسارہ ہوگا۔ چنانچہ وزیر مال نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے عام مصارف میں تخفیف اور محصولات میں اضافہ تجویز کیا ہے جس پر اب عملدرآمد

ہوگا۔ ورنہ مال کا تخمینہ گذشتہ نمبر میں یہ تھا کہ مجوزہ تخفیفِ مصارف اور اضافہ محصولات کے بعد سال [illegible] یعنی ۳۲-۱۹۳۱ کے میزانیہ میں ۱۹ کروڑ کی بجائے صرف دس کروڑ سترہ لاکھ کا خسارہ رہے گا۔ اور ۳۳-۱۹۳۲ کے اختتام پر بجائے کسی خسارہ کے ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی بچت ہوگی۔ لیکن بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیر مال کا یہ تخمینہ ضرورت سے زیادہ صحیح تھا۔ اس لئے کہ بجائے دس کروڑ ۱۷ لاکھ کے ۳۲-۱۹۳۱ کے میزانیہ کے تیرہ کروڑ ۶۶ لاکھ کا خسارہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۳۳-۱۹۳۲ کے اختتام پر جو بچت ۵ کروڑ ۲۳ لاکھ کی بچنے والی تھی اس میں سے ۳½ کروڑ روپیہ چار ہی مہینہ کے اندر نکل گئے اس میں بارہ مہینہ باقی ہیں اور کل دو کروڑ پندرہ لاکھ کا فرق اب رہ گیا ہے اگر لباس اور معاشی حالات ملک کے یہی رہے جو اس وقت ہیں تو کوئی تعجب نہ ہوگا اگر ۳۳-۱۹۳۲ کے میزانیہ میں بجائے کسی بچت کے چھ سات کروڑ کا خسارہ ہوگا۔

... ...

مرکزی حکومت ہند کے خاص خاص ذرائع آمدنی محصول کروڑگیری، انکم ٹیکس اور محصول نمک ہیں خرچ کی مدات میں فوجی مصارف۔ قرضہ جات کا سود۔ اور مختلف دفاتر کے مصارف ہیں جس کا صحیح اندازہ ذیل کے نقشے سے کیا جاسکتا ہے۔

تخمینہ آمدنی بابتہ ۳۳-۱۹۳۲

۱۔ کروڑگیری کا محصول	۵۲,۳۱,۲۷,۰۰۰
۲۔ انکم ٹیکس	۱۸,۷۳,۳۸,۰۰۰
۳۔ نمک محصول	۹ ,۴۳,۴۰,۰۰۰
۴۔ ٹکسال	۳ ,۳۱,۱۷,۰۰۰
۵۔ ریل و متفرق آمدنی	۴۹,۱۷,۰۳,۰۰۰
کل آمد	۱,۲۹,۹۶,۲۹,۰۰۰

تخمینہ مصارف بابتہ ۳۳-۱۹۳۲

۱۔ فوجی مصارف	۴۷,۹۱,۹۶,۰۰۰
۲۔ سود	۱۹,۹۲,۲۵,۰۰۰
۳۔ دیوانی	۹ ,۶۴,۹۳,۰۰۰
۴۔ ریل و متفرق خرچ	۵۱ ,۳۲,۲۱,۰۰۰
کل خرچ	۱,۲۷,۸۱,۴۵,۰۰۰
بچت	۲۱۴۸۴ ۰۰۰
	۱,۲۹,۹۶,۲۹۰۰۰

... ...

آمدنی کی مدات میں سب سے زیادہ اہم محصول کروڑگیری ہے ۳۲-۱۹۳۱ میں اس مد سے ۴۶ کروڑ۔

۱۸ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں ۵۶½ کروڑ کا تخمینہ تھا لیکن کل ۴۴½ کروڑ روپیہ مشکل سے آمدنی ہوئی حالانکہ آخری چار ماہ میں محصول کرورگیری میں کافی اضافہ کردیا گیا تھا سال آئندہ کے لئے ۵۲ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے کا تخمینہ کیا گیا ہے لیکن اول تو امینی محصول دوسرے ملک میں سودیشی تحریک کے قوی اثرات اور تیسرے قوم کی قوت خرید کم ہو جانے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ تخمینہ صحیح ثابت نہ ہوگا۔

کرورگیری کا دارو مدار تجارت درآمد اور برآمد پر ہے درآمد میں سب سے زیادہ آمدنی۔ شکر اور سوتی کپڑے سے ہوتی ہے لیکن شکر کی درآمد نصف سے زیادہ کم ہوگئی اور تین کروڑ ۵۶ لاکھ روپے اس محصول میں نقصان ہوا ہے۔ سوتی کپڑے کی درآمد کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے۔

جنگ عظیم سے قبل اوسطاً ہر سال	۳ ارب ۲۰ کروڑ گز کپڑا آتا تھا
جنگ عظیم کے بعد ۲۱ء تک	۱ ارب ۸۰ کروڑ "
اب صرف	۹۰ کروڑ گز کپڑا آتا ہے

۲۹ء تک سوتی کپڑے پر ۶½ کروڑ روپیہ محصول کرورگیری وصول ہوتا تھا۔ لیکن اب اضافہ محصول سابقہ پونے چار کروڑ روپیہ سے زیادہ اس مد میں وصول نہیں ہوتا۔ لیکن دونوں مدوں سے جو نقصان ساری آمدنی کو ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ فائدہ دیسی مصنوعات کو پہنچ رہا ہے شکر سازی اور سوتی کپڑے کی صنعت بیرونی مقابلہ میں بالکل تباہ ہوگئی تھیں ان کو زندہ کرنے کے لئے امینی محصول لگانے کی شدید ضرورت تھی اب بھی ان دونوں صنعتوں کی حالت بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں ہے بیرونی مال کی درآمد میں امینی محصول کی وجہ سے اتنی زیادہ کمی نہیں ہوتی ہے جتنی کہ عام کساد بازاری ملک کی سیاسی حالت اور قوم کی قوت خرید کم ہو جانے کی وجہ سے اس کی اصل حالت قائم ہو جائے گی اور مزید امین کی ضرورت ہوگی

... ...

مٹی کے تیل پر اضافہ محصول کی وجہ سے سال رواں میں زائد آمدنی کی توقع کی جاتی ہے علاوہ یہی حال نمک کے محصول کا بھی ہے کہ باوجود ۲۵ فی صدی اضافہ محصول کے نمک کی مانگ پر اس کا

کوئی اثر نہیں پڑا اور ایک کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کی مزید آمدنی اس مد سے حاصل ہوگی چنانچہ وزیر مال اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ آئندہ اگر آمدنی میں اضافہ کرنے کی ضرورت پڑے تو ایسی ہی چیزوں پر اضافہ کیا جائے جو عوام الناس استعمال کرتے ہیں صاحب موصوف کی اس رائے سے شاید کوئی شخص اتفاق نہ کرے۔ نمک اگزیر ضروریات زندگی سے ہے اور اس پر محصول کا اضافہ یا تخفیف کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا ۔ اگر نمک سستا ہو جائے گا۔ تو لوگ اس کو پھانکنا نہ شروع کر دیں گے اور اگر بہت زیادہ گراں ہوگا تو روکھی روٹی اور بے نمک کی دال نہ کھائیں گے۔ وزیر مال کا خیال صحیح ہے کہ تھوڑے آدمیوں پر زیادہ محصول لگانے کی اب انتہا ہو چکی ہے اور اس سے زیادہ ان سے وصول نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عوام الناس پر جو بار ان کی آمدنی کے لحاظ سے اس وقت پڑ رہا ہے یہ بھی ناقابل برداشت ہے۔ اس پر اگر اور اضافہ کیا گیا تو ناگزیر ضروریات زندگی سے گویا کوئی چیز ان سے چھین لی جائے گی۔ وزیر مال کو ایک نہ ایک آنہ فی کس عوام الناس سے وصول کرنا زیادہ آسان نظر آتا ہے لیکن اس ایک آنہ کی قدر ان غریبوں کے دل سے کوئی پوچھے جو اس ایک آنہ سے ایک وقت اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

گذشتہ میزانیہ میں ایک بزاز کی آمدنی پر بھی انکم ٹیکس لگایا گیا تھا' لیکن وزیر مال نے اس اضافہ کے متعلق کوئی اعداد و شمار پیش نہیں کئے جس سے معلوم ہوتا کہ مجموعی آمدنی میں اس جدید محصول سے کتنا اضافہ ہوا۔

... ...

میزانیہ میں توازن پیدا کرنے کی وزیر مال نے دو صورتیں تجویز کی تھیں کہ محصولات میں اضافہ کیا جائے اور مصارف میں تخفیف کی جائے چنانچہ محصولات میں اضافہ پونے دس کروڑ کے قریب ہو گیا ہے۔ لیکن مصارف میں تخفیف توقعات سے بہت کم ہوئی۔ تخفیف مصارف کی کمیٹی کو صدر سر عبدالرحیم کا تو یہ خیال تھا کہ میزانیہ کا خسارہ صرف مصارف میں تخفیف کے ذریعہ پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہی خیال تقریباً تمام منتخب اراکین اسمبلی کا بھی تھا' لیکن حکومت اس حد تک تخفیف مصارف کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی پھر بھی خیال تھا کہ محصولات میں جس قدر اضافہ ہوگا کم از کم اسی قدر رقم تخفیف مصارف سے حاصل ہوگی' لیکن وزیر مال کے بیان سے معلوم

ہوتا ہے کہ کل آٹھ کروڑ روپے کی تخفیف مصارف میں کی گئی ہے جس میں سے ۵ کروڑ فوجی مصارف میں اور تین لاکھ دیوانی میں اس میں بھی بیشتر حصہ بالکل عارضی ہے اور کمانڈر انچیف صاحب نے یہ جتلا دیا ہے کہ ۴۸ کروڑ روپیہ سے کم میں فوجی مصارف قطعاً نہیں چل سکتے سال رواں کے لئے۔ کمانڈر انچیف نے ازراہ عنایت ۴۶½ کروڑ قبول کر لیا ہے یہ مطالبہ قومی نقطۂ نظر سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں ہر ملک اپنی آمدنی اور حیثیت کے مطابق اپنی حفاظت کا انتظام کرتا ہے جس ملک میں ۹۲ فی صدی آبادی پڑھنا لکھنا نہ جانتی ہو اور جہاں بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ہیضہ طاعون چیچک اور بخار کے نذر ہو جاتی ہوں محض اس لئے کہ حفظان صحت کا معقول انتظام نہیں۔ ایسا ملک اپنی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ فوج کے سیاہ اور سفید آدمیوں کو کھلانے پلانے پر کس طرح صرف کر سکتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک اپنی آمدنی کا جو حصہ فوج پر صرف کرتے ہیں وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۱۹۲۶-۲۷ اور ۱۹۲۵-۲۶ کے اعداد و شمار پر ذیل کا نقشہ تیار کیا گیا ہے لیکن اتنے قلیل عرصہ میں بہت زائد فرق نہیں واقع ہو سکتا ہے

۱. ہندوستان	کل آمدنی کا تقریباً	۴۵	فی صدی	فوج پر صرف کرتا ہے
۲. جاپان	〃 〃	۲۶٫۵	〃	〃 〃
۳. اٹلی	〃 〃	۲۳٫۴	〃	〃 〃
۴. فرانس	〃 〃	۱۹٫۷۵	〃	〃 〃
۵. امریکہ	〃 〃	۱۶٫۰۹	〃	〃 〃
۶. برطانیہ	〃 〃	۱۴٫۷۵	〃	〃 〃
۷. آئرلینڈ	〃 〃	۷٫۶۹	〃	〃 〃
۸. جرمنی	〃 〃	۷٫۱۶	〃	〃 〃
۹. آسٹریلیا	〃 〃	۶٫۵۲	〃	〃 〃
۱۰. نیوزی لینڈ	〃 〃	۳٫۵۱	〃	〃 〃
۱۱. جنوبی افریقہ	〃 〃	۳٫۱۶	〃	〃 〃

اس طول طویل فہرست میں سب سے اول نمبر ہندوستان ہی کو حاصل ہے اور سب سے

ہیچے بہانہ عقلی دام بہ کا تہا کی دیگر خود فخلاز تو آبا دیہات ہندوستان اگر اپنی اس بے بسی پر شکایت کرے تو کیا بیجا ہے

... ...

محکمہ ریل کا میزانیہ محکمہ ریل میں ہمیں حکومت کو تقریباً ۹ ½ کروڑ روپے کا نقصان سال رواں میں ہوا ہے ابتداءً ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ میں شامل تھا لیکن سنہ ۲۱ء میں ریلوے کے انتظام کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایکورتھ کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ مختلف کمپنیوں کا معاہدہ ختم ہو جانے کے بعد ریلوں کا انتظام براہ راست حکومت کے ماتحت کر دیا جائے اور ریلوں کا حساب کتاب مرکزی حکومت کے میزانیہ سے علیحدہ کر دیا جائے نیز چونکہ حکومت نے تقریباً سات ارب ۶۵ کروڑ روپیہ کا سرمایہ اب تک ریلوں پر لگایا ہے اس لئے اس سرمایہ پر کچھ منافع بھی حکومت کو ملنا چاہیئے سنہ ۲۱ء تک ریلوں سے کوئی منافع نہیں ہوا تھا لیکن اس کے بعد سال بہ سال معقول آمدنی ہو رہی ہے جن کا کچھ اندازہ گذشتہ چند سال کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔

سنہ ۲۳-۲۴ء	۶ ½ کروڑ	سنہ ۲۶-۲۷ء	۸ ¼ کروڑ
سنہ ۲۴-۲۵ء	۱۳ کروڑ	سنہ ۲۷-۲۸ء	۱۱ کروڑ
سنہ ۲۵-۲۶ء	۱۸ ½ "	سنہ ۲۸-۲۹ء	۸ "

مارچ سنہ ۲۴ء میں حکومت ہند نے ایکورتھ کمیٹی کی سفارشات کو منظور کیا اور ایک قرارداد کے ذریعہ یہ طے پایا کہ ۱۔ ریلوں کا حساب کتاب علیحدہ کر دیا جائے۔ ۲۔ حکومت کے کل سرمایہ پر ایک فی صدی کا ⅕ حصہ سالانہ محکمہ ریل سے حکومت ہند کو ادا کیا کرے۔ ۳۔ اس کے بعد اگر کچھ فاضل رقم بچے تو اس کا بھی ⅓ حصہ مرکزی حکومت کو دیا جائے اور باقی رقم سرمایہ محفوظ اور سرمایہ فرسودگی میں جمع کر دی جائے تاکہ اگر کبھی خسارہ ہو تو سرمایہ محفوظ میں سے قرض لے کر حکومت ہند کا مطالبہ ادا کر دیا جائے اس فیصلہ کے مطابق پانچ اور چھ کروڑ کے درمیان رقم حکومت ہند کو سال بہ سال محکمہ ریل سے ملنا چاہیئے۔

... ...

۱۹۳۰ء تک ریلوں سے اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ حکومت ہند کا مستقل مطالبہ ادا کرنے کے بعد ایک کافی رقم سرمایہ محفوظ میں جمع کر دی جاتی تھی لیکن ۱۹۳۱ء سے ریلوں کی آمدنی میں خسارہ شروع ہوا ہے۔ پہلے سال ہی ۱۹۳۱ء میں دو کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لے کر حکومت ہند کا مطالبہ ادا کیا گیا۔ دوسرے سال ۵ کروڑ ۱۲ لاکھ خسارہ ہوا۔ چنانچہ یہ رقم اور حکومت ہند کا مطالبہ ادا کرنے کیلئے کل گیارہ کروڑ روپیہ سرمایہ محفوظ سے قرض لیا گیا۔ اب اس سال ۹½ کروڑ روپیہ کا نقصان ریلوں میں ہوا ہے۔ سرمایہ محفوظ میں کل ۵ کروڑ روپیہ رہ گیا تھا۔ اس لئے ۴½ کروڑ کی رقم سرمایہ فرسودگی سے قرض لے کر یہ خسارہ پورا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عالت میں حکومت ہند کا مستقل مطالبہ کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے سر جارج رینی (جو اس محکمہ کے ذمہ دار ہیں) تخمینہ کیا ہے کہ آئندہ سال بھی ۷½ کروڑ روپیہ کا خسارہ ہوگا۔

... ...

عالمگیر کساد بازاری کا زمانہ ہے ریلوں کے محکمہ میں یہ نقصان بہت زیادہ خلاف توقع نہیں ہے لیکن ریلوں کا کاروبار چونکہ تجارتی اصول پر ہے۔ اور کوئی کاروبار ایک عرصہ تک مسلسل نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی صورتیں نکالی جائیں۔ کہ اگر فائدہ نہ ہو تو نقصان بھی نہ ہو۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ کرایہ اور محصول میں اضافہ کیا جائے۔ اور انتظامی مصارف میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کی جائے۔ چونکہ ریلوں کے کاروبار میں اجارہ داری ہے اور اس کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ میں ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ یہ نقصان صرف کرایہ ریل اور محصولات میں اضافہ سے پورا کیا جائے گا۔ اور مصارف میں صرف برائے نام تخفیف ہوگی۔ لیکن سر جارج رینی (ریلوے ممبر) نے تسلیم کیا ہے کہ کرایہ ریل اور محصول کے اضافہ سے ریلوں کی آمدنی بجائے بڑھنے کے گھٹ جائیگی۔ اسلئے اب یہ خسارہ صرف تخفیف مصارف سے پورا ہو سکتا ہے اس وقت تک ریلوے بورڈ نے جو کوششیں تخفیف مصارف کیلئے کی ہیں۔ وہ ہر طرح قابل اطمینان ہیں۔ بشرطیکہ یہ کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو ریلوں کے انتظام کے متعلق از سر نو تحقیقات کرے۔ اس کمیٹی میں جرمنی اور فرانس کے واقف کار ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش ہے تاکہ وہ اپنے ملک کے سالہا سال کے تجربات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے متعلق مفید مشورہ دیں۔

ریلوں کی توسیع کا کام بھی مالی مشکلات کی وجہ سے بہت رو کا جا رہا ہے لیکن اس میں حتی الوسع کوتاہی نہ ہونا چاہیئے۔ ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کا دار و مدار ذرائع نقل و حمل خصوصاً ریلوں کی ترقی پر ہے۔ ہندوستان کے اٹھارہ لاکھ مربع میل رقبہ میں کل ۴۱ ہزار میل ریل اب تک تیار ہوئی ہے۔ اس کے بالمقابل یورپ کے ½ ۷ لاکھ مربع میل (روس کو نکال کر کے) رقبہ میں دو لاکھ میل ریل موجود ہے۔ ذیل کے نقشہ سے مختلف ممالک میں ریلوں کی ترقی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

بلجیم	فی ہزار مربع میل	۳۹۶ میل ریل
انگلستان	" "	۱۹۵ "
امریکہ	" "	۷۰ "
جاپان	" "	۳۲ "
ہندوستان	" "	۲۰ "

موجودہ کساد بازاری۔ بظاہر کوئی مستقل صورت نہیں اختیار کر سکتی اس لئے ریلوں کی توسیع کے پروگرام میں جہاں تک ممکن ہو کوئی کمی نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ بالآخر اس سے ملک کی ترقی کی راہ میں اس سے زیادہ رکاوٹیں پیدا ہوں گی جتنی کہ اس وقت موجود ہیں۔

ممالک غیر

چین و جاپان | آخری خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان نے شنگھائی کے علاقہ میں فوجی کارروائیاں بند کر دی ہیں اور انجمن اقوام کی مداخلت اور تحقیقات ہی کو منظور کر لیا ہے۔ ایک گذشتہ اشاعت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ جاپان کو مختلف عہد ناموں کی وجہ سے جو اس نے براہ راست چین سے کئے یا جو اسے روس سے اپنی عہد آفریں فتح کے بعد ورثتاً ملے۔ منچوریا میں عرصہ تک کے لئے بہت اہم حقوق حاصل ہیں۔ ان حقوق کی بنا پر منچوریا میں فوجی کارروائی کرتے وقت جاپان کو بین الاقوامی مداخلت کا زیادہ اندیشہ نہ تھا۔ لیکن جس حد تک منچوریا میں پیش قدمی کرنے کا قصد جاپانی وزارت نے کیا تھا وہاں اس سے زیادہ پیش قدمی ہو گئی اس لئے

نی فوج کا اقتدار سیاست پر غالب تھا اور منچوریا جاپانی فوج کے لئے ارض مقدس ہے۔ اس زیادتی
دل یورپ کے کان کھڑے کئے، اُدھر امریکہ (جو جاپان کے مقابلہ میں ہمیشہ چین کی منڈی کو
لئے محفوظ کرنے کی غرض سے اس کی حفاظت کرتا ہے) نے سخت احتجاج کیا۔ لیکن جاپان نے
لی نہ سنی اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کی وہ تفسیر اپنے عمل سے پیش کی جس کے سامنے
حتجاجات اور انجمن اقوام کی تمام قرار دادیں بے اثر ثابت ہوئیں۔

منچوریا کے بعد فوجی کارروائیاں شنگھائی کے علاقہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ شروع ہوئیں
ا اعلان جنگ کے گذشتہ جنگ عظیم کے ہیبت ناک مناظر دنیا نے پھر دیکھے۔ سمندر سے گولہ باری ہوئی
سے ہوئی، شہر جلے، پرامن شہری قتل ہوئے، لاکھوں آدمی بے گھر بے در ہو گئے اور ابھی جنگ
ابطہ اعلان بھی نہیں ہوا! اب خدا خدا کرکے یہ بے ضابطہ جنگ بند ہوئی ہے۔ شنگھائی میں
کارروائیوں کے آغاز اور اس وقت ان کے بند ہونے کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔

ائی میں فوجی کارروائی کا ہونا جاپان کے لئے اس واسطے ضروری تھا کہ منچوریا کی فوجی کامیابیاں
ی کے تجارتی میدان میں شکست سے مبدل ہو رہی تھیں۔ جب چین منچوریا کو نہ بچا سکا تو اس نے
ی مال کا بائیکاٹ کیا اور اس بائیکاٹ کا مرکز شنگھائی تھا۔ چین کی تجارت، ساہو کارہ، جہازرانی
ہر قسم کا کاروبار آکر شنگھائی میں جمع ہو گیا ہے۔ کچھ عرصہ سے سیاست کے اعتبار سے اسے کینٹن
یلت حاصل ہو گئی ہے چنانچہ یہیں جاپانی مال اور جاپانیوں کے بائیکاٹ کی تحریک نے زور
۔ جاپان جو منچوریا کو اس لئے اپنے تسلط میں لانا چاہتا تھا کہ اس کی تجارت کے لئے اجناس خام
ں سے باسانی حاصل ہو سکیں گی اسے کیسے گوارا کرتا کہ اس خام مال کو مصنوعات میں تبدیل کرنے
بعد کوئی انھیں ہاتھ بھی نہ لگائے! چنانچہ شنگھائی میں فوجیں آتار دی گئیں اور تجارتی مال کو بیچنے
لئے خریدنے والوں کے جان و مال کو برباد کر دیا گیا!

یہ کارروائی بلا نظیر نہ تھی۔ اس لئے کہ ۱۹۲۷ء میں چینی انقلاب کے موقع پر اپنے اغراض کی
ظت کے لئے برطانیہ نے بھی شنگھائی میں فوج بھیجی تھی۔ لیکن انگریزی فوج اپنی وزارت کے قبضہ
ں تھی اس لئے سیاسئین کی مصلحت آمیزیوں پر کسی نے کان نہ دھرا اور منچوریا کی طرح شنگھائی میں بھی
سپہ سالاران جاپانی نے اپنے دل کا حوصلہ نکالا۔

غریب انجمن اقوام جس کے تمام با اثر رکن خود دل میں معاملات کو طے کرنے کے اسی جاپانی مسلک کے قائل ہیں وقتاً فوقتاً قرار دادیں منظور کرتی رہی اور جاپان ان کی طرف سے بے اعتنائی برتتا رہا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ان احتجاج کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے مال کو بکوانے کے لئے وہی سب کر سکتا ہے جو وہ خود کر رہا ہے۔ انجمن اقوام کی حقیقت سے اس کے شرکا سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے کہ بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند لیکن پھر بھی ضمیر انسانیت ان ظالمانہ حرکتوں پر مشتعل ہوتا ہے اور کوئی ظالم اس کی طرف سے کامل بے اعتنائی نہیں برت سکتا' ہمیشہ ظالموں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس ضمیر کو اپنے کسی خواب آور عمل سے سلادیں۔ چنانچہ یہی اب جاپان کرنا چاہتا ہے۔ اس نے انجمن اقوام کی تمام تجاویز کو اچھی طرح ٹھکرایا اور اب منچوریا پر اچھی طرح تسلط قائم کر کے' وہاں ایک نام نہاد جمہوریت قائم کر کے اور شنگھائی میں جان و مال کی تباہی کے علاوہ چینی دلوں میں ہیبت پیدا کر کے وہ ضمیر انسانیت کا خیال بھی کر سکتا ہے اور "بگلہ بھگت" بن سکتا ہے!

چنانچہ انجمن اقوام کا وفد تحقیقاتی جائے گا۔ شنگھائی سے تو جاپانی فوجیں ہٹ جائیں گی مگر منچوریا پر تسلط قائم رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ امریکہ اور ایک دو مغربی دول کو بھی کچھ حقوق مل جائیں گے!

برطانیہ | درآمد اشیا پر ایک عام محصول لگا کر برطانیہ بھی اصولاً تامینی تجارت کے حامیوں کی صف میں آملا ہے۔ جو لوگ آزاد اور مامون تجارت پر انگریزی ادب سیاسی ومعاشی میں مفصل بحثیں پڑھنے کے عادی ہیں اور انگلستان کو آزاد تجارت کا سب سے بڑا حامی جانتے ہیں انھیں شاید یہ تبدیلی عجیب معلوم ہو۔ لیکن عرصہ سے اس کے لئے میدان تیار ہو رہا تھا۔ اصول اگرچہ آزاد تجارت ہی کا مقبول عام تھا لیکن مخصوص صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے تامینی محاصل کی تدبیریں جو بسا اوقات اختیار کی جا چکی تھی تامین کو بالکل نامانوس چیز نہ رکھا تھا۔ اُدھر جنگ عظیم کے بعد سے دوسری قوموں کی شدید تامینی تدابیر نے انگلستان میں بھی اس کے لئے خاصی آمادگی پیدا کر دی تھی۔ پھر خود اپنی نوآبادیوں سے تجارت کو ترجیح دینے کا خیال بہت ہر دلعزیز تھا، حال میں مزدوروں کے سیاسی اثر کی ترقی نے اجرتوں کو گھٹنے سے روکا' کام کا وقت کم کیا' اور یوں مصارف پیدائش میں اضافہ ہوا۔ دوسرے ملک جنھوں نے اپنے کو تامینی دیواروں میں محصور کر لیا تھا اپنی سستی اجرت اور طویل اوقات کار کے سبب بازار

ابنا کر برطانیہ کے مقابلہ کا حوصلہ کیا اور انگریزی صنعت سچ یہ ہے کہ بڑے خطرہ میں پڑگئی۔ اس خطرہ ہ نے کے لئے پہلے تو انگلستان نے اپنے سکہ کا تعلق سونے سے منقطع کیا اور اس طرح ملک کے اندر ں کی قیمت بڑھائی اور پردیسیوں کے لئے اسے ارزاں کیا۔ لیکن یہ تدبیر کافی نہ تھی۔ اس لئے تامین اختیار کی گئی اور اب چند چیزوں کو مستثنیٰ کر کے سب درآمد پر قیمت کا ۱۰ فی صدی محصول عائد کر دیا ان چیزوں میں سے خاص خاص یہ ہیں، گیہوں، گوشت، چاء، ربڑ، چمڑے اور کپڑے کی صنعت کے بناس خام۔ چھ مہینے کے بعد اس فہرست پر نظرثانی کی جائے گی اور اس میں ترمیم یا توسیع حکومت کے اختیار میں ہوگی۔ اس باب میں حکومت کو مشورہ دینے کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی مقرر کر دی گئی مینی محاصل کے اثرات کا بغور مطالعہ کرتی رہے گی۔

خود برطانوی سلطنت کے مختلف اراکین کے باہمی معاشی تعلقات کا مسئلہ اوٹاوا کانفرنس کے شمار کھا گیا ہے جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔

تا | آئرستان کے انتخابات میں عملی حکومت کو شکست ہوگئی اور ڈی ویلرا کی جمہوری جماعت برسراقتدار گذشتہ سال ہی یہ بات بہت واضح ہوگئی تھی کہ آئرستان کے شہریوں میں سیاسی اختلافات نہایت ہوگئے ہیں اور اس حد سے کہیں آگے بڑھ چکے ہیں جہاں تک جمے ہوئے پارلمنٹی نظام کی صورت ثر ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمہوری جماعت کی طرف سے ملک میں ایک قومی انقلابی شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ گذشتہ حکومت نے دستور اساسی میں ترمیم کی نہایت غیر معمولی کارروائی ے احتراز نہ کیا اور گذشتہ اکتوبر میں دستور کے ان دفعات میں، جن سے شخصی آزادی، اظہار خیال ادی، اور باضابطہ عدالتی تحقیقات کا حق ہر شہری کو ملا تھا، ترمیم کر دی گئی۔ اور سیاسی جرموں کی ت کے لئے ایک فوجی عدالت قائم کی گئی جسے سزائے موت تک کا اختیار تھا۔ لیکن بظاہر یہ فوجی ن اور جمہوری جماعت کو دبانے کی کوشش ناکام رہی اور بلا خون کا ایک قطرہ بہائے یہ جماعت ت میں برسراقتدار آگئی۔ ڈی ویلرا جو جنگ آزادی کے زمانے میں بھی وطن خواہ جماعت کا تھا آج پھر حکومت آئرستان کا صدر ہے۔ عہدۂ صدارت پر متمکن ہونے کے بعد اس نے سب سے نوان سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جو مذکورہ بالا قانون کے ماتحت پابجولاں تھے۔ پھر یہ اعلان کیا

کہ شہنشاہ انگلستان کی وفاداری کی قسم لینے کا فرض آئرستان کی پارلیمنٹ کے اراکین پر عاید نہ کیا جائیگا۔ ان مسائل پر یقیناً بہت جلد انگلستان اور آئرستان میں اختلافات رونما ہوں گے اگرچہ رفتار سیاست کا خیال کرکے یہ کہنا دشوار نہیں ہے کہ انگلستان اس سلسلہ میں بہت سے تلخ گھونٹ پینا گوارا کرے گا!

جرمنی | صدر جمہوریہ کا انتخاب فیصلہ کن ثابت نہ ہوا۔ جرمن دستور کے مطابق پہلے انتخاب میں وہ شخص صد منتخب ہوسکتا ہے جو امیدواروں سے بہیئت مجموعی زیادہ رائیں حاصل کرے۔ اگر کوئی امیدوار بھی ایس نہ کرسکے تو پھر دوبارہ انتخاب ہوتا ہے جس میں محض اکثریت آرا انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے اس انتخاب نے جرمنی کے موجودہ صدر اور قیصری زمانہ کے مشہور عالم سپہ سالار فان ہنڈنبرگ کو سب زیادہ رائیں ملیں لیکن دوسرے امیدواروں کی مجموعی رایوں سے کم۔ اس لئے اب انتخاب دوبا ۱۰ اپریل کو ہوگا جس میں فان ہنڈنبرگ کا منتخب ہوجانا تقریباً یقینی ہے۔

جرمنی کی موجودہ سیاسی اور معاشی حالت کا خیال کرکے وزیراعظم نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ سب سیاسی جماعتیں مل کر دستور اساسی میں ترمیم کردیں اور ہنڈنبرگ کا زمانہ صدارت اور بڑھا دیا جا لیکن قدامت پسند اور 'قومی اشتراکی' جماعتوں کے قائد ہوگن برگ اور ہٹلر اس پر راضی نہ ہوئے سیاست بھی عجیب دھوپ چھاؤں ہے' جن لوگوں نے گذشتہ انتخاب میں ہنڈنبرگ کو صدر بنوا وہ آج اس کے مخالف ہیں اور ہنڈنبرگ کو جتنی رائیں ملیں اکثر ان جماعتوں سے جو پچھلی بار اس خلاف تھیں۔ آج یہ مخالف دیکھتے ہیں کہ ملک کو شاہ پسندی اور اشتراک کے خطرناک تجربو سے اگر کوئی شخص بچا سکتا ہے تو ہنڈنبرگ۔ خانہ جنگی کو ٹال سکتا ہے تو یہ بوڑھا سپہ سالار جمہو اور دستور کو قائم رکھ سکتا ہے تو قیصر کا یہ آزمودہ کار جنرل!

لیکن ہر چند ہنڈنبرگ کا انتخاب اس مرتبہ یقینی سا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے جرمنی کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ اس سے صرف تغیر سیاسی و معاشی کی رفتار ذرا ہموار ہوجائے اور بس۔ زندگی کے شعبہ میں نہایت تیزی سے تغیر ہورہا ہے۔ سیاسی اور معاشی انتشار ناقابل بردا ہوتا جاتا ہے۔ ہٹلر کی جماعت بس یہی کہتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ناقابل برداشت ہے۔ ہمیں برسراقتدار کردو تو سب ٹھیک ہوجائے۔ وہ یہ نہیں بتلاتا کہ کیسے سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا،

ار میں لوگوں کو یہ سوال کرنے کی فرصت بھی نہیں ہے۔ اُدھر انتہا پسند اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ پریشاں حالی نقص کا قصور نہیں، یہ نظام سرمایہ داری کا لازمہ ہے اور اس کی ماہیت کا تقاضا ہے۔ اس نظام نقلاب اشتراکی سے ختم کرو، سب کچھ درست ہو جائے گا۔ اور جرمنی کے نوجوان، دیوالیئے دلوں لمی رکھنے والے، طبقہ وسطیٰ کے سب وہ لوگ جن کی ساری دولت جنگ کے بعد جرمن سکہ خرابی کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل گئی، یہ سب یا تو ہٹلر کی طرف جاتے ہیں یا اشتراکیوں طرف۔ اور ان سب کے معنی ہیں جرمن قوم کا بہت بڑا حصہ۔ اگر رفتار یہی رہی تو قیاس ہے کہ پہلے ر کو کامیابی ہوگی۔ جب وہ اپنے وعدے وفا نہ کر سکے گا اور ظاہر ہے کہ نہ کر سکے گا، تو اشتراکیوں وقع آئے گا اور انقلابی تحریک بہت قوی ہو جائے گی۔

اشتراکی روس کا مشہور سپہ سالار ٹراٹسکی جو اس وقت جلا وطنی میں اپنے دن کاٹ رہا ہے ے جگہ جرمنی کے متعلق لکھتا ہے:۔

"جرمن معاملات کی رفتار پر صرف جرمنی کی قسمت کا انحصار نہیں ہے بلکہ عرصہ تک کے لئے دنیا کی قسمت کا دارومدار ہے۔ روس کی اشتراکی تعمیر، ہسپانی انقلاب کی رفتار، انگلستان میں انقلاب سے پہلے کی سی حالت کا پیدا ہونا، اور فرانسیسی سامراجیت کا آنے والا حشر، یہ سب کچھ آکر ایک نقطہ پر جمع ہو گیا ہے۔ یعنی اس سوال کے جواب پر کہ اگلے چند مہینوں میں جرمنی میں کون جیتتا ہے اشتراکی یا فاشستی (ہٹلر)؟ کسی مخروطہ کے سرے پر ایک گیند رکھ دو تو ذرا سے دھکے سے وہ سیدھی طرف لڑک سکتی ہے یا الٹی طرف۔ یہی حال اس وقت جرمنی کا ہے، اور لڑکنے کا وقت ساعت بہ ساعت قریب آتا جاتا ہے۔ بعض قوتیں چاہتی ہیں کہ گیند سیدھی طرف لڑکے (قدامت پسندی کی طرف) اور مزدور جماعت کی کمر اس سے ٹوٹ جائے۔ بعض چاہتے ہیں کہ گیند وہیں سرے پر رکھی رہے۔ یہ لوگ ناممکن بات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ گیند وہاں نہیں رہ سکتی۔ اشتراکی چاہتے ہیں کہ گیند الٹی جانب (انقلاب کی طرف) لڑکے اور

سرمایہ داری کی کمر توڑ دے۔ لیکن آرزوئیں کافی نہیں ہوتیں۔ عمل کی قوت درکار ہے۔"

لیکن عجب بات ہے کہ باقی دنیا کا بڑا حصہ یہی چاہتا ہے کہ گیند اوپر سرے ہی رکھی رہے!

شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو ۱۹ مارچ کو ہونے والا تھا ملتوی کرنا پڑا۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہوگیا جس کی رو سے ہر عام جلسہ کرنے کے لئے خاص طور پر اجازت لینے کی ضرورت تھی۔ یہ اطلاع اتنی دیر میں ملی کہ اگر اجازت کا انتظار کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ جلسہ کا وقت آپہنچے اور اس وقت تک اجازت کی اطلاع نہ آئی ہو۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ جلسہ ملتوی کردیا جائے۔ اس تھوڑے وقت میں لوگوں کو بہ عجلت التوا کی اطلاع دیدی گئی۔ اب انشاء اللہ جلسہ ۹ اپریل کو ہوگا۔ اخباروں کے اور دعوت ناموں کے ذریعہ سے دو تین دن پہلے سب حضرات کو صحیح وقت کی اطلاع ہوجائے گی

فروری کے جامعہ میں جو افسانہ شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ عربی سے مولوی رئیس احمد ندوی صاحب نے کیا ہے۔ غلطی سے ان کا نام شائع نہ ہوسکا۔ ہم ان سے معافی کے خواستگار ہیں اس مہینہ جو افسانہ شائع ہورہا ہے اس میں کسی کا نام نہیں اور اس کے ساتھ کوئی خط بھی نہیں آیا یا آیا ہو تو ہمارے پاس نہیں پہنچا۔ ہمیں امید ہے کہ جن صاحب نے یہ افسانہ بھیجا ہے وہ اپنے نام نامی سے مطلع فرمائیں گے۔ انعامی مقابلہ کی جو تاریخ مقرر تھی اس کے گذر جانے کے بعد یہ افسانہ موصول ہوا ورنہ یقیناً یہ انعام کا مستحق قرار پاتا۔

دہلی یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد ۱۹ مارچ کو منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک کے بجائے تین خطبے دئے جاتے ہیں۔ ایک صدر کا جو اس سال مقرر ہوا ہو۔ دوسرا وائس چانسلر کا اور تیسرا پرو چانسلر یعنی وائسرے کی کونسل کے ممبر تعلیمات کا۔ اس تثلیث کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی مگر کچھ ہوگی ضرور۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جلسہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وائس چانسلر صاحب یونیورسٹی کی مختصر رپورٹ سنائیں اور پرو چانسلر صاحب اس کا جواب دیں مگر چونکہ اس قسم کے جلسوں میں باہر کے کسی شخص سے خطبۂ صدارت پڑھوانے کی رسم ہے اس لئے یہ بھی

ہو جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ سر سی پی راما سوامی آئر کا خطبۂ صدارت اس توقع کو پورا نہیں کرتا جو اُن کے علم و فضل اور عملی کارناموں کی بنا پر تھی کہ وہ علم و تعلیم پر وسیع مدبرانہ نظر ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا جائے اس میں یہ تین باتیں ہوں یا کم سے کم ان میں سے ایک بات ہونی چاہیئے۔ ۱. اعلیٰ تعلیم کے نصب العین کے متعلق کوئی نظریہ جو خطبہ پڑھنے والے نے ذاتی غور اور مشاہدے سے قائم کیا ہو یا کم سے کم گہری تنقید کے بعد تسلیم کیا ہو اور اس کے ماتحت موجودہ یونیورسٹیوں کی حالت پر تبصرہ۔ ۲. اس خاص یونیورسٹی کے عملی مسائل کی بحث اور ان کے حل کرنے کے لئے مفید مشورہ ۔ ۳. فارغ التحصیل طلباء کو عملی زندگی کے متعلق جس سے انہیں سابقہ پڑنے والا ہے ایسی ہدایتیں جن سے انہیں بصیرت اور فیضان حاصل ہو۔ یوں تو فاضل مقرر کے خطبہ میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں مگر کوئی اس معیار پر پوری نہیں اترتی جو ایسی وقیع علمی صحبت کی تقریروں کا ہے یا ہونا چاہئے۔

تعلیم کے نصب العین کی بحث میں موصوف نے کئی اہم مسئلے چھیڑے ہیں۔ لیکن اتنے اختصار سے کام لیا کہ نہ اپنا مطلب اچھی طرح واضح کر پائے اور نہ خیالات میں منطقی تسلسل اور ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ چند متفرق نکتے بیان کر دینے سے علمی تحقیق یا عملی رہنمائی کا فرض پورا نہیں ہوتا۔ پہلے فاضل مقرر نے یہ بحث اٹھائی کہ یونیورسٹی کی تعلیم میں عام متمدن تربیت اور کسی خاص فن کا مطالعہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر اتنا زور نہیں دینا چاہیئے کہ دوسرے کو نقصان پہونچے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ موصوف کے اندازِ بیان سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ ان کے نزدیک تعلیم کے ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ طبیعتوں کے لئے مناسب ہے۔ بعض کو ایک طرح کی تعلیم ملنی چاہیئے بعض کو دوسری طرح کی حالانکہ یونیورسٹی کی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ علم کو مرکز بنا کر ہر نوجوان متمدنی زندگی کے ہر شعبے سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرے تاکہ تمدن کا ایک مجموعی تصور اس کے ذہن میں قائم ہو سکے مگر اس کے ساتھ کسی ایک چیز کا گہرا مطالعہ کرے تاکہ اس کے ذریعے سے وہ کسی

حیثیت سے معاشرت کی عملی خدمت کر سکے اور اس کی بقا اور ترقی میں معاون ہو سکے۔
اس کے بعد موصوف نے اور اہم مقاصد کی طرف اشارہ کیا مگر صرف اشارہ ہی کر کے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اعلیٰ تعلیم میں اصل چیز یہ نہیں کہ بعض معلومات اور مشاہدات حاصل کرلئے جائیں بلکہ یہ ہے کہ نظر بینا پیدا کی جائے کہ انسان اپنے طبعی اور ذہنی ماحول کے تغیرات کو سمجھتا رہے اور ان سے مطابقت پیدا کرکے ہم آہنگ زندگی بسر کرے اس کے علاوہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی عملی خصوصیات اور معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھے اور نوجوانوں کو ہر قسم کے مفید پیشے اختیار کرنے کا شائق اور اس کے لائق بنا دے۔ مگر سب سے بڑا کام یونیورسٹی کا طالب علموں کے دلوں میں حق کی محبت، خدمت کا ذوق، وسعت نظر اور قوتِ ارادی پیدا کرنا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کی عملی ضروریات کے سلسلے میں موصوف کے نزدیک سب سے اہم سوال جو یونیورسٹی اور کالجوں کی تعلیم اور ان کے فرائض کی تقسیم کے متعلق ہے اس کا حل آپ نے یہ بتایا کہ تعلیم کالجوں میں ہو۔ یونیورسٹی صرف اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ اور معمل فراہم کرے مگر یہ بھی مالی دقتوں کے سبب سے فی الحال ناممکن ہے۔
مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی اس وقت تک مختلف کالجوں کا نام ہے جو ایک انتظامی سلسلہ میں مربوط کر دئے گئے ہیں۔ اب ان کو ملا کر وہ اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنا جو یونیورسٹی میں ہونا چاہیئے کیونکر ممکن ہے جو حل فاضل مقرر نے بتایا ہے اس سے نہ تو پوری نظری تشفی ہوتی ہے اور نہ زیادہ عملی مدد ملتی ہے۔

آخر میں فاضل مقرر نے طلباء کو نصیحت بھی کی گر یہ نصیحت رواج کے مطابق بس یہیں تک محدود ہے کہ انھیں سیاست میں شرکت نہیں کرنا چاہیئے۔ اس نصیحت کی جو دلیلیں ممدوح نے پیش کی ہیں۔ وہ ان دلائل سے کہیں زیادہ معقول ہیں جو عموماً ایسے موقعوں پر پیش کی جاتی ہیں۔ موصوف نے فرمایا کہ سیاست ہمیشہ فرقہ بندی اور نفاق پیدا کرتی ہے

یونیورسٹی کے طالب علموں کی جماعت کو ایک متفقہ برادری بن کر رہنا چاہیئے جس کا مشترکہ مقصد وہ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا کرنا ہو جو کشمکش حیات میں عملی حصہ لینے کے لئے ضروری ہے مگر فاضل مقرر نے ان نوجوانوں کی مشکلات پر غور نہیں فرمایا۔ ذہنی اور اخلاقی قوت پیدا کرنے کے لئے جن مؤثرات کی ضرورت ہے ان میں حب وطن۔ درد ملت۔ قوم کے سیاسی رہنماؤں کا احترام بھی شامل ہے۔ مگر یونیورسٹیاں حکومت کے دباؤ سے طلبہ پر ایسے قیود عاید کرتی ہیں کہ یہ جذبات بے تکلفی سے ظاہر نہیں ہونے پاتے بلکہ اپنے اظہار کی غیر معمولی راہیں ڈھونڈتے ہیں جن سے نقصان بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ پیش پا افتادہ بات ہے جسے نوجوانوں کا ہر معلم جانتا ہے بلکہ غالباً یونیورسٹیوں کے ارباب حل وعقد اور حامی حکومت سیاست داں بھی سمجھتے ہیں مگر حکومت کی مروت انہیں مجبور کرتی ہے کہ جب موقع ملے طالب علموں پر شورش پسندی کا الزام لگا دیں۔

اردو کی سب کتابیں

آپ مکتبہ جامعہ سے طلب فرمائیں

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب بی اے (آکسن)

نمبر ۱۰۵۲

رجسٹرڈ

اپریل ۳۲ء

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۸

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۲ء

نمبر ٤

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۲۱ | بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

۱۔ مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر	مولنا محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۲۹۴
۲۔ عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں	عبدالجلیل صاحب ندوی متعلم جامعہ	۳۱۰
۳۔ افغانوں کا سیاسی عروج و زوال	عبدالواحد صاحب سندھی متعلم جامعہ	۳۲۱
۴۔ خطابت کی سحر کاریاں (ترجمہ)	محب اللہ صاحب ندوی	۳۴۲
۵۔ غربت (فسانہ)	خواجہ منظور حسین صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۳۵۳
۶۔ تنقید و تبصرہ	ایڈیٹر	۳۶۵
۷۔ دنیا کی رفتار۔ ہندوستان	ش۔ق۔	۳۷۳
اسلامی ممالک	ن۔ن	۳۷۸
ممالک غیر	ذ۔ح	۳۸۴
۸۔ شذرات	ایڈیٹر	۳۸۹

محمد مجیب بی۔اے (آکسن)، پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ، دہلی سے شائع کیا

مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر

مصر میں مسلمان سنہ ۲۱ھ میں داخل ہوئے جبکہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں عمرو بن عاصؓ نے اس کو فتح کیا۔ اس زمانے میں مصر کی جو حالت تھی اس کو دکھلانے کے لئے ضرورت ہو کہ اختصار کے ساتھ وہاں کی قدیمی تاریخ بیان کر دی جائے۔

آج کل جو حصہ زمین مصر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کا مجموعی رقبہ تین لاکھ تراسی ہزار میل مربع ہے جو بیس ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس رقبے میں سے مزروعہ حصہ ۱۲ ہزار میل مربع سے زائد نہیں۔ یہ آبادی اور زراعت تمام تر ان قطعات میں ہے جن میں سے دریائے نیل گزرتا ہے۔ بقیہ حصہ بنجر۔ ریگستان اور بے آب و گیاہ ہے۔ درحقیقت مصر کی ساری دولت ثروت آبادانی اور رفاہیت کا ذریعہ یہی مبارک دریا ہے جس کا نام نیل ہے اور آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے

مورخین کا بیان ہے کہ قدیم اہل مصر حام بن نوح کے بیٹے مصرایم کی اولاد تھے جو شام کے ملک سے آکر وادی نیل میں جابجا قبیلے قبیلے آباد ہو گئے۔ اسی وجہ سے یہ ملک مصر کے نام سے مشہور ہوا یہ لوگ پانچ طبقوں میں منقسم تھے۔ پہلا طبقہ کاہنوں کا تھا جو دینی پیشوا تھے۔ ان کی کسی بات کی خلاف ورزی معبود کے حکم سے سرتابی کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ دوسرا طبقہ جنگی جماعت کا تھا جو دشمنوں کی مدافعت کرتا تھا۔ باقی تین طبقے تاجروں۔ کاشتکاروں اور گلہ بانوں کے تھے۔

اُس زمانے کے دستور کے مطابق بجز کاہنوں اور جنگ آوروں کے کوئی دوسرا زمین کی ملکیت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اراضی کا بڑا حصہ کاہنوں کے قبضے میں تھا اور کچھ جنگ آوروں کے بقیہ تینوں طبقے زمینیں ان سے ٹھیکے یا کرائے پہ لے کر کاشتکاری کرتے تھے۔

زمانہ دراز کے بعد جب ان قبائل کی تعداد زیادہ ہو گئی اور انتظامی ضرورت نے

محصور کیا تو انہیں میں سے ایک شخص منا نامی جو جنگی طبقے کا سرغنہ تھا بادشاہ بن گیا اور اس نے مصر میں پہلی سلطنت قائم کی جو ایک زمانے تک اس کی اولاد میں رہی۔ پھر دوسرا خاندان غالب آگیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ ۳۱ خاندان حکمراں ہوئے۔

ان اکتیس خاندانوں کا زمانہ پانچہزار سال قبل میلاد مسیح سے شروع ہو کر ۳۳۲ ق م میں ختم ہو جاتا ہے جبکہ سکندر اعظم نے آکر مصر کو فتح کر لیا اور وہاں یونانی حکومت قائم کر دی۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس قدیم تاریخ کے معتبر مصادر موجود نہیں ہیں کیونکہ میلاد مسیح سے پانسو سال قبل کی کوئی تصنیف نہیں ملی ہے سب سے پہلے مصر کا کچھ حال جس نے لکھا ہے وہ مشہور یونانی سیاح ہیروڈوٹس ہے جو ابو التاریخ کہا جاتا ہے اور جو چار سو پچپن سال میلاد مسیح سے پیشتر سواحل نیل سے گزرا تھا۔ اس کے دو سو سال کے بعد ایک مصری کاہن مانیتھو نے مصر کی تاریخ لکھی جو اگرچہ مفقود ہو گئی مگر اس کے جو حصے دوسرے مصنفوں نے نقل کر لئے تھے وہ باقی ہیں۔ انہیں سے قدیم حکمراں خاندانوں کے بادشاہوں کی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں۔

گذشتہ صدی میں نو سال کی لگاتار کوشش کے بعد فرانس کے مشہور اثری محقق شمپولن نے ۱۸۲۲ء میں ہیروغلیفی کتابت کو حل کر لیا جس کی وجہ سے آثار قدیمہ کے کتبے پڑھے جانے لگے اور پرانے ہیکلوں، معبدوں اور ان کے ستونوں اور دیواروں کے نقوش سے بعض بعض قدیم واقعات اور بادشاہوں کے کارنامے منکشف ہوئے۔ ادھر تقریباً نصف صدی سے مصر کے پرانے کھنڈر اور قبرستان کھودے جا رہے ہیں اور قدیمی عمارتوں سے آثار کی جستجو ہو رہی ہے جس سے کچھ کچھ تاریخی انکشافات ہوتے جاتے ہیں۔

قدیم اہل مصر جیسا کہ ان کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے متعدد دیوتاؤں اور دیبیوں کو پوجتے تھے۔ لیکن ان کے بڑے معبود دو ہی تھے۔ ایک فتاح یعنی خالق اکبر جس کا بت منف میں تھا جو قدیمی پایہ تخت تھا۔ دوسرا رع یعنی سورج جس کی مورت القصر میں جو آج کل لقصر کے نام سے مشہور ہے بنائی گئی تھی۔ لیکن رع کو وہ مستقل خدا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ خالق اکبر کی ایک

مظہری تمثال کی حیثیت سے اسکو پوجتے تھے اس کے بعد جوں جوں بت تراشی میں ترقی ہوتی گئی ان کے معبودون کے تنوع مین بھی اضافہ ہوتا گیا۔

بادشاہ بساممتیک اول (خاندان ۲۶) کے زمانہ میں جب یونانی مصر میں آئے اور وہاں رہے تو انہوں نے علوم مصریہ یعنی۔ ریاضی ہیأۃ اور نجوم وغیرہ کے ساتھ وہاں کے علم الاصنام کو بھی سیکھا اور مصری بتوں کو مع اُن کے ناموں کے یونان میں لیگئے۔

قدما مصر کا یہ خیال تھا کہ دیوتا بعض بعض حیوانات کی شکل مین جسم اختیار کر لیتے ہیں یہی وجہ تھی کہ وہ گائے ۔مگر۔ شہباز وغیرہ کو بھی پوجتے تھے۔

انکا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ موت کے بعد روح جسم کے ساتھ تعلق قائم رکھتی ہے اسی بنا پر وہ مردوں کی ممی بناتے تھے انہوں نے ایسی دوائیں معلوم کرلی تھین جن کی بدولت جسم غیر محدود زمانہ تک سڑنے سے محفوظ رہ سکے۔ انکا خیال تھا کہ جسم اگر ضائع ہوگیا تو روح بھٹکتی پھریگی اور اسکا کوئی ٹھکانا نہیں رہیگا۔ اس لئے امیر وغریب ہر ایک اپنے مردوں کی ممی بنواتے تھے اور اسکو محفوظ تابوت اور صندوق میں بند کرکے تہہ خانوں میں رکھتے تھے۔ امرا اور سلاطین ان پر پختہ عمارتیں بنوا دیتے تھے۔ چنانچہ مؤرخین کا خیال ہے کہ مصر کے اہرام وہاں کے بادشاہوں کے مقبرے ہین۔

ان میں ایک خاص رسم یہ بھی تھی کہ ممی تیار ہو جانے کے بعد پہلے اسکو ایک چبوترے پر لاکر رکھتے تھے جہاں مذہبی حکام۔ کاہن اور عوام الناس آکر جمع ہوتے اور اعلان کیا جاتا کہ اگر کسی کو اس میت پر کوئی دعوی ہو تو پیش کرے۔ اگر وہ بیگناہ نکلتا تو اسکو قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت ملتی۔ اسکے اقربا اُسی وقت اپنا ماتمی لباس اُتار دیتے اور اس کی برأت پر خوشی مناتے۔ اور اگر وہ گنہگار ٹھہرتا تو دفن سے ممنوع قرار پاتا۔ مجبوراً اسکے ورثہ اسکے تابوت کو لاکر اپنے گھر میں رکھتے جب اس قسم کے متعدد مردے کسی گھر میں جمع ہو جاتے تو کاہن زندون کی خاطر سے ان کو دفن

کرنے کی اجازت دیتے مگر قبرستان سے الگ۔ اس آخری احتساب میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جاتی تھی چنانچہ خوفو اور خفرع بادشاہوں کو بھی کاہنوں نے دفن ہونے سے روک دیا تھا۔

اس دستور کی وجہ سے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ کیونکہ آخری فضیحت اور رسوائی کے خوف سے وہ معاملات کو صاف رکھتے اور سب کے ساتھ نیک سلوک کرتے تھے۔

قدیم اہل مصر طب سے بھی واقف تھے اور اکثر بیماریوں کی شناخت اور انکی دوائیں جانتے تھے۔ ریاضی اور ہیأۃ سے بھی انکو ذوق تھا۔ جہانتک معلوم ہو سکا ہے دنیا میں قبطی ہی سب سے پہلی قوم ہیں جنہون نے شمسی سال ¼ ۳۶۵ دن اور قمری ۳۵۴ دن کا قرار دیا تھا فن تعمیر میں تو اہرام اور عجیب و غریب معبد اور ہیکل انکی ایسی یادگاریں ہیں جنکو آجتک ساری دنیا حیرت کے ساتھ دیکھتی ہے۔

مصر کی اس قدیم تاریخ کو مؤرخین نے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن مجھے یہاں تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ اُن ۳۱ خاندانوں کی خاص خاص تاریخی باتون اور یادگاروں پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے۔

مصر کا سب سے پہلا ہرم جو آج ہرم کوکمہ کے نام سے مشہور ہے۔ خاندان اول کے ایک بادشاہ ونفس کا تعمیر کردہ ہے۔ دوسرے خاندان میں بادشاہ بینوتریس بہت نامور گذرا ہے۔ جس نے یہ قانون بنایا تھا کہ خاندان میں اولاد ذکور نہونے کی صورت مین عورتوں کو تخت سلطنت پر بیٹھنے کا حق ہوگا۔ اسی نے دعویٰ کیا تھا کہ میں خدا کا رشتہ دار ہوں اسکے زمانہ سے یہ عقیدہ برابر یونانیون کے عہد تک ملوک مصر مین چلا آیا۔

تیسرے خاندان کے عہد میں فن کتابت اور سنگ تراشی میں ترقی ہوئی۔ ابوالہول کا عظیم الشان بت جسکا طول ۹۰ گز سے بھی زیادہ ہے اور جو اہرام جیزہ کے پاس آج بھی قائم ہے اسی زمانہ میں بنا تھا۔ اسکا جسم شیر کا ہے اور سر انسان کا جس سے قوت اور عقل

دونوں کے اجتماع کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھے خاندان میں سے خوفو بادشاہ نے مصر کا سب سے بڑا ہرم تعمیر کرایا جو جیزہ میں ہے اسکا ہر ضلع ساڑھے سات سو فٹ ہے اور بلندی ساڑھے چار سو۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس میں ایک لاکھ آدمی روزانہ کام کرتے تھے اور پورے تیس سال میں تیار ہوا پہاڑ سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ خلیفہ مامون عباسی جب سنہ ۲۱۰ھ میں مصر میں گیا اور لوگوں سے سنا کہ ان عمارتوں میں ملوک مصر کے خزانے ہین تو اسی ہرم کو تڑوانا شروع کیا۔ بہزار دقت صرف ایک حصہ ٹوٹ سکا اور صرفہ بہت پڑ گیا اسلئے چھوڑ دیا۔

اسی ہرم کے سامنے دوسرا ہرم جو کسی قدر اس سے چھوٹا ہے اسی خاندان کے ایک دوسرے بادشاہ خفرع کا بنایا ہوا ہے۔ تیسرا ہرم بھی جس کی بلندی ۲۰۳ فٹ ہے۔ اسی خاندان کے ایک بادشاہ منکورع نے بنایا تھا۔ اس منکورع کی نعش سنگین تابوت میں برآمد ہوئی تھی انگریز اسکو انگلستان لے جارہے تھے۔ راہ میں پرتگال کے ساحل پر جہاز ڈوب گیا۔ لیکن جثہ اور اسکا چوبیں غلاف جو انسان کی شکل کا تھا برآمد ہو گیا جو لندن کے میوزیم میں موجود ہے۔

چھٹے خاندان نے اپنی قوت بڑھا کر ایک طرف نوبیا اور دوسری طرف شام پر قبضہ کر لیا۔ جنگی کشتیاں بھی تیار کرائیں اور فیروزہ۔ توتیا اور تانبے کی کانیں نکالین۔ نیز کوہ طور سے لعل و جواہر برآمد کئے۔

گیارھویں خاندان نے اپنے عہد میں تجارتی غرض کے لئے مصر اور عرب کے راستہ کو ٹھیک کرایا۔ اسمین جا بجا منزلیں بنوائین اور کوئیں کھدوائے۔ یہی راستہ اسلام کے زمانہ تک رہا۔

بارھوین خاندان کے اوسرتسن نامی بادشاہ نے طیبہ کا ہیکل تعمیر کرایا۔ اسی کا بنوایا ہوا ایک ستون مطریہ میں موجود ہے جسپر ہیروغلیفی میں یہ کتبہ ہے

"بادشاہ منصور، ہر موجود کی حیات، بالائی اور نشیبی مصر کے فرمانروا، دونوں

تاجوں کے مالک، خورشید کے فرزند، اوسرتسن، مطریہ کے معبودوں کے محبوب نے، جو ہمیشہ زندہ رہے، اس نشان کو رسمی تیوہار کے آغاز میں اپنے نام سے اس جشن کی یادگار میں نصب فرمایا۔"

چودھویں خاندان کے خاتمہ پر شام اور عرب کے قبائل نے ٹڈی دل کی طرح مصر پر چڑھائی کی۔ جس قبیلہ نے ان کی قیادت کی وہ توریت میں عشین اور عربی تواریخ میں عمالیق کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے مصر کے بڑے بڑے ہیکلوں کو ڈھا دیا۔ شہروں کو آگ لگا دی۔ باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے زمانہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام جو انکے ہم قبیلہ تھے مصر میں تشریف لے گئے تھے اور عملیقی بادشاہ نے حضرت ہاجرہ کو ان کی خدمت کے لئے دیا تھا۔

مصر میں عمالقہ کے تین مختلف خاندانوں نے حکومت کی۔ آخری خاندان کے بادشاہ ابوقیس کے عہد میں حضرت یوسف علیہ السلام کو تاجروں کا قافلہ مصر میں لے گیا تھا اور اسکے وزیر دوفر نامی کے ہاتھ بیچا تھا۔ اسی خاندان کے آخر میں مصریوں نے پھر اپنی حکومت قائم کرلی اور احمس بادشاہ نے عمالقہ کو پورے چھ سو سال کے بعد مصر سے نکال کر اپنا تسلط جمایا۔ جبل قرنہ پر دیر بحری سے اسکی ممی نکلی ہے جو جیزہ کے انتیقہ خانہ خدیوی میں موجود ہے۔

اسی خاندان کا ایک بادشاہ تحوتمس ثالث تھا جس نے ایک طرف عرب۔ شام عراق ایشیائے کوچک اور کردستان وغیرہ کو فتح کیا اور دوسری طرف بحری بیڑہ سے۔ قبرس کریٹ۔ یونان اور اطالیہ کے جنوبی حصہ پر قابض ہوگیا۔ اسکے بنائے ہوئے دو ستون مطریہ میں تھے جو ملکہ قلیوپطرا کے عہد میں اسکندریہ میں لاکر رکھے گئے تھے۔ اب انمیں سے ایک انگلستان میں ہے اور ایک امریکہ میں۔ اسی خاندان کا بادشاہ توت انخ عمون تھا جس کی نعش مع اسکی ملکہ کی نعش کے بے شمار خزانہ اور طلائی تخت وغیرہ کے ساتھ آٹھ سال کا عرصہ ہوا الاقصر سے نکلی ہے۔

انیسویں خاندان میں مصر کا سب سے بڑا بادشاہ رعمیس اکبر تھا جس کی محبت اور عظمت مصریوں کے دلوں میں حد عبادت تک پہونچگئی تھی اس نے کنعانیوں پر دو لاکھ فوج کے ساتھ حملہ کیا اور ۱۶ سال تک لڑتا رہا۔ بالآخر مصالحت ہوئی۔ چاندی کے پتروں پر صلح نامہ لکھا گیا جو آج لندن کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ اس رعمیس کا بیٹا مفتاح تھا یعنی وہ فرعون جو حضرت موسی اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے سمندر مین غرق ہوا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کی نعش برآمد ہوگئی ہے۔ جیزہ کے عجائب خانہ میں رکھی ہوئی ہے اور دیکھنے والون کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ کہ یہ مشت خاک اور خدائی کا دعویٰ!!

بلیسویں خاندان میں ایک بادشاہ رعمیس ثالث تھا جسکی ممی پیرس کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

اکیسویں خاندان کے آخری بادشاہ کے زمانہ مین اشور کے بادشاہ نمرود نے چڑھائی کرکے مصر پر حکومت قائم کرلی جو ۱۰۰ سال تک اسکے خاندان میں رہی۔ اسی زمانہ میں بابلی اور اشوری تہذیب مصر میں پہونچی۔

نمرود کے بیٹے ششنق کی صورت کرنک کے ہیکل کی چاردیواری پر موجود ہے سر پر شاہی تاج۔ ہاتھ میں مصری تلوار اور سامنے حضرت سلیمان کے بیٹے رحیعام کی تصویر جنکی گردن میں رسّی پڑی ہوئی ہے۔

چھبیسوین خاندان کے بادشاہ بسامتیک نے یونانیوں کی مدد سے تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ اسلئے اسکے عہد میں انکو عروج ملا۔ اور بڑی بڑی جاگیریں اور امارتین دی گئین۔

ان یونانیون نے مصر مین مدارس قائم کئے جن مین ان کے ملک کے بہت سے طلبا تحصیل علم کے لئے آنے لگے۔ فیثاغورث۔ بقراط۔ جالینوس۔ افلاطون۔ اور ارسطو وغیرہ اکثر حکمائے یونان نے اپنے اپنے زمانوں میں آکر ان مین علوم حاصل کئے۔

اسی خاندان کے آخر مین کے بہمن پسر اسفندیار نے مصر کو جاکر مسخر کرلیا۔ ایک عرصہ تک

رس وہاں حکومت کرتے رہے۔ آخر میں ایک مصری رئیس تیں نامی نے ان کو مصر سے نکالا اور
ومت قائم کرلی۔ مگر کچھ ایسے انقلابات پیش آئے کہ ۶۰ سال کے عرصے میں تین مختلف مصری خاندانوں
ومت تبدیل ہوتی گئی آخر میں پھر ایرانیوں نے آکر قبضہ کرلیا۔ انھیں کی حکومت میں دارا
تھا کہ ۳۳۲ ق م میں سکندر نے مقدونیہ سے نکل کر مصر سے طرابلس تک فتح کرلیا۔ اپنے نام
سکندریہ آباد کراکے وہاں ایک نائب چھوڑا اور ایران کو فتح کرتا ہوا ہندوستان تک پہنچا
یں بابل میں انتقال کرگیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا جثہ اسکندریہ میں لاکر دفن کیا گیا۔

اسکندر کی فتح سے مصر میں یونانی حکومت قائم ہوگئی جو چند سال تک اس کے خاندان
رہی۔ پھر بطلیموس نے جو بابل میں اس کا نائب تھا مصر پر خودمختارانہ قبضہ کرلیا۔

اسی خاندان کی آخری تاجدار ملکہ قلیو بطراتھی جس کے جام زہر نوش کرنے کے بعد سنہ ۳۰ ق م
س کی حکومت قیصر آگسٹس کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس وقت سے مصر رومی سلطنت کا ایک
ہ ہوگیا۔

سنہ ۳۹۵ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مغربی حصہ کا پایہ تخت رومۃ الکبریٰ
اور مشرقی حصہ کا قسطنطنیہ قرار پایا۔ مصر اسی حصہ کا ماتحت رہا۔

آغاز عہد اسلام میں قسطنطنیہ کے تخت پر قیصر ہرقل تھا۔ اس نے ایک قبطی امیر مقوقس کو مصر
الی مقرر کیا تھا۔ اسی کے عہد میں سنہ ۶۲۹ء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک عظیم القبط کے
حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے۔ مقوقس اسلام تو نہیں لایا مگر ایک خچر جس کا نام دلدل تھا اور
دو لونڈیاں مع دیگر ہدیوں کے اس نے رسول اللہ کی خدمت میں بھیج دیں۔ انھیں میں سے ایک
رت ماریہ قبطیہ تھیں جن کے بطن سے حضور اکرم کے بیٹے ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔

اس طرح پر حضرت ہاجرہ کے قدیمی رشتے کے بعد اہل مصر کا ایک جدید رشتہ بھی رسول عربی
ساتھ قائم ہوگیا۔

اسلامی سنہ ۱۸ھ مطابق سنہ ۶۳۹ء میں طاعون عمواس کے بعد حضرت عمر جب فوج کے انتظام

لئے مدینہ سے شام میں تشریف لے گئے تو عمرو بن عاص رضؓ نے تنہائی میں ان سے عرض کیا کہ مجھے
ے کی اجازت دیجئے۔ کیونکہ اس کے فتح کر لینے سے رومیوں کی قوت ٹوٹ جائے گی اور
م کی شوکت بڑھے گی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی کلفت اور مشقت کے خیال سے اس دور دراز
باس پیش و پیش کیا لیکن عمرو بن عاصؓ نے اپنے عزم راسخ سے کامیابی کی ایسی قوی امید دلائی کہ
کار راضی ہوگئے اور چار ہزار سوار جو سب کے سب یمن کے قبیلہ کعب کے تھے۔ ان کے ساتھ
ے۔ وہ اس وقت اسی فوج کو لے کر روانہ ہوگئے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ جس طرح شام میں دربا
ت سے ہم کو مسلسل کمک آتی رہی ہے اسی طرح مصر میں بھی آئے گی۔

ان کے روانہ ہو جانے کے بعد امرار اسلامی نے تعجب ظاہر کیا کہ ایسے ملک میں جہاں کم سو
ہزار فوج حفاظت کے لئے موجود ہے۔ عمرو بن عاصؓ ان مٹھی بھر آدمیوں سے کیا کریں گے۔
رت عثمان نے خود خلیفہ سے جا کر کہا کہ ابن عاص امارت کا سخت حریص اور پیش قدمی اور حملے میں
یت بے باک ہے ایسا نہ ہو کہ اس جماعت کو ورطۂ ہلاکت میں ڈال دے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

عمرو بن عاصؓ بیابان سینا سے گزر کر مقام عریش میں پہنچے اور اس کو فتح کر لیا۔ یہ ذی الحجہ
دسویں تاریخ تھی۔ وہاں قربانی کی اور فوج کو دعوت کھلائی۔

عریش سے نکل کر فرما کی طرف بڑھے یہ ایک بڑا شہر تھا جس کے گرد فصیل تھی اور ملک مصر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا اس وجہ سے
لت کے لئے رومی ہزار فوجیں رکھی جاتی تھیں۔ عمرو بن عاصؓ نے محاصرہ کیا اور ایک مہینہ کے بعد محرم کو اس کے اندر
ل ہو گئے۔ اب رومی فوجیں مقام عین شمس پر جمع ہوئیں اور پوری طاقت سے مقابلہ کی تیاری کرنے لگیں۔ عمرو بن عاصؓ نے
ر خلافت سے امداد طلب کی۔ وہاں سے دس ہزار فوج آئی جس میں مشاہیر صحابہ میں سے حضرت زبیر بن عوام مقداد
سود، عبادہ بن صامت، مسلمہ بن مخلد، ابو الدرداء اور شرجیل بن حسنہ وغیرہ تھے۔

رومی سپہ سالار تھیوڈر لشکر لے کر بڑھا۔ کھلے میدان میں مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے ایسی
ست دی کہ اس کی بیس ہزار فوج میں سے صرف تین سو آدمی اپنی جانیں بچا سکے جو قصر شمع کی طرف
ماگے تھے باقی سب کے سب مارے گئے۔

قصر شمع ایک محفوظ قلعہ تھا جس میں والیٔ مصر مقوقس خود موجود تھا۔ اب مسلمانوں نے بڑھ کر اس کا محاصرہ کیا۔ مقوقس نے چند روز کے بعد عمرو بن عاص کے پاس دو آدمی بھیجے اور لکھا کہ

"تم لوگ ہمارے ملک میں گھس آئے اور جنگ کرنے لگے۔ اب ایک رومی لشکر آرہا ہے جو ہر طرح کے ساز و سامان سے مسلح ہے وہ یقیناً تم کو فنا کر دے گا۔ لہٰذا تمھارے حق میں بہتر یہ ہے کہ صلح کر کے چلے جاؤ ورنہ اس کے آجانے کے بعد کوئی گفتگو نہ ہوگی۔"

حضرت عمرو بن عاص نے جواب دیا کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لو۔ اسلام یا جزیہ یا جنگ۔

مقوقس عین شمس کی ہولناک جنگ سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسلمان اس قلعہ کو بھی یقیناً فتح کر لیں گے۔ لہٰذا ان کے ساتھ صلح کر لینی چاہئے۔ چنانچہ ان کے مشورے سے اس نے عمرو بن عاص کو پھر لکھا کہ آپ اپنا قائم مقام بھیجئے شاید صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔ انھوں نے عبادہ بن صامتؓ کو دس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا اور حکم دیا کہ تمھیں گفتگو اور بجز ان تینوں باتوں کے جو میں نے لکھی ہیں اور کوئی بات قبول نہ کرنا۔

حضرت عبادہ کا طول قامت دس بالشت تھا اور رنگ سیاہ۔ مقوقس ان کو دیکھ کر گھبرا اور کہا کہ تم میں سے کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ گفتگو کرے۔ مسلمان بولے کہ وہ عقل ورائے میں ہم سے بہتر اور درجے اور رتبے میں افضل ہیں اور ہمارے امیر نے انھیں کو اپنا نائب مقرر فرمایا ہے۔ مجبوراً مقوقس نے ان کو کلام کی اجازت دی۔ انھوں نے کہا کہ

"ہماری لڑائی کسی دنیاوی غرض سے نہیں بلکہ محض اعلاء کلمۂ حق کے لئے ہے نہ ہم دنیاوی آسائش کے جویا ہیں۔ راحت کی جگہ تو آخرت ہے۔ ہمارے اللہ اور رسول نے یہی ہم کو بتلایا ہے اور اس بات کا عہد لیا ہے کہ ہم اپنی ساری توجہ رضائے الٰہی کی طرف رکھیں اور دنیا کی نعمتوں سے صرف ضروری غذا و لباس پر قناعت کریں۔"

مقوقس نے پسندیدگی سے سر ہلایا۔ پھر نصیحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی دھمکی دینی شروع کی اور کہا کہ

"بے شک تمھاری یہی حالت ہے لیکن اب تمھارے مقابلے کے لئے ایک رومی لشکر آرہا ہے جن کی شجاعت مسلم ہے اور جو اس کی پروا نہیں کرتے کہ کس سے لڑتے ہیں اور ان کا مدمقابل کون ہے۔ تم یہاں پڑے ہوئے مصیبتیں اٹھا رہے ہو۔ اس لئے میں تمھاری حالت پر ترس کھا کر مشورہ دیتا ہوں کہ صلح کر لو۔ تم میں سے ہر ایک کو دو دو دینار امیر کو ایک سو اور خلیفہ کو ایک ہزار دیدوں گا۔ اس کو لے کر اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ قبل اس کے کہ وہ لشکر آجائے جس کے مقابلے کی طاقت تم نہیں رکھتے۔"

حضرت عبادہ نے فرمایا۔

"تم جو رومیوں کی قوت اور ان کی کثرت سے ہم کو ڈراتے ہو تو اس دھوکے میں نہ رہو کہ اس سے ہمارے ارادوں میں کچھ بھی فتور پڑ سکے گا۔ کیونکہ ہم سب اگر قتل بھی ہو گئے تو یہ ہمارے رب کی رضامندی اور حصول جنت کا ذریعہ ہو گا جس سے بڑھ کر کوئی شے ہم کو محبوب نہیں۔ ہم میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ہو گا جو یہاں سے لوٹ کر اپنے اہل وعیال کے پاس جانے کا خواہشمند ہو بلکہ ہر ایک صبح اور شام یہی دعا کرتا ہے کہ اللہ اس کو شہادت سے سرخرو فرمائے۔ اس لئے تم ہمارا خیال چھوڑ دو اور اپنی مصلحت دیکھ کر ان تینوں صورتوں میں سے جو پیش کی گئی ہیں کوئی صورت اختیار کر لو۔"

مقوقس نے کہا کہ کیا ان کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس گفتگو کے بعد رخصت ہو کر واپس چلے آئے۔ مقوقس نے اپنے اصحاب کو سمجھایا کہ اسلام یا جزیہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی پسند کر لو کیونکہ تم ان کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے

لیکن انھوں نے اس کی بات نہ مانی اور جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد مسلمانوں کے سخت حملوں کی تاب نہ لاکر آخر مصالحت پر مجبور ہوئے۔ مسلمان بلائے گئے اور یہ عہد نامہ لکھا گیا۔

"عمرو بن عاص اور مقوقس باہم اس بات پر صلح کرتے ہیں کہ اہل اسلام تمام ملک میں ہر ایک قبطی سے جو بالغ ہے خواہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ دو دینار جزیہ سالانہ لیں گے۔ بڈھے بچے۔ عورتیں اور معذور اشخاص اس سے بری ہیں۔ اہل مصر کے اراضی و اموال انھیں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اور ان کے مذہبی رسوم میں کسی قسم کا دخل نہیں دیا جائے گا"

یہ عہد مقوقس نے اپنے کل ہم قوموں یعنی اقباط مصر کی طرف سے کیا تھا۔ اس کے بعد رومیوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو ان شرائط پر صلح کر کے مصر میں رہو نہیں تو اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔

جب یہ عہد نامہ منظوری کے لئے ہرقل کے پاس بھیجا گیا تو اس نے مقوقس کو سخت توبیخ کی اور لکھا کہ عرب کی حقیر قوت کے مقابلے میں تم نے کیوں دب کر صلح کر لی اور سارا ملک ان کے حوالے کر دیا میں اس عہدنامے کو جائز نہیں قرار دیتا۔ رومی امیروں کو حکم بھیجا کہ تم جنگ جاری رکھو۔ مقوقس اپنی جماعت کو لے کر قلعے سے باہر نکلا اور نیل کے اُس پار مقام جزیرہ میں اپنے قصر میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ وہاں سے عمرو بن عاص کے پاس کہلا بھیجا کہ میں نے جو عہد نامہ لکھا ہے اس پر قائم ہوں۔ میری قوم ان شرائط کو پورا کرے گی لہٰذا اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

حضرت عمرو بن عاص نے لکھا کہ ہم بھی عہدنامے کی پابندی کریں گے لیکن قبطیوں کو چاہئے کہ ہمارے راستے میں فلاں فلاں دو مقامات پر پل بنائیں اور جہاں جہاں ہماری فوج خیمہ زن ہو وہاں بازار لگائیں اور سامان رسد پہنچائیں۔ قبطی اس پر رضامند ہو گئے۔

بعض مورخین نے مقوقس کے اس فعل کو خیانت اور غداری قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ رومی فوج کسی طرح عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خود قیصر ہرقل اپنی پوری قوت کے ساتھ ان کے مقابلے میں شکست پر شکست کھا کر شام کا ملک چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ اس

کے علاوہ اس کی قوم رومیوں کے ظلم وستم سے جاں بلب تھی۔ اور عربوں کی حکومت میں اس کو دینی آزادی اور دنیاوی آسائش نظر آئی۔ ایسی صورت میں اس کے لئے سوائے مصالحت کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس نے نہ صرف مفتوحہ علاقہ بلکہ کل ملک مصر کی طرف سے عہدنامہ لکھدیا۔

قیصر نے اس کو قسطنطنیہ طلب کیا اور باز پرس کی۔

رومیوں نے مقابلہ شروع کیا لیکن اسی درمیان میں قیصر انتقال کر گیا جس کی وجہ سے ان کا نظام ابتر ہوگیا۔ مسلمانوں نے ان کو شکست دیتے ہوئے بہت تھوڑے عرصے میں پہنچ کر اسکندریہ کا بھی جو ان کا مرکز تھا محاصرہ کر لیا۔ وہاں رومیوں کے ساتھ ۲۰ اکتوبر ۶۴۱ء میں معاہدہ لکھا گیا عجیب بات یہ ہے کہ اس معاہدے میں رومیوں کا نمائندہ بھی مقوقس ہی تھا جو قیصر کے انتقال کے بعد اسکندریہ میں واپس آگیا تھا۔ معاہدہ کی دفعات یہ تھیں۔

(۱) یہ عارضی صلح صرف گیارہ مہینے کے لئے ہے۔ ۲۸ ستمبر ۶۴۲ء کو اس کی مدت ختم ہو جائیگی۔

(۲) اس اثنا میں عرب رومیوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے بشرطیکہ وہ کوئی مخالفانہ رویہ نہ اختیار کریں۔

(۳) کسی رومی فوج کو مصر کی سرزمین میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے۔

(۴) مسلمان کنیسوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے نہ کسی دینی معاملے میں مداخلت کریں گے۔

(۵) یہود کو شہر اسکندریہ میں سکونت کا حق حاصل رہے گا۔

(۶) اسکندریہ کی محافظ رومی فوج اپنا سامان لے کر بحری راستے سے جا سکتی ہے۔ مگر جو لوگ خشکی سے جانا چاہیں گے ان کو جزیہ دینا ہوگا۔

(۷) شرائط معاہدے کی ضمانت کے لئے رومی فوج کے ۱۵۰ سردار مسلمانوں کے پاس بطور رہن رہیں گے۔

اس معاہدے کے بعد جنگ ختم ہوگئی اور بہت تھوڑے عرصے میں رومی فوج نے تمام مصر کو خالی کر دیا اور بالائی اور نشیبی کل علاقوں پر مسلمان قابض ہوگئے۔

اسکندریہ کے اطراف کے باشندوں نے دوران جنگ میں رومیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے
نقصانات پہنچائے تھے اس لئے عمرو بن عاص نے ان سب کو مع اہل و عیال کے گرفتار کر کے
مال غنیمت کے ساتھ دربار خلافت میں بھیج دیا۔ مگر حضرت عمر نے ان کے جرائم معاف کر کے ذمیوں
میں شامل کر دیا۔ اور پھر ان کو مصر میں واپس بھیج دیا کہ اپنے گھروں میں رہیں اور اپنی ملکیتوں پر
قابض رہیں۔

اسلامی فوج کا خیال تھا کہ مصر کو ہم نے جنگ سے فتح کیا ہے اس لئے اس کو سپاہیوں میں
تقسیم کر دینا چاہئے۔ مگر عمرو بن عاص اور خلیفۂ وقت نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اتنے بڑے ملک کو غنیمت
قرار دے کر اس کے باشندوں کو غلام بنا کر فوج میں تقسیم کر دیں۔ اس وجہ سے اہل مصر کو ذمی اور اس کی
زمین کو خراجی قرار دیا۔

عمرو بن عاص نے کل ملک مصر کو دو سال کے عرصے میں فتح کر لیا۔ اس کے بعد برقا اور
طرابلس غرب کو بھی قبضے میں لائے۔ تونس کا بھی ارادہ رکھتے تھے مگر حضرت عمر نے ان کو آگے
بڑھنے سے روک دیا۔ اور حکم بھیجا کہ جس قدر علاقہ قبضے میں آچکا ہے اسی کا انتظام مکمل کر دو۔
اس وقت سے آج تک مصر مسلمانوں کے زیر حکومت ہے۔ یہ اسلامی عہد بارہ تاریخی دوروں میں منقسم ہوتا ہے۔

(۱) خلافت راشدہ	۶۳۹ء سے	۶۶۱ء تک
(۲) بنی امیہ	۶۶۱ء "	۷۵۰ء "
(۳) عباسیہ اول	۷۵۰ء "	۸۷۰ء "
(۴) طولونی	۸۷۰ "	۹۰۵ "
(۵) عباسی بار دوم	۹۰۵ "	۹۳۴ "
(۶) اخشیدی	۹۳۴ "	۹۶۹ "
(۷) فاطمی	۹۶۹ "	۱۱۷۱ "
(۸) ایوبی	۱۱۷۱ "	۱۲۵۰ "

(۹) مالیک بحری ۱۲۵۰ء سے ۱۳۸۲ء تک
(۱۰) مالک چرکس ۱۳۸۲ " ۱۵۱۷ "
(۱۱) عثمانیہ ۱۵۱۷ " ۱۸۰۱ "
(۱۲) خدیوی ۱۸۰۱ء سے آج تک

اب میں اختصار کے ساتھ الگ الگ عنوانات میں اس اسلامی اثر کو بیان کروں گا جو مصر پر پڑا اور جو میرے اس مقالے کا موضوع ہے۔

مرکز

قدیم زمانے میں فراعنہ مصر کا دار السلطنت پہلے طیبہ تھا پھر منف جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ سکندر نے جب قبضہ کیا تو اپنے نام پر اسکندریہ کو آباد کرایا۔ اس وقت سے وہی مرکز قرار پا گیا اور ساحل بحر پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک عظیم الشان بندرگاہ اور شہر ہو گیا۔ رومیوں نے بھی اپنے عہد میں اسی کو مستقر رکھا۔

عمرو بن عاص نے جب اسکندریہ فتح کیا تو اس کی جملہ شاہی عمارتیں ان کو خالی ملیں۔ چاہتے تھے کہ اسی کو صدر مقام رکھیں لیکن حضرت عمر جو اپنے اور کسی دوسرے اسلامی مرکز کے درمیان دریا کا حائل ہونا پسند نہیں کرتے تھے راضی نہ ہوئے۔ اس لئے دریائے نیل کے اسی پار قصر شمع کے متصل جو زمین ہے اس کو منتخب کیا۔ یہ جگہ عرب اور مصر کے قریب ترین نقطۂ اتصال پر ہے اور یہاں سے مصر کے دونوں اطراف شمالی اور جنوبی کی نگہداشت ہو سکتی ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی صحت بخش ہے۔ ایک طرف دریائے نیل ہے اور دوسری طرف کوہ مقطم اور سارا قطعہ سرسبز و شاداب ہے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ پہلے اسی مقام پر عربی فوج نے ڈیرے ڈالے تھے جب اسکندریہ کو روانہ ہونے لگے اس وقت عمرو بن عاص کے خیمے میں ایک کبوتر نے گھونسلہ بنا کر انڈے دے دئے تھے انھوں نے اس پرندکی خاطر سے اس کو اسی طرح چھوڑ دینے کا حکم دیا اور کہا کہ مت اکھاڑو ورنہ ہمارے اس مہمان کو تکلیف ہوگی۔ جب اسکندریہ کی مہم سے واپس آئے تو اسی میں اترے اور اسی

یلہ شہر تعمیر کرایا۔ ڈیرہ کو عربی میں فسطاط کہتے ہیں اس وجہ سے اس شہر کا نام فسطاط رکھدیا گیا۔ س کے ارد گرد فصیل بنوائی اور وسط میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی جس کی سمت قبلہ کی عیین میں ۸۰ صحابۂ کرام شریک تھے۔

عرب کے بعض قبائل مثلاً حمیر۔ ازد اور ہمدان وغیرہ کے لوگوں نے چہار دیواری کے اندر سکونت رکھنے کو شجاعت کے منافی سمجھا۔ اس لئے باجازت خلیفہ ان کو ایک دوسرے قطعے میں آباد کرایا جس کا نام جیزہ رکھا اور جو آج تک آباد ہے۔

فسطاط مدت تک مصر کا صدر مقام اور وہاں کی تہذیب اور تجارت کا مرکز رہا جس جس محلے میں چار چار گھر آباد ہوتے تھے۔ ان میں چار چار سو آدمیوں کی سکونت ہوگئی۔ امیر معاویہ کے زمانے میں چالیس ہزار فوج یہاں رہتی تھی۔ ابن طولون کے عہد میں اس کی آبادی اس قدر بڑھ گئی کہ اس کو اس کے متصل ایک دوسرا شہر قطائع کے نام سے اپنی فوج کے لئے آباد کرنا پڑا۔ چوتھی صدی ہجری کا مشہور سیاح بشاری لکھتا ہے کہ "فسطاط بغداد کا مدمقابل، مغربی تجارت کا مرکز اور مسلمانوں کا مایۂ فخر ہے۔ دنیائے اسلام میں یہاں کی جامع مسجد سے زیادہ کہیں علمی مجالس نہیں ہوتیں نہ یہاں کی بندرگاہ سے زیادہ کہیں کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں۔

۳۵۸ھ میں جب خلفاء فاطمیہ کا مصر پر قبضہ ہوا اور شہر قاہرہ تعمیر کر کے مرکز بنایا گیا اس وقت سے فسطاط کی رونق کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ صلیبی ہنگاموں کے دوران میں وہ بالکل ویران ہوگیا۔ مگر اب تک جامع عمرو بن عاص اپنی جگہ پر موجود ہے۔

عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں

پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے عرب دنیا کے طول وعرض میں چھا گئے۔ کم ایسے خطے تھے جہاں کے وہ حکمراں نہ بن چکے ہوں یا کم از کم اپنے اثرات ہی سے دنیا کو متاثر نہ کیا ہو اکثر وبیشتر مقامات پر انھیں کی تہذیب تھی اور انھیں کا تمدن، اس لئے بعض قوموں کے بعض ان افراد نے جن کا قومی، وطنی اور مذہبی جذبہ قوی نہ تھا اس محکومیت کو قومی ذلت اور اپنی شاندار روایات کے بالکل منافی سمجھا اور اس نئی اسلامی تہذیب کو مشتبہ نظروں سے بھی دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اختلاط ایک نہ ایک دن ان کی قومیت ان کے مذہب اور لسانی امتیاز کو بالکل جڑ سے اکھاڑ کر رہے گا رسوائی کا یہ احساس اور اپنی ہستی کے فنا ہونے کا یہ خطرہ ایک سے زیادہ قوموں کے زیادہ افراد کو تھا لیکن بالخصوص ایرانیوں کو زیادہ تھا۔

ان الفرس کانوا من سعة الملك وعلو الید علی جمیع الامم وجلالة الخطیر فی انفسهم حتیٰ انهم کانوا یسمون انفسهم الاحرار والابناء وکانوا یعدون سائر الناس عبیداً لهم فلما امتحنوا بزوال الدولة عنهم علی ایدی العرب وکانت العرب اقل الامم عند الفرس خطراً فتعاظمهم الامر وتضاعفت لدیهم المصیبة

ایرانی اپنی وسیع سلطنت اور علو مرتبت کے اعتبار سے تمام قوموں پر غالب تھے اس لئے اپنے آپ کو آزاد اور دوسروں کو غلام سمجھتے تھے لیکن جب ان کی حکومت عربوں کے ہاتھ میں چلی گئی جس کو کہ یہ اپنے سے فروتر سمجھتے تھے تو یہ ان کو بہت شاق گذرا

انھیں خطرات اور اپنے ان احساسات کی بنا پر ایک ایسی چال چلنے پر مجبور ہوئے جو ایک عرصے بعد مسلمانوں کے انتشار اور ان کی سلطنت کی کمزوری کا سبب بنی۔ وہ چال یہ تھی کہ بظاہر مسلمان ہونے کا اظہار کیا جائے لیکن باطن میں خفیہ طور پر ان کے مٹانے کی فکر ہو۔ یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ

(۱) الملل والنحل ابن حزم صفحہ ۱۱۵

مسلمانوں کی اس وقت کی قوت کے آگے کوئی دوسرا طریقہ مقابلہ کا مشکل تھا چنانچہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر سب سے پہلے شرعی احکامات میں تاویل اور تنقید کا رواج عام دیا۔

(۱) راموا عند شوكة الاسلام تاويل الشرايع على وجوه تعود الى قواعد اسلافهم وذالك انهم اجتمعوا فتذاكروا ما كان عليه اسلافهم من الملك وقالوا لا سبيل لنا الى دفع المسلمين بالسيف لغلبتهم واستيلائهم على الممالك ولكنا نحتال بتاويل شرايعهم الى ما يعود على قواعدنا ونستدرج به الضعفاء منهم فان ذلك يوجب اختلافهم واضطراب كلمتهم۔

اسلام کی بڑھتی ہوئی شوکت سے خائف ہو کر ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ شریعت کی تاویل اس طریقے پر کی جائے جو ان کے اسلاف کے طریقوں کی طرف ان کو لے جا سکے اس لئے وہ جمع ہوئے اور اپنے بزرگوں کے بلند مرتبت کو یاد کیا اور چونکہ کوئی دوسرا طریقہ مسلمانوں کی قوت اور ان کے استیلاء کی وجہ سے نہ سوجھا سوائے شریعت کی تاویل کے کہ یہی ان میں (مسلمانوں میں) اضطراب اور اختلاف کا باعث ہو سکتا تھا۔

دوسرا موثر اور کارگر آلہ جو اختیار کیا گیا وہ میلان شعیت کا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ جماعت تھی کہ جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ان کی اولاد سے کوئی محبت تھی، ان کے نزدیک آل علیؓ اور دیگر عرب یکساں تھے صرف اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے یہ ایک بہتر صورت تھی وہ خوب سمجھتے تھے کہ عام مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے جتنا شغف ہے کسی سے نہیں ہو سکتا۔

"از ابتدائے (۲) اسلام مخصوص از روزے کہ ایران بدست سعد بن وقاص از طرف خلیفہ دوم

---

(۱) شرح مواقف

(۲) یہ اور اس کے بعد تین چار مقامات پر جو اقتباسات دئے گئے ہیں "تجلیات روح ایرانی در ادوار تاریخی" ایک فارسی رسالے کے ہیں۔ یہ رسالہ ایران کے ایک مشہور قوم پرست حسین کاظم زادہ کا ہے اس میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ روح خاص جو زمانۂ قدیم سے ایرانیوں میں چلی آتی ہے اب تک باقی اور زندہ ہے اور اس روح سے ان کی مراد جذبۂ قوم پرستی، وطن پرستی اور مذہب پرستی ہے۔ وہ

فتح و استیلا گردید۔ ایرانیاں کینہ و حس انتقام را در دل خود می پروریدند و ایں حس و کینہ و انتقام در مواقع عدیدہ خود نمائی می کرد و از پردۂ بیروں می افتاد تا اینکہ با تاسیس فرقہ تشیع بکلی ظاہر گشت۔"

"محبت مخصوص از ابتدائے اسلام ایرانیاں نسبت بخاندان رسول صلعم، حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) و اولاد او بہم رسانیدہ خیلے از اسباب معلومہ یک علت سیاسی نیز داشت۔ وگرنہ ہمہ قبائل عرب و پیشوایان اسلام برائے ایرانیاں یکے بود و یا ہیچ کدام خویشی و روابط مخصوص پیش از وقت نداشتند۔"

صحیح طور پر یہ بتانا کہ کس وقت اور کس کے عہد حکومت میں انھوں نے تشیع کا اظہار کیا، ذرا مشکل ہے۔ البتہ یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ بنوامیہ کے زمانے میں انھوں نے بھی اپنے مخبر، داعی، قاصد اور نقیب سلطنت امیہ کے چپہ چپہ پر پھیلادئے تھے، اور یہ وہ موقعہ تھا جب دو دو جماعتیں علویہ اور عباسیہ متحدہ سازشی قوت کے ساتھ بنوامیہ کی حکومت کو مٹانے کے درپے تھیں جو ایک خالص عربی حکومت تھی، ظاہر ہے کہ اس سے بہتر موقعہ عربوں کے خلاف ان کو اور کب مل سکتا تھا، چنانچہ ان کے مخبروں اور داعیوں نے وہ کر دکھایا جو ایک بڑی سے بڑی اور طاقتور حکومت بھی اپنے مخالف کے مقابلے میں مشکل کر سکتی، بالآخر انھیں کے ایک شخص ابو مسلم جو خالص ایرانی اور مجوسی النسل تھا بنوامیہ کی حکومت کو برباد کرنے اور ان کی جگہ عباسی حکمراں کو متعین کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بنوعباسیہ کی حکومت کسو خود ان کی کوشش کا

لکھتے ہیں اسی جذبہ کا اثر تھا کہ جس نے ایرانیوں کو مختلف مذاہب اور قوموں کے مقابل سینہ سپر کیا پھر اسلام کے خلاف بھی انھوں نے اپنے اس جذبہ کا ثبوت دیا۔

ایرانیوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار حسین کاظم، ابن حزم اور ان کے علاوہ اور بہت دوسرے مورخین نے کیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ اس جذبے میں ہر ایرانی مسلمان شریک تھا اس لئے کہ ایران کی سرزمین نے جہاں اس قسم کے لوگوں کو پیدا کیا وہاں بہت سے سچے مسلمان بھی تھے جن کی شہادت تاریخ، علم اخلاق، تصوف وغیرہ کی کتابوں کے صفحات سے مل رہے ہیں۔

اور ابومسلم کی کیاد فطرت کی فریب کاری کا ثمرہ تھی۔ یہ لوگ اپنی خاص اور ایرانی حکومت تصور کرتے تھے
"اگرچہ خلفائے عباسی از اولاد حضرت علی ابن ابی طالب کہ ایرانیان می خواستند نبودند
ولے باز بہتر از بنو امیہ بودند چوں بدستیاری ایرانیاں وپایمردی ابومسلم خراسانی بمقام خلافت
رسیدند سلطنت ہاں یک سلطنت ایرانی شمردہ می شود"
ان کا شاید یہ گمان تھا کہ رفتہ رفتہ اثر و اقتدار بڑھا کر اس کی حکومت کو خالص ایرانی حکومت
بنالیں گے۔ لیکن خلیفہ ابو منصور کی بروقت بیداری اور اس سلسلے میں ابومسلم خراسانی کے قتل نے
ایرانیوں کو چوکنا کر دیا۔ ان کو دھندلا سا نظر آیا کہ شاید ان کی آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔
"ولے ایں انقلاب ہنوز برائے اعادۂ استقلال سیاسی و تحقیقی ایران کافی نبودہ نبی آید
واستقرائے عباسیان بمسند خلافت رفع عطش از تشنگان زلال آزادی ایرانی نمی بود چنانچہ امیدے
کہ ایرانیاں بداں خاندان بستہ بودند بطور دلخواہ حاصل نشد"
اس لئے اب یہ پہلا موقعہ تھا کہ عباسیوں کے خلاف بھی ان کی پہلی جیسی سازشیں شروع ہوئیں،
لیکن سازشی تدبیروں کے علاوہ ابومسلم کے ہمراہیوں میں سے فیروز نامی مجوسی نے جو سنباد کے
نام سے مشہور ہے باغی ہوا اور ابومسلم کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے اس سلطنت کے شیرازہ
کو بکھیرنے کی تدبیر کی۔
"سنباد مجوسی کہ دوست وطرفدار او بود، ہواخواہان زیاد بزد ری دور خود جمع کردہ ابتدا،
شہر قومش و رے راکہ ابومسلم خزاین زیاد دریں شہر اخری گذاشتہ بود تصرف نمود و آں خزاین را
برداشت و اعلان کرد کہ خیال دارد کہ بر حجاز حملہ برد و کعبہ را خراب بکند"
رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی کارروائی جاری رکھی، یہاں تک کہ خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ
آگیا۔ اس زمانے میں خاندان برامکہ نے جو اثر و اقتدار اپنا حاصل کر لیا تھا اس سے ان کی یہ توقع
بیجا نہ تھی کہ اب حکومت آسانی کے ساتھ ایرانی حکومت میں تبدیل ہوسکتی ہے، مگر یکایک ہارون
چونکا اور خاندان برامکہ کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا۔ برامکہ کی تباہی جن اسباب کے تحت

ہوئی وہ دراصل یہی سبب تھا، چنانچہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ

"خالد بن برمک ابو مسلم خراسانی کا خاص معتمد تھا۔ یہ لوگ ایرانی سلطنت قائم کرنے کے بیحد آرزو مند تھے، خالد بن برمک نے ابو مسلم کے قتل کے بعد کسی اپنے طرز عمل سے اپنی ناراضگی کا اظہار ہونے نہ دیا، تیاری ہو چکی تھی اور سلطنت عباسیہ کا تختہ الٹ جانے کی سازش مکمل کر چکے تھے۔ اس سازش میں علوی ان کے شریک تھے۔ برامکہ کی یہ تیاریاں ابو مسلم کے خون کا بدلہ لینے اور ایرانی سلطنت قائم کرنے کے لئے تھیں۔ انھوں نے ایک طرف علویوں اور خارجیوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا اور دوسری طرف علماء، فقہاء، اور صوفیاء کو بھی زر پاشی سے اپنا ہوا خواہ بنا لیا تھا"

اس واقعے سے ایرانیوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یہاں پہنچ کر ان کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ کچھ بھی ہو آخر تو خلفاء مسلمان ہیں اور ان پر عربوں کا کافی اثر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ہمتیں پست نہیں ہوئی تھیں وہ برابر اسی دھن میں لگے رہے، خلیفہ مامون کی ماں ایرانی تھی، سلطنت بھی ایک ایرانی وزیر فضل نامی جس کا باپ مجوسی تھا کی کوششوں سے حاصل ہوئی تھی اس لئے قدرتاً مامون ایرانیوں کا ہوا خواہ تھا۔ اسی وجہ سے پھر وہ ایرانی اقتدار جس کو ہارون نے ختم کر دیا تھا اس دور میں حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ خیالات اور عقائد میں جو آزادی اس زمانے میں لوگوں کو حاصل تھی کسی زمانے میں بھی ایسی بے راہ روی نہ تھی، فارسی، یونانی اور سریانی وغیرہ زبانوں کی بہت سے فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے نے اس بے راہ روی میں اور اضافہ کر دیا تھا، ایرانیوں نے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جھٹ ایک بڑے گروہ نے اسماعیل اور ان کی اولاد کا ہوا خواہ بن کر ان کے لئے دعوت خلافت شروع کر دی۔ پروفیسر سلطان بک محمد کے وہ خطبات جو وقتاً فوقتاً جامعہ مصریہ کے طلبہ کے سامنے صاحب موصوف نے دئے ہیں "الفلسفۃ العربیہ والاخلاق" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں، اس میں ایک چھوٹا سا خطبہ اس جماعت پر بھی موجود ہے، چنانچہ وہ یہ کہنے کے بعد کہ فارسیوں کا یہ تعلق

قول حق صفحہ، ۵

۔ تھا جو اسلامی سلطنت کے خلاف کوشش کر رہے تھے، کہتے ہیں کہ

"۔۔۔۔۔ مامون[1] کا میلان شیعیت کی طرف زیادہ تھا، اس کے زمانے میں فارسی
۔انی اور سریانی زبانوں کی فلسفیانہ کتابیں عربی زبان میں بہت سی منتقل ہوئیں، لوگوں نے
۔ت سے اس کی طرف دلچسپی کا اظہار کیا، پھر ہر شخص کو مذہب وغیرہ کے متعلق خیالات کے اظہار
۔ں عام آزادی مل گئی، فارسیوں کو یہ موقعہ غنیمت معلوم ہوا، اس لئے وہ اسماعیلیت کی طرف
۔ھے اور یہ اس وجہ سے کہ لوگوں کا رجحان آل علی کی طرف زیادہ تھا۔"

اس قدر لکھنے کے بعد یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اسماعیلی جماعت کا تذکرہ کیا جائے
۔ں میں یہ لوگ آکر شریک ہوئے، اسماعیلیہ پہلے ایک سیاسی اور پھر بعد میں ایک مذہبی جماعت
۔ی، جو بنو عباس کے دور حکومت میں پیدا ہوئی اور وہ اس طرح پر کہ جہاں مسلمان بوجوہ بہت
۔سے عقائد اور خیالات کے مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم ہو گئے، سیاسی حیثیت سے بھی
۔بڑی شاخوں میں بٹ گئے، ان میں سے ایک گروہ اہل سنت والجماعت کا ہے اور دوسرا
۔یعہ، اہل سنت والجماعت سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کا اعتقاد اس مسئلہ خاص یعنی خلافت
۔امامت میں یہ ہے کہ خلفاء اربعہ جس ترتیب سے خلیفہ ہوئے ٹھیک اسی ترتیب سے ان کو حق خلافت
۔اصل تھا۔ لیکن شیعہ جن کا عقیدہ بالکل اس کے برعکس یہ ہے کہ خلافت کے اصل حقدار حضرت علی
۔ضی اللہ عنہ تھے۔ عام مسلمانوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا کر ان کے حق میں دست اندازی
۔ی۔ شروع شروع میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمہور اہل اسلام کا ابو بکرؓ کی بیعت
۔تفق ہو جانے کے بعد کسی کی ہمت یہ نہ تھی کہ ان کی خلافت اور اسی طرح حضرت عمرؓ کی خلافت سے
۔نکار کرتے لیکن حضرت عثمان کی خلافت کے ساتویں سال ۳۰ھ میں خلیفہ موصوف کی نرم مزاجی
۔سے یہ تحریک عملاً شروع ہوئی کہ علیؓ اور ان کے خاندان میں خلافت محدود ہو، چنانچہ اسی تحریک

---

(۱) الفلسفۃ العربیہ والاخلاق صفحہ ۱۲۹

کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت عثمان رض کی شہادت ہوئی اور بالآخر حضرت علی رض خلیفہ منتخب ہو گئے گو اس جماعت کا مقصد حاصل ہو گیا تھا مگر اس کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ حضرت علی رض کو بصرہ، نہروان اور صفین کی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور آخر کار ایک خارجی نے شہید کر دیا اور معاویہ ابن ابی سفیان کے ہاتھ پر شام، حجاز، یمن اور مصر کے لوگوں نے بیعت کر لی، صرف ایک کوفہ رہ گیا تھا جس نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، ان لوگوں نے حضرت علی رض کی شہادت کے بعد امام حسن رض حضرت علی کے صاحبزادے کو خلیفہ بنایا۔ امیر معاویہ نے عراق پر حملہ کیا اور چند دن کے بعد آخر کار امام حسین خلافت سے دست بردار ہو گئے امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت اپنی ہی زندگی میں تسلیم کرانی چاہی، کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی، چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں اپنی خلافت لوگوں سے منوانی چاہی اور کوفہ والوں نے امام حسین کو خلیفہ بنانا چاہا اور اسی سلسلے میں ان کی شہادت کا دردناک واقعہ پیش آیا، یزید کے انتقال کے بعد عبداللہ بن زبیر کا حلقۂ اطاعت بہت وسیع ہو چکا تھا اور دوسری طرف بنو امیہ کی اولاد تھی، ان دونوں گروہوں میں خوب جنگ ہوئی اور آخر میں امیہ کا خاندان غالب آ گیا اور ایک عرصے تک ان کی خلافت اور حکومت رہی، ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض جیسے جلیل القدر متدین صحابہ کو غاصب خلافت ٹھہرا سکتے تھے، بنو امیہ کا خاندان ان بزرگوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا تھا، اور پھر اس وقت جب بجائے اللہ کے حکومت کا دور دورہ ہو۔

لیکن اس دور حکومت میں بھی شیعہ دو بڑی شاخوں میں منقسم ہو گئے ایک زیدیہ اور دوسرے کسانیہ۔ اول الذکر خلافت وامامت کو اس جماعت میں دیکھنا چاہتی تھی جو حضرت فاطمہ کی اولاد سے ہوں، اور موخر الذکر نے محمد بن حنفیہ (حضرت علی رض کے بڑے لڑکے) کے سلسلہ کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا تھا۔ زیدیوں کے موجودہ امام زید بن علی بن حسین تھے اور کسانیہ کے ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب تھے۔ ان دونوں جماعتوں نے عباسی داعیوں کے ساتھ مل کر کام شروع کیا، جو راہ عمل اختیار کی تھی وہ یہ تھی کہ بظاہر امویوں کی خلافت تسلیم

رتے اور خفیہ طور پر جس کو اپنا ہمدرد سمجھتے بیعت لیتے، اور راز کے پوشیدہ رکھنے کی تاکید فرماتے۔
اس کے علاوہ آپس کے تصادم سے بچنے کے لئے بہتر طریقہ یہ اختیار کر رکھا تھا کہ بجائے امام
زین العابدین، محمد بن حنفیہ یا حضرت عباس کے نام پر بیعت لینے کے صرف اہل بیت کا لفظ استعمال
رتے، عباسی داعیوں کی یہ ایک چال تھی کہ اپنے کو ہمیشہ خود خلافت کی آرزو سے الگ اور ان کا
محض معاون ہی ثابت کرتے رہے۔ لیکن جب کامیابی کا موقعہ ابو مسلم کی کوششوں نے پیدا کر دیا۔
تو قدیم معاہدے کے خلاف اپنی حکومت قائم کر لی جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ علویہ کی وہ جماعتیں جس
طرح بنو امیہ کے مٹانے کے در پے تھیں عباسیہ کی فکر میں ہو گئیں چنانچہ پھر وہ اگلی سی کوششیں ان
کے خلاف جاری تھیں۔ اسماعیلیہ جن سے ان ایرانیوں کا تعلق بتایا گیا ہے وہ اسی دور حکومت
میں شیعوں کی ایک تیسری جماعت امامیہ کی ایک مشہور شاخ کے نام سے ظاہر ہوئی، امامیہ کا
عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کے مستحق در اصل حضرت علی، پھر حسن پھر حسین، پھر زین العابدین، پھر محمد باقر
اور پھر ان کے بیٹے جعفر صادق ہیں، جعفر صادق کے بعد دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک نے خلافت
کو موسیٰ کاظم کی نسل سے بتایا اور دوسری نے اسمٰعیل کی اور اسماعیلیہ کہلائے۔ جس طرح شیعوں
کی اور دوسری جماعتیں خلافت کے لئے کوشاں تھیں اسمٰعیلی اس معاملے میں سرگرم رکن نہ تھے۔
صرف اپنے عقیدے کے مطابق امام کی موجودگی کا یقین رکھتے تھے اور ان کے لئے بیعت لیتے
پھر رہے تھے، چنانچہ مبارک نامی جو محمد بن اسمٰعیل بن امام جعفر صادق کا غلام تھا۔ محمد بن اسمٰعیل
کی وفات کے بعد کوفے میں جا کر کوفے کے شیعوں کو مذہب اسمٰعیلی اختیار کرنے کی ترغیب دی
اور اسی طرح بعض اسماعیلیوں کا خفیہ طور پر شمالی افریقہ کے علاقوں میں اسی زمانے میں دعوت امامت
کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ شیعوں کے عام عقیدے کے مطابق امام وقت اللہ کی طرف سے مخلوق پر حجت
ہوتا ہے اور اس کا وجود تبلیغ شریعت کے لئے ضروری ہے کسی ایسے امام کا ظہور اسمٰعیل کی اولاد
میں نہیں ہوا مگر انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ امام کا ظہور ضروری نہیں بلکہ کبھی کبھی وہ مستور ہوا کرتا ہے
اور لوگوں کو ان کے حال سے آگاہی نہیں ہوتی ہے مگر ایسی حالت میں یہ لازم ہے کہ ان کا نائب

ظاہر ہو جو خلق اللہ پر حجت ہو اور دعوت و تبلیغ کے منصب پر قائم ہو۔

ایرانیوں کا اس تعلق کی خاطر جو انھوں نے اسماعیلیوں سے قائم کیا تھا ان کا تذکرہ کرنا ضروری تھا، اس لئے کہ یہ تعلق نہ صرف ابتدائی زمانے ہی میں ظاہر کیا گیا بلکہ تا انقراض دولت عباسیہ ہمیشہ یکساں طور پر باقی رکھا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ ساری وہ کامیابیاں جن کا ذکر آگے آئے گا اسی بنا پر ان کو حاصل ہوئیں، اس لئے قصداً ان واقعات کے بتانے میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا تاکہ جہاں یہ معلوم ہو سکے کہ یہ اسماعیلی کون تھے اور ان کا ظہور کن اسباب کے ماتحت ہوا، اس بات کے اندازہ کرنے میں بھی سہولت ہو کہ اس جماعت کے ساتھ شامل ہونے سے ان کا کیا فائدہ متصور ہو سکتا تھا۔ حالات اور واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ نہایت آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس اسماعیلی جماعت کی طرف اپنے کو منسوب کرنے میں ان کا بظاہر منشا یہی تھا کہ جس طرح دوسری شیعی جماعتیں زیدیہ اور کیسانیہ دولت عباسیہ کے خلاف اپنی خلافت قائم کرنے اور عباسی حکومت کو مٹانے کے درپے تھیں، اسماعیلیوں کا بھی دراصل وہی منشا تھا اور اس پردے کی آڑ میں کچھ اور ہی مقصود تھا کہ ان کے مقابل لاکر کھڑا کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اخوان الصفاء

اس وقت کے بہت سے علمائے جن کی ذہنیت کو یونانی فلسفہ اور منطق نے مسخ کر دیا تھا ایسے رسائل لکھے جن کا مقصود اگرچہ یہ نہ تھا کہ اس قسم کے لوگوں کی تائید کی جائے مگر باعتبار نتائج ایسا ضرور ہوا کہ انھوں نے اپنے ان خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جو حصول مقصد میں معین ہو سکتے تھے۔ یہ رسائل اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہیں اور یہ چار جلدوں میں ہیں۔ یہاں ایک آدھ مقام سے اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، تاکہ یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ ان رسائل سے ان کی تائید کیسے ہوتی تھی۔ ان اسماعیلیوں کی سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہ تھی (جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا) کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ قرآن اور جملہ احکام الٰہی اپنے ظاہری اور باطنی معنی کے اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں، لوگوں نے ظاہری احکام پر عمل کر کے سخت غلطی کی ہے، اسی خیال کو اخوان الصفا

،چوتھی جلد چھٹے رسالے میں ناموس الٰہی کی ماہیت اور نبوت کے شرائط کے ماتحت لکھا گیا ہے

"تمام آسمانی[1] کتابیں اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے دو معنی ہیں ایک تو وہ معنی ہیں جو
ں کے ظاہری الفاظ دلالت کرتے ہیں، دوسرے وہ حقیقی معنی جو کہ لفظ کی تہہ میں پوشیدہ ہیں،
ں بنا پر ہر شرعی احکام کے دو پہلو ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن جو لوگ ظاہری
کام کے پابند ہوتے ہیں وہ دنیاوی حیثیت سے بیشک کامیاب ہیں لیکن اصلی اور آخری کامیابی
ن لوگوں کے حصے میں ہے جو اس کے خفی معنی سے واقف اور اس کو اپنا عملی شعار بناتے ہیں.....
خدائی قانون کی غرض اصلی یہی ہے کہ لوگ اسرار سے واقف اور اس پر عامل ہوں جو
ل ان اسرار سے واقف ہونے کے باوجود کوئی جدوجہد بھی اس سلسلے میں نہیں کرتے تو ان کا
شر مرنے کے بعد یہ ہوگا کہ عام بہائم اور ان کے رتبے میں کوئی فرق نہ ہوگا"

رسالہ بعثت میں عام مسلمانوں کے اس اعتقاد سے کہ ہم اپنے اسی جسم سے قیامت کے دن
دوبارہ اٹھیں گے انکار کیا ہے جس کو اسماعیلیوں نے نفی قیامت کا پہلا زینہ قرار دیا ہے۔

یہ اسماعیلی دولت عباسیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے تھے اور یہ یقین عوام کو دلا رہے
تھے کہ اب خدا کا وعدہ پورا ہونے والا ہے، حکومت اور خلافت ہمارے خاندان میں بہت جلد
منتقل ہوگی۔ اس چیز کی تائید ایک دوسرے رسالے "الدعوۃ الی اللہ" سے ہوتی ہے۔

"ملک[2] اور دولت ہر زمانے اور ہر دور میں ایک خاندان سے دوسرے خاندان
ایک قوم سے دوسری قوم، ایک ملک والوں سے دوسرے ملک والوں میں تبدیل ہوتی رہتی
ہے، اس لئے اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اچھی حکومت اور دولت جو اب شروع ہونے والی
ہے اور جس حکومت کے کل وزیر اچھی قوم کے اچھے افراد ہوں گے، اس کوشش کے لئے یہ

---

(۱) اخوان الصفا جلد چہارم صفحہ ۱۹۰ - ۱۸۹

(۲) اخوان الصفا جلد چہارم صفحہ ۲۲۳

طے پایا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ کسی مخصوص مقام پر جمع ہوں ایک رائے اور طریقے پر متفق ہونے کے بعد یہ عہد کریں کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار رہینگے، ان کے تمام افراد کی مجموعی حیثیت تمام امور میں صرف شخص واحد کی اور تمام تدابیر میں صرف ایک نفس منفرد کی ہوگی اور یہ معاملہ دین کی مدد اور آخرت کی طلب کا ہے۔ اس لئے صرف (خدا کی رحمت کے طلبگار ہوں گے۔)

بھائیو! اس اچھی خبر سے خوش ہو، اللہ کی مدد پر اعتماد کرو جس نے ہر کوشش کرنے والے کو اس کی کوشش کا پھل دینے کا وعدہ کیا ہے۔ والذین جاہدو منہا لنہدینہم سلبنا ولیضرن اللہ من ینصرہ، وان حزب اللہ ہم الغالبون۔"

بہت سے عقائد اور خیالات جو ان اسماعیلیوں کے تھے بالکل ملتے جلتے ہوئے اکثر رسائل میں موجود ہیں جو یہاں صرف مضمون کے زیادہ بڑھ جانے کے خوف سے چھوڑے جاتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اخوان الصفا کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"چوتھی صدی ہجری کے آخر نصف میں ایک شیعی مذہبی اور سیاسی جماعت تھی جس کے عقائد اور خیالات اسماعیلی فرقے سے ملتے جلتے تھے۔ اس کا مرکز بصرہ تھا اس کے اراکین اپنے آپ کو صافی اور مومن کہتے اس لئے کہ اس کا مقصد اپنی روح کی نجات باہمی اعانت اور مدد سے حاصل کرنا تھا، اس جماعت کا نام اخوان الصفار کھا۔ ان کے سیاسی کارناموں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، سوائے ان کے رسائل کے جو بہت مبہم زبان میں ہوتے تھے۔"

افغانوں کا سیاسی عروج و زوال

افغانوں کا نسب | تاریخ اسلام میں افغان ایک عجیب و غریب قوم ہے جس کے سلسلہ نسب کے متعلق مشرقی اور مغربی مورخین میں سخت اختلاف ہے، افغانوں کی نسبی تحقیق و تدقیق کے متعلق محققین نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ لیکن جب ان کی تحقیقات پر غور کیا جاتا ہے تو ان میں بہت تباین پایا جاتا ہے۔

بعض مغربی مورخین کا خیال ہے کہ بعض قبائل افغان ان سپاہیوں کی اولاد سے ہیں جو سکندر اعظم کے ساتھ آئے تھے اور فتح کے بعد افغانستان کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہوگئے۔ ایک دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ افغان قوم ان نوآباد لوگوں کی نسل سے ہے جو سکندر اعظم کے جانشینوں کے عہد میں یونان سے ہجرت کرکے افغانستان میں آکر آباد ہوگئے تھے۔

مشرقی مورخین کا ایک بڑا گروہ اس بات پر متفق ہے کہ افغان قوم کا سلسلہ نسب بنی اسرائیل سے ملتا ہے یعنی افغان سامی النسل ہیں۔

"دی افغانز" کتاب کے مصنف کا خیال ہے کہ افغان قوم کا سلسلہ نسب البانیوں سے ملتا ہے اور یہ لوگ البانی النسل ہیں۔ مصنف موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ البانی قبائل جو سواحل بحر اسود اور بحر متوسط پر سکونت پذیر تھے اور جو آئے دن شاہان ایران کو پریشان کرتے رہتے تھے وہ "اغوان یا اوغان" کے نام سے مشہور تھے۔ شاہان ایران ان لوگوں کو وقتاً فوقتاً بحر اسود اور بحر متوسط کے سواحل سے جلاوطن کرکے افغانستان میں لالاکر بساتے تھے۔ چنانچہ اس مورخ کے خیال کے مطابق افغانی البانی النسل ہیں۔

خود افغان مورخین اپنے آپ کو یہودی النسل کہتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے وسط ایشیا میں آنے کا حال اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ "افغانہ" جس کے نام سے افغانوں کو منسوب کیا جاتا ہے حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ایک شخص تھا۔ بخت نصر نے یہودیوں کو قید کرکے کوہستان غور میں

بھیج دیا تھا، جہاں ان کی نسل پھلی پھولی اور بڑھی۔ اگرچہ یہ لوگ ارض مقدس سے دور جلا وطن کر کے بھیج دیئے گئے تھے تاہم ان لوگوں کا مذہب ظہور اسلام تک یہودی مذہب تھا اور اس وقت تک یہ اپنے مذہب پر قائم تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن میں سے بعض لوگ ارض مقدس میں آکر اپنے مذہبی جذبات تازہ کر کے واپس جاتے اور اپنے ہموطنوں کو یہودیت پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے ان لوگوں کے اسلام لانے کے متعلق یوں مشہور ہے کہ ایک یہودی خالد نامی آنحضرت کی خدمت میں آکر مشرف باسلام ہوا اور افغانستان میں اپنے بھائی بندوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا۔ رفتہ رفتہ جب تمام افغانوں نے اسلام قبول کر لیا تو خالد نے چند افغانی سرداروں کو خدمت نبوی میں حاضر کیا۔ ان لوگوں نے خدمت نبوی میں اپنا سلسلہ نسب بیان کیا اور کہا کہ ہم لوگ حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے ان لوگوں کے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک فرمایا۔ انھیں افغانی سرداروں میں سے ایک سردار قیس نامی تھا آنحضرتؐ نے اس کا نام عبدالرشید رکھا۔ افغانی مورخین میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ افغانی سردار خدمت نبوی میں رہ کر بعض غزوات میں ہمرکابی کے شرف سے بھی مشرف ہوئے تھے لیکن یہ واقعہ بعید از قیاس ہے کیونکہ سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ افغانوں کے اسلام لانے کے متعلق ایک دوسری روایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے جو ایک افغانی مورخ اس طریقے پر بیان کرتا ہے کہ لفظ افغان عربی لفظ ہے جو اصل میں عبرانی سے مشتق ہے ملک طالوت جو یہودیوں کا سردار تھا اس کے ایک لڑکے کا نام افغان تھا جس کے نام سے اس کی نسل افغان مشہور ہوئی۔ یہودیوں میں آپس میں ایک عرصہ دراز تک خانہ جنگی ہوئی اور بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس تک جاری رہی۔ بخت نصر نے ستر ہزار سے زیادہ یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ ان میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ بیت المقدس سے بھاگ کر ایک عرصہ تک عرب میں سکونت پذیر رہے لیکن معاش کی قلت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایشیا کے کسی سرسبز حصے میں جا کر آباد ہوں۔ چنانچہ انھوں نے کوہستان سلیمان کو پسند کر کے وہیں سکونت اختیار کی۔ باقی ماندہ افغان خلیفہ اول کے عہد میں مشرف باسلام ہوئے اور ایران میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ چنگیزی

حملہ تک ایران میں رہے اس کے بعد چنگیزی مظالم کی تاب نہ لاکر کوہ سلیمان میں ہجرت کرکے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ اقامت پذیر ہو گئے۔

افغان قوم مختلف قبائل اور جرگوں میں منقسم ہے۔ تمام افغانی قبیلوں کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ ملک طالوت کی نسل سے ہیں۔ افغانوں کی قومی خصوصیت آزادی۔ مہماں نوازی۔ اور شجاعت ہے۔ افغان سنی المذہب ہیں اور بعض شیعہ مذہب بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کثرت سنیوں کی ہے۔ افغانوں کی قومی زبان پشتو ہے۔ جو افغانستان کے مختلف حصوں میں مختلف لب و لہجہ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ قندھار کی پشتو ایران کے قرب کی وجہ سے نرم ہے۔ برخلاف اس کے مشرقی افغانستان کی پشتو سخت لہجہ رکھتی ہے۔ فارسی زبان تمام ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر تمام کے تمام فارسی زبان میں ہیں۔ گویا افغانستان کی سرکاری زبان فارسی ہے۔

افغانستان | افغانستان فارسی کا ایک مرکب لفظ ہے جس نے "افغان" اور "ستان" سے ترکیب پائی ہے۔ جس کے معنی ہوے افغانوں کا ملک یا افغان قوم کا مسکن۔ افغان اپنے ملک کو قلاجیت اور کابلستان بھی کہتے ہیں۔ افغانستان کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں ترکستان۔ مشرق میں پنجاب۔ جنوب میں بلوچستان اور مغرب میں خراسان۔

افغانستان کا رقبہ دو لاکھ پندرہ ہزار مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ باشندوں کی تعداد دس ملین کے لگ بھگ ہے۔ افغانستان کے مشہور شہر یہ ہیں۔ کابل۔ غزنی۔ قندھار۔ ہرات اور جلال آباد۔ ہرات اپنے موقع و محل کی وجہ سے مغربی ایشیا اور وسطی ایشیا کا تجارتی مرکز ہے جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک روس اور برطانیہ کی استعماریت کا مرکز توجہ بنا رہا۔

افغانستان، ایران کی سطح مرتفع کا سب سے بلند حصہ ہے جس کی بلندی چار ہزار فیٹ سے لیکر سات ہزار فیٹ تک ہے۔ افغانستان کا شمالی پہاڑ یعنی کوہستان ہندوکش بیس ہزار فیٹ بلند ہے۔ اور مشرق میں کوہ سلیمان ہے جس کی چوٹیاں سات ہزار فیٹ سے

سے کر گیارہ ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔ کوہستانِ ہندوکش کی مغربی شاخیں یہ ہیں، کوہ بابا کوہ سفید۔ اور کوہ سیاہ۔ ان سلسلوں کے شمال میں افغانی ترکستان واقع ہے۔ افغانی اور روسی ترکستان کے درمیان حدِ فاصل دریائے جیحون قائم کرتا ہے۔

افغانستان ناہموار سطح کا ملک ہے، بلند پہاڑیوں، عریض و عمیق میدانوں اور ندیوں کی تنگ گھاٹیوں اور دروں سے ترکیب پاتا ہے۔ افغانستان کے میدانوں میں کثرت سے باغات ہیں جن میں انگور، سیب، شفتالو، امرود، بہی، انار۔ بادام اور پستہ بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ جو افغانی باشندوں کی ضروریات کو پورا کر کے ہندوستان کے بازاروں میں بھی خشک و تر بکثرت آتا ہے۔ افغانستان کے اونچے اونچے پہاڑوں میں جو گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ کفتار۔ لومڑی اور بعض حصوں میں شیر اور چیتا بھی پایا جاتا ہے۔ پالتو جانوروں میں ایک قسم کی ایرانی بکری ہوتی ہے۔ جو اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتی ہے گائے، بھینس، گھوڑا، گدھا، خچر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ افغانستان میں وہ تمام پرندے ملتے ہیں جو ایشیا کے دوسرے حصوں میں ہیں۔ قدرت نے افغانستان کو بکثرت معدنیات عطا کی ہیں لیکن ابھی تک صرف چند معدنیات نکالی گئی ہیں مثلاً شورہ، گندھک، نمک، رانگا اور لوہا۔ افغانستان کا لوہا اپنی خصوصیات میں دنیا کے کسی حصہ کے لوہے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

افغانستان میں دریا بہت کم ہیں۔ سب سے بڑے دریا صرف دو ہیں رود ہلمند اور دریائے کابل۔ یہ دونوں دریا کوہ ہندوکش سے نکلتے ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی ندیاں بھی ہیں جن کا تذکرہ باعثِ طوالت ہوگا۔

افغانی حکمران خاندان | عہدِ بنو امیہ اور بنو عباس میں افغانستان اموی اور عباسی گورنروں کے ماتحت رہا۔ عباسی خلافت کے زوال کے بعد جب طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا تو افغانستان پر خراسان کے گورنر اسمٰعیل سامانی نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد الپتگین حاکم افغانستان ہوا

اس کے بعد سبکتگین اس کے بعد محمود کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کی تلوار ایک طرف تو وسط ایشیا میں چمکی اور دوسری طرف ہندوستان میں بے نیام ہوئی۔ دولت غزنویہ کے عہد حکومت میں افغانستان اپنی قومی حکومت قائم نہیں کرسکے۔

غوری خاندان | دولت غزنویہ کی تباہی کے بعد کوہستان غور میں غوریوں نے ایک حکومت قائم کی جس کو مورخ پہلی افغانی حکومت کہتے ہیں۔ یہ دولت غوریہ وہی ہے جس کے حکمرانوں میں شہاب الدین غوری بھی تھا جو ہندوستان کا مشہور فاتح اور سرزمین ہند میں اسلامی حکومت کا بانی ہے۔ یہ خاندان چنگیزی حملہ تک افغانستان میں نہایت شاندار طریقہ پر حکومت کرتا رہا۔ چنگیزی حملہ کے بعد افغانی قوم اپنے وطن میں ایک عرصہ دراز تک کوئی حکومت قائم نہ کرسکی کیونکہ مغلوں کے پے درپے حملوں نے ایشیا کی سیاست میں ایک طوفان عظیم پیدا کردیا تھا۔

لودھی خاندان | ہندوستان میں تغلق خاندان کی تباہی کے بعد طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا۔ جس سے فائدہ اٹھاکر بہلول نامی ایک لودہی سردار نے دہلی پر قبضہ کرلیا لیکن طوائف الملوکی کی گرم بازاری اس کے زمانہ میں بھی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی حکومت صرف دہلی ہی تک محدود رہی۔ البتہ سکندر لودھی کے زمانہ میں سلطنت لودھی۔ نے کافی وسعت حاصل کرلی تھی۔ سکندر بڑا عالم اور انصاف پسند حکمران تھا۔ ہمیشہ رعایا کی بہبودی کیلئے کوشاں رہتا تھا۔

سکندر لودہی کے بعد اس کے جانشینوں میں وہ قابلیت نہ تھی جو ہندوستان کے ایک حکمران میں ہونی چاہیئے۔ خود لودہی سرداروں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ دولت خاں۔ لودہی پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور بابر نے اس کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر اور ابراھیم لودہی کی فوجوں کا پانی پت کے مشہور میدان میں مقابلہ ہوا۔ ابراھیم لودہی کو شکست فاش ہوئی اور وہ مارا گیا۔ یہ واقعہ ۱۵۲۶ء کا ہے۔

سوری خاندان | تیرہ چودہ سال تک افغان اپنی کوئی سلطنت قائم نہیں کرسکے اس کی وجہ یہ تھی کہ بابر کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی اور افغان اس کے مقابلہ میں کمزور تھے۔ بابر نے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کو توسیع دینے کی سرتوڑ کوشش کی جس سے ہندوستان کے مختلف صوبے مرکز یعنی حکومت آگرہ سے ملحق ہوگئے۔ بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں نے بھی سلطنت کی توسیع و ترقی کی بے حد کوشش کی گجرات و مالوہ فتح کرکے مرکز کے ماتحت لایا۔ اور اس کے بعد چاہتا تھا کہ بنگال اور بہار کو بھی اپنی سلطنت کے ساتھ ملحق کرے۔ چنانچہ گجرات سے واپسی کے بعد اس نے بنگال و بہار کا رخ کیا بہار میں اس زمانے میں افغانی حکومت تھی جس کا بادشاہ ایک نابالغ شہزادہ جلال خان نامی تھا۔ حکومت کا نظم و نسق اس کی ماں اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔

اس زمانہ میں ایک نوجوان افغان جو اپنی شجاعت اور علمی تبحر کی وجہ سے شہرت تامہ رکھتا تھا۔ میدان سیاست میں نمودار ہوا۔ یہ نوجوان ایک نووارد افغانی سردار کا بیٹا تھا جس کی جاگیر سہسرام میں تھی۔ عنفوان شباب میں اپنے باپ سے خفا ہوکر جونپور چلا گیا۔ جہاں اس نے فارسی ادب اور تاریخ کا بہت محنت سے مطالعہ کیا اس نے مذکورہ بالا دونوں فنوں میں زبردست قابلیت حاصل کرلی تھی۔ تاریخ ہند اس نوجوان کو شیر خان کے نام سے یاد کرتی ہے۔ شیر خان مختلف اوقات میں مختلف بادشاہوں کی خدمتیں ادا کرتا رہا۔ کبھی لودھی حکومت میں فوجی خدمت ادا کی کبھی ہمایوں کے دربار میں رہا اور ستارہ اقبال چمکا تو بہار کی افغانی حکومت میں سیاہ وسفید کا مالک ہوگیا۔ شیر خان جلال خان نابالغ بادشاہ بہار کی ماں پر اس قدر اثر رکھتا تھا کہ وہ اپنے مرتے وقت حکومت بہار کا تمام نظم و نسق شیر خان کے سپرد کرگئی۔ چنانچہ اب شیر خان اور جلال خان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ جلال خان نے اپنی امداد کے لئے حاکم بنگالہ کو درخواست بھیجی۔ اس نے شیر خان پر حملہ کردیا جس زمانے میں شیر خان اور حاکم بنگالہ کی فوجیں برسر پیکار تھیں ہمایوں کی فوجوں نے بہار کے قلعوں پر قبضہ کرکے بنگالہ کے قدیم دارالحکومت گور کو مسخر کرلیا

موسم باران کی وجہ سے دو تین ماہ تک ہمایوں مع اپنی فوج کے گور میں رہا۔ اس اثنا میں شیر خاں بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوا۔ لیکن بعد میں میدانی علاقوں میں نکلکر بنارس اور جونپور پر قابض ہوگیا۔ اس طریقہ پر شیر خان نے ہمایون کا راستہ روک لیا اب ہمایوں کے لئے آگرہ سے کمک بھی نہیں آسکتی تھی۔ ہمایون نے مجبوراً برسات کی وجہ سے آگرہ واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔ ہمایوں جب پٹنہ پہونچا تو اس کو یہ معلوم ہوا کہ شیر خان کی فوجیں راستہ روکے کھڑی ہیں۔ ہمایوں نے گنگا پار کرنے کے لئے کشتیوں کے پل تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ دوسری طرف خیمہ زن ہوکر دشمن کا مقابلہ کرسکے اسی اثنا میں شیر خان کی طرف سے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی ہوئی۔ چنانچہ ہمایوں نے اپنے کوچ کو ملتوی رکھا۔ لیکن درحقیقت یہ صلح ایک دھوکہ تھا۔ جس کے بعد شیر خان نے ہمایون پر شب خوں مارا۔

رات کے وقت شیر خانی فوجوں نے ہمایونی فوجوں پر بہت زور کا شب خوں مارا جس کی وجہ سے ہمایوں کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور اس نے جان بچانے کی غرض سے مع اپنے ہمراہیوں کے دریا پار ہوکر بھاگنا چاہا لیکن اس کے بہت سے ساتھی غرق ہوگئے اور وہ خود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ اس جنگ کو تاریخ ہند میں جنگ بکسر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور یہ ۱۵۳۹ء کا واقعہ ہے۔

دوسرے سال ہمایوں نے شیر خان جس نے اب شیر شاہ کا لقب اختیار کرلیا تھا کی سرکوبی کے لئے از سر نو فوج تیار کی اور کوچ کیا۔ اس دفعہ شیر شاہی اور ہمایونی فوجوں کا مقابلہ دریائے گنگا پر قنوج کے قریب ہوا۔ ہمایوں کی فوج کے لئے بارش نے لشکرگاہ میں رہنا مشکل کردیا۔ اور بعض سرداروں نے عین وقت پر ہمایوں کو دغا دی۔ اس حالت میں شیر شاہی فوجیں ہمایونی فوجوں پر شدت سے حملہ آور ہوئیں۔ ہمایون کو پھر شکست ہوئی۔ افتاں وخیزاں آگرہ پہونچا شیر شاہی فوجیں برابر تعاقب کررہی تھیں۔ مزید براں آگرہ

میں ہمایوں کے بھائیوں کی ظاہری مخالفت بھی ہمایوں کیلئے شکست کا باعث ہوئی۔
ان دو اسباب کی بنا پر ہمایوں نے بادل ناخواستہ ہندوستان کو خیر باد کہا۔

ہمایوں، پنجاب اور سندھ ہوتا ہوا ایران پہونچا۔ شاہ ایران نے اس کی بڑی خاطر و مدارات کی اور اپنا خاص مہمان بنا کر رکھا یہ واقعات ۱۵۴۵ء کے ہیں۔ ہمایوں کے جانے کے بعد تقریباً تمام شمالی ہند شیر شاہ کے قبضہ میں آگیا۔ شیر شاہ نے مالوہ اور مارواڑ فتح کر کے اپنی حکومت کی توسیع کی پانچ سال تک حکومت کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوا۔

شیر شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ ملکی زراعتی انتظامات ہیں جن کی وجہ سے اس کا نام تاریخ ہند میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور اسی چیز نے مورخین کے اس نظریہ کو باطل کر دیا کہ افغان حکومت کرنا نہیں جانتے۔ لیکن ایک فاتح یا بہترین سپاہی بن سکتے ہیں۔ شیر شاہ کے رفاہ عام کی چیزوں میں سے آج بھی ہم کو ایک یادگار ملتی ہے۔ اور وہ مشہور سڑک اعظم ہے جو کلکتہ سے پشاور تک اب بھی رہرووں کی رہبری کرتی ہے۔

شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے نو سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی اور اپنے باپ کے نامکمل کاموں کی تکمیل کی۔ اس کے بعد سوری حکومت نالائق حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی جنھوں نے اپنی ناقابلیت کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں میں حکومت کو کھو دیا۔ سلطنت کھونے کی سب سے بڑی وجہ سوری سرداروں کا باہمی نفاق تھا۔ سوری سرداروں کی باہمی کشمکش کے دوران میں ہمایوں نے مناسب موقع پا کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ سوری اور ہمایونی فوجوں میں پانی پت کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ میدان ہمایوں کے ہاتھ رہا۔ سوری فوجیں بھاگ نکلیں۔ ہمایوں کامیابی و کامرانی کے ساتھ دہلی اور آگرہ پر پھر قابض ہوا ۱۵۵۶ء میں افغانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور سلطنت مغلیہ کی از سر نو بنیاد پڑی۔

درّانی خاندان | سنہ ۱۷۲۰ء تک جب تک سلطنت مغلیہ میں انحطاط و تنزل نہ ظاہر ہوا تھا اس وقت تک مغلوں نے افغانوں کو بالکل دبائے رکھا تھا۔ اگر افغان سردار کسی علاقہ میں سر اٹھاتے تھے تو نہایت سختی سے ان کی سرکوبی کی جاتی تھی۔ افغانوں کا اصل وطن، افغانستان بھی ہمیشہ مغلوں کے گورنروں کے ماتحت رہا یہ حالت تقریباً دو سو برس تک رہی اس عرصہ میں افغانی کوئی اپنی قومی حکومت قائم نہ کر سکے۔

قدرت نے ایک دفعہ پھر سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے بعد افغانوں کو اپنے وطن افغانستان میں حکومت کرنے کا موقع دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کی ابتدا میں ایرانی حکومت نہایت تنزل و انحطاط کو پہنچ گئی۔ مغربی افغانستان کے باشندوں میں سپاہیانہ جذبہ ایک دفعہ اور ابھرا۔ چنانچہ انھوں نے ایران کی کمزور حکومت کو پے در پے حملوں سے پریشان کر دیا۔ اور دوسری طرف ترکوں نے ایرانیوں کے ایک بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اس زمانہ میں قدرت نے ایران کی حفاظت کے لئے نادر شاہ افشار کو پیدا کیا۔ جس نے ایک طرف تو افغانوں کو شکست دے کر ان کے وطن افغانستان پر قبضہ کیا اور دوسری طرف ترکوں کو سخت شکستیں دیکر ایرانی علاقے خالی کرائے۔ سنہ ۱۷۴۷ء میں جب نادر شاہ افشار قتل ہوا تو ہر افغانی سردار کی تمنا تھی کہ افغانستان کی عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئے۔ چنانچہ تمام افغانی سرداروں کا جرگہ منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے یہ طے ہوا کہ احمد شاہ ابدالی شاہ افغانستان ہو۔ اور جمال خان بارک زئی اس کا وزیر اور مشیر ہو۔ احمد شاہ ابدالی نادر شاہ افشار کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر تھا اور نادر شاہ افشار کا مختلف معرکوں میں ہمرکاب رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے اس نے افغانستان کے سرکش قبائل کو رام کیا اس کے بعد اپنی حکومت کیلئے کوشاں ہوا۔ کشمیر، پنجاب۔ سندھ۔ بلوچستان اور سیستان کو اپنی حکومت سے ملحق کر لیا۔ اور آخر میں پانی پت کے میدان

میں مرہٹوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد مرہٹہ طاقت پھر سنبھل نہ سکی۔ احمد شاہ نے چھبیس سال تک حکومت کی۔ اس کا دور نہایت کامیاب رہا۔ اس زمانے میں حکومت افغانستان کی حد ایک طرف مشہد تک پہونچتی تھی۔ دوسری طرف دہلی تک اس کے مرنے کے بعد اس بیٹا تیمور وارث تخت ہوا۔ اس کے زمانہ میں بھی حکومت کا وہی عالم تھا جو احمد شاہ کے زمانہ میں تھا۔ لیکن بعد اس کے جب زماں شاہ تخت افغانستان پر آیا تو ایک طرف تو سلطنت میں تنزل شروع ہوا۔ اور دوسری طرف ابدالی شہزادے عنان حکومت کے لئے برسرپیکار نظر آنے لگے۔ چنانچہ ایک قلیل عرصہ میں افغانستان کی وہ وسیع سلطنت جو احمد شاہ ابدالی نے قائم کی تھی، کوہ سلیمان کی گھاٹیوں ہی میں محدود ہوگئی۔

سنہ ۱۸۰۱ء میں زماں شاہ کے بھائی شجاع نے جو پشاور میں مقیم تھا۔ اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے کابل پر حملہ کر دیا۔ لیکن محمود شاہ کی فوجوں سے شکست کھا کر درہ خیبر میں پناہ گزین ہوا۔ لیکن سنہ ۱۸۰۲ء میں وہ تخت کابل لینے میں کامیاب گیا۔ اور محمود شاہ کو تخت سے اتار کر اُسے قید کر دیا، اور خود رونق افروز تخت کابل ہوگیا۔

اس کے بعد سات سال تک شاہ شجاع نے افغانستان پر حکومت کی۔ مگر آئے دن بغاوتوں اور شورشوں سے پریشان رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نہ تو جنگ و جدل کا مرد میدان تھا۔ اور نہ تدبر و سیاست کی چالیں جانتا تھا۔ مزید برآں بڑھاپے نے اس کے قویٰ کو اور بھی شل کر دیا تھا اس لئے ہر افغان شاہ شجاع سے نفرت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نفرت نے افغانستان میں ایک عالمگیر بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۹ء میں وزیر خان نے شاہ شجاع کو شکست فاش دے کر تخت کابل چھین لیا اور شجاع افغانستان کو چھوڑ کر ہندوستان میں اوّل اوّل رنجیت سنگھ کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے بجائے خاطر و مدارات کے شاہ شجاع کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ شاہ شجاع کے پاس جتنے جواہر

تھے اس نے وہ سب اس سے غضب کر لئے۔

اب بحالت مجبوری شاہ شجاع نے انگریزوں کے ہاں جا کر پناہ لی۔ انگریزوں نے اسکے لئے ایک وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن ابھی تک شاہ شجاع تخت کابل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ایک بار اور تخت کابل کے لئے قسمت آزمائی کی۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاہ شجاع نے سکھوں اور انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ طاقتیں افغانستان کا تخت اس کے اصلی اور حقیقی وارث شاہ شجاع کو دلائیں گی۔

چنانچہ افغانستان کی پہلی جنگ کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا انگریزی فوجیں براہ درۂ بولان افغانستان میں داخل ہوئیں۔ قندھار، غزنی اور کابل پر قابض ہو کر شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھایا۔ دوست محمد خان بارکزئی جو شاہ شجاع کے بعد تخت کابل پر قابض ہوا تھا بھاگ کر امیر بخارا کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ لیکن چند دنوں کے بعد امیر بخارا نے اس کو قید کر لیا۔ اتفاقی طور پر دوست محمد خان نے رہائی پا کر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے اس کو کلکتہ میں نظر بند رکھا۔ اور دو لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ افغانی قبائل شاہ شجاع کی حکومت سے ناراض تھے۔ اب اس ناراضگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ اس نے کفار و نصاریٰ کو کابل میں بلایا تھا۔ نیز اس نے ہمیشہ قوم کے ساتھ منافقانہ برتاؤ کیا۔ افغانستان کی پہلی جنگ کے بعد جو برطانوی فوجیں شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے کابل میں مقیم تھیں۔ افغان چاہتے تھے کہ ان کا کلی استیصال کر کے برطانوی قدموں سے افغانستان کی زمین کو پاک کر دیں۔ اس زمانہ میں شاہ شجاع بظاہر تو قوم سے ملا ہوا تھا۔ مگر خفیہ طور پر برطانوی نمائندوں سے سازباز رکھتا تھا۔ اس چیز نے افغانوں کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے شاہ شجاع کو قتل کر ڈالا۔ الغرض ۱۸۴۳ء میں ابدالی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور بارک زئی خاندان نے اس کی جگہ لی۔

بارک زئی خاندان | اس زمانہ میں تمام افغانستان میں انگریزوں کے خلاف ایک عام نفرت کی

جذبات پھیل گئے جنھوں نے ترقی پاکر بغاوت کی شکل اختیار کرلی جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ اس زمانہ میں دوست محمد خان انگریزوں کی پناہ میں کلکتہ میں مقیم تھا۔ دوست محمد خان کا بیٹا اکبر خان جو شجاعت میں اپنے باپ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس نے افغانوں کی رہنمائی کی۔ آخر الامر انگریزوں اور اکبر خان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی خاص دفعات یہ تھیں کہ دوست محمد خان کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے۔ اور انگریزوں کی فوجیں جلد سے جلد افغانستان کے تمام شہروں کو خالی کردیں۔ چنانچہ معاہدہ کی رو سے انگریزی فوجیں واپس آرہی تھیں کہ برف باری اور افغانی قبائل دونوں نے مل کر تمام انگریزی فوج کا خاتمہ کردیا۔ ایک ڈاکٹر بمشکل جلال آباد سے پشاور تک پہونچا جس کی زبانی یہ سرگذشت دوسروں کے کانوں تک پہونچی۔ اس کے بعد انگریزوں نے دوسری مہم محض اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے افغانستان روانہ کی جس نے کابل کے سب سے خوبصورت بازار کو جو ایشیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا گراکر پیوند خاک کردیا۔ اور چن چن کر افغانوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد انگریزی فوجیں واپس ہوئیں اس وقت انگریزوں نے افغانی قیدیوں کو رہا کیا۔

اب دوست محمد خاں کو افغانستان کا امیر تسلیم کیا گیا۔ اس نے ایک عرصہ تک افغانستان پر حکومت کرنے کے بعد ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد شیر علیخان اور افضل خان افغانستان کے دعویدار ہوئے۔ شیر علی خان نے انگریزوں سے امداد کی درخواست کی جس کو انگریزوں نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کریں۔ اس خشک جواب کے بعد شیر علی خاں تن تنہا اپنی قوت بازو سے تمام افغانستان پر قابض ہوگیا۔

اس باہمی نزاع کے دوران میں انگریزوں نے موقعہ پاکر خان قلات سے ایک خفیہ معاہدہ کیا اور کوئٹہ لے لیا۔ اس چیز نے شیر علی خاں کو انگریزوں سے متنفر کردیا۔ و

روسی حکومت سے اپنے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے اب تیسرا حملہ افغانستان پر کیا۔ شیر علی خان بھاگ کر روسی سرحد میں پناہ گزین ہوا۔ جہاں موت نے ہمیشہ کے لئے اس کو کشمکش زندگی سے نجات دے دی۔

اب انگریزوں نے ایک معاہدہ کی رو سے امیر یعقوب علی خاں کو تخت کا مالک بنایا۔ لیکن یعقوب علی خان سے افغان خوش نہ تھے۔ کیونکہ ابھی شاہ شجاع کی طرح اپنی حکومت انگریزی تلواروں کے زیر سایہ قائم کی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی افغانوں نے انگریزی ریزیڈنسی کو جلا دیا۔ یعقوب علی خاں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ انگریزوں نے اسے ہندوستان میں نظر بند رکھا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔

یعقوب علی خان کے بعد افغانون کی حکومت کا خاتمہ تقریباً ہو گیا تھا۔ تمام احکامات جنرل رابرٹس جاری کرتا تھا۔ شیر علی خان کے دوسرے بیٹے ایوب خان نے ہرات سے میوند پر حملہ کر کے انگریزوں کو شکست دی۔ اب انگریزون نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ افغانوں پر بزور شمشیر حکومت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

چنانچہ انگریزی مدبرین نے یہ مناسب سمجھا کہ کسی افغان شہزادے کو تخت افغانستان دے کر انگریزی فوجیں ہندوستان کو واپس ہوں۔ انگریز مدبرین کی نظریں عبدالرحمان خاں پر پڑیں جو ایک عرصہ سے روس میں پناہ گزین تھا۔ اور اب روس چھوڑ کر حدود افغانستان میں اپنی قوت مجتمع کر رہا تھا۔ اور موقع کا منتظر تھا کہ اتنے مین انگریزی قاصد پیغام لے کر پہونچا۔ عبدالرحمٰن خان نے انگریزوں کی دعوت قبول کر کے تخت کابل کو سنبھالا اور انگریزی فوجیں ہندوستان واپس چلی آئیں۔

عبدالرحمان خان اپنے زمانہ کا ایک بڑا مدبر شخص تھا۔ انقلاب زمانہ نے اس کے ذہن کو اور جلا دیدی تھی۔ اس نے اپنے طویل عہد حکومت میں ملکی اور فوجی محکموں کی اصلاحات

کی اس سے پہلے افغانستان پس ماندہ ممالک میں شمار کیا جاتا تھا لیکن اس کی شبانہ روز کی محنت شاقہ نے افغانستان کو تہذیب حاضر سے آشنا کردیا۔ عبدالرحمان خان نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ افغانستان انگریزی اور روسی اقتدار سے ہمیشہ آزاد رہے۔ چنانچہ امیر موصوف نے اپنے سب سے چہیتے بیٹے نصراللہ خان کو انگلستان اس مقصد کے لئے بھیجا کہ شاہ انگلستان سے اس بات کی اجازت حاصل کرلے کہ افغانی اور برطانوی معاملات حکومت انگلستان سے براہ راست طے ہوا کریں۔ نہ کہ حکومت ہند کے توسط سے۔

لیکن شاہ انگلستان نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے عبدالرحمان خان کو انگریزوں سے بددلی پیدا ہوگئی۔ انگریزوں نے اس کی تلافی اس طریقہ پر کرنی چاہی کہ راولپنڈی میں ایک دربار منعقد کرکے عبدالرحمان خان کو بلایا جس میں ویسرائے ہند اور امیر موصوف کی کی ملاقات ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے شاہ افغانستان کے سالانہ وظیفہ میں اضافہ کرکے بارہ لاکھ کے بجائے اٹھارہ لاکھ کردئے۔ امیر موصوف نے اس اضافہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور برطانوی مدبرین کو یقین دلایا کہ افغان ہمیشہ حکومت برطانیہ کے سچے دوست رہینگے اور وہ بوقت ضرورت حکومت برطانیہ کی مدد کرنے کو ہر طرح تیار رہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب امیر عبدالرحمان خان نے رحلت کی تو ان کے بیٹے حبیب اللہ خان افغانستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ امیر حبیب اللہ خان نے اپنے پہلے دربار میں تمام سرداران قبائل کے سامنے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ ان کی حکومت کی پالیسی وہی رہیگی جو ان کے والد امیر مرحوم کی تھی۔ حقیقت یہ ہے حبیب اللہ خان کو عبدالرحمان نے اپنی زندگی میں اچھی طرح ملکی معاملات کا عملی تجربہ سکھادیا تھا۔ لیکن حبیب اللہ خان نے کوئی خاص جوہر نہیں دکھایا۔ جو اس کے باپ امیر عبدالرحمان خان میں تھا۔ امیر حبیب اللہ خان کو افغانستان کی عنان سلطنت اس وقت ملی جب تمام ملک منظم تھا۔ تمام افغانستان میں امن وامان کا دور دورہ تھا۔ عبدالرحمان خان کے انتقال کے بعد تخت کے لئے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ان حالات

ں حبیب اللہ خان کا فرض تھا کہ ملک کو ایک قدم اور آگے بڑھاتے۔ لیکن حبیب اللہ خان
ں باپ کے انتقال کے بعد وہ ولولہ نہیں رہا تھا جو وقتاً فوقتاً باپ کی زندگی میں ظاہر ہوتا
رہا۔ غرضیکہ ۱۴؁ ۱۹ء میں جب یورپ کی جنگ عظیم چھڑی تو اس زمانہ میں ایک جرمن و ترکی
فد افغانستان پہونچا اور حبیب اللہ خان سے استدعا کی کہ افغانستان کی فوجیں ہندوستان
حملہ کرکے اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کریں۔ حبیب اللہ خان نے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا۔
رمن و ترکی وفد بے نیل و مرام واپس گیا۔

اس واقعہ نے نوجوان افغانون کے دلوں میں حبیب اللہ خان کے خلاف نفرت انگیز
ذبات پیدا کردئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸؁ ۱۹ء میں حبیب اللہ خان جلال آباد کے قریب
شکارگاہ میں ایک نوجوان افغان کے ہاتھ گولی کا نشانہ بنا۔ اور قاتل کا آج
ک کوئی پتہ نہیں چلا۔

حبیب اللہ خان کے بعد تخت افغانستان پر وہ شخصیت جلوہ آرا ہوئی جس کو دنیا
مان اللہ خان کے ہر دلعزیز نام سے جانتی ہے۔ امان اللہ خان بھی بلا کسی مخالفت کے شاہ
فغانستان ہوا۔ ۱۹؁ ۱۹ء میں جب انگریزی قوت باوجود فتح یابی کے چور چور ہو گئی تھی۔ اسی وقت
ان اللہ خان نے زرین موقع دیکھ کر انگریزون کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ افغانی
وجوں نے نادر خان موجودہ شاہ افغانستان کی قیادت میں انگریزی سرحد پر حملہ کرکے انگریزون کو
س شرط کے ماننے پر مجبور کیا کہ حکومت برطانیہ افغانستان کے استقلال کو تسلیم کرے۔ کیونکہ افغان
ب انگریزی اقتدار کو کسی حالت میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ افغانی اور انگریزی
مائندون نے راولپنڈی اور دہرہ دون میں معاہدہ تیار کیا۔ اس میں افغانستان کو دولت مستقلہ
ما گیا۔ اور انگریزون نے وظیفہ کی وہ رقم جو شاہان افغانستان کو سالانہ دیتے تھے بند کر دی۔
ب افغانستان کی سلطنت "دولت خداداد مستقلۂ افغانستان" کے نام سے مشہور ہوئی۔
ور تمام مشرقی اور مغربی طاقتوں نے افغانستان کے استقلال کو تسلیم کیا۔ مختلف ممالک

میں افغانی سفراء مقرر ہو کر رہنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے امان اللہ خان کو وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ جس کی قدر و قیمت افغانوں جیسے قدامت پسند لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ امان اللہ خان اپنے دادا کی طرح چاہتا تھا کہ افغان قوم اقوام عالم کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں دوش بدوش چل سکے۔ لیکن افغانوں جیسی قدامت پسند قوم نے امان اللہ خان کی شخصیت کو نہیں سمجھا۔ ایسے افراد کسی قوم میں ہر روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔ بلکہ قدرت اپنی یہ نعمت ایک عرصۂ دراز کے بعد دیتی ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)

۱۹۲۸ء میں امان اللہ خان نے اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کیلئے ضروری سمجھا کہ بذات خود یورپ کے مختلف ممالک کی سیاحت کرکے وہاں کے تعلیمی، صنعتی اور تجارتی اداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے ملک، افغانستان میں ان طریقوں کو رائج کریں۔ چنانچہ امان اللہ خان نے یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ خصوصاً جب وہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس میں گئے تو ان کی حکومتوں نے امان اللہ خان کا شاہانہ استقبال کیا۔ یورپ اور ایشیا کے جرائد و اخبار نے امان اللہ خان اور افغانستان پر مفصل مضامین شائع کئے۔ افغانستان کی شہرت دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہونچی۔ امان اللہ خان یہ سفر تقریباً سات آٹھ ماہ میں ختم کرکے بخیریت اپنے وطن کو واپس ہوئے۔ امان اللہ خان کے دل میں اپنے وطن کی محبت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے افغانستان ترقی کرکے دنیا کے متمدن ممالک میں شمار ہونے لگے۔ آتے ہی امان اللہ خان نے ملک میں اصلاحات جدیدہ جاری کر دیں۔ اس فوری اقدام نے افغانی قوم کو ناراض کر دیا۔ قوم کی ناراضگی نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ الغرض امان اللہ خان نے کابل کو خیرباد

قندھار میں پناہ لی۔ باغیوں کے سرغنہ بچہ سقہ نے تخت کابل پر قبضہ کرلیا۔ اور امیر حبیب اللہ کے لقب سے تخت نشین ہوگیا۔

امان اللہ خان نے قندھار میں فوجی قوت درست کی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ باغیوں سے مقابلہ کیا لیکن اس مقابلہ میں ان کو معلوم ہوگیا کہ ان کا افغانستان میں رہنا محال اور بے فائدہ ہے۔ چنانچہ امان اللہ خان ہندوستان کی راہ یورپ چلے گئے۔ اور روم میں سکونت پذیر ہوگئے۔ امان اللہ خان کے جانے کے بعد تمام افغانستان پر بچہ سقہ کا قبضہ ہوگیا سقوی مظالم نے افغانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کردیا۔ قدرت نے افغانستان کی بہبود اور نجات کے لئے ایک مریض سردار کو جو فرانس میں صاحب فراش تھا جس کو دنیا نادر خان کے نام سے جانتی ہے لاکر کھڑا کردیا۔ بیماری کی حالت میں نادر خاں کو حب الوطنی کے جذبات نے مجبور کیا کہ فرانس جیسے ملک کی پر لطف زندگی کو ترک کرکے افغانستان میں جو اس وقت سقوی مظالم کی وجہ سے کرۂ آتش بنا ہوا تھا آئے اور ملک کو ڈاکوؤں کے ہاتھ سے چھڑا کر ایک منظم حکومت قائم کرے۔ چنانچہ نادر خان نے مع اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ۱۹۲۹ء میں افغانستان پہونچکر ملک کو ڈاکوؤں سے صاف کرکے افغانستان کے تاج کو قومی جرگہ کے سامنے رکھا۔ کہ قومی جرگہ اس تاج کے قابل جس کو سمجھے اس کے سر پر رکھ دے۔ چنانچہ تمام افغانستان کے سرداروں نے یہی فیصلہ کیا کہ موجودہ ابتری کی حالت میں افغانی تاج کا سزاوار صرف نادر خان کا سر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ نادر خان ہی تھا کہ جس نے ۱۹۱۹ء میں ملک کو استقلال کی دولت سے مالامال کردیا تھا اور پھر اب مصیبت کے وقت ملک کو اسی نے نجات دلائی۔

اس لئے افغانی تاج نادر خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جسکو انھوں نے بڑے اصرار کے بعد زیب سر کیا۔ اس کے بعد سے اپنے وطن عزیز افغانستان کی ترقی اور بہبودی کے لئے برابر کوشاں ہیں۔ اور تدریجی طریقہ سے ملک کو اسی منزل کی طرف لے جارہے ہیں

جس کی طرف امان اللہ خان نہایت تیزی سے لیجانا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ امان اللہ خان اور نادر خان دو قابل فخر فرزند ہیں۔ دونوں کے دل افغان قوم کی ترقی کے لئے بے قرار ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ افغانستان تمام دنیا میں عزت و وقار حاصل کرے۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ امان اللہ خان بہت تیزی سے ملک کو تہذیب جدید سے آشنا کرنا چاہتے تھے اور نادر خان تدریجی طریقے پر ملک کو ترقی کی طرف لیجا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانوں جیسی قدامت پسند قوم کو یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ بیک وقت تہذیب حاضرہ سے ہمکنار ہو جائیں۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کو تدریجی طریقے سے ترقی کی طرف لیجایا جاسکے۔

امیر عبدالرحمان خان افغانی زندگی کا سب سے بڑا نباض تھا؛ بالفاظ دیگر جس نے افغانی فطرت کا نہایت عمیق مطالعہ کیا تھا اس نے اپنے جانشینوں کو اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں چند نصیحتیں کی ہیں اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ

"میرے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ جو اصلاحی تحریک ملک میں جاری کرنا چاہیں وہ سوچ سمجھ کر جاری کریں۔ ایسا نہ ہو کہ افغان قوم کے جذبات کو ٹھیس لگے مغربی تعلیم کے دارالعلوم اور جمہوری طرز حکومت کے قوانین بتدریج جاری کریں۔"

ماہر فطرت افغانی، امیر عبدالرحمن خاں کی یہ نصیحت کس قدر تجربہ اور حقیقت پر مبنی ہے امان اللہ خان اس نصیحت کو ترک کرکے سرعت کے ساتھ اپنی قوم کو اصلاحات کی طرف لیجانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اس لئے افغانستان کے ہر حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ افغانستان کے سامنے اصلاحی پروگرام تدریجی طور پر پیش کرے۔

نادر خان نے اس قلیل عرصہ میں افغانستان کو جس طرح منظم کیا ہے۔ اس کی مثال۔ افغانی تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ اس وقت افغانستان خدا کے فضل سے تدریجی رفتار سے ترقی

کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آج افغانستان کی فوجیں منظم ہیں ملک کی سیاسی، تعلیمی، تجارتی، مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لئے موجودہ فرمانروا ہر طرح سے کوشاں ہے۔ مذہبی اصلاح کیلئے اس نے ایک جماعت جمعیۃ علمائے افغانستان کے نام سے تشکیل دی ہے۔ سیاسی ترقی کے لئے اسی سال افغانی پارلیمنٹ اور افغانی دارالامراء کا افتتاح ہو چکا ہے۔ ان اداروں کا افتتاح کرتے ہوئے نادر خان نے جو تقریریں کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرمانروا کا دل اپنی قوم اور مذہب سے کس قدر معمور ہے اور وہ اسلامی اصولوں کے احترام و وقار کے لئے اپنی ہر چیز قربان کرنے کیلئے آمادہ ہے۔

خاتمہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ افغان بجائے حکمران ہونے کے سپاہی بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ ایک افغانی جس طرح میدان جنگ میں سپاہیانہ جوہر دکھلا سکتا ہے۔ اسی طرح تخت حکومت پر بیٹھ کر بہتر طریقے پر انتظام مملکت بھی کر سکتا ہے۔

دولت غوریہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک اگر افغانوں کی سیاسی تاریخ دیکھی جائے تو افغانوں میں سینکڑوں افراد ایسے ملیں گے جنھوں نے اس امر کا کافی ثبوت بہم پہونچایا ہے۔ کہ افغان قوم اصول جہانبانی میں کسی قوم سے کم نہیں۔ قدرت نے افغانوں کو جہاں سپاہیانہ جوہر مرحمت فرمایا ہے وہاں حکمرانی کا سلیقہ بھی عنایت کیا ہے۔ یہ سلیقہ حکمرانی افغانوں میں اگر کسی قوم سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ سکندر لودھی کا عدل و انصاف۔ شیر شاہ کا انتظام مملکت احمد شاہ ابدالی کی فوجی قابلیت۔ امیر عبدالرحمن خان کے سیاسی تجربات اور امان اللہ خان کی حب الوطنی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ افغانوں کو قدرت نے جہاں سپاہیانہ مادہ عنایت کیا ہے وہاں ملکہ فرمانروائی میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں خاصیتیں کسی قوم میں بیک وقت کم پائی جاتی ہیں۔

افغانی حکمران خاندانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ افغانی حکومتیں رعایا پروری، عدل و انصاف میں دوسرے حکمران خاندانوں سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔

رفاہ عام اور ملک کی اندرونی امن وامان ان کی حکومتوں کا مقصد اولین تھا۔ غوریوں کی حکومت میں تمام افغانستان میں امن وامان تھا۔ لودھیوں نے طوائف الملوکی کے زمانہ میں سلطنت ہندوستان کو جس طرح لامرکزیت سے نکال کر مرکزیت میں کر دیا۔ کیا یہ واقعہ ان کے ملک جہانبانی کے ثبوت کے لئے کافی نہیں؟ شیر شاہی عہد اپنی برکات کی وجہ سے تاریخ ہند میں ایک نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ ابدالی فتوحات افغانی تاریخ میں ایک زرین صفحہ ہے۔ بارک زئی خاندان کی شجاعت کے کارنامے ہر افغان بچے اور بوڑھے کی زبان پر جاری ہیں۔ اسی خاندان نے اپنی شجاعت اور تدبیر سے روس اور برطانیہ جیسی استعماریت پرست طاقتوں کو متعدد بار نیچا دکھایا۔ دونوں طاقتوں کو معلوم ہوگیا کہ افغانی قوم کوئی تر لقمہ نہیں جس کو آسانی کے ساتھ ہضم کیا جاسکے۔ برطانوی مدبرین اپنی انتہائی سیاسی چالبازیوں اور فوجی طاقت کے مظاہروں کے باوجود افغانوں کو اپنے قبضہ میں نہ لاسکے۔ انگریزوں کو اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ افغانوں جیسی حریت پسند قوم پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ افغانی اور برطانوی جنگوں پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ "بتیس کروڑ مصارف کثیرہ اور ہزارہا جانیں ضائع ہونے کے باوجود ہم کو افغانوں کی عداوت کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔"

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ افغان قوم باوجود ان مندرجہ بالا خصائص کے ایک خرابی رکھتی ہے جو ان کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہے اور وہ نفاق ہے۔ افغانی تاریخ بتاتی ہے کہ متعدد شخصیتوں نے افغانوں کو اتحاد کی تلقین کی۔ ان شخصیتوں میں نمایاں شخصیت شیر شاہ کی ہے۔ شیر شاہ نے افغانوں کے اتحاد کے لئے بے انتہا کوشش کی۔ لیکن شیر شاہ کے مرنے کے بعد افغان سرداروں میں وہی نااتفاقی عود کر آئی جس نے شیر شاہ کی قائم کی ہوئی وسیع سلطنت کو تباہ و برباد کر کے چھوڑا۔ شیر شاہ کے بعد دوسری شخصیت عبدالرحمان خان کی ہے جس نے افغان قوم کو متنبہ کیا کہ "تمہاری نااتفاقی تمہاری تباہی و بربادی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ افغانستان کی حکومت مضبوط ہو تو تمہارا

سب سے مقدم فرض ہے کہ قوم کے منتشر افراد کو رشتہ اخوت میں منسلک کرو۔"

عبدالرحمان خان کے بعد اس کے پوتے امان اللہ خان نے بھی قوم کے سامنے اپنے دادا کے پیغام کو دہرایا اور کہا کہ "افغانوں کی ترقی کا راز اتحاد اور محض اتحاد میں مضمر ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج تک افغان قوم نے اپنی جہالت کی وجہ سے اتحاد کی برکت کو نہیں سمجھا۔ مگر گردش زمانہ افغانوں کو ایک نہ ایک روز رشتۂ اتحاد میں منسلک کرکے چھوڑے گی۔ اس وقت یہ ملت آوارہ کوہ و دمن میدان میں نکل کر ایشیا کی رہنمائی کا فخر حاصل کرے گی۔

حوالے

اردو
(۱) نیرنگ افغانستان — از اغلب حسن حسرت
(۲) تاریخ فرشتہ — دارالترجمہ حیدرآباد
(۳) تاریخ ہند — از ھاشمی

فارسی
(۱) تاریخ سراج الاخبار
(۲) تزک عبدالرحمانی
(۳) فارسی جرائد (افغانستان - اصلاح)

(1) The History of Kabul vol: I by Elphinstone.

خطابت کی سحر کاریاں

شیکسپیر کا ایک مشہور ڈرامہ (جولیس قیصر) ہے یہ افسانہ عقول عوام کی ایک دردناک داستان اور خطبار کی ہوس رانیوں اور فریب کاریوں کی ایک مکمل تصویر ہے۔ تمہیں اس قصہ میں نظر آئیگا کہ جس طرح کھلاڑی فٹ بال کو اپنے حسب منشا اوپر پھینکتے نیچے گراتے اور ٹھوکریں دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح عوام کے لیڈر بڑے بڑے خطباء اور اچھے سے اچھے مقررین انکے جذبات ان کے خیالات اور انکے احساسات سے کھیلتے ہیں۔ کبھی اپنے قطرہائے اشک کے سیلاب میں انہیں ڈبکیاں دیتے ہیں تو کبھی اپنے برق صفت تبسم سے انکے خرمن سکون و راحت کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں کبھی اپنی پرجوش تقریروں سے قلب کو گرما اور روح کو تڑپا دیتے ہیں۔ تو کبھی اپنی جادو بیانیوں سے ساری قوم کو اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی اغراض و مقاصد کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

بروٹس ایک ہمدرد قوم و ملک اور شریف معزز رومی تھا اسنے شدت کیساتھ یہ محسوس کیا کہ جولیس قیصر نے پوری رومی قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ انکی شرافت نفس فنا کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ ابدی ذلت نے انکے حواس و شعور پر پورا قابو پا لیا ہے۔ انہیں اپنی زندگی کی تلخی کا احساس نہیں۔ چندے یہی لیل و نہار رہا تو بحیثیت ایک معزز و خود دار قوم کے انکا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ جائیگا۔ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس مہلک مرض کا واحد علاج قیصر کا قتل ہے۔

قیصر بروٹس کا نہایت ہی محبوب دوست تھا لیکن قوم و ملک کی خاطر اسنے اپنی محبوب متاع کو اپنی ہی تلوار سے موت کے خوفناک گڑھے میں ڈھکیل دیا

رومی قوم قیصر کے قاتل سے انتقام لینے کیلئے بیتاب ہوگئی۔ لوگوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا اور بروٹس کو گھیر لیا۔

بروٹس اس غضبناک مجمع کے سامنے تقریر کرنیکے لئے کھڑا ہوا۔ یہ نہایت ہی نازک موقع تھا

سرفرازی وسربلندی کا تاج یا ذلت ورسوائی کا قہر بے پناہ۔ بہادروں اور جاں نثاروں کا درخشاں تمغہ خائن وغدار گروہ کا سا تاریک انجام۔ یہ ظاہر ہے کہ تقریر کی تاثیر وعدم تاثیر پر موقوف تھا۔ مجمع غصے میں بھرا ہوا تھا۔ کسی طرح تقریر سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ زبان پر انتقام انتقام کی رٹ تھی۔ بالآخر بعض زعما کی کوششوں سے سکوں کی فضا پیدا ہوئی اور بروٹس نے تقریر شروع کی۔

بروٹس کی تقریر

بزرگان قوم۔ کیا میں امید کروں کہ آپ حضرات میری بھلی یا بری کڑوی یا میٹھی بکواس تھوڑی دیر کیلئے عدل وانصاف کی خاطر صبر وسکون کے ساتھ سنیں گے۔ میں آپ لوگوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا اور نہ آپ کے جذبات واحساسات کی توہین کرنا اور آپ کے دلوں اور دماغوں سے کھیلنا چاہتا ہوں بلکہ آپ لوگوں سے میری پرزور درخواست ہے کہ واقعہ کا نہایت ہی حزم واحتیاط کے ساتھ مطالعہ فرمائیے میں آپ لوگوں کو کامل صداقت وخلوص سے دعوت دیتا ہوں کہ قضیہ بالنزاع کا فیصلہ متانت وسنجیدگی اور سکون قلب واطمینان خاطر کیساتھ عدل وانصاف کی روشنی میں کیجئے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرا یہ اقدام مبنی برحق ہے اسکے دامن پر کوئی ایسا داغ نہیں جسے میں آپ لوگوں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کروں۔

برادران وطن! اگر آپ میں کوئی قیصر کا دوست یہاں موجود ہو اور وہ اسکے قتل پر اپنے جگر کے ٹکڑے کر رہا ہو تو مجھے معاف کرے اگر میں اس سے یہ کہوں کہ اے میرے معزز دوست! قیصر کے قاتل بروٹس کو قیصر تم سے زیادہ محبوب تھا۔ قیصر کی وقعت تمہارے دل میں اتنی نہیں جتنی اسکے دل میں تھی۔

اکابر ملت! میں تمام دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کے سامنے کوئی جھوٹا دعوی نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے اپنے محبوب دوست قیصر کو کسی ذاتی بغض وعناد کسی شخصی عداوت ودشمنی کی بنا پر قتل نہیں کیا ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے قتل کیا ہے کہ روم مجھکو اس سے کہیں زیادہ محبوب تھا۔

قیصر ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا اس لئے مجھے وہ محبوب تھا وہ شجاع اور بہادر تھا اسلئے میں اُسکا احترام کرتا تھا لیکن وہ طماع و حریص تھا اس لئے مینے اُسکا کام تمام کر دیا۔ بس ایک ہی وقت میں میں نے اسپر آنسو بھی بہائے اور خنجر بھی چلایا۔

مجھے یقین نہین کہ آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے قیصر کی موت پر حقیقی اور واقعی رنج و غم اور افسوس و حسرت ہو آپ رومی ہین اور رومی کبھی ذلت کیساتھ زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔

آپ لوگوں میں وہ کون ایسا شخص ہے جو رومی کہلایا جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ کون ہے جو آزاد رہنا عیب سمجھتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے نفس و ضمیر کی توہین گوارا کرتا ہے۔ وہ کون ہے جو اپنے وطن عزیز کی ذلت و حقارت کی اپنے اندر تاب رکھتا ہے۔ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہو تو جواب دے وہی اس بات کا حقدار ہے کہ مجھ سے قیصر کے خون کا مطالبہ کرے کیونکہ میں نے اس شخص کے علا کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچایا ہے۔

مجمع۔ نہیں ہم میں کوئی ایسا نہین۔

بروٹس۔ تو پھر میں نے کسی کو اذیت نہیں دی۔

بروٹس نے مشکل ہی سے یہ جملہ ختم کیا تھا کہ قیصر کا دوست اور طالبان انتقام کا سر گروہ ان مع اپنے رفقا کے قیصر کی لاش لئے ہوئے مجمع میں نوحہ و مرثیہ خوانی کے لئے پہونچا۔ بروٹس نے سل تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے یہ قیصر کی لاش ہے اور یہ انٹونیو قیصر کا دوست ہے۔ یہاں پر یہ قیصر کے فضائل و محا بیان کرنے آیا ہے۔ آپ لوگ غور سے سنئے مگر اس فرق کو ذہن میں محفوظ رکھئے کہ گنہگار قیصر او اور نیک و پرہیز گار قیصر اور ہے۔ گنہگار قیصر کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اسے تو آپ سُن۔ اب پرہیز گار قیصر کے متعلق جو کچھ کہا جائے اسے سنئے۔ آخر مین میں ایک جملہ پر اپنی تقر ختم کرتا ہوں۔

عظمائے روم! جس تلوار سے مین نے روم کے لئے قیصر کو قتل کیا ہے وہ تلوار قیص

خاطر بروٹس کے قتل کے لئے بھی جب کبھی بھی روم چاہے ہمیشہ محفوظ رہے گی ۔

تقریر کا اثر

مجمع ۔ زندہ باد بروٹس

ایک ۔ اس جان نثار ملک و فداکار قوم کا ایک مجسمہ نصب کرنا چاہئے ۔

دوسرا ۔ اس لائق فرزند وطن کو قیصر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا جائے ۔

تیسرا ۔ قیصر فضل و کمال اور شرافت نفس میں اس کے پاسنگ بھی نہیں تھا ۔

چوتھا ۔ قیصر ظالم و جفا کار تھا ۔

پانچواں ۔ اجی وہ سراپا جور و ستم اور ظلم و جفا تھا ۔

چھٹا ۔ اب روم کو اس ظالم و سفاک سے نجات ملی ۔

ساتواں ۔ کیا ہمیں انٹونیو کے ساتھ قیصر کے مرثیے میں شرکت کرنا چاہئے ۔

آٹھواں ۔ ہاں ضرور کیونکہ بروٹس نے ہم کو حکم دیا ہے ۔

بروٹس اسٹیج سے اب اتر پڑا اور مجمع پروانہ وار اس پر ٹوٹ پڑا ۔ لوگوں کے دل اس کے قدموں پر لوٹ رہے تھے اور آنکھیں اس کے لئے بچھی جاتی تھیں ۔ انٹونیو اسی عالم میں کھڑا ہوا تھا ۔ غضبناک اور خشم آلود آنکھوں نے اس کو گھورا ۔ اگر بروٹس نہ روکتا تو مجمع اسے چشم زدن میں فرش زمین پر ڈھیر کر دیتا ۔ انٹونیو نے اس غبار آلود فضا میں حسب ذیل معرکۃ الآرا تقریر شروع کی ۔

انٹونیو کی تقریر

انٹونیو ۔ اے رومیو !

ایک ۔ خاموش ، سنو ، انٹونیو کیا کہتا ہے

دوسرا ۔ نہیں ، ہم نہیں سنیں گے ۔ ہم اس کی بات نہیں سنیں گے ۔

انٹونیو ۔ پیارے بھائیو ! سنو بروٹس کے حکم کی عزت کرو ۔ بروٹس کی خاطر میری سنو ۔

کوئی ایک۔ دیکھو سنو تو سہی کہ بروٹس کے متعلق یہ شخص کیا کہتا ہے۔

دوسرا۔ اماں، کچھ نہیں۔ ہم اس کی بکواس نہیں سنیں گے۔

تیسرا۔ نہیں ہم لوگوں کو سننا چاہئے، دیکھیں کہتا کیا ہے۔

انٹونیو۔ دوستو! میں قیصر کا مرثیہ پڑھنے نہیں بلکہ اس کی نعش کو دفن کرنے اور اس کے مردہ جسم کو سپرد خاک کرنے کے لئے آیا ہوں۔

ہر شخص اپنی زندگی میں اچھے اور برے کردار کا مالک ہوتا ہے، اس کے اعمال حسنہ تو اس کی موت کے ساتھ مٹ جاتے ہیں لیکن اس کے افعال سیئہ قیامت تک باقی رہتے ہیں قیصر بھی انسان تھا اس کے بھی حسنات وسئیات کا یہی حشر ہونا تھا اور رہوا۔

برادران قوم! اگر بروٹس مجھے اسٹیج پر آنے اور کچھ عرض کرنے کا حکم نہ دیتا تو اس وقت میں ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہ نکالتا، اس نے مجھکو حکم دیا، میں نے اس کی اطاعت کی اور اس کے فرمان والاشان کے سامنے سر تسلیم و انقیاد خم کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک شریف ولائق عزت شخص ہے۔

برادران! معزز دوست بروٹس نے کہا کہ قیصر ایک طماع و حریص شخص تھا۔ میں اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ایک سچا آدمی ہے، جھوٹ نہیں بولتا۔

میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قیصر قناعت پسند اور بے طمع آدمی تھا کیونکہ محترم بروٹس نے اس کے خلاف اعلان کیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہی وہ لالچی قیصر تھا جس نے قیدی دشمنوں سے اتنا کثیر زر فدیہ وصول کیا کہ روم کا خزانہ گہر و جواہر سے لبریز ہو گیا اور ملک دولت و ثروت کی اس بارش سے سرسبز و شاداب ہو گیا۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری ان آنکھوں نے قیصر کو غربا کے فقر و فاقے پر اکثر آنسو بہاتے، گریہ و بکا کرتے، آہیں بھرتے اور نالہ و فغاں کرتے دیکھا ہے، کتنی ہی ایسی راتیں ہیں جنھیں قیصر نے تنگدستوں کی اصلاح حال اور فراہمی معاش کی فکر میں آنکھوں میں کاٹ ڈالا ہے۔

میں نے خود کئی دفعہ "لوپرکال" میں تاج و تخت قیصر کی خدمت میں پیش کیا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس سے اعراض و انکار کیا، اس کو تاج کا شوق نہیں تھا وہ تو خدمت وطن کا بھوکا تھا، اسا کو عیش و آرام سے الفت نہیں تھی، اس کو تو قوم کی خوشحالی کی خاطر آلام و مصائب کے برداشت کرنے میں لطف آتا تھا۔

بروٹس ایک نہایت ہی معزز شخص ہے میں کسی حال میں بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا ورنہ میں تم سے دریافت کرتا کہ کیا حرص و آز کا مسکن ایسا ہی قلب ہو سکتا ہے، کیا ایسے پاکیزہ دل میں، کیا ایسے خداترس قلب میں طمع اور لالچ کے لئے کوئی گوشہ ڈھونڈنے سے بھی مل سکتا ہے؟

رومیو! آج سے پہلے قیصر تمھیں دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا تم اس پر نثار ہونے اس کی خاطر اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ پھر آج تمھیں یہ کیا ہوگیا ہے کہ آنسو کا ایک قطرہ بھی تمھاری آنکھوں سے نہیں گرتا۔

اگر تم اس عمدہ صفات، بہتر خصائل اور لائق تعریف شمائل پر نہیں روتے تو نہ روؤ لیکن کم از کم اس کے لئے تو روؤ کہ وہ تم کو محبوب تھا، تم کو پیارا تھا۔ دنیا جہان میں سب سے زیادہ تمھارا چہیتا تھا۔ تم اس لئے روؤ کہ کل یہی وہ شخص تھا جس کی ایک جنبش لب پر بڑے بڑے بہادروں اور سورماؤں کے دل دہل جاتے تھے جس طرح بجلی کی ایک کڑک سے اس سرے سے لے کر اس سرے تک زمین و آسمان کی ساری فضا لرز جاتی ہے، لیکن آج وہی شخص ہے جو ایک دیوار کے کنارے ذلیل و خوار بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ نہ اس کا کوئی نوحہ خواں ہے نہ غمخوار۔ آہ آج اس پر کوئی رونے والا نہیں۔

اے عقل انسانی! آج یہ تجھکو کیا ہوگیا ہے؟ تو کیوں انسانوں کے دلوں سے نکل کر وحشی حیوانوں کے سینوں میں سما گئی ہے؟ تو نے اپنا رستہ کیوں کھو دیا؟ تو کیوں گم کردہ راہ ہو گئی؟ تو مبہوت ہو کر رہ گئی ہے۔ تو نے خیر کو شر اور شر کو خیر قرار دے لیا ہے۔ کیا تجھ سے قوت ممیزہ چھین لی گئی؟ کیا تجھے اب صواب و خطا کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں رہی؟ کیا جرائم و محاسن کی پہچان

سے تو عاجز ہو گئی!

رومیو! میری ژولیدہ بیانی و پریشان گوئی سے اگر تم کو تکلیف ہوتی ہو تو معاف کرنا کہ اس فاجعہ عظمیٰ و حادثہ کبریٰ نے میرے دماغ کو منتشر اور قلب کو پراگندہ کر دیا ہے۔

دوستو! میرے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جو تمہاری محبت والفت میں سرشار، تمہاری خیر اندیشی و نکوکوشی میں غرق، تمہاری فلاح و بہبود کے لئے بیچین اور تمہاری آرام و آسایش کے بیتاب ہے۔ اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ تمہارے سینے شدت رنج و محن و کثرت و حزن والم سے پھٹ جائیں گے تو میں کہتا قیصر مظلوم ہے وہ بلا قصور قتل کر دیا گیا۔

بروٹس اور اس کے رفقار کار فخر قوم اور ملک کے سرمایہ ناز فرزند ہیں۔ ان کو مجرم و خطا کہنے سے پہلے میرے ضمیر کو، روم کو، اور خود قیصر کی پاک روح کو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔

اتنا کہہ کر انٹونیو خاموش ہو گیا اور اس کی چشمہائے پرنم سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔

انقلاب

ایک۔ (اپنے ہم نشیں کی طرف مخاطب ہو کر) مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ شخص نہا ہی معقول بات کہہ رہا ہے۔

دوسرا۔ یقیناً، اگر تم ذرا غور کرو تو تم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ قیصر کا قتل سفا بے رحمی کا بدترین نمونہ اور انتہائی بزدلانہ جرم ہے۔

تیسرا۔ قیصر کے تاج و تخت سے استغنا نے تو میرے دل کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل مستحسن اور کس قدر مبارک ہے

چوتھا۔ وہ کیسا نرم دل، رقیق القلب اور رحم صفت تھا کہ مصیبت زدوں اور فاقہ ک کی حالت زار پر رنج و غم کے آنسو بہاتا اور جگر کے ٹکڑے کرتا تھا۔

پانچواں۔ فقیروں اور آفت رسیدوں کا ایسا مونس و غمخوار ایسا ہمدرد و غمگسار طماع و ظالم نہ تھا۔ اب تو جناب قیصر کی خونریزی نے بڑی اہم نازک صورت حال اختیار کر

ساتواں۔ قاتل سے ضرور انتقام لینا چاہئے۔

آٹھواں۔ (اپنے ہم جلیس کی طرف مخاطب ہو کر) دیکھو انٹونیو کس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا اور نوحہ کرتا ہے۔

نواں۔ روم میں انٹونیو سے بڑھ کر ملک کا کوئی سچا بہی خواہ نہیں۔

انٹونیو۔ کیا آپ لوگ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ تھوڑی دیر کے لئے میں یہاں سے ہٹ جاؤں اور اس بیکس و مظلوم میت پر نذر عقیدت کے چند پھول چڑھا آؤں۔

مجمع۔ ضرور۔ ضرور۔

انٹونیو اسٹیج سے اتر آیا اور آہستہ آہستہ قیصر کی لاش کے پاس گیا۔ لاش اب تک انھیں کپڑوں میں لپٹی پڑی ہوئی تھی جن میں کہ وہ قتل کی گئی تھی اور خنجر کے زخم لباس کے اندر سے ظاہر ہو رہے تھے۔ انٹونیو نے مجمع کو پکار کر کہا۔

انٹونیو۔ لوگو! یہی وہ قیصر ہے جس کے ابر کرم کی بارش سے تم بارہا سیراب ہو چکے ہو۔ اس کی لاش زخم و خون میں شرابور ہے۔ آؤ اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے اس کو غسل دو۔ قیصر کی لاش کا رواں رواں نہایت بے کسی و عاجزی کے ساتھ تم سے اس کا مطالبہ کر رہا ہے۔

تم سب لوگ اس لباس کو دیکھتے ہو مگر شاید اس کی تاریخ و اہمیت سے واقف نہیں ہو۔ مجھ خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یہ خون میں لتھڑا ہوا لباس قیصر نے اس شام کو زیب تن کیا تھا جس شام کو قیصر نے وہ شاندار فتحیابی حاصل کی تھی جس پر روم قیامت تک فخر کرے گا۔

(اس موقع پر انٹونیو نے قیصر کی عبا کے ایک شگاف کو نمایاں کیا اور کہا۔)

اسی بڑے سوراخ سے اس فاتح اعظم کے جسم کو چھلنی کیا گیا۔ اسی سوراخ سے ہو کر بروٹس کا خنجر قیصر کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اسی سوراخ سے قیصر کا بے گناہ خون بہایا گیا۔

زخموں نے خنجر کے اس بنائے ہوئے جھروکے سے اپنے قاتل کی خوفناک صورت کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ قیصر نے بروٹس سے طلب رحم کرنے سے پہلے روم کے ہر ہر فرد کو دادرسی کے لئے آواز دی مگر افسوس صد افسوس کہ کسی نے بھی اس کی دادرسی نہیں کی

اور وہ بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

قیصر نے پہچان لیا کہ میرا قاتل میرا دوست ہے۔ وہ شخص ہے جس کی گردن اس وقت بھی میری عنایتوں اور نوازشوں، میری کرمفرمائیوں اور مہربانیوں کے بارگراں سے جھکی ہوئی ہے۔

اس خلاف توقع کمینگی و غداری سے اس کی ہمت ٹوٹ گئی، مقابلے کی جرأت نہ رہی، اس جانگداز واقعے نے جتنا کاری اثر اس کے دل پر کیا وہ کسی حیثیت سے اس زخم سے جس نے اس کے لاشے کو ماہی بےآب بنا رہا تھا کم نہ تھا۔ تیغ و خنجر تیرو سناں کا خوفناک منظر اس کے لئے اتنا بھیانک اور ڈراؤنا نہ تھا جتنی کہ خیانت غداری اور بیوفائی کی مکروہ اور نفرت انگیز صورت اسی لئے قیصر کے لبوں پر مہر لگ گئی اور وہ صرف اتنا آخری اور الوداعی مختصر جملہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا کہ

اور تو بھی اے بروٹس؟

قیصر مجسمہ "پامپی" کے نیچے مقتول پایا گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے چہرہ کو اپنی عبا کی آستین سے چھپا لیا تھا تا کہ اس کی روح ناشکرگزاری، احسان فراموشی اور کفران نعمت کے کریہہ و بدمنظر مجسمہ کے دیکھنے سے دوبارہ متنفص، رنجیدہ و غمگین نہ ہو۔

قیصر کی موت کے غم میں زمین و آسمان تاریک ہو گئے ہیں، شجر، حجر، بشر سبھی اپنے لختہائے جگر اپنی آنکھوں کی راہ سے بہا رہے ہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے کہ تمھارے دل نہایت ہی غمگین ہیں اور تمھاری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ہے۔ میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ تم اپنے سیلاب اشک سے سفاکانہ خونریزی و بےرحمانہ قتل و غارت کی وہ خونی علامت و نشانی بہائے گئے جس سے کہ ظالموں کے ہاتھ نے اس زمین کو ملوث کر دیا تھا۔ تم قیصر کی دریدہ عبا دیکھ کر زار و قطار رو رہے ہو، اگر تم اس کی نعش کے ٹکڑے اور جسم کے شگاف دیکھو تو تمھارا کیا حال ہو

(انٹونیو لاش کے قریب آیا اور اس پر سے چادر ہٹا کر مجمع سے یوں مخاطب ہوا)

ہر ہر زخم اپنی زبان حال سے تم سے دادرسی و انصاف کا طالب ہے، غور سے سنو کہ جو شہ

میں اس سے زیادہ گویائی کی قوت نہیں۔ مرثیے سے جگر پاش و دلگداز واقعہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سننے میں نہیں آسکتا۔

ایک شخص۔ کیا ہی قیامت آفریں منظر ہے۔

دوسرا۔ اے لوگو! قیصر پر رحم اور اس کے ساتھ انصاف کرو۔

تیسرا۔ قیصر کا یوم قتل نہایت ہی شر انگیز دن تھا جس کی چنگاریوں نے روم کی شاندار روایتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

چوتھا۔ یہ دنارت اور سفلہ پن روم کے چہرے پر انتہائی بدنما داغ ہے۔

پانچواں۔ اس خیانت اور غداری نے روم کو دنیا والوں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔

چھٹا۔ انتقام، انتقام۔

مجمع۔ (سخت اشتعال میں) قاتلوں کو جلا ڈالو، ان کے جسم کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں بکھیر دو، کسی ایک پر بھی ترس نہ کھاؤ۔ یہ رحم کے قابل نہیں۔

انٹونیو۔ ٹھہرو، ٹھہرو۔ میں تمہارے اشتعال سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنا نہیں چاہتا کہ قاتلوں سے خون کا مطالبہ کر کے وطن کی فضا کو تیرہ و تاریک بنا دوں میرا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ یہ قوم کے بہی خواہ، ملک کے ہمدرد اور ملک کے معزز افراد ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قیصر کے قتل کے ان کے نزدیک وہ معقول وجوہ موجود ہوں جن کو ہم نہ جانتے ہوں۔ میرا مطلب تو اس وقت صرف یہ ہے کہ قیصر تم کو دل و جان سے پیار کرتا تھا، اس لئے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ تم اس کا مرثیہ بیان کرو۔ مجلس عزا جماؤ اور اس پر توجہ کرو۔ اگر مجھ کو تمہارے ہاتھ سے عنان صبر کے چھوٹ جانے، تمہارے بے قابو ہو جانے کا خوف نہ ہوتا اور اگر مجھ کو ڈر نہ ہوتا کہ تمہارے قلوب غم و الم میں اور رنج و محن میں ڈوب جائیں گے تو میں تمہیں اس نقید عصر کی وصیت سناتا پھر تمہیں معلوم ہو جاتا کہ قیصر کو تم کتنے زیادہ محبوب تھے، وہ تمہارا کتنا جان نثار و فدا کار سردار تھا اور وہ ہرگز اس لائق نہ تھا کہ وہ تمہارے سامنے اس بیدردی سے قتل کر دیا جاتے۔ درانحالیکہ تمہاری

آنکھیں دیکھتی ہوں اور تمھاری رگوں میں خون کی گردش و دوادوش ہو۔

مجمع ۔ وصیت ضرور سنائیے ۔

انٹونیو ۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمھارے سینے اس شہید اعظم کے قتل پر شدت حزن والم سے شق ہو جا

مجمع ۔ نہیں ہم وصیت ضرور سنیں گے۔

انٹونیو ۔ قیصر نے وصیت کی ہے کہ رومی قوم کے ہر ہر فرد کو میرے خزانۂ خاص سے ۵ ، فرنک دیئے جائیں اور تمام رومی قوم کے لئے میرے تمام باغات اور تفریح گاہیں وقف ہیں۔

ایک شخص ۔ قیصر کیا ہی فیاض طبع و غریب پرور آدمی تھا ۔

دوسرا ۔ کیا ہی شریف و کریم تھا ۔

تیسرا ۔ قاتل تباہ و برباد ہیں۔

چوتھا ۔ انتقام ! انتقام !!

پانچواں ۔ ہم بروٹس کا گھر جلا کر رہیں گے۔

اس کے بعد طوفانی مجمع سڑکوں پر لہریں مارتا ہوا نظر آنے لگا ۔ ٹھیک اس طرح جس ط
زخار سمندر میں موجیں بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

انٹونیو (تنہا اپنی جگہ پر) اے تاریک شر! اے بھیانک فتنہ! میں نے ہی تجھکو ت
خوابگاہ سے اٹھایا ہے ۔ بس تو جا اور اپنا کام کر ۔ تو مشتعل ہو جا اور سقف آسمان اور فرش ز
جلا کر خاک سیاہ کر دے ۔

دیکھو یہ کس قدر عبرتناک منظر ہے کہ رومی قوم نے ابھی قیصر کی غلامی سے پورے ط
نجات بھی نہیں پائی تھی کہ انٹونیو نے اپنے دام عبودیت میں ان کو جکڑ دیا ۔ جاہل و غلام
کی یہی حالت ہوتی ہے یا تو وہ صاحب تاج و تخت کے زیر نگیں ہوتا ہے یا کسی جادو بیاں خطیب
دامن سحر کا شکار ۔ (ترجمہ)

غربت

بوڑھا سیمون عرف لال بھکڑ اور ایک نوجوان تاتاری جس کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا، دریا کے کنارے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ باقی تین ملّاح جھونپڑی کے اندر تھے۔ سیمون کوئی ساٹھ سال کا دُبلا پتلا، پوپلا آدمی تھا۔ اُس کے شانے چوڑے چکلے تھے۔ اور چہرے سے ابھی صحت کے آثار ٹپکتے تھے۔ اِس وقت وہ نشے کی ترنگ میں تھا۔ اُس کی جیب میں شراب کی بوتل تھی۔ اور دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ کہیں میرے ساتھی اس میں سے حصّہ نہ مانگ بیٹھیں۔ یہ نہ ہوتا تو وہ کبھی کا سو جاتا۔ تاتاری، بیمار، اور تھکا ماندہ، پھٹے پُرانے چیتھڑے بدن سے لپیٹے، صوبہ سمبرسک کی مزے دار زندگی اور اپنی بیوی کے حُسن وجمال، فہم وفراست کی داستان بیان کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس ۲۵ سال ہوگی۔ مگر الاؤ کی روشنی میں اُس کے زرد بیمار، اور مغموم چہرے کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا۔ کہ ابھی لڑکا سا ہے۔

لال بھکڑ بولا "بھئی یہ جگہ کچھ جنّت تو ہے نہیں۔ تم خود ہی دیکھتے ہو۔ کہ سوائے پانی اور دریا کے چٹیل کناروں، اور لیسدار مٹی کے کچھ بھی نہیں۔ جاڑا ہو چکنے کو آیا۔ دریا میں برف بہ کر آ رہی ہے۔ آج سویرے بھی تھی"

تاتاری نے کہا، مصیبت ہے مصیبت! اور گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالی۔

دس قدم کے فاصلے پر ٹھنڈا برف کا سیاہ دریا بہ رہا تھا جھلّاتا تھا، کھو کھلے ریتیلے ساحل سے ٹکراتا تھا اور کہیں دور سمندر کی طرف تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا، کنارے سے ملی ہوئی ایک بڑی ناؤ کی سیاہ پرچھائیں نظر آتی تھی۔ بہت دور دریا کے اُس پار، روشنیاں کبھی دھندلی ہو جاتی تھیں۔ کبھی جھلملانے لگتی تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح بل کھاتی تھیں، یہ پچھلے سال کی گھاس تھی جو جلائی جا رہی تھی ان سینٹھوں کے پیچھے پھر اندھیرا تھا۔ ہوا مرطوب اور سرد تھی۔

تاتاری نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اُس کے وطن میں بھی اتنے ہی تارے تھے، چاروں

طرف اُسی قدر اندھیرا تھا۔ لیکن یہاں کسی بات کی کمی محسوس ہوتی تھی، صوبہ سمبرسک میں تارے یہاں سے بالکل مختلف تھے۔ اور آسمان بھی دوسرا تھا۔

تاتاری نے پھر کہا۔ "مصیبت ہے مصیبت"

سیمون ہنسا، رفتہ رفتہ طبیعت مانوس ہو جائیگی، ابھی کچے ہو..... منہ سے ابھی دودھ کی بُو آتی ہے۔ اپنی نادانی سے سمجھتے ہو کہ مجھ سے زیادہ بُرا حال کسی کا نہیں۔ کوئی دن جاتا ہے۔ اپنے دل میں کہو گے، خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے! مجھے دیکھو۔ ہفتہ بھر میں پانی اُتر جائیگا۔ ڈونگے چلنے لگیں گے۔ تم سب سائبیریا کا راستہ لوگے، میں یہاں پڑا اِس کنارے سے اُس کنارے، اُس کنارے سے اِس کنارے کشتی کھیتا رہ جاؤں گا۔ بائیس ۲۲ سال سے میرا دن رات یہی کام ہے۔ پانی کے تلے مچھلیاں، پانی کے اوپر میں، پھر بھی شکر ہے کہ مجھے کسی بات کی شکایت نہیں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!

تاتاری نے آگ میں کچھ خشک ٹہنیاں جھونکیں اور شعلوں کے قریب سُکڑ کر بیٹھ گیا اور بولا میرے والد ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ میری ماں اور بیوی وعدہ کر چکی ہیں، کہ اُن کے مرنے کے بعد یہاں آجائیں گی۔

لال جھگڑالو نے پوچھا "ماں اور بیوی کو لے کر کیا کروگے؟ ارے میاں اس حماقت میں نہ پڑو۔ شیطان ملعون تم کو بہکا رہا ہے۔ اُس مردود کی ایک نہ سنو! اُس کے دم میں ہرگز نہ آؤ۔ اگر وہ عورتوں کا ذکر چھیڑ کے ورغلائے۔ تو اُسے جلانے کے لئے کہ دو، مجھے اُن کی کوئی ضرورت نہیں۔ آزادی کے بہانے اکسائے تو اُس کا مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔ اور کہ دو مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ آزادی، نہ ڈاک، نہ کھیت کھلیان، خدا ان سب کا ستیاناس کرے۔ مجھے اِن میں سے کچھ نہیں چاہئے۔

لال جھگڑالو نے اپنی بوتل میں سے ایک گھونٹ لیا۔ اور پھر بولنا شروع کیا۔ "میں معمولی کسان "مزدوری پیشہ لوگوں میں سے نہیں۔ ایک پادری کا لڑکا ہوں۔ جب آزاد تھا

…ک میں رہتا تھا۔ ایک زمانے میں میں بھی فراک کوٹ ڈانٹا کرتا تھا۔ مگر میں نے اپنا یہ حال بنالیا ہے …مین پر ننگا سو سکتا ہوں۔ اور ضرورت پڑے تو جڑی بوٹی پر گذارہ کرنے کو تیار رہوں۔ خدا سب …یسی زندگی نصیب کرے! نہ منہ سے کچھ مانگتا ہوں۔ نہ دِل میں کسی سے دبتا ہوں۔ اپنے سے زیادہ اور آزاد کسی کو نہیں سمجھتا جس دن سے روس سے یہاں بھیجا گیا، میں نے دِل کڑا کر کے ٹھان لی، مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ شیطان نے مجھے بھی بیوی، گھر، آزادی کا دم دے دے کر پھسلانا چاہا۔ میں نے اُس سے صاف کہدیا، مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ اور اپنے خیال پر جما رہا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کتنے مزے میں ہوں۔ کسی بات کی مطلق شکایت نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ جو ذرا سا شیطان کے پھیر میں آیا۔ اور اس کا فیصلہ ہوا۔ پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ چندیا تک دَل دَل میں دھنس جائیگا۔ اور نکالے نہیں نکلے گا۔

تم دہقان لوگ ہی شیطان کی چالوں میں نہیں آتے۔ خاندانی پڑھے لکھے لوگ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ کوئی پندرہ سال کا ذِکر ہے کہ ایک شخص روس سے جلاوطن ہو کر یہاں پہنچا۔ بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم اور جعلی وصیت کا کچھ جھگڑا تھا، لوگ سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی شہزادہ یا جاگیردار ہے، یہ بھی ممکن ہے۔ صرف معمولی سرکاری ملازم ہو۔ کسی کو کیا معلوم؟ خیر، تو وہ صاحب یہاں تشریف لائے اور آتے کے ساتھ ہی انہوں نے ایک مکان اور کچھ زمین خرید لی۔ فرمانے لگے" میں خود روزی کما کر کھاؤنگا۔ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی پر گذارا کروں گا۔ میں اب رئیس نہیں رہا۔ معمولی جلاوطن ہوں، میں نے سنکر کہا ارادہ تو بہت نیک ہے!

وہ اس وقت نوجوان تھا۔ مزاج میں دوڑ دھوپ کے ساتھ احتیاط کا مادہ بھی تھا۔ خود گھاس کاٹتا اور مچھلیاں پکڑتا، گھوڑے پر ساٹھ میل کی سواری اس کے لئے معمولی بات تھی، مگر آگے چل کر یہ نقشہ بدل گیا پہلے ہی سال گھوڑے پر چڑھ کر ڈاک لینے کائی رینو آنے جانے لگا۔ میری کشتی میں کھڑا ہوجاتا۔ اور ٹھنڈا سانس کھینچ کر کہتا۔ کیوں تمہیں گھر والوں نے کتنے عرصہ سے خرچ نہیں بھیجا! میں، کہتا [illegible] سر کے بوجھ، روپے کی تمہیں ضرورت نہیں، روپیہ لے کر کیا کرو گے؟ اگلے زمانے کو بھول [illegible] نہیں، یا اگر تھا بھی تو محض ایک خواب تھا، نئے سرے سے زندگی شروع

۔ شیطان کی گھاتوں میں نہ آؤ! اس کا انجام بُرا ہوگا۔ اُس کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ اگر
صرف روپیہ چاہتے ہو، تھوڑے دنوں میں کچھ اور چاہو گے۔ پھر کچھ اور، پھر کچھ اور...... سے
دش رہنے کی ترکیب یہ ہے۔ کہ کسی چیز کی خواہش نہ کرو... اگر تقدیر نے ہم پر تم پر زیادتی کی، تو اس کے
کے آگے ہاتھ پھیلانے اور سر جھکانے سے فائدہ؟ چاہئے یہ کہ اُسے ٹھکراؤ، اس کا مذاق اُڑاؤ: نہیں
دل
وہ تمہارا مذاق اُڑائے گا، میں اسے یہ مشورہ دیتا رہا.......

اس کے دو سال بعد مجھے اُسے دریا کے اُس پار اُتارنے کا اتفاق ہوا۔ خوشی کے مارے
پھولا نہیں سماتا تھا۔ کہنے لگا، اپنی بیوی کو لینے گائی رنیو جا رہا ہوں، آخر اُس کا دل پسیج گیا۔ اور
وہ یہاں آنے پر رضامند ہو گئی۔ کتنی نیک اور مہربان ہے! اُس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں، دوسرے
دن وہ بیوی سمیت واپس ہوا۔ وہ سر پر ٹوپی لگائے ایک نوجوان بانکی عورت تھی، گود میں ایک
دودھ پیتی بچی تھی، اور منوں نے مختلف قسم کا مال اسباب، سرگے یو پچ صاحب اُس کا طواف کر رہے
تھے۔ کیا مجال ہے جو آنکھیں دم بھر کو بیوی کے چہرے سے اُٹھ جائیں، اُس کی تعریف میں اُن کا منہ
سوکھتا تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے، ہاں بھائی سیموں، لوگ سائبیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے
ہیں! میں نے دل میں کہا، یہ چند دن کی بہار ہے، رت بدلتے دیر نہیں لگتی، اُس دن سے ہر ہفتہ
اس کا معمول بندھ گیا، کہ ڈاک خانہ جا کر پوچھے کہ گھر سے روپیہ تو نہیں آیا۔

ایک دن مجھ سے کہا، میری خاطر وہ اپنا حُسن، اپنی جوانی سائبیریا میں گنوا رہی ہے اور
میرے ساتھ کڑیاں جھیل رہی ہے، لہٰذا مجھ پر واجب ہے، کہ اُس کے آرام و آسائش کا پورا پورا
خیال رکھوں، بیگم صاحبہ کا جی بہلانے کے لئے اُس نے مقامی افسروں اور ایرا غیرا سب سے
راہ و رسم پیدا کی، پھر لازم ہوا اِس لشکر کی خاطر تواضع کا بندوبست ہو، ضروری سمجھا گیا کہ
ایک پیانو خرید ا جائے۔ اور صوفا پر ایک بالوں والا گدڑ کا کتا ہو۔ غارت ہو کم بخت! الغرض،
ہر طرح کے ٹھاٹ، بلکہ عیاشی ہونے لگی، اس پر بھی وہ نک چڑھی بیگم زیادہ عرصہ تک اُس کے پاس
نہ ٹکیں۔ اور ٹکتیں بھی کیوں، کیچڑ اور پانی، کڑاکے کی سردی، نہ پھل نہ مٹھائی، گنوار لوگ

گنوار، شرابی، جنہیں نہ اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ، نہ بات کرنے کا ڈھنگ۔ اور وہ ٹیریں ماشاء اللہ ایک یا ماسکو کی مزاج دار خاتون ... یہاں اُن کے لئے مکھیاں مارنے کے علاوہ کیا دھرا اس پر طرہ یہ کہ خاوند کی حیثیت بھی پہلے سے گر گئی تھی، ایک بیچارے جلا وطن کی اوقات ہی کیا ہے۔

اِس کے تین سال بعد کا ذکر ہے، مجھے خوب یاد ہے۔ کہ لیلۃ القدر کی شام کو پرے کنارے سے کسی نے زور سے پکارا، میں ناؤ اُدھر لے کر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہی بیگم صاحبہ کانوں تک اوڑھ موڑ لپیٹے کھڑی ہیں، اور پہلو میں ایک نوجوان افسر ہے۔ ایک ٹکڑی ساتھ تھی کھڑی ہے... میں نے انہیں پار اتار دیا، وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا، ہوا ہو گئے، اگلے دِن علی الصباح گھوڑا اڑاتے ولیسلائی سرگے یوچ صاحب گھاٹ پر نمودار ہوئے۔ پوچھنے لگے، ہنیوں میری بیوی تو کسی عینک والے آدمی کے ساتھ پار نہیں گئی؟ میں نے جواب دیا، جی ہاں' اب میدانوں میں جاکر ہوا پر ٹچل ماریئے! اس نے ان کے پیچھے بگٹٹ گھوڑا ڈال دیا، دِن رات پانچ روز تک اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ واپسی پر جب میں اسے پار اتار رہا تھا۔ تو وہ بے دم ہو کر میری کشتی میں ڈھیر ہو گیا۔ اور اپنا سر تختوں پر پٹختا اور چیخیں مار مار کے روتا رہا۔ میں نے کہا تو یہ معاملہ ہے' ہنس کر اسے یاد دلایا کہ 'لوگ سائبیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں!' وہ اپنا سر اور زور سے پیٹنے لگا۔

اِس کے بعد آزادی کی ہوس اُس کے دِل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اُس کی بیوی فرار ہو کر روس پہنچ چکی تھی، اُس کے دِل میں ہوک اٹھی کہ جاکر اُسے عاشق کے پنجے سے چھڑاؤں' ہاں! اُس دِن سے وہ مارا مارا صبح شام گھوڑا دوڑائے پھرنے لگا، کبھی ڈاک خانہ ہے، کبھی کیدان کا دفتر، عرضیوں کا تانتا باندھ دیا۔ کہ میرے حال پر رحم کیا جائے۔ اور روس واپس جانے کی اجازت دیدی جائے۔ زمین بیچ ڈالی مکان یہودیوں کے ہاتھ رہن کر دیا۔ بال سفید ہو گئے کمر جھک گئی۔ چہرہ دق کے ماروں کی طرح زرد پڑ گیا۔ بھلا چنگا ایکا ایکی

کمی کمی کرنے لگتا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ اس طرح آٹھ سال تک عضون کا تار بانا رکھا۔ مگر اب پھر اُس کی جان میں جان آگئی ہے۔ کیوں نہ ہو خیر سے بیٹی کے سیانے ہونے ایک نیا بہلاوا ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور آنکھ کی پتلی طرح رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ لڑکی میں کسی قسم کا عیب نہیں، اچھی شکل، کالی کالی بھویں مزاج میں شوخی، ہر اتوار کو اسے ساتھ لے کر گرجا جاتا تھا۔ دونوں کشتی میں پاس پاس کھڑے ہو جاتے، لڑکی مسکراتی، اور باپ کی نظریں بیٹی کے مکھڑے سے پل بھر کو اٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ وہ کہتا، 'ہاں' 'سمیوں' سانٹے بیریا میں بھی زندگی لطف سے بسر ہو سکتی ہے، سانٹے بیریا میں بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ میری بیٹی کو دیکھو، ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے! میں شرط لگاتا ہوں کہ اتنی پیاری لڑکی تم چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہیں پا سکتے، میں جواب دیتا، بے شک تم ٹھیک کہتے ہو، تمہاری لڑکی میں کوئی خرابی نہیں، اور اپنے دل میں کہتا، ذرا صبر کرو...... اس کی اٹھتی جوانی ہے۔ خون میں اُبال ہے، جی میں مرادیں ہیں، یہاں بھلا راگ رنگ کہاں؟ اور میاں، لڑکی سچ مچ گھلنے لگی، سوکھتی گئی، سوکھتی گئی، اور ایڑیاں رگڑ رگڑ رینگ رہی ہے دق، ......

دیکھ لی آپ نے سانٹے بیریا کی خوشی، لعنت ہو کم بخت پر، یہاں زندگی اس طور سے بسر ہوتی ہے...... خیر تو اب ڈاکٹروں کی ڈھونڈ مچی، ایک کو چھوڑا، دوسرے کو پکڑا۔ آج اِدھر دکھا، کل اُسے، جہاں کسی ڈاکٹر یا جادوگر کا پتہ چلا اور اسے لینے پہنچا، ڈاکٹروں کے پیچھے ہزاروں روپیہ برباد کر دیا۔ میرے نزدیک تو بہتر ہوتا، کہ یہ روپیہ شراب میں اڑا دیتا، لڑکی تو مرکر رہیگی، اب کسی کے بچائے نہیں بچتی، پھر اس کی کمر ٹوٹ جائیگی، اور اس کا یقین رکھ کہ یا تو صدمے سے خودکشی کرنے گا۔ یا روس بھاگ جائے گا، فرار ہوگا، پکڑا جائیگا، مقدمہ چلے گا، سزا ہوگی،

تاتاری نے جو سردی میں سکڑ رہا تھا، بڑبڑا کر کہا، اچھا ہے، اچھا ہے، اچھا ہے، کیا؟

ر گیا، اُس کی بیوی، اُس کی بیٹی... اس کے مقابلہ میں قید کی، صدمے کی کیا حقیقت ہے!
کہ بیوی، اپنی بیٹی کی شکل تو دیکھنے کو مل گئی... تم کہتے ہو، کچھ نہ مانگو، یہ بہوت بُری، اس کی بیوی
تھا، سال تک اُس کے ساتھ رہی، یہ پروردگار کی دین تھی، بہوت بُری، تین سال اچھے، کچھ سمجھے
ں؟

سردی سے اٹک اٹک کے اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے روسی لفظ سوچ سوچ کر، اُسے فقر کے روسی لفظ آتے تھے، تاتاری نے کہنا شروع کیا، کہ، خدا وہ گھڑی نہ لائے، کہ کوئی بیمار پڑے اور پردیس میں جان دے، اور ٹھنڈی، کالی زمین میں گاڑا جائے، میری بیوی میرے پاس دن بھر نہ سہی، گھنٹہ بھر کو آجائے، تو اس نعمت کے بدلے میں ہر طرح کا دُکھ درد سہ لوں گا، اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر دوں گا، خوشی کا ایک دن بہوت سے اچھا،

وہ پھر اپنی حسین و ذہین بیوی کی حکایت لے بیٹھا، پھر اُس نے اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ لیا، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، سمیوں کو اس نے یقین دلایا، کہ 'میں بے گناہ ہوں' اور مفت میں مصیبت بھگت رہا ہوں، میرے دو بھائیوں اور چچا نے مل کر اُس کسان کے گھوڑے پار صاف کیا تھا، اور انہی نے گھوڑے والے کو مار مار کے ادھ موا کیا تھا، پنچایت نے انصاف سے کام نہیں لیا، بلکہ کچھ ایسی کاری گری کی، کہ ہم بھائیوں کو کالا پانی ہوگیا، اور ہمارا پیسے والا چچا صاف چھٹ گیا۔

سمیوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، کچھ دنوں میں خود بخود جی لگ جائے گا،

تاتاری دم بخود بیٹھا اپنی اشک آلود آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھتا رہا۔ چہرے سے حیرانی اور تردد پڑا ٹپکتا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیوں گھر سے اتنی دور اِس تاریکی اور نمی میں انجان لوگوں کی صحبت میں پڑا سڑ رہا ہوں،

لال بھبکڑا آگ کے قریب لیٹے لیٹے کسی بات کا دھیان کرکے آپ ہی آپ ہنسا، اور دھیمی لے سے ایک دُھن گنگنانے لگا۔

تھوڑی دیر میں بولا ، لڑکی کے لئے باپ کی صحبت میں کیا لطف ؟ یہ ضرور ہے کہ وہ اس دل وجان سے چاہتا ہے۔ مگر، بھائی ، اس کے سامنے انسان کو اپنے عشق۔ق کا خیال رکھنا پڑتا ہے، بڈھا مزاج کا سخت اور چڑچڑا ہے ، جوان لڑکیوں کو بھلا سختی سے کیا سروکار ؟ انہیں چاؤ چونچلے چاہئیں۔ اور ہا ہا ہا ! ہو ہو ہو ! عطر چاہیئے۔ اور غازہ چاہیئے۔ جی ہاں ... آہ، یہ زندگی، سیموں نے دقت کے ساتھ اُٹھتے ہوئے ایک آہ کھینچی۔ شراب ختم۔ معلوم ہوتا ہے سونے کا وقت آپہنچا۔ بہاں ، میاں تو چلا.....،

تاتاری اکیلا رہ گیا ، تو اُس نے الاؤ میں کچھ اور ٹہنیاں ڈالیں۔ لیٹ رہا۔ اور شعلوں پر ٹکٹکی باندھ کر اپنی بیوی کے تصور میں ڈوب گیا۔ مہینہ بھر، دن بھر کو وہ میرے پاس آجاتے۔ خواہ جی چاہے تو پھر چلی جائے۔ ایک مہینہ یا ایک دن سدا کی محرومی سے بہتر ہے۔ اچھا ، فرض کرو، اس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اور وہ آبھی گئی۔ آخر کھائیگی تو کیا کھائیگی ؟ رہیگی تو کہاں رہیگی ؟ سوچتے سوچتے اُس کی زبان سے نکلا ، کھانے کو کچھ نہوا ، تو رہیگی کیونکر ؟

دن رات چیخ چلانے پر بھی گُلّم ُگلّا دس کوپک اُس کے پلے پڑتے تھے ، یہ سچ ہے کہ سوداگر شراب یا چائے کے لئے کچھ بخشش دے دیتے تھیں۔ وہ دوسرے ملاح آپس میں بانٹ لیتے تھے اور نہ صرف بیچارے تاتاری کو سوکھا ٹرخاتے تھے ، بلکہ اُس کا اُلٹا مذاق اُڑاتے تھے ، خرچ کی تنگی کی وجہ سے وہ بھوک ، سردی اور دہشت کا شکار تھا۔۔

اب کہ وہ سردی کے مارے تھرتھر کانپ رہا تھا ، اور اُس کا جوڑ جوڑ ٹوٹا جاتا تھا۔ چاہئے کہ وہ جھونپڑی میں جاکر پڑ رہتا ، اور سوجاتا ، مگر وہاں اس کے پاس اوڑھنے کو کوئی چیز نہ تھی اندر سردی باہر سے بھی زیادہ تھی ، ساحل پر بھی اگرچہ اوڑھنے کو کچھ نہ تھا ، مگر کم از کم آگ تو سکتا تھا۔

ہفتہ بھر میں پانی اتر جائیگا۔ اور چھوٹے ڈونگے چلنے لگیں گے۔ اور سوائے سیموں ملاح کی ضرورت نہیں رہیگی تب تاتاری گاؤں گاؤں ...

بیوی صرف سترہ سال کی تھی، خوب صورت، نازک مزاج، شرمیلی، کیا وہ بھی شرم وحیا
آب اُلٹ ور بد رجھولی لئے پھرے گی؟ نہیں اِس کے خیال ہی سے اُس کے بدن
ین لگتے کھڑے ہو جاتے تھے ...
بھی پھٹ رہی تھی، کشتی، پانی میں بید مجنوں کی جھاڑیاں، دریا کی لہریں صاف چمکنے لگی تھیں
کر دیکھنے سے ترچھی ریتلی ڈھال نظر آتی تھی، اس کے دامن میں چھپر کی جھونپڑی تھی، ذرا
پر گاؤں کی جھونپڑیاں پاس پاس پڑی تھیں، گاؤں میں مرغ بانگ دینے لگے تھے۔
تاتاری سوچنے لگا، کہ یہ سرخ ریتلی ڈھال، کشتی، دریا، اجنبی کھڑے لوگ، بھوک،
پاس، بیماری، شاید یہ سب مایا ہو، بلکہ بعید نہیں کہ یہ سب کچھ صرف خواب نکلے، اُسے ایسا
معلوم ہوا، کہ میں سو رہا ہوں، اور اپنے خراٹوں کی آواز میرے کان میں آرہی ہے.... وہ اپنے
ملن سمبر سک میں ہے، اُس نے اپنی بیوی کو نام لیکر پکارا، اور وہ بولی، دوسرے کمرے
میں اس کی ماں ہے۔ لوگ کیسے کیسے درد ناک خواب دیکھتے ہیں! خواب آخر آتے کیوں ہیں؟
تاری نے مسکرا کر آنکھیں کھولیں۔ یہ کون سا دریا ہے؟ دالگا؟

برف پڑ رہی تھی

'کشتی'! دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی شخص چیخ رہا تھا، کشتی!
تاتاری چونک کر اُٹھ بیٹھا اور دوسری طرف جانے کے لئے اپنے ساتھیوں کو جگانے لگا،
دار وہ یہی پرانی بھیڑ کی کھالیں پہن، اپنی بھاری نیند بھری آواز میں گالیاں دیتے
سردی سے ٹھٹھرتے ملاح گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کچی نیند سے اُٹھ کر دریا کی تیز ہوا اُن کے
ن کے پار ہوئی جاتی تھی، آہستہ آہستہ سب اچھل کر کشتی میں سوار ہوئے،... تاتاری اور
ں اور ملاحوں نے بڑے بڑے، چوڑے پھل کے چپوار سنبھالے جو اندھیرے میں کیکڑوں کے
معلوم ہوتے تھے، سیموں پیٹ کے بل تپوار کے پیرم کے سہارے لیٹ گیا، دوسرے کنارے
چیخنے کی آواز بدستور آرہی تھی، دو مرتبہ تمنچہ شاید اِس خیال سے چلایا گیا۔ کہ ممکن ہے ملاح

سو رہے ہوں، یا گاؤں کے شراب خانے میں گئے ہوتے ہوں،
سُن لیا" آخر ایسی کیا گھبراہٹ ہے ؟ لال بھکڑ کے لہجے سے ٹپکتا تھا، کہ اس میں جلدی
فضول ہے، یا کم از کم جلدی کا کوئی نتیجہ نہیں"
لمبی چوڑی، بھدّی ناؤ کنارے سے روانہ ہوئی، اور بید مجنوں کی جھاڑیوں میں بہتے ہوئے
لگی، درخت چلتے نظر آتے تھے۔ اور صرف اسی بات سے اندازہ ہوتا تھا، کہ کشتی ساکن نہیں، بلکہ
حرکت میں ہے، ملاح بیچ تلے ہاتھوں سے چپو چلا رہے تھے، لال بھکڑ پیٹ کے بل کمان کی شکل
لیٹا تھا، کبھی اس طرف کو لڑھک جاتا کبھی اس طرف کو، اندھیرے میں یہ معلوم ہوتا تھا، کہ ملاح
کسی بابا آدم کے وقت کے لمبے لمبے پنجوں والے دقیانوسی جانور کی پشت پر بیٹھے ایک بر فا
لق و دق ملک میں سے چلے جا رہے ہیں، ایک ایسے ملک میں جو کبھی کبھی ڈراؤنے خواب میں
دکھائی دیتا ہے، ناؤ بید مجنوں کی جھاڑیوں سے نکل کر کھلے دریا پر بہنے لگی، چپوؤں کے برا
چلنے کی آواز دریا کے دوسرے کنارے پر سنائی دیتی تھی، کوئی شخص چلاّتے جاتا تھا
جلدی کرو! جلدی کرو!

دس منٹ کے بعد ناؤ زور سے گھاٹ سے جا کر ٹکرائی،
سیموں اپنے منہ سے برف پونچھتے ہوئے بڑبڑایا۔ برف کی بوچھاڑ ہے کہ ختم ہونے کو نہ
آتی، خدا جانے اتنی برف کہاں سے نازل ہوتی ہے،
کنارے پر ایک میانہ قد و قامت کا مختصر سا آدمی لومڑی کی کھال کا چھوٹا کوٹ
سفید بھیڑ کی کھال کی ٹوپی اوڑھے بے حس و حرکت اپنے گھوڑے سے الگ ہٹ کر کھڑا
غم واندہ اور از خود رفتگی اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ گویا کوئی بھولی بسری بات یا
کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اپنے ناقص حافظہ پر دانت پیس رہا ہے، سیموں اس کے
پہنچا اور مسکرا کر ٹوپی اتاری، اُس نے کہا مجھے انستاسائیف سکا جانے کی جلدی ہے،
لڑکی کی حالت پھر خراب ہو گئی، سُنا ہے کہ وہاں کوئی نیا ڈاکٹر آیا ہے۔

گاڑی ناؤ میں دھکیلی گئی، اور ملاحوں نے اسے بہاؤ کے خلاف کھینا شروع کیا۔ وہ شخص ں نے ویسیلائی سرگے یوچ کے نام سے پکارا تھا بالکل ساکت کھڑا اپنے موٹے موٹے ہونٹ ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ کوچوان نے اُس سے سگریٹ پینے کی اجازت مانگی س نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ سیموں نے اُس کی طرف طنز کی نظر سے دیکھا۔ ر کہا ہاں ہی ہاں، سائبیریا میں بھی لوگ لطف سے زندگی بسر کرسکتے ہیں، لطف سے! لال بھبکڑے ے پر فاتحانہ رنگ جھلک رہا تھا، جیسے اس نے کوئی بات ثابت کردی، اور اسے خوشی ہے کہ ری پیشین گوئی پوری ہو کے رہی، صاف ظاہر تھا کہ وہ ویسیلائی سرگے یوچ کی غمزدہ بے بسی پر ت لطف اٹھا رہا ہے،

جب گھوڑے ساحل پر پہنچ کر جوتے جانے لگے، تو اُس نے کہا، ویسیلائی سرگے یوچ، ں موسم میں آپ کو بہت کیچڑ ملے گی، آپ کو چاہئے تھا، کہ ابھی زمین کے سوکھنے تک توقف کرتے، یا رے سے سفر کا خیال ہی دل سے نکال دیتے، سفر سے کچھ حاصل ہو، تب بھی ایک بات ہے۔ ر آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ سالہا سال سے دن رات اِدھر سے اُدھر حیران و پریشان مارے رے پھرتے ہیں، دیکھان کی بات تو یہ ہے، کہ اِس دوڑ دھوپ کا نتیجہ خاک نہیں نکلتا۔

ویسیلائی سرگے یوچ چپ چاپ اسے انعام دیکر گاڑی میں بیٹھا، اور روانہ ہوگیا، سیموں نے سردی سے سکڑ کر کہا، پھر وہی ڈاکٹر کی تلاش! گویا معقول ڈاکٹر کا ملنا اتنا ہی آسان ہے، جتنا میدان کی ہوا کا، یا شیطان ملعون کی دُم کا ہاتھ آنا! عجب آدمی ہے، خدایا، مجھ گناہ گار کو معاف کر!

تاتاری، لال بھبکڑے کے قریب پہنچا، اور تھوڑی دیر تک اُسے نفرت اور بیزاری کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر سردی سے تھرتھراتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی میں تاتاری الفاظ گڈمڈ کرکے اُس نے کہنا شروع کیا، وہ نیک ہیں، نیک، اور تم بُرے ہو، تم بُرے ہو! ان کی روح ک ہے اور تم حیوان ہو، پلید! وہ زندہ ہیں اور تم ایک مُردہ لاش ہو۔ خدا نے انسان کو

اس لئے بنایا ہے۔ کہ دُکھ سکھ سہے، تمہارے دل میں کوئی خواہش نہیں تم بے جان ہو... تم تو بس مٹی کا ڈھیر ہو!

اللہ میاں تمہیں نہیں چاہتا، اُنہیں چاہتا ہے!

ملاح ہنسنے لگے، تاتاری کی پیشانی پر حقارت سے بل آگیا۔ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اُس نے اپنے پھٹے پُرانے چیتھڑے بدن سے لپیٹ لئے، اور الاؤ کے قریب چلا گیا۔ سیموں اور دوسرے ملاح ٹہلتے ہوئے جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔

ایک ملاح خشک گھاس پر لیٹے ہوئے بھاری آواز میں بولا "سردی ہے!"

دوسرے نے اتفاق کیا "ہاں، گرمی نہیں ہے، زندگی کیا ہے جنجال ہے..."

سب لیٹ گئے دروازہ ہوا کے جھونکے سے کھل گیا، اور برف کی بوچھاڑ اندر آنے لگی، کسی میں مارے سردی اور کاہلی کے اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اُٹھ کر دروازہ بند کر دیتا۔

سیموں غنودگی کا جھونکا آتے وقت بولا "میں تو مزے میں ہوں، خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!"

تمہاری دلاوری کا لوہا ہم سب مانتے ہیں، شیاطین بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے!

باہر سے ایسی چیخیں آئیں جیسے کوئی کتا بھوں بھوں کر رہا ہے،

کیا ہے؟ کون ہے؟

تاتاری باہر بیٹھا سو رہا ہے!

عجب دیوانہ ہے!

سیموں نے کہا، رفتہ رفتہ عادی ہو جائیگا، اور فوراً اُس کی آنکھ لگ گئی،

باقی لوگ بھی تھوڑی دیر میں سو گئے۔ دروازہ کھلا پڑا رہا،

(چیخوف)

خواجہ منظور حسین

تنقید و تبصرہ

کتب

المسیح الدجال و یاجوج ماجوج ۔ مثنوی یاد اسلام ۔ پانصد در نادر ۔ جواہرات اسلام ۔ تناسخ ۔ پیام عمل ۔ انار کلی

المسیح الدجال و یاجوج و ماجوج | مصنفہ مولوی محمد علی صاحب ایم ۔اے ۔امیر جماعت احمدیہ لاہور لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی ۔تقطیع ۲۰×۲۶ ۔ضخامت ۶۸ صفحات ۔قیمت فی نسخہ ۸/۔

ملنے کا پتہ : احمدیہ انجمن اشاعت اسلام ۔لاہور ۔

اس رسالہ میں مولوی محمد علی صاحب نے بعض علامات قیامت کی تشریح کی ہے مثلاً یاجوج و ماجوج ۔مسیح دجال ۔ دابۃ الارض اور مغرب سے طلوع شمس ۔یاجوج و ماجوج جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے ان کے متعلق کوئی تفصیلی بحث مولوی صاحب نے نہیں کی نہ ان کے تاریخی حالات پڑھنے کی زحمت گوارا کی نہ ان کتابوں کا مطالعہ کیا جو خود علما مغرب یا بائبل کے شارحین نے اس موضوع پر لکھی ہیں ۔ صرف حزقیل نبی کی کتاب کے حوالے سے اقوام مغرب کو یاجوج و ماجوج قرار دیدیا۔

زیادہ توجہ انھوں نے مسیح دجال پر صرف کی ہے بلکہ یہ سارا رسالہ اسی کے متعلق ہے ۔مگر اس بحث میں تاویلیں اس قدر کمزور ہیں جن کے لکھنے کی جرأت صرف انھیں کو ہوسکتی ہے مثلاً دعویٰ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج اور دجال دونوں ایک ہی ہیں ۔ دلیل یہ ہے کہ

> "صحیح حدیث نے سورۂ کہف کو فتنۂ دجال کا علاج بتایا ہے' اور سورۂ کہف بالخصوص عیسائیت کے فتنہ پر ہے ۔تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے غلبۂ عیسائیت ہی کو فتنۂ دجال قرار دیا ہے" صفحہ ۱۲ ۔

اگر مولوی صاحب اس دلیل کو ترتیب دیکر اپنے سامنے رکھ لیتے تو ان کو خود معلوم ہو جاتا کہ

کے کتنے مقدمات ممنوع ہیں۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ دجال ایک فرد کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قوم کا نام ہے۔ دلیل یہ لکھی ہے کہ

"یہ پیشین گوئیاں نبی کریم علیہ السلام کے کشوف (؟) ہیں اور کشف یا رویا میں جب ایک قوم دکھائی جائے گی تو ایک فرد واحد ہی کے طور پر دکھائی جائیگی" صفحہ ۱۷۔

سوال یہ ہے کہ "ایک فرد واحد" کس طور پر دکھایا جائے گا؟ مولوی صاحب نے خود ابن صیاد ذکر میں نقل کیا ہے کہ حضرت جابر صحابی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ دجال ہے۔ نیز خود آنحضرتؐ بھی جیسا کہ ت سے معلوم ہوتا ہے اس کے دجال ہونے کا گمان رکھتے تھے۔ کیا وہ "ایک فرد واحد" تھا ب قوم؟

اس کے علاوہ یہ بھی حدیث میں ہے کہ "میری امت میں تیس۳۰ دجال نکلینگے"۔ کیا وہ "ایک احد" ہوں گے یا ایک ایک قوم؟

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عیسیٰؑ کا کام صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صلیب کو توڑیگا اور خنزیر کو قتل کرے گا۔ یہاں قتل دجال کا نام تک نہیں" صفحہ ۱۴۱۔

پھر آگے لکھتے ہیں:۔

"آنے والے مسیح کے کارناموں میں قتل دجال کا نام تک نہ لینا اس بات کی قطعی اور کھلی شہادت ہے کہ فتنۂ دجال اور غلبۂ صلیب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں" صفحہ ۱۴۱۔

دعویٰ، دلیل اور نتیجہ کی مطابقت کی منطقی بحث کو جانے دیجئے کیونکہ مولوی صاحب اس سے ں سروکار نہیں رکھتے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جن حدیثوں میں کسر صلیب اور قتل خنزیر کا ذکر ہے ان میں یلے تصریح کے ساتھ قتل دجال کا بھی ذکر ہے جس کا اس شدومد سے مولوی صاحب نے بار بار انکار ا ہے۔ مجھے ان احادیث کے نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ آخر میں خود مولوی صاحب ممدوح ں کے قلم سے یہ پردہ اس طرح فاش ہوتا ہے:۔

"بعض قلوب میں یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ مسیح موعود وہی شخص ہو سکتا ہے جو دجال کو قتل کرے اور حضرت مرزا صاحب نے دجال کو قتل نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ احادیث میں مسیح موعود کے دجال کو قتل کرنے کا ذکر آتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ قتل دجال سے مراد کیا ہے"۔ صفحہ ۵۱۔

قتل دجال کی اگر پہلے ہی تاویل کر دیتے اور یہ نہ لکھتے کہ "آنے والے مسیح کے کارناموں میں قتل دجال کا نام تک نہیں ہے" تو کیا ہرج تھا۔

ذوالقرنین بعض لوگوں نے سکندر کو کہا ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ ان کے نزدیک ذوالقرنین دارائے اول ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے یہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے کیونکہ دارا کا سد بنانا کسی طرح ثابت نہیں۔ اس بارے میں کتاب التیجان کا بیان زیادہ قابل قبول ہے جس نے ملک یمن کے ذوالقرنین کے سفر مغرب و مشرق اور سد یاجوج بنانے کے مفصل حالات لکھے ہیں۔

دابۃ الارض جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح پر ہے

"جب ان کے اوپر عذاب کا فیصلہ ہو چکے گا اس وقت ہم زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو لوگوں سے یہ کہے گا کہ وہ اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے"

(پ ۲۰ رکوع ۲)۔

مولوی صاحب نے اس سے عیسائی علماء کو مراد لیا ہے۔ لکھتے ہیں

"اقوام یورپ کے تین مختلف حصوں کا تین ناموں کے تحت میں ذکر کیا ہے۔ دجال ان کے پادری ہیں۔ یاجوج ماجوج انکا وہ گروہ ہے جس کے ہاتھ میں ملکی طاقت ہے اور دابۃ الارض ان کے وہ علماء ہیں جو مادہ پرستی میں منہمک ہیں۔"

صفحہ ۴٦۔

لیکن مرزا صاحب نے دابۃ الارض خود علماء اسلام ہی کو قرار دیا ہے جو زمینی باتوں پر گرے ہوئے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب کو اس تحقیق کے سامنے بھی سر جھکانا تھا۔ لکھتے ہیں:-

"کیا اس میں کوئی شبہہ ہے کہ یہ آج ہمارے علماء کی ہو بہو تصویر ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو دابۃ الارض کہدیا گیا ہو تو کیا بعید ہے"۔ صفحہ ٦٦۔

لیکن کیا علمارِ اسلام کی آج ہو بہو تصویر یہ ہے؟ میں تو یہی ان کی ذہنیت ایک ہزار سال سے ثابت کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کو چھوڑیے اور یہ دیکھیے کہ قرآن میں دابۃ الارض کا خروج مشروط ہے کہ اس وقت ہوگا جب عذاب یا قیامت کا فیصلہ ہو چکے گا۔ لیکن بقول مولوی محمد علی صاحب علمارِ مغرب اور بقول مرزا صاحب علمارِ اسلام جو دوسرے انسانوں کی طرح ماں کے شکم ہی سے پیدا ہوئے ہیں، زمین سے نکالے جا چکے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ لوگ آیات الٰہی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ دابۃٌ میں تنوین وحدت کی ہے جس کے معنی ہوئے ایک جاندار۔ مگر مولوی محمد علی صاحب کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ "ایک فردِ واحد" کو ایک قوم بنالیں۔

آخر میں مغرب سے طلوعِ شمس کی یہ تاویل کی ہے کہ جماعت احمدیہ نے ممالک مغربیہ میں تبلیغی مرکز قائم کر دیا ہے جہاں سے آفتابِ اسلام "ضیا باریاں" کر رہا ہے۔ مگر اس صورت میں تو طلوعِ آفتاب مشرق یعنی پنجاب ہی سے ماننا پڑے گا جس کی ایک کرن مغرب میں پہونچ گئی ہے نہ کہ مغرب سے۔

خاتمہ پر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ پیشین گوئیاں جو روایات میں بیان کی گئی ہیں ان کی نسبت خود ائمہ حدیث نے اپنا اطمینان ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ملاحم میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں۔ ایسی حالت میں ان کی اس قدر بے بنیاد تاویلوں میں پڑنا اہل علم و دین کے شایانِ شان نہیں۔ بے شک قرآن میں جو امور مذکور ہوئے ہیں ان پر مفید اور دلچسپ بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسی بحث جس کی بنیاد علم و عقل پر ہو نہ کہ فرقہ وارانہ خیالات پر۔

مثنوی یادِ اسلام | مصنفہ شاہ ممتاز علی صاحب آہ امیٹھوی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد حجم پانچ جزو قیمت فی نسخہ ۱۰/ ملنے کا پتہ: مولوی محمد ساجد صاحب، محلہ مغلپورہ شہر فیض آباد۔

شاہ صاحب موصوف نے اس مثنوی میں اللہ کے صفات۔ رسول اللہ کے حالاتِ طیبہ اور بزرگانِ دین کے بعض تاریخی واقعات نہایت عقیدت کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ملحدوں، دہریوں اور بے دینوں کے اعتراضات کے جوابات بھی دئے ہیں اور موجودہ مسلمانوں کی دین سے بیزاری اور نیچریت کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔

وہ ایک کہنہ مشق شاعر اور حضرت منشی امیر احمد مرحوم مینائی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ا

کی شاعری ٹکسالی ہے مگر غزل گوئی اور واقعات منظوم کرنے میں بڑا فرق ہے چنانچہ اس مثنوی میں انکے بدیز قلم نے وہ دلکش جولانیاں نہیں دکھائیں جو غزلوں میں ہیں۔ مگر پھر بھی پختہ کلامی کا جوہر ہر جگہ عیاں ہے۔

قصد ورنادر | مصنفہ مولوی محمد حسین خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق رئیس تدریسات افغانستان۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ۸/۔

ملنے کا پتہ: سید حمید خاں۔ بستی نو جالندھر۔

اس کتاب میں قدیم اولیا رکرام اور بزرگان اسلام کے اقوال سے پانسو نصیحتیں جو دین اور دنیا دونوں میں کار آمد ہو سکتی ہیں اور انسان کی عقل و معرفت کو بڑھاتی ہیں تذکرۃ الاولیا سے التقاط کے لکھی گئی ہیں۔ غازی نادر خاں بادشاہ افغانستان کے نام کی نسبت سے اس کا نام قصد ورنادر رکھا گیا ہے۔ انتخاب عقل و فہم کے ساتھ کیا گیا ہے اور ترجمہ صاف اور واضح ہے۔ اس کا مطالعہ ہر چھوٹے بڑے اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ سب کے لئے مفید ہے۔

جواہرات اسلام | مصنفہ چمپت رائے صاحب جین۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ تقطیع خورد۔ حجم ۵۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ ۸/۔ ملنے کا پتہ: ہیرالال پنالال۔ دریبہ کلاں۔ دہلی۔

اس رسالہ کے مصنف مسٹر چمپت رائے دہلی کے ایک معزز بیرسٹر ہیں۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے حقائق کی زیادہ تر مولانا روم کی مثنوی سے تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے اہم مسائل کو بیان کیا ہے۔

تناسخ کو بھی انھوں نے اسلامی تعلیمات میں سے سمجھا ہے اور اس کے اوپر مثنوی کے بعض اشعار سے سند پیش کی ہے۔ لیکن دراصل یہ غلط فہمی ہے۔ اسلام نے تناسخ ارواح یعنی آواگون کی تعلیم نہیں دی ہے۔ خود مولانا روم نے بھی تخلیق کے مدارج دکھائے ہیں نہ کہ گناہوں یا نیکیوں کے عوض میں بار بار پیدائش کے یعنی جو اشعار سند میں پیش کئے گئے ہیں ان میں ارتقائے تخلیق ہے نہ کہ مسئلہ تناسخ۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے نہ کہ مثنوی پر۔ کاش ایسی بے تعصب اور

سعادت مند طبیعتیں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اسلامی حقائق کو زیادہ صحت کے ساتھ دنیا کے پیش کر سکتیں۔

تناسخ | مصنفہ ڈاکٹر بشارت احمد صاحب احمدی۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم چار جزو۔ قیمت نسخہ ۴ر۔ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب دار الکتب اسلامیہ۔ احمدیہ بلڈنگس لاہور۔

ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ میں ایک سوال کے جواب پر تناسخ کے متعلق تفصیل سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ اعتقاد زمانہ لاعلمی کا ایک غلط نظریہ ہے۔ اس مسئلہ کی تردید میں پہلے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ رسالہ سب سے زیادہ واضح، مبین اور مدلل ہے۔ ان دلائل کا خلاصہ تین امور ہیں۔ اول یہ کہ ہر ایک آدمی جانتا ہے کہ میں اس سے قبل اس دنیا میں نہیں آیا۔ دوم یہ کہ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعے سے انسان کو جو علم ملا ہے یعنی سائنس اس نے لا ان کر تناسخ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ سوم یہ کہ خود خالق کائنات نے بنی نوع انسان کو آج تک جو کے ذریعے سے دیا ان میں یہ بتا کر کہ مرنے کے بعد انسان اس دنیا میں واپس نہیں آتا تناسخ کی کر دی۔

ساری کتاب ان تین اصولی دلائل کی تشریح اور توضیح ہے اور اس خوبی کے ساتھ علم اور عقل کی روشنی میں ان کا جواب ناممکن ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ کو چار مختلف لکچروں میں تقسیم کیا ہے جس کی وجہ سے مضامین جا بجا تکرار ہو گیا ہے۔ اگر مسلسل ایک مضمون لکھتے تو یہ عیب نہ واقع ہوتا۔ مگر تاہم اپنے موضوع پر رسالہ ہے۔

پیام عمل | جزیرہ مورشس میں مولانا حکیم عبداللہ رشید نواب کی مدد سے سنہ ۱۹۲۳ء سے ایک مدرسہ قائم ہے جس میں مسلمان بچوں کو انگریزی نصاب کے ساتھ اردو اور دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ رسالہ میں اس مدرسہ کی ضروریات دکھا کر اس کی امداد کی تحریک کی گئی ہے۔ دستخط کنندگان میں کا و ممبران مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی و دیگر مسلمانان مورشس ہیں۔

امداد بذریعہ خطیب صاحب مکہ مسجد ارود شریف حیدر آباد دکن ارسال کی جا سکتی ہے۔

انارکلی مصنفہ سید امتیاز علی تاج، دار الاشاعت پنجاب لاہور تقطیع ۲۰×۲۶، حجم ۲۰۰ صفحے۔

اردو پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جسے یہ ڈراما دیکھ کر خوشی نہ ہوئی ہو۔ موضوع، پس منظر، ڈراما کے مخصوص اوصاف، ہر اعتبار سے یہ تصنیف قابل قدر ہے، اور ہمیں امید ہے ہندوستانی ڈراما اور تھیٹر کے شائقین کی عام بدمذاقی رفع کرنے میں یہ بہت مدد دے گا۔ اس میں حقیقت نگاری بھی ہے اور تصویر کی رنگینی بھی، جذبات کا تلاطم بھی اور ایک اچھی کہانی کی ترتیب بھی۔ مصنف نے مغل بادشاہوں کے حرم سرا کی فضا اور طرز معاشرت کا نقشہ بہت صحت اور نکتہ رسی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور انارکلی اور سلیم کی داستان کے لئے اس سے زیادہ موزوں پس منظر نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈراما کے اشخاص مورخ کے تخیل کی بنائی ہوئی مورتیں نہیں معلوم ہوتے، بلکہ باغ اور چمن، دریا کے کنارے اور چاندنی رات کے ویسے ہی سچے قدردان جیسے کہ مغل واقعی تھے، ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ محلوں میں رہنے کے عادی ہیں، اپنے جسم، اپنے مکان، اپنی زندگی کو آراستہ کرنا جانتے ہیں، اور وہ آرائش اور نفاست جو ہمارے تصور میں نہیں سماتی ان لوگوں کی روزمرہ زندگی کی ایک معمولی حقیقت ہے۔ مغل حرم سرا کے پرستان میں عشق کی داستانیں کوئی نرالی بات نہ ہوں گی، مگر انارکلی کا عشق کوئی معمولی جذبہ نہیں ہے۔ اس کا تیز شعلہ اس طرح بھڑک اٹھتا ہے کہ محل اور باغ سب جگمگانے لگتے ہیں، اور کبھی کبھی اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جلا کر چھوڑے گا، مگر شعلے کی چمک دم بھر کی ہے، وہ کچھ جلاتا نہیں، اپنی رونق دکھا کر بجھ جاتا ہے اور محل اور باغ شرمندہ ہو کر شام کے سے اندھیرے میں اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔

وہ جذبہ جس کا انارکلی ایک مجسمہ ہے ہر شاعر، داستان گو اور افسانہ نویس کا تختۂ مشق رہا ہے اور نہ صرف ہمارے ادب میں بلکہ تمام دنیا میں عشق سے زیادہ فرسودہ کوئی مضمون نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو رنگا رنگی اس جذبے میں ہے، جو اثر اس کا ہر دل پر ہوتا ہے اور جو مختلف شکلیں یہ ہر طبیعت اور مذاق کے ساتھ اختیار کرتا ہے اس میں بہت وسعت پیدا کر دیتی ہیں اور ہر عاشق کی طرح عشق کا ہر مصور بھی خود بخود ایک موجد ہو جاتا ہے۔ لیکن انارکلی کے عشق کی تصویر میں اصلیت کم اور رنگینی زیادہ نظر آتی ہے جیسے ہمارے شاعر اپنے جذبۂ عشق کی شدت ظاہر کرنے کے لئے بیخودی اور محویت کی انتہا تک پہنچ جانے کا دعویٰ کرتے ہیں، ویسے ہی انارکلی

کا عشق ایک ایسے رنگ میں دکھایا گیا ہے جو شاید ہی کسی انسان میں نظر آتا ہو۔ انسانی جذبات کے ہزاروں محرک ہوتے ہیں اور عشق کے جذبے کی ایک محرک کسی دوسری ذات میں محو ہو جانے کی آرزو بھی ہو جاتی ہے لیکن عشق کو محض محو ہو جانے کی خواہش ظاہر کرنا اور کسی انسان کو خالص عشق کا مجسمہ بنانا مبالغہ ہے۔ ممکن ہے یہ بعض لوگوں کو پسند آتا ہو، مگر جو لوگ انسانی سیرت کو اصلی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں انھیں یہ بے جا رنگ آمیزی معلوم ہوگی۔

اکبر کا طرزِ عمل بھی نفسیات کی رو سے ایک معمہ سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصنف نے عموماً اسے اپنے سیاسی منصوبوں میں ڈوبا ہوا دکھایا ہے، اور حرم سرا کی رنگیلی زندگی محض ایک دلچسپی ہے جس سے اس کے تھکے ماندے دماغ کو کسی قدر تفریح ہو جاتی ہے۔ سلیم نے اس کو جو شکایت ہے وہ بجا ہے۔ لیکن وہ صرف محل کی کنیزوں اور حرم سرا کی دلچسپیوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اکبر کو شکایت سلیم کی فطرت سے ہونا چاہیے، اس کی استعداد کی کمی اور اس کے شوق کی گمراہی سے۔ محض انارکلی کی ایک گستاخی پر وہ اس قدر بگڑ جاتا ہے، حالانکہ ایسی حرکت حرم سرا میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی، جب مرد اور عورتیں سب شراب کے عادی تھے اور خود جہاں پناہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح میخواری کی داد دیا کرتے تھے۔ سلیم کا انارکلی کو آزاد کرنے کی کوشش کرنا خصوصاً ایسے بھولے پن سے اسے بھی سزا کا سبب ماننا دشوار ہے۔ اگر باپ بیٹے میں رقابت ہوتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اکبر کا غصہ انارکلی کو تباہ کر دیتا لیکن رقابت کا ڈراما میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اکبر مطلق العنانی میں مست ہوتا اور اسے خواہ مخواہ اپنی طاقت استعمال کرنے کا شوق ہوتا تب بھی ہم سمجھ سکتے کہ اس نے انارکلی کو ایسی سزا کیوں دی، کیونکہ طاقت کے ناجائز استعمال کی ہزاروں مثالیں تاریخ میں اور ہمارے زمانے میں ملتی ہیں لیکن اکبر کو انارکلی میں ایک نہایت روشن ضمیر، عاقل و دانا، مدبر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور وہ وحشیانہ طرزِ عمل جو اس نے سلیم اور انارکلی کو جدا کرنے کے واسطے اختیار کیا اس کی سیرت کے بالکل مخالف ہوتا ہے۔

مصنف نے دیباچے میں بیان کر دیا ہے کہ انارکلی کا قصہ بے بنیاد ہے، مگر ڈراما میں حقیقت نگاری کا ایسا رنگ ہے کہ ڈراما کے پڑھنے والے کو یقین ہونے لگتا ہے کہ قصہ ضرور سچا ہوگا۔ ہم انشا پردازوں کو کسی طرح پابند کرنا نہیں چاہتے لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم جن لوگوں کی برائیاں بیان کریں ان کی بھلی باتوں کو بھی یاد کرتے رہیں۔ ہماری موجودہ غلامی اور بے مائگی ہمارے پیش روؤں کی گمراہی اور ان کی سیرت کی خامیاں واضح کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کچھ ان باتوں کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے جو ہمارے پیش روؤں کو اس وقت مصروف رکھتی تھی جب شراب اور عیش کی طلب ان کو دنیا سے غافل نہیں کر دیتی تھی۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

دیس میں ہندوستانیوں کا حال | یوں تو ہر ملک اور ہر دیس کے لوگوں کو اپنے وطن اور اپنے گھر سے محبت
تی ہے لیکن ہندوستان کی قناعت پسند آبادی کو اپنے گھر اور اپنے دیہات کی چوپال سے اتنی زیادہ
بت اور تعلق تھا کہ دیس کو چھوڑ کر پردیس جانا برا اور سمندر پار کرنا مذہبی گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن رفتہ
تہ ایسے سیاسی اور معاشی اسباب پیدا ہوتے گئے کہ انیسویں صدی کے وسط میں دنیا کے بعض غیر آباد
وں کو آباد کرنے کے لئے ہندوستان میں بھرتی شروع کی گئی اور طرح طرح کی ترغیبات دیکر ہندوستانیوں
سے معاہدے کے کاغذ پر انگوٹھا لگوایا گیا اور سمجھا بجھا کر سمندر پار بھیج دیا گیا۔ چنانچہ اس وقت دنیا کے
ختلف حصوں میں پردیسی ہندوستانیوں کی مردم شماری ۲۶½ لاکھ ہے جس میں سے تقریباً ۲۵½
لاکھ برطانوی نوآبادیات میں بس گئے اور باقی ایک لاکھ غیر برطانوی علاقوں میں ہیں جس کی تفصیل حسب
ذیل ہے :-

برطانوی نوآبادیات	۱۔ جزیرہ سیلون (لنکا)	۹ لاکھ ۵۹ ہزار
	۲۔ ملایا	۷ لاکھ
	۳۔ ماریشس	۲ لاکھ ۸۱ ہزار
	۴۔ جنوبی افریقہ	۱ لاکھ ۶۰ ہزار
	۵۔ ٹرینی ڈاڈ	۱ لاکھ ۳۰ ہزار
	۶۔ جزائر فیجی	۶۹ ہزار
	۷۔ دیگر	۲½ لاکھ
	میزان	۲۵½ لاکھ

غیر برطانوی علاقے		
	۱۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۱۷۰۰
	۲۔ مڈاگاسکر	۵۲۷۲
	۳۔ جزائر الشرق	۵۰ ہزار
	۴۔ سرینم	۲۴ ہزار
	میزان	تقریباً ایک لاکھ



ابتدا ازصرف مزدورپیشہ اور زراعت پیشہ طبقہ کے لوگ باہر گئے لیکن اس کے بعد پھر گویا دروازہ کھل گیا اور تاجر، دستکار، منشی، وکیل، ڈاکٹر غرض ہر پیشے کے لوگ بہتر مواقع کی تلاش میں باہر جانے لگے، لیکن بدقسمتی سے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگوں میں بیرون ملک جانے کا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوا جب یورپ کے گورے آدمی ایشیا کے "سیاہ فام انسانوں" کو انتہائی ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ جہاں جہاں ہندوستانیوں کا گزر ہوا ہر جگہ وہی آسمان وہی زمین، وہی پابندیاں، امتیازات اور تعصبات۔ قدرتاً شکایات پیدا ہوئیں اور اس لئے اور بھی زیادہ کہ ۲۶ لاکھ

میں سے ۲۵ لاکھ ہندوستانی اس وسیع سلطنت میں آباد کئے گئے تھے جہاں "آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا"۔ لیکن پردیس میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے، نہ حکومت ہند نے اپنی رعایا کی پردیس میں کوئی فکر کی اور نہ برطانوی پارلمنٹ نے کبھی توجہ کی۔ مقامی طور پر کچھ تو ہندوستانیوں کی اپنی سعی و کوشش سے اور کچھ تنگ نظر فرنگیوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی وجہ سے اکثر نوآبادیات میں حالات روبہ اصلاح ہونے لگے اور اب کم از کم برطانوی گوئنا، ٹرینی داد، جمائیکا، سیلون اور مارشس میں ہندوستانیوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض دیگر نوآبادیات میں ہندوستانیوں کی حالت بہت پریشان کن ہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں کی جاتی ہیں تاکہ وہ کسی طرح اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں مثلاً ایک شہر یا صوبے سے دوسرے شہر یا صوبے میں سکونت نہیں تبدیل کر سکتے، زمینات اور مکانات نہیں خرید سکتے، کئی کئی نسلوں سے وہاں آباد ہیں مگر حقوق شہریت نہیں ملتے، حق تجارت بہت مشکل سے ملتا ہے اور مخصوص بازار کے علاوہ دوسری جگہ دوکان نہیں لگا سکتے، مقررہ محلوں کے علاوہ دوسری جگہ سکونت نہیں اختیار کر سکتے، ریلوں میں صرف انھیں درجوں میں سفر کر سکتے ہیں جو ان کے لئے مخصوص ہوں، ہوٹلوں میں قیام ممنوع۔ مزدوری وغیرہ کے لئے جو قوانین حکومت نے بنائے ہیں ان سے وہ محروم ہیں، ان کے بچے اسکولوں میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ان شکایات کا تعلق ہے جنوبی افریقہ کی حکومت متحدہ کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ سب سے زیادہ معاندانہ ہے، جنگ سے قبل مہاتما گاندھی نے کئی سال تک وہاں قیام کر کے ہندوستانیوں کی ان شکایات کو دور کرنے کی سعی و کوشش کی اور بالآخر مجبور ہو کر حکومت متحدہ کے خلاف ستیہ گرہ کی جنگ شروع کی جس کا اختتام ۱۹۱۴ء میں "گاندھی اسمٹس" سمجھوتہ پر ہوا۔ جنگ عظیم کے زمانے میں ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کی "امپیریل وار کانفرنس" میں یہ مسئلہ کئی مرتبہ زیر بحث آیا اور مناسب قرار داد بھی منظور کی گئی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۲۱، ۲۴، ۲۵ء میں حکومت متحدہ جنوبی افریقہ نے کئی مسودات قانون اپنی پارلیمنٹ میں پیش کئے جن کا مقصد صریحاً ہندوستانیوں کی تجارت اور کاروبار کا تباہ کرنا تھا۔ حالات بہت نازک ہوتے جا رہے تھے اس لئے مئی ۱۹۲۶ء میں حکومت ہند نے سر جارج پیڈیسن کی سرکردگی میں ایک وفد حکومت متحدہ سے گفت و شنید کے لئے جنوبی افریقہ بھیجا اور یہ طے پایا کہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں دونوں حکومتوں

کی ایک کانفرنس افریقہ میں منعقد ہو اور اس کانفرنس سے قبل جنوبی افریقہ کا ایک وفد ہندوستان آکر یہاں کے حالات کا بچشم خود مطالعہ کرے۔ چنانچہ کانفرنس ہوئی اور گفت و شنید کے بعد ایک سمجھوتہ ہوا کہ حکومت جنوبی افریقہ مغربی طرز زندگی اختیار کرنے پر ہر جائز طریقے سے اصرار کر سکتی ہے اور جو ہندوستانی ایسا کرنا چاہیں گے ان کی اس معاملہ میں امداد کرنا بھی دونوں حکومتوں کا فرض ہے اور جو لوگ افریقہ چھوڑنا چاہیں گے ان کو دوسرے ملکوں میں آباد کرنے کے لئے ہر قسم کی امداد دونوں حکومتوں کی طرف سے دیجائے گی تین سال کی مسلسل غیر حاضری کے بعد واپسی کا حق نہ ہوگا لیکن اگر اس سے قبل واپس آنا چاہیں تو جو رقم حکومت نے ان پر صرف کی ہے وہ ادا کرنا پڑے گی' جو مسودات پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کے متعلق پیش کئے گئے ہیں ان پر مزید کارروائی نہ کیجائے گی، حکومت ہند اپنا ایک ایجنٹ معاملات کی نگرانی اور دونوں حکومتوں کے خوشگوار تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے مقرر کرے گی۔

جون ۱۹۲۷ء میں سمجھوتے کے مطابق مسٹر شاستری حکومت ہند کی طرف سے افریقہ میں ایجنٹ مقرر کئے گئے اور ان کے دوران قیام میں حالات قابل اطمینان رہے لیکن موصوف کو قبل از وقت استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے بعد مسٹر رڈی ایجنٹ مقرر ہوگئے۔ مسٹر رڈی کو بھی علالت کی وجہ سے رخصت لے کر دسمبر ۱۹۲۹ء میں ہندوستان واپس آنا پڑا' اور آپ کی غیر موجودگی میں حکومت متحدہ نے فرنگیوں کی درخواست پر یہ فیصلہ کیا کہ ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کی جائداد غیر منقولہ کی ملکیت اور قبضہ وغیرہ کے متعلق قواعد و ضوابط پر نظر ثانی کی جائے۔ اس فیصلے سے ہندوستانیوں کو قدرتاً اندیشہ پیدا ہوا۔ حکومت نے کوشش کی کہ یہ معاملہ کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہو جائے مگر حکومت متحدہ نے کسی طرح منظور نہ مسئلہ تحقیقاتی کمیٹی سے گزر کر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوگیا۔ لیکن بالآخر حکومت ہند کے اصرار سے پارلیمنٹ کے دوسرے اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور یہ طے پایا کہ ۱۹۲۷ء کے سمجھوتے کے مطا حکومت ہند اور حکومت متحدہ کے نمائندوں کی ایک کانفرنس پھر منعقد ہو اور از سر نو تمام مسائل پر غور کیا جائے چنانچہ اس سال جنوری اور فروری کے مہینے میں کانفرنس ہوئی۔ ہندوستان کی طرف سے سر فضل حسین، مسٹر شاستری، مسز نیڈو اور مسٹر باجپی بھیجے گئے۔ حسب ذیل مختلف فیہ مسائل تھے بالآخر سمجھوتہ ہوگیا:-

(۱) جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو بالخصوص ہندوستان واپس بھیجنے کے متعلق جو سمجھوتہ ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا وہ ناقابل عمل ہے۔ اول تو ۸۰ فی صدی ہندوستانی افریقی ہیں اور ہندوستان اب ان کے لئے ایک اجنبی ملک ہے، وہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہیں اس لئے وہ ہندوستان واپس جانا نہیں چاہتے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں کثرت آبادی کی وجہ سے مزید دشواریاں ہیں، لہذا ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو دنیا کے دوسرے غیر آباد علاقوں میں تحقیق حالات کرے اور اگر آب و ہوا مناسب ہو تو افریقی ہندوستانیوں کو وہاں آباد کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کمیٹی میں افریقہ انڈین کانگریس کا بھی ایک نمائندہ ہوگا۔

(۲) مغربی طرز زندگی کو اختیار کرانے کے لئے تعلیمی اور دیگر آسانیاں بہم پہونچانے کا جو وعدہ حکومت متحدہ نے ۱۹۲۷ء کے سمجھوتے میں کیا تھا اس پر وہ قائم رہے اور اس پر عمل بھی کرے۔

(۳) ٹرانسوال میں حقیت اراضی کے متعلق جو مسودہ قانون افریقی پارلیمنٹ میں پیش تھا اس پر بحث کرنے کے لئے جنوبی افریقہ کے نمائندے تیار نہ تھے۔ وہاں کی فرنگی آبادی کو اس پر سخت اعتراض تھا کہ جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ کے معاملات میں حکومت ہند کو اس طرح دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لئے یہ طے پایا کہ افریقی نمائندے ڈاکٹر ملان ہندوستانی نمائندوں کے خیالات مجلس منتخبہ کے سامنے پیش کر دیں اور کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ خود مجوزہ مسودہ میں ضروری ترمیمات کر دیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ کانفرنس کے سمجھوتے کا دار و مدار اسی پر ہے کہ اس خاص مسئلہ میں ہندوستانی نمائندوں کی تجاویز کو مسترد نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ اختلافات تھے لیکن بالآخر اس پر بھی سمجھوتہ ہو گیا جو بحالات موجودہ کافی سمجھا جاتا ہے۔

حکومت ہند کا ایک نمائندہ آئندہ بھی بحیثیت ایجنٹ کے جنوبی افریقہ میں رہے گا۔ مسٹر ریڈی کی میعاد ختم ہو گئی ہے، لیکن ان کے جانشین کا تقرر ابھی تک عمل میں نہیں آیا ہے۔

اس سمجھوتے کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی ہے لیکن جنوبی افریقہ کے فرنگیوں کی ذہنیت سے اندیشہ ہے کہ پچھلے سمجھوتوں کی طرح سے یہ سمجھوتہ بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے گا۔ ہندوستان میں پنچ ذات اور اونچ ذات کے اختلافات پر فرنگیوں کو ہنسی آتی ہے لیکن خود ان کی بدترین ذہنیت اور نسل و رنگ کے تعصب کا جو حال ہے وہ آج بھی جنوبی افریقہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کو برطانوی پارلیمنٹ سے بجا طور پر شکایت ہے کہ ہندوستان میں تو بات بات پر صوبے کے گورنر سے لیکر ملک معظم تک سب اپنے "تصدیق" اور تردید کے اختیارات استعمال کرتے ہیں لیکن گو یہ سب اختیارات دیگر نوآبادیات کے متعلق بھی پارلیمنٹ اور ملک معظم کو حاصل ہیں لیکن آج تک کبھی ان کا استعمال ہندوستانیوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے نہیں کیا گیا حالانکہ امپیریل کانفرنس کی قرارداد کے صریحاً خلاف ہندوستانیوں کے ساتھ طرح طرح کی قانونی اور غیر قانونی زیادتیاں کی جاتی ہیں۔

اسلامی ممالک

حوادث فلسطین | ۱۹۳۱ء کی روئیداد مردم شماری کی رو سے فلسطین میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کے شمار و اعداد یہ ہیں:-

مسلمان	۷۵۹۹۵۲
یہود	۱۷۵۰۰۶
عیسائی	۹۰۶۰۷

۱۹۲۲ء کی نسبت یہود کی تعداد اب دگنی ہوگئی ہے (یعنی ۸۳۷۹۴ سے ۱۷۵۰۰۶) لیکن یہودیوں کے لئے یہ امر کچھ بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں اس لئے کہ گزشتہ ۹ سال میں مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے وہ یہود کی کل تعداد کے تقریباً برابر ہے (یہود کی کل تعداد ۱۷۵۰۰۶ ہے۔ ۱۹۲۲ء میں مسلمانوں کی تعداد ۵۹۰۸۹۰ تھی اور اب ۷۵۹۹۵۲ ہے۔ گویا ان کی تعداد میں ۱۶۹۰۶۲ کا اضافہ ہوا ہے)۔ لہٰذا محض آبادی کے مسئلے میں مسلمانوں کو یہود سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ فلسطین کی کل آبادی ۱۰۳۵۱۵۴ ہے جس میں سے صرف بیت المقدس میں ۹۰۵۲۶

آدمی بستے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ جس طرح باعتبار تعداد صیہونی تحریک فلسطین کو یہود کا "قومی وطن" بنانے میں ناکام رہی ہے اسی طرح اسلامیان فلسطین اپنے ہمت و استقلال کی بدولت برطانوی شہنشاہیت واستعمار کی تمام منصوبہ بازیوں کا خاتمہ کر دیں گے۔

اس سلسلے میں ایک تازہ خبر یہ آئی ہے کہ عرب رہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فلسطین کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جائے اور ان میں سے ایک میں مسلمانوں اور دوسرے میں یہود کو حق خود اختیاری حاصل ہو۔ پھر ان دونوں حصوں کو ملا کر ایک متحدہ ریاست قائم کی جائے، عرب اور یہود دونوں اس میں شامل ہوں اور اگر اس تجویز پر کامیابی کے ساتھ عمل ہو سکے تو یہ متحدہ ریاست کم و بیش اسی حیثیت سے جو عراق کو حاصل ہے انجمن اقوام میں شرکت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہود کا ایک فرقہ اس تجویز کا سخت مخالف ہے۔ اس نے اس امر کے خلاف بھی ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ حکومت برطانیہ نے موجودہ ششماہی کے لئے یہودی تارکان وطن کی تعداد ۱۰۲۰ سے ۲۵۰ کیوں کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ طرفداران صیہونیت جو تمام فلسطین پر تغلب حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں اس امر پر کیونکر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ ان کے خانہ ساز "وطن" کا ایک حصہ صیہونی دستبرد سے آزاد ہو جائے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین برطانوی انتداب کی بجائے براہ راست انجمن اقوام کے زیر حکومت آجائے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں نو لاکھ آبادی میں سات لاکھ کے مقابلے پر زبردستی ڈیڑھ لاکھ یہودی ٹھونس دئے گئے ہوں مٹھی بھر اجنبیوں کی خاطر ملک کے اصلی باشندوں کو حق ملکیت سے محروم کرنے کی تجویز پیش کرنا مغربی دستور و سیاست و فتنہ ہائے رعایات و حقوق کے ماتحت ہی ممکن ہے۔ البتہ یہ خیال کہ سیاسئین مصر و ہندوستان تجزیہ فلسطین کی حمایت کر رہے ہیں سراسر لغو ہے مصریوں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن مسلمانان ہندوستان جن کی ہر جماعت آزادی مقامات مقدسہ کا حلف اٹھا چکی ہے کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی تجویز پر صاد کریں جو فلسطین کے حقیقی استقلال اور حریت کے منافی ہو۔

ممالک اسلامی کی مالی حالت اس وقت دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جو مالی دشواریوں میں

گرفتار نہ ہو۔ ممالک اسلام جن کی معاشی حالت پہلے بھی کچھ اچھی نہیں تھی اور جہاں آقایان مغرب کی حرص غصب و اجارہ داری کی بدولت آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا ہوتا رہتا ہے دنیا کی عام اقتصادی مشکلات کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ پریشان ہیں۔ ہم نے جامعہ کے ان صفحات میں بار بار ان کوششوں کی طرف اشارا کیا ہے جو دول مغرب میں سے کسی نہ کسی کی جانب سے ایران، ترکی، عرب، افغانستان ـــ باقی ممالک کا نام لینا بیکار ہے ـــ میں معاشی جبر و تغلب کا کوئی نہ کوئی ذریعہ پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ اور چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ جس طرح ہندوستان کا ہر مسلمان اپنے پڑوس کے بنیے کا دست نگر ہے اسی طرح جملہ ممالک اسلامی کسی نہ کسی مغربی بنیے کے شرمندۂ احسان۔ لہذا جب کبھی ان بنیوں کے معاملات کوئی اچھی یا بری صورت اختیار کرتے ہیں تو اس کا اثر دول اسلامی پر ضرور پڑتا ہے۔ اس وقت دنیا کا سارا معاشی نظام اہل مغرب کے ہاتھوں میں ہے۔ بنک ان کے ہیں، اندوختے ان کے پاس ہیں، چاندی اور سونے کے وہ مالک ہیں، معیار طلا کی پابندی یا اس سے آزادی ان کے اختیار میں ہے، دنیا کے ہر ملک کا سکہ ان کے سکوں سے وابستہ ہے۔ ان کی حالت اچھی ہوتی ہے تو تجارت، کاروبار، لین دین، صنعت و حرفت سب کی حالت اچھی ہوتی ہے لیکن آج کل یہ لوگ خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ تاوان، قرضہ، تخفیف، میزانیے کا عدم تعاون، مقاطعہ، بے روزگاری یہ اور اس قسم کے مسائل ہیں جنھوں نے ان کی راہ میں طرح طرح کی دقتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس سے دنیا کی معاشی حالت پر جو خراب اثر پڑا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ممالک اسلامیہ کی معاشی حالت ہمیشہ سے پست چلی آتی تھی۔ اب اس میں اس عام کساد بازاری کا جس سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں، اور اضافہ ہوا۔ ممالک اسلام کو بھی دنیا کی تمام حکومتوں کی طرح اپنے میزانیوں کو درست کرنا ہے۔ اس کے لئے آمدنی کے جدید وسائل اور محاصل کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ ان کو بین الاقوامی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں، اپنے ملک کی معاشی ترقی کے لئے صنعت و حرفت کو فروغ دینا ہے اور یہ سب قرض کے بغیر ناممکن ہے لیکن قرضہ کس سے لیا جائے، آج کل کی دنیا میں سیاست اور معیشت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بغیر کسی سیاسی غرض کے کسی دوسری قوم کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار نہیں۔ خوش قسمتی سے ممالک اسلام اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں۔ انھوں نے اس باب میں جو ذرائع عمل اختیار کئے ہیں ان کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہو سکتا ہے۔

جمہوریہ ترکیہ :- ہم نے جامعہ کے کسی گزشتہ پرچے میں عرض کیا تھا کہ حکومت انگورہ روسی تجارت اور روسی مصنوعات کی درآمد کو روکنے کے لئے اس پر خاص پابندیاں عائد کر رہی ہے۔ حکومت ہر دو ماہ کے لئے درآمد کی تعداد مقرر کر دیتی ہے۔ اس تدبیر سے خاطر خواہ نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ روسی مصنوعات کی آمد پہلے کی نسبت بہت کم ہو گئی ہے اور تین سو روسی افسر جو اپنے بال بچوں سمیت ترکی میں مقیم تھے اب واپس جا رہے ہیں۔

ایران :- ایران اور روس کے تجارتی تعلقات کے متعلق ہم نے جامعہ کی کسی پہلی اشاعت میں ایک طویل شذرہ سپرد قلم کیا تھا۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ دولت ایران نے خارجی تجارت کے تباہ کن اثرات کو روکنے کے لئے یہ قانون بنا دیا ہے کہ بجز سرکاری اجازت ناموں کے کسی خارجی حکومت کا مال ایران میں نہیں آسکتا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومت ایران سختی کے ساتھ اس قانون پر عمل نہیں کر سکی۔ امریکہ کو اس پابندی سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ ایران کی تجارت میں بھی سال گزشتہ کے مقابلے میں ۱۰ فیصدی کی کمی ہو گئی ہے لیکن اگر قیمت کا خیال کیا جائے تو یہی خسارہ سترہ فی صدی تک پہنچ جاتا ہے۔

مصر :- مصر کی حالت ایران کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ سال نو کا مصری میزانیہ اگرچہ ۱۰ کی بجائے اٹھارہ کرور اسٹرلنگ پر قائم ہوا ہے لیکن حکومت کے پاس ۱۵ کروڑ اسٹرلنگ بطور زر محفوظ موجود ہے۔ روئی کی برآمد کی مقدار بھی سال گزشتہ کی نسبت تیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔

عراق :- نوری پاشا وزیر اعظم کے اس اعلان کے مطابق جو عراق کے تیل کی برآمد کے متعلق تھا اور جس کا تذکرہ جامعہ کے پچھلے نمبر میں آچکا ہے حکومت عراق اور ایک انگریزی کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ مرتب ہوا ہے اور اس کے ماتحت جو رعایت حکومت برطانیہ کو دی گئی ہے اس میں بین الاقوامی مفاد کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی، اٹلی اور فرانس اس معاہدے سے بے تعلق نہیں ہوں گے۔ کمپنی کو ۷۵ برس تک تیل کی برآمد کا اجارہ حاصل ہوگا اور اس کے لئے دریائے دجلہ کے مغربی کنارے دو سو مربع میل کا رقبہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

عرب :- حکومت نجد و حجاز کے متعلق ایک عرصے سے یہ خبر مشہور تھی کہ سلطان ابن سعود دولت برطانیہ سے کچھ روپیہ قرض لینا چاہتے ہیں جس کے عوض میں انگریزوں کو حجاز میں خاص مراعات حاصل

ہونگی۔ چونکہ یہ معاملات حجاز میں انگریزی سیادت کے مرادف ہیں اس لئے مسلمان بجا طور پر اس خبر سے مضطرب تھے۔ مقام مسرت ہے کہ حکومت نجد نے اس خبر کی تردید کردی ہے لیکن جو اعلان سلطان ابن سعود یا ان کے نمائندوں کی طرف سے شائع ہوا ہے اس کا آخری حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہا گیا ہے کہ حکومت نجد بجائے کسی مغربی قوم کے کسی دولتمند مسلمان سے قرض لینے کی خواہشمند ہے۔ اگر جلالۃ الملک کی حکومت واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس تجویز پر غور کررہی ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ جلالۃ الملک یا ان کے نمائندے اپنے سوا تمام دنیا کو جاہل سمجھتے ہیں اور یہ کوئی بہت اچھی بات نہیں۔ اس لئے کہ اول تو ہماری دانست میں ایسے مسلمانوں کا وجود عنقا ہے جو کسی حکومت کو قرض دے سکیں اور اگر ہو بھی تو ان کی یہ کارروائی بین الاقوامی ذمہ داریوں سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اگر اس قسم کا کوئی مسلمان واقعی دنیا میں موجود ہو تو اس انکشاف کا سہرا ہز میجسٹی عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد و ملحقاتہا کے سر ہوگا اور اس کے لئے مسلمانان عالم جلالت مآب کو جس قدر بھی مبارک باد دیں کم ہے۔

وزارت معارف افغانستان کی تعلیمی روئیداد جریدۂ اصلاح کی تازہ اشاعتوں سے معلوم ہوا ہے کہ شروع اپریل میں مدارس کابل کے تقسیم انعامات کی رسم نہایت دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس موقع پر خود اعلیٰحضرت شہریار غازی بنفس نفیس تشریف رکھتے تھے اور ممدوح کے علاوہ وزیر معارف اور دوسرے اعیان و عمائد مملکت بھی موجود تھے۔ اول والی بال کا میچ ہوا (مکتب امانی اور امانیہ کے درمیان) پھر تلاوت قرآن کے بعد آقائے محمد کبیر خاں متعلم مکتب حبیبیہ نے اعلیٰحضرت کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:۔

هزار شکر که از طالع نکو فرجام ۔۔۔ مشرفیم بدربار شاه با اکرام
شهے که گشت ز تدبیر ناجیٔ ملت ۔۔۔ ز سیل حادثه انقلاب فتنه خرام
ز سعی اوست که احیائے ملک و ملت شد ۔۔۔ ز فرض اوست همیں راحت و آسائش عوام
همیں زمین قدوم مبارکش از سر ۔۔۔ گسسته رشته تامین خلق یافت نظام
اگرچه ره بترقی از دست جمله امور ۔۔۔ نموده سوئے معارف مسے توجۂ تام
بماست فرض که دانیم قدر ایں نعمت ۔۔۔ ز روئے صدق نمائیم شکر ایں انعام

وزیر معارف کی رپورٹ کے بعد اعلیحضرت نے انعامات تقسیم کئے اور موقعہ کی مناسبت کے لحاظ سے برجستہ ایک تقریر فرمائی۔

وزیر معارف کی روئیداد کا ملخص یہ ہے کہ سال گزشتہ حکومت افغانستان نے تین لاکھ روپیہ ابتدائی تعلیم پر صرف کیا۔ دارالامان کی اراضی اور باغات سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے (اور جو تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے) اس کے علاوہ ہے۔ تعلیمی حالت باعتبار معلمین و متعلمین دن بدن رو بہ اصلاح ہے۔ طلبا کی تعداد بڑھ گئی ہے اور بہتر معلموں کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ انقلاب کے زمانے میں جو عمارات منہدم ہو گئی تھیں ان کی از سر نو مرمت کرائی گئی ہے۔ بعض مدارس میں اضافہ ہوا ہے اور حتی الوسع ان کی تزئین و آرائش کی کوشش کی گئی ہے۔ سامان تعلیم کے علاوہ نصاب میں شعبہ ہائے نجاری و معماری کو بڑھا دیا گیا ہے۔ مکتب زراعت اور مکتب صنائع کا افتتاح ہوا۔ قندھار، قطغن، بدخشاں، ہرات، مزار شریف اور سمت مشرقی میں ایک ایک مکتب ابتدائی کھولا گیا ہے۔ سمت مشرقی میں ایک اور مدرسہ نجم المدارس کے نام سے قائم ہوا ہے۔ کیمیا اور طبیعیات کی تعلیم کے لئے معملوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ بوائے اسکاؤٹس (یعنی کشافان) کی تحریک بھی دن بدن مقبول ہو رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے مدارس کے علاوہ تمام مساجد میں تعلیم کا انتظام ہے۔ وزارت معارف نے صیغۂ تالیف و اشاعت سے بھی غفلت نہیں برتی۔ صیغۂ مذکور نے اس وقت تک ۴۲ کتابیں شائع کی ہیں۔ بیرونی ممالک میں جو افغان طلبا مختلف مضامین مثلاً زراعت، ہندسی، تعمیرات، ریڈیو، تار برقی، طب، دندان سازی، آبرسانی، عسکریات وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی تعداد ۸۴ ہے۔

اعلیحضرت شہریار غازی نے اس روئیداد پر اطمینان کا اظہار کیا لیکن وزارت معارف کو ہدایت کی کہ ابھی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے اسے اپنی مساعی میں اور زیادہ اجتہاد اور سرگرمی سے کام لینا پڑے گا۔ جلالت مآب نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا تعلیمی نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ افغان طلبا مذہب کے پابند اور خدمت ملک و ملت کی آرزو رکھتے ہوں۔

ممالک غیر

برطانیہ | ناظرین کو معلوم ہے کہ برطانیہ نے ستمبر گذشتہ میں پونڈ اور سونے کا تعلق توڑا، پھر دسمبر سے اکثر اشیاء کی درآمد پر تامینی محصول لگائے۔ لیکن ان دونوں غیر معمولی معاشی کارروائیوں کے جو نتائج نظری اعتبار سے رونما ہونے چاہیے تھے وہ ہنوز وضاحت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ انگلستان میں درآمد اشیاء میں معتدبہ کمی ہو، برآمد اشیاء خوب بڑھے اور ملک میں قیمتیں بڑھیں اور تجارت کی کساد بازاری دور ہو۔ لیکن واقعی صورت حال نے اس نظری نقشہ کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا۔ ستمبر میں پونڈ کو سونے سے جدا کرنے کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ پونڈ کی قدر میں باعتبار زر کوئی ایک تہائی کی کمی ہو گئی لیکن تھوک فروشی کی قیمتیں ستمبر میں اگر ۹۹ تھیں تو نومبر میں ۱۰۶ تک بڑھیں اور دسمبر میں پھر کچھ گھٹ کر ۱۰۴ سے کم ہو گئیں۔ اجرتیں ۹۷½ سے گھٹ کر ۹۶½ رہ گئیں۔ قیمتوں میں بھی جتنی امید تھی اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ تجارت پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ سنہ ۱۹۳۱ء کے پہلے نو مہینوں میں انگلستان کی اوسط ماہوار درآمد ۶۹ ملین پونڈ تھی، اور پونڈ کے سونے سے جدا ہونے کے بعد آخری تین مہینوں میں ۷۶ ملین پونڈ۔ البتہ جنوری میں تامینی محصول لگنے کے بعد یکایک درآمد میں کوئی ۲۴ ملین پونڈ کی کمی ہوئی۔ لیکن ایک تو جنوری سنہ ۳۱ء میں بھی کوئی ۱۵ ملین پونڈ کی کمی ہوئی تھی، دوسرے محاصل درآمد کی خبر پا کر لوگوں نے جلد جلد مال منگا لیا تھا اس لئے جنوری سنہ ۳۲ء میں آنے والا مال دراصل نومبر اور دسمبر میں انگلستان پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اعداد کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۴ ملین میں سے صرف ۵ ملین کی کمی ان اشیاء کی درآمد میں ہوئی ہے جن پر تامینی محصول لگایا گیا ہے باقی کمی دوسری چیزوں کی ہے۔ ستمبر کے بعد کی برآمد کے اعداد سے بھی متوقع نتائج کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ اعداد یہ ہیں:۔

سنہ	اکتوبر	نومبر	دسمبر	جنوری
برآمد سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء (ملین پونڈ)	۵۴٫۱	۵۰٫۱	۴۳٫۷	۴۳٫۷
برآمد سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء (ملین پونڈ)	۳۸٫۱	۳۶٫۸	۳۷٫۶	۳۶٫۴

یہ نتائج ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ انگلستان کی مالی حالت کے جلد درست ہو جانے کی توقع کیجا سکے کہ اسی غرض کے لئے "متحدہ 'قومی حکومت' قائم کی گئی تھی۔ اور جب پونڈ کو سونے سے جدا کرکے اور آزاد تجارت کی روایتی راہ کو چھوڑ کر بھی یہ اہم مقصد حاصل نہ ہوا تو غالباً اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ 'قومی حکومت' اپنی موجودہ شکل میں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔ چنانچہ حال ہی میں پارلیمنٹ کی ایک جگہ پر مزدور جماعت کے ایک رکن کا انتخاب پتہ دیتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر بدلنے والا ہے۔

موجودہ وزارت قومی میں اشتراک عمل کے امکانات زیادہ دن تک چلتے نظر نہیں آتے۔ خود وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ یہ نام کو وزیر اعظم ہیں لیکن پہلے دن سے 'کنزرویٹو' جماعت ان کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہی ہے مثلاً جنوری میں وزیر اعظم کے رفیق جووٹ جنھوں نے جرأت کرکے اس رفاقت میں لیبر پارٹی کو چھوڑا تھا 'اٹارنی جنرل' کے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ اس لئے کہ انھیں عام انتخاب میں شکست ہوگئی تھی۔ عام دستور کے مطابق سرکاری ممبروں میں کسی کو ان کے لئے ایسی جگہ خالی کر دینی چاہئے تھی جس پر ان کا انتخاب یقینی ہوتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ ان کی جگہ ایک کنزرویٹو طامس انس کپ کو اٹارنی جنرل بنایا گیا اور ان کی جو جگہ خالی ہوئی اس پر بھی ایک کنزرویٹو سر فرینک مری مین بھیجے گئے۔ پھر تاہینی محاصل کے قانون کے بارے میں بہت کچھ اختلافات رہے اور وزارت برطانوی کی متحدہ ذمہ داری کا مسلک سپرد طاق نسیاں کیا گیا۔ اور برطانوی وزرا نے برطانوی وزارت کے پیش کردہ قانون کے خلاف پارلیمنٹ میں تقریریں کیں۔ ہندوستان اور آئرستان کے مسائل کے متعلق بھی اس قدر مختلف الخیال جماعتوں کا باہمی تعاون زیادہ قرین قیاس نہیں ہے۔

جب وزارت کے باہمی تعاون کا یہ حال ہو اور ان کی تدابیر قوم کی مالی حالت کو بہتر بنانے میں واضح نتائج پیدا نہ کرسکیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر آئندہ ۶ مہینے کے اندر اندر موجودہ وزارت ٹوٹے اور حکومت کی تشکیل نو کے مسئلہ سے انگلستان کے مدبر دو چار ہوں۔

آئرستان | ڈی ویلرا کے انتخاب پر پچھلی اشاعت میں کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس انتخاب عام سے پہلے آئرستانی ڈیل (آئرستانی پارلیمنٹ) میں نشستوں کی تقسیم یوں تھی کہ ۶۵ کاسگریو وزیر اعظم کی پارٹی کے اراکین تھے اور ان کی حمایت میں ۱۲ غیر جانبدار، ۶ کسان، اور ۲ غیر جانبدار مزدور جماعت کے اراکین تھے کل ۸۵۔

مخالفوں میں ۵۶ فیانا فیل یعنی ڈی ولیرا کی جماعت کے رکن تھے، ۱۰ مزدور اور ایک غیر جانبدار کل ۶۷۔
نئی پارلیمنٹ میں فیانا فیل کے ۷۲ آدمی ہیں اور ان کی حمایت میں ۷ مزدور کل ۷۹۔
مخالف جماعت میں ۵۶ کاسگریو کی جماعت کے لوگ ہیں اور ۱۰ غیر جانبدار کل ۷۳۔

نئی وزارت کی اکثریت کا دار و مدار مزدور جماعت کے اراکین پر ہے اور مزدور اپنی اس اہمیت کو سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ مزدور جماعت اور 'فیانا فیل' کے معاشی پروگرام میں بہت کچھ ہم آہنگی ہے لیکن شاید خالص سیاسی یا جذباتی معاملات میں مزدور آخر وقت تک ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوں۔

جرمنی | مارچ کے جامعہ میں اس خیال کا یقین کے ساتھ اظہار کیا گیا تھا کہ گو فان ہنڈنبرگ پہلے انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن دوسرے انتخاب میں ان کا منتخب ہونا یقینی ہے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس موقع پر بجائے پانچ امیدواروں کے صرف تین امیدوار میدان میں تھے ۔ ہٹلر قومی اشتراکیوں اور بعض دوسرے قوم پرست گروہوں کی طرف سے، ٹیلمان اصلی اشتراکیوں (کمیونسٹوں) کی طرف سے اور فان ہنڈنبرگ تمام دوسری جماعتوں کی جانب سے ۔ منتخب فان ہنڈنبرگ ہوئے اور اس طرح کہ انھیں منتخب کرنے والوں کی تعداد دوسرے دونوں امیدواروں کی مجموعی رایوں سے زیادہ تھی ۔ جرمنی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے فان ہنڈنبرگ کے لئے یہ بڑی کامیابی تھی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہٹلر گو منتخب نہ ہو سکا مگر کامیابی اسے بھی بڑی حاصل ہوئی۔ فان ہنڈنبرگ جیسی شخصیت کے مقابلہ میں ایک کروڑ تیس لاکھ رائیں حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں ۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ قومی اشتراکیت کی تحریک روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اگر آج نہیں تو کچھ دنوں بعد اس جماعت کا برسر اقتدار آنا لازمی امر ہے ۔

اس دعوے کی تائید مجالس قانون ساز کے ان انتخابات سے بھی ہوتی ہے جو ابھی اسی مہینے جرمنی کی پانچ ریاستوں میں منعقد ہوئے ۔ ان ریاستوں میں پرشا کو قدرتاً بہت اہمیت حاصل ہے ۔ جرمن قول کے مطابق جو پرشا پر حکومت کرتا ہے وہی جرمنی کا اصلی حاکم ہوتا ہے ۔ اب تک اس ریاست میں اعتدال پسند اشتراکی بعض دوسری جماعتوں کی مدد سے برسر اقتدار تھے مگر نئے انتخابات نے صورت حال بالکل بدل دی ہے ۔ جہاں اب تک ہٹلر کے مؤیدین کی تعداد ۹ تھی اب ۱۶۰ سے بھی اوپر پہنچ گئی ہے ۔ گو تمام دوسری جماعتوں کی مجموعی تعداد اس سے زیادہ ہے پھر بھی اس کا امکان ہے کہ قومی اشتراکی بعض

دوسری جماعتوں سے مل کر جو کم و بیش ان کے ہم خیال ہیں حکومت قائم کرسکیں۔ اگر انتہا پسند اشتراکیوں نے اپنے تمام وعدوں کے خلاف اعتدال پسندوں کا ساتھ دیا تب تو بیشک پرشیا میں موجودہ حکومت قائم رہ سکتی ہے ورنہ اور کوئی صورت نہیں۔

اگر اس وقت پرشیا میں قومی اشتراکی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر پرشیا اور مرکزی حکومت میں پیچیدگیوں کا پیدا ہونا لازمی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر جرمنی کے وزیراعظم ہر برونِنگ کو مجبوراً مرکزی مجلس قانون ساز کے بھی نئے انتخابات کرانا پڑیں۔ نئے انتخابات کے یقینی طور پر معنی ہوں گے قومی اشتراکیوں کی کامیابی۔ اور قومی اشتراکیوں کی کامیابی کے معنی ہوں گے ایک طرف فرانس اور دوسرے ممالک سے ناچاقی اور دوسری طرف اندرون ملک میں نظام جمہوری کی تخریب۔ مگر یہ صرف اس صورت میں ہے جب یہ جماعت اپنے وعدوں پر قائم رہ سکی۔ مگر وہ سب وعدے جو آج قومی اشتراکی کر رہے ہیں ان کا پورا کرنا قدرتی ناممکنات سے ہے۔ قوت حاصل کرنے کے بعد اس جماعت کا رسوا ہونا ضروری ہے اور اس کی رسوائی کے ساتھ ہی انتہا پسند اشتراکیوں کی باری آتی ہے۔ جرمنی کی جو موجودہ حالت ہے اس میں قدرتی طور پر انتہا پسند جماعتیں پھلتی پھولتی ہیں۔ یا تو قومی اشتراکی یا پھر کمیونسٹ !

چین وجاپان | جیسا کہ پچھلے مہینہ لکھا جاچکا ہے جاپان نے شنگھائی کے علاقہ میں تو انجمن اقوام کی قرارداد کے مطابق جنگی کارروائیاں بند کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن منچوریا پر اپنے اثر میں ذرا سی کمی بھی اسے گوارا نہیں۔ جاپان نے ایک خودمختار منچوری حکومت کا اعلان کرادیا ہے اور معزول شاہ چین کو جس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں صدر جمہوریہ بنا کر خود اس ملک پر حکمراں ہے۔

امریکہ اور دول یورپ اس صورت حال کو پسند نہیں کرتے مگر جاپان انھیں کی سنت پر تو چل رہا ہے اس لئے ناپسندیدگی کے اظہار میں زور کہاں سے آئے؟ چین کی تقسیم کا منصوبہ جاپان سے پہلے دول یورپ نے بنایا تھا۔ کبھی مراعات معاشی کی شکل میں، کبھی دورافتادہ صوبوں مثلاً تبت اور منگولیا پر تسلط کی صورت میں، کہیں ٹھیکوں کے نام سے، کہیں حلقہائے اثر کے روپ میں۔ اتفاق کی بات تھی کہ جاپان کو اس تقسیم میں روس کے وارث کی حیثیت سے حصہ ملا اور منچوریا کو جاپان کی

نوآبادی بنانے کا منصوبہ دراصل جاپان کو اسی تقسیم کے پروگرام کے ایک حصہ کی تکمیل ہے۔

امریکہ اس کی سخت مخالفت کر رہا ہے اگرچہ ۱۹۰۳ء میں کولمبیا سے پناما کی بغاوت میں ریاستہائے متحدہ کا جو رویہ رہا تھا اسے جاپان بطور نظیر پیش کرتا ہے۔ انگریز اس نظیر کو وزنی بتلاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ تبت کے متعلق انگریزوں کے جو منصوبے ہیں وہ اس باب میں ان کے لئے زیادہ وزنی ہوں گے!

روس نے بھی منچوریا کی نئی حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگرچہ چینی مشرقی ریلوے کے چینی صدر مو کو جب جاپانیوں نے اس لئے نکال دیا کہ اس نے نئی حکومت کے احکام نہ مانے تو روس نے اسکی برخاستگی کو منظور کر لیا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ فوجی نقل و حرکت کے سلسلہ میں روس کو احتجاج کا موقع ملا مگر وہ خاموش رہا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ روس کو منچوریا میں جاپان کا اس درجہ تسلط نہیں بھاتا۔ شروع مارچ میں روسی حکومت کے سرکاری اخبار نے دو دستاویزیں شائع کیں جن کے متعلق خیال ہے کہ ممتاز جاپانی سپہ سالاروں نے تیار کی تھیں اور جن میں روسی علاقہ پر حملہ آور ہونے کے منصوبوں کی تفصیل ہے۔ اس اخبار نے پھر ایک افتتاحیہ لکھا کہ روس ہر چند کہ غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے لیکن اگر اس کے خلاف یہ منصوبے بنائے گئے تو لڑنے پر بھی آمادہ ہے۔ یہ مضمون تمام روس میں لاسلکی کے ذریعہ پھیلایا گیا اور تمام روسی اخباروں نے اسے شائع کیا۔ اس کے بعد سے منچوری سرحد کے قریب روسی فوجیں جمع ہو رہی ہیں اور چونکہ "مشرق بعید کی ریلوے" کے سلسلہ میں روس کے اغراض جاپان سے ٹکراتے ہیں اور ادھر جاپان کا فوجی وجوہ سے ولاڈی واسٹک پر دانت ہے اس لئے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد مخالفت کے یہ شرارے جنگ کی شکل میں ظاہر ہوں۔

شذرات

اردو اکادمی کا جلسہ جو پچھلے مہینے ملتوی ہوگیا تھا ۹ اپریل کو منعقد ہوا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دو جلسے
ے پہلا ۸ بجے شام سے ۹ بجے تک دوسرا ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک۔ حاضرین کی تعداد اس مرتبہ پچھلے
جلسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ باہر سے بھی پہلے سے زیادہ لوگ آئے تھے اور دہلی کے اہل
ق بھی بہت کثرت سے موجود تھے۔

پہلے جلسے میں مولانا اسلم جیراجپوری نے "مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر" کے عنوان
ے ایک دلچسپ مقالہ پڑھا جس کا نصف حصہ اس پرچے میں چھپ رہا ہے اور نصف آیندہ مہینے چھپے گا۔
لسے کی صدارت مولانا محمد سورتی صاحب کرنے والے تھے مگر انھیں عین وقت پر دہلی سے باہر تشریف
ے جانا پڑا۔ حسن اتفاق سے ان کے مایۂ ناز شاگرد ڈاکٹر عبد العلیم صاحب احراری جو ابھی برلن سے
وم اسلامی کی ڈگری لے کر آئے ہیں موجود تھے اور وہی جناب شیخ الجامعہ کی تجویز سے جلسے کے صدر
انے گئے۔ فاضل مقرر کی تقریر ختم ہونے کے بعد جناب صدر نے ایک مختصر سی تقریر میں موضوع کلام
مزید روشنی ڈالی اور جلسہ دونوں حضرات کے شکریے پر ختم ہوا۔

پہلے جلسے کے بعد کسی قدر وقفے سے دوسرا جلسہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں شروع
وا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم اجتماعی اور انفرادی
ونوں پہلوؤں سے صحیح نشوونما میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹ ڈالتی ہے":
اجتماعی حیثیت سے یونیورسٹی کا فرض یہ ہے کہ قومی تمدن اور قومی روایات کو محفوظ رکھے، ان میں
انے کے رنگ اور ضرورت کے مطابق تجدید اور اصلاح کرے، تخلیقی قوت سے کام لے کر ان کی حدود
وسعت دے اور یہ سارا خزانہ آیندہ نسلوں کے سپرد کر دے۔ مگر ہماری یونیورسٹیاں قومی تمدن اور قومی
وایات کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ اور اگر کرتی بھی ہیں تو اسے حفاظت کے لائق نہیں بلکہ مٹا دینے

کے قابل سمجھتے ہیں۔ انھوں نے مذہب کو جو ہر قوم خصوصاً ہر ایشیائی قوم کی زندگی اور تعلیم کا مرکز ہونا چاہئے اپنے دائرے سے خارج کر دیا ہے اور اس کی طرف سے ایسی بے حسی پیدا کر دی ہے جو لامذہبی سے بھی بدتر ہے۔ انھوں نے ملکی زبانوں اور ان کے ادب کو اپنی محفل میں بار نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو اتنی ذلت اور تحقیر کے ساتھ جتنی اونچی ذات والے اچھوتوں کی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے علمی خزانوں کو کبھی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا بلکہ محض مغربی علوم کو پڑھنے اور پڑھانے کے قابل سمجھا اور وہ بھی مجتہدانہ نظر سے نہیں بلکہ محض سطحی اور تقلیدی طور پر۔ علمی تحقیق درکنار ان سے اتنا بھی تو نہ ہو سکا کہ جدید علوم کو اپنے ملک کی زبانوں میں منتقل کر دیتیں تاکہ لوگ عام طور پر ان سے فائدہ اٹھا سکتے۔ سیاسی آزادی اور معاشرتی اور معاشی اصلاح کی کوششوں میں رہنمائی کرنا ایک طرف انھوں نے ہمیشہ ارباب حکومت کے اشارے سے ان کوششوں کی مخالفت کی اور انھیں بے جا اور مضر ثابت کرنے کے لئے منطق کے گلے پر چھری پھیری۔

انفرادی پہلو سے دیکھئے تو یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے کل قوائے ذہنی کی تربیت کر سکے خصوصاً ان میں تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا مادہ پیدا کر سکے، ان کے ذوق جمال کی صحیح تربیت کر سکے اور ان کے آئینۂ اخلاق کو علم کی صیقل سے چمکائے۔ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ عموماً ان صفات سے خود ہی عاری ہوتے ہیں تا بہ دیگراں چہ رسد۔ تعمیری تنقید اور آزادی فکر کا یہ حال ہے کہ شاید ہی آج تک کسی یونیورسٹی کے پروفیسر نے کوئی کتاب لکھی ہو جس میں کسی علمی مسئلے میں مغربی علماء سے مدلل طور پر اختلاف کرنے یا اپنی طرف سے کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کی ہو۔ ذوق جمال کی کیفیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر حضرات کے کمرے ادنیٰ بازاری تصویروں سے آراستہ ہوتے ہیں اور سچے آرٹ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب رہا اخلاق تو وہ مذہب کے ساتھ ہی علم وفضل کے ان درباروں سے رخصت کر دیا گیا ہے اور ان کی خالص علمی فضا میں اس غیر علمی چیز کے لئے کہیں گنجائش نہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان حضرات کی تعلیم سے نوجوانوں کے انفرادی قوائے ذہنی کی نشو و نما پر کیا اثر پڑیگا۔

مجوز کی تقریر ختم ہونے پر خواجہ غلام السیدین صاحب تجویز کی تردید کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ بات کی تردید کے مختلف پہلو اور مختلف حد ہوتی ہے۔ مجھے جناب مجوز کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم ناقص ہے اور اصلاح کی محتاج ہے۔ اس کی خرابیاں مجھے غالباً جناب

مجوزہ زیادہ معلوم ہیں اور ان کی درستی کو میں بھی موصوف کی طرح ضروری سمجھتا ہوں مگر یہ مجھے تسلیم نہیں کہ ان کی تعلیم کا مجموعی نتیجہ ملک و قوم کے لئے مضر ہے۔ اس حد تک میں اس تجویز کا مخالف ہوں۔ مجموعی حیثیت سے کسی چیز کے حسن و قبح یا فائدے اور ضرر کے اندازے کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ معیار کمال پر رکھی جائے اور جب وہ اس پر پوری نہ اترے تو کھوٹی سمجھ کر یکسر رد کر دی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ زمانے کے لحاظ سے، امکانی صورتوں کے لحاظ سے، دوسری چیزوں کے مقابلے میں اس چیز کی قدر و قیمت کیا ہے اور پھر یہ کہ اس کے فوائد زیادہ ہیں یا نقصانات۔ موجودہ تعلیم جس زمانے میں شروع ہوئی وہ ہمارے ملک کے لئے انتہائی تنزل کا زمانہ تھا۔ ہماری پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ایک بیرونی قوم ہم پر حاکم ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں جو مشرقی تعلیم رائج تھی اس کا مجموعی حیثیت سے مضر ہونا اسی سے ثابت تھا کہ اس نے ہمیں ان دنوں کو پہنچایا۔ سارے ملک پر اس درجہ کم ہمتی اور مایوسی کا غلبہ تھا کہ ہمارے قدیم تہذیب و تمدن کے جو عناصر زمانے کی دستبرد سے بچ رہے تھے انھیں سنبھال کر رکھنے کا کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ ادھر باہر سے جدید مغربی تمدن کا سیلاب آرہا تھا اور خوف تھا کہ وہ سارے مشرق کو تہ آب کر دے گا۔ ایسی صورت میں کچھ تو حاکم قوم کی مصلحتوں سے کچھ محکوموں کی اپنی خواہش سے یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم کی بنیاد پڑی جس کا مرکز مغربی علوم کی تعلیم قرار دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بہترین صورت نہیں تھی مگر مشکل یہ ہے کہ سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں تھی۔ اس وقت سوال کشتی کے طوفان سے بچ کر پار لگنے کا نہیں تھا بلکہ محض اتنا تھا کہ کسی طرح وہ پانی پر قائم رہے۔

اب زمانہ بدلا ہے۔ ہمارے دل تنزل کے احساس اور ترقی کی آرزو سے بے چین ہیں۔ اگر سچ پوچھئے تو اسی ناقص تعلیم کا طفیل ہے۔ سقراط جہل کے احساس کو علم کا پہلا زینہ سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک تعلیم کا سب سے اہم مقصد یہی تھا کہ یہ احساس پیدا کیا جائے۔ یہ محض شاعری نہیں بلکہ گہرا فلسفیانہ نکتہ ہے۔ تنزل کا احساس تبھی ممکن ہے جب ترقی کا نصب العین نظر کے سامنے ہو۔ موجودہ تعلیم میں لاکھ خرابیاں ہوں مگر یہ بڑی خوبی ہے کہ اس نے خود اپنی خرابیوں کا احساس ہمارے دل میں پیدا کر دیا ہے۔ زندہ قوموں کے علوم اور ان کی زندگی کے مطالعے نے خواہ وہ کتنا ہی محدود ہو ہمارے دلوں میں زندگی کا حوصلہ پھر سے ابھارا ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اب رہی ہمارے مذہب و اخلاق اور ہماری قدیم معاشرت کی بربادی اس کی ذمہ داری موجودہ تعلیم پر نہیں بلکہ اس گھن پر ہے جو ہماری زندگی کو پہلے

سے لگ گیا تھا اور جس کے دور کرنے میں موجودہ تعلیم حائل نہیں ہوتی بلکہ مدد دیتی ہے۔

خواجہ صاحب کی پر مغز تقریر کے بعد ڈاکٹر سید احمد صاحب بریلوی، سید تجمل حسین صاحب، مولوی نور الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر عبد العلیم صاحب اعزازی سب نے تجویز کی تائید میں دلچسپ تقریریں کیں خصوصاً سید تجمل حسین صاحب نے اپنے ظریفانہ چٹکلوں سے محفل کو کشت زعفران بنا دیا۔ افسوس ہے کہ خواجہ صاحب کو سارے مجمع میں کوئی تائید کرنے والا نہ ملا۔ اس اثنا میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ناسازی مزاج کے باعث تشریف لے گئے تھے اور یوں بھی چونکہ مخالف کی تقریر کے بعد کل تقریریں انکی تائید میں ہوئی تھیں اس لئے جواب کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے جناب صدر نے معزز مقرروں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جلسہ برخاست کر دیا۔ عام اصول کے خلاف لوگوں سے تجویز کے متعلق رائیں نہیں لی گئیں کیونکہ اکادمی نے اپنے مباحثوں کا مقصد کسی کی فتح اور کسی کی شکست قرار نہیں دیا ہے بلکہ یہ کہ زیر بحث مسئلے کے ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے اور سامعین کو بطور خود اس پر غور کرنے کی تحریک ہو۔

مباحثے کے دوران میں اور اس کے بعد اکثر حاضرین نے اس قدر جوش اور انہماک ظاہر کیا کہ اب اکادمی کے کارکنوں کا ارادہ ہے کہ ممکن ہو تو سال میں دو تین جلسے اس قسم کے منعقد کیا کریں۔ اگر اکادمی کے اراکین میں سے کوئی صاحب آیندہ اگست کے بعد آخر ستمبر یا اکتوبر میں کسی مسئلے پر کوئی تجویز پیش کر کے مباحثے کا آغاز کرنا چاہتے ہوں تو براہ کرم ناظم اکادمی کو اپنے نام نامی سے اور اپنی تجویز سے مطلع فرمائیں۔

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب بی اے (آکسن)

نی

ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد [illegible] بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۲ء نمبر ۵

فہرست مضامین

مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر	مولانا اسلم جیراجپوری	۳۹۴
اناطول فرانس کا فلسفۂ زندگی	... ...	۴۱۳
ادب الجاحظ	رئیس احمد صاحب جعفری ندوی متعلم جامعہ	۴۱۹
عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں	عبدالحلیم صاحب ندوی متعلم جامعہ	۴۴۶
[illegible]	خواجہ منظور حسین صاحب متعلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۶۱
[illegible]	اڈیٹر	
[illegible]	ذ۔ح	۴۷۳
اسلامی ممالک	ل۔ل	۴۷۸
ہندوستان	ن۔ا	۴۸۲
[illegible]	[illegible]	۴۷۹

[illegible] دفتر رسالہ "جامعہ" [illegible] سے شائع کیا

مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر

انتظام

ملوک قدیم کے زمانہ میں مصر کی جو انتظامی حالت تھی اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہو سکا بجز اس کے کہ وہاں زمین کی ملکیت کا دستور تھا اور زیادہ تر زمینیں کاہنوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے قبضہ میں تھیں جو کاشتکاروں اور فلاحوں سے پیداوار کا ایک بڑا حصہ لیتے تھے۔ عمالقہ کے عہد میں جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے وزیر ہوئے اور فرعون ابوفیس نے ان کے لئے اپنی کرسی سے صرف چار انگل چھوٹی کرسی بنوائی اور اس پر ان کو بٹھا کر ملک کے سیاہ وسفید کا پورا اختیار دیدیا تو انھوں نے قحط کے سات سالوں میں زمینداروں کے ہاتھوں سے جملہ زمینیں خریدلیں۔ پھر ان کو بقدر مناسب اس شرط پر جوتنے کے لئے دیدیں کہ پیداوار کا پانچواں حصہ حکومت لیا کرے گی۔

غالباً اسی عہد سے ملک مصر کی اراضی سرکاری قرار پاگئی اور بادشاہ اور رعایا کے درمیان سے زمینداروں کا طبقہ اٹھ گیا بجز ان امرا کے جن کو سلاطین کسی خدمت یا خوشنودی کے صلہ میں کوئی قطعۂ زمین انعام یا جاگیر میں دیدیں۔

چونکہ مصر کی سرزمین نہایت زرخیز ہے اس لئے وہاں کی خوشحالی کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ مسیح سے تیس سال قبل جب سے رومیوں نے وہاں قبضہ کیا وہ اس کی پیداوار کا ایک اچھا حصہ اپنے ملک کو لیجانے لگے۔ انھوں نے مصریوں کو حکومت میں بھی کوئی حصہ نہیں دیا اور ان کی ہر چیز، باغ، مویشی، اثاث البیت یہاں تک کہ راستہ سے گزرنے والوں اور قبرستان میں جانے والے مردوں سب پر محصول لگادیا۔ ان وجوہ سے مصری محتاج اور مفلوک ہوگئے اور ان کی ساری علمی اور تاریخی شان جاتی رہی۔

عمرو بن عاص نے جب مصر کا انتظام کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے باشندوں کی دلجمعی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان کو ان کی جان ومال، اولاد، آبرو، دولت اور تجارت ہر چیز کی حفاظت کا پورا اطمینان

دلایا۔ مذہب اور رسوم میں آزادی بخشی۔ جملہ ظالمانہ قوانین اور ناجائز محصول موقوف کئے۔ خراج کی تشخیص اور تحصیل کے لیے خود واقف کار اور معتبر قبطیوں کو مقرر کیا اور جا بجا عدالتیں قائم کر دیں۔

ملک مصر کی کیفیت کے متعلق انھوں نے دربار خلافت میں ایک تحریر بھیجی تھی جو اب تک اہل ادب میں مشہور ہے۔ فرانسیسی ادیب موسیو اوکتاف اوزاں نے تو اس کو بلاغت کا ایک حیرت انگیز نمونہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ معمورۂ عالم کے جملہ مدارس میں اس کو پڑھانا چاہیے تاکہ طلبار کو اشیار کی حقیقت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ گبن اور ٹیلر نے بھی اپنی اپنی تاریخوں میں اس کے ترجمے درج کئے ہیں۔ ہم اس کو اردو میں نقل کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ میں وہ لطافت جو اصل میں ہے نہیں دکھائی جا سکتی صرف مضمون کا اظہار ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

مصر کی زمین سیر حاصل اور باردار درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کا طول ایک ماہ اور عرض دس روز کی مسافت ہے۔ اس کے بیچ میں سے وہ دریا گذرتا ہے جس کی خرام سحری فرخ فرجام اور روانی شام مبارک انجام ہے۔ اس کے فیضان میں مہر و ماہ کی طرح کبھی زیادتی ہو جاتی ہے اور کبھی کمی۔ جس وقت چڑھتا ہے اور اس کی موجیں سر اٹھاتی ہیں اس وقت تمام چشمے اور نہریں لبالب ہو جاتی ہیں اور باشندوں کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے آنے کے لیے بجز کشتی کے کوئی سبیل نہیں رہتی۔ پھر جب اس کا جوش پورا ہو چکتا ہے تو پلٹا کھاتا ہے اور تیزی کے ساتھ اتر کر اپنی حد پر آجاتا ہے۔ اس وقت کاشتکار اس کے ساحلوں کے فراز اور دامنوں کے نشیب میں نکل پڑتے ہیں۔ دانے بوتے ہیں اور خرمن کے آرزومند ہوتے ہیں۔

جب دانے جمے اور کھیتیاں اگیں اور نیچے زمین کی نمی اور اوپر بارش کی تری سے پرورش پا کر انھیں نشو و نما اور بالیدگی ہوئی تو ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگتے ہیں اور زمین کی دولت اس کے شکم سے اس کی پشت پر آجاتی ہے۔

امیرالمومنین! میں اس زمین کا کیا حال لکھوں۔ ابھی گوہر سپید ہے، ابھی عنبر سیاہ اور ابھی

جز یہ قدرت الٰہی کے کرشمے ہیں جس نے اس میں ایسی صلاحیت رکھدی اور باشندوں کی معیشت کے لئے اس کو ایسا بنا دیا۔

حضرت عمر اس کو پڑھ کر شگفتہ ہوئے اور فرمایا کہ ابن عاص نے تو گویا مصر کی سرزمین میری آنکھوں کے سامنے رکھدی۔

فراعنہ کے عہد سے مصر میں چہار سالہ بندوبست کا دستور تھا۔ وہ چند سالوں کی پیداوار کا اوسط نکال کر تشخیص لگان کیا کرتے تھے اور نقد و جنس دونوں میں وصول کرتے تھے۔ رومی اپنے عہد میں خراج کے علاوہ فوج کے لئے غلہ بھی وصول کرنے لگے۔

لیکن مصر ایک ایسا ملک ہے جس کی زراعت کا دارومدار نیل کے فیضان پر ہے اور اس کے مدارج میں ہر سال تفاوت رہتا ہے جس سے پیداوار میں بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ چند سالوں کی پیداوار کو دیکھ کر ممکن ہے کہ حکومت کوئی اوسط متعین کرے مگر نادار کاشتکار تو اپنے مصارف کو اس اوسط کے مطابق سالوار نہیں تقسیم کر سکتا۔ اس لئے وہاں ہر سال آب نیل کی کمی یا زیادتی کے مطابق خراج کی تعیین قرین انصاف ہے۔ اسی بنا پر عمرو بن عاص نے خلیفہ کو لکھا کہ:۔

> مصر کی زراعت کا انحصار نیل کے فیضان پر ہے۔ میں نے اچھی طرح تحقیق کر لیا ہے کہ اس کا چڑھاؤ جب ۱۴ ذراع تک پہونچ جاتا ہے تو خشک سالی نہیں رہتی اور ۱۶ ذراع میں سارا ملک سیراب ہو جاتا ہے اور اس قدر پیداوار ہوتی ہے کہ دوسرے سال کے لئے بھی کافی ہو سکے۔ نیچے اور اوپر کی دو حدیں جو خوفناک ہیں وہ ۱۲ اور ۱۸ ہیں۔ ۱۲ میں قحط رہتا ہے اور ۱۸ میں طوفان سے فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

حضرت عمر نے حکم بھیجا کہ پانی کا چڑھاؤ معلوم کرنے کے لئے مقیاس بنواؤ۔ چنانچہ انھوں نے حلوان میں مقیاس النیل بنایا جو آج تک قائم ہے۔ اس وقت سے مصر میں یہ قانون چلا آتا ہے کہ جب تک پانی ۱۶ درجہ پر نہ پہونچ جائے اس وقت تک عمال حکومت رعایا سے مالگزاری تحصیل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ جس دن نیل کی طغیانی سولھویں درجہ پر پہونچتی ہے اس دن بہت بڑا میلہ وفاء النیل

کے نام سے لگتا ہے۔ مقیاس پر قاضی القضاۃ آکر شہادتوں کے بعد اپنے دستخط اور مہر ثبت کرتا ہے جس کے بعد سلامی کی توپیں سر کی جاتی ہیں۔

اسی پیمانہ سے پیداوار کا اندازہ لگا کر تشخیص لگان کی جاتی ہے جس کے لئے ہر ہر پرگنہ سے آزمودہ کار فلاح بلائے جاتے اور فصل اور پیداوار کا اندازہ پوچھ کر انھیں سے لگان کا تخمینہ لیا جاتا جس کے حساب سے تحصیل کی جاتی۔ جہاں کنیسے اور حمام ہوتے ان کے اخراجات نیز مسلمانوں کی ضیافت کے لیے صرفے جو منزلوں میں مقرر تھے منہا کئے جاتے۔

کاشتکاروں کی شرح لگان کی مقدار سے پیشہ وروں سے بھی ان کی آمدنی پر خراج لیا جاتا۔ اس کے علاوہ اور جتنے محاصل تھے سب یک قلم موقوف کر دئے گئے۔

خود حضرت عمر نے بھی قبطی رؤسا کو بلا کر بندوبست اراضی اور تحصیل مالیہ کے متعلق مشورے کئے اور ان کے مطابق ہدایات بھیجیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ہاجرہ کے قدیم رشتہ کی وجہ سے جو حضرت اسماعیل کی والدہ تھیں عربوں کو مصریوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی تھی۔ چنانچہ بندوبست میں خصوصیت کے ساتھ وہاں نرمی برتی گئی اور شرح لگان کم سے کم رکھی گئی۔

مسلمانوں نے آنحضرت کے جدید رشتہ کا بھی لحاظ رکھا اور قریۂ حفن کو جو ضلع انصنا میں ہے جہاں کی رہنے والی حضرت ماریۂ قبطیہ سریہ رسول تھیں خراج سے بری کر دیا۔

اس سالانہ بندوبست کی وجہ سے ہر سال کی وصولی کی کوئی رقم متعین نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ عدم پیداوار کی وجہ سے کبھی کبھی بعض پرگنوں اور دیہاتوں کا خراج معاف کر دینا پڑتا تھا اس لئے رومیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی وصولی میں کمی ناگزیر تھی۔ چنانچہ سال اول میں تمام ملک مصر سے ایک کروڑ بیس لاکھ دینار وصول ہوئے۔

حضرت عمر کو معلوم تھا کہ مقوقس نے پچھلے سال دو کروڑ دینار وصول کئے تھے اس بنا پر انھوں نے عمرو بن عاص سے باز پرس کی لیکن جب خراج کی تشخیص اور نوعیت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جواب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ رومیوں کی ایک تو شرح لگان زیادہ تھی دوسرے انھوں نے بہت سے ناجائز ضرائب

بن عاص ان دونوں کو گوارا نہیں سکتے تھے۔

باوجود اس نرمی کے زمانۂ مابعد میں کبھی اس قدر وصولی نہیں ہوئی۔ صرف خلیفۂ ثالث کے یں عبداللہ بن سعد نے ایک سال دو کروڑ دینار وصول کئے تھے جس پر حضرت عثمان نے فخریہ عمرو بن عاص سے کہا کہ اونٹنی نے زیادہ دودھ دیا۔ بولے کہ ہاں لیکن اس کا بچہ بھوکا رہا۔

امیر معاویہ کے سلیقۂ انتظام میں کس کو شک ہے مگر ان کے عہد میں تحصیل ۹۰ لاکھ سے آگے نہ بڑھی اور ان کے بعد بنی امیہ نیز بنی عباس بھی چالیس بلکہ تیس لاکھ سالانہ وصول کرتے رہے۔ خلفاء فاطمیہ نے اپنے زمانہ میں بہ نسبت سابق کے شرح لگان دگنی کر دی تھی لیکن پھر بھی ۴۳ لاکھ سے زائد نہ وصول کر سکے۔

اس زمانہ میں اگرچہ ملک مصر کی سالانہ آمدنی ڈھائی کروڑ پاؤنڈ سے بھی زیادہ ہے مگر اس کا بڑا حصہ ریلوے، ڈاکخانہ اور آبکاری وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین کی مالگزاری ۶۰ لاکھ گنی سے زائد نہیں ہے۔

عمرو بن عاص نے مصر سے عرب کے ساتھ غلہ کی تجارت کے لئے ایک نہر دریائے نیل سے نکال کر بحیرۂ قلزم میں ملا دی۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ قدیمی نہر تھی جس کو بادشاہ سیتی اول (خاندان ۱۹) نے کھدوانا شروع کیا تھا اور بادشاہ نکاؤ (خاندان ۲۶) نے اس کی تکمیل کی تھی۔ رومیوں کے عہد میں یہ بالکل خراب ہو گئی تھی مگر نشانات باقی تھے۔ عمرو بن عاص نے فسطاط کے کنارہ سے اسی نشان کے مطابق کھدوانا شروع کیا اور عین شمس اور وادی طمیلات سے لاکر شہر قلزم کے متصل بحیرہ میں گرا دیا۔

یہ نہر ۶ مہینہ کے عرصہ میں ۲۳ھ میں حضرت عمر کے عہد میں تیار ہو گئی تھی۔ اسی وقت سے غلہ مصر سے عرب میں آنے لگا۔ عہد بنی امیہ میں والیوں کی غفلت سے اس کی مرمت نہ ہوئی اور جا بجا ریتا اٹ گیا یہاں تک کہ بالکل بند ہو گئی۔ اس کے نشانات کہیں کہیں باقی تھے مگر ۱۸۹۵ء میں مصری حکومت نے ان کو پاٹنے کا حکم دے کر ان کو مٹا دیا۔

عمرو بن عاص نے نہر سویز کھودنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ چاہتے تھے کہ فرما کے متصل جہاں

بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم میں صرف ۵۰ میل کا فاصلہ رہجاتا ہے کاٹ کر دونوں کو ملادیں۔ مگر حضرت عمر نے روک دیا اور لکھا کہ رومی اس راستے سے عرب پر حملہ کرنے لگیں گے۔ اس وجہ سے باز رہے۔

حضرت عمرو بن عاص نے انتظام کا جو طریقہ مصر میں قائم کیا تھا زمانۂ مابعد میں بھی کم و بیش وہی چلا آیا۔ عہد عباسیہ اولیٰ میں البتہ والیوں کی جلد جلد تبدیلی کی وجہ سے ابتری رہی۔

شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ ہارون رشید نے کہا کہ اس ضد پر کہ فرعون نے ملک مصر کے گھمنڈ پر خدائی کا دعویٰ کیا تھا میں اپنے ادنیٰ ترین غلام کو وہاں کی حکومت دونگا۔ چنانچہ ایک حبشی کو جس کا نام خصیب تھا والی بناکر بھیجدیا۔ اس کی عقل کا یہ حال تھا کہ فلاحوں نے ایک بار آکر شکایت پیش کی کہ ہم نے روئی کی کاشت کی تھی وہ پانی کی کثرت سے ضائع ہوگئی تو اس نے کہا کہ تم کو اُون بونا چاہیئے تھا کہ خراب نہ ہوتا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعرانہ قصہ ہے۔ صورت یہ تھی کہ عباسیہ کے عہد میں مصر کی ولایت کسی وزیر کے سپرد ہوئی تھی جو اپنی طرف سے ایک کارندہ وہاں رکھتا تھا۔ ہارون کے زمانہ میں مصر کی ولایت اس کے وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے آخر عہد میں خصیب بن عبدالحمید مصر میں امیر خراج تھا لیکن نہ وہ حبشی تھا نہ احمق بلکہ مورخین لکھتے ہیں کہ نہایت متقی اور عاقل تھا جس سے اہل مصر خوش تھے اور جس کے نام پر آجتک وہاں ایک قصبہ منیۃ الخصیب آباد ہے۔

خوش قسمتی سے مصر کو تھوڑے تھوڑے زمانہ کے بعد اچھے اچھے مدبر اور منتظم ملتے گئے جس کی وجہ سے ہر خزاں کے بعد اس میں بہار آتی رہی۔ ان لوگوں کے نام اب تک اہل مصر عزت اور محبت کے ساتھ لیتے ہیں۔

عباسیہ کے عہد میں احمد بن طولون ان کا غلام مصر کا حاکم تھا۔ اس نے مرکز یعنی بغداد کی ابتری اور بدنظمی کی وجہ سے ۲۶۴ھ میں اپنی خودمختاری کا علم بلند کردیا اور اپنے حسن انتظام سے مصر کی حالت ایسی درست کی کہ رعایا خوشحال اور فارغ البال ہوگئی جس کی وجہ سے اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی کہ دربار خلافت نے رومیوں کے مقابلہ کے لیے شام کی ولایت کا فرمان بھی اس کے نام لکھدیا۔

۔ دو بار بڑے بڑے پرانے دفینے بھی ملے۔ ایک سے عالیشان جامع تیار کرائی
ت اب تک باقی ہیں اور دوسرے سے ایک شفاخانہ تعمیر کرایا۔ غربا کے مفت معالجہ
یے اطبا ملازم رکھے اور عمارات اور دوکانیں بنوا کر اس کے خرچ کے لئے وقف کیں۔

اخشیدی خاندان کے آخر میں ان کا غلام کافور ۳۵۵ھ میں تخت مصر پر آگیا۔ یہ بھی منتظم اور مصلح تھا۔ عرب کا مشہور شاعر متنبی سیف الدولہ کا دربار چھوڑ کر اس کے پاس آگیا تھا اور اس کی مدح میں قصیدے لکھتا تھا۔ اس کے زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مصر میں کسی واعظ نے اپنے وعظ میں کہا کہ دنیا کی خواری دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے لوگوں کو اس کا مالک بنا رکھا ہے بغداد میں معزالدولہ دیلمی ہے وہ لولا ادر مصر میں کافور اخشیدی ہے وہ خصی۔

یہ بات کافور تک پہونچی ہنسا اور اس واعظ کو بلا کر کچھ رقم دیدی جس کے بعد وہ اپنے وعظوں میں کہا کرتا تھا کہ حام کی اولاد میں سے تین ہی شخص کامل نکلے ایک لقمان حکیم، دوسرے حضرت بلال مؤذن رسول اللہ، تیسرے موالی کافور اخشیدی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ۔

فاطمی خلفاء کے عہد میں حروب صلیبی اور نیز اندرونی خلفشاروں کی وجہ سے جب انتظام میں سخت ابتری پڑ گئی تھی مستنصر باللہ کے وزیر بدر جمالی متوفی ۴۸۷ھ نے اپنے حسن انتظام سے پھر مصر کی حالت سنبھالی اور تجارت اور زراعت کو فروغ دے کر ملک کو مالا مال اور رعایا کو خوشحال کر دیا۔
اسی بدر جمالی کے بیٹے افضل امیر الجیوش نے عسقلان سے امام حسین علیہ السلام کے سر مبارک کا مشہد مصر میں منتقل کیا اور اس پر ایک جامع تعمیر کرائی۔

فاطمیہ کے انقراض کے بعد سلطان صلاح الدین کے عہد میں بھی مصر میں رفاہیت رہی لیکن یہ اس کے وزیر بہاء الدین اسدی کا کارنامہ تھا جس نے ایک طرف رعایا کو خوش رکھا اور دوسری طرف سلطان کو ورنہ صلاح الدین نے تو اپنی زندگی کا بڑا حصہ صلیبیوں کے مقابلہ میں گزارا۔ اس کو انتظام ملک کی فرصت کہاں تھی۔ اس نے صرف ایک قلعہ قاہرہ کے متصل اپنی سکونت کے لئے بنوایا تھا جو اس وقت موجود ہے اور مصر کے کل قلعوں سے زیادہ سنگین اور موقع کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔

ایوبی خاندان کے بعد ممالیک بحری میں سے ملک ظاہر بیبرس بڑا مدبر اور شجاع گزرا ہے جس نے
لک کے انتظام کو بھی ٹھیک رکھا اور ایک طرف صلیبیوں اور دوسری طرف تاتاریوں کو نکالا۔
ممالیک کے بعد جب ترکی پاشاؤں کی بدتدبیری سے مصر کا حال تباہ ہو رہا تھا اس وقت
مد علی پاشا نے اس کی حالت درست کی اور بالآخر اپنی دولت اور قوت اس قدر بڑھائی کہ باب عالی
سے استقلال مصر کا نسلاً بعد نسل فرمان حاصل کر لیا۔ چنانچہ ابتک مصر کی حکومت اسی کے خاندان میں
ہے۔ اُسی کے پوتے خدیو اسماعیل پاشا نے اپنی فضول خرچیوں کی بدولت قرضے لئے جن کی ضمانت
کے لئے انگریزوں نے مالیہ میں مداخلت کی۔ احمد عربی پاشا نے اس بیرونی مداخلت کی مخالفت شروع
کی جس کے اوپر ہنگامہ ہوا اور آخر کار انگریزی فوجوں نے ۱۸۸۲ء میں داخل ہو کر وہاں تسلط جما لیا۔
وطنی جماعت نے مصطفےٰ کمال پاشا اور فریدبے وغیرہ کی قیادت میں آزادی کی جد وجہد شروع کی جو
آج تک جاری ہے لیکن ابھی وہ دن قریب نہیں دکھائی دیتا۔
مصر کی زمین زرخیز ہے۔ فراعنہ کی دولت اور ثروت کی شہادت نہ صرف تاریخوں بلکہ ان کے آثار
اور دفینوں سے بھی ملتی ہے جو زیر زمین سے کبھی کبھی برآمد ہوتے ہیں۔ قارون جس کے خزانوں کی کثرت
کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے مصر کا ایک معمولی عہدہ دار تھا یعنی مہتمم جنگلات۔
اسلامی عہد میں بھی جب کبھی مصر کو استقلال نصیب ہو گیا اس کی وہی دولت اور ثروت عود
کر آئی۔ چنانچہ ابن طولون کی خود مختاری کے بعد اس کے بیٹے خمارویہ کی دولت و ثروت اور شان و
شوکت مصر کے کسی قدیم بادشاہ سے کم نہ تھی۔ اس کے محل کی دیواریں لاجورد محلول اور طلا اور مختلف
قسم کی چوبی تصویروں سے آراستہ تھیں۔ دربار اس عظمت و جلال کا تھا کہ داخل ہونے والے کے ہوش
اڑ جاتے تھے۔ علاوہ دیگر سامان سطوت و جبروت کے زندہ شیر اور چیتے بھی اس کے اطراف میں بندھے
ہوئے رکھے جاتے تھے۔
اس کی خوابگاہ بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک حوض پارہ سے بھر کر اس کے دونوں کناروں
پر چاندی کے کڑوں میں ریشم کی ڈوریاں باندھی گئی تھیں اور ان پر ایک چرمی گدا ہوا سے بھرا ہوا

ڈال دیا گیا تھا جس کے اوپر وہ سوتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ اس کو کم خوابی کی شکایت تھی طبیب نے بتلا
کہ جس سے نیند آجائے گی۔ اس نے کہا کہ میری طبیعت گوارا نہیں کرسکتی کہ میرے بدن پر کوئی ہاتھ لگے
اس لئے یہ صورت اختیار کی گئی کیونکہ پارہ کی وجہ سے بستر برابر حرکت کرتا رہتا ہے جس سے نیند آجاتی تھ

اس نے اپنی بیٹی قطر الندیٰ کی شادی بغداد کے خلیفہ معتضد باللہ کے ساتھ کی تھی۔ اس کو جہیز
میں اس قدر ساز و سامان دیا تھا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں۔ جوڑوں کی قیمت کا اندازہ کچھ اس سے
ہو سکے گا کہ ایک ہزار ازار بند تھے جن کا صرفہ بارہ ہزار دینار تھا۔ رخصتی کے وقت مصر سے بغداد تک
ہر ہر منزل پر اپنے محل کے مشابہ ایک ایک قصر تعمیر کرا کے آلات و فروش سے آراستہ کرا دیا تھا تاکہ مص
سے بغداد تک عروس اپنے باپ ہی کے گھر میں قیام کرتی ہوئی جائے۔ آغاز محرم ۲۸۲ھ میں اس ک
داخلہ بغداد میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہوا۔

اسی طرح فاطمیہ جن کی خلافت مصر میں تھی ان کی دولت و ثروت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ان
کے ایک وزیر امیر الجیوش نے مرنے کے وقت جس قدر دولت چھوڑی تھی اس میں علاوہ بے شمار ساز و
سامان کے ابن خلکان کے قول کے مطابق ساٹھ کروڑ دینار نقد تھے اور پانچ سو صندوق خاص اس
کے پہننے کے کپڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔

آخری خلیفہ فاطمی عاضد باللہ کے قصر پر اس کی وفات کے بعد جب سلطان صلاح الدین نے
قبضہ کیا ہے تو اس کے امتعہ و اموال کی فہرست سے تاریخ کے صفحات تنگ نظر آتے ہیں۔ زر و جواہ
کے علاوہ تقریباً دو لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے بہت سی آج جرمنی میں موجود ہیں۔

اگر خدیو اسماعیل نے اپنی فضول خرچیوں سے مصر کو قرضہ میں مبتلا نہ کیا ہوتا تو آج وہ عالم اسلامی
کا ایک عظیم الشان خزانہ ہوتا۔

علوم

مصری تہذیب مورخوں کے نزدیک دنیا کی قدیم تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ان میں علوم و
فنون کا ذوق آغاز عہد سے تھا۔ چنانچہ پہلے ہی خاندان کے ایک بادشاہ تتا نے طب کا ایک رسالہ

ماتھا۔ دوسرے خاندان کے بادشاہ استنس نے اس کی تکمیل کی۔ خاندان سوم کے بادشاہ نبکانے بھی ب کے کچھ نوشتے چھوڑے تھے جو پہلی صدی عیسوی تک رائج رہے۔ اس نے فن کتابت اور سنگ تراشی بھی ترقی دی تھی۔ خاندان چہارم کے بادشاہ اسکاف کو ہندسہ سے بہت ذوق تھا۔ اس نے آلات ہندسی بنائے تھے۔

ان علوم کے علاوہ شعبدہ، کہانت اور سحر میں بھی مصری فائق تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ انیسویں اندان کے عہد میں جس زمانہ میں کہ حضرت موسیٰؑ کی بعثت ہوئی سحر کا اس قدر چرچا تھا کہ سال میں ایک ن مقرر تھا جس میں جادوگروں کا جلوس نکلتا تھا۔ کوئی شیر پر سوار ہو کر چلتا، کوئی آتش فشاں اژدہے پر اور کوئی جلتے ہوئے شعلوں میں۔ شہر کے لوگ اس دن خوف سے اپنے دروازے بند رکھتے تھے ر کوٹھوں اور چھتوں پر سے تماشا دیکھتے تھے۔ ان جادوگروں کو جو کسی ایک ستارہ کی سات سال پوجا ر چکے ہوں شاہی دربار میں اعزاز ملتا تھا اور جو ساتوں ستاروں کی سات سات سال پرستش کر لیتے تھے ن کو فرعون اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا۔

چھبیسویں خاندان کے عہد میں جب مصر میں بڑے مدارس قائم ہوئے اس وقت طب، ہندسہ، ہیئات اور نجوم کے علاوہ فلسفہ اور علم الاصنام کی بھی تعلیم ہونے لگی۔ یونانی قبضہ کے بعد سے تو اسکندریہ علوم امرکز ہو گیا تھا۔ ارسطو اسی شہر میں درس دیتا تھا۔

فنون تعمیر و سنگ تراشی و تمثال گری میں ان کو جو مہارت تھی اس کی شہادت ان کے آثار سے ملتی ہے۔

رومیوں نے اپنے زمانہ میں مصریوں کے قدیم علوم و فنون کی کتابیں جلا ڈالیں بعض عیسائی مورخوں نے دینی تعصب کی وجہ سے اس کا الزام مسلمانوں پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ عمرو بن عاص نے فتح کے بعد اسکندریہ کے عظیم الشان کتب خانہ کو خلیفہ اسلام کے حکم سے جلا دیا۔

لیکن دراصل یہ محض افترا اور بہتان ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے اسی عنوان سے ایک رسالہ

لکھ کر اس الزام کی اچھی طرح تردید کر دی ہے بلکہ ان سے پہلے ہی جس وقت یہ مسئلہ بساط بحث پر آیا اسی وقت خود یورپ کے محقق مورخوں شلاً گبن، بٹلر، سدیو اور گستاؤلی بان وغیرہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا اور اس کے تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔

ڈاکٹر بٹلر لکھتا ہے کہ فتح اسلامی کے وقت اس کتب خانہ کا وجود ہی نہ تھا کیونکہ یہ پہلی بار قیصر جولیس کے حملہ میں ۴۸ء میں جل چکا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ جو کتابیں جمع ہوئیں وہ اسقف زوفیل کے حکم سے ۳۹۱ء میں جلا دی گئیں۔

جب سے مصر میں مسلمان پہونچے اور وہاں کے قبیلے کے قبیلے اور خاندان کے خاندان اسلام میں داخل ہونے لگے اس وقت سے وہاں اسلامی علوم کا دور شروع ہوا۔ حضرت عمرو بن عاص کے ساتھ جو جماعت گئی تھی ان میں کم سے کم دو سو صحابۂ کرام تھے جن میں سے حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے، ابوالدرداء، حاطب بن بلتعہ اور عبادہ بن صامت وغیرہ اہل بدر میں سے، کم سے کم ستر آدمی بیعت رضوان کے شرکاء میں سے نیز عبداللہ بن عمر اور حارث بن عباس وغیرہ سادات قریش اور ثوبان اور ابورافع خادمان رسول اللہ بھی تھے۔

ان حضرات میں سے اکثر ایسے تھے جن کے پاس لوگ جمع ہوتے اور قرآن کی آیات اور آنحضرتؐ کے حالات سنتے۔ اس طرح تفسیر اور حدیث کا سلسلہ رائج ہو گیا اور جا بجا اس کے حلقے قائم ہو گئے۔ ۹۲ھ میں جب خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے حکم اور ابن یربوع فزاری کی کوشش سے مصر کا دفتر حکومت عربی میں منتقل ہو گیا اس وقت سے اہل مصر عربی زبان حاصل کرنے لگے اور اسلامی علوم بھی۔ دوسری صدی ہجری کے آخر میں وہاں لیث بن سعد جیسے امام ہوئے جن کو خلیفہ منصور عباسی نے مصر کی ولایت دینی چاہی مگر قبول نہ کی۔ امام شافعی بھی پہونچکر وہیں سکونت گزیں ہو گئے اور زید بن ابی حبیب اور دیگر ائمہ نے شہرت پائی اور فسطاط اسلامی علوم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

۳۵۸ھ میں جب فاطمیہ کے غلام اور مصر کے فاتح جوہر نے قاہرہ اور اس کے ساتھ جامع ازہر تعمیر کی تو اس میں علوم اسلامی کا درس شروع ہوا۔ زمانہ مابعد میں اس مدرسہ نے بہت ترقی کی۔ سلاطین

دلوک مصر نے خصوصیت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی اور اس پر بڑے بڑے اوقاف کئے۔ چنانچہ آج تک یہ مدرسہ قائم ہے اور غالباً دنیا کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ اس کے طلباء کی تعداد کم وبیش پندرہ ہزار رہتی ہے جس میں ہر ملک اور ہر قوم کے مسلمان شامل رہتے ہیں۔ یہاں کی تعلیم قدیم اصول اور نصاب کے مطابق ہے لیکن مفتی محمد عبدہ مرحوم کی کوشش سے اصلاحات کا بھی اس میں دخل ہو گیا ہے جس سے امید ہے کہ یہ مدرسہ زمانہ کا ساتھ دے سکے گا۔

حاکم بامر اللہ خلیفہ فاطمی نے پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں بغداد کے بیت الحکمۃ کے مقابلہ پر اپنے قصر کے ساتھ دار الحکمۃ تعمیر کرایا جس میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ یہاں ہر شخص کو مطالعہ کے لیے کتابیں ملتی تھیں اور نقل لینے والوں کو سامان کتابت بھی دیا جاتا تھا۔

ایوبی خاندان کے عہد میں مدرسہ صلاحیہ سلطان صلاح الدین کا مدرسہ کاملیہ ملک کامل کا اور مدرسہ صالحیہ ملک صالح نجم الدین کا خاص طور پر مشہور ہوا۔ ان میں وہ لوگ درس دیتے تھے جو اپنے اپنے زمانوں کے امام تھے اور کل اسلامی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ لوگ دور دراز سے سفر کر کے ان میں علوم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔

ممالیک کے عہد میں مدرسہ ظاہریہ ملک ظاہر بیبرس کا اور مدرسہ منصوریہ وناصریہ خاندان قلاؤون کے اسلام کے مشہور مدارس تھے۔

علماء مصر نہ صرف اپنی علمی قابلیت بلکہ تقوے اور عمل کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں علامہ اسکندرانی ابن دقیق العید اور عز الدین بن عبد السلام جیسے لوگ ہم کو وہاں دکھائی دیتے ہیں جن کی نظیر سے دوسرے اسلامی ممالک اس وقت قاطبۃً خالی نظر آتے ہیں۔

شیخ عز الدین کا یہ واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ ایوبی خاندان کے آخری زمانہ میں جبکہ وہ مصر کے قاضی تھے ملک صالح نے بہت سے غلام خریدے تھے جن کے ہاتھوں میں سلطنت کی نہ صرف وزارت اور سپہ سالاری بلکہ تقریباً جملہ مناصب وامارات تھیں۔ چنانچہ آخر میں وہی حکمران بھی ہو گئے۔ قاضی

عزالدین کے نزدیک کسی مقدمہ کی شہادت کے دوران میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ یہ ممالیک جن کو سلطان نے مسلمانوں کے بیت المال سے خرید کیا ہے آزاد نہیں کئے گئے ہیں۔ اسی وقت انھوں نے اعلان کرایا کہ ان کے جملہ خود مختارانہ تصرفات از قسم بیع و شرا و نکاح و طلاق وغیرہ بوجہ عدم حریت ناجائز ہیں اور ان کو حکم بھیجا کہ عدالت میں حاضر آئیں۔

ممالیک نے جب یہ سنا تو قیامت برپا ہوگئی۔ نائب السلطنت نے غضبناک ہوکر کہا کہ ہم روئے زمین کے ملوک ہیں قاضی کی کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے دم مار سکے۔ قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مارونگا۔ یہ کہہ کر اپنے اعوان کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر چلا۔ سب کے سب غصہ میں بھرے ہوئے اور ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے۔ جب ان کے گھر کے پاس پہونچے تو قاضی مذکور کا لڑکا دیکھ کر سہما ہوا اندر بھاگا اور باپ کو اطلاع کی۔ انھوں نے بے پروائی سے کہا کہ تیرے باپ کا یہ رتبہ کہاں کہ اس کا خون راہ حق میں بہایا جائے۔ یہ کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔ نائب السلطنت کی نگاہ جب ان کے اوپر پڑی تو جلال حق سے کانپنے لگا۔ تلوار ہاتھ سے گر گئی اور بولا کہ یا مولانا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ تم سب کو فروخت کروں گا۔ بولا کہ قیمت کون لے گا۔ کہا کہ میں اور اس کو بیت المال میں داخل کروں گا۔ چنانچہ یہی کیا۔

ساتویں صدی کے وسط میں زوال بغداد کے بعد جب سے مصر میں خلافت عباسی قائم ہوگئی اس وقت سے وہی اسلامی علوم و حضارۃ کا مرکز ہوگیا۔ اسی عہد میں علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر اور جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے ائمہ وہاں ہوئے جن کی تصنیفیں آج تک مسلمانوں کا سرمایۂ افتخار ہیں۔

۹۲۳ھ میں سلاطین عثمانیہ اسلامی خلافت کو تو مصر سے روم میں لے گئے مگر علوم اسلامی کو وہیں چھوڑ گئے۔ چنانچہ ان کا مرکز آج تک بھی مصر ہی ہے اور اس کے علمی احسانات کا فیض دنیائے اسلام میں برابر جاری ہے۔

خدیوی خاندان کے عہد میں علوم حاضرہ یعنی طب، قانون، زراعت اور انجینئرنگ وغیرہ کے کالج بھی مصر میں قائم ہوگئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں مصری طلبا مغربی ممالک میں بھی جاکر تعلیم حاصل کرتے

ہیں۔ موجودہ سلطان مصر احمد فواد علم کے بہت بڑی مربی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاہزادگی ہی کے زمانہ میں دارالعلوم قائم کیا تھا جو جامعہ مصریہ کے نام سے ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو گیا ہے۔

مذہب

اہل مصر کا قدیمی مذہب بت پرستی اور ستارہ پرستی تھا جس پر یونانیوں کے عہد تک وہ قائم رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد جب عیسائیت کی اشاعت ہوئی تو ان میں سے بھی کچھ لوگوں نے اس کو اختیار کرنا شروع کیا مگر رومیوں نے جو اس وقت تک بت پرست تھے ان کو روکنے کی کوشش کی اور ان پر سختیاں کرنے لگے۔

۳۱۲ء میں قسطنطین اعظم نے اپنی تخت نشینی کے سال اول میں جب عیسوی دین کو اختیار کیا اور اسی کو سلطنت کا مذہب قرار دیا اس وقت مصریوں کو سختیوں سے نجات ملی اور کثرت کے ساتھ وہ اس مذہب میں داخل ہوئے۔ ۳۸۳ء میں قیصر تھیوڈوسیس نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی فرمان عام جاری کیا کہ سلطنت کے کل باشندے عیسائی بنائے جائیں۔ اس حکم کی بنیاد پر مصری بت پرست جو باقی رہ گئے تھے ان کی عبادت گاہیں ڈھادی گئیں اور ان پر وہ مظالم کئے گئے جو اس سے پہلے ان لوگوں پر بھی نہیں کئے گئے تھے جو عیسائی ہوتے تھے۔

اسی درمیان میں عیسائیوں میں تفرقہ واقع ہو گیا اور ان میں ملکی اور یعقوبی دو فریق ہو گئے۔ یعقوبیوں کا عقیدہ تھا کہ مسیح کی ذات الوہیت اور بشریت دونوں کا مجموعہ ہے اور ملکی کہتے تھے کہ ابن ازلی مولود اور غیر مخلوق ہے۔ وہی اس انسان کے ساتھ جو حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوا تھا متحد ہو کر مسیح ہو گیا۔

یہ اختلاف چونکہ نفس ذات مسیح کے متعلق تھا اس وجہ سے دونوں فریق میں سخت نزاع قائم ہوئی جس کے فیصلہ کے لئے قیصر نے پاپائے روم کے مشورہ سے مقام خلقدونیہ میں مسیحی علماء کا مجمع کیا۔ اس میں یہ طے پایا کہ یعقوبی عقیدہ غلط ہے اور جو کوئی اس کو اختیار کرے وہ واجب القتل ہے۔ اہل مصر تمام تر یعقوبی تھے اور رومی سب کے سب ملکی۔ اس وجہ سے رومیوں نے ان پر سختی شروع کی۔ مگر وہ مقابلہ کے

لے تیار ہوگئے۔ اور آخر بہت جھگڑوں کے بعد ایک یعقوبی بطریق کی کرسی انھوں نے قائم کرلی لیکن رومی حکام بوجہ مذہبی تعصب کے ان کے اوپر برابر ظلم وستم کرتے رہے۔ اس وجہ سے اہل مصر نہ صرف قومی اور ملکی حیثیت سے بلکہ مذہبی لحاظ سے بھی رومیوں سے الگ اور بیزار تھے۔ اور ان کی زبان، رسم، لباس اور ہر چیز کو انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔

سنہ۶۱۰ء میں جب ہرقل قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھا تو اس کی غفلت اور عیش پرستی کو دیکھ کر ایرانیوں نے سنہ۶۱۶ء میں چڑھائی کردی اور شام وفلسطین لیتے ہوئے مصر پر بڑھے۔ رومی سپہ سالار نکیتاس مقابلہ سے عاجز رہا اور مصر چھوڑ کر چلا گیا۔ ایرانی قابض ہوگئے۔ انھوں نے مصریوں کے مذہب میں دخل نہیں دیا جس کی وجہ سے ان کو اس مشرقی دولت کے سایہ میں امن نصیب ہوا اور انھوں نے اپنے پیشوا بنیامین کو مصر کے بطریق کی کرسی پر بٹھا دیا جس کی تمام ملک میں خوشی منائی گئی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی کیونکہ ہرقل نے خواب غفلت سے بیدار ہوکر سنہ۶۲۲ء میں ایرانیوں پر حملہ کیا اور اپنے سارے علاقے ان سے واپس لے لئے جس کی پیشین گوئی قرآن کریم میں کی گئی تھی کہ

غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین	رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے لیکن وہ مغلوب ہوجانے کے بعد چند سال میں غالب آجائیں گے۔

اب رومیوں نے جوش انتقام میں مصریوں پر بہت سختی شروع کی۔ بنیامین خوف سے بھاگ گیا مگر اس کا بھائی مینا گرفتار ہوگیا۔ رومیوں نے اس کو مجبور کیا کہ خلقدونی فیصلہ کو تسلیم کرلے۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر اس کے چہرہ کو مشعل سے یہاں تک جلایا کہ چربی ٹپکنے لگی مگر وہ اپنے قول پر قائم رہا۔ پھر اس کے دانت ایک ایک کرکے اکھاڑ ڈالے اس پر بھی وہ اپنے عقیدہ سے نہیں پھرا۔ اس کے بعد اس کو ریت کے تھیلے میں ڈال کر ساحل پر لے گئے اور تین بار کہا کہ خلقدونی عقیدہ کو مان لے تو جان بخشی کردی جائیگی۔ جب اس نے نہیں مانا تو سمندر میں غرق کردیا گیا۔ اہل مصر ان سختیوں سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح رومی یہاں سے نکل جائیں۔

ہرقل نے ایک قبطی شرا درمیس مقوقس کو اپنے پاس رکھ کر تربیت دی تھی جو بخلاف اپنی قوم کے

ی عقیدہ کا تھا۔ اسی کو مصریوں کی سیاست کے لئے مصر کا والی بنایا تھا لیکن وہ بھی کچھ دنوں کے بعد رومیوں
کے مظالم دیکھ کر در پردہ یعقوبی ہو گیا تھا اور اپنی قوم کی طرفداری کرنے لگا تھا جس کی وجہ سے اس میں اور
رومی ہائی کمشنر قیرس میں سخت مخالفت ہو گئی تھی۔ اسی درمیان میں اسلامی حملہ ہوا۔ قبطیوں نے عرب کے
انصاف اور رواداری کو دیکھ کر ان کا ساتھ دیا اور لڑائیوں میں مدد پہنچائی۔ خود مقوقس نے بھی ان سے
مصالحت کر کے رومیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ فتح کے بعد عمرو بن عاص نے مصریوں کو مذہبی آزادی بخشی۔
ان کے عزیز ترین پیشوا بنیامین کو جو تیرہ سال سے وادی نطرون میں روپوش تھا بلا کر اسکندریہ کی
بطریق کی کرسی عطا فرمائی۔ اس کا شاندار استقبال کرایا اور کنیسہ کے متعلق اس نے جو جو درخواستیں کیں
سب منظور فرمائیں۔ ان کے اس برتاؤ سے تمام قبطیوں کے دلوں میں مسلمانوں بلکہ اسلام کی محبت پیدا ہوئی۔
اسقف یاسلی نے اپنی تقریر میں کہا کہ

دین سے خارج ستم پیشہ رومیوں کے جور و ظلم کے بعد اب میں اسکندریہ میں امن و راحت
دیکھتا ہوں۔

اسقف ساویرس نے کہا کہ

آج کے دن ہماری بیڑیاں کٹ گئیں اور ہم آزاد ہو گئے۔

قبطیوں نے مسلمانوں کے تقوے، دیانت، راستبازی، عدل اور مساوات وغیرہ بے نظیر
اوصاف کو دیکھ کر اسلام کی طرف قدم بڑھایا اور قبیلے کے قبیلے اور خاندان کے خاندان مسلمان ہونے لگے۔
مقوقس کا خود اسلام لانا تو ثابت نہیں مگر اس کا ماموں زاد بھائی شطا نامی مسلمان ہو گیا۔ اس نے ہزاروں
قبطیوں کو مسلمان بنا کر ایک فوج مرتب کی اور اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد کی فضیلت حاصل کرنے کے
لئے شریک ہو گیا تینس کے معرکہ میں شہادت پائی۔ قبطیوں نے اس کو دمیاط کے باہر دفن کیا۔ اس
کی اس قدر عظمت اور محبت ان کے دلوں میں تھی کہ اس کی برسی منانے لگے چنانچہ آج تک ہر سال
پانچویں شعبان کو جو اس کی شہادت کا دن ہے اس کی قبر پر میلہ لگتا ہے۔

سنہ ۹۲ھ سے جب سے کہ مصر کا دفتر عربی زبان میں منتقل کر لیا گیا قبطیوں نے عربی زبان

اور علوم کی تحصیل شروع کی اور کثرت کے ساتھ اسلام لانے لگے۔

اہل عرب نے ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم کئے اور ان کو بالکل اپنے برابر رکھا۔ اس اختلاط کی وجہ سے بہت تھوڑے عرصہ میں نہ صرف زبان و لباس بلکہ دین اور اخلاق کے لحاظ سے بھی وہ بالکل عرب ہو گئے۔

اسلامی مذاہب کے لحاظ سے وہاں زیادہ تر مذہب شافعی پھیلا کیونکہ امام شافعی خود وہاں پہونچ گئے تھے۔ دیگر مذاہب کے علما کے ذریعہ سے ان کے مذاہب بھی پہونچے۔

خلافت فاطمیہ کے عہد میں اسماعیلیت کی اشاعت ہوئی۔ اس کے لئے ایک خاص مرکز انھوں نے قائم کیا تھا جس کے رئیس کا لقب داعی الدعاۃ تھا اور جس کا درجہ قاضی القضاۃ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس میں طریق دعوت اور اسرار امامت کی تلقین کر کے مبلغین دوسرے ممالک میں بھیجے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ سلمیہ کی باطنی جماعت کا تعلق تھا جو بھنگ کے استعمال کی وجہ سے حشیشین کہے جاتے تھے اور عراق کی قرمطی جماعت کا بھی جس نے بغداد کی عباسی خلافت کو مضطرب کر رکھا تھا حسن بن صباح کوہ الموت کی بہشت کا شداد بھی اسی مرکز کا تعلیم یافتہ تھا۔

یہ جماعتیں ایک عرصہ تک قائم رہیں۔ آخر میں ان کو ہلاکو نے اور باقی ماندہ کو ملک ظاہر بیبرس نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں فنا کیا۔ فاطمیہ نے اپنے عہد میں مصر میں چار مذاہب کے قاضی مقرر کئے تھے شافعی، مالکی، اسماعیلی اور اثنا عشری۔

فاطمیہ کے بعد ایوبی عہد میں اسماعیلیت مٹ گئی اور پھر شافعی مذہب کو غلبہ ہو گیا اور اسی کے قاضی مقرر ہونے لگے۔ اسی خاندان کے آخری تاجداروں میں ملک صالح نجم الدین کی کنیزک خاتون شجرۃ الدر تھی۔ اسی کے عہد سے مصری محمل یعنی غلاف کعبہ ہر سال مصر سے مکہ کو بھیجا جانے لگا جس کا سلسلہ برابر جاری تھا مگر ادھر پانچ سال سے بعض وجوہ سے بند ہو گیا ہے۔

ملک ظاہر بیبرس متوفی ۶۷۶ھ نے اپنے عہد میں پھر چار قاضیوں کی رسم جاری کی۔ مگر یہ سنیوں کے چاروں فرقوں کے ہوتے تھے۔ غالباً اس کے عہد میں حرم مکہ میں چاروں مصلے بھی الگ

الگ قائم کئے گئے۔

ممالیک بحری نیز ممالیک چرکس نے اپنے اپنے زمانوں میں مصر میں بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں بلکہ مصر کی زیادہ تاریخی یادگاریں انھیں کے عہد کی ہیں۔ ان کے زمانہ میں درویشی اور فقیری کا زیادہ رواج ہوا۔

تصوف کا اثر بھی مصر پر کم نہ تھا بلکہ حضرت ذوالنون متوفی ۲۴۵ھ جن کو رسالہ قشیریہ میں اسلامی تصوف کا بانی کہا گیا ہے مصر ہی کے مقام اخمیم کے باشندے تھے۔ شیخ ابن فارض کے پُر معرفت قصائد بھی مصر ہی کی برکات ہیں۔ وہاں کے صوفیہ کبار میں سے رفاعہ بن احمد اور سید احمد بدوی خصوصیت کے ساتھ شہرت رکھتے ہیں جن کے پیرو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ آج بھی مصر کے ہر حصہ میں فقراء اور درویشوں کے تکیے اور زاوئے پائے جاتے ہیں خاصکر قاہرہ میں۔

عربوں کے اختلاط اور مساوات نے قبطیوں کو بہت تھوڑے عرصہ میں اپنے اندر ایسا جذب کر لیا کہ وہ ہر لحاظ سے عرب ہو گئے اور ان کی نہ صرف دینی اور اخلاقی بلکہ علمی اور دماغی کیفیت بھی وہی ہو گئی جو عرب کی تھی۔ ان میں زیادہ تر انھیں علوم نے رواج پایا جو خالص عربی تھے یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، سیرۃ و تاریخ وغیرہ برخلاف عراقیوں کے علوم دخیلہ یعنی منطق و فلسفہ وغیرہ کی طرف انکا رجحان کم رہا۔

یونانیوں اور رومیوں کی صدیوں غلامی نے اہل مصر کے شجاعانہ جذبات کو تقریباً فنا کر دیا تھا مگر اسلام کی بدولت پھر وہ زندہ ہو گئے۔ چنانچہ ان لڑائیوں میں جو عہد اسلام میں پیش آئیں ان کی بہادری اور شجاعت، دوسری مسلمان قوم سے درجہ دوم پر نظر نہیں آتی۔

صلیبوں کو جن کے مقابلہ کی سوائے نورالدین زنگی شہید کے خلافت عباسیہ نے بھی کبھی جرأت نہیں کی آخر میں مصریوں ہی نے سرزمین مقدس سے نکالا۔ تاتاریوں نے مشرق سے لیکر مغرب تک اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کر ڈالا تھا مگر شام سے مصریوں ہی نے ان کا منہ پھیرا۔ بلکہ ۶۶۰ھ میں بغداد بھی ان سے واپس لیا۔ ۶۸۰ھ میں اباقا خاں پسر ہلاکو نے جب عراق عجم پر چڑھائی کی تو ملک ظاہر بیبرس نے ایسی شکست دی کہ تقریباً ایک لاکھ نعشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر وہ بھاگا۔ اسی

طرح دوبارہ ۱۳۰۰ء میں جب وہ پھر اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہوا اس وقت ملک منصور قلاؤون نے پہونچ کر ۱۳ رجب کو حمص کے متصل اس کو شکست دی جس کے بعد کبھی مصر کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ الغرض مصریوں نے ہر مقابلہ میں تقریباً وہی شجاعت اور سیاست دکھلائی جو عرب دکھلاتے تھے۔

صنعت

مصر کی قدیمی صنعت قصب بافی تھی۔ اسلامی عہد میں خاص کر فاطمیہ کے زمانہ میں اس کو خصوصیت کے ساتھ ترقی ہوئی اور قصب مصری دنیا بھر میں جانے لگا۔ دوسری صنعت سنگ تراشی تھی۔ نہ صرف ان کے پرانے بت بلکہ قدیمی عمارتیں وغیرہ بھی ایک قسم کی سنگ تراشی ہی کہی جاسکتی ہیں۔ بڑا ہرم جو تقریباً بیندرہ ایکڑ زمین پر واقع ہے صرف ترشے ہوئے چوکور ۲۳ لاکھ پتھروں کا مجموعہ ہے اور کچھ نہیں۔ اسلامی زمانہ میں معابد، مساجد اور محلات وغیرہ کی بدولت مصر میں فن تعمیر آیا اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس میں ترقی ہوتی گئی چنانچہ ممالیک کے عہد کی عمارتیں اپنی خوبیوں کے لحاظ سے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ شمار کی گئی ہیں اور قلقشندی کے بیان کے مطابق ان کے کتبے دنیا کے جملہ عربی کتبوں سے خوشنما ہیں۔

مردم شماری

ہیروڈوٹس نے کہا ہے کہ مصر میں دو ہزار شہر ہیں۔ دیودرس نے وہاں کی آبادی ستر لاکھ لکھی ہے اور یوسیفوس یہودی نے اپنی کتاب آثار الاسرائیلین میں ۷۵ لاکھ۔ اسلامی عہد میں یہ تعداد بڑھ کر دو کروڑ تک پہونچ گئی تھی مگر خلفاء فاطمیہ اور خاصکر ممالیک کے زمانہ میں اندرونی فتنوں، صلیبی جنگوں، بلاؤں، وباؤں، قحطوں اور سب سے بڑھکر بدنظمیوں کی وجہ سے گھٹ کر صرف تین بتیس لاکھ رہ گئی۔ خدیوی عہد سے پھر ترقی پر ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء کی مردم شماری تقریباً ۱۲ ملین تھی جس میں سے صرف ایک ملین غیر مسلم ہیں اور باقی مسلمان۔ ان غیر مسلموں میں بڑی تعداد یونانیوں کی ہے جو عربی خوب بولتے اور لکھتے ہیں۔ زیادہ تر اہل دفاتر او قانون پیشہ لوگ یہی ہیں۔ ان کے علاوہ انگریز، فرانسیسی، اطالین، جرمن اور ارمن وغیرہ ہیں۔ قدیم قبطی مصری جو یعقوبی فرقہ کے عیسائی ہیں، اب آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔

اناطول فرانس کا فلسفۂ زندگی

انسانی زندگی

حال میں میری نظر سے ایک کتاب گذری ہے جس میں مصنف صاحب نے، جو فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی، ہمارا تعارف ایک ایسی قوم سے کرایا ہے جو رنج، خوشی، ذوق، جستجو ان سب سے بالکل بری ہے، اگر اس خیالی دنیا سے نکل کر جب ہم اپنے چاروں طرف انسانوں کو زندگی کی جدوجہد، محبت یا غم میں گرفتار دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں ان کی کتنی جگہ ہوتی ہے اور ان کے غم میں ان کا ساتھ دیکر قلب کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے! اس وقت ہم کو احساس ہوتا ہے کہ سچی خوشی ہمیں اسی دنیا میں مل سکتی ہے۔ جس طرح درد کی دوا پھوٹ بہنے والے درد آشنا درخت کے زخموں سے ملتی ہے اسی طرح سچی خوشی بھی غم ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس خیالی دنیا کے باشندوں نے جذبات اور خواہشات کو فنا کرکے خوشی اور رنج، غم اور لطف، نیکی اور بدی، ذوق حسن بلکہ خود جوہر اخلاق ان سب کو بھی مٹا دیا ہے۔ وہ لوگ عقلمند ضرور ہیں مگر ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کیا وقعت ہے اس کام کی جو بلا کوشش اور دقت کے ہوسکے! کیا وقعت ہے اس زندگی کی جو دراز ہو مگر جوش حیات سے خالی، جو پوری طرح سے بسر نہ کی جائے، صرف کاٹی جائے؟

اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے انسان کی موجودہ حالت بہت کچھ عزیز ہوگئی ہے، اس رنج و غم کی زندگی سے میں بہت کچھ مانوس ہوگیا ہوں، میرے دل میں اپنے ہم جنسوں کی قدر زیادہ ہوگئی ہے اور انسانی ہمدردی کا جذبہ پھر ابھر آیا ہے۔ اس کتاب میں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ یہ ہم کو واقعات سے رغبت دلاتی ہے اور وہم و خیال سے خبردار کرتی ہے۔ ہمارے سامنے ایسے لوگوں کو پیش کرکے جو تمام برائیوں سے بری ہیں یہ ہم کو دکھاتی ہے کہ وہ "خوش قسمت" لوگ دراصل ہم سے کمتر ہیں اور اپنی حالت

کو ان کی حالت سے بدلنا اگر ممکن بھی ہو تب بھی ہماری انتہائی بیوقوفی ہوگی۔

وہ "خوش نصیب" لوگ بھی کس قدر بدنصیب ہیں جو جذبات کو رد کر کے "آرٹ" کو بھی کھو بیٹھے ہیں! بھلا ان میں کوئی شاعر کیونکر پیدا ہو سکتا ہے جبکہ وہ نہ تو رزمیہ شاعری سے لطف اٹھا سکتے ہیں جو محبت اور نفرت کے تلاطم خیز جذبات پر منحصر ہے نہ وہ ظریفانہ شاعری سے حظ حاصل کر سکتے ہیں جو انسان کی مضحکہ خیز خامیوں پر مبنی ہے، ڈیڈو[1] اور فائدرا دونوں ان بیچاروں کی سمجھ سے باہر اور ان کے خیال سے بالا ہیں۔

ان کی آنکھیں، ان کے کان دونوں اس شاعری سے محروم ہیں جو ہماری دنیا میں جنت کی خوبیاں پیدا کر دیتی ہے۔ ان میں ایک ورجل[2] بھی نہیں ہے پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ان کو خوشی حاصل ہے محض اس وجہ سے کہ وہ بجلی کی مدد سے زینوں کی زحمت برداشت کئے بغیر مکان کی ایک منزل سے دوسری منزل پر جا سکتے ہیں! حالانکہ سچ پوچھو تو دنیا کی خوشی میں تمام بہترین مشینوں کے مقابلہ میں ایک خوبصورت مصرعہ سے کہیں زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

ترقی! بے پناہ ترقی! ان انجنیر لوگوں میں نہ تو جذبات ہوتے ہیں نہ شاعری نہ محبت۔ افسوس! وہ محبت کو کیا جانیں، وہ تو خوش اور مطمئن ہیں! محبت کی کلی صرف غم ہی کی فضا میں کھلتی ہے۔ ایک گرفتار محبت کی عرض حال ایک مصیبت زدہ کا نالہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک انگریزی شاعر درد محبت سے متاثر ہو کر کہتا ہے "اگر میری جگہ کوئی دیوتا ہوتا تو اس کا رنج سے کیا حال نہ ہوا ہوتا! ایک دیوتا میں نہ تو اتنی قوت برداشت ہے کہ تیرا دیا ہوا غم سہہ سکے نہ اس کی اہلیت ہے کہ تیرے قدموں پر اپنی جان نثار کر سکے۔"

ہم کو چاہئے کہ ہم رنج و غم سے صلح کر لیں اور یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جہاں تک ہماری عقل کی

---

[1] دو یونانی عورتیں جن کی دردناک زندگی کی روایتیں مشہور ہیں۔ دونوں جذبات کے تلاطم کا مجسمہ تھیں اور دونوں کی زندگی کا خاتمہ خودکشی ہی پر ہوا۔

[2] لاطینی زبان کا سب سے بڑا شاعر جس کو انگریزی میں 'ورجل' (Virgil) کہتے ہیں۔

پہونچتی ہے کوئی خوشی بھی اس خوشی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی جو ہم کو اس زندگی میں حاصل ہے۔ یہی زندگی جو لطیف بھی بے انتہا ہے اور تلخ بھی بے انتہا، جس میں اچھائی بھی بے حساب ہے اور برائی بھی بے حساب، جو بلند سے بلند خیالات سے معمور بھی ہے اور سخت سے سخت حادثات سے گرانبار بھی ہے، یہی دنیا جو تمام چیزوں، تمام باتوں کو اپنے دامن میں لیے ہے اور جو تمام اضداد کو ہم آہنگ کرتی ہے، یہی ہمارا باغ ہے جس کی ہم جس قدر بھی سیوا کریں کم ہے۔

اتفاقات | جن لوگوں نے بڑے بڑے کام کرنے کا ذوق اور سلیقہ پایا ہے وہ جانتے ہیں کہ عملی تدبیریں بھی الٹی ہو جاتی ہیں اور اس لئے وہ ہمیشہ اتفاقات کا خیال رکھتے ہیں۔ جنگ اور جوا دونوں فن یہی سکھاتے ہیں کہ کبھی تمام موافق حالات کے جمع ہو لینے کا انتظار نہ کرنا چاہئے، بلکہ جو موقع بھی ہاتھ آ سکے اس سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیے۔

فلسفۂ زندگی | زندگی کو اچھا یا برا کہنا ایک فضول اور مہمل بات ہے۔ دراصل ہم کو یہ کہنا چاہئے کہ زندگی اچھی بھی ہے اور بری بھی کیونکہ اچھائی اور برائی یہ دونوں خیالات ہم کو زندگی ہی سے حاصل ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی پر لطف بھی ہے، پر درد بھی ہے، دل آویز بھی ہے، دل دوز بھی ہے، شیریں بھی ہے اور تلخ بھی ہے، غرضیکہ ایک معجون مرکب ہے جس میں سب ہی کچھ ہے۔ اگر مثال دی جائے تو کہا جا سکتا ہے ہارلےکن[1] کی رنگا رنگ پوشاک کی طرح ہے، کسی کو وہ سرخ نظر آتی ہے، کوئی اسے نیلی بتاتا ہے اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ ٹھیک کہتا ہے کیونکہ جہاں اس میں اور رنگ ہیں وہ سرخ بھی ہے اور نیلی بھی ہے۔ یہ حقیقت کا ایک ایسا نکتہ ہے کہ جس کے سمجھنے سے ہم سب ایک ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ فلسفیوں میں بھی جو ایک دوسرے کو نوچتے پھاڑتے رہتے ہیں اتفاق ہو سکتا ہے مگر ہماری فطرت ایسی ہے کہ ہم دوسروں سے زبردستی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے خیالات اور جذبات بھی ہمارے ہی جیسے ہوں، ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ہم مغموم ہوں اور ہمارا ہمسایہ خوشیاں منائے۔

---

[1] ایک پرانے اور مشہور سوانگ کا مسخرہ جس کی پوشاک کئی مختلف رنگ کے کپڑوں کی بنی ہوتی ہے۔

شیطان کا رحم و کرم | برائی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو اچھائی بھی نہ ہوتی۔ اچھائی کا وجود ہی برائی کے وجود پر مبنی ہے۔ اگر خوف نہ ہو تو بہادری ایک بے معنی خیال ہے، اگر مصیبت اور غم نہوں تو ترس اور ہمدردی کا ہونا بھی ممکن نہیں جس دنیا میں خوشی ہی خوشی ہو وہاں خدمت اور ایثار کے کیا معنی؟ جب تک بدی نہ ہو نیکی ایک مہمل لفظ ہے، بغیر نفرت کے محبت ناممکن ہے، خوبصورتی کا خیال بدصورتی کے خیال سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ محض برائی کا صدقہ ہے کہ دنیا رہنے کے قابل ہے، غم ہی کی بدولت زندگی قابل برداشت ہے۔ لہذا شیطان کو بجائے برا بھلا کہنے کے ہم کو اس کا احسان ماننا چاہئے اور اس کی صناعی اور دانشمندی کی داد دینا چاہئے۔ کم از کم آدھی دنیا تو اسی کی کاریگری ہے اور اس آدھی اور دوسری آدھی کا اس طرح گوشت اور ناخن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو چھیڑا تو دوسری کو صدمہ پہونچنا لازمی ہے۔ ہر بدی کے ساتھ کوئی نہ کوئی نیکی لگی ہوئی ہے اور بغیر اس نیکی کو مٹائے بدی کو دفع کرنا ممکن نہیں۔

کچھ عرصہ ہوا میں دیہات کے ایک میلے میں گیا اور وہاں کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ حضرت انتھونی[1] کی نقل ہو رہی تھی۔ یہ وہ تماشا ہے جس کے فلسفہ کے سامنے شیکسپیئر کے تمام المیے اور ہمارے ذیبری صاحب کے تمام ڈرامے سب ہیچ ہیں۔ خدا اور شیطان دونوں کے رحم و کرم کو کس قدر واضح طور پر اکٹھا دکھایا ہے!

جب پردہ اٹھا تو تماشا گاہ (اسٹیج) پر ایک بھیانک ریگستان نظر آیا مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ

---

[1] یہ تیسری صدی عیسوی کے آخر اور چوتھی کے شروع میں ایک بہت بڑے عیسائی ولی گزرے ہیں۔ یہ مصر کے باشندے تھے اور برسوں افریقہ کے ریگستانوں میں خدا کی عبادت میں مشغول رہے۔ وہاں ان کی سخت سے سخت آزمایش ہوئی۔ شیطان طرح طرح کے بھیس بدل کر آتا تھا اور کبھی ان کو ورغلاتا تھا، کبھی لالچ دلاتا تھا، کبھی ناقابل برداشت زد و کوب بھی کرتا تھا مگر حضرت انتھونی ایمان کے راستے سے نہ ہٹے اور امتحان میں پورے اترے۔

فرشتوں اور شیطانوں سے بھر گیا۔ کچھ تو ان فرشتوں اور شیطانوں کے تماشا گاہ پر باری باری آنے سے اور کچھ کٹھ پتلیوں کی چال ڈھال سے یہ شروع ہی سے خیال ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے حکم سے ہو رہا ہے یا یوں کہئے قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ پھر بھی جب حضرت آنتھونی نے حمد اور دعا ختم کی اور سجدے سے سر اٹھایا۔ ان کی پیشانی بے شمار سجدوں سے اونٹ کی پیٹھ کی طرح سخت اور گھٹے دار ہو گئی تھی اور ان کی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے ملکۂ سبا اپنے سنہرے لباس میں ناز و انداز سے ہنستی اور دونوں ہاتھ پھیلائے دکھائی دی تو ہمارے بدن میں سنسنی پڑ گئی اور ہمارا دل اس اندیشہ سے دھڑکنے لگا کہ کہیں حضرت آنتھونی ملکۂ سبا کے جال میں پھنس نہ جائیں۔ اسی طرح ان کی باقی آزمائشوں اور مصیبتوں کو بھی ہم اپنا دل تھامے دیکھتے رہے۔

حضرت آنتھونی کے ساتھ ہماری پرجوش ہمدردی کی بنا یہی تھی کہ ان کے آئینے میں ہم اپنے آپ کو دیکھتے تھے۔ جب ان کی فتح ہوئی تو وہ ہماری فتح تھی بلکہ یوں کہئے کہ وہ فتح بنی آدم کی فتح تھی اس جد و جہد میں جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

القصہ حضرت آنتھونی جو اتنے بڑے ولی ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ ملکۂ سبا کے جال میں نہ پھنسے اور آزمائش میں پورے اترے۔ اگر ہم اتنا مانتے ہیں تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ شیطان نے ملکۂ سبا کو حضرت آنتھونی کے پاس بھیج کر وہ کام کیا جس کے بغیر وہ ولی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

اس طرح کٹھ پتلیوں نے میرے اس یقین کو کامل کر دیا کہ دنیا میں اچھائی سے پہلے برائی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ شیطان ہی وہ ستون ہے جس کے سہارے دنیا کی ساری اخلاقی خوبیاں قائم ہیں۔

<u>الفاظ کا جادو</u> | میرے سامنے یہ کتاب ہے اور مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس طرح قدرت ہم کو اپنی موزونیت کے نادر لمحوں میں طرح طرح کی شکلوں اور رنگوں سے فرحت بخشتی ہے اسی طرح چند لفظوں میں جو کسی زبان سے مانگ لئے جائیں اسی قوت سے کہ وہ ہمارے دل و دماغ میں سرور پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ چند اشارے ہمارے دماغ میں الہامی تصویریں کھینچ دیتے ہیں۔ اسی کو میں

معجزہ کہتا ہوں۔ ایک خوبصورت شعر ہماری روح کے راگ بھرے تاروں کو چھیڑنے میں اس مضراب کا کام کرتا ہے جو کسی استاد کی انگلی میں ہو۔ شاعر ہمارے گوش دل کو اپنے خیالات نہیں ہمارے ہی خیالات کے گیت سناتا ہے۔ جب وہ اپنی محبوبہ کا ذکر کرتا ہے تو ہمارے دلوں میں ہمارے اپنے وصل اور ہجر کے قصے تازہ ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو دراصل روح کا جگانے والا کہنا چاہئے۔ جب ہم اس کے مطلب کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں تو ہم خود شاعر ہو جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک میں ہمارے تمام شاعروں کا ایک نمونہ موجود ہے۔ اول نمونوں سے کوئی بھی واقف نہیں ہے اور جب ہم میں احساس نہ رہے گا تو یہ نمونے بھی سب ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔

بھلا یہ ممکن تھا کہ اگر یہ شاعر وہی باتیں نہ کہتے جو ہمارے دل میں ہیں تو ہم کو ان کے کلام سے اس قدر رغبت ہوتی؟ ہرگز نہیں یہ محض خام خیالی ہے۔ بلند سے بلند خیالات کا شاعر بھی اصل میں خود بیں اور خود پرست ہے۔ اس میں خودی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ہر شاعر نے اپنے کلام میں اپنی ہی تصویر کھینچی ہے اور ہم اس میں صرف اپنی تصویر دیکھتے ہیں۔ شاعر محبت کی راہ دکھاتا ہے اور ہمیں اس منزل میں سہارا دیتا ہے۔ بس اتنا ہی شاعروں سے فائدہ ہے، یہی ان کا کام ہے اور یہ ان کی پیاری خود پسندی کو تسکین دینے کے لئے بھی کافی ہے۔ ان کے اشعار کی تعریف کرنا اسی قدر فضول ہے جس قدر عورت کی تعریف کرنا۔ جن شعروں کا اثر دل سب سے زیادہ قبول کرے گا وہی سب سے زیادہ خوبصورت ہوں گے۔ رہا لوگوں سے یہ قبول کرانا کہ ہماری پسند لاجواب ہے یہ تو خدائی فوجداروں کا کام ہے نہ کسی سمجھدار آدمی کا۔

ادبُ الجاحظ

عنوان بالا سے ابھی حال میں ایک کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے کتاب صوری و معنوی ہر اعتبار سے نہایت دیدہ زیب و دلپذیر ہے۔ فاضل مؤلف کا نام "حسن السندوبی" ہے۔ سندوبی صاحب مصر کے اہل انشا میں ایک مرتبۂ خاص کے مالک ہیں۔ تلاش و جستجو، جرح و تنقید اور روایت و درایت کا نہایت خوبی سے امتزاج کیا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ رنگینیٔ عبارت اور حسن بیان بھی اس کتاب کی خصوصیت خاصہ ہے۔

اصل کتاب ڈھائی سو صفحات کو محیط ہے، میں نے یہ چاہا ہے کہ اس کتاب کا عطر کشید کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں، یعنی کوئی اہم بات رہنے بھی نہ پائے اور صفحات بھی اتنے نہ ہوں کہ گراں گزریں۔

قبل اس کے کہ اصل موضوع شروع کروں، یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، میں یہ کتاب مولینا سورتی صاحب مدظلہ سے محض مطالعہ کی غرض سے لایا تھا۔ کتاب کے پڑھنے کے بعد میری بھی یہی رائے ہوئی کہ اس کے ضروری حصص کا ترجمہ کر دوں اور مولینا موصوف نے بھی یہی ارشاد فرمایا۔ اس لئے مولینا سورتی صاحب کا شکریہ واجب ہے کہ ان کی عنایت و شفقت سے یہ کتاب میرے پاس اتنے دنوں رہی کہ میں اس کے ضروری مباحث اردو میں منتقل کر سکا۔

رئیس احمد جعفری ندوی

اصل و نسب | سلسلۂ نسب، ابوعثمان عمرو بن بحر بن محبوب بن فزارۃ، لیثی، کنعانی ہے، بعض ارباب سیر کا خیال ہے کہ فزارہ ابوالقلمس عمرو بن قلع الفقمی کا غلام تھا، قلمس کی اصابت رائے اور نفوذ و اثر کا ہر شخص معترف تھا۔ یہ جس مہینہ کو چاہتا تھا حلال کر دیتا تھا، جس مہینہ کو چاہتا تھا حرام[1] کر دیتا تھا۔ یہ خصوصیت واقتدار

[1] دیکھو صفحہ ۴۲۰۔

اس کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ قائم رہی، عرب میں اس شان کا نہ کوئی پیدا ہوا، اور نہ کسی میں یہ جرأت تھی کہ اس کی کسی رائے کی مخالفت کر سکتا۔

اس مقتدر خاندان میں جاحظ نے اپنے ایام نشو و نما پورے کئے، اور نہ صرف اس نے بلکہ اس کے آبا و اجداد نے بھی یہیں پرورش پائی۔ یموت بن المزرع کہتا ہے کہ فزارہ ایک سیاہ رو آدمی تھا اور عمر بن قلع کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔

یہاں سے جاحظ کی عربیت اور نسل کے متعلق ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاحظ عربی سامی نسل سے تھا یا قرب و جوار کی وجہ سے افریقی عناصر عربی عناصر میں ممزوج ہو گئے؟ یا اس کے آبا و اجداد میں سے کوئی غلام تھا یا اس کی نسل غلامی کی کدورتوں اور آلائشوں سے پاک تھی؟ اور وہ اچھا خاصا "حر" پیدا ہوا تھا؟

میرا جواب تو یہ ہے کہ سیاہ رنگ ہونا تو عربی الاصل ہونے کے خلاف کوئی معقول دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ یہ رنگ عربوں میں پایا جاتا تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس رنگ پر فخر بھی کیا جاتا تھا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جو اسے پسند کرتے تھے، محبوب رکھتے تھے اور دوسرے رنگوں پر اسے ترجیح دیتے تھے، لہٰذا جاحظ کے جد اعلیٰ کا سیاہ رنگ ہونا اس کی "عجمیت" کی دلیل کیوں کر ہو سکتا ہے؟

رہی غلامی تو ماہرین انساب و اخبار، و رواۃ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اس کے آبا و اجداد میں کوئی بھی غلام رہا ہے؟ اسی طرح یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ اس کے اسلاف میں سے کوئی شخص کبھی اسیر کیا گیا ہو۔

فزارہ کو آل فقیم کا "مولیٰ" کہتے ہیں، تو لفظ "ولا" حریت کی نفی کب کرتا ہے؟ یہ لفظ تو محب، صدیق، نصیر، غلام، آزاد سب پر منطبق ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے معنوں میں

(حاشیہ صفحہ ۴۱۹) اصطلاح میں اسے "نسی" کہتے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے "انما النسیٔ زیادۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما ویحرمونہ عاما"۔ ۱۲

استعمال ہوتا ہے، ایک صحیح النسب قبیلہ دوسرے قبیلہ کا ہمیشہ "مولیٰ" رہا کرتا تھا۔

اب خود جاحظ کو لیجئے۔ اس کی کتابوں اور روایتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عربیت میں اسے بہت غلو تھا، کسی قوم کو عرب سے افضل و اعلیٰ وہ تسلیم ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس قدر اپنے اس خیال میں متعصب تھا کہ انسانیت کی ہر فضیلت، بزرگی اور اولیت کا سہرا وہ عرب ہی کے سر رکھتا تھا۔

اس کے باوجود محققین نے اعتراف کیا ہے کہ جاحظ خالص النسب عرب تھا، ابوالقاسم بلخی اور ابن حزم کہتے ہیں کہ وہ عرب تھا، عرب خاندان سے تھا اور عرب کے ایسے گھرانہ میں پرورش پائی کہ مجد و شرف اس کے رگ ریشہ میں پیوست ہو گیا۔

لقب | لقب جاحظ تھا، اس لئے کہ وہ بہت ہی بدشکل تھا، اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں، اس کے علم و فضل کے آگے یہ عیب کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اعاظم رجال میں بہت سے ایسے ہوئے ہیں جو اس سے بھی زیادہ بدشکل و بدقوارہ تھے مثلاً شیخ الفلاسفہ، سقراط، یہ بھی حد درجہ بدشکل تھا، ناک چپٹی چپٹی اور ہونٹ موٹے موٹے تھے، جاحظ تو بہرحال سقراط سے کم تھا، یہ عجیب بات ہے کہ اس کا اصلی نام "عمرو" کوئی نہیں لیتا، نہ اس کی کنیت "ابوعثمان" سے کوئی یاد کرتا ہے، کہتا ہے تو جاحظ۔

جہاں تک جاحظ کا تعلق ہے وہ اس لقب (جاحظ) کو بہت ناپسند کرتا تھا اور جو کوئی اسے اس لقب سے پکارتا تھا تو وہ برا مانتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگ اس کا اصلی نام لیا کریں۔ وہ اپنے اصلی نام "عمرو" سے اتنا خوش تھا کہ کہا کرتا تھا کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ نام بہادروں کے لئے، بادشاہوں کے لئے، سرداروں کے لئے، رئیسوں کے لئے مخصوص رہا مثلاً عمرو بن سعید الاکبر، عمرو بن العاص، عمرو بن معدیکرب وغیرہ۔

وہ کہا کرتا تھا "لوگ مجھے 'عمرو بن بحر' کیوں نہیں کہتے؟ یہ کیا ہے جس کو دیکھئے وہ اسی مہمل لقب جاحظ سے یاد کر رہا ہے۔"

بات بھی یہی ہے کہ جب کوئی لقب آدمی کے کسی عیب کو ظاہر کرتا ہو تو برا معلوم ہی ہوتا ہے اگر جاحظ کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کا یہ لقب بڑے بڑے لوگوں کے لئے باعث شرف و مجد ہوگا بلکہ معیار

فضیلت قرار دیدیا جائے گا تو شاید وہ خوش ہوتا بلکہ بعض مرتبہ تو یہ خطاب دوسروں کے لئے خصومت کا سبب بھی بن جاتا تھا، اور ویسے ایک مستقل فضیلت تو تھی ہی۔ ابو حیان توحیدی ابن عمیہ سے اس لئے برسرپرخاش تھے کہ "جاحظ ثانی" وہ بھی کہلاتے تھے حالانکہ وہ صرف اپنے تئیں اس خطاب جلیل کا حقدار سمجھتے تھے، محمود بن عزیز جیسا فاضل اجل "جاحظ ثانی" کے شرف کا مالک تھا، ابو محمد الحسین بن خلاد کے متعلق ابن ندیم کہتا ہے کہ "وہ جاحظ کے مسلک کے پیرو تھے"۔ ابوالقاسم آمدی جیسے شخص کے متعلق ابن ندیم ان کے مصنفات کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے "وہ جاحظ کے ہم مذہب تھے"۔

مولد و منشا | جاحظ کے مولد کے بارے میں مورخین اور رواۃ میں اختلاف ہے، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اسکی ولادت ۱۵۹ھ میں ہوئی، بعض کچھ اور کہتے ہیں، لیکن صحیح تر روایت خود جاحظ کی ہے جسے یاقوت نے اپنی "معجم" میں نقل کیا ہے کہ جاحظ کہتا تھا "میں ابو نواس سے ایک سال بڑا ہوں۔ میں ۱۵۰ھ کے اوائل میں کتم عدم سے عالم وجود میں آیا، اور وہ اواخر میں، ...." خود جاحظ کی اس "نص" کے بعد شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ابن خلکان کی روایت حد درجہ تعجب خیز ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں خطیب بغدادی کی "تاریخ بغداد" سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "ابو نواس کی پیدائش ۱۳۶ھ میں ہوئی لیکن اس قول کی اہمیت جاحظ کے اس قول سے زائل ہو جاتی ہے جس میں اس نے اپنی اور ابو نواس کی عمر بیان کی ہے۔

جاحظ بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں بصرہ و کوفہ ہی دو شہر تھے جو تہذیب و تمدن، علوم و فنون، اور لغت و ادب کے مرکز تھے۔ بغداد اس وقت تک عہد طفولیت میں تھا۔ اس کی عمرانیت و حضارت ابھی اس درجہ تک نہیں پہونچی تھی، اگرچہ عمران و تمدن کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

جاحظ کی نشو و نما بصرہ ہی میں ہوئی اور وہیں سے اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بحث و استقرا، اور علماء عصر سے استفادہ کی خاطر وہ بصرہ چھوڑ کے اس زمانے کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرف گیا جہاں سے وہ کامیاب و کامران واپس ہوتا تھا، جب اس کی عمر پچاس سے متجاوز ہوگئی تو اس نے بغداد کا رخ کیا، اور اسی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ بغداد جب وہ پہونچا تو

مامون الرشید کا عہد سعادت تھا' اس وقت تک بغداد ترقی و سرفرازی کی ساری منزلیں طے کر چکا تھا۔ بغداد میں اس کا داخلہ ۲۰۴ھ میں ہوا' جب اس کے قیام کی شہرت ہوئی تو علماء و فضلاء کی ایک جماعت کی جماعت مشتاق زیارت ہو کر آئی اور طالبان علم کا تو دریا امنڈ آیا' ہر صنف اور ہر جنس کے طلبہ موجود تھے' نسل و قوم کا کوئی امتیاز ہی نہیں تھا' جاحظ کہتا ہے "نظام میرے پاس علم کلام حاصل کرنے کے لئے آیا' لیکن اس کو اس فن سے کوئی مناسبت نہیں تھی"۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جاحظ کو علم حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں تھا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ علوم حدیث میں بھی وہ کمال حاصل کر چکا تھا اور مسند درس کی زینت بن چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بصرہ میں تھا اور ابھی بغداد نہیں گیا تھا۔ خطیب بغدادی اپنی "تاریخ بغداد" میں لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے جاحظ سے حدیث کی سند لی ہے ان میں سے ایک ابوداؤد[1] بھی ہیں۔ ابن ابی داؤد کہتے ہیں" میں بصرہ میں تھا تو ایک بار جاحظ کے ہاں گیا۔ میں نے اجازت طلب کی تو انھوں نے روشن دان سے جھانکا اور پوچھا کون ہے؛ میں نے کہا اصحاب حدیث میں ایک شخص حاضر ہے۔ کہا تم نے مجھے "حشویہ[2]" سے گفتگو کرتے کبھی دیکھا ہے؟ میں نے کہا میں ابوداؤد کا بیٹا ہوں۔ کہا' اخاہ' آؤ۔ یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آیا اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا مجھ سے کوئی حدیث بیان کیجئے۔ کہا لکھو' عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی طنفسۃ[3]"۔ خطیب نے سلیمان بن اشعث سے ایک روایت کی ہے کہ میں جاحظ کے ہاں گیا اور کہا کوئی حدیث بیان کیجئے۔ کہا لکھو' عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلاۃ الا المکتوبہ[4]۔ یہاں ایک غلط فہمی رفع ہو جانا چاہیئے۔ یعنی جاحظ ہر محدث کی "حشو" سے نہیں تعریف کرتا تھا۔ یہ خیال ان کا انھیں لوگوں کے متعلق تھا جو

---

[1] ابوداؤد کا جاحظ سے ملاقی ہونا مشتبہ ہے (مترجم)

[2] مہمل' برے لوگ۔ [3] قالین' دری

[4] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض کے علاوہ اور نماز نہ پڑھنا چاہیئے۔

لوگ کھوٹے کھرے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

عہد جاحظ کے اسالیب تعلیم | قبل اس کے کہ ہم اس امر پر گفتگو کریں کہ جاحظ کی تعلیم کیوں کر ہوئی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب تعلیم کا ایک مختصر سا خاکہ بھی آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

غور و فکر اور بحث و استقرار کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم و تعلم کا دستور یہ تھا کہ پہلے بچہ ابتدائی طور پر لکھنا پڑھنا سیکھتا تھا، پھر کچھ صرف و نحو کی تعلیم ہوتی تھی، پھر کچھ تھوڑا سا حساب سکھایا جاتا تھا، پھر قرآن مجید پورے طور سے قرأت وغیرہ کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا، اس کے بعد بچے کو کسی داستان گو کے سپرد کر دیتے تھے جو بادشاہوں کی جنگ و فتح کے قصے سناتا تھا، بہادروں کے حالات بتاتا تھا، شہ سواروں اور سپہ سالاروں کی کہانیاں سناتا تھا، اصحاب جنگ و جدل کی سیرت بیان کرتا تھا، اور یہ سب وہ اس طرح کرتا تھا کہ عبرت و موعظت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا، باتیں پورے طور سے بچے کے دل میں گھر کر جاتی تھیں، اسی سلسلہ میں عابدوں اور زاہدوں، خلوت نشینوں اور بزرگوں کے حالات بھی بیان کرتا جاتا تھا، ان متفرق معلومات پر عبور حاصل کر لینے کے بعد مساجد عامہ کے حلقہائے درس میں شریک ہوتا تھا، فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محدث کے ہاں کا رخ کرتا تھا، پھر اہل لغت کی مجلس میں جاتا تھا، وہاں سے ماہرین انساب کے درس میں شریک ہوتا تھا، وہاں سے ماہرین اخبار و آثار کے پاس حاضر ہوتا تھا، پھر منطقی کی مجلس میں، وہاں سے فلسفی کے ہاں، پھر محفل ادب میں، وہاں سے مہندس کے "عمل" میں، پھر مفسر کے ہاں زانوئے شاگردی تہ کرتا ہوتا تھا، وہاں سے اصولی و متکلم کی جماعت میں، پھر محفل روایت میں، اور وہاں سے شاعر کے فکر و ذکر میں، پھر انشا پردازوں کے دفتر میں، اور وہاں سے منجمین کے رصد خانوں میں، پھر کسی طبیب کے حضور میں، اور وہاں سے کسی جغرافی کے سامنے، پھر بزم موسیقی کے کسی "استاد" کے دولت کدے پر، وہاں سے کسی ساز و چنگ کے مرشد کے پاس، پھر کسی دف و نے بجانے والے کے گھر پر۔ یہ ہے اس زمانہ کے اسلوب تعلیم کا ایک مختصر خاکہ جس سے لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو بقدر استعداد حصہ ملتا تھا۔ جب طالب علم اپنے علم و فن میں استحکام حاصل کر لیتا تھا تو اسے اپنے "شیخ"

طرف سے سند ملتی تھی۔ اس کے بعد اسے حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ مسند درس و تدریس کو سنبھال لے، لیکن بہت سے ان اسناد پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے بعد بھی بادیہ گردی کرتے تھے۔ بڑے بڑے شیوخ و علماء سے ملاقات کرتے تھے، استفادہ کرتے تھے، مجلس مناظرہ منعقد کرتے تھے۔

اسی نظام و دستور کے مطابق جاحظ نے بصرہ اور کوفہ کے اکابر علماء سے تعلیم حاصل کی۔ جن لوگوں سے اس نے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند کے اسماء گرامی آپ بھی سن لیجیے، مثلاً ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ، اصمعی، ابوزید انصاری، اخفش اور ابو اسحٰق نظام سے اس نے علوم کلام و مذہب اعتزال کی تعلیم حاصل کی۔

اس نے اپنے شیوخ سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ تو کیا ہی تھا، پھر بھی وہ بصرہ کے مربد میں جایا کرتا تھا اور تازہ وارد اعراب بادیہ سے فصاحت و بلاغت کے درس لیتا تھا[۵۱]۔

اس مربد میں عرب تجارت اور اسباب تجارت کی خرید و فروخت اور لین دین کے لئے آیا کرتے تھے۔ خطبا و شعرا، رواۃ و نساب، رجز خواں اور ارباب بلاغت جو مختلف قبائل سے متعلق ہوتے تھے سب ہی آتے تھے، اپنے نتائج افکار پیش کرتے تھے، داد فصاحت دیتے تھے، اور خراج تحسین لیتے تھے، یہ مربد گویا اسلام میں "سوق عکاظ" کا دوسرا نمونہ تھا۔

جاحظ نے علم حدیث بھی بہت سے ثقہ اور قابل استناد بزرگوں سے حاصل کیا تھا مثلاً قاضی ابویوسف شاگرد امام ابوحنیفہ (قاضی القضاۃ، چیف جسٹس، بغداد) یزید بن ہارون سری بن عبدویہ، حجاج بن محمد بن حماد بن سلمہ وغیرہ۔[۵۲]

جاحظ سے بھی بہتوں نے اس فن کو حاصل کیا مثلاً مبرد، یموت بن مزرع اور ابوبکر بن ابی داؤد

---

[۵۱] اعراب بادیہ کی فصاحت و بلاغت ہمیشہ معیار رہی، اب کہ دنیا اسقدر تہذیب و تمدن سے آشنا ہو چکی ہے اور زبان عربی بھی مختلف ادوار سے گزر چکی ہے، باایں ہمہ اب تک اعراب بادیہ کی عربی سند ہے۔ (مترجم)

[۵۲] ؟ (مترجم)

سجستانی وغیرہ۔

اسباب معاش اور عزت وجاہ

جاحظ کے ابتدائی ایام بہت تنگدستی اور فقر وفاقہ میں بسر ہوئے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ نہر سیحان پر مچھلی اور روٹی بیچا کرتا تھا۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو بہر حال اس سے یہ تو ثابت ہی ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام اس کے بہت عسرت و فلاکت میں گزرے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اس کی سبکی ہوتی ہو جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے فضل و کمال کا ایک زمانہ قائل ہے، اس کی تصنیفات سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، جب وہ روشناس خلق ہوا تو ساری دنیا اس کی طرف امنڈ پڑی، اس کے اسباب معیشت وسیع ہو گئے اور وہ عیش و عشرت میں اپنی زندگی بسر کرنے لگا۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ وزراء دولت اور عمائد سلطنت اس سے قرب رکھنے لگے مثلاً خاندان برامکہ کے افراد، آل طاہریہ کے اشخاص، فتح بن خاقان، ابراہیم بن عباس الصولی، محمد بن عبد الملک زیات، احمد بن ابی داؤد وغیرہ۔

میمون بن ہارون نے یہ دیکھ کر کہ اب تو اس کی خوب مزے میں بسر ہوتی ہے ایک بار اس سے دریافت کیا "کیا بصرہ میں تمہارے پاس کوئی جاگیر ہے؟"

جاحظ مسکرایا اور کہا " ہاں، میں ہوں، میری جاریہ ہے، ایک خادمہ ہے جو اس کی خدمت کرتی ہے، ایک نوکر ہے، ایک گدھا ہے، بس یہ ہے میری کل کائنات، ایک بار میں نے اپنی کتاب "الحیوان" محمد بن عبد الملک زیات کو ہدیۃً بھیجی تو اس نے مجھے پانچ ہزار دینار عطا کئے، "البیان و التبیین" احمد بن ابی داؤد کو میں نے عطیۃً بھیجی، اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار بخشے، اسی طرح کتاب "الزرع والنخل" ابراہیم بن عباس الصولی کو میں نے بھیجی اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار عنایت کئے، اب میں بصرہ میں ہوں، میری جاگیر میرے ساتھ ہے جو نہ تجدید کی محتاج ہے نہ اس کی کھاد وغیرہ کی فکر کی جائے۔

جب جاحظ کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی تھی تو پھر یہ امر باعث حیرت نہیں رہ جاتا کہ اس نے زمین کے چپہ چپہ کو علم سے لبریز کر دیا اور اپنے امثال واقران سے فضل و فہم میں بہ مدارج بڑھ گیا اور

ن پر متعدد تصانیف کا ایک ذخیرہ تیار کر دیا اس لئے کہ نعم و عطایا آدمی کو بے فکر کر دیتے ہیں اور وہ
ستعداد کے مطابق اپنے ذوق سے کام لیتا ہے۔

جاحظ کے بعض احباب واخوان اس کے پاس آئے اور پوچھا "کہو ابو عثمان کیا حال ہے؟"
نے جواب دیا "تمہارے سوال کے دو پہلو ہیں دونوں کا الگ الگ جواب سن لو۔ حال تو میرا
کہ وزیر میری رائے پر عمل کرتا ہے، جو میں کہہ دیتا ہوں اس کو نافذ کرتا ہے، خلیفہ کے انعامات
ات کا ایک سلسلہ ہے کہ جاری ہے، پرندوں کا گوشت کھاتا ہوں، نرم وریشمی لباس پہنتا ہوں،
طبرستانی گدہ پر بیٹھتا ہوں اور دیکھو یہ تکیہ لگاتا ہوں اور اب چاہتا ہوں کہ خدا کسی طرح یوم عیش
رت لائے" ان میں سے ایک نے کہا "اب جس حال میں ہو یہ عیش و مسرت نہیں ہے؟" جاحظ
جواب دیا "عیش و مسرت تو جب حاصل ہوگی جب خلافت میرے قبضہ میں ہوگی۔"

ان الفاظ میں گویا خود جاحظ نے اپنی عزت و جاہ کا پورا حال بیان کر دیا ہے۔ رہی خلافت
تو یا تو یہ اس کی حرص بے پایاں کا ایک ثبوت ہے، یا پھر اس نے بطور مزاح کہا ہوگا ورنہ
ی بات وہ سنجیدگی سے کہتا تو اس کا نتیجہ بھی نہایت تلخ ہوتا ۔ وہ سمجھدار آدمی ایسی احمقانہ
کیوں کرتا۔ مزاح میں یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی ہوگی۔

نی | میر منشی کا منصب اسلامی ممالک میں نہایت اہم عہدہ تھا، حکومت عامہ کی سیاست اسی محور پر
ش کرتی تھی۔ اس منصب جلیل پر وہی معمور کیا جاتا تھا جو مختلف علوم و آداب میں دسترس رکھتا
جس کا شمار اصحاب سیاست و تدبیر میں ہوتا تھا اور جو اپنی دانش و بینش کی بنا پر عام طور سے
ز سمجھا جاتا تھا۔

مامون الرشید نے جاحظ کی فضیلت کی بنا پر اسے اس عہدہ پر مامور کر دیا۔ بعض لوگوں
ں کی یہ سرافرازی و قدر افزائی گراں گزری۔ وہ لوگ طرح طرح کے حیلے سوچنے لگے اور مامون
اس کی چغلی بھی پہونچنے لگی۔ یہ رنگ دیکھ کر تین ہی دن کے بعد جاحظ نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ
دیا جو منظور ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاحظ ان آزاد نگاروں میں تھا جو اپنا قلم آزاد رکھتے ہیں اور اصحاب دولت و اقتدار، خلفا و ملوک اور وزرا و ارباب دولت سے مرعوب نہیں ہوتے یا ان لوگوں میں تھا جو اس قسم کے مناصب کو حصول عزت وجاہ کا ایک زینہ سمجھتے ہیں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا میلان آزاد نویسی ہی کی طرف تھا۔

علم و وسعت علم | جاحظ نے بہت سے علوم میں کمال حاصل کیا تھا، فلاسفۂ یونان، حکمار ہند، علمار فارس اور ادبار روما ن کی اکثر کتابیں اس نے مطالعہ کی تھیں، ان کے افکار و آرا پر اس نے غور کیا تھا کسی علم و فن کی کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو عربی میں ترجمہ ہوئی ہو اور جاحظ نے اس کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

ابو ہفان کہتے ہیں "جاحظ سے زیادہ کتابوں کو محبوب رکھنے والا نہ میں نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ جو کتاب بھی اس کے ہاتھ پڑ گئی بس ختم کر کے دم لیا" یہ شوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ کتب فروشوں سے رات رات بھر کے لئے ان کی دوکان کرایہ پر لیتا تھا اور رات بھر کتابیں دیکھا کرتا تھا۔ حافظہ بھی غضب کا تھا۔ بہت زیادہ وسیع الروایۃ، قوی الحجۃ اور تیز زبان تھا۔ اسے علم و فضل کی "انسائیکلوپیڈیا" کہنا چاہئے، دنیا کی کون ایسی چیز تھی جو اس کے احاطۂ معلومات سے خارج تھی؟

اس کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی جانتا تھا۔ اس دعوے کی کوئی ایسی مسکت دلیل نہیں ہے جو پورے طور سے اس کو ثابت کرتی ہو لیکن اسی کی عبارت و الفاظ سے ایسے قرائن ضرور ملتے ہیں جو اس رائے کے مؤید ہیں۔

ابو بکر احمد بن علی کا یہ قول جاحظ کی وسعت علم و کمال پر ایک مزید شاہد ہے وہ کہتا ہے:-

"جاحظ اصحاب نظام میں سے تھا۔ علم کلام میں وہ پورے طور سے ماہر تھا۔ علوم دین و دنیا میں بھی وہ بہت بڑا فاضل تھا۔ اس کی بہت سی مشہور کتابیں دین و مذہب کی حمایت میں ہیں، نیز آداب و اخلاق اور ظرافت و سنجیدگی سے متعلق بھی اس نے

بہت سی کتابیں لکھی ہیں. لوگ ان کتابوں کو پڑھتے ہیں اور اس کے فضل و کمال کے قائل ہوتے ہیں. جاحظ معتزلہ و غیر معتزلہ ہر جماعت میں نہایت عظمت و عزت کا مالک تھا. جو علماء اشخاص کے قدر شناس اور معاملہ فہم ہیں وہ اسے خوب جانتے ہیں؛

جاحظ کی کتابیں دوسروں کے نام سے | جیسا کہ ہر عہد و ہر زمانہ میں ارباب قلم آفات فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے جاحظ بھی نہ بچ سکا۔ قدماء کے آثار کی عظمت گزشتہ لوگوں کا اعتبار لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت اپنے زمانہ کے چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب "التنبیہ والاشراف" میں روایت کی ہے کہ جاحظ باوجود اپنی جلالت قدر کے کہتا تھا۔

"میں نے بہت سی کتابیں تالیف کیں جو کثرت معانی اور حسن نظم کی بنا پر خوب تھیں لیکن میں نے لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں دیکھی، پھر میں نے اس سے کم درجہ کی کتابیں تالیف کیں. کسی کو میں نے عبداللہ بن مقفع کی طرف منسوب کر دیا کسی کو سہل بن ہارون کی طرف یا ان کے علاوہ متقدمین میں سے کسی اور کی طرف. بس لوگ دوڑ پڑتے تھے اور نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے تھے۔ ان کتابوں میں سوا اس کے کوئی بات نہیں تھی کہ میں نے انھیں متقدمین کی طرف منسوب کیا تھا"

اس قول صریح سے ثابت ہوتا ہے کہ جاحظ نے اپنی بہت سی کتابوں کو ابن مقفع اور سہل بن ہارون وغیرہ کی طرف منسوب کیا۔

تعجب خیز یہ بات ہے کہ اس اعتراف صریح کے باوجود اب تک دس صدیاں گزر چکی ہیں لیکن کوئی ایسا مرد باخدا نہ ہوا جو ابن مقفع کی کتابوں کا مطالعہ کرکے جاحظ اور اس کے اسلوب کا فرق مدنظر رکھ کے کوئی تحقیق کرتا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ابن مقفع کے اب آثار ہی کیا موجود ہیں. جس طرح جاحظ کی بہت سی کتابیں محو ہو گئیں سہل بن ہارون اور ابن مقفع کی کتابیں بھی نذر دور ایام ہو گئیں۔ جس طرح جاحظ نے اپنی بہت سی کتابیں دوسروں کی طرف غلط طور سے منسوب کر دیں

اسی طرح دوسروں نے بھی اس کی طرف بہت سے مصنفات (شاید طلب منفعت کے خیال سے) منسوب کردئے، جیسے کتاب "الابل" اور کتاب "الہدایا" حسب تحقیق یاقوت (صاحب معجم) ایک عرصہ سے اس کی طرف منسوب ہیں "تنبیہ الملوک والمکائد" بھی اس کی طرف منسوب ہے جس کی جانب احمد ذکی پاشانے اشارہ بھی کیا ہے۔

"المحاسن والاضداد" کتاب "التاج" "الدلائل والاعتبار علی الخلق والتدبیر" بھی اس کی طرف غلط طور سے منسوب ہیں۔ جاحظ کا اسلوب نگارش تو ان میں پایا نہیں جاتا۔

جاحظ نگاہ اعدا میں | ارباب علم ودانش کی ایک مخالف جماعت بھی ان کے قدر دانوں اور معتقد افراد کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہی ہے، جاحظ بھی اس خصوصیت سے مستثنیٰ نہیں تھا، اس کے بھی دشمن تھے، بداندیش تھے اور یہ سب کے سب اس کے فضل وکمال کے منکر بھی تھے اور اسی طرح ذریعۂ اشاعت تھے جس طرح عقیدتمندوں اور دوستوں کی جماعت، اس کے خصوصیات وکمالات کی تبلیغ کیا کرتی تھی۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کے خصوم واعدا نے اس پر جو ناروا الزامات لگائے ہیں وہ آپ کے سامنے پیش کردیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ واقعہ کیا ہے؛ سب سے پہلے ہم ابن قتیبہ کے مطاعن سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:۔

"جاحظ کا شمار آخر متکلمین میں ہے۔ وہ ننگ متقدمین ہے۔ اس کا انداز عجیب و غریب ہے۔ وہ جب چاہتا ہے رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے پہاڑ کو رائی کر دکھاتا ہے۔ کبھی وہ کالوں کو گوروں پر بڑے شد ومد سے ترجیح دیتا ہے، کبھی وہ حامیان عثمانؓ کو روافض سے بہتر ثابت کرتا ہے اور کبھی وہ یزیدیوں کو عثمانیوں اور اہل سنت پر تفوق دیتا ہے، کبھی وہ حضرت علیؓ کی فضیلت بیان کرتا ہے اور کبھی ان کی تنقیص کرتا ہے۔ کبھی وہ ایک کتاب لکھتا ہے جس میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں پر اعتراضات ہوتے ہیں اور کبھی وہ احادیث رسول کے ساتھ تمسخر اور استہزا کرتا ہے جو "اہل علم سے پوشیدہ

نہیں مثلاً .... حجرِ اسود کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ وہ تو سفید تھا مشرکین و کفار نے اسے اپنی سیاہ کاریوں سے سیاہ کر دیا تو چاہئے تھا کہ اسلام جب پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے تو پھر وہ سفید ہو جاتا۔ اسی طرح صیغۂ رضاعت پر بھی وہ کہا کرتا تھا..... .... الخ"

اب آئیے ذرا ابن قتیبہ کے اس طعن کی حقیقت پر غور کریں۔ حجرِ اسود کے متعلق ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ حجرِ اسود جنت کے پتھروں میں سے ایک پتھر تھا، وہ اولے کی طرح سفید تھا لیکن مشرکین و کفار کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا لیکن حضرت محمد بن الحنفیہ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے) فرماتے تھے کہ حجرِ اسود انہی عام پتھروں میں سے ایک پتھر ہے[1]۔ جاحظ حضرت بن عباس کی طرف جو قول منسوب ہے اس کی ندرت کی بنا پر یہ کہا کرتا تھا پھر مسلمانوں نے مسلمان ہو کر اسے سفید کیوں نہیں کر لیا؟

اب رضاعت کے مسئلہ کو لیجئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی طرف ایک قول منسوب ہے کہ "رجم ورضاعت کے متعلق وحی آئی، وہ ایک کاغذ میں میرے بستر کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت رکھی ہوئی تھی۔ جب آنحضرت نے انتقال فرمایا تو ہم اس میں مشغول ہو گئے اتنے میں کسی قبیلہ کی ایک بکری آئی اور اسے کھا گئی ...." یہ عجیب بات ہے علماء احناف اس مسئلہ میں جاحظ کے ہم آہنگ ہیں۔ "جواہر مضیئہ" میں ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تحریم رضاعت قلیل و کثیر دونوں سے ہوتی ہے اور امام شافعی کے ہاں پانچ رضعات کے بعد ہوتی ہے۔ ابو حنیفہ تو دلیل میں حدیث پیش کرتے ہیں "الرضاعة من المجاعة" لیکن شوافع کی دلیل کیا ہے؟ احناف کہتے ہیں کہ دلیل تھی تو شوافع کے پاس بھی لیکن اسے بکری کھا گئی!

جاحظ بلکہ تمام معتزلہ اس قسم کے خرافات و مہملات سے انکار کرتے ہیں اور واقعہ تو یہ ہے

---

[1] یہ قول بھی مشتبہ ہے۔ (مترجم)۔

کہ ان کے دلائل بھی بڑے قوی ہیں۔ اس واقعہ کو وہ قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں "وانہ لکتاب عزیز، لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ" تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس جیسی عزیز و مستحکم چیز کو بکری کھا لیتی؟ فرض باطل ہو جاتا اور دلیل ساقط ہو جاتی؟ ویسے تو دنیا کی ہر شخصیت اسے نہ باطل کر سکتی نہ محو کر سکتی ہے لیکن ایک بکری کے قبضہ تصرف میں یہ کیسے ہے؟ اور اگر ایسا تھا بھی تو قرآن کی اس آیت کی کیا تاویل ہوگی؟ "الیوم اکملت لکم دینکم"۔ یہ کہنے کے بعد خود خدا نے اسے بھیج دیا کہ وہ کھائے؟ اور یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وحی کو بکری کے کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس کی حفاظت و صیانت کا کوئی انتظام نہ کیا جائے؟ اور پھر وہ آیت نازل ہی کیوں کی گئی اگر اسے معمول بہ نہیں بننا تھا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ جاحظ کے اعتزال کی بنا پر ابن قتیبہ کو اس سے پرخاش تھی اور حقاً تعصب کا یہ نہایت عجیب نمونہ ہے کہ ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا جائے۔

رہی ابن قتیبہ کی یہ تنقیص کہ وہ ایک چیز بڑی شد و مد سے ثابت کرتا ہے اور اسی زور و شور سے اس کی تردید بھی کرتا ہے تو یہ تو گویا اس کی قوت بیان کا اعتراف ہے۔ اسے ابن قتیبہ نے کیوں کر فراموش کر دیا کہ یہ اعجاز بلاغت ہی جو خدا کی طرف سے صرف جاحظ ہی کے حصہ میں آیا تھا یا اسے بھی چھوڑئے۔ اس پر غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز ہے جو معائب سے بری ہو؟ یا یکسر خیر ہو یا سراسر شر؟ ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے دو پہلو نہ نکلتے ہوں، ایک حیثیت سے وہ سزاوار ستائش ہوتی ہے تو دوسرے اعتبار سے مستحق مذمت، اور یہ جاحظ کا کمال ہے کہ جو چیز پیش کرتا ہے وہ اس قدر مجلا اور مشرح طور سے کہ دوسرا نہیں کر سکتا۔

ابو العباس ثعلب سے روایت کی جاتی ہے کہ ایک مجلس میں اس نے کہا "جاحظ کا چھوڑو، وہ تو غیر ثقہ ہے۔ شاید اسی قول کی بنیاد پر ابو منصور ازہری کا یہ قول بھی ہے کہ "جاحظ زبان و خطابت میں ملکہ حاصل تھا، علوم و فنون میں نہایت وسیع النظر تھا، لیکن اہل علم و معا

اس کی برائی کرتے ہیں، اور اس کے صدق کو مشتبہ سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے اقوال سے جاحظ کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے جن پر نہ کوئی دلیل ہو نہ برہان۔ بات تو وہ قابل التفات ہوتی ہے جو دلائل و براہین سے محکم ہو۔

بدیع الزماں ہمدانی اپنے ایک مقامہ میں جاحظ کا ذکر بایں الفاظ کرتا ہے :۔

"جاحظ بلاغت کے دو پہلوؤں میں سے ایک میں خوشہ چینی کرتا ہے اور دوسرے میں ٹھہر جاتا ہے۔ بلیغ تو وہی کہلاتا ہے جس کی نثر و نظم کا پلہ برابر ہو اشعار سے اس کا کلام داغدار نہ ہو جاتا ہو۔ تو جاحظ کا کوئی عمدہ شعر تم میں سے کسی کو معلوم ہے؟ ہم نے کہا، نہیں، تو کہا، اس کا کلام لاؤ، تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کے کلام میں اشارات کم ہیں، عبارت قریب المفہوم ہے، استعارہ بھی شاذ و نادر ہیں، کلام میں پیچیدگی نہیں ہے، سیدھا سادا کلام وہ استعمال کرتا ہے۔ کیا تم میں سے کسی نے اس کا کوئی ایسا کلمہ سنا ہو جو سماعت پر بار ہو؟"

بدیع الزماں کے اس قول کو میں جاحظ کی حمایت میں سمجھتا ہوں مخالفت میں نہیں، اس لئے کہ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ادبا میں بہت کم پائے جاتے ہیں لیکن جاحظ میں تھے۔

لغزش | جاحظ اپنی وسعت علم، گیرائی فہم اور دانش و بینش کے باوجود کبھی کبھی ٹھوکر بھی کھا جاتا ہے اور دنیا میں کون ایسا ہے جس سے کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی غلطی نہ ہوئی ہو۔ وہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، مثلاً مسعودی نے جغرافیہ میں اس کی ایک غلطی نکالی ہے کہ :۔

"سندھ میں مکرون نامی جو نہر ہے جاحظ اسے دریائے نیل کا ایک حصہ سمجھتا تھا اور دلیل اس پر یہ لاتا تھا کہ اس میں بھی گھڑیال ہیں جس طرح نیل میں ہیں۔ کم سے کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ گھڑیالوں کا وجود دلیل کیوں کر بن سکتا ہے؟ اس نے اپنی کتاب "امصار" میں لکھا ہے کہ اس نے نہ کبھی دریا کا سفر کیا، نہ وہ کوئی بڑا بھاری سیاح تھا، نہ راستوں سے واقف تھا، اس کی حالت تو اس شخص کی سی تھی جو رات کو جنگل سے اندھیرے میں لکڑیاں

چن رہا ہو ایسے ہی وہ بھی دوسروں کی کتابوں سے نقل کر دیتا ہے:

اس میں شبہ نہیں کہ مسعودی کا اعتراض بجا ہے، علاوہ ازیں وہ اس فن میں مہارت رکھتا تھا، لیکن اس لغزش سے جاحظ کا درجہ کم نہیں ہو جاتا اس لئے کہ علم و عمل کے میدان میں ایک جغرافی کی حیثیت سے قدم نہیں رکھا تھا۔

جاحظ نگاہ حق شناس میں | ایک وہ شخص جو اس کی فضل و منزلت سے واقف ہو اس کے نزدیک بلا شبہہ عربی انشاپردازوں کا سردار، ادبا رعرب کا شیخ، اور ارباب علم و بیان کا امام ہے، فصاحت کا ستون ہے، ارباب فلسفہ و حکمت اور اہل علم و ادب میں سے کوئی شاید ہی اس جیسے کمال تک اس کے معارف کا درجہ تو یہاں تک بلند ہے کہ اسے ان لوگوں میں شمار کرنا چاہئے جن پر اُ فخر ہے!

ابو حیان توحیدی نے ایک مستقل کتاب "تقریظ الجاحظ" کے نام سے لکھی ہے۔ ہم کتاب کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن یاقوت نے اس کتاب سے یہ عبارت نقل کی ہے:

"ہم سے صابئین[1] کی ایک جماعت نے بیان کیا کہ ثابت بن قرہ[2] نے کہا کہ امت عربیہ میں تین ہستیاں بہت زیادہ قابل رشک گزری ہیں، ان میں سے پہلی ہستی تو عمر بن الخطاب کی ہے، .... دوسری ذات حسن بصری کی ہے ....[3] اور تیسری شخصیت ابوعثمان الجاحظ کی ہے جسے خطیب المسلمین، شیخ المتکلمین کہیے تو بجا ہے۔ وہ جب

---

[1] کافر

[2] پورا نام ابوالحسن ثابت بن قرہ ہے: مذہباً صابی تھا، طبیب و فیلسوف، صاحب فضل و کمال تھا، حکمت میں خاص دستگاہ رکھتا تھا۔ ۲۲۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۸۸ھ میں بمقام بغداد انتقال ہوا۔

[3] صاحب کتاب نے اس مقام پر ان دونوں بزرگوں کے متعلق ثابت بن قرہ کی تفصیلی رائے نقل کر دی چونکہ اس کا اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا اس لئے اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ (مترجم)

گفتگو کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سحبان[1] کی فصاحت و بلاغت سے کان آشنا ہو رہے ہیں۔ وہ اگر مناظرہ کرتا ہے تو نظام کو مات کر دیتا ہے۔ اگر سنجیدگی سے کچھ کہتا ہے تو عامر[2] بن عبد قیس سے بھی بڑھ جاتا ہے، اور اگر ہزل و مذاق پر اتر آتا ہے تو مزبد[3] سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ تو جاحظ وہ تھا جس سے دل کو سرور اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ شیخ العرب اور لسان العرب تھا۔ اس کی کتابیں ایک ایسا باغ ہیں جو کلیوں سے لبریز ہوں اور اس کے رسائل ان کے پھل، بڑے بڑے خلفا اس کی عظمت کے قدر شناس تھے اور امرا اس کی تعریف میں رطب اللسان، بادشاہ اسے اپنا ندیم بناتے تھے اور علما اس سے کسب علم کرتے تھے، بڑے بڑے مغرور متکبر اس کے فضائل کو تسلیم کرتے تھے اور عامۂ خلائق اس کی محبت میں سرشار تھی، وہ زبان و قلم دونوں کا مالک تھا، علم و ذہانت دونوں اس کے حصہ میں تھیں، رائے اور ادب پر بھی اسے قابو حاصل تھا، نثر و نظم کا بھی وہ بادشاہ تھا اور فہم و ذکا سے بھی اسے بہرۂ وافر ملا تھا، اس کی عمر بھی خاصی ہوئی، اس کی حکمت سارے جہان میں بوئے گل کی طرح پھیلی، لوگوں نے اس کے نقش قدم پر چلنا باعث سعادت سمجھا، اس کے نام سے انتساب باعث فخر و نازش مانا گیا اور جنھوں نے اس کی پیروی کی وہ کامیاب ہوئے بلاشبہ اسے "حکمت" اور "فصل خطاب" دونوں جوہر بخشے گئے تھے۔"

ابوحیان کہتا ہے یہ قول ایک صابی کا ہے جس کے دل میں اسلام کی ذرا بھی حرمت نہیں ہے نہ مسلمانوں کا کوئی احترام ہے، اس نے یہ تنقید کی ہے اور حق کو ایسی نظروں سے دیکھا ہے کہ ہوا و ہوس کے جذبات دور کر دئے ہیں، ایسی عقل سے کام لیا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ تعصب کو فراموش

---

[1] سحبان وائل مشہور عربی خطیب۔

[2] فصاحت و بلاغت میں مرتبۂ خاص کا مالک تھا۔

[3] ابواسحٰق مزبد، نوادرات و نکاہات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

کر گیا ہے، ہم اپنے دوسرے اسلاف و اخلاف کے فضائل و محاسن سے ناواقف نہیں ہیں لیکن ہمیں
شخص کی یہ بات پسند آئی کہ جو اگرچہ ہمارا ہم قوم و ہم زبان نہیں ہے اور جو شاید حضرت عمر بن الخطاب
سوانح حیات پر پورا عبور بھی نہیں رکھتا، اور اسی طرح جاحظ کے علم و ادب پر پوری وسعت نظر بھی
رکھتا، لیکن بایں ہمہ وہ ایسی بات کہتا ہے اور اس طرح رشک کرتا ہے اور جاحظ پر اپنے کلام کو فخر
کرتا ہے، ایک عیب جو جاحظ میں معائب ہی معائب دیکھتا ہے لیکن وہ اس سے قطع نظر کر کے ا
صفائی دیتا ہے۔

ابو حیان کہتا ہے میں نے ابو محمد الاندلسی[1] سے (جو سیرانی کی جماعت کے ایک رکن۔
کہا، ہم ابو سعید سیرانی کی مجلس میں سرگرم تکلم تھے، کہ ایک اختلاف آن پڑا اور وہ اختلاف ہے
اور ابو حنیفہ[2] صاحب "النبات" کی فصاحت و بلاغت کے متعلق اور ہم سب تمہیں حکم بنانے
راضی ہیں، اب کہو تمہاری کیا رائے ہے؟

محمد نے کہا، میں ان دونوں کی حمایت یا مخالفت میں کچھ کہنے کی اپنے اندر جرأت نہیں
میں نے کہا، بہرحال کچھ تو کہئے۔

محمد نے جواب دیا، ابو محمد ندواۃ کے اعتبار سے زیادہ ہیں اور ابو عثمان (جاحظ) ع
کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں، ابو عثمان کے معانی دل پر اثر انداز ہوتے ہیں کانوں کو گراں

---

[1] پورا نام ابو محمد عبد اللہ بن حمود الزبیدی الاندلسی، نحو، لغت اور شعر کے امام تھے۔ جاحظ کے کلام سے ب
رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جنت میں اس کے سارے اسباب تنعم کے بجائے اگر مجھے جاحظ
ملائیں تو میں اس "تبادلہ" پر تیار ہوں۔ ابو سلیمان منطقی اور ابو سعید سیرانی کی جماعت کے ایک بہت
رکن تھے۔

[2] ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن ونند الدینوری، مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ ایک کتاب
پر لکھی اس میں بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔

گزرتے، ابوحنیفہ کے الفاظ بہت زیادہ شیریں ہوتے ہیں، اور اسالیب عرب کے بہت زیادہ آئینہ دار ہوتے ہیں۔

یاقوت کے قول کے مطابق ہنر شناسان علم کلام کی متفقہ رائے یہ ہے کہ دنیا میں بس تین متکلم گزرے ہیں، جاحظ، علی بن عبیدہ[1] اور ابوزید بلخی۔ ان میں سے جاحظ تو وہ ہے جس کے الفاظ معانی سے زیادہ ہوتے ہیں اور علی بن عبیدہ وہ ہے جس کے معانی الفاظ سے زیادہ ہوتے ہیں اور ابوزید وہ ہے جس کے لفظ و معنی دونوں کا توازن بالکل درست ہوتا ہے لیکن اس رائے کے باوجود خود یاقوت نے روایت کی ہے کہ ابوزید کو "جاحظ خراسان" کہا جاتا تھا۔ جاحظ کی جلالت شان و عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ ابوزید بلخی جیسا فخر روزگار اس کی طرف منسوب کیا جائے۔

ابوالفضل بن عمید ان لوگوں میں سے تھے جو جاحظ کے پرستاروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اسی کے اسلوب و مذہب کے وہ عامل تھے۔ اگر کوئی انھیں جاحظ ثانی کہدیتا تو بہت خوش ہوتے، ان کا سینہ جاحظ کی عظمت و بزرگی سے بھرا ہوا تھا۔ اگر کوئی صاحب آداب و علوم ان کے پاس آتا اور وہ اس کا امتحان لینا چاہتے کہ عقل و ذہانت میں کیسا ہے تو پہلے تو وہ بغداد کے متعلق اس کی رائے دریافت کرتے، اگر وہ بغداد کے خصوصیات و محاسن سے واقفیت کا ثبوت دیدیتا تو گویا یہ اس کے فضل و عقل کا مقدمہ ہوتا، پھر جاحظ کے متعلق پوچھتے۔ اگر دیکھتے کہ اس کے انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اس کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے، اس کے بحر علم و کلام سے جرعہ نوشی کی ہے تو اس کے متعلق فیصلہ کردیتے کہ اس کی پیشانی پر علم و ادب کا نشان چمک رہا ہے۔ اور اگر دیکھتے کہ یہ شخص بغداد کی برائی کر رہا ہے،

---

[1] علی بن عبیدہ الریحانی نہایت ذکی و ذہین شخص تھا، مامون الرشید کے صاحب اعتماد لوگوں میں شمار ہوتا تھا، فصاحت و بلاغت میں بھی بڑا پایہ رکھتا تھا۔ حکماء کے طرز پر اس کی بہت سی کتابیں ہیں، بعض لوگوں نے اس پر زندقہ کا الزام بھی لگایا ہے لیکن یہ غلط ہے بلکہ معتزلہ کی جماعت کا ایک ذی علم شخص تھا۔

جاحظ کے واجبات و معارف سے ناآشنا ہے تو پھر وہ چاہے جتنے محاسن رکھتا ہو سب بے کار۔

ابوالقاسم سیرانی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے استاذ ابوالفضل بن العمید وزیر کے دولت خانہ پر حاضر تھے باتوں باتوں میں جاحظ کا ذکر نکل آیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کی برائیاں بیان کرنا شروع کیں لیکن وزیر صاحب خاموش رہے۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے پوچھا تعجب ہے آپ اس آدمی کی باتوں پر خاموش رہے حالانکہ اور لوگوں سے آپ خوب بحث کرتے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا اس کے مقابلہ سے زیادہ بلیغ صورت یہ تھی کہ اسے اس کے جہل پر باقی رہنے دیا جاتا۔ اگر میں اسے روک کے دلائل پیش کرنے لگتا تو وہ جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور اے ابوالقاسم وہ آدمی بن جاتا، جاحظ کی کتابیں پہلے عقل سکھاتی ہیں پھر علم و ادب اور یہ میں چاہتا نہیں کہ وہ آدمی بنے!

ابن عمید کہتے ہیں تین علوم ایسے ہیں کہ تمام دنیا ان کے بارے میں تین آدمیوں کی "عیال" ہے۔

فقہ میں امام ابوحنیفہ،

کلام میں ابوالہذیل العلاف[1]،

فصاحت و بلاغت میں ابوعثمان جاحظ۔

ابومحمد الحسن بن عمرو النجرمی کا ایک عجب دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اندلس میں تھا۔ میں نے سنا کہ یہاں جاحظ کے ایک شاگرد ہیں جنھیں سلام بن یزید کہتے ہیں ابوخلف کنیت کرتے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ وہ ایک مسن آدمی تھے۔ میں نے ان سے جاحظ کی ملاقات کا حال دریافت کیا اس لئے کہ جاحظ تو کبھی اندلس میں آیا نہیں تھا انھوں نے کہا

---

[1] ابوالہذیل العلاف بصری، ان کا شمار اکابر معتزلہ اور افاضل اہل کلام میں کیا جاتا ہے۔ صاحب علم و نظر بزرگ تھے منطق و فلسفہ وغیرہ میں متقدمین کی تمام کتابوں پر نہایت وسیع نظر رکھتے تھے۔

مشرق کے طلبہ ہمارے بادشاہوں کے ہاں اس لئے شرف وعزت کے مستحق سمجھے جاتے تھے کہ وہ جاحظ سے شرف ملاقات حاصل کر چکے ہیں۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں اس کی ایک کتاب "التربیع والتدویر" آئی، اس کے بعد ہی اس کی دوسری کتاب "البیان والتبیین" آئی، پھر میں نکل کھڑا ہوا اور کسی مانع کی پروا نہیں کی۔ جب بغداد پہونچا تو معلوم ہوا وہ سر من رأی میں ہے۔ ادھر کا قصد کیا تو معلوم ہوا وہ بصرہ جا چکا۔ بصرہ جب پہونچا تو خیر اس کے سامنے حاضری کا موقع حاصل ہوا۔ جاحظ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد بے ریش و بروت بیس لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، سوا اس کے کسی اور کی اس مجلس میں ڈاڑھی تھی ہی نہیں۔ اس منظر سے میں کچھ گھبرا سا گیا، میں نے پوچھا:

تم میں سے ابو عثمان کون ہے؟

اس نے میری طرف گھور کے دیکھا اور کہا

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں: "اندلس سے"

جاحظ: "احمقوں کی سرزمین، اچھا نام کیا ہے؟"

میں: "سلّام"

جاحظ: "ایک کتے کا نام، ابن؟"

میں: "ابن یزید"

جاحظ: "بہت خوب، کنیت؟"

میں: "ابو خلف"

جاحظ: "سگ زبیدہ کی کنیت، تشریف کیوں لائے؟"

میں: "علم حاصل کرنے"

جاحظ: "تشریف لے جایئے، کامیابی مشکل ہے"

میں: "آپ نے انصاف نہیں کیا، میں طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر کے یہاں تک پہونچا

ہوں:

جاحظ: "تم نے میرے اردگرد بیس لڑکے دیکھے، سوا میرے کسی کے ڈاڑھی نہیں تھی، پھر مجھے پہچاننے میں وقت کیا پیش آئی۔"

اُن تمام باتوں کے باوجود میں جاحظ کے ہاں بیس سال تک مقیم رہا۔"

میرا خیال ہے کہ جاحظ نے سرزمین اندلس کے متعلق جو کچھ کہا وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ عربوں کے دخول سے پیشتر اس میں مجد و شرف کا کوئی سامان نہیں تھا، نہ کوئی تمدن تھا، نہ تہذیب لیکن عربوں نے جب اسے فتح کیا تو وہ اپنے ساتھ صرف فوج و سپاہ نہیں لے گئے، بلکہ عقل و بینہ ذہن صافی، علوم صالح، حضارۃ نافعہ ہمت مرداں کے خزانے بھی لے گئے، وہ اپنے ساتھ جراثیم حیات اور اصول عمرانیت بھی لے گئے۔ انھوں نے وہاں مدنیت قائم کی، حضارت قائم کی، انسانیت کے شرف و بزرگی کا راستہ کھول دیا، لیکن جب وہ عہد مسعود ختم ہو گیا ان کی قوت عزیمت ضعیف پڑتی گئی، ان کی ہمت دبتی گئی تاآنکہ سب کچھ ختم ہو گیا!

تصنیفات کی شہرت | عرب انشاپردازوں میں شاید کسی شخص کی کتابوں نے وہ شہرت دوام اور ہردلعزیزی نہیں حاصل کی جو جاحظ کی تصنیفات کو حاصل ہوئی۔ جب بھی وہ کوئی کتاب یا رسالہ لکھتا تھا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے تھے، اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ جاتے تھے، کوئی زبانی یاد کرتا کوئی نقل کرتا تھا، غرض ایک دھوم مچ جاتی تھی۔

عالموں کی مجلسیں اور ادیبوں کی محفلیں جاحظ اور اس کی تصنیفات کے ذکر سے بھری رہتی تھیں۔ جہاں کسی شہر میں کوئی کتاب پہونچی بس اس کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابو حیان توحیدی کہتے ہیں کہ ہم سے علی بن عیسیٰ[۱] نحوی بیان کرتے تھے کہ میں نے اپنے شیخ

---

[۱] ابوالحسن علی بن عیسیٰ بن عبداللہ الرمانی، اخشیدی اور وراق سے مشہور ہیں لیکن زیادہ تر "رمانی" کے جاتے ہیں۔ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے، بہت بڑے متکلم تھے۔ ۲۹۶ھ میں ولادت ہوئی اور ۳۸۴ھ میں وفات۔

بن زخشید کو کہتے ہوئے سنا کہ

"جاحظ نے اپنی کتاب الحیوان میں اپنی تمام کتابوں کی فہرست لکھدی ہے، اس نے "الفرق بین النبی والمتنبی" اور "دلائل النبوۃ" کا "الفرق" کے ساتھ ذکر کیا ہے اور "الفرق" کا ذکر چوتھی جلد میں پھر کیا ہے۔ میں نے دونوں کتابیں دیکھنا چاہیں اور ان دونوں میں سے ایک ہی پر میں کامیاب ہو سکا یعنی "دلائل النبوۃ" پر جسے غلطی سے "الفرق" بھی کہتے ہیں۔ مجھے اپنی اس ناکامیابی پر افسوس ہوا۔ جب میں مصر سے مکہ میں داخل ہوا تو عرفات میں (جہاں دنیا بھر کے لوگ موجود تھے اور ایسا عجیب وغریب منظر تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا) میں نے پکارنا شروع کیا، خدا اس شخص پر رحم کرے جو "الفرق بین النبی والمتنبی للجاحظ" کا مجھے پتہ دے سکے لیکن یہ ندا بے اثر رہی اور کسی نے بھی اس کتاب کا اعتراف کیا نہ پتہ بتایا۔ ابن زخشید کہتے ہیں اس سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے دل سے کہہ سکوں کہ میں جو کچھ کر سکتا تھا، کر چکا۔

یاقوت کہتا ہے ابوعثمان جاحظ کی فضیلت کو یہ کافی ہے کہ ابن زخشید جیسا یگانۂ روزگار، جو فلسفہ کا ایک بڑا مبصر، اور معتزلہ کا ایک نہایت گراں پایہ سردار تھا جاحظ کی کتابوں کو اس درجہ عزیز ومحبوب رکھتا تھا کہ عرفات و بیت الحرام میں ندا دیتا رہا۔

ایک مجلس میں ابوہفان سے پوچھا گیا کہ تم جاحظ کی ہجو کیوں نہیں کرتے؛ حالانکہ وہ تمھیں چھیڑنے سے باز نہیں آتا۔ اس نے جواب دیا، خدا کی قسم اگر جاحظ ایک معمولی سا رسالہ بھی لکھدے تو اس کی شہرت چین تک پہونچے گی اور میں اگر ایک ہزار بیتیں بھی کہہ ڈالوں تو ہزار برس تک وہ یوں ہی رہیں گی۔

القاضی الفاضل[۱] جیسا شخص اقرار کرتا ہے کہ تمام انشاپردازان عہد جاحظ اس کی کتابوں سے نفع اٹھاتے تھے۔

---

[۱] ابوعلی عبدالرحیم القاضی الفاضل، صلاح الدین ایوبی کا وزیر باتدبیر، جو اپنی اصابت رائے، سیاست دانی، فصاحت،

اہل بصرہ اہل کوفہ سے تفاخر کیا کرتے تھے، اور اسی طرح اہل کوفہ اہل بصرہ سے خطیب بغدادی روایت کرتے ہیں کہ بصرہ کے لوگ کوفہ والوں سے ان کتابوں پر تفاخر کیا کرتے تھے کتاب الحیوان للجاحظ، کتاب سیبویہ، کتاب العین للخلیل۔

ابوالقاسم اسکافی کہا کرتے تھے کہ تین چیزیں ہیں جن کو میں بلاغت کا معیار سمجھتا ہوں (۱) قرآن مجید (۲) کلام جاحظ (۳) اور بحتری[1] کے اشعار۔

ابن درید[2] کے سامنے دنیا کی مسرت افزا چیزوں کا ذکر کیا گیا، انھوں نے کہا یہ چیزیں تو زیادہ سے زیادہ "فردوس نظر" ہوسکتی ہیں۔ وہ چیزیں کہاں ہیں جو دل کو طراوت بخشتی ہوں؟ لوگوں نے پوچھا وہ کیا؟ کہا جاحظ کی کتابیں، محدثین کے اشعار اور ابوالعین کے نوادر۔

ابو محمد اندلسی کہا کرتے تھے کہ جنت کے سارے سامان تنعم پر میں جاحظ کی کتابوں کو ترجیح دیتا ہوں۔

پایۂ تحقیق و شوق سفر | جاحظ ادب میں فرد فرید تھا، نہ صرف ادب میں بلکہ تمام علوم و فنون میں وہ یکساں مہارت رکھتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو مسائل علمیہ سے دلچسپی لیتے ہیں اور اہل بحث و نظر کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ اس نے نسابین کی اس بڑی غلط فہمی کو رفع کیا ہے انھوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے نہ معلوم کیا سے کیا کر دیا تھا مثلاً زبیر بن بکار سے روایت کی جاتی ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ ام نضر بن کنانہ ابن خزیمہ کا نام برۃ بنت مر بن ادبن طابخہ تھا اور کنانہ نے اپنے باپ خزیمہ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تب نضر کی پیدائش ہوئی (جیسی کہ عرب جاہلیت میں عادت

(بقیہ صفحہ ۴۴۱) بلاغت، ذکاوت اور بہت سے ممتاز خصائص میں مشہور امام ہے۔ ولادت ۵۲۹ھ ہجری میں بمقام عسقلان ہوئی اور وفات ۵۹۶ھ میں بمقام قاہرہ ہوئی۔

[1] ابوعبادۃ الولید بن عبید البحتری مشہور شاعر تھے، ولادت ۲۰۶ھ وفات ۲۸۴ھ۔

[2] ابوبکر محمد الحسن بن درید الازدی فن لغت وادب کے امام، ۳۲۱ھ میں بمقام بغداد فوت ہوئے۔

تھی کہ سوتیلا لڑکا اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی ماں سے نکاح کر لیا کرتا تھا، لیکن جاحظ نے اس افترا کے تار پود بکھیر کے رکھ دئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کنانہ کی کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی نہ از قبیل ذکر نہ انثیٰ، لیکن ان کی بھتیجی برۃ بن مر بن اد بن طابخہ تھیں جن کی کنانہ بن خزیمہ سے شادی ہوئی تھی، اور ان سے نضر پیدا ہوئے تھے، یہ صرف دو ناموں کا ایک ہونا ہے، اس سے اتنی غلط فہمی پھیلی ......
یہی وہ صحیح مسلک ہے جس پر اہل علم واہل نسب کا اتفاق ہے۔ جاحظ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ جو شخص عقیدہ قائم کرے کفر کا مرتکب ہوگا...... میرا تو یہ خیال ہے کہ جاحظ اپنے اس کارنامہ کی بنا پر یوم آخرت میں ماجور ہوگا۔

تحقیق علمی ہی کے خیال سے اس نے متعدد شہروں میں سفر کیا، وہ مصر بھی گیا اور وہاں ایک عرصۂ دراز تک مقیم رہا اور اپنے تجربات کی آزمائش کرتا رہا۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "حسن المحاضرہ" میں جہاں ان اہل علم کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مصر کا سفر اختیار کیا ان میں جاحظ کا ذکر نہیں کیا شاید اس لئے کہ وہ معتزلی تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ مختصر نمونہ اس باب میں کافی ہے۔

فن ترجمہ اور جاحظ | گزشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی میں کسی غیر زبان کی کوئی ایسی کتاب منتقل نہیں ہوئی (عام اس سے کہ وہ کسی علم وفن سے تعلق رکھتی ہو) جسے جاحظ نے پورے طور سے ضبط بلکہ بقول بعض "ہضم" نہ کر لیا ہو، اگرچہ اس زمانہ میں نہ پریس کی یہ عالمگیر ترقیاں تھیں نہ سہولتیں۔ کتابوں تک پہونچنے کا ذریعہ سفر تھا یا خود نقل کرتا تھا یا کتب فروشوں کے سامنے دست سوال دراز کرتا تھا۔

جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا اور وہ گرہیں جو شروح و حواشی، تعلیقات وتفاسیر وتاویلات میں بعض اہل بحث ونظر مثلاً فارابی، ابن سینا، ابن رشد اور غزالی نے سقراط وافلاطون، بقراط وارسطو، جالینوس وفیثاغورث وغیرہ کی کتابوں میں پیدا کر دی تھیں اور علما ومفکرین حیران تھے کہ کیا صورت نکلے کہ اطمینان حاصل ہو۔ جاحظ نے اس دشوار گزار راہ میں بھی رہنمائی کی اور ان گرہوں

کی گرہ کشائی کی۔

قبل اس کے کہ آپ کے سامنے جاحظ کی رائے پیش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب نقل اور طریق ترجمہ کا ایک مختصر سا نقشہ پیش کر دیا جائے۔

اس زمانہ میں نقل و ترجمہ کی دو صورتیں تھیں:۔

ایک تو وہ طریقہ تھا جسے یوحنا بن بطریق اور ابن ناعمہ الحمصی کا طریقہ سمجھنا چاہیے یعنی لفظ پر لفظ رکھنا، جس لفظ کو یونانی یا کسی اور زبان میں دیکھا اسی کا عربی میں مترادف تلاش کیا اور اسے اسکی جگہ پر رکھدیا یہاں تک کہ ساری کتاب کا "ترجمہ" ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ حد درجہ مہمل ہے اس لئے کہ مترجم پوری زبان عربی پر مہارت تو رکھ نہیں سکتا تھا کہ ہر غیر زبان کے لفظ کے مقابلہ میں بالکل ویسا ہی وسیع المفہوم لفظ عربی سے تلاش کرکے اس کی جگہ پر رکھ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کتاب نہ عربی ہی ہوتی تھی اور نہ عجمی۔ اس طریق ترجمہ سے بہت نقصان پہونچا اور یونانی، فارسی، ہندی، سریانی اور لاطینی کے بہت سے کلمات اسی طرح رہ گئے، مخصوص ترکیبیں دوسری زبان کی ویسی مخصوص ترکیبیں نہ حاصل کرسکیں، مجازات و استعارات کے استعمال میں بھی یہی صورت رہی۔

دوسرا طریقہ حنین[1] بن اسحٰق اور عباس بن سعید جوہری[2] کا ہے وہ یہ کہ ترجمہ کرنے والا پورا جملہ پڑھ لیتا ہے، اپنے ذہن میں اس کے معنی متقرر کر لیتا ہے، پھر اسے ایسے عربی جملہ میں منتقل کرتا ہے کہ پورا پورا مفہوم ادا ہو جاتا ہے خواہ الفاظ ہم آہنگی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ ظاہر ہے یہ اصول بہت زیادہ کامیاب ہے، اسی لئے لوگوں کا خیال ہے کہ حنین بن اسحٰق کی کتابیں جو طب، منطق، طبعیات،

---

[1] ابو زید حنین بن اسحٰق عبادی، علوم اوائل کے ماہر تھے، طبیب تھے، بہت سی قدیم کتابوں کو عربی میں منتقل کیا ہے یونانی، سریانی اور لاطینی خوب جانتے تھے۔ بعض خلفا کتاب کے برابر سونا تلوا کر دیا کرتے تھے۔ سنہ ۲۶۰ھ میں وفات ہوئی۔

[2] العباس بن سعید الجوہری بہت بڑے فلکی اور منجم تھے، ارصاد اور اس کے آلات میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے، انکی "زیج" مشہور ہے، اکابر ہندسین و حساب میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

اور الٰہیات سے متعلق ہیں وہ کسی قسم کی تہذیب و اصلاح کی محتاج نہیں ہیں، ہاں علوم ریاضی میں ان کی جو کتابیں ہیں وہ بلاشبہ نظر ثانی کی محتاج ہیں اس لئے کہ اس فن میں انھیں پورا پورا عبور نہیں حاصل تھا ــــ اس زمانہ کا یہ دستور تھا نقل و ترجمہ کا۔

اب حسب وعدہ ہم جاحظ کا "قول فیصل" اس باب میں پیش کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:۔

"مترجم ان مفاہیم کو ہرگز ادا نہیں کر سکتا جن کا حکیم نے لحاظ رکھا ہے، نہ ان نکتوں اور حقائق کو سمجھ سکتا ہے جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں، جب تک وہ خود اس علم یا فن میں جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے اصل مصنف کی سی استعداد نہ رکھتا ہو۔ مترجم کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس میں اپنی مادری زبان کی سی مہارت رکھتا ہو۔

ہمارا یہ قول تو کتب ہندسہ، تنجیم، حساب اور موسیقی کے متعلق تھا لیکن قرآن مجید وغیرہ میں ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔"

یہ ہیں جاحظ کے خیالات نقل و ترجمہ کے بارے میں۔ اس طریقہ سے اس نے گویا نقل و ترجمہ کا راستہ روشن تر کر دیا ہے۔

(باقی)

عربی سیادت کے خلاف عجمی تحریکیں

(گزشتہ سے پیوستہ)

عبداللہ بن میمون

بہرحال یہ اسمٰعیلی جماعت باوجود اپنی تمام کوششوں کے ایک عرصہ تک کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ عبداللہ بن میمون ایک مجوسی سردار ان کو ایسا مل گیا جس کی کوششوں نے چند روز کے اندر ہی اندر وہ کام کیا۔ جسکو اس کی ہم مشرب جماعت صدیوں میں بھی نہ کر سکی تھی۔ اس کے مبلغین نے عباسی خلفاء کو اس درجہ پریشان کیا۔ کہ بار بار کی جنگ پر بھی ان کی ایک مختصر سی جماعت کو یہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ بلکہ اس کے برعکس حمدان قرمط بانی مذہب قرامطہ اس کے ساتھیوں نے بحرین اور شام کے علاقے پر قابض ہو کر عرصہ تک حکومت کی۔ عام مؤ[رخین] کے بیان کے مطابق عبداللہ کا پڑپوتا ابوسعید مغرب اور مصر کی خلافت فاطمی کا بانی ہوا۔ اور اپنی خفیہ سازش کی بنا پر تمام ممالک اسلامیہ کو غارت اور تباہ کیا۔ مذہبی عقائد میں تشکیک کے عقیدے کو رواج دیکر بہت مسلمانوں کو گمراہ سے بے راہ کیا۔ اور اس بارہ میں مذہب معتزلہ کے رواج نے جو اس سے بہت پہلے رائج ہو چکے تھے بڑی امداد بہم پہونچائی۔ عبداللہ بڑا ذہین اور مختلف طبیعتوں کے مختلف رجحانات کو پرکھنے کی خاص لیاقت رکھتا تھا۔

عہ دولت فاطمیہ جو ۲۹۷ھ سے ۵۶۷ھ تک افریقہ اور مصر میں رہی۔ عام مورخین کا خیال ہے کہ [اس] کا بانی ابوسعید عبداللہ بن میمون کا پوتا تھا۔ اس نے اپنے کو امام اسمٰعیل کی اولاد بتایا۔ چنانچہ سب سے پہلے فاس کے متصل کتامہ میں ابومحمد عبداللہ کے نام سے مہدویت کا اعلان کیا۔ ادارسہ اور اغالبہ کی جماعتوں نے اس کا ساتھ دیا۔ ان کی استعانت اور مدد سے رفتہ رفتہ وہاں اس نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا با[لآخر] ۲۹۶ھ میں قیروان کو بھی جو افریقیہ کا مرکز تھا۔ فتح کر لیا۔ اور جب قوت کافی ہو چکی تھی اپنی خلافت کا باقاعدہ اعلان کر دیا لیکن ابن خلدون اور مقریزی کا خیال ہے کہ عبیدی خلفاء کا عبداللہ کی طرف انتساب کرنا غلطی ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ قادر باللہ نے فاطمی خلفاء کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ایسے مرعو[ب]

بقیہ صفحہ

"مذہبِ اسمٰعیلیہ کی اشاعت عبداللہ بن میمون کے ذریعہ عمل میں آئی یہ انسانی فطرت
پرکھنے اور مذہبی اعتقادات کو مختلف طبائع کے موافق بنانے میں عباسیوں کے فرقہ کے
بانی سے کہیں بڑھ چڑھ کر استعداد رکھتا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں اس شخص نے
سمٰعیلیہ فرقہ میں نئی روح پھونکی۔"

عبداللہ بن میمون کی ذہانت اور استعداد کا خاکہ جن لفظوں میں ڈی گوپے اور
دزی نے کھینچا ہے۔ اس سے بہتر تصویر لفظوں میں نہیں کھینچی جاسکتی۔ لکھتے ہیں

"عرب اور اسلام کی دشمنی نے عبداللہ بن میمون کو ایک ایسے ارادہ پر مائل کیا کہ
س کے طور طریق میں ذہانت، جرأت، یقین اور جوش حیرت انگیز ہیں غالب اور مغلوب
ایک لڑی میں پرونا، مذہب کو بار سمجھنے والی جماعت اور متعصب لوگوں کو ایک خفیہ جماعت
ں مجتمع کر دینا۔ مومنوں سے کفر اور الحاد کی تخم ریزی کرانا۔ فاتح قوم کے فاتح افراد کو انہیں
حکومت مٹانے کا آلہ بنانا۔ غرض کہ ایک ایسی جماعت تیار کرنا جو ایک بڑی تعداد کے باوجود
فد اور سر فروشانہ جذبہ رکھتی ہو۔ اور جو کیسی ہی سخت وقت کیوں نہ ہو۔ سردار کے حکم کے
لاف کرنا گناہ عظیم سمجھتی ہو اور یہ اس لئے کہ وقت پر اس کو یا اس کے خاندان والوں کو
نت و حکومت دلوا سکے۔ یہ ہوس کیسی ہی خراب کیوں نہ سہی لیکن اس نے نہایت ہوشیاری
ر علم النفس کی گہری واقفیت اور علمیت کے ساتھ پوری کرلی۔"

ریق دعوت: یہ تمام اسباب تو تھے ہی لیکن عبداللہ کی کامیابی کا اصل راز در اصل اُس
طریقہ دعوت میں مضمر تھا جن جن طریقوں سے اس نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا وہ حیرت انگیز

بہ حاشیہ صفحہ ۴۴۵۔ ہو کر بغداد میں بڑے بڑے علماء کی زبان سے باقاعدہ یہ کہلایا۔ کہ یہ لوگ فاطمہ کی اولاد
نہیں ہیں بلکہ عبداللہ بن میمون کے خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ یہ اس لئے کہ عام مسلمانوں کی نظروں میں
کا وقار اس طرح کہہ کر گھٹا دیا جائے۔ امیر علی مرحوم نے ان مورخین کے علاوہ ابو الفداء کی تائید سے موخرالذکر
ل کو صحیح قرار دیا ہے۔ صفحہ ۲۶۲ اسپرٹ آف اسلام۔ ؏۱ The preaching of Islam

ہیں۔ اس نے اپنے داعیوں کو تاجروں کے بھیس میں ملک کے دور دراز خطوں میں روانہ کیا جہاں وہ بظاہر ایک پیشہ ور جماعت ہوئی لیکن ہر وقت تبلیغ و دعوت کے موقع کی متلاشی رہی۔ یہ داعی جن اصولوں کے ماتحت تبلیغ کر رہے تھے : اس کا ایک خاکہ ذیل کی سطروں میں کھینچا جاتا ہے۔

جاہلوں میں جب پہونچتے تو ان کو طرح طرح کے شعبدے دکھاتے یہ لوگ اس کو ان کی کرامت پر محمول کرتے۔ اور معجزہ سمجھتے۔ مذہب کے سخت پابند لوگوں میں جاتے تو بزرگی اور تقدس کی مجسم تصویر بن جاتے۔ ایسے لوگوں میں جب پہونچتے ، جو مذہبی عقائد میں یہاں بین کے قائل ہوتے۔ تو عام عقائد کے عجیب عجیب معنی بہناتے۔ مذہب سے برگشتہ لوگوں میں جاتے تو مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہوکر تمام برائیاں جائز کر دی جاتیں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو امام مہدی، یہودیوں کو مسیح اور عیسائیوں کو فارقلیط کا منتظر پاکر ان کے آنیکی بشارت دیتے۔ لیکن اس بشارت میں یہ عقیدہ بھی شامل کرتے کہ حقیقی نجات حضرت علی رضی اللہ، ہی آکر دلائیں گے۔

اسی کو محقق ڈیح ڈی گوتیح نے یوں لکھا ہے۔

عبد اللہ نے حصول مقصد کے لئے مختلف طریقہ اختیار کئے۔ جو حقیقۃً کوئی عمدہ طریقہ نہ تھا۔ انسانی کمزوریوں پر حملہ کا کوئی طریقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ پابند مذہب اور نیک دِل لوگوں کے سامنے زہد و تقویٰ عیاش اور اوباش لوگوں کے سامنے ہر قسم کی ہوسناکی جائز کی گئی۔ بلند تخیل والوں کے لئے فلسفہ کا ڈھونگ، جوشیلے انسانوں کے لئے باطنیت اور رہبانیت اور عوام کو حیرت اور تشکیک میں ڈالا گیا۔ بالآخر یہود کے لئے ایک مسیح موعود، عیسائیوں کے لئے ایک فارقلیط اور مسلمانوں کے لئے ایک مہدی مہیا کیا گیا۔

تعلیمات اور اس کے مختلف مدارج ! ان تمام طریقوں میں سے جس طریقہ سے بھی کوئی

Preaching of Islam ؎

س جماعت کا رکن بننا چاہتا تو اس کو پہلا سبق یہ دیا جاتا کہ شریعت کے جتنے احکام ہیں۔
س کے دو رُخ ہیں ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن اور اسرار صرف انہیں لوگوں
پر منکشف ہوتے ہیں جو امام وقت کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ اِس بات کے ذہن نشین کرانے کے بعد
اس کو اپنی جماعت میں داخل کرتے اور سب سے پہلے درجہ پر اس سے اطاعت کا حلف اٹھوایا
جاتا۔ اور دوسرے درجہ پر یہ بتایا جاتا کہ پہلے ائمہ اور معلمین نے اسلام کو غلط سمجھا ہے اسلئے
وہ لوگ ظاہری احکام کے پابند تھے۔ خدا ظاہری عمل پر خوش نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ امام سے
باطنی احکام کو سیکھ کر عمل نہ کرے۔ تیسرے درجہ پر یہ بتایا جاتا کہ امام صرف سات ہیں۔ اور
دوسرے شیعی فرقے غلطی پر ہیں۔ چوتھے درجہ پر یہ تعلیم دی جاتی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
خاتم النبیین نہ تھے۔ بلکہ اسمٰعیل بن جعفر ہیں۔ پانچویں درجہ پر یہ بتایا جاتا کہ احادیث لغو اور عارضی
ہیں اور یہ عبادات اور ارشادات محض اس زمانہ کے لئے تھے چھٹے درجہ میں پہونچکر نماز، روزہ،
حج، زکوٰۃ وغیرہ کو ترک کرنے کی تعلیم دیتے۔ ساتویں دور میں پہونچکر مجوس کے ثنوی عقیدہ کی
تعلیم دیکر عقیدۂ توحید سے باز رکھتے۔ آٹھویں درجہ پر اوپر کی تمام تعلیمات پر عمل در آمد کرانیکی
پوری پوری کوشش کراتے اور آخری نویں درجہ پر پہونچکر رہے سہے اسلامی اثرات کا خاتمہ
کر دیا جاتا۔

عقائد :- اس[۱] سے تقریباً یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ان کا عقیدہ کیا تھا۔ وہ توحید کے قائل نہ
تھے۔ بلکہ ان کے نزدیک پیدائش عالم کے دو خالق ہیں، خالق اول اور خالق ثانی، خالق اول
خدا ہے جس نے نفس اول کو پیدا کیا اور پھر نفس اول نے عالم کو، یہ عقیدہ مجوسیوں اور ثنویوں
کے عقیدہ سے مشابہ ہے۔ یہ دونوں فرقے بجائے اول اور ثانی کے خالق عالم نور اور ظلمت کو
بتاتے ہیں۔ عقیدۂ رسالت کے متعلق وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے۔ بلکہ وہ
کہتے ہیں کہ ابتدائے عالم سے اِس وقت تک صرف سات پیغمبر ہوئے۔ حضرت آدمؑ، نوحؑ، ابراہیم

---

[۱] صفحہ ۲۰۶ Encyclopaedia ۲۰۴، دبستان المذہب، الملل والنحل، رسالہ نصیریہ ابن تیمیہ۔

موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ، اسمٰعیل بن جعفرؒ، صلی اللہ علیہم السلام۔ یہ انبیا ناطق تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا رفیق یا امام صامت ہوتا تھا۔ جو ناطق امام کا جانشین ہوتا، امام صامت کا کام صرف امام ناطق کی تعلیمات کی تبلیغ تھا۔ آنحضرت محمد صلعم کے امام صامت حضرت علیؓ اور اسمٰعیل بن جعفر الصادق کے امام صامت امام محمدؒ تھے۔ اِس عقیدہ کی بنا پر یہ صاف ہو گیا کہ انحضرت خاتم الانبیاء نہ تھے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور نہ صرف یہی بلکہ جملہ احکامات صرف آنحضرت کے زمانہ تک محدود تھے، سزا و جزا، ہر شخص کے اعمال کی اسی دنیا میں مل جانے کے قایل نبیذ کا پینا تو حرام لیکن شراب حلال، جنابت میں بجائے غسل کے وضو کرتے۔ نماز کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ دو روز روزے بھی رکھے جاتے تھے۔ ایک مہر کے دِن دوسرے نوروز کے دن۔ کسی چیز کی حرمت اور حلت کے متعلق کبھی ایک چیز کو موقع و محل کے لحاظ سے حلال کر دیتے تو دوسری طرف، دوسری جگہ وہی چیز حرام ہو جاتی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں یعنی کہیں کہیں حرمت و حلت کا خیال نماز، و روزہ کی جدید شکلیں جو اختیار کی گئی تھیں۔ وہ محض اس لئے کہ لوگ ان کو اسلام سے خارج نہ سمجھیں۔ صرف یہ جانیں کہ اِن کے نزدیک اسلام کی تاویل اس طرح پر ہے۔

بحرین میں حکومت

عام مورخین کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن میمون کا ایک تشدد پسند مبلغ حمدان قرمطؒ جو کوفہ کا ایک معمولی کاشتکار تھا۔ بحرین میں ۲۸۱ھ میں ظاہر ہوا۔ اس نے وہاں زہد و تقشف

ؒ قرمط کہے جانے کی وجہ یہ تھی کہ قرمط کے لغوی معنی فاصلہ بین القدمین کے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خود یہ شخص اسمیں مبتلا تھا جسکی بنا پر اس لقب سے مشہور ہوا لیکن بعض مورخین نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ قرامط کرامتیہ کی بگڑی ہوئی تصویر ہے جس کے معنی سرخ آنکھوں والوں کے ہیں۔ اور چونکہ اُس کی آنکھیں سرخ رہا کرتی تھیں اس لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ دوسرے اور بھی مناسبات پیش کئے ہیں۔

کا اظہار کیا، کچھ اِس اثر سے اور زیادہ تر سحر و جادو کی بدولت عوام اور جاہل طبقہ میں اپنی شخصیت کو منوایا۔ اور پھر امام مہدی کا فرستادہ بتاکر ان کو اپنی جماعت میں کثرت سے شامل کیا یہ شخص شام اور بحرین کے علاقہ میں امام اسمٰعیل کے لئے دعوت و تبلیغ کرتا اور طرح طرح کی امیدیں دلاکر ورغلاتا اِس معاملہ میں یہ اپنے مقتدا عبداللہ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ ہاں البتہ اپنے پیرؤں سے عدم تشدد کے معاملہ میں مخالف تھا۔ وہ دن دہاڑے اپنی جماعت کے ماوراء لوگوں کو لوٹنے اور غارت کرنے کی پالیسی کا قائل تھا چنانچہ اُس نے اسی اصول پر کام شروع کیا۔ اسکی دعوت کا دار و مدار دو شخصوں پر تھا۔ ایک اُن میں سے زکرویہ بن یحییٰ تھا جسکا لقب ذکرویہ تھا۔ اور دوسرا ابوسعید جنابی، اول الذکر سواد کوفہ اور بعد ازاں شام و عراق میں مذہب کی اشاعت کی، باوجود کوشش دولت کی بنا یہ قائم نہ کرسکا۔ ۲۹۰ھ میں شام پر حملہ کیا اور پھر ۳۱۱ھ میں بصرہ اور کوفہ پر لیکن کامیابی نہ ہوسکی بہت سے مارے گئے۔ اور خود بھی قتل کیا گیا۔ اور بچی کھچی جماعت مختلف اطرافِ عالم میں منتشر ہو گئی۔

ثانی الذکر ابوسعید جنابی نے بحرین میں دعوت کی ابتدا کی۔ اور ایک عرصہ تک اُس نے اور اس کے خاندان والوں نے حکومت کی، چنانچہ وہاں دعوت و تبلیغ کرکے مہدی کے نام پر ایک چھوٹا سا فوجی دستہ تیار کیا۔ اس دستہ سے سب سے پہلے ۲۸۳ھ میں بصرہ پر حملہ کیا، والی بصرہ کو شکست دیکر قبضہ کیا۔ اور پھر اسی سلسلہ میں ہجیر پر قابض ہوگیا۔ اس فتح کے بعد ابوطاہر کو جو ابوسعید کا جائز وارث تھا، مالک تخت بناکر واپس آیا اور دوسرے مقامات پر دعوت و تبلیغ کرتا پھر رہا تھا کہ اسی اثنا میں اکبر تبہ ابوطاہر کے ہاتھ سے بصرہ نکل گیا۔ اور عرصہ تک محروم حکومت رہا۔ لیکن دوبارہ ۳۱۱ھ میں ابوطاہر نے بصرہ پر حملہ کیا۔ بازاروں کو لوٹا، بیشمار جانوروں کو قتل کیا۔ جامع مسجد کو مسمار اور ویران کیا۔ اور پھر دوسرے سال ۳۱۲ھ میں حاجیوں کے قافلے لوٹے۔

عہ یہ سب واقعات ابن اثیر، ابن خلدون اور ابوالفداء سے لئے گئے ہیں۔

بچوں اور عورتوں کو قید کیا۔ مال و اسباب چھینا، اور بہت کم لوگ اس قافلہ کے تھے جو بچ سکے۔

اس شخص کے جور و ظلم کی انتہا یہ نہ تھی بلکہ ۳۱۴ھ میں کوفہ کی تباہی اور پھر ۳۱۵ھ میں عمان پر قبضہ کے بعد ۳۱۷ھ میں مکہ پر فوج کشی کی، بیشمار حاجیوں کو قتل اہل مکہ کے گھربار اور مال و اسباب کو لوٹا خانہ کعبہ کے میزاب اور دروازہ ڈالا۔ غلاف کعبہ کو چیر پھاڑ کر تقسیم کیا گیا۔ اور پھر حجر اسود کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ بحرین میں حجر اسود لے جانے کی غرض یہ تھی کہ حج بجائے مکہ کے بحرین میں ہو ان کے اس اعلان سے جو مکہ سے واپسی کے وقت کیا ظاہر ہوتا ہے، ایک تک خلیفہ وقت اور رعایا کو قتل و غارت سے پریشان کر کے ۱۳ برس کے بعد اس دنیا سے کوچ کیا۔ ابو طاہر کے بعد احمد ابو منصور اور پھر ابو منصور کا علی حسن بن احمد سریر آرا ہوئے، ابو منصور، ابو طاہر کا بھائی تھا وہ ابو لڑکوں کو تخت سے محروم کر کے خود حکمراں بن گیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا دونوں خاندانوں میں کشمکش پیدا ہو گئی۔ اور پھر یہ کشمکش ایک عرصہ رہی، آپس کی نااتفاقی کے باعث کچھ عرصہ کے بعد ۳۶۴ھ میں حکومت ا کی اولاد میں رہ سکی، اور نہ طاہریوں میں، اکیاسی برس تک یہ خاندان حکمراں کہلایا۔

واقعات کی اس کھتونی میں اوپر کہیں ذکر ویہ کے قتل کا ذکر کیا جا چکا یہ بھی بتایا جا چکا ہے۔ کہ اس کے ساتھ کے لوگ ادھر ادھر ممالک اسلا ہر گوشہ میں پھیل گئے تھے۔ ان لوگوں میں اپنے سردار کے مقتول ہو جانے اتنی جرأت تو باقی نہ رہی تھی کہ کھلے بندوں مقابلہ کر سکتے۔ البتہ ایسا ضرور ہو چھپ کر اپنے خیالات و عقائد کی تبلیغ کرتے۔ اور موقع پا کر مناسب مقا

مارتے، اور اسی مناسبت سے سب سے پہلے اہل عراق نے انکو باطنیہ کے لقب سے پکارا۔ اور پھر ان کو اسماعیلیہ بھی کہا گیا، اور سب سے آخر میں ان کا ایک اور تیسرا نام رکھا گیا۔ اور وہ نزاریہ ہے۔ اور یہ اس لئے کہ مستعلی علوی کے زمانہ خلافت میں اس کے بیٹے نزار نے بیعت نہ کرنے پر اسماعیلیہ کے ہوا خواہوں کو قتل و تہ تیغ کیا اور حسن بن صباح جس کا تذکرہ ابھی آئیگا۔ نزار کے بعد ائمہ کی امامت سے مصر میں انکار کیا

بہرحال ان کا فتنہ و فساد ملکشاہ کے زمانہ حکومت میں جبکہ ویلم اور سلجوقی اسلامی ممالک پر حکمرانی کر رہے تھے بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس وقت کے سلاطین اس قدر بھی طاقت نہ رکھتے تھے کہ ان کے فتنہ و فساد کو فرو کر سکتے۔ اس لئے قدرتاً یہ تمام اسلامی ممالک پر دھاوا کرتے۔ اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کرتے، تدریجاً ان کی قوت برابر بڑھتی گئی، اور جب اس قابل ہو گئے کہ اپنی قوت کی نمائش کر سکتے تو بہت سے ایران اور شام کے قلعات پر قابض ہو گئے۔ سب سے پہلے قاین کے پاس ایک قلعہ تھا، جہاں پر ان لوگوں کا ہم خیال ایک شخص حاکم تھا۔ وہاں گئے اور اس کو اپنا مرکزی مقام بنایا اور یہیں سے دن رات ان قافلوں کو جو ادھر سے گذرتے اور قرب و جوار کی آبادی کو لوٹتے، انہیں دنوں کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بہت بڑا قافلہ کرمان سے روانہ ہوا۔ جو قاین کا عازم تھا، ان لوگوں نے اس پر چھاپہ مارا، سب کو قتل کیا ایک ترکمانی شخص اتفاقاً بچ گیا تھا، جس نے قاین پہنچکر اس غمناک حادثے کی اطلاع دی یہ واقعہ محض اس لئے لکھا گیا ہے کہ قارئین اُن کی سخت دلی کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد قلعہ اصفہان پر قبضہ کیا۔ پھر قلعہ الموت پر، یہ ایک پرانا قلعہ تھا جو کوہ البرز کے سلسلہ میں رودبار کے اُس حصہ میں جسے طالقان کہتے ہیں۔ قزوین سے رشت کو جانے والی سڑک پر واقع تھا یہ پیچ در پیچ گھاٹیوں میں ایسا گھرا ہوا تھا۔ کہ بمشکل کوئی وہاں پہنچ سکتا حسن بن صباح نامی اس جماعت کے ایک مشہور سردار نے چالاکی، اور ہوشیاری سے اس پر قبضہ کیا

اور اس کو اپنی تبلیغ اور دعوت کا مرکز بنایا یہ شخص نہایت چالاک اور فطرۃً بہت ذہین تھا اور عیاری کی بدولت کچھ دنوں کے بعد حکمراں کہلایا اور ایسا حکمراں کہ جس کے نام سے تمام سـ تھراتے جس سلطان، وزیر کو جس عالم وفاضل کو چاہا اپنے جانثار سپاہیوں کے ذریعہ کے گھاٹ اتار دیا۔ جو جو طریقہ اپنی فتحمندی اور برتری کے اختیار کئے وہ حیرت انگیز اور بلاشبہ پرعمل تھے ذیل میں مختصر طور پر اس شخص کے حالات اور کارناموں کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے

حسن بن صباح

یہ شخص چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں اضلاع خراسان کے ایک شہر طوس میں پیدا باپ ایک مفلوک الحال اور تنگ دست آدمی تھا تعلیم وتربیت کے خیال سے اسنے اپنے بیٹے حسن امام موفق الدین کے حلقہ درس میں بٹھایا۔ عام مورخین کی روایت ہے کہ طالب علمی کے زمانہ حسن کی ¹ اپنے دو ساتھیوں عمر خیام اور قیام الدین سے جو بعد میں نظام الملک طوسی کے نام سے مشہ معروف ہوا) عہد ہوا تھا کہ جو شخص ہم میں سے کبھی بلند درجہ پر سرفراز ہو وہ اپنے بقیہ ساتھیوں کی امداد کرے زمانہ نے قیام الدین کو ملکشاہ سلجوقی کا چہیتا وزیر بنایا۔ حسن کو خبر تو تکمیل معاہدہ کی امید میں گیا۔ اور ایک معزز عہدہ پر سرفراز ہوا۔ حسن چالاک اور حوصلہ مند ہی سے تھا اس لئے یہ اس تاک میں رہنے لگا کہ نظام الملک سے کسی نہ کسی طرح اپنی ذہانت ا ہوشیاری تسلیم کرائے چنانچہ ایک دن موقعہ مل گیا۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ نے قیا نظام الملک سے کہا۔ کہ جو دفتری نظام ہماری سلطنت کا ہے اس سے محاصل اور خرچ کے صحیح

عا۔ مولوی محمد مسلم صاحب نے اپنے ایک مضمون حسن بن صباح میں جو زمانہ ایک مستشرق کی تائید کرتے ہو دکھایا ہے کہ یہ معاہدہ قرین قیاس نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تینوں ہمعصر نہ تھے۔ نظام الملک بیس برس حسن سے بڑا البتہ عمر خیام اور حسن بن صباح قریب قریب ہم سن تھے۔

معلوم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ کوئی صورت ایسی نکالو کہ یہ دشواری جاتی رہے۔ وزیر
۱ موصوف نے اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر کافی مہلت چاہی۔ حسن جو موقع پر موجود تھا۔ بول اٹھا کہ
کہ اتنی مہلت اس حقیر کام کے لئے زیادہ ہے اس کو چالیس روز میں میں کرسکتا ہوں۔ بادشاہ
خوش ہوکر یہ کام حسن کے سپرد کیا لیکن حسن ناکامیاب رہا اور دربار سے نکالا گیا حسن یہاں سے
نکل کر ادھر ادھر مارا مارا پھیر رہا تھا کہ اتفاقاً اس کی ایک ایرانی داعی سے ملاقات ہوگئی یہ وہ
زمانہ تھا کہ ایک طرف باطنیہ کے داعی اطراف ملک میں خفیہ خفیہ اپنے مقصد کے حاصل کرنیکی
کوششیں کر رہے تھے اور دوسری طرف اسی اصول پر عبیدی خلفاء کے ایلچی بھی عباسی
خلفاء کے خلاف مسلمانوں کو اکسا رہے تھے حسن داعی کے خیالات سے اتفاق کرکے
مصر گیا۔ وہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ کچھ دن وہاں مقیم رہا مگر اس کی اس خاطر تواضع
سے جو عبیدی خلفاء کی طرف سے ہوئی۔ امراء اور سربرآوردہ لوگوں کو اس کا حاسد بنا دیا
اس لئے مجبوراً اس کو یہاں سے ہٹنا پڑا۔ یہاں سے روانہ ہوکر یہ ایک جہاز پر سوار ہوا تھا
کہ طوفان نے جہاز کو آگھیرا بچنے کی کوئی امید نہ تھی حسن نے جہاز کے دوسرے مسافروں سے
کہا کہ میرے نزدیک تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نہ
ڈوبینگے، اتفاق کی بات کہ جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔ لوگ اس کی اس پیشین گوئی پر آ آکر
اس کے ہاتھ چومتے۔ اور اپنی انتہائی عقیدت کا اظہار کرتے۔ بعض مورخین کا خیال ہے
اور سچ ہے کہ یہ حسن کی چالاکی اور دانائی تھی وہ سمجھتا تھا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو کوئی تکذیب
کرنے والا نہ رہیگا اور اگر بچ گیا تو مقصد حاصل ہے بہرحال یہ جہاز سواحل شام
سے آلگا۔ یہاں سے اتر کر ایشیا کوچک اور ایران کے تمام بڑے چھوٹے مقام کی سہ سالہ
سیر اور دعوت و تبلیغ کے بعد قلعہ الموت جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے قابض ہوا۔ ملکشاہ سلجوق
نے اپنے ہاتھ سے قلعہ کو جاتے دیکھ کر حملہ کیا۔ کوئی باقاعدہ فوج حسن کی ایسی تو تھی نہیں کہ اس کو اس
کے مقابل لاتا۔ ترکیب یہ کی اور خوب تھی کہ ایک لڑکے کو فریادی بنا کر نظام الملک کے پاس بھیجا

اس نے جب اپنے معاملہ میں نظام الملک کو مشغول بنا لیا تو یکایک خلاف وہم وگمان حملہ
اور یہ اس قدر جلد ہوا کہ نظام الملک کو خبر بھی نہ ہوئی کہ پیٹ میں خنجر پہنچ چکا تھا وزیر مو
کی موت کے بعد فوج ہٹالی گئی۔ یہ حربہ ایسا کاری تھا کہ آئندہ سے حسن نے اپنی کامیابی
لئے یہ طریقہ بہت پسند کیا چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ اس نے ایک جانباز جماعت فدائیہ
تیار کی۔ اس کو جانباز بنانے میں جو جو طریقہ استعمال کئے گئے اسی سے اس کی دماغی ملبۂ
رفعت تخیل، اور پھر عیاری اور چالاکی کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے، اول تو اپنے زہد
سچائی اور ایمانداری کا سکہ ان لوگوں پر جو اس کے ہمرکاب تھے جمایا گیا۔ کہا گیا ہے کہ ا
ان پر ڈال نے کے لئے وہ قلعہ کی بلند جگہ پر چڑھ گیا۔ تو برسوں نیچے نہیں اترا، ساتھی یہ سمجھ
تھے کہ شیخ یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں یہ دین سے تمام احکامات مذہبی کی شکل میں نافذ
سخت سے سخت احکامات کے نافذ کرنے میں عزیز قرابا کا لحاظ نہ کرتا۔ چنانچہ شراب پینا کبھی
قرار دیا تو اپنے ایک بیٹے کو جس نے اس جرم کا ارتکاب کیا فوراً قتل کا حکم صادر کر
کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح ایک فدائی کا واقعہ ہے کہ اس کے ایک دوسرے بیٹے نے لے جان
ڈالا تھا حسن کے قتل کے حکم سے وہ بھی نہ بچ سکا حسن کی زاہدانہ زندگی اور تعزیرا
خوف کے علاوہ جو چیز فدائیوں کو اپنی پیاری جان تک قربان کرنے سے باز نہ ر
وہ اس کی خود ساختہ بہشت تھی،

حسن کی بہشت ۔ اس نے الموت کے ارد گرد سرسبز اور شاداب کہسار میں جنۂ
دلفریب وادیوں اور جانفزا مرغزاروں میں چاندی سونے کے خوبصورت محل
بیش بہا جواہرات لعل و زمرد سے اس کی پچیکاری کی گئی عمدہ عمدہ آرائش اور ز
کی چیزوں سے محل آراستہ کیا گیا۔ ہر طرف باغ لگائے گئے، حور اور غلمان کے تخیل
خوبصورت اور نازک نازک لڑکوں اور لڑکیوں سے اس کو آباد کیا گیا۔ دودھ او
کی نہریں بہائی گئیں۔ بعض نہریں ایسی بھی تھیں کہ جن میں عمدہ اور سبک کشتیاں چلا

الغرض تمام عیش ونشاط کی چیزیں فراہم کی گئیں۔ اس بہشت کے بنانے میں اسنے انتہائی تخیل سے کام لیا۔ جس فدائی کو اس کی ایک دفعہ سیر کرادی گئی اسکی یہ مجال نہ تھی کہ شیخ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکے۔ بہشت میں پہونچانے کی جو صورت تھی وہ یہ تھی کہ ایک نشیلا پتہ جس کو عربی میں حشیش[1] کہتے تھے فدائی کو اس کا شربت پلایا جاتا وہ پیتے ہی بیہوش ہوجاتا آنکھ جب کھلتی تو وہ اپنے کو کسی نازک نازنین کی گود میں پاتا۔ اس حسین وجمیل منظر سے وہ ایسا متأثر ہوتا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں سے باہر آنے کے تخیل ہی سے اسے بے چینی اور تکلیف محسوس کرتا۔ اس کو یقین کامل ہوتا کہ وہ اسی بہشت میں ہے کہ جس کا خدا نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ کیا ہے۔ لیکن اس حالت میں وہ زیادہ نہ ٹھہر سکتا کہ پھر اسی شربت سے بے ہوش کرکے باہر پہونچا دیا جاتا۔ باہر جب آتا تو اس کو یقین دلایا جاتا کہ حقیقتاً تم اس مادی اور ناپاک جسم سے بہشت کے اصلی لطف سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ تا وقتیکہ تم اس کو پاک وصاف نہ کرلو اور یہ صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب امام کی پوری پوری پیروی کردیہی وہ فدائی تھے کہ جو بہشت کی طمع دلاکر اطراف ملک میں پھیلائے گئے۔ جس نے ذرہ برابر ان کی مخالفت کی اس کی قضا اس کے سر پر پہونچتی سینکڑوں علماء وفضلاء ان کے شکار ہوئے۔ علماء تو علماء خلفاء بھی ان کی تلوار بے نیام سے نہ بچ سکے، خلیفہ مسترشد اور خلیفہ راشد انہیں کے ہاتھوں شہید ہوتے یہ فدائی کھلے بندوں مقابلہ نہ کرتے۔ بلکہ جس کسی سربراوردہ اشخاص کو مارنا مقصود ہوتا اس کی خدمت میں آہستہ آہستہ اپنا رسوخ اور اقتدار بڑھاتے خواہ خدمت کرکے یا اور دوسرے طریقوں سے، مدتوں ساتھ رہتے سہتے۔ جب کبھی اچھا موقعہ مل جاتا تو اس سے فائدہ اٹھاتے، فدائیوں کے علاوہ عقیدت مندوں کے دو طبقہ اور تھے۔ جو ان سے کم مرتبہ پر تھے۔ ایک داعیوں کا جو باطنیت کی خفیہ تبلیغ کرتے پھرتے اور دوسرا رفیقوں کا جو

---

[1] اسی مناسبت سے حسن کے ساتھیوں کو حشاشین کہا گیا ہے۔

مشیر کی حیثیت رکھتے اور مجتہد کہلاتے . بعضوں نے ان کے پانچ[1] طبقہ بتائے ہیں سب سے بڑا افسر شیخ الجبل کہلاتا . اس کے ماتحت تین داعی القرباں ہوتے جو تین صوبوں کے افسر ہوتے اس کے بعد داعیوں کی جماعت ہوتی جو تمام خفیہ اصولوں سے واقف ہوتے . اور اس مقصد کے مبلغ ہوتے چوتھے رفقاء کی جماعت ہوتی - پانچویں فدائیوں کی -

حسن نے ان ان طریقوں سے پینتیس سال تک قلعہ الموت اور اس کے ارد گرد بہت سے دوسرے قلعوں پر فرماں روائی کی - یہ قلعے خراسان سے شروع ہو کر حسار کے کنارے کنارے آذربیجان تک اور پھر یہاں سے جنوب کی طرف عراق اور خوزستان تک اور اسی طرح سواحل روم تک . ہزار ہا میل تک کوہستان ہی کوہستان میں چلے گئے تھے .

حسن کے انتقال کے بعد کیا بزرگ جو اس کا خاص معتمد تھا تخت نشین ہوا ، اس سے پیشتر فدائیوں کے سلسلہ میں خلیفہ مسترشد اور ارشد کی شہادت کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے - وہ اس کے زمانے میں وقوع میں آیا تھا - اس کے زمانے میں شام کی باطنی جماعت تو علانیہ کہلاتی تھی - لیکن ایرانی کچھ کمزور پڑ گئے تھے - تیسرا تاجور ان کا محمد اول تھا - باطنیوں کے خیال کے مطابق یہ ان کا کوئی قابل حکمراں نہ تھا - اس سے زیادہ اس کے بیٹے حسن کی طرف ان کی توجہ تھی چنانچہ محمد کے بعد یہ جانشین بنایا گیا - ۱۱۶۴ء کا واقعہ ہے کہ اس نے امام مہدی کا ایک خط پیش کیا - جس میں امام موصوف کی طرف سے عوام الناس سے یہ مطالبہ تھا - کہ حسن کی فرمانبرداری کریں اس لئے کہ یہ سچا اور ایماندار داعی ہے - اس خط کو سنا کر حسن نے اعلان کیا - کہ اسلام کے وہ بعض ظاہری اصول جو کبھی ہمارے پیشرؤں نے بھی ضروری قرار دئے تھے سب ختم ہوگئے - خوب عیش

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا -

کردی اور خوشیاں منائیں۔ اس سلسلہ میں اس نے امام خلیفتہ اللہ ہونے کا دعویٰ کیا وہ کہتا تھا کہ میں محمد کا بیٹا نہیں بلکہ نزار خلیفہ، مصر کا بیٹا ہوں لیکن ابھی اس دعویٰ کا اعلان ہی ہوا تھا کہ اس کے سالے نے اس کو قتل کرا دیا، اس کے بعد محمد ثانی جانشین ہوا۔ جو چھیالیس ۴۶ سال تک حکمراں رہا۔ باپ کے قاتل اور اس کے تمام خاندان کو تباہ کرایا اور اس نے اتابک سلطان نورالدین اور پھر صلاح الدین سے جنگیں کیں۔
صلاح الدین پر اکثر و بیشتر فدائیوں نے وار کیا۔ لیکن صرف یہی ایک ایسی شخصیت تھی جو ان کے ہاتھوں سے بچ سکی۔ سلطان صلاح الدین نے وہ محاصرہ جس کو کہ ان کے علاقہ پر ڈالا تھا۔ اٹھا لیا اس لئے پھر ان باطنیوں نے ان کا پیچھا نہ کیا۔ اس عہد کا ایک واقعہ امام رازی سے متعلق بہت مشہور ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ بعض مسلمانوں کو امام موصوف کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ اگر باطنیوں کی تائید نہیں تو برا بھی ان کو نہیں سمجھتے۔ امام صاحب نے صفائی کی خاطر ایک دن منبر پر باطنیوں کو بہت سخت سست سنایا۔ باطنی امام شیخ الجبل الموت کو جب اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے ایک فدائی کو بھیجا یہ ایک طالب علم کے بھیس میں سات مہینہ تک وہاں رہا آخر کار ایک دن موقعہ پا کر امام کے سینہ پر سوار ہو گیا اور خنجر نکالا امام کی عاجزی سے وہ اتر تو پڑا لیکن اس نے کہا کہ ہمارے امام کا بس اسی قدر حکم تھا۔ ورنہ آپ کی عاجزی اور منت کوئی اثر ہمارے قلب پر نہ ڈال سکتی، اس وقت شامی شاخ داعی سنان کے زمانہ میں صلیبیوں سے مل گئی تھی صلیبی جماعت نے بھی ان کو بعض لوگوں کے قتل کا آلہ کار بنایا تھا۔
اس کو اس کے بیٹے جلال الدین حسن ثالث نے زہر دید یا تھا اور خود جانشین ہوا اس عہد میں کوئی واقعہ قتل اور خونریزی کا پیش نہیں آیا غالباً اس کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ وہ بہت جلد قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ اس کے بیٹے محمد ثالث کو بٹھایا گیا۔ اس نے جب زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو نو برس کا بچہ تھا۔ باپ کا طریقہ چھوڑ حسن بن صباح کے طریقہ کو

پھر سے رائج کیا۔ ۱۲۵۵ء میں تیس سال حکومت کے بعد یہ بھی اپنے بیٹے رکن الدین کے ہاتھ مارا گیا۔ یہ ان کا آخری حکمران تھا۔ حکومت کا دوسرا ہی سال تھا کہ ہلاکو نے ایران کے کوہستانی علاقہ پر چڑھائی کی المَوت اور تمام ارد گرد کے قلعات پر قبضہ کیا۔ رکن الدین کو گرفتار کیا۔ مگر اس کی خواہش کے مطابق منگو خاں (ہلاکو کے باپ) کے ہاں بھیجدیا گیا۔ لیکن راستہ میں دغابازی کی اور وہیں قتل کردیا گیا۔ اس کے ساتھ تقریباً بارہ ہزار حشاشین (باطنین) قتل کئے گئے۔ اور اس طرح ایران میں ان کی قوت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ شامی شاخ اس کے بعد کچھ عرصہ تک تھی کہ بیبرس سلطان مصر نے ختم کرڈالا۔ اس کے بعد بھی چھوٹی چھوٹی جماعتیں باقی رہیں۔ جو آج تک موجود سمجھی جاتی ہیں۔ انسے ملتے جلتے خیالات اب بھی شمالی شام و ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ رَیف کے لوگوں کے متعلق بھی یہی یقین کیا جاتا ہے۔ آئندہ سلسلہ میں انشا اللہ یہ بتانے کی کوشش کیجائیگی کہ ہندوستان میں اس قسم کی جماعت کا کیونکر نشو نما ہوا اور انہوں نے یہاں کے خیالات و عقائد پر کیا اثر ڈالا۔

بپتا

اپنا دُکھڑا کسے سناؤں؟

شام کا جھٹپٹا گیلی برف کے بڑے بڑے گالے بازار کے لیمپوں کے جو ابھی جلائے گئے ہیں ارد گرد دھیمی رفتار سے گھوم رہے ہیں، چھتوں پر، گھوڑوں کی پیٹھ پر، بازوؤں پر، ٹوپیوں پر، برف کی باریک نرم تہہ جمی ہوئی ہے، گاڑی بان ایونا، بھوت کی طرح سفید براق، کوچ بکس پر بے حس و حرکت گٹھری بنا بیٹھا ہے، اس سے زیادہ جھکنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر برف کے تودے کے تودے اس پر آ پڑیں، تب بھی انہیں جھٹکنا ضروری نہیں سمجھے گا، اُس کی سوکھی سہمی گھوڑی بھی سفید اور ساکت ہے۔ اُس کے سکوت جسم کے پیچ و خم، اور بانس کی سی سیدھی ٹانگوں کو دیکھ کر اس پیسے کی مٹھائی کے گھوڑے کا شبہ ہوتا ہے۔ شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے، جس غریب کو ہل بکھیر سے ان مٹیالے مناظر سے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں، زبردستی چھڑا کر اس جنجال میں پھنسا دیا جائے۔ جہاں ڈراؤنی روشنیاں، غُل غپاڑا، لوگوں کی لگاتار ان تھک دوڑ دھوپ ہو، وہ سوچ میں کیسے نہ پڑے؟

ایونا اور اس کی گھوڑی کو ایک جگہ سے ہلے بہت دیر ہو گئی تھی، دوپہر سے پہلے نکلے تھے اور اب تک ایک سواری نہیں ملی، شہر پر شام کی تاریکی چھا رہی ہے، بازار کے لیمپوں کی دھندلی روشنی تیز ہو رہی ہے۔ اور سڑک کا شور شغب بڑھ رہا ہے۔

وائی برگ اسکایا کے لئے گاڑی! ایونا کے کان میں آواز آتی ہے، گاڑی!

ایونا چونک پڑتا ہے اور اپنی برف سے ڈھکی ہوئی پلکوں میں سے ایک افسر کو دیکھتا ہے جو بڑا فوجی کوٹ پہنے کھڑا ہے۔

وائی برگ اسکایا کو! افسر پھر کہتا ہے۔ سو رہے ہو؟ وائی برگ اسکایا کو!

افسر کی بات سمجھ کر ایونا باگ کو جھٹکا دیتا ہے، برف کے ٹکڑے گھوڑی کی پیٹھ اور ٹھوں

پرے ہوا میں اڑتے ہیں، افسر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے، گاڑی بان گھوڑی کو للکارتا ہے، بط کی طرح گردن آگے کو نکالتا ہے، اپنی جگہ پر اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور گو اس کی ضرورت نہیں ہے، مگر عادت کے مطابق چابک کھینچتا ہے، گھوڑی گردن آگے کو نکالتی ہے، اپنی بانس کی سی ٹانگیں سکیڑتی ہے، اور بادلِ ناخواستہ چلنے لگتی ہے،

تاریکی کے انبار میں سے جو اس کے سامنے اِدھر سے اُدھر گردش کر رہا ہے۔ ایونا کے کان میں چیخوں کی آواز آتی ہے "شیطان، کہاں گھسا چلا آتا ہے؟ کدھر ملا پڑتا ہے؟ د۔ دائیں کو چل!

تمہیں چلانا نہیں آتا! دائیں کو چلاؤ، افسر بگڑ کر کہتا ہے۔

ایک کوچوان جو کسی کی ذاتی گاڑی چلا رہا ہے، اُسے جھڑکتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک راہ گیر کے شانے گھوڑی کی ناک سے رگڑ کھاتے ہیں۔ وہ اُس کی طرف غصے کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی آستین جھٹکتا ہے۔ ایونا بکس پر اس طرح پہلو بدلتا ہے، جیسے کانٹوں پر ہے۔ کہنیاں ہلاتا ہے، اور چاروں طرف مبہوت ہو کر کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے، کہ کہاں ہوں، اور جہاں ہوں، وہاں کیوں ہوں،

"یہ سب لوگ کتنے بدمعاش ہیں!" افسر از راہ تمسخر کہتا ہے، پوری کوشش کرتے ہیں۔ کہ تمہارے راستے میں حائل ہوں، یا گھوڑی کے پاؤں سے کچلے جائیں، ضرور جان بوجھ کر یہ شرارت کرتے ہیں،

ایونا اپنی سواری کی طرف دیکھتا ہے، اور اپنے ہونٹ ہلاتا ہے... بظاہر کچھ کہنا چاہتا ہے، مگر سوائے سوں سوں کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔

"کیا کہا؟" افسر پوچھتا ہے۔

ایونا کھسیانا ہو کر مسکراتا ہے۔ اور گلے پر زور ڈال کر روکھی آواز سے بمشکل یہ لفظ ادا کرتا ہے:

"میرا لڑکا... میرا لڑکا اس ہفتہ گذر گیا حضور"

...

ہُوں ! کیا شکایت تھی ؟

ایونا پوری طرح سواری کی طرف پلٹ کر کہتا ہے:

’خدا جانے ! بخار رہو گا... تین دن ہسپتال میں پڑا رہا ، اس کے بعد گذر گیا ، جو خدا کی مرضی‘

’شیطان‘ مڑ کر دیکھ !‘ اندھیرے سے آواز آتی ہے، ’کتے ، باؤلا ہو گیا ہے ؟ آنکھیں کھول کر دیکھ
دھر چلا جا رہا ہے !‘

چلے چلو ! چلے چلو ! افسر کہتا ہے۔ اس رفتار سے کل تک بھی نہیں پہنچ سکتے ، تیز چلو !

گاڑی بان پھر گردن آگے کو نکالتا ہے ، اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، چابک گھماتا ہے، کئی بار
مڑ کر افسر کی طرف دیکھتا ہے، افسر نے آنکھیں میچ لی ہیں ، اور بات چیت کرنا نہیں چاہتا ،

وائی برگ اسکایا پر سواری کو اتار کر ایونا ایک قہوہ خانے کے پاس گاڑی کھڑی کرتا ہے ،
ر پھر سکڑ کر بکس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ گزرتا ہے ، پھر دوسرا...

تین نوجوان ، دو کشیدہ قامت ، اور دبلے پتلے ، ایک پستہ قد اور کبڑا ، ایک دوسرے
فقرے کستے ، اپنے برساتی جوتے پہنے ، کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اُس طرف آتے ہیں ،

’گاڑی بان !‘ پولس کے پُل کو چلو ! کبڑا ابھو جری آواز سے چلاتا ہے ! ’تینوں کے... بیس کوپک !‘
ایونا باگ کھینچتا ہے ، اور گھوڑی کو للکارتا ہے ، اصل کرایہ بیس کوپک سے زیادہ ہوتا ہے مگر اسے
ں کا خیال نہیں ، ایک روبل ہو یا پانچ کوپک ، اس کی پرواہ نہیں ، بس سواری مل جائے
دں آدمی ایک دوسرے کو دھکیلتے ، بد زبانی کرتے ، گاڑی کی طرف آتے ہیں ، اور تینوں
کوشش کرتے ہیں ، کہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں ، تصفیہ طلب سوال یہ ہے ، کون سے دو بیٹھیں ، اور
ن کھڑا رہے ؟ لمبے چوڑے بحث مباحثے ، تو تو میں میں ، گالی گلوج کے بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے
کبڑا کھڑا رہے ، کیونکہ وہ سب سے مختصر ہے ،

چلو کبڑا کھڑا ہو کر کہتا ہے ، ایونا کی پیٹھ پر اس کا سانس محسوس ہوتا ہے ’فروٹ ہو جاؤ ! دوست
ہاری ٹوپی عجیب و غریب ہے ، اس سے ردی ٹوپی سارے پیٹر برگ میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گی‘

ہی ہی! ہی ہی! ایونا ہنستا ہے، بس گذارے کے لائق ہے،

'خیر، جناب گذارے کے لائق، ذرا تیز چلئے! تمام راستے اسی چال سے چلو گے؟ کیوں؟ دوں تان کر ایک چٹاخا؟

'میرا سر پھٹا جا تا ہے' کشیدہ قامت نوجوانوں میں سے ایک کہتا ہے، 'دکماسوف کے ہاں کل واسکا اور میں مل کر برانڈی کی چار بوتلیں اڑا گئے'

'سمجھ میں نہیں آتا تم اتنی بکواس کیوں کرتے ہو؟' دوسرا کشیدہ قامت نوجوان خفا ہو کر کہتا ہے، 'وحشیوں کی طرح جھوٹ بکتے ہو!'

'اپنی جان کی قسم، سچ کہتا ہوں!'

'یہ ایسا ہی ہے، جیسے یہ کہنا کہ جوں کھانستی ہے!'

ہی ہی! ایونا ہنستا ہے، صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں!

'مردود!' کبڑا غصے میں آکر چنختیا ہے، چلاّتا ہے، 'ملعون، نہیں؟ گاڑی یوں چلائی جاتی ہے؟ چلانے کا یہ طریقہ ہے؟ لگا ایک چابک۔ کم بخت کی چابک سے خبر لے۔'

ایونا کو اپنے پیچھے کبڑے کے ہلنے جلنے اور کانپتی ہوئی آواز کا احساس ہوتا ہے، وہ سنتا ہے کہ مجھے گالیاں دی جا رہی ہیں، لوگوں کو دیکھتا ہے، اور تنہائی کا بوجھ اُس کے دل پر سے ہلکا ہو جاتا ہے، کبڑا اُسے بُرا بھلا کہتا ہے، یہاں تک کہ اپنے پچھلے وار گرم گرم فقروں سے اُس کے گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے، اور کھانسی اُس کی زبان بند کر دیتی ہے۔ اُس کے کشیدہ قامت رفیق نداٗنسرڈا پتروونا ایک عورت کا ذکر چھیڑتے ہیں، ایونا اُن کی طرف دیکھتا ہے، تھوڑی دیر انتظار کر کے، جب وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں، تو پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

'اس ہفتے... میرا... لڑکا گذر گیا!'

'سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے' کبڑا ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے، اور کھانس کر ہونٹ پونچھتا ہے 'خیر، تیز چلاؤ، تیز۔ یارو مجھ سے یہ چیونٹی کی چال نہیں دیکھی جاتی! نہ معلوم کب پہنچائے گا؟'

ذرا اِس کی ہمت بڑھاؤ... لگا دُگرون پر ایک ہاتھ!،

ملعون، سُنتا ہے! مزا چکھا دوں گا، تم لوگوں کا لحاظ کرنے سے پیدل چلنا اچھا
سنتا ہے؟ یا جو کچھ ہم لوگ کہ رہے ہیں، تیری جوتی کی نوک سے!،

ایونا کی پیٹھ پر تھپڑ پڑتا ہے جس کا تڑاخا اُسے چوٹ سے زیادہ سنائی دیتا ہے۔

ہی ہی! وہ ہنستا ہے۔ صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں، خدا آپ صاحبان کو سلامت
،

گاڑی بان تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ ایک کشیدہ قامت پوچھتا ہے۔

میری؟ ہی ہی! صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔ اب گیلی مٹی ہی میری دُلہن بنے گی...
ہو! یعنی قبر! ذرا سوچو، میرا بیٹیا چل بسا، اور میں ہٹا کٹا موجود ہوں، عجب معاملہ ہے،
اٹکل پچو زنجیر کھٹکھٹاتی ہے۔ میرے پاس آنے کے بجائے میرے لڑکے کو جا دبوچا...!

ایونا مُڑ کر انہیں اپنے بیٹے کی موت کا حال سُناتا ہے، مگر یہاں پہنچ کر کبڑا ہلکی سی آہ بھر کر
ے شکر ہے منزل مقصود پر آ پہنچے۔ اپنے بیس کوپک لے کر ایونا دیر تک اُن اوباشوں کی
دیکھتا رہتا ہے، وہ ایک اندھیرے پھاٹک میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے
یونا کے لئے پھر وہی تنہائی وہی ہُو کا عالم چھا جاتا ہے، جو صدمہ گھڑی بھر کو ہلکا ہو گیا
پھر اُبھر آتا ہے۔ اور اس کے دل پر انتہائی شدت سے ٹوٹتا ہے، اُس کی نظروں سے
مدد ٹپکتا ہے، وہ بےچین نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی ریل پیل پر نظریں
ہے، کیا اس ہزاروں کے مجمعے میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں، جو اُس کی دُکھ بھری
نے؟ لوگ اُس سے، اُس کے غم سے غافل گزرے چلے جاتے ہیں.... اس کا غم بے انتہا
اندازے سے باہر ہے، اگر اُس کا دل ٹکرے ٹکرے ہو جائے اور اس کا غم اُس سے
بہے، تو وہ تمام دنیا میں سیلاب کی طرح پھیل جائے، پھر بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتا
ے ایک ایسے حقیر خول میں چھپنے کو جگہ نکالی ہے کہ دن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو

تب بھی نہ دکھائی دے ۔...

ایونا کی نظر ایک دربان پر پڑتی ہے، جس کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے، وہ اس سے

چیت کرنے کی ٹھانتا ہے،

'بھئی کیا وقت ہوگا؟'

'دس بجا چاہتے ہیں... یہاں کیوں کھڑے ہو؟ آگے بڑھو!'

ایونا چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے، اتنا جھکتا ہے کہ دوہرا ہو جاتا ہے، اور اپنے غم میں

ڈوب جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ لوگوں سے کسی قسم کی امید رکھنا بے فائد

ہے۔ پانچ منٹ نہیں گذرتے کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر اس طرح ہلاتا ہے

سخت درد میں مبتلا ہے، اور باگ کھینچتا ہے... اب اس سے تکلیف نہیں سہی جاتی۔

'واپس اصطبل کو!' اپنے دل میں کہتا ہے، 'اصطبل کو!'

گھوڑی اس کے خیالات کو تاڑ کر دلکی چلنے لگتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایونا ایک

بڑے آتش دان کے پاس بیٹھا ہے، آتش دان پر، فرش پر، بینچوں پر لوگ پڑ

خراٹے لے رہے ہیں۔ ہوا بو میں بسی ہوئی اور کثیف ہے، ایونا سونے والوں کی طر

آتا ہے۔ اپنا بدن کھجاتا ہے، اور افسوس کرتا ہے، کہ ناحق اتنے سویرے گھر واپس

'مزدوری سے دانے کے دام بھی نہیں نکلیں گے!' سوچتا ہے 'یہی وجہ

کہ میں اتنا غمگین ہوں جو اپنا کام ٹھکانے سے کرتا ہے... جسے پیٹ بھر کھانے کو میس

ہے، جس کے گھوڑے کو پیٹ بھر دانا ملتا ہے، وہ ہمیشہ چین سے رہتا ہے.....'

ایک کونے میں سے ایک نوعمر گاڑی بان اٹھتا ہے، کچھ سوتے کچھ جاگتے کھنکھ

ہے۔ اور پانی کی بالٹی کا رخ کرتا ہے،

'کچھ پیو گے؟' ایونا پوچھتا ہے'

'معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے'

«خدارا اس لائے!... بھئی، دیکھو میرا بیٹا گذر گیا.... سنتے ہو؟ اِس ہفتے اسپتال میں... عجیب معاملہ ہے..»

ایونا دیکھتا ہے کہ اُس کے لفظوں کا کیا اثر ہوا، مگر کچھ نظر نہیں آتا، نوجوان اپنا منہ لپیٹ کر سو جاتا ہے، بڈھا آہ بھرتا ہے اور اپنا بدن کھجاتا ہے.. جس طرح نوجوان کو پانی کی پیاس تھی، اسی طرح وہ بات چیت کا پیاسا ہے، اس کے لڑکے کو مرے عنقریب ہفتہ بھر ہو جائے گا، اور اب تک اُسے کسی سے کھُل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا، وہ اِس بارے میں ٹھکانے سے جی بھر کر باتیں کرنی چاہتا ہے... وہ یہ بتانا چاہتا ہے، کہ میرا بیٹا کس طرح بیمار پڑا، اُس نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، مرتے دم کیا کہا، کیونکر مرا... وہ چاہتا ہے کہ جنازے کا حال سُنائے، اور بتائے کہ کیونکر اپنے لڑکے کے کپڑے لینے ہسپتال گیا، اُس کی لڑکی انیسیا دیہات میں رہتی ہے،.. وہ چاہتا ہے کہ اُس کا بھی ذکر کرے.. ہاں، اب اُسے بہت کچھ کہنا سننا ہے، جس سے وہ باتیں کرے اُسے چاہئے کہ ٹھنڈی آہیں بھرے، تعجب کا اظہار کرے، اور اُس کے سوگ میں شریک ہو.... اگر عورتیں بات کرنے کو مل جائیں تو اور بھی اچھا ہو، گو وہ بے وقوف ہوتی ہیں، اور بات شروع نہیں ہوتی کہ بسورنے لگتی ہیں،

«چلیں، گھوڑی کو ایک نظر دیکھ آئیں، ایونا سوچتا ہے، سونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے... نیند کہیں نہیں گئی...»

کوٹ پہن کر گھوڑی کے تھان میں داخل ہوتا ہے، اسے دانے چارے، موسم کا خیال آتا ہے... تنہائی میں وہ اپنے لڑکے کا خیال نہیں کر سکتا... کسی اور سے اس کا ذکر کر سکتا ہے.. مگر اُس کا خیال کرنا اور تصور باندھنا، یہ اذیت اُس کی برداشت سے باہر ہے...

«دانہ چبا رہی ہو؟» اپنی گھوڑی کی روشن آنکھیں دیکھ کر پوچھتا ہے: «اچھا جگالی کئے

جاؤ، کے جاؤ ... دانے کے لئے کافی مزدوری نہیں ملی تو نہ سہی، گھاس کھاکر گذارہ کر لیں گے،... ہاں ... میری عمر اب گاڑی چلانے کی نہیں رہی، اب میرا نہیں، میرے لڑکے کا کام سنبھالنے کا وقت تھا،... وہ پورا گاڑی بان تھا... اسے کچھ دن اور جینا تھا...... ...

ایونا تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جاتا ہے، پھر کہتا ہے:

'بیٹی یہ بات ہے،... کُزما ایونچ چل بسا... مجھ سے رخصت ہو گیا، بلا وجہ اچانک جان دے دی... اچھا یوں سمجھو کہ تمہارا ایک بچھیرا ہے، اور تم اس ننھے سے بچھیرے کی ماں ہو... اور یکایک وہ بچھیرا مر جائے... تو تمہیں اُس کا رنج ہوگا کہ نہیں؟'

گھوڑی منہ چلاتی ہے، سنتی ہے، اور اپنے مالک کے ہاتھوں پر سانس لیتی ہے، ایونا کا دِل بھر آتا ہے، اور وہ اُس کے سامنے اپنا دِل چیر کر رکھ دیتا ہے،

(از چیخوف مترجمہ خواجہ منظور حسین صاحب)

تنقید و تبصرہ

کتب

یورپ میں دکھنی مخطوطات | مولفہ سید نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ تقطیع ۲۶×۲۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۱۲۱ صفحات قیمت غیر مجلد فی نسخہ للعہ مجلد صہ مولف سے ملجا گوڑہ ترپ بازار حیدر آباد دکن کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں ان دکھنی قلمی نسخوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جو انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ اور پیرس کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دکھنی مصنفیں کے حالات اور اُن کے کلام کے نمونوں کے ساتھ متفرق اردو اور فارسی نسخوں کے اختلاف بھی بیان کئے گئے ہیں۔

جن کتابوں اور مصنفوں کی نسبت اس کتاب میں معلومات لکھی گئی ہیں۔ وہ اردو زبان کے قدیم ترین کارنامے اور اساتذہ ہیں جن سے بالعموم لوگ واقف نہیں۔ اس لئے اردو زبان کی تاریخ میں یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ اور ہاشمی صاحب کی یہ کوشش ان کی دوسری کتابوں کی طرح اردو زبان کی تنقیدی تحقیقی کارناموں میں ایک بےنظیر کارنامہ ہے۔ کیونکہ جب تک اس سے مدد نہ لی جائیگی۔ کوئی تاریخ اردو زبان کی مکمل نہ ہو سکیگی

قانون وقف علی الاولاد | مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب حنیفی ایڈوکیٹ میرٹھ حجم ۵۲ صفحہ تقطیع ۲۶×۲۰/۸ لکھائی چھپائی کاغذ معمولی۔ قیمت فی نسخہ ۸ر مولف سے مِل سکتی ہے۔

یہ قانون جو مسلمانوں کی جائدادوں کی حفاظت کے لئے وضع ہوا ہے۔ اور ان کے لئے بیحد مفید ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک عام طور پر اہل اسلام اس سے غافل ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے اس کو صاف اور سلیس اردو زبان میں لکھدیا ہے تاکہ مسلمان اِس کو دیکھیں۔ اور اس سے نفع اٹھا سکیں۔ ہر صاحب جائداد مسلم کو چاہیئے کہ

اس کا مطالعہ کرے اور اس پر عمل درآمد کرکے اپنی ملکیت کو اپنی اولاد کے لئے محفوظ کر جائے

ریحان حمید | دیوان فارسی جناب مولوی حمید الزماں صاحب حمید شاہجہاں پوری تقطیع ۲۰×۲۹ حجم پانچ جزو۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا۔ قیمت درج نہیں مطبع آگرہ اخبار سے شائع ہوا۔

مولوی حمید الزماں صاحب کو فارسی زبان سے ذوق ہے۔ اور وہ اکثر غزلیں یا قطعات لکھتے ہیں۔ کبھی کبھی اردو میں بھی زمزمہ سنجی کرتے ہیں۔ اب انھوں نے اپنے کلام کا ایک مختصر مجموعہ مذکورہ بالا نام سے شائع کیا ہے۔ جس میں بڑا حصہ فارسی کلام کا ہے۔ اور آخر میں اردو غزلیں ہیں۔ کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کو زبان پر قدرت ہے۔ بیان صاف ہے۔ اکثر اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ نمونتاً دو چار اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

تا سر بہ پائے آن بت گلرو نہادہ ایم — کونین را گرفتہ بیک سو نہادہ ایم
واعظ بناز بر سر منبر لقبیل و قال — ما سر بطاق گوشۂ ابرو نہادہ ایم

زغرور حسن دنی سر خود فراز کردن — بہ کرشمہ از دو چشمت در فتنہ باز کردن
چہ خوش است جانِ جاناں بہ تبسم کہ گوئی — بنیش نمی پسندم گلہ را دراز کردن

اردو کا نمونہ یہ ہے۔

سنا تھا غیر کے ہمراہ آپ آتے تھے — یہ سنکے دل میں میری پیچ و تاب آتے تھے
عدو کے ساتھ یہیں آنے سے مدعا یہ تھا — ہمارے دل کو دکھانے جناب آتے تھے

گلزار عثمانی | مولوی عبد القوی صاحب فانی ایم۔ اے (علیگ) معلم شعبہ فارسی و اردو لکھنو یونیورسٹی نے شہزادگان آصف جاہی کی تقریب کدخدائی پر فارسی قصائد بطور تہنیت کے

پیش کیے۔ نیز چند قصیدے ہزاگزالٹیڈ ہائی نس اعلیٰ حضرت نظام کی مدح میں بھی اس مجموعہ میں ہیں۔

یہ قصائد لسانی اور شاعرانہ دونوں خوبیوں کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے قصائد میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے اپنی زباں دانی کی قدرت کا تماشا دکھایا ہے کہ خاقانی سے لیکر قاآنی تک کے رنگ میں قصائد لکھے ہیں۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ۔ حجم ۹۴ صفحات۔

سوارج دین و دنیا | مصنفہ محمد شرف الدین گندھی منیجر دواخانہ معدن الصحت چمن گو لنگوڑہ حیدرآباد دکن۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ ادنیٰ۔ حجم دو جزو۔ قیمت ۴ر فی نسخہ

آج جب کہ دنیا سوارج کے لئے میدان عمل میں اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور سلطنت سے مقابلہ کر رہی ہے۔ مولوی محمد شرف الدین صاحب نے دین اور دنیا دونوں کے سوارج کیلئے اس چھوٹے سے رسالہ میں چند اخلاقی سبق لکھدئے ہیں۔ ممدوح کا قول یہ ہے کہ اُن کے بار بار پڑھنے اور اُن پر عمل کرنے سے دونوں جہان کا سوارج مل سکتا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے نصیحتیں اچھی منتخب کی ہیں۔ لیکن اس امر کی طرف خیال نہ فرمایا کہ حکمت اور ہے اور حکومت اور۔

بارش اور قرآن | مصنفہ طبیب علی عبدالرسول شاکر۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی حجم تین جزو۔ ملنے کا پتہ۔ نسیم سحر آنس۔ راجہ سنگر اسٹریٹ جبلپور۔ قیمت فی نسخہ ۴ر

یہ ایک مضمون ہے جس کو مصنف نے کسی رسالہ میں شائع کرایا تھا۔ پھر اس کو الگ چھاپا ہے۔ اس میں بارش کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ تبلایا گیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور موجودہ علم طبیعی کی اس کے ساتھ مطابقت دکھائی ہے۔ قرآن کی آیتوں سے یہ تبایا ہے کہ بادل کیونکر بنتے ہیں۔ اور انکی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ پھر بارش کیونکر ہوتی ہے اور کتنے اقسام پر منقسم ہے۔ نیز اس سے دنیا کو کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں اور کن کن آیات ربانی پر استدلال ہوتا ہے

یہ رسالہ نہایت عمیق غور وفکر اور محنت وکاوش کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اور ہماری آرزو یہ ہے کہ اسی قسم کے علمی رسائل قرآن کریم سے لکھے جائیں۔ طبیب علی صاحب کے آغاز کار سے ہماری دل میں امید پیدا ہوگئی ہے۔ کہ آئندہ وہ اور ان کو دیکھ کر دوسرے طلبا رِ قرآن اس منزل میں قدم رکھیں گے۔

انہوں نے جس خوبی سے اس رسالہ کو لکھا ہے۔ اور جس طرح اس مضمون کے متعلق آیاتِ قرآن کا استیعاب کیا ہے۔ وہ بہت قابل داد ہے۔

مشاہدات! داؤدی بوہرہ اوقاف کے چشم دید حالات۔ نوشتہ جناب سیماب اکبرآبادی تقطیع خورد۔ حجم چار جزو۔ قیمت فی نسخہ ۱۰؍

ملنے کا پتہ نسیم سحر آفس سنگر اسٹریٹ۔ جبلپور

اس رسالہ میں جناب سیماب صاحب نے بطور خود داؤدی بوہرہ اوقاف کے حالات کی تفتیش کی۔ ان کی کیفیت دیکھی۔ اور جو کچھ دیکھا۔ اس کو لکھ کر شائع کردیا۔ انکی تحقیقات کا نتیجہ ان کے الفاظ میں یہ ہے۔ کہ داؤدی بوہرہ اوقاف کی حالت بالکل قابل اطمینان ہے انتظامات نہایت قابل اور تجربہ کار ہاتھوں میں ہیں۔ اور اوقاف کی نگرانی اور ان کی آمدنی کا جمع خرچ نہایت احتیاط سے ہوتا ہے۔

رسائل۔

مورخ! یہ رسالہ چھوٹی تقطیع پر ۴۰ صفحہ ماہوار کا مولوی سید علی اظہر صاحب عابدی کی ادارت فیض آباد سے نکلنا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر اپریل ۱۹۳۳ء کا تنقید کیلئے موصول ہوا ہے قیمت سالانہ ۱۲؍ ہے۔

اس رسالہ کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یعنی خدمت تاریخ۔ چنانچہ زیرِ تنقید رسالہ میں تاریخی ہی مضامین ہیں۔ لیکن لکھائی چھپائی نہایت ردی اور کاغذ اس سے زیادہ معمولی ہیں۔ کاش آئندہ نمبروں میں اسکی صوری و معنوی دونوں حیثیتوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

چین اور منچوریا | شنگھائی کے علاقہ میں جنگ بند ہوگئی اور بظاہر جمعیۃ اقوام کی ثالثی نے دنیا کو ایک حادثۂ عظیم سے بچالیا۔ اگرچہ سمجھوتہ ہونے سے پہلے جو حالات پیدا ہوئے ان سب سے اس کا اظہار ہوتا تھا کہ طرفین کے دل صاف نہیں۔ چین اپنی بے بسی کی وجہ سے ایک کڑوا گھونٹ پی رہا ہے اور جاپان اپنی قوت کے گھمنڈ میں باوجود افواج کے ہٹانے کے جانتا ہے کہ منچوریا پر تو اس کا تسلط ہو ہی گیا۔ قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں مگر پھر بھی سمجھوتہ ہوگیا۔ مگر ادھر منچوریا میں صورت حال کچھ اچھی نہیں۔ جاپان اور روس میں کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ نئی منچوری ریاست نے چین کے دونوں سیاسی مرکزوں لویانگ اور نانکنگ کو مطلع کر دیا ہے کہ ہمارا آپ کا تعلق یک قلم ختم۔ جنیوا کو بھی پیام بھیج دیا گیا ہے کہ اب چین ہماری طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ بے شمار منچوری مہاجرین کی طرف سے بھی ایک پیام جمعیۃ اقوام کو ملا ہے کہ "منچوریا کی نام نہاد خود مختار حکومت تمام و کمال جاپانی اثر میں ہے اور اس کے کارکن آزاد اور خود مختار نہیں ہیں"۔ جدید دستور اساسی کا اعلان ہوگیا ہے جس کی رو سے تمام طاقت ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں ہے جسے قوم کے سامنے جواب دہ بتلایا گیا ہے۔ وزارت اس ڈکٹیٹر کے زیر فرمان ہے۔ ڈکٹیٹر اپنی مشیر جماعت کی رائے سے تمام ایسے قوانین بھی منظور کر سکتا ہے جسے جماعت قانون ساز مسترد کر چکی ہو! پہلا جلسہ جولائی میں ہونے والا ہے!

لیکن دستور کے اعلان نے ملک میں بدامنی کم نہیں کی کچھ بڑھا ہی دی ہے۔ ہر طرف اس نئی حکومت کی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے اور یہ جاپانی بندوقوں کے زور پر اپنے کو قائم کئے ہوئے ہے دیکھنا ہے تا کجے؟ روسی سرحد پر بھی برابر کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔ روسی وزیر خارجہ کاراخان اور جاپانی سفیر ہیرو تا میں خاصی گرم گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن روس اپنے کو بہت روکے ہوئے ہے اس لئے کہ ڈر ہے کہ اس کی مخالفت میں فرانس اور انگلستان جاپان سے مل کر اسے سخت نقصان پہنچا دیں گے۔

جاپان | خود جاپان میں اس مہینہ میں وزیر اعظم انو کائی کے قتل کا حادثہ اندرونی حالات کی پیچیدگی کا مظہر ہے یوں بھی یہ قتل ایک اہم واقعہ ہوتا لیکن موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے اس سے جاپان میں آئینی حکومت کے مستقبل کا مسئلہ وابستہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری قوموں کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی جاپانی وزارت جو معاہدہ کرے وہ قابل اعتماد بھی سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں۔ جاپان میں آئینی حکومت کے قیام کو کوئی ۴۰ سال ہوتے ہیں اس لئے یہ توقع بے جا نہیں کہ جاپانی قوم اس طرز حکومت کی عادی ہو چکی ہوگی۔ لیکن حال میں جو صورتیں پیدا ہوئی ہیں وہ اس توقع میں شبہ کا عنصر شامل کر دیتی ہیں۔ ایک طرف سیاسیین کی کمزوری ہے اور خود غرضی دوسری طرف فوجی جماعت کا غرور ہے اور بے صبری۔ اور اندیشہ ہے اس کشاکش میں جاپان کا نظام حکومت درہم برہم نہ ہو جائے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب واکت سکی کی وزارت ختم ہوئی تو گویا اکثریت کی حکومت کو ایک ضرب کاری لگی۔ اس لئے کہ ملک کے مالیاتی طرز عمل میں تبدیلی پیدا ہو۔ منچوریا پر حملہ کے معاملہ میں بھی فوجی گروہ نے بہت کچھ اپنی مرضی پر کام کیا۔ شنگھائی کا معرکہ جس میں بحری و بری افواج کی بڑی تعداد ملک سے باہر بھیجی گئی وہ جب شروع ہوا ہے تو اس سے پہلے اس کا ذکر جاپانی پارلیمنٹ میں نہ ہوا تھا! جب مصارف کی منظوری کا مسئلہ پارلیمنٹ کے سامنے آیا تو ہر رکن نظر تحیل۔ اپنی پیشانی کے سامنے ایک بھرا ریوالور دیکھتا تھا اور ظاہر ہے کہ کم لوگ اس حال میں آزادی سے رائے دے سکتے ہیں۔ چنانچہ مصارف منظور کر دئے گئے۔ ایوان خاص کے ایک معزز رکن ڈاکٹر نی توبے نے کہہ دیا تھا کہ "یہ فوجی جتھے اور اشتراکی جماعتیں قوم کو تباہ کئے ڈالتی ہیں" تو انھیں سخت بیماری کی حالت میں ہسپتال سے نکال کر معافی منگوائی گئی۔ سب کو معلوم تھا کہ سابقہ وزیر مال انوئے اور بیرن تاکو ماوا کے قاتلوں کو پستول مشہور بحری کمانڈر فوجی نے دئے تھے جو خود بعد کو شنگھائی کے معرکہ میں کام آیا۔ غرض چار طرف "وطن دوست" جماعتوں کا دور دورہ ہے جو قوم کی اصلاح بالجبر کے درپے ہیں اور جن کا کام یہ فہرستیں بنانا ہے کہ کس کس ممتاز شخص کو جلد سے جلد گولی کا نشانہ بنایا جائے تاکہ قوم ترقی کرے! ان فہرستوں میں جاپان کے تقریباً سب مشہور مدبر شامل ہیں!

جاپان میں یہ چیز بالکل نئی ہے۔ جاپانی سیاسی جماعتیں پہلے بھی لڑتی تھیں لیکن جب کوئی فیصلہ ہوتا تھا تو شاہی منظوری اسے مقدس بنا دیتی تھی اور ہر جاپانی اسے اپنا فیصلہ جانتا تھا۔ اور یہ چیز جاپانیوں کے لئے بحیثیت قوم بڑی قوت کا باعث تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی گوناگوں مشکلات کے بارے اہم

روایت کو ختم کر دیا ہے۔ اور وزیر اعظم انوکائی کا قتل اس کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ اس خاتمہ کی ذمہ داری اشتراکی اور فوجی جماعتوں کے سر پر ہے۔ اشتراکیوں کو تو حکومت دبالیتی تھی، مگر فوجی اور بحری حلقوں میں بیزاری کی اس کمی کا علاج حکومت کے پاس کیا ہے؟ سیاست میں فوج کا طرفدار ہونا اور فوجی قائدوں کا سیاسی جتھوں سے وابستہ ہو جانا پہلے بھی سلطنتوں کو تباہ کر چکا ہے۔ سلطنت روما میں یہی ہوا، چین کی قوت اسی سے منتشر ہوئی، کیا جاپانی سپاہی بھی قوم کے خادم ہونے کی جگہ اس کا آقا بننے کی ہوس میں جاپانی عظمت کے اختتام کا آغاز کر رہا ہے؟

فرانس اپنا سالانہ میزانیہ منظور کرنے کے بعد فرانسیسی پارلیمنٹ کے اجلاس یکم اپریل کو ختم ہو گئے تھے اور لوگوں کی توجہ تمام تر عام انتخابات کی جانب ہو گئی تھی۔ انتخابات پہلی اور آٹھویں مئی کو ہوئے۔ دو روز اس لئے کہ فرانس میں انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو انتخابی حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر حلقہ سے ایک نمائندہ بھیجا جاتا ہے۔ پہلے انتخاب میں اس شخص کو منتخب شدہ سمجھتے ہیں جسے اپنے دوسرے حریفوں کی مجموعی رایوں سے زیادہ رائیں حاصل کی ہوں۔ جن حلقوں میں کوئی شخص اتنی رائیں نہیں پاتا وہاں پھر انتخاب ہوتا ہے جس میں محض اکثریت انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔

انتخاب سے پہلے فروری میں ایوان عام (چیمبر) میں طریقۂ انتخاب میں ترمیم کی تجویز منظور ہوئی تھی۔ جس کی رو سے دوسرا انتخاب غیر ضروری قرار دیا گیا اور عورتوں کو حق انتخاب دینے کی تجویز تھی۔ (یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کی سب سے قدیم جمہوریت میں آج تک عورتوں کو رائے دینے کا حق نہیں ہے!) لیکن ایوان خاص (سینٹ) نے تقریباً بیک آواز اسے مسترد کر دیا۔ جب یہ تجویز دوبارہ چیمبر میں آئی (۱۰ مارچ کو) تو عام انتخابات سر پر آچکے تھے اس لئے چیمبر نے اپنے فروری والے فیصلہ کو واپس لے لیا۔

دوسرا انتخاب ۸ مئی کو ہونے والا تھا اور ۶ مئی کو ایک پاگل روسی ڈاکٹر نے صدر جمہوریہ، موسیو دومے، کو کئی گولیوں کا نشانہ بنایا اور وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ روس میں ذہنی کام کرنے والوں کے ساتھ عموماً اور موجودہ نظام حکومت کے مخالفوں کے ساتھ خصوصاً جو بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے اس نے ان گنتی روسیوں کو پردیس میں ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ پاگل ڈاکٹر بھی انھیں مہاجرین میں سے ہے جن کے ساتھ فرانس نے حتی الوسع اچھا سلوک کیا ہے! مگر یہ اپنے دل کی بے چینی کو کیا کرتا، اپنے ملک کی

سیاسی حالت جس نے گھر چھڑایا اس کے بدلنے سے بدل نہ سکتی تھی، ناکامی پر غصہ تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی طرح ساری فرانسیسی قوم کو بھی غصہ کیوں نہیں اور وہ اس کی خاطر روس پر حملہ آور کیوں نہیں ہو جاتی، چنانچہ اس کے نزدیک وہ بھی اسی قدر نفرت کی مستحق قرار پائی تھی جتنی کہ روس کی موجودہ حکومت۔ بس کیا تھا، موقع ملا اور اس نے اس حکومت کے صدر کو قتل کر دیا۔ اس پر نہ تعجب ضروری ہے نہ اس سے نفرت کہ جنون کی منطق ہی جدا ہے!

اس واقعہ نے یوں تو چند روز کے لئے فرانس کو ماتم کدہ بنا دیا لیکن انتخابات پر اس کا ذرا اثر نہ پڑا، اس لئے کہ قاتل پردیسی تھا اور ملک کی کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ سینٹ کے صدر موسیو لوبرلاں جو اعتدال پسند سیاسی ہیں اور اپنی اصابت رائے کے لئے بہت مشہور ہیں، صدر جمہوریہ منتخب ہو گئے۔

عام انتخابات میں پچھلے ایوان عام کی مخالف جماعتوں کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ پچھلے ایوان میں قدامت پسند جماعتوں کی اکثریت تھی۔ اس مرتبہ Radical Socialist اور اشتراکی جماعتوں کے نمائندے بڑھ گئے ہیں۔ مخالف جماعتوں کے پاس انتخاب کے معرکہ میں یہ حربے تھے کہ موجودہ حکومت پر ملک کے معاشی مصائب کی ذمہ داری ہے، بجٹ کی تمام دشواریاں انہیں نے پیدا کیں، بعض بنکوں کو بچانے کے لئے بہت بڑی بڑی رقمیں صرف کی گئیں، بہت سے شخصی کاروبار کرنے والوں کو خطیر رقمیں دی گئیں اور جنوبی مشرقی یورپ کی دیوالیہ قوموں پر نہ جانے کتنا کچھ صرف کیا گیا، تخفیف اسلحہ کی تجاویز کی حمایت حکومت نے دل سے نہیں کی۔ اور بریاں نے دول یورپ میں باہمی تعاون اور اتحاد کی جو کوششیں کی تھیں انھیں بھی حکومت نے اچھی طرح پنپنے نہ دیا۔

جنوب مشرقی یورپ کا معاشی اتحاد | قوم پرستی کی تنگ تعبیر نے یورپ کی معاشی زندگی کو جو نقصان پہونچایا ہے اس کی تلافی کی تدبیریں برابر سوچی جا رہی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جرمنی اور آسٹریا میں اتحاد معاشی کی تجویز نہایت زور سے اٹھی تھی لیکن فرانس کے سیاسی دباؤ نے اسے روبراہ نہ آنے دیا۔ اب ساحل ڈینیوب والی ریاستوں میں اتحاد معاشی کی تجویز پیش ہے۔ اس تجویز کا آغاز تو انگلستان میں کوئی تین مہینے پہلے ہوا تھا، مگر اسے فوراً فرانس نے اپنا لیا۔ فرانس اور انگلستان کی طرف سے تجویز یہ تھی کہ چکوسلوواکیا، آسٹریا، ہنگری، رومانیا اور یوگوسلاویا اپنے آپس کے محاصل درآمد میں ۱۰ فی صدی کی کمی کر دیں، دوسرے ممالک کو جو مخصوص جدا جدا حقوق حاصل

ہیں وہ ان سے دست کش ہو جائیں اور ان کے مال پر جو درآمد کے محاصل لگا رکھے ہیں ان میں اب مزید اضافہ نہ کریں۔ ان ممالک کی زرعی پیداوار پر جو محاصل درآمد دوسرے ممالک میں ہیں ان میں کمی کر دی جائے اور فوری ضروریات کے لئے ان ممالک کو کوئی ۵ کروڑ روپیہ کا قرضہ دیا جائے اور اس قرض کے ضامن انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی ہوں۔ جرمن اور اطالوی نمائندوں نے اس تدبیر کو مطلق پسند نہ کیا کہ ان کے نزدیک اس سے ڈینیوبی ممالک کی بھی کچھ مدد نہ ہو سکے گی اور خود ان کے ملکوں کو غیر ضروری معاشی مشکلات میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ یہ دونوں قومیں اس تجویز کی زیادہ حامی اس لئے بھی نہیں کہ یہ صاف طور پر ان مشرقی ممالک میں فرانسیسی اثر کو مستحکم کرنے کی ایک اور تدبیر ہے جس پر عمل اس لیے آسان ہوگا کہ شرکا میں سے اکثر مالی اعتبار سے پہلے ہی سے فرانس کے دست نگر ہیں۔ فرانس اور اٹلی کے علاوہ پولینڈ کے اخبارات بھی اس تجویز کی کم و بیش مخالفت ہی کر رہے ہیں اور اس پر تو متفق اللسان معلوم ہوتے ہیں کہ اگر یہ اتحاد قائم ہی ہو تو اس میں پولینڈ کی شرکت ضروری ہے۔

غرض فرانس کی خود غرضی اور دوسری دول کی رقابت نے فی الحال اس تجویز کو ملتوی کرا دیا ہے مگر صورت حال ایسی ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکالنا لازمی ہے۔ اس لئے کہ سیاسی آزادی کی جو قیمت ان نئی ریاستوں کو ادا کرنی پڑی ہے اس کا بوجھ اب اٹھائے نہیں اٹھتا۔ جنگ سے پہلے آسٹریا ہنگری کی سلطنت اگرچہ نسلی اور لسانی اعتبار سے مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب تھی اور اس لئے سیاسی رقابتوں کا جولانگاہ تھی مگر معاشی خوشحالی کی ضامن بھی تھی۔ سلطنت کے زراعتی اور صنعتی علاقوں میں خوب تبادلۂ اجناس ہوتا تھا اور اندرونی تجارت ہی خوشحالی قائم رکھنے کے لئے کافی تھی۔ اب جو نئی ریاستیں بنیں وہ سب اپنی سیاسی آزادی کے ساتھ معاشی خود مختاری کی بھی خواہاں ہیں۔ قوم پرستی کا بھوت سب کے سر پر سوار ہے اور یہ زرخیز اور خاصا ترقی یافتہ صنعتی علاقہ فلاکت و افلاس سے دوچار ہے۔ آسٹریا اور چیکوسلوواکیا کی صنعتی پیداوار ہنگری میں نہیں جا سکتی، اور ہنگری کا غلہ آسٹریا میں نہیں آ سکتا اور یہ ملک جو پہلے آپس میں خوب لین دین کرتے تھے اب بس یورپ کے دوسرے ممالک سے تجارت پر مجبور ہیں اور یہ تجارت اتنی نہیں کہ ان کے مال کی نکاسی ہو سکے۔

ہر چند کہ اس وقت اس اتحاد معاشی کی تجویز ملتوی ہو گئی ہے لیکن یقین ہے کہ معاشی دشواریاں پھر مسئلہ کو سامنے لائیں گی اور شاید اتحاد یورپ کا وہ خواب جو چند مغربی مفکرین نے سیاست کے ہنگاموں

سے دور دیکھا تھا اور جسے بریاں نے اپنا کر ذمہ دار سیاست کا جزو بنا دیا ان منصوبوں میں اپنی تعبیر پائے اور یورپ تنگ نظر قوم پرستی کے نقصانات سے تنگ آکر اپنے نظام سیاسی و معاشی میں ترمیم کی طرف متوجہ ہو۔

اسلامی ممالک

افغانستان انگریزوں کی نظر میں | ایک انگریز نامہ نگار لکھتا ہے:۔

"تاجدار افغانستان کی یہ کوشش ہے کہ وہ شاہ معزول کی قائم کردہ بنیادوں پر ایک مضبوط عمارت تیار کریں۔ افغانستان میں درانی حکومت کی ابتدا ہوئے کم و بیش ایک صدی گزر چکی ہے۔ اسی اثنا میں اکثر خونریزیاں ہوتی رہیں چنانچہ ابھی تک ملک میں انقلاب ۱۹۲۹ء کے آثار باقی ہیں۔

بایں ہمہ اگر افغانستان کو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ موجودہ صورت حالات کو یکسر بدل ڈالے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک جاہل اور غیر متمدن قوم اعلیٰ درجے کی مہذب اور تعلیمیافتہ قوموں کے درمیان آزادانہ حیثیت اختیار کر سکے۔ افغانستان کی آبادی شاید ایک کروڑ ہوگی۔ جنوب اور مشرق میں پٹھان اور افغان بستے ہیں، وسط میں تاتاری اور ہزارا قبائل، مغرب میں ایک قلیل آبادی ایرانیوں کی ہے اور شمال میں حدود روس تک تاجیک، ازبک اور مختلف ترکی عناصر آباد ہیں۔ ان لوگوں میں اتحاد و اتفاق کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ ہزارا قبائل اور درانی پشتہا پشت سے ایک دوسرے کے دشمن چلے آتے ہیں۔ ترکی عناصر کسی خارجی دباؤ یا اثر کو پسند نہیں کرتے اور تاجیک جو نسبتاً زیادہ امن پسند ہیں افغانوں کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اس وقت افغانستان میں ستر ہزار قواعد داں سپاہی ہیں لیکن ان کی جنگی صلاحیات کم و بیش مختلف ہیں۔ اگر نظم و انضباط پر زور دیا جائے تو پٹھان نہایت اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ محکمۂ پولیس اگرچہ ایک ایسے افسر کی زیر نگرانی ہے جو اسکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ ہے لیکن

اس محکمہ کا اثر زیادہ تر شہروں تک محدود ہے۔ دیہات میں ہر شخص خود اپنا محافظ ہے۔ بایں ہمہ لوگوں کے تعلقات آپس میں خوشگوار ہیں اور نقص امن کے احتمالات بہت کم۔

اگر افغانستان میں آبپاشی کا معقول انتظام ہو جائے تو زرعی پیداوار میں بہت کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ قندھار کے قرب وجوار میں اعلیٰ درجہ کا گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے گیہوں اور پھلوں کی کاشت کے لئے اکثر اضلاع میں "مزرعے" (ایگریکلچر فارم) قائم کئے گئے ہیں۔ مصر اور امریکہ سے کپاس کا بیج حاصل کیا گیا ہے۔ اونی مصنوعات کے لئے افغان کسی ملک کے محتاج نہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ کپاس کی کاشت کے بعد ان کو دوسرے ممالک سے سوتی کپڑے منگوانے کی ضرورت باقی رہے۔ کابل کے قریب حکومت نے جانور پالنے بھی شروع کر دیئے ہیں لیکن ان کی نسل کشی کے لئے بیرونی امداد کی ضرورت ہو گی اس لئے کہ افغانستان میں پالتو جانور کچھ بہت اچھی قسم کے نہیں ہیں۔

اس وقت افغانستان میں کپاس، تنباکو، تیل کے بیجوں، دالوں، چاول اور پھلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ ایکڑ پر آبپاشی کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جس کا بڑا ذریعہ زمین دوز نالے یا کچھ نہریں ہیں۔ ہزارا قبائل زمین دوز نالوں کی تیاری میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہی حال ان ایرانیوں کا ہے جو وادی ہلمند اور قندھار میں آباد ہیں۔ افغان زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔ ان کے ایک تہائی حصے کا مستقل قیام کسی علاقے میں نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر وسائل آبپاشی کو وسعت دی جا سکے تو بہ نسبت اس وقت کے تین حصے زائد زمین کاشت کے قابل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ تاجدار افغانستان آبپاشی کی ایک بہت بڑی اسکیم پر غور کر رہے ہیں۔

افغان کاشتکار وہی پرانا ہل استعمال کرتا ہے جو ابدالآباد سے اس کے ملک میں رائج ہے۔ اس کا کام کھالوں کا بیچنا اور کپاس، نمک اور کپڑا خریدنا ہے۔ قرض کی ضرورت ہو تو اس کے لئے کسی سنی مسلمان، شیعہ ایرانی، ارمنی عیسائی، یہودی یا ہندو کے ہاں پہنچتا ہے۔ قحط سالی سے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچتا۔ اول تو افغانستان میں قحط سالی ہوتی بہت کم ہے اور ہو بھی تو خانہ بدوش قبائل کو اس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ ٹیکسوں کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ حکومت صرف پیداوار کے ۱/۵ یا ۱/۶ حصے کی مستحق ہے۔

افغانوں پر جدید خیالات کا مطلق اثر نہیں۔ صرف دو ایک شہر ہیں جن میں سینما موجود ہیں۔ ریڈیو بھی صرف اہل شہر تک محدود ہے۔ سوائے قرآن خوانی کے تقریباً تمام آبادی ان پڑھ ہے۔ عام عورتیں اگرچہ بے نقاب رہتی ہیں لیکن ان کا مردوں سے مطلق میل جول نہیں۔ دیہات میں اخبار کبھی نہیں پہنچتے اور اول تو شہروں میں بھی اخبارات کا وجود کس گنتی میں ہے۔ یونہی کبھی کبھی دیہات میں شہر کی کوئی خبر پہونچ جاتی ہے۔ دیہاتیوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مجلس ملی کے لئے اپنا نمائندہ چن لیں۔ تعلیم سے ان کو کوئی رغبت نہیں۔ مدارس سے صرف تاجر یا زمیندار فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اہل دیہات صرف اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب ملا ان سے یہ کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے مثلاً امان اللہ خاں نے فرنگی ٹوپی کیوں پہنی یا قادیانیوں کو سنگسار کر دیا گیا تو بہت اچھا کیا۔

اہل دیہات کا مطمح نظر صرف اس وقت بدل سکتا ہے جب ملک میں ہر طرف ریلیں اور سڑکیں پھیل جائیں۔ فضائی آمد و رفت عام ہو جائے۔ ہر طرف امن و امان قائم ہو۔ لوگ قانون کا احترام کریں۔ حکومت باقاعدہ اور منظم ہو لیکن اس کے لئے ٹیکسوں میں اضافہ کرنا ناگزیر ہوگا اور ٹیکس افغانستان میں نہایت ناپسند کئے جاتے ہیں۔ افغانستان کی حکومت کوئی پھولوں کی سیج نہیں۔ تاجدار افغانستان کا راستہ مشکلات سے پر ہے لیکن اعلیحضرت نادر شاہ غازی ایک نہایت ہی محتاط اور مدبر حاکم ہیں اور وہ جو قدم اُٹھاتے ہیں سوچ سمجھ کر اُٹھاتے ہیں۔

اتحاد عراق و ایران پچھلے مہینے شاہ فیصل ایران تشریف لے گئے جہاں ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا گیا۔ طہران میں دعوتوں اور استقبالوں کی بھرمار تھی۔ شاہ فیصل قم کی زیارت کرتے ہوئے سلطان آباد آئے اور وہاں سے ۴ مئی کو محمرہ پہنچے، البتہ نوری پاشا براہ راست اسی روز بغداد پہنچ گئے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا تھا شاہ عراق کا مقصود اس سفر سے یہ تھا کہ دولت ایران و عراق میں دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ عراق اور ایران کی ایک دوسرے سے کشیدگی کی بڑی وجہ کردی قبائل کی نقل و حرکت تھی جو بین الاقوامی ذمہ داریوں کا خیال کئے بغیر اپنی آزادی اور سرکشی کی دھن میں عراق سے ایران اور ایران سے عراق کی سرحد میں چلے آتے تھے۔ اس صورت حالات میں اگرچہ

کوئی معتد بہ تغیر نہیں ہوا لیکن با ایں ہمہ سیاسی حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ ایران و عراق کے تمام باہمی اختلافات دور ہوگئے ہیں اور عنقریب دونوں ہمسایہ ممالک کے درمیان دوستانہ معاہدہ قائم ہو جائیگا۔ اس کے لئے جس قسم کی گفت وشنید کی ضرورت ہے اس کے لئے بغداد میں ایرانی اور عراقی نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوگی۔ عراق میں اس معاہدہ کو غیر معمولی اہمیت دی جارہی ہے اس لئے کہ جبتک عراق کے خارجی معاملات صلح وآشتی سے طے نہیں ہوجاتے اس کا مجلس اقوام میں داخل ہونا دشوار ہے۔ چنانچہ عراق کے برطانوی ہائی کمشنر جنیوا روانہ ہوچکے ہیں تاکہ خاتمہ انتداب کے لئے جو شرائط پیش کیجارہی ہیں ان پر غور وخوض کریں۔ عراق اور شام کی سرحد کے تصفیے کے لئے جو کمیشن بٹھایا گیا تھا اس کی صدارت کرنل اسکین کے سپرد کی گئی ہے۔ صدر مذکور سوئسٹان کے رہنے والے ہیں اور آج کل کمیشن کا کام نہایت سرگرمی سے انجام دے رہے ہیں۔

عراق کا تذکرہ ان صفحات میں اس کثرت سے آچکا ہے کہ اس سے اس ملک کی سیاسی حالت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ابتک ہم نے اس نوخیز اسلامی ریاست اور برطانیہ کے باہمی تعلقات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل ان لوگوں کے خیالات کی تفسیر تھی جنکو دولت برطانیہ پر اعتماد ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ جن کے نزدیک عراق کی ترقی مجلس اقوام اور انگریز سیاسئین کے ساتھ اشتراک و تعاون پر موقوف ہے۔ ہمیں اس مسلک پر کوئی خاص اعتراض نہیں اس لئے کہ اہل عراق اپنے مصالح کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ امت عربیہ کی تقسیم و تفریق کا جو سلسلہ مجلس اقوام نے مشرق قریبہ میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام سے شروع کیا ہے وہ اسلام کے دینی اور تمدنی مصالح سے قطع نظر کرتے ہوے عربوں کے سیاسی اور معاشی مفاد کے لئے بھی کسی طرح موزوں نہیں اور غالباً اسی لئے قرب وجوار کے اسلامی ممالک نے ان ریاستوں کو کسی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ جب تک ان ریاستوں میں غیر قوموں کا ہاتھ رہے گا اس کا کوئی نہ کوئی ناخوشگوار اور غیر پسندیدہ اثر ہمسایہ ممالک پر ضرور پڑے گا ثانیاً عرب اقوام کی یہ جبری تفریق ان کے باہمی اتفاق واتحاد میں بہت بری طرح سے حائل ہے۔ محض سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تب بھی اس امر کا اقرار کرنا پڑے گا کہ ایسے علاقے پر جس کے معاشی اور سیاسی مصالح تقریباً یکساں ہیں ایک کی بجائے پانچ چھ حکومتوں کا خرچ ڈالنا دور اندیشی سے بعید ہے۔ علاوہ ازیں عراق کی حقیقی آزادی صرف اس

وقت ممکن ہے جب اس کے اقتصادی معاملات خود اس کے ہاتھ میں ہوں، سیاسیات میں اسکا طرز عمل اس کی مرضی کا پابند ہو لیکن یہ مجلسِ اقوام کی شرائط اور اس کی پابندیاں' یہ اقلیتوں کے حقوق و مراعات' یہ تیل کے ٹھیکے' یہ بین الاقوامی ذمہ داریاں اور یہ برطانیہ کے فضائی مستقر جب تک یہ چیزیں موجود ہیں عراق کو آزادی کا درجہ کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟ ارباب بصیرت اسکے متعلق کیا کہتے ہیں؟

حوادث فلسطین | فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان ایک نیا قضیہ رونما ہوا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عرب ان تمام زمینوں پر قابض ہو رہے ہیں جو یہودیوں نے ان سے خریدی تھیں۔ عربوں کا عذر یہ ہے کہ ان زمینوں کی فروخت میں بہت سے قانونی سقم باقی رہ گئے ہیں علاوہ ازیں عرب کاشتکاروں کو ان کو موروثی زمینوں سے زبردستی الگ کر دیا گیا تھا۔ اس پر فلسطین کے یہودی نہایت خفا ہیں اور ان کے نزدیک یہ ساری کارروائی صیہونی تحریک کو شکست دینے کے لئے کی جا رہی ہے۔ یہودی نمائندوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عیسائیوں کے قبضے میں بہت سی زمین بالکل بے کار پڑی ہے لیکن مسلمان اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

جب یہ قضیہ عدالت عالیہ میں پیش ہوا تو جسٹس میکڈانل نے اس کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ اس قسم کے تمام مقدمات میں ملکیت زمین کے دعویدار مدعی اور اس زمین کے اصلی مالک مدعا علیہ تصور کئے جائیں گے۔ جسٹس میکڈانل کے اس فیصلے سے یہودی نہایت خفا ہیں۔

۱۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو فیلیڈلفیا میں امریکہ کی صیہونی جمعیت کا ایک اجتماع ہوا جس میں صیہونی جمعیت عالم سے درخواست کی گئی کہ وہ حکومت برطانیہ کو اس بات پر مجبور کرے کہ حکومت فلسطین یہودی ایجنسی سے اشتراک عمل کرے اور یہودی تارکین وطن کو وادی اردن میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے۔ مندوبین فیلیڈلفیا نے کہا کہ ہم اپنے اس عزم کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے عرب ہمسایوں سے ہر بات میں اشتراک و تعاون کریں گے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت فلسطین نے متوسط درجے کے یہودیوں کو مثلاً تاجروں' دستکاروں اور کاشتکاروں کو فلسطین میں آباد ہونے کے لئے بہت سی سہولتیں دیدی ہیں اور اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ فلسطین میں آتے وقت ان کے پاس صرف ڈھائی ہزار ڈالر کی رقم موجود ہونی

چاہیئے۔ عراق و فلسطین کے باشندے اس بات پر بھی سخت ناراض ہیں کہ چنگی اور محصول کے قوانین میں ان دونوں ممالک کو "خارجی" ممالک کا درجہ دیا گیا ہے حالانکہ ان دونوں ممالک میں انگریزوں کی معاشی روش کو دیکھتے ہوئے ان کا "خارجی" قرار دیا جانا سراسر ستم ظریفی ہے۔

عباس حلمی پاشا جنھوں نے حال ہی میں شام، فلسطین اور ترکی کا سفر کیا تھا اور جن کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ تخت شام کے آرزومند ہیں اب تخت فلسطین و ماورائے اردن کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اتحاد فلسطین و ماورائے اردن کے بعد ممکن ہے اس میں جزیرہ نمائے کنعان کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت مصر خدیو معزول کی ان سرگرمیوں سے کچھ بہت زیادہ خوش نہیں اور صدقی پاشا کے سفر فلسطین کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خدیو موصوف کی کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیں۔

ہندوستان

دفاقی مجلس مالیات کی رپورٹ | گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس کے بعد ہندوستان میں وفاقی حکومت کے قائم کرنے کی غرض سے متعدد مجالس کا تقرر اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ وہ اس طرز کی حکومت کے لئے یہاں کے حالات پر مختلف پہلوؤں سے غور و تحقیق کے بعد رپورٹ پیش کریں تاکہ انھی کی روشنی میں اس جدید حکومت کی داغ بیل ڈالی جائے چنانچہ ایک مجلس یہاں کی مالیاتی حالت کی تحقیقات کے لئے لارڈ پرسی کی صدارت میں مقرر کی گئی تھی جس نے مہینوں کی محنت و کوشش کے بعد اب اپنی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس مجلس کے دوسرے ارکین میں سر لوئی کیرشا، سر اکبر حیدری، کرنل ہاسکر، مسٹر رابنسن اور مسٹر سندرم تھے۔

مجلس مذکور نے اپنی سفارشات اس تمہید کے ساتھ پیش کی ہیں کہ موجودہ معاشی حالات کی خرابی زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہے گی اور بہت جلد تجارتی حالات اپنے اصلی رنگ پر آجائیں گے اور اشیاء کا نرخ اگر بالکل بدستور سابق نہ ہو جائے گا، پھر بھی موجودہ شرح سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس بنا پر وفاقی حکومت کی آمد و خرچ کا آئندہ جو نقشہ ہو گا وہ مطابق ذیل ہو گا:-

آمدنے		خرچ	
محاصل	۵۰۳۰۰۰۰۰۰	سود	۱۱۲۵۰۰۰۰۰
نمک	۵۵۵۰۰۰۰۰	ضائع شدہ	۶۵۰۰۰۰۰۰
افیون	۵۰۰۰۰۰	فوج	۴۷۰۰۰۰۰۰۰
ریلوے	۵۰۰۰۰۰۰۰	سرحدکی حفاظت	۱۷۰۰۰۰۰۰
ٹکسال	۳۸۰۰۰۰۰۰	انتظامات ملکی	۶۸۵۰۰۰۰۰
متفرق	۱۹۶۰۰۰۰۰	پنشنیں	۲۶۵۰۰۰۰۰
صوبوں سے امداد	۷۴۰۰۰۰۰	صوبہ سرحد	۱۰۰۰۰۰۰۰
انکم ٹیکس	۱۷۲۰۰۰۰۰۰	انتظامی امور	۱۶۰۰۰۰۰۰
		صوبجات ماتحت چیف کمشنر	۱۵۵۰۰۰۰۰
کل میزان	۸۴۶۰۰۰۰۰۰	کل میزان	۸۰۱۰۰۰۰۰۰

اس حساب سے کل بچت وفاقی حکومت کے خزانہ میں ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ کی ہوگی۔

اب اس کے بعد دوسرا کام مجلس مذکور کا یہ تھا کہ وہ صوبوں کی مالیاتی حالت کا اندازہ کرے اور اس غرض سے اس نے ۱۹۳۲-۳۳ء سے لیکر ۱۹۳۶-۳۷ء تک کے جو میزانیے تھے، ان پر قیاس کرکے ہر صوبہ کی مالیاتی حیثیت کا جو نقشہ تیار کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔ مثبت کی علامت (+) سے بچت اور منفی کی علامت (-) سے خسارہ مراد ہے۔

نام صوبہ	رقم
۱۔ مدراس	- ۲۰ لاکھ
۲۔ بمبئی	- ۶۵ "
۳۔ بنگال	- ۲ کروڑ
۴۔ صوبہ متحدہ	+ ۲۵ لاکھ
۵۔ پنجاب	+ ۳۰ "
۶۔ بہار و اڑیسہ	- ۷۰ "

نام صوبہ	رقم
۷۔ صوبہ متوسط	۱۷ لاکھ
۸۔ آسام	۶۵ "

صوبوں کے اس مالیاتی نقشہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وفاقی حکومت کی شرکت میں انھیں ابتدا بہت مشکلات کا سامنا ہوگا اور اگر انھوں نے اس عرصہ میں اپنے نقصانات کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تو ان کی صوبجاتی خودمختاری بہت خطرہ میں پڑجائے گی۔ لیکن بعض حالات کی بنا پر یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر انھوں نے بعض مدات خرچ میں تخفیف سے کام لیا یا آمدنی کے نئے ذرائع نکالنے کی فکر کی تو ان کی مشکلات بہت حد تک رفع ہو جائیں گی مثلاً بمبئی سے صوبہ سندھ کے علیحدہ ہو جانے کی صورت میں صوبہ بمبئی کو تقریباً ۹۰ اور ۱۰۰ لاکھ کے درمیان بچت ہوگی، اسی طرح صوبہ بہار و اڑیسہ بھی اپنے تمام ملازموں کی تنخواہ میں ایک معقول تخفیف کرنے کے بعد اپنی اس کمی کو پورا کرے گا جیسا کہ ۱۹۳۲ء کے میزانیہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مجلس مذکور نے صوبوں کے لئے کچھ نئے ذرائع آمدنی بھی تجویز کئے ہیں جن میں سے ایک تمباکو، دیاسلائی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں پر محصول کے اضافہ کی ہے۔ اسی طرح چھوٹے بڑے قرضہ جات کے متعلق بھی تصفیے کئے ہیں کہ کون کون سے قرضے وفاقی حکومت ادا کرے گی اور کون کون سے صوبوں کے ذمہ رہیں گے۔ پھر وفاقی حکومت اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان تعلقات کیسے رہیں گے جن کا دارمدار زیادہ تر تین مسائل پر ہے۔ (۱) ریاستوں کے ساتھ سمجھوتہ (۲) سندھ کی علیحدگی اور (۳) وفاقی نظام حکومت کے قیام سے مزید اخراجات کی صورت۔ اول الذکر ہر دو مسائل کے متعلق تو علیحدہ علیحدہ مجلسیں مقرر کی گئی ہیں لیکن موخرالذکر کے لئے مجلس مذکور نے صاف طور پر یہ سفارش کی ہے کہ آیندہ نظام حکومت کے قیام میں بہت کم سے کم اخراجات ہونے چاہئیں۔ ہندوستان جیسے ایک زراعتی ملک کے لئے موجودہ نظام حکومت خود ایک بہت بڑا گراں قیمت نظام ہے۔ انتظامات ملکی سے متعلق جتنی مدات ہیں، ان کے اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کمی کرنی چاہئے۔

سب سے آخر میں مجلس مذکور نے محصول لگانے کے اختیارات سے بحث کی ہے جس کا اختیار صرف وفاقی حکومت کے ہاتھ میں رکھا ہے اور اس کی تین صورتیں تجویز کی ہیں:۔ (۱) وہ ذرائع جو وفاقی حکومت کے ساتھ مخصوص ہوں گے مثلاً معدنیات، جنگلات، ریلوے، ڈاک اور تار وغیرہ وغیرہ (۲) محصول آبکاری

مثلاً منشیات و مسکرات کی اشیاء اور نمک وغیرہ (۲) وہ محصول جس سے صوبوں کو فائدہ پہونچتا ہو۔ صوبوں کو صرف آخری صورت میں محصول لگانے کا اختیار دیا گیا ہے اور وہ بھی وفاقی حکومت کی اجازت سے۔ اسی طرح قرضے لینے کے متعلق بھی صوبوں کو اختیار ہے لیکن مرکزی حکومت کی اطلاع اور اجازت سے۔

یہ جو کچھ ہے کاغذ کے صفحات پر ہے لیکن اس پر عمل درآمد کب سے ہوتا ہے اور عمل کی صورت میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی اس کے لئے ابھی ہندوستان کو اور انتظار کرنا ہے۔

گلینسی کمیشن اور برادران وطن کا احتجاج | تقریباً ایک سال ہوتا ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کی مسلمان رعایا اپنے والی سے اپنے جائز اور ناقابل انکار حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں اس نے ہر وہ قربانی کی ہے جو ایک آزادی پسند جماعت کر سکتی ہے، اگرچہ اس آزادی کی قیمت زیادہ تر ریاست کے حدود سے باہر برطانوی علاقہ میں ادا کی گئی ہے اور آج مجلس احرار کے کوئی تیس پینتیس ہزار ارکان جیل کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ اس تمام مظاہرے اور شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی طرف سے مسٹر گلینسی کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر ہوا جو ان کی شکایات کی تحقیقات کرکے ایک رپورٹ پیش کرے اور پھر اس رپورٹ کی سفارشات پر حکومت کشمیر عمل درآمد کرے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کمیشن نے اپنا کام ختم کیا اور رپورٹ شائع ہوئی جس میں ریاست کے قوانین میں کچھ عام اصلاحات کے ساتھ مسلمانوں کو بعض حقوق بھی دئے گئے ہیں، مثلاً عام اصلاحات کے سلسلہ میں جیل کے قوانین میں یہ ترمیم کی گئی ہے کہ قیدیوں کی اب سے دو قسمیں ہوں گی، ایک معمولی جو عام جرائم کے مرتکب ہوں گے اور جن کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی۔ اور دوسرے خاص، جن کے لباس و طعام اور دوسرے معاملات میں عام قیدیوں کے مقابلہ میں کچھ رعائتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں، مثلاً انہیں جیل کا عام کپڑا اور کھانا نہیں ملے گا بلکہ ان کے لئے اس کا مخصوص انتظام ہوگا، وہ ہتکڑیوں سے بجز حالات خاص کے مستثنےٰ ہوں گے۔

اسی طرح ریاست کے قانون مطابع میں بھی کچھ ترمیم کی گئی ہے اور اس کے ذریعہ سے حکومت کے اختیارات میں اضافہ اور اظہار رائے و خیال کی آزادی میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ پہلے کوئی شخص پریس قائم کرنا چاہتا تو اس کے لئے صرف ۵۰۰ کی ضمانت داخل کرنی اور مہاراجہ سے اجازت لینی کافی تھی۔ اب ایک ہزار کی ضمانت لی جائے گی اور اجازت کے تمام اختیارات وزیر اعظم کو حاصل ہوں گے۔ نفرت کے جذبات پھیلانے، کسی کو کسی کے قتل پر آمادہ کرنے اور اسی قسم کے دوسرے ارتکاب جرم پر وہ ضمانت فوراً ضبط کر لی جائے گی اور

پھر دوسری ضمانت ایک ہزار سے دس ہزار تک کے درمیان لی جائے گی۔

لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور ضروری کمیشن کی وہ سفارشات ہیں جو اس نے یہاں کے سواد اعظم حصہ آبادی کے متعلق کی ہیں اور ان کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے اس میں سب سے بڑی چیز ایک انتخابی مجلس کی بنیاد ہے، جو کل ۷۵ ارکان پر مشتمل ہوگی۔ ان اراکین کا تناسب سردست یہ ہوگا: مسلمان ۲۳، ہندو ۷، سکھ ۱، وزرا اور عمال کے نمائندے ۱۹، غیر سرکاری نامزد ارکان ۷۔ اور اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں، تعلیمی وظیفوں اور دوسرے معاملات میں مسلمانوں کی تعداد کو کچھ بڑھا دیا گیا ہے جو اب بھی ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں کم ہے۔

بہر حال، اس رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ برادران وطن نے ریاست کے اندر اور باہر شورش اور ہنگاموں کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ ڈاکٹر مونجے نے جو مسلمانوں کے دیرینہ ہمدرد ہونے کے علاوہ ہندو مہاسبھا کے صدر بھی ہیں فوراً ایک تار دیا کہ کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک کہ مہاسبھا کے نمائندوں سے ملاقات نہ کر لی جائے۔ سکھوں نے الگ شور و پکار شروع کی کہ کشمیر کی جمعیت مقننہ میں ۷۵ میں سے سکھوں کو صرف ایک نشست دی گئی ہے، حالانکہ انہیں اس سے زائد ملنی چاہیے۔ ریاست کشمیر کے ہندو پنڈتوں کی جماعت نے جو ریاست کے اندر سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور اثر و اقتدار رکھنے والی جماعت ہے، شورش اور ہنگامے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا اور ہر کشمیری پنڈت کی زبان سے یہ شور و پکار کی آواز اٹھنے لگی کہ ہم نمک خواران سلطنت قدیم سے حکومت کے دامن سے وابستہ چلے آتے ہیں مسلمانوں کو ملازمتوں کے اندر مزید حقوق دینے سے ہم کاسہ لیسان سلطنت کا کوئی اور ذریعہ معاش نہ رہے گا اور ایک طویل درخواست گورنر کشمیر کی خدمت میں پیش کی گئی، جس میں مسلمانوں کے ساتھ مراعات کے پہلو بہ پہلو اپنے حقوق کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔ ان تنگ دل انسانوں سے کوئی پوچھے کہ آج جن سفارشات کو تم مراعات سے موسوم کر رہے ہو اور جن کی بنا پر تم اس قدر انگاروں پر لوٹ رہے ہو وہ دیکھو تو سہی کہ مراعات ہیں یا ان کے معمولی حقوق ہیں۔ یہ حقیقت میں تمہارے لئے اب تک مراعات کا درجہ رکھتی تھیں اس لئے کہ تم اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھا رہے تھے اور دوسروں کو ان سے مستفید ہونے کا موقع نہیں دیتے تھے۔

ریاست جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کوئی ۹۷ فی صدی ہے لیکن سرکاری ملازمتوں

میں ان کا تناسب صفر کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں اور کشمیری پنڈت جو تعلیم سے بہرہ ور ہیں قدرتاً تمام سرکاری عہدوں اور ملازمتوں پر حاوی ہیں۔ مسلمانوں کے تعلیم میں پیچھے رہنے کے اسباب میں ایک بڑا سبب ان کا اقتصادی افلاس ہے۔ وہ زیادہ تر کاشتکار ہونے کی وجہ سے اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم بھی دلا سکیں اور بچپن ہی سے اپنے خوش شکل بچے اور بچیوں کو شالی (چاول)، کے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے بھیجتے ہیں تاکہ وہ شام کی روٹی کا بندوبست کر سکیں۔ بعض قصبات اور شہروں میں جو صناع اور کاریگر ہیں وہ اپنے افلاس اور غربت سے تنگ آ کر تھوڑی تھوڑی اجرتوں پر دولتمند آڑھتیوں کا کام کرتے ہیں جو تمام تر کشمیری پنڈت اور باہر کے تاجر ہوتے ہیں۔ یہ اسباب ہیں جو دیہاتی و قصباتی ہر دو قسم کی مسلمان آبادی کو تعلیم حاصل کرنے اور پھر اس کی وجہ سے زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کی راہ میں حائل ہیں اور ان کا اپنا وطن "کشمیر بہشت نظیر" حقیقت میں ان کے لئے ان غاصبان حقوق کے ہاتھوں "دوزخ نشان" بن گیا ہے جس سے اگر گلینسی کمیشن یا اور کوئی دوسرا ذریعہ نکالنے میں کچھ امداد کر سکے تو انسانی ہمدردی اور غیرت کا تقاضا یہ نہیں کہ کوئی جماعت اس پر اس درجہ آتش بر اندام ہو اور یوں ہنگامہ اور شورش سے مستحقوں کو اپنے حقوق سے فائدہ نہ اٹھانے دے!

ASIFA

ASIFA
Asifa
ASIF
ASIFA
ARIF
ARIFA

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۹	بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

		صفحہ
۱. غالب کی فارسی شاعری	سید عابد علی صاحب عابد	۱۸۵
۲. مولانا محمد علی مرحوم کا ایک خط	جناب رئیس احمد صاحب جعفری	۲۰۸
۳. مالیات ہند	ڈاکٹر جعفر حسن صاحب عثمانیہ یونیورسٹی	۲۱۶
۴. خواجہ میر درد	محمد یحییٰ صاحب تنہا	۲۳۴
۵. سانچا نام تیرا	بشیر احمد صاحب ہاشمی ایم اے۔ ایم۔ ایڈ لیڈس	۲۴۶
۶. غزل	مصور جذبات سید نا ثاقب لکھنوی مدظلہ	۲۵۰
۷. خیر مقدم	محمد حسین صاحب محوی، لیکچرار مدراس یونیورسٹی	۲۵۱
۸. تنقید و تبصرہ	....	۲۵۳
۹. دنیا کی رفتار ہندوستان	ش۔ ق	۲۵۸
۱۰. ممالک غیر	... س فاروقی	۲۶۶
۱۱. ممالک اسلامی	... آ۔ ن	۲۷۰
۱۲. شذرات	ایڈیٹر	۲۷۵

محمد مجیب بی اے آکسن پرنٹر پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا

اعلان

رسالہ جامعہ کا ایک سٹ مکمل شروع سے لے کر آج تک

کا فروخت کے لئے موجود ہے۔ ایک پرچہ کی بھی کمی نہیں ہے جو صاحب

خریدنا چاہیں وہ ایڈیٹر رسالہ جامعہ سے خط کتابت کریں۔

منیجر

ARi

غالب کی فارسی شاعری

۱

کلیات کے شروع میں غالب ایک قطعے میں کہتا ہے

ای کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ　　کے بہ پر گوئی فلاں در شعر ہمسنگِ من است
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن　　کمتر از بانگ دہل گر نغمہ چنگ من است
نیست نقصاں یک دو جزو است از سواد ریختہ　　کان وثرم برگے ز نخلستان فرہنگ من است
فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
فارسی بیں تا بدانی اندر اقلیم خیال　　مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید　　ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

حقیقت میں غالب کے فارسی دیوان میں فن کاری کے وہ نادر نمونے نظر آتے ہیں کہ ناظر کو اپنی چشم تخیل کے سامنے افسانہائے جمال و داستانہائے محبت کا ایک قصر رنگیں تعمیر ہوتا نظر آتا ہے۔ حسین و جمیل الفاظ اور رنگین و دل آویز تراکیب سے غالب نے بے مثال صنعت سے شعر کو اوج کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اس نے ظلمات ہستی میں ایک چراغ حسن روشن کیا ہے جس کی شعاعوں نے حیات کے تمام تاریک گوشوں کو منور کر دیا ہے۔

- - - - - - - اَفسوس ہے کہ جس فارسی شاعری پر اس کو ناز تھا اس کی آج کوئی قدر نہیں۔ اور جس مجموعہ کلام کو اس نے "بے رنگ" کہ کر یاد کیا تھا وہ آج نقادوں اور نکتہ سنجوں کی کشمکش کا باعث ثابت ہو رہا ہے۔ غالب کے اردو کلام کے متعلق اتنا کچھ لکھ جا چکا ہے کہ اب آئندہ جو کچھ لکھا جائے گا وہ پہلے افکار کی ایک صدائے بازگشت ہوگی

آئے دن اردو کلام کی شرحیں شائع ہوتی ہیں۔ اس کا دوسرے شعراء کے کلام سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ اردو کلام کا مجموعہ اکثر یونیورسٹیوں میں بی اے کے نصاب میں داخل ہے اس کے مطلا اور دیدہ زیب نسخے شائع ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں "مرقع چغتائی" کی اشاعت سے چغتائی نے ارباب نظر کے ذوق جمال کی تسکین کے لئے ایک مجموعہ نقش و رنگ مرتب کیا ہے جس میں غالب کے شعروں کی مادی صورت نظر آتی ہے۔ ایک طرف اس کے اردو کلام سے اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے دوسری طرف فارسی زبان کی ناقدردانی کے باعث اور کچھ ارباب نظر کی بے پروائی کی وجہ سے غالب کا فارسی کلام دماغوں سے محو ہو چکا ہے اور اب کتابوں کے صفحات سے بھی محو ہوا چاہتا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کوئی ناشر دیوان غالب فارسی کی اشاعت گوارا نہ کرے گا۔ مندرجہ ذیل سطور کا مقصد یہ ہے کہ ارباب ذوق کی توجہ غالب کی فارسی شاعری کی طرف از سر نو منعطف کرائی جائے اور اگر اس مضمون سے صرف یہی ایک فائدہ ہوگا کہ معدودے چند فارسی داں اصحاب کو غالب کے فارسی کلام کے مطالعہ کا شوق ہو جائے تو سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔

... ...

عبدالرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں "شاعری کو اکثر شعراء نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز۔ جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ مگر یہ تقسیم خود ان کی قاصری کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں۔ شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ جمال الٰہی ہر شئے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے جہاں ملائکہ کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں معروف ہیں۔ شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مرزا کو رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس [illegible] روشن کیا ہے۔ کونسا پیکر تصور ہے جو اس کے کاغذی پیرہن پر منازل زیست

لے کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

دیوان غالب۔ نسخہ حمیدیہ، مقدمہ صفحہ ۲۴،۳۲،۳۴

بجنوری کا یہ خیال کہ شاعری انکشاف حیات ہے ارنلڈ کے اس خیال سے ملتا جلتا ہے کہ شعر تنقید حیات کا دوسرا نام ہے۔ اس جگہ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے علاوہ کوئی چیز شعر کا موضوع نہیں بن سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ شعرا نے اکثر ایسی چیزوں کو اپنا اپنا موضوع بنایا ہے جو بادی النظر میں انسانی زندگی سے ماورا معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جب شعر انسان کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنا موضوع بناتا ہے تو اس وقت وہ چیز بنفسہٖ موضوع نہیں ہوتی بلکہ اس شے کے ساتھ انسان کو جو تعلق ہوتا ہے۔ وہ موضوع ہوتا ہے۔ بہر نوع یہ بات تسلیم کرنی پڑیگی کہ صرف وہی موضوع شعر کے لئے موزوں ہیں جن سے انسان کو کوئی تعلق ہو۔ صناع کا فرض ہے کہ زندگی کے مرکز یعنی انسان سے ابتدا کرے یہی وہ موضوع ہے جس کے متعلق وہ بہت کچھ جانتا ہے۔

بجنوری اور ارنلڈ کی تعریف کے اعتبار سے ہر چیز جسے انسان کی زندگی سے تعلق ہے شعر کا موضوع بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ فلسفہ۔ اخلاق۔ جذبات کی تحلیل و تشریح۔ مذہب۔ روحانی دنیا خدا۔ ہر چیز شعر کی حدود میں داخل ہے۔ اور شاعر کے ذوق نظر و حسن جمال کی مطابقت میں شعریت کے لامحدود خزائن اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ شاعر موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور کرتا ہے اور پھر استادانہ چابکدستی سے کام لے کر مختصر الفاظ میں اس حسن کا انکشاف کرتا ہے جو موضوع میں اس طرح پوشیدہ تھا جیسے سنگ میں شرا۔ گویا شعر کا موضوع انکشاف حیات ہے اور اس کا نتیجہ حسن۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تمام فنون لطیفہ صرف اپنے اپنے مظاہر کے اعتبار سے اختلاف رکھتے ہیں ورنہ ان میں سے ہر ایک کا مقصد مسرت افروزی اور آفرینش حسن و جمال ہے ہر ایک آرٹ اپنے تخیل کو مادی صورت دینے کے لئے ایک مظہر کی تلاش کرتا ہے سنگ تراشی کا فن نقوش و صورت کے ذریعہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ مصوری نقوش و رنگ سے روح کو متاثر کرتی ہے موسیقی سر لے بین اور آواز و لب کے تناسب اتار چڑھاؤ سے شعر کا مظہر الفاظ ہیں۔ اس فن کو دوسرے فنون لطیفہ پر یہ تفوق حاصل

ہے کہ اس کا مظہر دنیا کی سب سے زیادہ لطیف اور نازک شے ہے. گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تخیل حسن نے الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے۔

حسن ہر اچھے شعر کا ایک جزو لازم ہے. جب الفاظ الہام شعری کے ماتحت شعر کا لباس پہنتے ہیں تو حسن نتیجۃً پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر کا محرک یا موضوع حسن ہو.

حالی کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں.

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت ... بڑھا جانب بو قبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت ... چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا.

ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت ... کہ طالع ہوا ماہ برج سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت ... کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت

یہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غار حرا سے

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی ... پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی ... جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کون کہہ سکتا ہے کہ مندرجہ بالا اشعار معیار شعر پر پورے نہیں اترتے. باوجود اس کے ان میں جو دلکشی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے. حسن اس کا محرک ہے نہ موضوع. محرک اصلاح ہے اور موضوع بانی اسلام کی عظمت و وجاہت. اسی طرح مندرجہ ذیل رباعی پر غور کیجئے.

محروم تھا حباب شہرت کے مزے — آلودۂ غم سراب دولت کے مزے
ہر چند محبت بھی ہے فانی لیکن — فردوس نژاد ہیں محبت کے مزے

رباعی کی تصنیف کا محرک یہ خیال ہے کہ دنیا کی ہر چیز بے ثبات ہے لیکن محبت کی عارضی دلفریبی میں کچھ ایسے سامان تسکین قلب پنہاں ہیں کہ انسان دنیا کی بے ثباتی کو فراموش کر دیتا ہے۔ موضوع محبت کی دلفریبی ہے۔ اور نتیجہ حسن ہے۔ گویا ہم بے خوف تردید کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ حسن دنیا کے ذرّے ذرّے جھلکتا ہے اور شاعر کی حسن انگیز نظر نقاب خاک میں دلبری اور دلربائی کے خزانے پوشیدہ دیکھتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اپنے اشعار کا موضوع حسن ہی کو بنائے ..... مندرجہ بالا مثالوں میں تو موضوع میں کچھ ایسے عناصر بھی تھے جن کو حسین کہا جا سکتا ہے لیکن ایک چینی شاعر کی مختصر سی نظم یاد آئی جس کا موضوع حسن سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا..... وہ کہتا ہے

جب بچے پیدا ہوتے ہیں۔
تو ماں باپ چاہتے ہیں کہ وہ ذہین ہوں
میں اپنی زندگی ذہانت کے باعث برباد کر چکا ہوں۔
اور صرف یہی چاہتا ہوں کہ میرا بچہ بے وقوف اور جاہل ہو۔
تاکہ اس کی زندگی چین سے کٹ جائے اور
وہ وزارات کا قلمدان سنبھالے۔

اس نظم کا محرک شاعر کے وطن کی بے انتظامی ہے۔ شاعر دیکھتا ہے کہ اس کے وطن میں دانشمندی اور تدبر کی کوئی قدر نہیں اس کے برخلاف جاہل اور بیوقوف لوگ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اس صورت حالات کو وہ ایک زہریلے اور بے پناہ طنز کے انداز میں ادا کرتا ہے...... ظاہر ہے کہ اس نظم کے موضوع و محرک کو حسن سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن نظم نے حسن آفرینی کا فرض ادا کر دیا ہے اور اس اعتبار سے کامیاب شمار ہوگی۔

جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ شعر کے متعلق ہے۔ لیکن شعر کی ایک صنف ہے جو سر تا پا حسن ہے۔ اور وہ غزل ہے۔ اس کا محرک حسن ہے۔ موضوع حسن نتیجہ حسن ہے۔ گویا یہ صنف شعر حسن ہی کی تخلیق ہے اور حسن ہی کی خالق ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انسان مرکز حیات دل انسان کی تمام کیفیات کا مرکز ہے اور غزل واردات قلب کا دوسرا نام ہے پھر شاعر کا ذوق جمال عام لوگوں سے کہیں زیادہ تیز اور لطیف ہوتا ہے۔ اس کی نگاہیں ہر چیز میں تناسب تطابق ڈھونڈتی ہیں۔ اس کا دل گداز ہونے کے باعث فریفتگی اور شیفتگی کی بہت زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے جس صنف شعر کو اس کی واردات قلب سے تعلق ہوتا ہے وہ حسن و عشق کے افسانوں کے سوا اور کسی چیز سے متعلق نہیں ہوتی۔ غزل کا مرکزی جذبہ حسن کے تاثرات کا اظہار اور عشق کی کیفیات کا بیان ہے۔

"حسن موجودات کے ایک ایک ذرے سے جھانک کر صاعقہ افگنی کر رہا ہے۔ اور عشق کی خانماں سوزی کے شعلے فضا میں بھڑک رہے ہیں یہ شاعری کے مسلمات ہیں جیسے ہر علم کے بعض مسلمات ہوا کرتے ہیں شاعری فضا میں پھیلی ہوئی ہے ہوا کے جھونکے اس کے تقطر سے لبریز ہیں۔ وہ بادلوں سے برستی اور سبزے کے ساتھ روئیدہ ہوتی ہے وہ حسن سے اٹھکیلیاں کرتی ہے اور محبت بھرے دلوں سے کھیلتی ہے۔

شہا مقدمہ مطالب الغالب۔ صفحہ ۸

جب ہم حسن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو عام طور پر ایک پیکر آب و گل یعنی انسان کی دلکشی یا دلفریبی مراد ہوتی ہے۔ حسن کا یہ محدود تصور ہماری کور ذوقی اور کم سوادی کی دلیل ہے۔ شاعر کیلئے نگارخانہ فطرت کا ہر نقش حسین ہے زمیں سے لیکر آسمان تک ایک کارواں ناز جا رواں ہے جس کے غبار راہ سے شاعر کی چشم بصیرت روشن ہوتی ہے اور سینہ جلا پاتا ہے اس کی نظر پی اجسام سے گذر کر فطرت کے رموز و اسرار کو دیکھتی ہیں جن چیزوں پر ہم ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان میں وہ لطیف و جمیل اشارات دیکھتا ہے۔ اسے وہ نغمے سنائی دیتے ہیں جن سے روح بالیدہ ہوتی ہے اس کے لئے سیارے اور ستارے رقص کرتے ہیں اس کے لئے آسمان کا چمن زار چراغ مہر و مہتاب

کرتا ہے۔ برق کی درخشانی بادل کی گرج ہوا کے جھونکے سب اس کے محرم راز ہیں فطرت کے مظاہر مناظر سب لوگ دیکھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں لیکن وہ ان کو کسی داستان حسن یا افسانۂ عشق سے وابستہ کر دیتا ہے اور ہمیشہ کے لئے ایک منظر کے ساتھ ایسی دلالتہائے التزامی ایسے نازک مفہوم ایسے دلکش تعلقات خاص ہو جاتے ہیں کہ اسی منظر کو دیکھتے ہی انسان کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے

مائیکل انجلو کا قول ہے کہ مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا۔ بلکہ حقیقت میں بت ابتدا ہی سے سنگ سفید میں موجود ہوتا ہے اور جلوہ نمائی کا منتظر اور متقاضی ہوتا ہے، استاد کامل محض پتھر کی عارضی چادر کو علیحدہ کر دیتا ہے[1]۔

انجلو کا مندرجہ بالا قول بہت سے لطیف و نفیس مطالب پر مشتمل ہے۔ یہ موقع ان کی تفصیل کا نہیں مجملاً ہم چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ فطرت اپنی نمود کے لئے صناع کے ذوق نظر اور لطف عمل کی محتاج ہے۔ حسن ہر شے میں پوشیدہ ہے۔ لیکن مادی نقابوں کے دور کرنے کے لئے شاعر یا صناع کی نگاہ نکتہ رس کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک صناع فطرت کی کسی خاص شے میں صنعت کی ارتقا یافتہ شکل مضمر نہ پائے گا۔ حسن کو بے نقاب نہ کر سکے گا۔ اقبال نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما　　ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
خودی او را بیک تارِ نگہ بست　　زمین و آسمان و مہر و مہ بست
دل ما را بہ او پوشیدہ راہے است　　کہ ہر موجود ممنون نگاہے است
گر او را کس نہ بیند زار گردد　　اگر بیند یم و کہسار گردد
جہاں را فربہی از دیدنِ ما　　نہالش رستہ از بالیدنِ ما

---

[1] دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (مرحوم)

حدیث نظر و منظور رازے است | دل ہر ذرہ در عرض نیازے است
تو اے شاہد مرا مشہود گرداں | ز فیض یک نظر موجود گرداں
کمال ذات شے موجود بودن | برائے شاہدے مشہود بودن
جمال غیر از تجلی ہائے ما نیست | کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

حیات کی نمود ہماری نظر کی محتاج ہے جس چیز کو ہم نہ دیکھیں وہ گویا معدوم ہے۔ اسی فطرت کا حسن شاعر کے ذوق نظر کا محتاج ہے۔ اگر شاعر اس حسن کا احساس نہ کرے تو

جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نہ رسید

کا عالم طاری ہو جائے۔

۲. انجلو کے قول کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حسن فطرت کے اظہار کے لئے صناع کے ذہن میں پہلے ایک تخیلی خاکہ موجود ہونا چاہیئے۔ سنگ مرمر ایک مادی چیز ہے۔ لیکن اس میں حسن کی ایک تصویر پوشیدہ ہے یہ تصویر اپنی پوری شان جمال میں اس وقت جلوہ گر ہو سکتی ہے جب صناع اپنے ذہن میں اس کا ایک تخیلی عکس متعین کرے اس کی مراد یہ ہے کہ فطرت کے مظاہر میں صرف حسن پوشیدہ ہے وہ مادی پیکر جو نقوش و رنگ اور خم و تدریج سے مزین ہو کر کسی خاص بت یا کسی خاص تصویر کی صورت اختیار کرتا ہے اپنی ان خصوصیات کے اعتبار سے جو اسے ہر دوسرے بت اور تصویر سے ممیز کرتی ہیں صناع کے تخیل کی تخلیق ہوتا ہے اگر یوں نہ ہو تو کسی خاص چیز کی تصویر اس چیز کی تمام دوسری تصویروں سے ہر طرح مشابہ ہو اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایک صناع کی فنی تخلیقات دوسرے صناعوں کی تخلیقات سے اتنی ہی مختلف ہوتی ہیں۔ جتنا ایک انسان دوسرے انسان سے صنعت نے بھی آفرینش حسن و جمال میں صانع مطلق کی پیروی کی ہے۔

۳. تیسرا پہلو یہ ہے کہ حسن فطرتاً نمود و اظہار کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس نمود حسن کے مظہر صناع ہوتے ہیں۔

۴. سب سے لطیف اور نازک اشارہ اس قول میں یہ ہے کہ اجسام کی ظاہری صورتیں شاعر و صناع کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتیں ... [illegible]

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی وادبی رسالہ

جلد ۱۹ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء | نمبر ۳

1932.

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۵ ردیف یائے. کلیات غالب مطبوعہ نولکشور صفحات ۵۲۶

حدیث ... عرض ... ت

آ

... لی ہے

... ح ہوتے ہیں۔

... ان میں یہ ہے کہ اجسام کی ظاہری صورتیں شاہد و صانع کے

لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ وہ ہمیشہ مظاہر فطرت کی ارتقا یافتہ شکل کو دیکھتا ہے۔ اس کو نگہ حروف ...

ہی نہیں آیا۔ اس نے سنگ مرمر کی جگہ ایک حسین و جمیل مجسمہ دیکھا ہے۔ اس مجسمے کی تخیلی تصویر اس کے دماغ میں ایسی روشن اور واضح ہے کہ وہ سر سے لے کر پاؤں تک اس کی تمام شان دلربائی کو صاف دیکھتا ہے۔ آنکھوں میں سرمہ کی تحریر سے لے کر پاؤں کی مہندی تک کوئی سامان زینت و آرائش ایسا نہیں جس کا تصور اس کے ذہن میں موجود نہ ہو۔

غالب نے ان تمام پہلوؤں کی طرف مندرجہ ذیل اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

دیدہ ور[لے] آں کہ دل نہد تا بہ شمار دلبری
در دل خاک بنگرد رقص بتانِ آذری

دیدہ وراں[سے] چوں گہر آبلۂ پا بینند
پائے را پایہ فرا تر ز ثریا بینند

ہر چہ در دیدہ عیاں است نگاہش دارند
ہر چہ در سینہ نہاں است ز سیما بینند

راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند
نقش کج بر ورق شہپر عنقا بینند

دور بینان ازل کوری چشم بہ بیں
ہم دریں جا نگرند آنچہ در آں جا بینند

راز زیں دیدہ در آں جوئے کہ از دیدہ وری
نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند

رہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبض تپاں در رگ صحرا بینند

شررے را کہ نہ بنگاہ بدر خواہد جست
زخمہ کردار بتار رگ خارا بینند

قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورت آبلہ بر چہرۂ دریا بینند

شام در کوکبہ صبح نمایاں نگرند
روز در منظر خفاشش ہویدا بینند

ہر چہ گوید عجم از خسرو شیریں شنوند
ہر چہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

نستوہند اگر ہرزہ مجنوں گردند
نخروشند اگر محمل لیلا بینند

لے ردیف یائے۔ کلیات غالب مطبوعہ نولکشور صفحات ۵۲۶

سے بیت ہائے متعددہ۔ " " " ۲۲۸، ۲۲۹

قشقہ را رونق ہنگامہ ہندو خوانند ۔ بادہ را شمع طرب خانۂ ترسا بینند
ہر چہ در سومنتواں یافت ز ہر سو یابند ۔ ہر چہ در جانتواں دید بہر جا بینند

غالب کا ذوق جمال خزاں رسیدہ برگ و بار میں آئندہ بہار کی شگفتگی اور دل آویزی دیکھتا ہے مرجھائی ہوئی پتیاں اس کی نظر میں شاداب پھول ہیں۔ بہار مٹ گئی لیکن اس کا تاثر شاعر کے دل و دماغ پر ثبت ہے۔ اسی طرح جب وہ کبھی باغ میں جاتا ہے تو نکہت گل کے انتشار سے پہلے صبح کی تمام دلفریبیاں اور رعنائیاں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں۔ ابھی پھولوں کے دامن سے کاروان بو روانہ نہیں ہوا کہ شاعر نے "فیض سحر" کے تمام اشارے دیکھ لئے۔ ابھی باد سحرگاہی جنبش میں نہیں آئی لیکن اس نے طرۂ سنبل کو پریشان دیکھ لیا۔ ابھی دنیائے رنگ و بو محو خواب ہے لیکن شاعر کے ذوق جمال نے ایک ہنگامۂ حسن ترتیب دے لیا ہے۔

رات کے وقت اس کی نگاہ چراغہائے انجم کے نورین نقاب کے پردوں کو چاک کر دیتی ہے زہرہ اپنی "ردائے نور" میں مستور ہے لیکن شاعر نے اس کی دلکشی اور دلفریبی سے لطف اٹھالیا ہاروت اور ماروت کا افسانہ عشق اس کے ذہن میں ہے اور وہ تمام اشارات جو اس افسانے سے متعلق ہیں اس کے اشہب تخیل کو مہمیز کر رہے ہیں۔ مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ روز و شب اور دوش و فردا کے طلسم اس کی نگاہ نکتہ رس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔۔۔ کہتا ہے۔

آں سحر خیزم کہ اسرار شبستاں دیدہ ام ۔ شب نشیناں را دریں گردندہ ایواں دیدہ ام
اینت خلوت خانۂ روحانیاں کاینجا ز دور ۔ زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام
ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش ۔ لولئے را در رہ عشرتگہ دو جہاں دیدہ ام
ہر گرنے ناداں بر سوائی نہ بندی دل کہ من ۔ ماہ را در تور کیاں را بہ زنداں دیدہ ام
رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغاں را بہ باغ ۔ سر بہم خواب زیر بال پنہاں دیدہ ام
کلک موج نکہت گل دم ز گردش نازدہ ۔ نامۂ فیض سحر ناشستہ عنواں دیدہ ام

شانۂ باد سحرگاہی تہ جنبش نا مدہ — طرۂ سنبل بہ بالیں برپریشاں دیدہ ام
باد مستانہ می جنبید و شبنم می چکید — غنچہ را در رخت خواب آلودہ داماں دیدہ ام
محرم راز نہاں روزگارم کردہ اند
تا بجرم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

اس بند کا اٹھواں شعر اپنی موسیقی کے اعتبار سے مکمل آرکسٹرا ہے (orchestra) آوازوں کا اتار چڑھاؤ اور پہلے مصرعے دو ٹکڑوں کا ہم قوافی ہونا غالب کے ذوق لغز پر دال ہے۔

مناظر فطرت کے حسن کی عکاسی اگر مناظر فطرت سے "تماشائے بہار و خزاں، باغ وراغ، کوہسار و آبشار" مراد لی جائے غزل کی حدود میں داخل ہیں۔ جن شعراء نے اس معنی میں صحیفۂ فطرت کی تصویرکشی کو اپنا موضوع بنا لیا ہے ان کی کوششیں سزاوار احترام ہیں لیکن ان کو غزل سے کوئی نسبت نہیں حسن فطرت کا نقاش شاعر اس تاثر جمال کا اظہار کرتا ہے جو فطرت کے جلوؤں کی بوقلمونیاں اس کے دل میں پیدا کرتی ہیں۔ صبح کی رعنائی، رات کی مہیب تاریکی، شفق کی خوں چکانی، برق کی درخشانی، باغ و راغ کی دلفریبی، کوہسار و مرغزار کی نظر افروزی، ان سب کے آثار نقاش فطرت کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور یہی چیزیں بنفسہٖ اس کا موضوع ہوتی ہیں لیکن ان کے ساتھ کوئی داستان محبت کوئی افسانۂ عشق متعلق نہیں ہوتا۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اس صنف شعر کا رتبہ غزل سے کم ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی کے لئے عمیق مشاہدہ حیرت انگیز قوت فکر، اصابت رائے، ذوق نظر، طبع سلیم اور قدرت اظہار کی ضرورت ہے۔ قاری کے دل میں وہی تاثر جمال پیدا کر دینا جو شاعر کے دل میں موجود تھا بہت دشوار ہے۔ فن کاری سے ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا جو کسی منظر کی خصوصیات کے آئینہ دار ہوں آسان نہیں۔ میر حسن نے ایک جگہ باغ کی تصویر کھینچی ہے۔

---

۵۵ کلیات غالب۔ نولکشور۔ ترکیب بند۔ صفحات ۵۵، ۵۶

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار | ہر ایک گل سفیدی میں مہتاب وار
پڑا آب جو ہر طرف کو بہے | کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا | اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر | نشے کا سا عالم گلستان پر

"پڑا آب جو ہر طرف کو بہے۔ کریں قمریاں سرو پر چہچہے" یہ شعر پہلے باغ کی ایک مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ میر حسن کی فن کاری کا کمال ہے کہ صرف "چہچہے" کے لفظ سے اس نے باغ کو نوا و صدا کے ہنگاموں سے لبریز کر دیا ہے خود چہچہے کا لفظ اپنے صوتی تعلقات کے اعتبار سے صرف قمریوں کی خوش نوائی کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ بلکہ ہر خوش آواز پرندے کی رسیلی صداؤں کی یاد دلاتا ہے "گلوں کا لب نہر پر جھومنا" اس ارتعاش مسرت کا آئینہ دار ہے جو شاعر کو چمن کے ذرے ذرے میں نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی "جھومنا" نسیم کے جھونکوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اب باغ کی فضا میں ایک اور عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے یعنی پڑھنے والا ہوا کی جنبش کو بھی محسوس کرتا ہے۔ "اسی اپنے عالم میں منہ چومنا" اس بات کی دلیل ہے کہ مناظر فطرت کی عکاسی میں بھی شاعر انسانی افعال و کردار سے تشبیہات اور استعارات مستعار کر لیتا ہے۔ اب تک نشاط اور سرمستی کی تصویر بے رنگ تھی مناسب فضا پیدا ہو چکی تھی۔ اب صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ صناع اپنے موقلم کی ایک جنبش سے تصویر کو روشن کر دے اور آخری شعر اس فرض کو ادا کرتا ہے۔

"نشے کا سا عالم گلستان پر" نشاط و سرمستی کی ان تمام کیفیات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کو ہم "نشے" سے مخصوص سمجھتے ہیں اور اب باغ کا پتا پتا اور زمین چمن کا ذرہ ذرہ رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے شاعر کا مقصد پورا ہو چکا۔ جو تاثر جمال باغ کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا وہی قاری کے دل میں پیدا ہو گیا۔

چاندنی رات کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

وہ سنسان جنگل وہ نور قمر | وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت | اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

درختوں کے پتے چمکتے ہوئے   حسن رخسار سا رے جھلکتے ہوئے

درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور   گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

مندرجہ بالا اقتباس کی طلسم کاری تعریف سے مستغنی ہے۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ چاندنی کے عالمگیر حسن کی طرف اشارہ کرے اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ چاندنی کے سیلاب نور میں غرق ہوکر ہر چیز نورین ہوگئی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ درحقیقت اشیاء نور میں نہیں ہوتیں۔ یہ اس کی نظر ہے جو چاندنی سے متاثر ہوکر ہر چیز میں نور کا سیلاب دیکھ رہی ہے اس لئے پہلے "سنسان جنگل" کہہ کر قاری پر ایک طلسمی اثر پیدا کردیا۔ اب اسے اس سنسان جنگل میں چاندنی کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی پھر شاعر نے "اجلا سا میداں چمکتی سی ریت" کہہ کر اشیا کے نور اور ان کی روشنی کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت قاری الفاظ کے طلسم سے ایسا مسحور ہوچکا ہے کہ اسے میدان کے اُجلے ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ وہ بھی شاعر کے ساتھ ہر چیز کو نور کے نقاب میں مستور دیکھ رہا ہے۔ اب شاعر پورے اطمینان سے کہتا ہے۔

"درختوں کے پتے چمکتے ہوئے"

اور واقعی قاری اپنے آپ کو ایک طلسمی دنیا میں پاتا ہے جہاں درختوں کے پتوں کا رنگ سبز ہونے کی بجائے سفید "مہتاب وار" سفید ہے اور جہاں ان پتوں کی چمک سے آنکھوں میں خیرگی آجاتی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مناظر فطرت کی عکاسی سے شاعر کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ فطرت کے حسن وجمال کا اظہار کرے۔ ان مناظر کو اس کی زندگی کے کسی واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان سے کوئی داستان محبت متعلق نہیں ہوتی۔ مختصر الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ مناظر "پس منظر" (Back gound) کا کام نہیں دیتے اس کے برخلاف غزل میں مناظر صرف فضا پیدا کرتے ہیں۔ درحقیقت شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبت میں جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں سے کسی کا بیان کرے یا "محبوب" کے حسن وجمال کے کسی پہلو کی تصویر کھینچے اور مناظر فطرت ان تصاویر کے لئے پس منظر کا کام دیتے ہیں جس طرح فن کار مصور پس منظر میں مختلف [illegible] کے ذریعے اصل تصویر کے مطابق زمانہ واضح

ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک غزل گو شاعر مناظر فطرت کے ذریعے کسی داستان محبت کو زیادہ روشن طریقے سے پیش کرتا ہے۔

درحقیقت غزل گو شاعر کا دماغ محبت کے رنگ سے بھرا ہوا خم ہے۔ اس میں جو چیز ڈالی جاتی ہے محبت کے رنگ میں رنگی ہوئی نکلتی ہے۔ الفاظ کا پیرہن اسی خم میں جا کر "تغزل" کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ دنیا کے تمام حقایق، غزل گو شاعر کی زبان سے اصطلاحات حسن و عشق کے لباس میں ادا ہوتے ہیں یہ محبت کا ہمہ گیر اثر ہے کہ ہر جذبے کو اپنی گداز کرنے والی قوت سے اپنے ہی سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ اس حقیقت سے شاعر خود بے خبر نہیں چنانچہ نیفی کہتا ہے۔

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود　　　بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

اور غالب کہتا ہے۔

در پردۂ تو چند کشم ناز عالمے　　　داغم ز روزگار و فراقت بہانہ ایست

غالب نے بھی مناظر فطرت کو اکثر پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں

مہ بباغ از افق سرو شبے کرد طلوع　+　سرو گفتند بداں ماہ سراپا مانند

پہلے مصرعے میں شاعر نے ایک حسین و جمیل منظر کی تصویر کھینچی ہے۔ شام کا وقت ہے، کہیں کسی باغ میں درختوں کے سائے ہیبت کا اثر پیدا کر رہے ہیں، تاریکی گہری ہوتی جا رہی ہے، قریب ہے کہ باغ نقاب ظلمت میں پوشیدہ ہو جائے کہ ایک بلند و بالا سرو کے اوپر سے چاند طلوع ہوتا ہے۔ سرو کی بلندی کے ساتھ ماہ کامل کی گولائی کی صورت اور اس کی دلکشی شاعر کو متاثر کرتی ہے اور اسے کسی کا قول یاد آجاتا ہے کہ

"سرو بداں ماہ سراپا مانند"

[illegible]

بہاراں است مخاک از جلوہ گل امتلا دارد — برگ نشتر زن از موج خرام ناز صحرا را

. . . .

زلیباں کہ سر بسر گل و ریحان و سنبل است — طرف چمن نمونہ طرف کلاہ کیست
بیا کہ فصل بہار است و گل بہ صحن چمن — کشادہ روئے تر از شاہدان بازار است
نظارہ عرض جہالت ز نو بہار گرفت — شکوہ صاحب خرمن ز خوشہ چیں پیداست

. . . . . .

صحن چمن نمونہ بزم فراغ تو — باد سحر علاقہ ربط حواس کیست
لرزم بکوئے غنچہ ز بیتابی نسیم — کاندر امید واری بوئے لباس کیست

. . . .

زبس کز لالہ و گل حسرت ناز تو مے جوشد — خیاباں محشر دلہائے خوں گردیدہ را ماند
بہار از رنگ و بو در پیشگاہ جلوہ نازش — گدایان نثار از رہگذر برچیدہ را ماند

. . . .

شگفتن عرض بیتابی است ہاں اے غنچہ میدانم — ولت با نالہ مرغ سحر خواں برنمی آید
خوشا گلے کہ بفرق بلند بالائیست — وز شاخ و ازیں سبز کاخ بر گذرد

حسن کا لطیف ترین مظہر قالب انسانی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انسان فطرت کی تخلیقات کی آخری ارتقائی شکل ہے اور عناصر چہارگانہ کی تمام لطافتوں کا مجموعہ۔ اس اعتبار سے جس رعنا انداز میں انسانی حسن صانع مطلق کے جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ کہاں فطرت کی دوسری نسبتاً بے جان اور بے روح تخلیقات اور کہاں انسان۔ نرگس دلفریب ہے لیکن نرگس نیم باز سے کیا نسبت۔ گلاب حسین ہے لیکن عذار محبوب سے کیا تعلق۔ روانی آب جو مترنم ہے لیکن خرام دوست سے کیا مقابلہ۔ دوسرے فطرت کی ایمائی اور اشارتی صلاحیتوں کے نمایاں کرنے کے لئے شاعر کو تخیل سے مدد لینی پڑتی ہے لیکن انسان تو اپنی نگاہ کے انداز سے

سے "حسن مطلق" کی صفت کا اظہار کرتا ہے جمال الٰہی کی شعاعوں کے لئے پیکر انسانی سے بہتر کوئی آئینہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ہر شاعر حسن انسانی کا ایک تخیلی پیکر پیش کرتا ہے اور اس تخیلی پیکر کی رعنائی کے مدارج سے شاعر کے ذوق نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت بڑے شاعر اپنے تخیلی پیکر کو پیش کرتے وقت اس کے اعضا کے حسن و جمال کی طرف اشارہ نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حسن ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے۔ ممکن ہے جو پیکر وہ پیش کر رہے ہیں اس میں کسی کو کوئی دلکشی نظر نہ آئے۔ ایسے موقعوں پر وہ ابہام سے کام لیتے ہیں۔ اور کہکر خاموش ہو جاتے ہیں "ایک پری" "ایک دیوی" اب قاری کو اختیار ہے کہ وہ اپنے ذوق نظر اور وجدان تخیل کے مطابق "پری" کے خاکے میں رنگ بھر کر اپنے لئے ایک دلکش تصویر تیار کرے۔

فارسی شاعری میں یہ ابہام بہت کم نظر آتا ہے۔ محبوب کے تخیلی پیکر کو فارسی شعرا نے چند معینہ اصول و قوانین کا پابند بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ اصول و قوانین محبوب کی عادات پر بھی حاوی ہو گئے ہیں۔ فارسی شاعری کا معیاری محبوب نزاکت کا ایک مجسمہ ہے، جس کی نرگس چشم، گل رخسار اور پستہ دہن کے سامنے پریاں بھی غلامی کا اقرار کرتی ہے۔ وہ خوں ریز اور سفاک ہے، عاشق سے اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس کے جلانے کے لئے رقیب سے خوب گھل مل کر باتیں کرتا ہے، محبت کے افسانے کو درد سر کا موجب تصور کرتا ہے، اپنے سراپا ناز کے لئے دنیا میں مشہور ہے، ہر وقت اونچی بنا رہتا ہے، بسملوں کو خاک و خوں میں ملا کر خوش ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام باتیں حسن کی صفات کے لئے کنائے اور استعارے کے طور پر برتی جاتی ہیں لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ استعارات کثرت استعمال سے مردہ ہو جاتے ہیں اور اپنی تمام دلکشی کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ کیا قیامت ہے کہ ہم تشبیہات اور استعارات کے لئے ایک خاص محدود فضا کے پابند ہو جائیں اور کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کسی نئی تشبیہ کا استعمال گناہ تصور کریں۔

غالب رسمیات شعر کا پابند نہ تھا۔ اس کا معیار حسن رسمی معیار حسن سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ صدیوں کے رسم و رواج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مثلاً

بتے دارم از اہل دل رم گرفتہ   بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

ز سفاک گفتن چو گل بر شگفته / درین شیوه خود را مسلم گرفته
رگ غمزه از نیش مژگاں کشوده / سر فتنه در زلف پرخم گرفته
به رخساره عرض گلستاں ربوده / به هنگامه عرض جهنم گرفته
فسوں خوانده و کار عیسیٰ نموده / پری بوده و خاتم از جم گرفته
ز ناز و ادا تن به معجر نداده / بشرم و حیا رخ ز محرم گرفته
دمش رخنه در زهد یوسف فگنده / غمش گندم از دست آدم گرفته
گهے طعنه بر لحن مطرب سروده / گهے خرده بر نطق همدم گرفته
به بیداد صد کشته برهم نهاده / به بازیچه صد گونه ماتم گرفته
بروئیش ز گرمی نگه تاب خورده / بکوشش برفتن صبا دم گرفته
نیارد ز من هیچگه یاد هرگز / مگر خوے خاقان اعظم گرفته

. . . .

تا ہم ز دل برد کافر ادائے / بالا بلندے کوتہ قبائے
از خوے ناخوش دوزخ نہیبے / وز روئے دلکش مینو لقائے
در دیر گیری غافل نوازے / در زود میری عاشق ستائے
زر دشت کیشے آتش پرستے / بر سم گذارے زمزم سرائے
چوں مرگ ناگہ بسیار تلخے / چوں جاں شیریں اندک وفائے
در کام بخشی ممسک امیرے / در دلستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے پوزش پسندے / طاقت گدازے صبر آزمائے
در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے / در مہربانی بستاں سرائے
در زلف پرچم مشکیں نقابے / از تابش تن زریں روائے
در عرض دعوی لیلیٰ نکوئے / بر رغم غالب مجنوں ستائے

مندرجہ بالا اقتباسات میں محبوب کا تخیل یہی ہے لیکن جذبات میں غالب نے جیسی دلکشی پیدا کی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ موئے دلکش کی تشبیہ فردوس سے کس قدر دل افروز ہے "تفسیدہ دشت" سے کینہ وری کے کن کن جانگداز اور مہلک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے "از تابش تن زد بہ ردائے" میں نگ ولو کے کتنے ایما ہیں پھر موضوع سے قطع نظر الفاظ کی موسیقی کتنی مکمل ہے۔ ترنم اور نغمے کے تسلسل کے لئے حروف میں بھی تکرار اور وحدت کا اصول قائم رکھا گیا ہے۔

"گستاخ سازے پوزش پسندے — طاقت گدازے صبر آزمائے"

میں "ز" کی تکرار تخلیق نغمہ میں کتنی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ اچھا صناع رسمیاتِ عہد کی پابندی میں بھی اپنی طبیعت کی جدت کا اظہار کر سکتا ہے۔

.. ..

ایرانی شاعری کی رسمیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض اوقات محبوب کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر رموز محبت سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو اکثر شعرا نے بیان کیا ہے۔ نظیری نے اس کے متعلق ایک غزل لکھی ہے جو یوں شروع ہوتی ہے۔ در سینہ دارد آتشے پیراہن چاکش نگر۔

غالب اپنے انداز کلام میں نظیری کی پیروی کرنا فخر سمجھتا تھا اس نے بھی اس بحر اور زمین میں ایک مسلسل غزل لکھی ہے جس میں محبوب کے عاشق ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔

در گریہ از بس نازکی رنج ماندہ بر خاکش نگر — واں سینہ سودن ہا ز تپش بر خاک نمناکش نگر
برمے کہ جانہا سوختے دل از جفا سردش ببین — شوخے کہ خوں ہا ریختے دست از حنا پاکش نگر
آں کو بہ خلوت با خدا ہرگز نکردے التجا — نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر
تا نام غم بردے زباں میگفت در یا در میاں — دریائے خوں اکنوں رواں از چشم سفاکش نگر
آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزن چاکش نگر
بر مقدم صید افگنے گر نغمے بآوازش ببیں — در بازگشت توسنے چنگے بفتراکش نگر
بر آستانِ دیگرے در شکرہ بالشش ببیں — در کوئے از مو کندے در شکنہ نمناکش نگر

تا نگفته نشود نغزیں شنو تلخ است بر لب غنچه اش | زہر سکه نہاں می خورد پیدا ز ترا کیش نگر
با نجابی چشم و دلش با گرمی آب و گلشن | چشم گہر بارش ببیں آہ شرر ناکش نگر

خواند به امید اثر اشعار غالب بر سحر
از نکته چینی درگذر فرہنگ دانائش نگر

•• ••• ••

ایک اور غزل میں کہتا ہے۔

سرشک افشانی چشم ترش بیں | شہ خوباں و گنج گوہرش بیں
ادائے دلستانی رفتہ از یاد | ہوائے جانفشانی در سرش بیں *
بدست آوردہ روسیلت گوئی | روا رو در گدایان درش بیں
صفائے تن فزوں تر کردہ رسوا | دل از اندیشہ لرزاں در برش بیں
بجا ماندہ عتاب و غمزہ و ناز | متاع ناروائے کشورش بیں
رقیب از کوچہ گردی آبرو یافت | بکوئے دوست دشمن رہبرش بیں
زمن آئین غم خواری پسندید | بشبہا جائے من بر بسترش بیں
گذشت آں کز غم لبے خبر بود | بخویش از خویش بے پرواترش بیں
مہ نو کردہ کاہش پیکرش را | بچشم کم ہماں مہ پیکرش بیں
چکد در سجدہ خوں از چشم مستش | گداز شبہائے نفس کافرش بیں
گر از غم بیشش حاکرد غم نیست | زجاں تن زن لب جاں پرورش بیں
خداوندش بخوں ما گمیراد | بہ بیتابی نگہ بر خنجرش بیں

برسم چارہ جوئی پیشش غالب
شکایت ہائے چرخ و اخترش بیں

اس قسم کی چند اور مثالوں سے قطع نظر کر لینے کے بعد دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالب نے محبوب کا جو تخیلی پیکر پیش کیا ہے وہ رنگ و نور و حسن و بو کا ایک لطیف مرکب ہے۔ جو قریب قریب ہر مادی صفت سے مبرا ہے۔ اسکا حسن و جمال تحلیل و تجزیہ سے بالاتر ہے اور اس کی دلکشی خد و خال کی خوبصورتی پر مبنی نہیں۔ وہ حسن مطلق کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ وہ ایک نازک سا حباب ہے جو چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ حسن بے پایاں کا ایک مظہر ہے جس کے ذوق دیدار سے شاعر کا دل وجد کرتا ہے اس کے دیکھنے سے روح بالیدہ ہوتی ہے۔ اور جسم کے ذرّے ذرّے میں ایک رقص کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ خواہشات سے اس قدر ماوراء ہے کہ اس کے متعلق کبھی یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوا کہ وہ جنس مقابل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے حسن میں یہ اثر ہے کہ اس کا پیغام بھی "دیدار" کی طرح نظر افروز اور روح پرور ہے۔ اس کی محبت پیغام و گفتار کے وسیلوں سے بالاتر ہے۔ اس کا ایک جلوۂ رخ "اختلاط شبنم و خورشید تاباں" کا عالم پیدا کرتا ہے۔ اس کی دلربائی کی یہ کیفیت ہے۔ کہ اس کو مادی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ اس کا حسن صداقت اور نیکی سے ہم آہنگ ہے۔ جلوہ ہائے بہار اس کے رخسار کے آئینہ دار ہیں۔ لو و کائنات اس کی راہ عشق میں ایک غبار۔ آنکھیں اس کے جلووں سے جلا پاتی ہیں۔ اور سینہ میں ایک شمع ایمان روشن ہو جاتی ہے۔ اس کے انداز و ادا سے جمال الٰہی کی مہابت و عظمت کا اظہار ہوتا ہے وہ ایک شمع ہے جو ظلمات ہستی میں روشن ہے لیکن اس کے نور کو دیکھنے کے لئے نگاہ دوربیں کی ضرورت ہے

شوخی خوئے ترا قاعدہ داں است خزاں — خوبی روئے ترا آئینہ دار است بہار
در غمت غازۂ رخسارۂ ہوش است جنوں — در رہت شانۂ گیسوئے غبار است بہار
ہم حریفان ترا طرف بساط است چمن — ہم شہیدان ترا شمع مزار است بہار
جعد مشکیں ترا غالیہ سائیست نسیم — رخ رنگیں ترا غازہ نگار است بہار
و خشتے مے دمد از گرد پر افشانی رنگ — از کمیں گاہ کہ رم خوردہ شکار است بہار
بجہاں گرمی ہنگامۂ حسن است ز عشق — شورش اندوز ز غوغائے ہزار است بہار

تا کیم درد شکایت ز زبان برخیزد — بزن آتش کہ شنیدن ز زبان برخیزد

.. ..

طراوت مشک بہ دامان نسیم افشاند — جلوہ ات گل بکف آئینہ پرواز دہد
پردہ داراں بہ نے و ساز فشارش زدوند — نالہ می خواست کہ شرح ستم ناز دہد

.. ..

بالذت دیدہ ز پیغام گرفتیم — مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشناسد
بے پردہ شو از ناز دمیدیش کہ مارا — چوں آئینہ چشمے است کہ دیدن نشناسد

.. ..

گلت را نوا نرگست را تماشا — تو داری بہارے کہ عالم ندارد
نگہدار خود را وز آئینہ بگذر — نگاہ تو پروائے خود ہم ندارد

.. ..

روش باد بہاری بہ گمانم افگند — کیں گل و غنچہ پئے قافلہ بوئے تو بود
آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بہ عتاب — نفسم پردہ کشائے اثر خوئے تو بود

.. ..

ادا فہمیت اور اکہ از دلربائی — نہفتن ز شوخی بہ اظہار ماند
چہ جویم مراد از نگرنے کہ او را — نشستن ز تشنگی بہ رفتار ماند

.. ..

قاآنی اور نظیری نے بھی محبوب کے نہایت حسین و دلکش تخیلی پیکر پیش کئے ہیں۔ لیکن ان کا حسن لذت اندوزی کے لئے ہے۔ نظیری اور قاآنی حسن کی جسمانی کیفیات سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ حسن میں جو روحانی اشارے پوشیدہ ہیں ان سے وہ اکثر ناواقف رہتے ہیں ان کے محبوب شوخ و شنگ ہیں ان کے دل میں حصول لذات کا جذبہ موجود ہے اور وہ زندگی میں ہر قسم کے عیش و عشرت سے متمتع ہونا چاہتے

ہیں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندہ ہیں مثال کے طور پر تطیری محبوب کے حسن کی تصویر یوں کھینچتا ہے ۱

دارم دریں دیار مغاں شیوہ دلبرے   مستی خوش و میانہ خوش و ہوشیار خوش

دستار افگند خم کاکل پرا گند   کیں است وضع صحبت و زیں سان نگار خوش

شادو شگفتہ مطرب و ساغر طلب کند   یکسو نہد حجاب و در آید بکار خوش

ہر گہ کند شتاب بہ رفتن کہ دیر شد   تسکیں دہمے دہم کہ سکون و قرار خوش

ساغر کنم لبالب و گویم بیک نبوش   در موسم بہار نباشد خمار خوش

وصال کی کیفیت کے متعلق لکھتا ہے۔

ہمہ شب بر لب و رخسار و گیسوی زنم بوسہ   گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن آتش

قاآنی کا تخیل پیکر شوخ و رعنا ہے لیکن "سحر نگاہاں سیاہ کار انند" کی تفسیر۔

کنوں کز شنبلید و ارغواں و یاسمن دارد   چمن تمکیں و من تزیین زمیں آئین نگار چین

بہ صحن باغ و طرف راغ و زیر سرو پائے جو   بنہ گام و بجو کام و بکش جام و بخور ساغر

بویژہ با بتے شنگول و شوخ و شنگ بے پروا   سخن پرداز و خوش آواز و افسوں ساز و حیلت گر

. . . .   پری موئے پری روئے پری چہرے پری پیکر

ہر زمانے کہ بہ آں ترک سرو کار افتد   صلح خیزد ز میاں کار بہ تکرار افتد

من بعمدا بپئے صلح ہمے جویم جنگ   کز پئے جنگم با بوسہ سرو کار افتد

اے خوش آں وقت کہ خیزد بت من از پئے جنگ   وز طرب رعشہ دریں گنبد دوار افتد

مست در بستر من افتد و رنداں دانند   حالت مست کہ در بستر ہوشیار افتد

اس کے برخلاف غالب کا محبوب ایک سنگ مرمر کا بے داغ اور بے عیب بت ہے جس کے پیکر لطیف میں شرارہ حیات کا وجود تک نہیں۔

اس عالی معیارِ حسن پر قائم رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ردِ عمل کے اٹل قوانین کے ماتحت غالب حسنِ عام کے انداز و ادا کی تعریف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔

بتانِ شہر ستم پیشہ شہریارانند ۔۔۔ کہ در ستم روش آموز روزگارانند
برند دل بہ ادائے کہ کس گماں نبرد ۔۔۔ فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دارانند
بجنگ تا چہ بود خوئے دلبراں کیں قوم ۔۔۔ در آشتی نمک زخم دلفگارانند
ز وعدہ گشتہ پشیماں و بہر دفع ملال ۔۔۔ امیدوار برگ امیدوارانند
ز روئے و خوئے منش نور دیدہ آتش ۔۔۔ برنگ و بوئے جگر گوشۂ بہارانند
تو سرمہ بیں و ہوس در نورد و دم درکش ۔۔۔ مبیں کہ سحر نگاہاں سیاہ کارانند

دلستاناں کلبند ارچہ جفا نیز کنند ۔۔۔ از وفائے کہ نکردند حیا نیز کنند
چوں بہ بینید بترسند صبیرواں گردند ۔۔۔ رحم خود نیست کہ بر حال گدا نیز کنند
خستہ تا جاں ندہد وعدہ دیدار نہند ۔۔۔ عشوہ خواہند کہ در کار قضا نیز کنند
خلق غالب نگر و خستۂ سعدی کہ سرود
خوب رویان جفا پیشہ وفا نیز کنند

ذوقش بوصل گرچہ زبانم بہ کار برد ۔۔۔ لب در ہجوم بوسہ ز بالیش نگار برد
دادم بہ بوسہ جاں ز خوشم کاں بہانہ جو ۔۔۔ زخش دو چند کرد و شکر نی بکار برد
پیشم اندا پرس کہ بوسی و اہل کوئے ۔۔۔ گویند خستہ زحمت خود ایں دیار برد
نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئے او
ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

مولانا محمد علیؒ مرحوم کا ایک خط

غلام بھیک صاحب نیرنگ کے نام

محمد علی میوزم میں، مولانا مرحوم کے متعدد، دلچسپ، سبق آموز، اور معلومات افزا خطوط، محفوظ ہیں، خواہش ہے کہ رفتہ رفتہ ان سب خطوط کو قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

غالباً ۲۵ء میں، میر غلام بھیک نیرنگ، کنور عبدالوہاب خاں، اور ڈاکٹر کچلو نے ایک آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی تھی کہ مسلمانوں کے مختلف الخیال زعما جمع ہو کر ایک شاہراہ عمل تیار کریں، یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریک شدھی و سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم کی معرکہ آرائیوں نے ہندوستان کو ایک عرصہ کارزار بنا رکھا تھا، عجیب زمانہ تھا! بہت سے سنجیدہ دماغ خلافتی جو تحریک خلافت کے سلسلہ میں قید و بند کے مصائب برداشت کر چکے تھے، فضا سے اتنے متاثر ہوئے کہ بلا تامل تبلیغ کے میدان میں تنظیم کا جھنڈا لے کر کود پڑے، اور کتنے صحیح العقیدہ کانگرسی تھے جن کی ذہانتیں مہاسبھا کے پلیٹ فارم پر کام کر رہی تھیں،

محمد علی کے رفقا، کار میں سے ہندوؤں کی ایک خاصی جماعت کانگرس کے کیمپ سے نکل کر مہاسبھا کے میدان میں ڈیرے ڈال چکی تھی، خلافت کی تحریک میں جو دوش بدوش کام کر چکے تھے وہ محمد علی کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ بھی آزادی ہند کے جذبہ کو خیرباد کہیں ترک موالات کو سلام کریں، اور تبلیغ کے راجہ بن کر میدان عمل میں اتر آئیں،

محمد علی کے سے داعی استقلال و علمبردار حریت کے لئے، یہ ناممکن تھا، وہ اس وقت تک کانگرس کے ہمنوا رہے جب تک مایوس نہ ہو گئے، مکتوب ذیل میں انہی واقعات پر تلمیح و استعارے ہیں، اور کہیں صاف صاف الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے،

خاص طور پر متوجہ کرنے کے لئے مخصوص جملوں پر خط راقم الحروف نے کھینچا ہے۔ فٹ نوٹ کی تشریح

بھی راقم الحروف ہی کی ہے۔

رئیس احمد جعفری

محمد علی میوزیم جامعہ ملیہ، دہلی

مکتوب

بنام سید غلام بھیک نیرنگ انبالہ

مکرمی نیرنگ صاحب، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

پرسوں کنور عبدالوہاب خاں صاحب تشریف لائے تھے اور ان سے اس دعوت کا حال معلوم ہوا تھا جو چند حضرات ایک مسلم کانفرنس کو امرتسر میں دینا چاہتے ہیں انھوں نے فرمایا تھا کہ تمھارے نام بھی دعوتی خط آئے گا، کہ داعیوں میں شریک ہو جو کچھ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا تھا، وہی آپ کی خدمت میں بھی عرض کرتا ہوں میں مسلمانوں کے مختلف عناصر کی کانفرنس کو، ہندو مسلمانوں کی اتحادی[1] کانفرنس سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا تھا اور خود مسلمانوں کی ایک یونٹی کانفرنس کو مختلف اقوام کی یونٹی کانفرنس سے پہلے منعقد ہونا چاہیئے تھا، اگر مہاتماجی نے ایک نہایت خطرناک برت نہ رکھ لیا ہوتا[2]۔ تو گذشتہ ستمبر کی یونٹی کانفرنس کا انعقاد بعد میں ہوا ہوتا، اور مسلمانوں کی یونٹی کانفرنس کا پہلے۔ اس کے بعد بھی جب کنور عبدالوہاب خاں نے اس کی طرف مجھے متوجہ کیا تو میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور حکیم اجمل خاں صاحب اور بھائی مولانا شوکت علی صاحب سے اس کا ذکر کیا، چنانچہ سب نے اتفاق کیا، مگر کانگرس کے اجلاس سے پیشتر کوئی اجتماع ہونا مشکل نظر آیا۔ کانگرس سے واپسی پر بھائی نے اس کی تحریک مسلم لیگ کے جلسہ میں کی، اور بڑی مشکلوں سے کثرت رائے حاصل کرکے، اپنی تحریک کو منظور کرایا، تاہم جیسا کہ تمام ان مستبد جماعتوں کا قاعدہ ہے، اگر کوئی چیز ان خداوندوں کی مرضی کے خلاف کثرت رائے سے منظور بھی ہو گئی، تو لوگ عمل میں تساہل کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ چیز کھٹائی میں پڑ جاتی ہے، اور تعمیل کا نام بھی نہیں آتا۔ مسلم لیگ نے آل پارٹیز کے اجتماع کے لئے تو ایک جلسہ ۲۳ جنوری

---

[1] اشارہ ہے یونٹی کانفرنس کی طرف جو ستمبر ۱۹۲۴ء میں دہلی میں ہوئی تھی اور بلا کسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے برخاست ہو گئی تھی

[2] اسی زمانہ میں فسادات کوہاٹ سے متاثر ہو کر اور دوسرے حوصلہ شکن حالات سے مجبور ہو کر گاندھی جی نے اپنا مشہور ۲۱ روزہ برت رکھا تھا"

کو طلب کیا مگر باوجود میرے کئی روپیہ کے تار کے شوکت صاحب کی اس تحریک کے مطابق مسلمانوں کے تمام فریقوں کا اجتماع آج تک نہ ہو سکا آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ جون میں خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا تھا اس موقع پر بھی مسلمانوں کے تمام فریقوں کو عام دعوت دی گئی تھی کہ قومی تنظیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے دہلی میں مجتمع ہوں، اس کے جواب میں بھی مسلم لیگ کے لوگ شریک نہ ہوئے اس لئے شوکت صاحب نے خیال کیا کہ بہتر ہوگا اگر بجائے خلافت کے یہ دعوت خود لیگ کی طرف سے دی جائے، لیکن نتیجہ وہی ہوا کہ کوئی اجتماع آج تک نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ کی کونسل اور مسلمانوں کا اجتماع جنوری گذشتہ میں یہاں ہوا تھا اور وہ صرف اسی غرض سے تھا کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلم لیگ کے خداوند ہماری تائید کریں، چونکہ ہم ان کے تمام خیالات سے متفق نہ تھے اس لئے یہ تو نہ ہوا، بلکہ پھر بھی ہمیں کو جھکنا پڑا، اور مروت کے خیال سے ہم نے کہہ دیا کہ بہت اچھا تو آپ اُن کے اپنے مطالبات کے پورا کرنے پر راضی کرلیں، تاکہ کل کو یہ نہ ہو کہ آپ شکایت کریں کہ ہندو تو ہمارے مطالبات پورا کرنے پر راضی تھے مگر تمہاری مخالفت نے ان کو روک دیا جینا[1] صاحب اور ان کے ساتھیوں کو پورا موقع دیا گیا کہ وہ اپنے مطالبات کو پیش کرکے، ہنود کو راضی کرلیں، لیکن اس میں انھیں مطلق کامیابی نہ ہوئی، اور اجتماع کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے بعد نہ لیگ کے سکریٹری صاحب نے، نہ صدر صاحب نے، اس رزولیوشن پر توجہ کی جسے شوکت صاحب نے لیگ میں پیش کرکے منظور کرایا تھا، اور مسلمانوں کی آل پارٹیز کانفرنس آج تک جمع نہ ہو سکی الحمدللہ کہ آپ نے اس طرف توجہ فرمائی ہے مگر میں نہیں دیکھتا کہ داعیوں میں مختلف الخیال اور متفرق عناصر شامل ہیں، میں نے چھوٹتے ہی کنور صاحب سے پرسوں کہہ دیا تھا کہ اگر اس کانفرنس کا مقصود یہ ہے کہ مختلف الخیال لوگ ایک جگہ جمع ہوں، اور فیصلہ کریں کہ مسلمانوں کا کاروبار کس طرح چلے اور کیا کیا عناصر کس کس طریقہ پر کس کس کام کو کرنے کے لئے تیار ہیں تو میں کانفرنس میں بھی شریک ہو سکتا ہوں اور اس کے داعیوں میں بھی، لیکن اگر مقصد وہی ہے جو بعض ہمارے پنجابی اور دیگر بھائیوں کا گذشتہ اجلاس خلافت کمیٹی منعقدہ ۴ مارچ بمقام دہلی میں تھا، یعنی ترک موالات

---

[1] مسٹر محمد علی جناح

کو ہم سے ترک کرانا، تو میں اس دعوت الی الشر میں شریک نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے داعیوں میں ترک موالات کی مشکلات سے میں ناواقف نہیں، لیکن دین اور آزادی کی راہ میں ان سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہم کو بھی کرنا پڑے گا، جو صاحب ۱۹۲۰ء میں ہمارے ساتھ نہ تھے وہ آج بھی ہمارے ساتھ نہ ہوں تو کچھ تعجب کی بات نہیں لیکن جو صاحب اس وقت تارک موالات تھے، وہ آج مشکلات سے گھبرا کر موالات کی طرف بڑھیں تو یہ ان کو مبارک ہو مگر میں تو اس طرح قدم نہیں اٹھا سکتا تبلیغ میرا دین و ایمان ہے، خلافت تنظیم مسلمانان کا نام ہے، اور قیام دین کے لئے اس تنظیم کی ضرورت ہے۔ اسلام گوشہ نشینوں اور تسبیح ہلانے والوں کا مذہب نہیں ہے۔ سیاست بھی تنظیم مسلمانان کا ایک اہم جزو ہے اور ہم کو ایک اسلامی سیاست کو ہر وقت پیش نظر رکھنا ہے جس میں غیر مسلموں کے ہر گروہ کے ساتھ ہمارا سیاسی تعلق صاف اور غیر مشتبہ نظر آ سکے موجودہ "کمزوری بلکہ بے حسی اور ناکارگی" جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے اور جسے آپ دور کرنا چاہتے ہیں محض "بدنظمی" کے باعث نہیں ہے بلکہ اس باعث ہے کہ ایک جماعت جب میں انگریزی پڑھے لکھے مسلمان اور علماء بھی زیادہ تعداد میں شامل ہیں ایسے "نظم" کو قائم کرنا چاہتے ہیں کہ جس میں ان کے نزدیک وہ مصیبتیں سہنا نہیں پڑیں گی جو ترک موالات کی حالت میں ہم کو سہنا پڑتی ہیں "تفرق اور تضاد عناصر کا تصادم" دور کرنا بہت اچھا ہے مگر وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جو لوگ تارک موالات نہیں ہیں وہ بھی تارک موالات ہو جائیں تو نہ کوئی تفریق و تضاد باقی رہیگا اور نہ کوئی تصادم ہوگا، یا کم از کم اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو حضرات تارک موالات نہیں ہیں وہ صاف کہدیں کہ بھائی ہم ان تکالیف کے لئے تیار نہیں ہیں، جو ترک موالات میں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ہم اپنی حد میں رہ کر فلاں فلاں خدمت قوم کی کریں گے، جو تارک موالات ہیں وہ مصیبتیں جھیلیں اور اس دشوار گزار راہ سے گذریں، ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن اگر "رخصت" چاہنے والے نہ "عزیمت" والے بنیں نہ اپنے آپ کو "رخصت" چاہنے والا سمجھیں بلکہ "نفس لوامہ" کا منہ بند کر کے اپنے آپ کو "نفس مطمئنہ" والا کہنے لگیں حالانکہ ہوں "نفس امارہ" کے پنجے میں اور اپنے آپ کو صاحب "عزیمت" سمجھ کر حقیقی صاحبان "عزیمت" کو "رخصت" بھی نہ دیں تو ایسی جماعت کی شرکت خطرہ سے خالی نہیں اور اس کی دعوت الی الخیر نہیں، بلکہ دعوت الی الشر ہے۔

بھائی نیرنگ! مجھ سے زیادہ میری کمزوریوں کو صرف خدا ہی جانتا ہے میں نیکی کا دم نہیں بھرتا، پاکی کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ ایمان کی حفاظت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اچھا ہوتا ہے اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے[1] میں آپ اپنے میں اتنی قوت نہیں دیکھتا کہ نیکی کی طرف لپکوں تو کم سے کم برائی کی طرف سرکنا نہیں چاہتا اور بہتر یہی ہے کہ جہاں ہوں وہیں کی زمین پکڑ کر بیٹھ جاؤں جن صاحبوں کی فہرست بطور داعیوں کے آپ نے ارسال کی ہے ان کی دعوت، مولنا ... علی خاں[2] کی صدارت اور (معاف کرنا) پنجاب کا اس کانفرنس کی جائے وقوع قرار پانا یہ سب چیزیں مل کر ایک ایسا اجتماع پیدا کردیتی ہیں جیسے پنجاب کے پانچوں دریا مل جائیں اور جہاں پایاب بھی ہوں، وہاں بھی دھار اس زور سے بہے کہ عبور کرنے والے کے پاؤں اکھڑ جائیں اور دریا کی رو کے ساتھ بہنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آئے۔ اس دھار کی تیزی میں آج بہا کل کے ڈوبنے کا پیش خیمہ ہے، میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ صحیح معنوں میں شاعر ہیں آپ کے دل میں مذہب اور قوم کا عشق ہے، آپ کیوں ان "سوداگروں" کے ساتھ سیاسی مول تول میں شریک ہوتے ہیں، اگر آپ کو میں انہیں جیسا سمجھتا، تو ہرگز یہ کچھ نہ لکھتا جو لکھ رہا ہوں۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی

ایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستاں است

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف میں علماء سے دست و گریباں ہونے کے لئے تیار ہوں، میں دوسری طرف مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کے الغاء خلافت اور secular state کا قائل نہیں، افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہتا ہوں کنور عبدالوہاب خاں مجھ سے بھی زیادہ ٹھیکے جوان ہیں، میں شیخ ہوں گو رامپور افغانان میں پیدائش اور عرصہ تک سکونت کے باعث کبھی کبھی "پٹھان ولی" پر اتر آتا ہوں، لیکن پھر بھی شیخ ہوں، جب

---

[1] اشارہ ہے ایک حدیث کی طرف

[2] آخر میں اس کانفرنس کے صدر وہ صاحب نہیں ہوئے جن کی طرف اشارہ ہے بلکہ میرٹھ کے مشہور رئیس اور قومی کارکن نواب اسمٰعیل خاں بیرسٹر ہوئے تھے۔

ذرا جوش کم ہوتا ہے اور عقل پھر ہدایت کرنے لگتی ہے تو مجھیں رنجی کر لیتا ہوں کنور صاحب اب تک رجپوت ہیں' وہ زود خشم ہیں اور الدانخصام[1] کو چھوڑ کر جھپٹ بھیتوں پر غصہ اتار لگتے ہیں، مگر ماشاء اللہ آپ جوش اسلامی کے ساتھ عقل کا بھی وافر حصہ رکھتے ہیں' اور پھر خود شاعر ہیں ایک قرآن کریم کی اس آیت کریمہ پر غور فرمایئے کہ

ولتسمعن من الذین اوتوالکتب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذیً کثیراً وان تصبروا وتتقوا فان ذالک من عزم الامور (آل عمران)

جس صبر کو وہ میری کمزوری سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک "عزم امور" ہے' پھر غالب کے اس شعر پر غور کیجئے، ؎

نفس نہ انجمن آرزو سے باھر کھینچ
اگر شراب نہیں. انتظار ساغر کھینچ

کنور عبدالوہاب خاں صاحب سمجھتے ہیں کہ مجھے پیاس نہیں لگی اگر میرے مذہب میں شراب بھی ملے تب بھی پانی پینا حرام ہے' وہ سمجھتے ہیں کہ میں ہندو سے مرعوب ہوں اور ان کی خوشامد کرتا ہوں. حالانکہ مجھ ہی بدبخت کے یہ شعر ہیں

فرشتوں نے کیا ہے ان کو سجدہ
نہیں اے بت یہ بت کدہ تیرے بس کے

جو ہر اور صاحب دربار کی شکایت کیا خوب
عرش و کرسی پہ گذر ہے تیرے دربار ی کا

اب کی بار آئے تھے تو فرماتے تھے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسلام کی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ انگریزوں سے بغض کی وجہ سے' خیر یہی سہی لیکن

---

[1] انگریز مراد ہیں

مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

میری "استواری" کی داد بھی داد دی اور معتقد بھی ہوئے تو انھیں "شہیدان امتحانی" کے جن میں سے ایک یعنی فرہاد کے متعلق غالب کہ گذرے ہیں۔

دلم بر رنج نا برداری فرہاد می لرزد
خداوندا بیامرز آں شہید امتحانی را

کنور صاحب بھول گئے کہ اب بھی دفعہ ۱۲۴ الف کا وار دفعہ ۱۵۳ الف کے وار سے زیادہ سخت ہے اور زیادہ کثرت سے اور بالخصوص آج کل تو دفعہ ۱۵۳ الف کی سزا حکومت کا مقرب بارگاہ بنتا ہے نہ کہ خیر اب یہ دکھڑا کہاں تک روؤں میں تو آج بھی اپنے کو وہیں پاتا ہوں جہاں ۱۹۲۱ء میں تھا ہنوز غلامی ہم سے زیادہ سرایت کر گئی ہے اسی باعث وہ مالوی اور لاجپت رائے کے ساتھیوں میں پھر ہو گئے ہیں اگر میں نے رائے بدلی ہے تو صرف اسی قدر جتنے کہ واقعات بدلے ہیں یعنی ۱۹۲۱ء میں ہنود کو مہاتما گاندھی کی طرف مائل دیکھ کر یقین ہوا تھا کہ اس قوم کے دن پھرے ہیں آج انھیں پھر پرانی بدبختی میں مبتلا پاتا ہوں لیکن انھیں قدم بہ قدم چل کر مولوی مالوی اور منشی لاجپت رائے انھیں دو ہندوؤں کی طرح کے مسلمان سرداروں کا اتباع کرنا نہیں چاہتا۔

نے پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

آپ کو یاد ہو گا کہ آپ ہی نے مجھے بیداستہ بھوالی میں بتایا تھا اور فرمایا تھا کہ لڑائی ہندو مسلمانوں کی نہیں ہے بلکہ مالویت اور گاندھیت کی ہے۔ میں "گاندھیت" کا ساتھ دے کر ہندوستان اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک مسلمان کے لئے محض "مالویت" کی مخالفت کرنا اس کو ہنود میں تقویت پہنچانا ہے۔ اور اس میں نہ اسلام کی بہتری ہے نہ ہندوستان کی اور نہ خود ہندوؤں کی۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال ہو کہ مہاتما گاندھی سے خود بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں ایک حد تک میں اس خیال کی تائید کر سکتا ہوں لیکن گاندھی انسان ہیں فرشتے نہیں، نہ خدا ہیں، ان کے اوپر ہنود کا اور بالخصوص ہندو پنجاب کا ایک عرصے سے زغہ رہا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے خود

پچھ سال گذشتہ میں مسلمانوں کی BRIFF مانگی تھی، مگر جس سے اس چیز کے لئے کہا گیا اس نے سوائے ہندو اخباروں کے پلندوں کے جو میرے سر پر کھینچ مارے گئے مجھے مشکل سے کوئی چیز بھیجی جس کو میں پڑھ کر مہاتماجی کے سامنے مسلمانوں کا case پیش کرسکتا یا جس کو مہاتماجی کو دے سکتا۔ ہم میں جوش زیادہ ہے مگر کام کا سلیقہ ہم نہیں جانتے، نہ پتہ مارنا ہم کو آتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی مہاتماجی نے مسلمانوں کے کیس کے متعلق سنا ہے وہ زیادہ تر مجھی سے یا میری ہی معرفت سنا ہے۔ اگر مسلمانوں کی بے صبری، اشتعال پذیری اور پھر صحیح طریق کار سے ناواقفیت کے باعث مہاتما گاندھی کے دل پر جو ہندو ہیں اور جن پر ہندو رسم و رواج اور طریق بود و ماند کا پیدائش سے لے کر اس وقت تک بہت کچھ اثر پڑا ہے، "اثر ہوا" اور انھوں نے مسلمانوں کے متعلق ایک حد تک غلط فیصلہ کیا تو زیادہ تعجب کی بات نہیں، ان کے خیالات کی اصلاح کرنا اب بھی ہمارا فرض ہے، لیکن اس کے لئے وہ سوقیانہ طریقہ ہرگز مفید نہیں ہوسکتا جس کو حضرت مولانا ..... علی خاں نے اختیار کیا ہے، بھائی نیرنگ صاحب افسوس ہے کہ مسلمان پھر بھی اسی طریقہ پر چلنے لگے ہیں جو ابتداً انھوں نے اختیار کیا تھا۔

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مجھے معاف کیجئے، یہ خط بہت طویل ہوگیا اور جیسا کہ دنیا کا کتا ہوں اسی طرح کا یہ میرا خط ہوگیا، اس میں شک ہے، حسد ہے، غیبت ہے، اپنی تعلّی ہے، خودستائی ہے، لیکن کیا کروں جیسا میں ہوں ویسا ہی اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں "ایک فاسق و فاجر ہوں"، اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ہے اس کو ظاہر کردوں کم از کم ایک جرم کا ارتکاب تو اب تک نہیں کیا ہے، یعنی تقدس کا دعوی نہیں کرتا اور سجدۂ ریائی سے زمین کو بھی گندہ اور ناپاک نہیں کرتا۔

جو کچھ میرے دل میں تھا، وہ سب کچھ کہ گذرا، اب اس سے زیادہ اور کیا لکھوں۔ اگر ایسا شخص آپ کے کسی کام کا ہو تو حاضر ہوں، ورنہ معذور ہوں۔

محمد علی

مالیات ہند

مرکزی حکومت ہند کے اخراجات

نمبر		سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء
۱	فوج	۵۸،۵۰،۰۰،۰۰۰
۲	ریلوے	۳۲،۲۴،۰۰،۰۰۰
۳	قرضہ عامہ کا سود	۱۵،۶۲،۰۰،۰۰۰
۴	تنظیمی محکمہ جات	۱۱،۴۴،۰۰،۰۰۰
۵	متفرق اخراجات مثلاً آبپاشی، ڈاک اور تارگھر، زراور ٹکسال تعمیرات عامہ، سرحدی وظائف، طباعت وغیرہ	۷،۴۵،۵۶،۴۱۸
۶	مختلف ٹیکس وصول کرنے کے اخراجات	۴،۰۳،۰۰،۰۰۰
	میزان	۱۲۹،۲۸،۵۶،۴۱۸

گذشتہ چند سالوں میں مرکزی حکومت کے سالانہ اخراجات حسب ذیل تھے:-

۱	سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء	۱۴۲،۸۶،۵۲،۰۱۷
۲	سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء	۱۳۶،۴۳،۰۵،۵۴۸
۳	سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء	۱۳۰،۳۹،۶۴،۷۶۹
۴	سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء	۱۳۱،۸۸،۹۲،۴۲۱
۵	سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء	۱۲۹،۸۶،۱۲،۳۰۵
۶	سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء	۱۳۱،۶۵،۴۴،۹۰۳

۷. سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء ۱۲۷،۲۲،۷۷،۹۲۰

۸. سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء ۱۲۹،۲۸،۵۶،۲۱۸

ان اعداد پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے سالانہ اخراجات لگ بھگ ۱۲۰ کروڑ ہوتے ہیں۔ آمدنی اور اخراجات کا موازنہ کرنے سے حسب ذیل جدول تیار ہوتا ہے۔

نمبر	سن	زائد آمدنی دبچت +	زائد اخراجات دخسارہ -	کیفیت
۱	سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء	ــــــــ	۲۷،۶۵،۰۱،۷۰۰	
۲	سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء	ــــــــ	۱۵،۰۱،۷۴،۳۹۲	
۳	سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء	۲،۳۸،۹۹،۷۵۸	ــــــــ	
۴	سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	۵،۶۸،۲۵،۶۹۸	ــــــــ	
۵	سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	۳،۳۱،۱۸،۱۸۶	ــــــــ	
۶	سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	ــــــــ	ــــــــ	اس سال کا میزانیہ بالکل متوازن تھا
۷	سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	ــــــــ	ــــــــ	" " " "
۸	سنہ ۱۹۲۸-۹ء	ــــــــ	۳۱،۴۵،۰۰۲	

اس کے بعد کے اعداد و شمار اگرچہ سرکاری طور پر شائع نہیں ہوئے ہیں مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۲۸-۹ء کے بعد سے ہر سال مرکزی حکومت کی آمدنی سے اخراجات بڑھے ہوئے ہیں۔

صوبجاتی حکومت کے اخراجات

سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء

محصول وصول کرنے کے اخراجات ۱۰،۲۸،۰۰،۰۰۰

آبپاشی ۶،۰۰،۰۰،۰۰۰

[illegible] ۲،۰۰،۰۰،۰۰۰

تنظیمی محکمہ جات مثلاً عدالت، جیلخانے، پولیس، تعلیم، صفائی، زراعت، صنعت	۵۴،۲۱،۳۸،۰۴۷
تعمیرات	۱۲،۴۱،۰۰،۰۰۰
متفرق مثلاً وظائف، پنشن، مطابع، تحفظ فنڈ، جنگلات	۷،۰۱،۰۰،۰۰۰
میزان	۹۲،۹۱،۳۸،۰۴۷

گذشتہ چند سالوں میں صوبجاتی حکومت کے اخراجات حسب ذیل رہے ہیں۔

صوبجاتی حکومتوں کے مجموعی اخراجات

سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء	۷۹،۱۶،۲۵،۵۵۶
سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء	۷۷،۲۳،۳۸،۵۲۲
سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء	۷۶،۰۹،۲۸،۶۳۰
سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	۷۸،۴۰،۶۹،۷۲۳
سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	۸۵،۸۹،۵۲،۷۹۱
سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	۹۰،۱۷،۲۲،۷۹۳
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	۹۱،۵۰،۴۲،۹۲۶
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	۹۲،۹۱،۳۸،۰۴۷

صوبجاتی حکومتوں کی مجموعی آمدنی اور مجموعی اخراجات کا موازنہ کرنے سے حسب ذیل جدول تیار ہوتا ہے۔

سنین	زائد آمدنی بچت +	زائد اخراجات خسارہ -	کیفیت
سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء		۸،۷۳،۲۱،۸۲۰	
سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء		۱،۴۹،۵۳،۲۸۴	
سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء	[illegible]		

سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	۲٬۸۷٬۴۸٬۲۵۹	
سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	۱٬۶۱٬۶۷٬۲۳۸	
سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء		۳٬۷۴٬۰۶٬۹۲۵
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	۱۰۷۹٬۱۱٬۴۸۰	
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء		۱٬۴۳٬۶۲٬۴۶۶

سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء کے بعد سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوبجاتی حکومت کے موازنوں میں برابر خسارہ پایا جاتا ہے۔

قومی تعمیری محکمہ جات پر مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے اخراجات

حسب ذیل جدول کے دیکھنے سے آسانی پتہ چلتا ہے کہ حکومت ہند قوم کے تعمیری محکموں پر کس قدر رقم صرف کرتی ہے:۔

تعلیمات	تقریباً	۱۳٬۰۰٬۰۰٬۰۰۰
طبابت وصحت عامہ		۵٬۶۰٬۰۰٬۰۰۰
زراعت		۲٬۷۵٬۰۰٬۰۰۰
صنعت		۸۵٬۰۰٬۰۰۰
	میزان	۲۲٬۲۰٬۰۰٬۰۰۰

ریاست حیدرآباد کے اخراجات

آمدنی وصول کرنے کے اخراجات	۱٬۵۴٬۰۰٬۰۰۰
تعلیمات	۷۶٬۱۶٬۰۰۰
تعمیرات عمارات و آرائش شہر	۱٬۰۶٬۰۰٬۰۰۰

فوج	۶۶٬۷۱٬۰۰۰
پولیس	۶۱٬۰۰٬۰۰۰
اعلیحضرت کی خدمت میں نذرانہ	۵۰٬۰۰٬۰۰۰
تنظیمی محکمہ جات، مثلاً عدالت، سیاسیات	۷۰٬۰۰٬۰۰۰
طبابت	۲۱٬۵۰٬۰۰۰
منصب	۱۵٬۶۱٬۰۰۰
مذہب	۱۲٬۲۰٬۰۰۰
آبپاشی	۱۲٬۵۰٬۰۰۰
قحط فنڈ	۱۵٬۰۰٬۰۰۰
سود اور ادائی قرضہ عامہ	۲۴٬۲۵٬۰۰۰
متفرق مثلاً ڈاک، ٹکسال، زر صاحبزادگان بلند اقبال کے سرکاری و نیم سرکاری اخراجات، بیمہ فنڈ، جیل خانے، برقی روشنی، طباعت وغیرہ	۵۳٬۲۷٬۰۰۰
زراعت و علاج حیوانات	۹٬۹۶٬۰۰۰
میزان	۸٬۰۱٬۹۱٬۰۰۰

حکومت ہند کے ذرائع آمدنی پر تنقیدی تبصرہ

ذرائع آمدنی:۔ کروڑگیری، نمک، مالگزاری۔

خرچ کی مدیں:۔ فوج، قومی تعمیری محکمہ جات، پولیس، سیاسیات

موجودہ زمانہ میں مرکزی حکومت ہند کا اہم ترین ذریعہ آمدنی کروڑگیری ہے جو حقیقت میں بالواسطہ محصول ہے۔ یہ آمدی و برآمدی مال پر محصول نہ صرف آمدنی کی خاطر عائد کیا جاتا ہے بلکہ ملکی صنعتوں کی حفاظت کے

لئے بھی۔ ابتدا میں آزاد تجارت کے بہلنے برطانوی حکومت ہند نے ہندوستانی صنعت و حرفت کو تباہ ہونے دیا مگر بعد میں آمدنی حاصل کرنے کی نیت سے درآمدی اشیاء پر محصول عائد کرنا شروع کیا چنانچہ ۱۸۹۴ء سے جنگ عظیم کے آغاز تک آمدنی حاصل کرنے کی غرض سے درآمدی اشیاء پر ۵ فی صدی محصول عاید کیا جاتا تھا۔ پارچہ جات پر البتہ صرف ۳½ فی صدی درآمدی محصول عائد کیا گیا۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں پر بہت زیادہ بار نہ پڑے۔ مگر اس بار کو بھی انگریزی سرمایہ دار گوارا نہ کر سکے اور انھوں نے خیال کیا کہ اس ۳½ فی صدی درآمدی محصول سے ہندوستانی کارخانوں کو مقابلے کا بہت اچھا موقع ملے گا اور اس کی وجہ سے ان کے مال کی نکاسی کم ہو گئی چنانچہ ان کا پر زور مطالبہ ہوا کہ درآمدی محصول سے کپڑوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے مگر حکومت کو آمدنی کی ضرورت تھی اور وہ اس ذریعہ آمدنی سے خود کو محروم نہیں کر سکتی تھی لہذا برطانوی حکومت کے دباؤ اور انگریزی سرمایہ داروں اور مالکان کارخانہ جات کے پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر حکومت ہند نے انگریزی مصنوعات کی حفاظت کے لئے ایک عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا جو اس امر کا بدیہی ثبوت پیش کرتا ہے کہ حکومت ہند اہل ہند کی حفاظت نہیں کرتی اور ہندوستان کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر نہیں رکھتی بلکہ اس کا رہبر ستارہ guiding star انگلستان اور اہل انگلستان کی فلاح و بہبودی ہے۔ وہ عجیب و غریب طریقہ یہ تھا کہ حکومت ہند نے ہندوستانی پارچہ جات پر بھی جو اندرون ملک تیار کئے جاتے تھے مثل بیرونی پارچہ جات کے ۳½ فی صدی کا محصول عائد کرنا شروع کیا۔ انگلستان کے کارخانوں کے مالکوں کو اطمینان ہوا، حکومت ہند کو توقع سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کا موقع ملا مگر ہندوستانی کارخانوں پر ۳½ فی صدی محصول کا مزید بار پڑا۔ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی کپڑے پر محصول عائد کرنے کی وجہ لنکاشائر کی حفاظت تھی۔ سیاسی اقتدار کو اس قدر تنگ نظری سے اور اس قدر بدیہی ناانصافی سے ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا اور بڑے بڑے وعدوں کے باوجود ہندوستانی صنعت و حرفت کو انگریزی صنعت و سرمایہ داری پر بھینٹ چڑھا دینا ہندوستانیوں کے لئے اس امر کا بین ثبوت تھا کہ وہ غیر قوم کے باشندوں کے ہاتھوں کیا توقع کر سکتے ہیں! دوران جنگ میں مالی دقتوں کی وجہ سے پریشان ہو کر حکومت نے درآمدی محصول کی شرح بڑھا کر دس فی صدی کر دی جنگ عظیم کے بعد بھی ہندوستانی اقتصادی جنگ اور اندرونی سیاسی بدامنی و بے چینی کی وجہ سے سرکار کو جب اور زیادہ آمدنی

کی ضرورت پڑی تو درآمدی شرح محصول گیارہ فی صدی کردی گئی۔

موجودہ زمانے میں کروڑگیری کا دستور یہ ہے کہ ایک طرف تو بعض اشیاء کی مفت درآمد کی جاسکتی ہے مثلاً غلہ، زرعی آلات، مطبوعہ کتب اور دوسری طرف بعض مخرب صحت و اخلاق ناپسندیدہ اشیاء کی درآمد کو حتی الامکان کم کرنے کے لئے اعلیٰ ترین شرح محصول عائد کی جاتی ہے جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ ناپسندیدہ اشیاء کا استعمال بھی کم سے کم ہو اور اس سے سرکار کو زیادہ سے زیادہ آمدنی وصول ہو۔ ان اشیاء کی درآمد کی یکلخت ممانعت میں یہ خطرہ مضمر ہوتا ہے کہ ان کا استعمال کسی نہ کسی طرح ہوتا رہے گا۔ ناجائز طور پر درآمد ہوا کرے گی۔ رشوت ستانی بڑھے گی لوگ کسی نہ کسی طرح یہ اشیاء حاصل کر ہی لیں گے اور سرکار کو خواہ مخواہ مالی نقصان ہوگا۔ اس قسم کے محصول کو انگریزی میں (punitive tariff) کہتے ہیں جسے ہم اردو میں "امتناعی محصول" کہہ سکتے ہیں۔ امتناعی محصول تعیشات کی چیزوں پر عاید کیا جاتا ہے مثلاً سگریٹ، شراب وغیرہ۔

درآمدی محصول کی تیسری قسم حفاظتی محصول ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ محصول رائج ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے اس محصول کی غرض و غایت ملکی مصنوعات کی سرپرستی اور ملکی صنعت کی حفاظت ہے۔ برطانوی حکومت ہند نے ہندوستانی صنعت کی حفاظت کے لئے بیرونی اشیاء پر حفاظتی محصول عائد کرنا متعدد سیاسی دقتوں کے بعد قبول کیا ہے تاہم انگریزی صنعت کی حفاظت کے لئے بھی اس نے کافی اہتمام کیا ہے۔ فی الحال حفاظت صرف دیاسلائی، پارچہ جات، اور لوہے کی کی جاتی ہے، آہنی اور فولادی اشیاء پر بالعموم ۱۷ فی صدی اور پندرہ روپے فی ٹن اور کپڑوں پر ۲۰ فی صدی محصول عائد کیا جاتا ہے[1]۔

حفاظت محصول کے متعلق ہندوستانی صنعت کو شکایت	

حفاظتی محصول کے متعلق ہندوستانی صنعتوں کو گوناگوں شکایتیں ہیں۔ ان شکایتوں کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے اور ہر صنعت کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر حکومت سے صنعتوں کی حفاظت کے متعلق سفارش کرنے کے لئے حکومت نے ۱۹۲۳ء میں ٹیرف بورڈ "Tariff

---

[1] جزوی تفصیل کے لئے دیکھئے Statistical abstract for British India برائے ۱۹۲۲ تا ۱۹۳۰-۳۱ء مطبوعہ گورنمنٹ پریس کلکتہ ۱۹۳۱ء صفحات (۶۶۲ تا ۶۷۰)

Board قائم کیا۔ اس بورڈ کی طرف سے متعدد صنعتوں کے متعلق تحقیق ہو چکی ہے اور اس بورڈ نے اپنے مکمل
و بیانات و سفارشات کو متعدد ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع بھی کیا ہے[4]۔ اور کئی صنعتوں کی حفاظت کا مشورہ
بت کو دیا بھی ہے مگر ابھی تک اس پر عمل ہونا شروع نہیں ہوا۔ اور نہ مستقبل قریب میں مزید صنعتوں کی حفاظت
امید ہے۔

شاہی ترجیح کا اثر حفاظتی محصول پر

جب سے ہندوستانی حکومت نے ہندوستانی صنعتوں کی ظاہری حفاظت کا ذمہ لیا ہے اسی وقت سے انگریزی صنعت کی حتی المقدور امداد کرنے کی غرض سے حکومت ہند نے انگریزی مصنوعات رعایتی محصول عائد کرنا شروع کیا ہے یعنی یہ کہ ہندوستانی صنعت و حرفت کی حفاظت کے باوجود امریکی، جاپانی انی، فرانسیسی، اطالوی اور دیگر ممالک کی صنعت پر برطانوی صنعت کو ترجیح دی جاتی ہے لہٰذا "حفاظتی" محصول شرح کم کردی جاتی ہے اگر درآمدی مال برطانوی ہو۔ اسی کو اصطلاحاً "شاہی ترجیح" "Imperial preference" کہتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں بھی ملکی صنعت کی حفاظت کے لئے اگرچہ آہنی فولادی اشیاء پر حفاظتی محصول عائد کیا جاتا ہے مگر شاہی ترجیح کی بنا پر اس محصول میں بشرطیکہ آہنی و فولادی نیاء انگریزی ہوں نمایاں کمی کردی جاتی ہے مثلاً بجائے ۱۷ فی صدی اور پندرہ روپے فی ٹن محصول عائد کرنے کے صرف ۱۷ فی صدی محصول عائد کیا جاتا ہے۔ گویا پندرہ روپے فی ٹن کی رعایت صرف انگریزی مال کے لئے کی جاتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس رعایت سے حفاظتی محصول کا اثر کم ہو جاتا ہے بالخصوص اس لئے کہ مثل دیگر اشیاء کے ہندوستان کا سب سے زیادہ زبردست حریف اور اہم ترین مقابل انگلستان ہی ہے جس قدر لوہے اور فولاد کا سامان بیرونی ممالک سے درآمد ہوتا ہے اس کے نصف سے زیادہ انگلستان سے آتا ہے[5]۔ لہٰذا ہندوستانی صنعت کی حفاظت کے سلسلہ میں ہندوستان کے اہم ترین مقابل سے رعایت کرنا حفاظت کی غرض و غایت کو غائب کرنا ہے۔

۴۔ دیاسلائی، لوہا، اور فولاد، روئی اور پارچہ جات، کے متعلق ہی بیس جلدیں اس بورڈ کی طرف سے شائع کی گئی ہیں، ان کے علاوہ اور صنعتوں کے متعلق تحقیق ہو چکی ہے۔

۵ دیکھئے "Statistical Abstract" صفحہ ۵۵۷

شرح مبادلہ کا اثر حفاظتی محصول پر اسی ضمن میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ شرح مبادلہ بھی ایسی متعین کی گئی ہے جس سے ہندوستانی صنعت کا نقصان اور برطانوی صنعت کا فائدہ ہے۔ ہندوستانی اساتذہ معاشیات ہندوستانی مالکان کارخانہ جات، اور ہندوستانی قوم پرستوں اور رہبروں کی اکثریت کا مطالبہ ہے کہ شرح مبادلہ بجائے ایک شلنگ چھ پنیس فی روپیہ کے ایک شلنگ چار پنیس فی روپیہ ہونی چاہئیے۔ حکومت نے شرح ایک شلنگ چھ پنیس مقرر کی ہے جس سے ہندوستانی صنعت کو بلکہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کو بھی نقصان ہو رہا ہے۔

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ مبادلات خارجیہ یعنی بیرونی ممالک سے تجارتی معاملات کے لئے ذریعہ مبادلہ پونڈ ہے یعنی یہ کہ پونڈ کے ذریعہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ایک شلنگ ۴ پنیس فی روپیہ کے حساب سے ایک پونڈ کی قیمت پندرہ روپے ہوتی ہے اور ایک شلنگ ۶ پنیس فی روپے کے حساب تیرہ روپے ۵ آنے ۴ پائی۔ موجودہ زمانے میں پونڈ کا نرخ سرکاری طور پر فی روپیہ ایک شلنگ ۶ پنیس معین ہے، لہذا جب ہندوستان سے مال منگوایا جاتا ہے جو زیادہ تر خام پیداوار کی شکل میں ہوتا ہے ہندوستانیوں کو ایک پونڈ کے عوض ۱۳ روپے ۵ آنے ۴ پائی ملتے ہیں۔ اگر شرح مبادلہ فی روپیہ ا شلنگ ۴ پنیس ہوتی تو پندرہ روپے ملتے۔ بالفاظ دیگر برآمد کرتے وقت ہندوستان کو فی پونڈ محض شرح مبادلہ کے ناموافق ہونے کی وجہ سے ایک روپیہ ۱۰ آنے ۸ پائی کا نقصان ہوتا ہے اس طرح ہندوستانی زراعت کو یعنی ہندوستان کی تقریباً ۷۵ آبادی کو کثیر نقصان ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس معینہ نرخ کی وجہ سے انگلستان اور دیگر ممالک سے مال درآمد کرنے وقت ہمیں فی پونڈ ۱۳ روپے ۵ آنے ۴ پائی ادا کرنے پڑتے ہیں اگر شرح مبادلہ فی روپیہ ایک شلنگ ۴ پنیس ہوتی تو ہمیں ظاہر ہے کہ بجائے تیرہ روپے ۵ آنے ۴ پائی کے پندرہ روپے ادا کرنے پڑتے۔ بالفاظ دیگر فی پونڈ ۱ روپیہ ۱۰ آنے ۸ پائی زائد دینے پڑتے صرف تجارت پیشہ لوگوں کا اس معینہ شرح مبادلہ میں کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ جس بھاؤ سے خریدتے ہیں اسی سے بیچتے ہیں مگر ہندوستانی صنعت و مالکان کارخانہ جات کا اس شرح مبادلہ سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔

پہلا نقصان تو یہ ہے کہ ہندوستان کی برآمد درآمد سے بڑھی رہتی ہے۔ ہندوستانی تجارت کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی برآمد اکثر زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت درآمد کے یعنی ہندوستان کو جو رقم ادا کرنی ہوتی ہے اس سے زیادہ وصول طلب ہوتی ہے۔ اوسطاً ہندوستان کو ۴۲ کروڑ سالانہ وصول طلب ہوتے ہیں مگر چونکہ

تقریباً اتنی ہی رقم مطالبات ولایت کی مد میں ہندوستان کو ادا کرنی ہوتی ہے لہذا یہ "وصول طلب" رقم کبھی حقیقت میں وصول نہیں کی جاتی بلکہ یہ رقم مطالبات وطن کے سلسلہ میں خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ بہرحال ہماری برآمد کی قیمت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت درآمد کے۔ اور جیسا کہ ہم نے ثابت کیا ہے برآمد کرتے وقت موجودہ شرح مبادلہ (عہ؍ = ۱۸ پنیں) کی وجہ سے ہندوستانیوں کو فی پونڈ عصہ ۱۰ آنہ ۸ پائی کا نقصان برآمد کرتے وقت عہ؍ ۱۰ آنے ۸ پائی کا فائدہ ہوتا ہے۔ چونکہ ہندوستان کی برآمد درآمد سے زیادہ ہے لہذا ظاہر ہے کہ نقصان زیادہ اور فائدہ کم ہے[1]

دوسرے نقصان کی اہمیت کا اس وقت اندازہ ہو سکتا ہے جب کہ ہم ہندوستان کی معاشی صورت حال کو پیش نظر رکھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ایک مفلس ملک ہے جس کے افلاس کے متعدد اسباب ہیں سب سے زیادہ اہم "بے روزگاری" ہے۔ بے روزگاری کو دور کرنے کے لئے احیا اور تجدید صنعت لازمی ہے۔ یعنی یہ کہ جب تک ہندوستان کی مردہ صنعتوں کو از سر نو جلایا نہ جائے گا اور نیم مردہ صنعتوں میں نئی جان ڈال کر ان کی حالت درست نہ کی جائے گی ہندوستان کبھی صنعتی ترقی نہ کر سکے گا۔ اس ترقی کو حاصل کرنے کے لئے نہ صرف عوام کی سرپرستی ضروری ہے بلکہ نوخیز صنعتوں کے پنپنے کے لئے اور نیم مردہ صنعتوں کے زندہ رہنے کے لئے تامین تجارت لازمی ہے یعنی یہ کہ صنعتی ترقی کے لئے لابدی ہے کہ حکومت بیرونی ممالک کی اشیا پر حفاظتی محصول عائد کرے تاکہ کم از کم ملکی بازاروں میں ملکی مال بیرونی مصنوعات کا مقابلہ کر سکے۔ بغیر اس حفاظتی محصول کے یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان کی نئی صنعتیں بیرونی ممالک کا مقابلہ کر سکیں۔ ملکی صنعت کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ بیرونی مال زیادہ سے

---

[1] اس کا جواب بالجواب یہ دیا جاتا ہے کہ مطالبات ولایت کے ضمن میں جو کثیر رقم ادا کرنی پڑتی ہے اس کی ادائی کے وقت بھی بحساب فی پونڈ عصہ؍ ۱۰ آنے ۸ پائی کی "بچت" ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ظاہری "فائدہ" کو ملحوظ رکھنے کے باوجود بھی نقصان زیادہ اور فائدہ کم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کی دانست میں جو سرے سے "مطالبات ولایت" کو ہندوستانی دولت کو کھینچ لیجانے (drain) سے تعبیر کرتے ہیں، ادائی مطالبات ولایت میں شرح مبادلہ کا فائدہ قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔

زیادہ قیمت پر فروخت ہو اس لئے شرح مبادلہ اگر ایک شلنگ ۴ پنیں فی روپیہ ہوتی تو انگلستان کا صنعتی مال جس کی قیمت ایک پاونڈ ہو یہاں ۱۵؍ کا ہوتا مگر اب شرح مبادلہ ایک شلنگ چھ پنیں فی روپیہ ہونے کی وجہ سے ہی ایک پاونڈ کا مال یہاں تیرہ روپے ۵ آنہ ۴ پائی کا ہوتا ہے۔ اسی نرخ کی وجہ سے انگریزی صنعت کو ہندوستانی صنعت کا مقابلہ کرنے میں بہت آسانی ہوتی ہے کیونکہ وہ یہاں ارزاں قیمت پر فروخت ہو سکتا ہے۔

اصول تامین تجارت (جس کے تحت بیرونی اشیاء پر حفاظتی محصول عائد کیا جاتا ہے) کا یہ منشا ہے کہ بیرونی مصنوعات زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت ہوں اور بوجہ گرانی بیرونی مال کی نکاسی کم ہو اور بجائے اس کے دیسی مال کو بیرونی صنعت کا مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔

شرح مبادلہ کے اثرات بخوبی معلوم کرنے کے بعد اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستانی صنعت و حرفت کی کس قدر سرپرستی اور حفاظت کی جا رہی ہے۔ ایک طرف تو سیاسی شور کو کم کرنے کے لئے حفاظتی محصول عائد کر کے ظاہری طور پر ہندوستان پر احسان عظیم کیا گیا ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ کی اکثریت چونکہ معاشی مسائل حاضرہ کی پیچیدگیوں سے ناواقف ہے وہ تو مطمئن کر دی گئی مگر شاہی ترجیح کی بناء پر اور ہندوستانیوں کے حق میں ناموافق شرح مبادلہ مقرر کر کے حکومت ہند نے انگلستان کو میدان کارزار کا سب سے زیادہ طاقتور مرد میداں بنا دیا۔ حکومت کو اس دو رخی پالیسی سے دو چند فائدہ حاصل ہوا اور اس نے وہ کام کیا جو توپ اور بندوق، گولہ و بارود نہیں کر سکتے تھے، پڑھے لکھے معاشی مسائل سے بے خبر و ناواقف حضرات کو خوش کر دیا۔ سیاسی آگ دھیمی پڑ گئی، بغاوت کے شعلے دب گئے، مگر برطانوی صنعتی ترقی کی بنیاد قائم و سالم رہی۔ کیونکہ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوا کہ شاہی ترجیح کا اصول تامین تجارت کے سراسر منافی ہے لہذا ہندوستان میں حقیقی حفاظت معدوم[1] ہے یہ حفاظتی محصول حقیقت میں بچوں کا دل بہلاؤ اور ضعیف الاعتقاد

---

[1] اس حفاظتی محصول کا اثر ریلوں کی شرح نقل و حمل کی وجہ سے اور بھی زائل ہو جاتا ہے۔ ابتدا ہی سے ریلوں کا یہ دستور رہا ہے اور اب تک ہے کہ ساحلی مقامات سے مال لانے یا وہاں تک لیجانے کی شرح کم رکھی ہے بہ نسبت اندرون ملک کی شرح نقل و حمل کے۔ اس کی حقیقی وجہ یہی کہ بیرونی مالکان کارخانہ جات کو خام پیداوار لیجانے اور مصنوعات اندرون ملک بھجوانے میں آسانی اور ارزانی ہو۔ مالیات ہند کے مضمون میں اس موضوع پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہم آئندہ فرصت کے موقع پر ریلوں کے موضوع پر اسی قسم کا تفصیلی

یوں کا دل خوش کن تصور ہے۔

مالگزاری

صوبجاتی حکومتوں کا اہم ترین ذریعہ آمدنی وہ مالگزاری ہے جو حکومت زراعتی زمینوں سے وصول کرتی ہے سرکاری عہدہ دار، حکومت کے خوشامدی غرض مند، اور سب سے بڑھ کر سرکار کے پیشہ ور مداح کہتے ہیں کہ تمام زمین سرکاری ملک ہے۔ زمانۂ قدیم سے زمین کا مالک حاکم وقت رہا ہے ملک کا بادشاہ "بھوم پتی" اور "انداتا" ہے ہمیشہ سے زمین بادشاہ کی رہی ہے لہذا موجودہ زمانے میں بھی تمام زمین کا مالک ہندوستان کا شہنشاہ ہے! لہذا بحیثیت مالک زمین کے زمین کی پیداوار کا کچھ حصہ یقیناً اسے بھی ملنا چاہیئے۔ اور حقیقت میں یہی حق مالکانہ ہے جو حکومت زمیندار یا کاشتکار سے وصول کرتی ہے۔ یہ رقم صرف زمین استعمال کرنے کا معاوضہ ہے اور جس طرح کرایہ دار مالک مکان کو مکان استعمال کرنے کا معاوضہ دیتا ہے اسی طرح ہندوستانی رعیت یا زمیندار کو مالگزاری ادا کرنی چاہیئے گویا سرکاری نقطۂ نظر سے مالگزاری حق مالکانہ ہے۔

حکومت کے "بہی خواہ" اور "ہماری سرکار" کے اطاعت گذار نظری محققین معاشیات مالگزاری کو جائز اور بجا ثابت کرنے کے لئے یہ مزید استدلال پیش کرتے ہیں کہ جو مالگزاری ہندوستان سے حاصل کی جاتی ہے وہ حقیقت میں معاشی لگان ہے اور باوجود مالک زمین ہونے کے حکومت صرف اسی قدر حصہ پیداوار لیتی ہے جو مفت عطیہ قدرت ہے، یہ حکومت کی رعایا پروری کا بین ثبوت ہے جس کے لئے ہر کسان کو حکومت کا بدل وجان ممنون و احسانمند ہونا چاہیئے۔

یہ خیال کہ زر مالگزاری حقیقت میں معاشی لگان ہے صریحاً غلط ہے محض اس لئے کہ معاشی لگان کا ہر کھیت سے اور ہمیشہ پیدا ہونا ضروری نہیں، مگر مالگزاری تمام کھیتوں سے وصول کی جاتی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ معاشی لگان میں برابر اضافہ ہوتا رہے، مگر مالگزاری میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ

ایک مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں انشاءاللہ ان امور کی کافی وضاحت سے تشریح و تنقید کی جائے گی۔

اہلکاران اور عہدہ داران بندوبست اپنی کارگزاری اور قابلیت دکھانے میں اور اپنے سے بالاتر عہدہ داروں کو خوش کرنے میں اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب کہ زرمالگزاری میں بجائے تخفیف کے اضافہ کریں لہذا اہلکاران وعہدہ داران بندوبست ہی زرمالگزاری کو ایک قسم کا محصول سمجھ کر ہر میعاد کے ختم ہونے پر زرمالگزاری میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی بہت بڑی کثرت (overwhelming majority) معاشی لگان کی نوعیت سے ناواقف ہے۔ وہ جانتے نہیں کہ معاشی لگان کے یقین کرنے میں کن اسباب کا ملحوظ رکھنا قطعی طور پر ضروری ہے۔ اگر کسان زیادہ کھاد کا استعمال کرتا ہے، پختہ باؤلی بناتا ہے، بہتر قسم کا تخم ڈالتا ہے بہتر نگرانی کرتا ہے، اور اس طرح زیادہ پیداوار حاصل کرتا ہے تو میعاد ختم ہونے پر محکمہ بندوبست کی طرف سے "لگان" میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مزید پیداوار "معاشی لگان" ہے۔ حالانکہ یہ مزید پیداوار اس کی محنت، کارکردگی، اور تنظیم کا نتیجہ ہے۔ معاشی لگان مقرر کرنے کے لئے قوانین تکثیر، استقرار اور تقلیل حاصل کا بخوبی جاننا اور قدرتی زرخیزی زمین اور قرب بازار کو ملحوظ رکھنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ اجناس کی قیمتوں سے واقفیت لازمی ہے جس شخص کو یہ نظری معلومات حاصل نہ ہوں وہ کسی طرح "معاشی لگان" کا صحیح اندازہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور یہ خیال کرنا کہ تمام عہدہ داران اور اہلکاران بندوبست ان امور سے کما حقہٗ واقف ہیں اور نہ صرف واقف کار ہیں بلکہ دیانت کے مجسمے ہیں انتہائی غلطی و نادانی ہے۔ میرا اندازہ تو یہ ہے کہ بندوبست کے عہدہ داروں اور اہلکاروں میں ایک فی صدی سے زیادہ "معاشی لگان" کی نوعیت سے واقف نہیں اور بمشکل ہزاروں میں ایک ایسا ہوتا ہے جسے اس بات کا علم ہو کہ معاشی لگان متعین کرتے وقت کن خاص امور کا لحاظ ضروری ہے۔ جس کسی کو شبہ ہو وہ اپنے قیاس پر گمان نہ کرے بلکہ کسی تحصیلداری سے دریافت کرے تو حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ صوبجات متحدہ آگرہ واودھ کے ایک تحصیلدار سے میں نے باتوں باتوں میں "معاشی لگان" کا مفہوم دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ "معاشی لگان تو وہ رقم ہے جو کاشتکار زمیندار کو یا زمیندار حکومت کو ادا کرتا ہے اور جہاں رعیت واری طریق رائج ہے وہاں کاشتکار ہی حکومت کو ادا کرتا ہے!" ریاست حیدرآباد کے ایک تحصیلدار سے ایک اور موقع پر میں نے دریافت کیا تو انھوں

نے کہا۔ "کالج کے زمانے میں تو مجھے معاشی لگان کا مفہوم اچھی طرح معلوم تھا۔ معاشیات کے ہر پرچہ میں معاشی لگان کے متعلق سوال کیا جاتا تھا اب کسے یاد ہے؟"

غرض تمام زر مالگزاری کو معاشی لگان تصور کرنا اصولاً سخت غلطی ہے۔ اب سوال کا صرف یہ جزو جواب طلب رہ گیا ہے کہ حکومت ہندوستان کی زمین کی مالک ہونے کی حیثیت سے جو رقم وصول کرتی ہے آیا وہ حق مالکانہ ہے یا نہیں۔ میں اس تفصیلی بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ صرف ایک دو حوالے دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گراں بہا تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> "یہ نظریہ کہ قدیم زمانے سے ہر وقت یا سلطنت کی حقیقی مالک ہے
> کوئی اصلیت نہیں رکھتا بلکہ بعد کی ایجاد ہے تاکہ زرعی دولت پیدا کرنے والوں[۱]
> کا خون چوسنے کو جائز قرار دے سکیں۔"

اس میں مطلق شک نہیں کہ برطانوی حکومت ہند زمین کی قطعی ملکیت کی دعویدار رہی۔ مگر حقیقت میں زمین کی مالک نہیں۔ کیونکہ کاشتکاروں اور زمینداروں کا بھی ہندوستان کی زمین پر قبضہ ہے اور بلا وجہ وہ کسی طرح بے دخل نہیں کئے جا سکتے۔ کیا ہندوستانی کاشتکار سرکاری زمین پر کاشت اسی طرح کرتا ہے جس طرح کرایہ دار مکان میں رہتا ہے؟ جس طرح کرایہ دار کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسروں کے مکان کو بیع، رہن یا مکفول کرے یا یہ کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے رشتہ داروں میں کرایہ کے مکان کا بٹوارہ ہو گیا اسی طرح کاشتکار یا زمیندار حق مالکانہ سے محروم ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حقوق کاشتکاروں اور زمینداروں کو "سرکاری" زمین پر ہیں اس کے عشر عشیر بھی حقوق کرایہ دار کو کرایہ کے گھر پر حاصل نہیں۔ غرض زمین کی قطعی ملکیت

---

[۱] Die Agrarverfassung Britisch-Indien از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ناشر Paul Parey مطبوعہ برلن ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۳۱

کا دعویٰ نہ صرف مہمل اور لایعنی بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ اگر حکومت کو صرف احساس ملکیت سے خوشی ہوتی ہے تو زمین ہی پر کیا منحصر ہے اس کو چاہئیے کہ زمین و آسمان کی ملکیت کی دعویدار ہو اور نہ صرف چاند سورج کو بلکہ تمام کائنات کو اپنی ملکیت تصور کرے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زمین کی قطعی ملکیت کی دعویدار ہونے والی حکومت زمین کی تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کو بھی نہیں روک سکتی۔ زرعی زمینوں کی تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کی وجہ سے زراعت کو کثیر نقصان ہو رہا ہے مگر حکومت کچھ مداخلت نہیں کرتی کیونکہ وہ مداخلت نہیں کر سکتی محض اس لئے کہ "حکومت کی زمین" پر رعیت کا قبضہ ہے۔ حکومت کی ملکیت افسانہ ہے رعیت کا قبضہ واقعہ ہے مگر حکومت اس افسانہ کو قائم رکھے ہوئے ہے تاکہ "حق مالکانہ" اور "معاشی لگان" کے بہانے رعیت سے ان کی پیداوار کا ایک حصہ لینے میں آسانی ہو۔

اگر زر مالگزاری نہ حق مالکانہ ہے اور نہ معاشی لگان تو آخر ہے کیا؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ محصول یا ٹیکس ہے کیونکہ یہ حکومت محض اپنے سیاسی اقتدار کی وجہ سے وصول کرتی ہے اور رعیت کو مجبوراً ادا کرنا پڑتا ہے[1] چنانچہ طرق ہائے بند وبست کے مشہور محقق اور مستند ماہر "بیڈن پاؤل" کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ مالگزاری کسی طرح لگان نہیں قرار پا سکتی۔ حتیٰ کہ رعیت واری حلقوں میں بھی نہیں بلکہ ان کی رائے میں یہ مطالبہ زرعی آمدنی پر محصول ہے نہ کہ لگان کا کوئی جزو[2]۔

ان سب ماہرین کی تحقیق اور ہندوستانی مدبروں اور قومی رہبروں کی متفقہ رائے کے خلاف حکومت سرکاری طور پر اسی نظریہ پر قائم ہے کہ زمین کی ملکیت سرکاری ہے، زر مالگزاری حق مالکانہ ہے، ہندوستانی

---

[1] ۔ واضح رہے کہ مالگزاری کو محصول سمجھنے میں ۹۹ فیصدی ہندوستانی محققین معاشیات و ماہرین مالیات کو اتفاق ہے تمام معاشیاتی کتابوں میں جن میں علمی آزادی کا لحاظ کیا جاتا ہے اور گورنمنٹ کی چاپلوسی مد نظر نہیں ہوتی کھلم کھلا بیان کر دیا جاتا ہے کہ تمام زر مالگزاری حقیقت میں محصول ہے۔ مثلاً دیکھئے۔ جاتھر اور بیری کی مشترکہ تصنیف "Indian Economics" مطبوعہ تاراپور والا بمبئی ۱۹۲۸ء صفحہ ۱۳۴ تا ۱۴۲

[2] ۔ دیکھئے۔ "Indian Economics" از بنرجی صفحہ ۲۸۱ مطبوعہ میکملن

کسان، ہندوستانی رعیت اور ہندوستانی زرعی آبادی برطانوی امن و امان سے مستفید و مستفیض ہو رہی ہے، چین و راحت، سکون و اطمینان سے تحصیل دولت میں مصروف ہے مگر سرکاری خدمت کا کچھ بھی معاوضہ نہیں دیتی (زر مالگزاری تو ظاہر ہے سرکار کی دانست میں حق مالکانہ ہے) لہذا حکومت نے نمک پر محصول عائد کر رکھا ہے جس سے ان دنوں سرکار کو سالانہ ۷ کروڑ کی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔

نمک کا محصول

جس جوش کے ساتھ قانون نمک کی خلاف ورزی گذشتہ چند سالوں میں کی گئی ہے اور جو اہمیت نمک کے محصول کو سیاست حاضرہ میں داخل ہے۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے قائد اعظم نے اپنے چودہ مطالبات کے سلسلے میں ایک مطالبہ یہ بھی کیا ہے کہ نمک پر محصول عائد نہ کیا جائے۔ جب سے مہاتما گاندھی نے سنہ ۱۹۳۰ء میں (۲۰۰) میل کا سفر پیادہ پا احمد آباد سے مغربی ساحل ہند کے ایک غیر معروف مقام ڈنڈی تک کیا اور وہاں پہنچکر قوانین وقت کی خلاف ورزی کی نمک کے مسئلہ کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ سیاست حاضرہ میں نمک کے محصول کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ بلا شبہ گاندھی جی کی تبلیغ کا اثر ہے مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خاص معاشئین کے گروہ میں یہ سوال ہمیشہ مابہ النزاع رہا ہے اور معاشی کتب میں ہمیشہ نمک کے محصول پر تفصیلی بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ نمک کے محصول کو جائز اور ضروری قرار دینے کے لئے برطانوی حکومت ہند کی طرف سے جو استدلال پیش کیا جاتا ہے وہ بہترین طور پر ان الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے جو "ڈیوک آف آرگیئل" نے بحیثیت وزیر ہند کے سنہ ۱۸۶۹ء میں استعمال کئے تھے۔ براہ راست محصول کے ذریعہ عوام تک رسائی کسی ملک میں بھی محال ہے۔ اگر سرکاری اخراجات کے لئے عوام کو کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہیئے تو یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ محصول ایسی چیز پر عائد کیا جائے جو عام طور پر استعمال ہوتی ہو۔ اگر اس قسم کے محصول انصافاً متعین کئے جائیں تو کثیر آمدنی حاصل کی جاسکے گی۔ اس طرح پر نہ صرف لوگوں کو اس محصول کا کم احساس ہوگا بلکہ بمقابلہ کسی دوسرے طریق کے لوگوں پر اس محصول کا حقیقی بار کم ہوگا تاہم اس امر کا لحاظ رکھنا حکومت کا فریضہ ہے کہ ضروری مصارف کا جزو غالب بن کر کے اس قسم کے

محصول کا بار غربا پر بہت بےجا طور پر نہ پڑے۔

یہ خیال کہ ہندوستان کی کثیر خلقت پر سرکاری اخراجات کا مطلق بار نہیں گو اراکتی اس غلطی پر مبنی ہے کہ مالگزاری محصول نہیں بلکہ معاشی لگان یا حق مالکانہ ہے محض اسی اصولی غلطی کی وجہ سے ہندوستان پر نمک کے محصول کا بےجا بار ڈالا جا رہا ہے۔ حکومت ہند اپنے رویہ کو جائز قرار دینے کے لئے گذشتہ زمانوں کا حوالہ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اُس زمانے میں بھی حکومت نمک پر محصول عائد کرتی تھی یہ مانا کہ گذشتہ زمانوں میں نمک پر محصول عائد کیا جاتا تھا مگر چونکہ نمک بنانے میں کبھی اس قدر سختی نہیں برتی جاتی تھی جیسے کہ ان دنوں برتی جاتی ہے[1] اور نہ نمک قطعی طور پر سرکاری اجارہ تھا) مگر محض اسی لئے نمک کے محصول کو برقرار رکھنا صحیح نہیں ہو سکتا تھا گذشتہ زمانوں میں ستی کی رسم جائز تھی، غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت اخلاقاً اور قانوناً جائز تھی محض گذشتہ زمانے کا حوالہ دے کر موجودہ زمانے کی غلط کاریوں کو جائز قرار دینا حکومت کی سب سے بڑی دھاندلی ہے۔

نمک کا محصول اس لئے برا ہے کہ نمک پر محصول عائد کر کے حکومت غریبوں، فقیروں، اور بیواؤں سے محصول لے رہی ہے اور ان پر بھی ٹیکس کا بار ڈال رہی ہے اور جو خود گردش روزگار کی وجہ سے پسے جا رہے ہیں ہندوستانی کسانوں سے اس طرح دگنا محصول لیا جا رہا ہے ایک تو زمین پر زر مالگزاری عائد کر کے اور دوسرے نمک کے ذریعے ہندوستانی آبادی پر محصول کا بار ہندوستان کی غربت کی ایک اہم وجہ ہے۔

حکومت ہند کے ذرائع آمدنی پر تنقید کرنے سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ حکومت وقت کی مالیاتی پولیسی میں ہمیں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی حکومت ہند نے جب سے آمدنی پر محصول عائد کرنا شروع کیا ہے اور خصوصاً متزائد شرح پر محصول لینا شروع کیا ہے اس وقت سے ہندوستان کے امیروں کو بھی سرکاری اخراجات کے بار کے متحمل ہونے پر مجبور کیا ہے۔ انصافاً ماننا پڑے گا کہ برطانوی حکومت سے قبل یا موجودہ

---

[1] اس سختی کی وجہ سے کس طرح سینکڑوں لوگ نفع بخش تجارت سے اور ہزاروں لوگ روزگار سے محروم ہو گئے اور کس طرح دیسی ریاستوں پر حکومت کی اس پالیسی کا برا اثر پڑا اس کے دیکھئے The Power of India از مسز یم ناشر P. Putnam بمقام نیویارک سنہ ۱۹۳۰ء بالخصوص صفحات ۷۹ تا ۸۳

زمانے کی بہت سی دیسی ریاستوں میں امیر اس بار سے "آزاد" تھے اور ہیں! مثلاً حیدر آباد میں انکم ٹیکس نہیں عائد کیا جاتا اور وہ لوگ بھی جو لکھوکھا روپے سالانہ کماتے ہیں سرکار کو براہ راست ایک پیسہ بھی بطور محصول نہیں دیتے۔ مگر برطانوی حکومت ہند میں حکومت کی پالیسی چونکہ زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی رہی ہے لہذا حکومت نے ان امیروں کو بھی اخراجات عامہ کے بار کا متحمل ہونے پر مجبور کیا ہے تاہم حکومت کو چاہیئے کہ مالیات کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ٹیکس عائد کرے خصوصاً نمک کا محصول قطعی طور پر اٹھا دینا چاہیئے اور زرمالگزاری میں نمایاں تخفیف کرنی چاہیئے صاف ظاہر ہے کہ ان محصولوں کو منسوخ کرنے کی وجہ سے تخفیف ہوگی مگر اس تخفیف کا اثر قومی تعمیری محکمہ جات پر نہیں بلکہ ان محکموں پر پڑنا چاہیئے جن میں بے دریغ فضول خرچی ہورہی ہے ملک و قوم کا کروڑہا روپیہ فوج پر صرف ہورہا ہے۔ یہ فوج صرف حفاظت ملک کیلئے نہیں بلکہ دیسی حکومتوں اور ہمسایہ سلطنتوں کو مرعوب اور خائف کرنے کے لئے یا محض "سطوت" کے خاطر رکھی گئی ہے۔ لکھوکھا روپیہ بیجا "الاؤنس" اور بیکار انعامات دینے میں ضائع ہوجاتا ہے، خصوصاً محکمہ سیاسیات اور امور مذہبی پر بہت غیر ضروری اخراجات ہورہے ہیں تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں صرف اس حقیقت پر غور کیجئے کہ حکومت تعلیمات طبابت، زراعت اور صنعت پر بحیثیت مجموعی سالانہ صرف ۲۲ کروڑ صرف کرتی ہے اور تنہا فوج پر تقریباً ساٹھ کروڑ! مفت تعلیم اور جبری تعلیم کے لئے پیسہ طلب کیجئے تو سر رشتہ معلومات عامہ کے توسط سے اطلاع ملتی ہے کہ سرکاری تجوری خالی پڑی ہے اور آئندہ سال ہوانے میں بھی "بچت" نہیں کی جاسکتی۔ مگر لاٹ صاحب اگر دربار کرنا چاہیں یا حکومت کو تبدیل آب وہوا کی ضرورت ہو یعنی گرمیوں میں پہاڑی مقامات پر جانے کے لئے سرکار کو رقم کی ضرورت ہو اور اگر حکومت کی طرف سے پرتکلف دعوتیں دینا ضروری ہو تو سرکاری خزانے میں بہار آئی ہوئی ہوتی ہے۔ منہ مانگے ملتا ہے اور اگر نہیں بھی ہو تو قرض لے لیا جاتا ہے۔

مالیات ہند بھی عجیب وغریب باغ ہے، اس کے ایک حصہ پر ہمیشہ خزاں کے آثار نظر آتے ہیں اور ایک حصے میں ہمیشہ بہار رہتی ہے۔ کیا وہ بھی دن آئے گا کہ خزاں کے آثار دور ہوجائیں گے اور سارا باغ شاداب ہوگا؟

خواجہ میر درد

آپ کا نام خواجہ میر اور درد تخلص ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ خواجہ ناصر متخلص بہ عندلیب کے بڑے صاحبزادے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ آپنے علوم رسمیہ کی تکمیل اپنے والد بزرگوار سے اور کتب تصوف کی تحصیل اپنے زمانے کے سربرآوردہ علماء اور صوفیا کرام سے کی آپکے خاندان میں عرصے سے پیری مریدی کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ کچھ جاگیر بادشاہی معافی میں تھی اس لئے معاش کی طرف سے بے فکری تھی اور آپ اپنا وقت یاد الٰہی میں صرف کرتے تھے۔ اٹھائیس سال کی عمر میں مسند فقر پر قناعت کا تکیہ لگا کر بیٹھ گئے حالانکہ سودا، میر، سوز، مصحفی، جرأت، حسرت، انشاء وغیرہم جن کے دم سے دلی کی رونق تھی اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے لیکن آپ اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے سجادے پر اسی طرح جمے بیٹھے رہے اور پائے ثبات کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی آپ علم موسیقی کے بھی خوب ماہر تھے۔ بڑے بڑے گوئیے آپکے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اور استفادہ اور اصلاح کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ کسی کی تعریف میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ اسی وجہ سے غالباً میر صاحب نے آپ کو آدھا شاعر مانا ہے۔ ورنہ غزل گوئی میں تو آپ اپنے ہم عصروں سے ہرگز کم پایہ نہیں ہیں۔ آپنے چند کتابیں فارسی زبان میں تصنیف فرمائی ہیں اور فارسی اشعار بھی کہے ہیں مگر زیادہ تر رباعیات ہیں۔ آپنے ۱۱۹۹ھ میں انتقال فرمایا۔

آپکے شاگردوں کی تعداد کافی ہے اور شاگرد بھی ایسے ہیں جو استادی کا درجہ رکھتے ہیں۔ قائم چاندپوری آپ ہی کے شاگرد تھے اگرچہ بعد ازاں وہ اپنا کلام سودا کو دکھانے لگے تھے۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت کی تعریف میر تقی میر نے اپنی کتاب نکات الشعراء میں اس طرح کی ہے "ریختہ را بطرزی گوید۔ از وضع او بسیار محظوظم"۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق کو کون نہیں جانتا مشہور شاعر ہیں۔ اثر کے آپ چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے میر محمد علی عرف میر محمد بیدار بھی صاحب دیوان اور نہایت خوشگو شاعر تھے، مرزا محمد اسمٰعیل طپش اور محمد پناہ خاں نثار یہ سب آپ ہی کے شاگرد تھے۔

کلام پر تبصرہ

آپ کا دیوان پڑھ کر طبیعت بڑی محظوظ ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ از سر تا پا منتخب کلام طبع کرایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطبوع خلایق ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے آپ نے فحش اور رکیک اشعار نہیں کہے البتہ ہمارے زمانے کے اشخاص آپ کے دو چار شعروں کو رکیک کہہ سکتے ہیں لیکن ان کی رکاکت دیگر شعرار کے اشعار کے مقابلہ میں بہت ہی کم وزن پائی جائے گی آپ کے خاص مضامین حسب ذیل ہیں دنیا کی ناپائیداری، انسان کی زندگی کا آلام و مصائب سے پُر ہونا، خدا کے سوا اور چیزیں قابل توجہ نہیں، ہر شئے میں خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ فقر و استغنا وغیرہ۔

ولی سے لے کر داغ تک ہمارے شعرا نے اپنا اچھا برا کلام سب کچھ چھپوایا ہے اور مطلق اس طرف توجہ نہیں کی کہ صرف اچھے شعروں کو دیوان میں جگہ دی جائے مگر اس عام قاعدہ سے دیوان درد مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے نہیں معلوم آپ نے اپنے شعروں کا انتخاب کیا ہے یا اشعار ہی ایسے کہے ہیں جن میں انتخاب کی ضرورت نہیں ہوئی دونوں حالتوں میں بجائے خود یہ بات قابل تعریف ہے۔ جس غزل کو پڑھئے لطف آتا ہے اور سرسری طور پر پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس عہد کے دو مشہور اور نامور شاعر سودا اور میر تھے۔ اگر دونوں کی ہم طرح غزلوں کا آپ کی غزل سے موازنہ کیا جائے تو آپ کی شستہ بیانی اور بلند خیالی کی داد دینی پڑے گی۔ مقابلتًا اشعار چیدہ اور بلحاظ مضمون عمدہ معلوم ہوں گے حشو و زوائد سے پاک اور بھرتی کے اشعار سے کلام بالکل خالی ہے۔ ذیل میں ایک ایک طرح غزل تینوں استادوں کی درج کی جاتی ہے۔

درد

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا	ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں	آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ	وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

سودا عشق کی خلقت سے آگے میں ترا دیوانہ تھا — سنگ میں آتش تھی جب تو شمع میں پروانہ تھا

جزو کل میں غرق آشنا ہی فقط ہے اعتقاد — ورنہ جس خرمن کو دیکھا بالحقیقت دانہ تھا

اختلاط اہل آبادی سے دل آیا ہے تنگ — اے خوشا وقتے کہ تنہا ہم تھے اور ویرانہ تھا

اس چمن میں جب تلک ہم نشۂ ہستی میں تھے — عمر کا اپنی پر از خون جگر پیمانہ تھا

اک برہمن زادہ کل کہتا تھا یوں مل مل کے ہاتھ
ہم میں اور سودا میں یارو کس قدر یارانہ تھا

میر کل شب ہجراں بھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا — شام سے تا صبح دم بالیں پہ سر یکجا نہ تھا

شہرہ عالم اسی میں نے محبت سے کیا — ورنہ مجنوں ایک خاک افتادہ ویرانہ تھا

منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہمنشیں — اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا

اک نگاہ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں — وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

روز و شب گزرے ہے پیچ و تاب میں اپنے تجھے — اے دل صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا

جسکو دیکھا ہم نے اس وحشت کدے میں دہر کے — یا سڑی یا خبطی یا مجنون یا دیوانہ تھا

بعد خوں ریزی کے، مدت بے حنا رنگین رہا — ہاتھ اس کا جو میرے لوہو میں گستاخانہ تھا

غیر کے کہنے سے مارا ان نے ہم کو بے گناہ — یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

صبح ہوتے وہ بنا گوش آج یاد آیا مجھے — جو گرا دامن پہ آنسو گوہر یکدانہ تھا

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست — شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

رات اس کی چشم میگوں خواب میں دیکھی تھی میں — صبح سوتے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے — گوش اس کا شب ادھر تا آخر افسانہ تھا

میر بھی کیا مست طافح تھا شراب عشق کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا

اس وقت ہمارے پاس سودا کی غزل کا انتخاب موجود تھا پوری غزل نہ تھی اس وجہ سے اس کو مکمل

درج نہ کرسکے۔ تاہم ہمارا مقصد موازنہ ہے اور اس لحاظ سے یہ اور بھی اچھا ہے، کہ سودا کے عمدہ اور منتخبہ اشعار موجود ہیں۔ اہل انصاف غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ ان تینوں غزلوں میں درد کی غزل کو بے شبہ و شک فوقیت حاصل ہے یا نہیں، میر کی غزل کے اشعار نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۰ مقابلے کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ تفصیل سے بحث کرنا طوالت سے خالی نہیں ایسے موقع پر صرف اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

آپ کے کلام میں تصوف کی چاشنی بہت زیادہ ہے۔ کوئی غزل اس کیف سے خالی نہیں ہے مثلاً ایک غزل کے چند اشعار درج کرتا ہوں۔

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا — اعیاں ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا
باہر نہ آ سکی تو قید خودی سے اپنی — اے عقل بے حقیقت دیکھا شعور تیرا
ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت — یاں بھی شہود تیرا واں بھی حضور تیرا
اے درد منبسط ہے ہر سو کمال اس کا — نقصان گر تو دیکھے، تو ہے قصور تیرا

یہ تو ظاہر ہے کہ رنگ تصوف فارسی سے اردو میں جلوہ گر ہوا ہے لیکن چونکہ آپ خود صوفی صافی تھے لہٰذا آپ کا قال حال ہو گیا ہے، کلام میں عجیب کیفیت اور اثر ہے خود فرماتے ہیں۔

پھولیں گے اس زبان میں گلزار معرفت
یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا
اگرچہ

تقلیداً دیگر شعراء نے تصوف کا رنگ اختیار کیا مگر آپ کی سی بات نصیب نہیں ہوئی۔ متقدمین شعراء سے لے کر متاخرین شعراء تک سوائے مرزا غالب بوالہوسی کے شکار معلوم ہوتے ہیں لیکن خواجہ میر درد یہاں بھی دیگر شعراء سے الگ ہیں کیا خوب فرمایا ہے۔

ہر چند مشق میں تو ہزاروں ہیں لذتیں — لیکن عجب مزا ہے فقط دل کی چاہ میں

آپ کے کلام میں جا بجا فارسی کی عمدہ ترکیبیں پائی جاتی ہیں مثال کے طور پر چند تراکیب تحریر کرتا ہوں۔

مہماں سرائے کثرت موہوم۔ جرعہ ریزی ہستی بے بود کشتۂ غم شعر کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ بخانہ آباد
تونے گھر نہ کیا۔ یہاں خانہ آباد بمعنی معشوق استعمال کیا ہے۔ کم فرصتی۔ موج نقش بوریا دل گرفتہ۔ سجود خلایق جلوہ
فروش۔ مردہ خو گوشہ خاطر بمعنت بر ے

دل لے گیا پر ایک نہ کی اس طرف نگاہ   ایسا تو دلبروں میں کوئی مفت بر نہیں

دل داغ داغ۔ تمیز بے تمیزی۔

تمیز بے تمیزی عالم کرے ہے کب   نالے سے عندلیب کے یاں بانگ زاغ کو

سرزنش نگاہ تغافل۔ چشم براہ۔ شورش سن دما وغیرہ

آپ کے یہاں ہندی الفاظ بھی برمحل کثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

کی تو تھی تاثیر آہ آتشیں نے اس کو بھی   جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

جگ میں آکر اِدھر ادھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

دیکھنے پاتا نہیں ہے کوئی جس کی چھاؤں یاں   لے چلی ہے آج ہم کو وہ پری سایا کئے

وفا کی چھینٹ بھی تجھ پر پڑی ہر گز نہ اے ظالم   لگا تھا خون دامن سے سو وہ بھی آپ دھو بیٹھے

پر یکھا کس لئے اتنا کوئی جانے جو کچھ جانے   سدا رہتے ہیں یوں تو لوگ یاں ایدھر ادھر بیٹھے

درد گھبرا کے تو جو یوں چونکا   کیا اٹھی جی میں کھلبلی ایسی

ترچھی نظروں سے دیکھنا ہر دم   یہ بھی اک بانکپن کا بانا ہے

آپ کے یہاں بھی بعض اشعار تلازمے سے پر پائے گئے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے مثلاً

تو شام سے جو لے سہے خورشید رو گیا   انجم کی طرح آیا نہ آنکھوں میں خواب رات

آتش مے سے جو ساقی نے اسے بھڑکا یا   زاہد خشک ہوا خوب ہی تر پانی میں

دل ٹکڑے کیا ہے یہ مرا کس کے لبوں نے   جو لخت ہے سو رشک عقیق یمنی ہے

آپ کے پر درد کلام میں بعض اوقات ثقیل الفاظ ناگوار طبع ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ غزل کے لئے یہ ثقالت
کسی طرح جائز تصور نہیں کی جا سکتی مثلاً چند الفاظ لکھتا ہوں۔

افتقار، شہود، منبسط، لاتعین، حول قوت، اطفائے نار عشق، شرک خفی، الیہ المصیر، مرفوع القلم، وجع مفاصل وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ان بزرگوں کی زبانوں پر فارسی عربی کے الفاظ بکثرت آتے ہوں گے اور اس زمانہ میں شاید یہ الفاظ عام فہم بھی ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیرینی جس کا نام ہے وہ ان الفاظ سے کوسوں دور ہے

آپکے یہاں بعض الفاظ مذکر بندھے ہیں حالانکہ آج کل ان کا استعمال اس کے برعکس ہے مثلاً دید کو مذکر لکھا ہے حالانکہ آج کل مونث ہے ؎

گلستان جہاں کا دید کچھ چشم عبرت سے — کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا

تجلی کو مذکر لکھا ہے۔ ع تجلی پر تو نظر اس کے کوہ طور ہے شیشا۔ سیر کو بھی مذکر باندھا ہے کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا۔ گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے۔ آپکے یہاں بھی بعض اشعار رکیک ہیں یا آپکے درجے سے گرے ہوئے ہیں

خط کے آنے سے ہوا معلوم جاناں حسن کا — نوخطوں نے اب نکالا پیش خانہ حسن کا

وہ سو کر کہیں یہ ہوا بے حجاب رات — تھا شل زلف دل کو عجب پیچ و تاب رات

دل تجھے کیوں ہے بے کلی ایسی — کون دیکھی ہے اچپلی ایسی

آپنے بعض سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی فرمائی ہے اور لطف یہ ہے کہ بعض بعض اشعار خوب نکالے ہیں۔ مگر سنگلاخ زمینوں کو تو آج کل ترک ہی کر دینا چاہیئے۔ چند مثالیں ذیل میں درج کرتا ہوں: کمبخت دل کے ہاتھوں، ایک لخت دل کے ہاتھوں، غبار دامن، بہار دامن، دیدہ تر پانی میں، گھر پانی میں، زنجیر میں راہ، گزر پروانہ، بال و پر پروانہ، وطن گرہ، کٹھن گرہ وغیرہ

ذیل میں وہ متروک الفاظ اور محاورات قلمبند کرتا ہوں جو آپکے کلام میں اکثر و بیشتر پائے گئے۔

اس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے — کیا تاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا

آج کل ہووے کی بجائے ہو استعمال کریں گے۔

بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر — درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

آج کل وے کی جگہ وہ لکھیں گے اور سابقہ کی جمع سابقے کوئی استعمال نہ کرے گا۔

کبھو بجائے کبھی لکھا ہے اور جس پاس کی جگہ جس کے پاس ہونا چاہئے۔ نت بجائے ہمیشہ۔ ٹک بجائے ذرا جوں بمعنی مانند اُودھر بجائے اُدھر۔ جیدھر بجائے جدھر۔ زور بمعنی بہت۔ میں سپر نہ کیا بجائے میں نے سپر نہ کیا یاں تئیں بجائے یاں تک۔ جس تس بجائے جس کسی۔ تس پر بجائے اس پر۔ پکارے بجائے پکار پکار کر۔

کہسار پہ ہر سنگ یہ کہتا تھا پکارے
اے درد مقر ہوں ترے نالوں کے اثر کا

بھلا بجائے اچھا جوں بمعنی جس طرح

جوں چاہیے اس طرح بیاں ہم سے نہ ہوگا
کر اپنے دہن سے ہی تو وصف اپنی کمر کا

نے بجائے نہ ع نہ اندیشہ ہے شادی کا مجھے نے فکر ہے غم کا۔ لوہو بجائے لہو۔

ع آگاہ اس جہاں سے نہیں غیر بیخود اں۔ غیر بیخود اں کا استعمال آج کل کے روزمرہ کے خلاف ہے

قتل تو کرتے ہو مجھ کو لیکن
بہت سا آپ پچھتایئے گا

بہت سا میں بہت کی ہ ظاہر نہیں کی گئی۔ کہ بجائے کہکر ع میں اپنا حال کہ سارا جو پوچھا وعدہ کر کے
لے ہے بجائے ملتا ہے۔ اب معشوق کے لئے پیارے کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ کہا جب میں ترا بوسہ تو جیسا
ہے پیارے۔ لگا تب کہنے پر قند مکرر ہو نہیں سکتا۔

میں خدا جانے یہ کیا دیکھوں ہوں
آپ کچھ جی میں نہ بھر مائے گا۔

بھرمانا بمعنی گمان پیدا کرنا بہر حال آج کل یہ لفظ نہیں بولا جاتا غوی بمعنی خاکساری سے

بلے ہے درد اس کے ساتھ دکھیا تو غریبی سے
گھمنڈ اس کے جو تھا جی میں سو اب یکبار نکلا

کسو بمعنی کسی ور بمعنی غالب ع ہمارے دل پہ کوئی اور تو ور ہو نہیں سکتا۔ سن بجائے سن کر اور آگر، تبھی تئیں بجائے تب تک یا اس وقت تک،

جب تک ہے دل کے شیشے میں رنگ تعلیا کا
ہے اے پری تبھی تئیں آئینہ ناز کا

واؤ عطف کو اب اس طرح استعمال نہیں کیا جاتا۔ [illegible]

مرنا ہی لکھا ہے مری قسمت میں عزیزاں　　گر زندگی ہوتی تو یہ آزار نہ ہوتا

پیمانے کی بیچ بجائے پیمانے میں۔ آئے گا ہ بجائے آنے گا ہے ع آئیے گا فقیروں کے بھی ویرانے بیچ۔ ہے گا بجائے ہے۔ بوند بوند کر بجائے بوند بوند ہو کر۔ جاگہ بجائے جگہ۔ تجھ بن بجائے تیرے بغیر۔ پرکھا بجائے یار۔

پرکھا آدد کھو مت رکھ ترقی اور تنزل کا　　کہ اپنے ذہن میں یاں تو گدا بھی شاہ ہوتے ہیں

اُن نے بجائے اُس نے۔ گزران بجائے گزر۔ پہونچنا بجائے پہنچنا

داد کو تو پہونچنا معلوم ہے　　کوئی یاں فریاد سنتا بھی نہیں

دہاں کا نوں ظاہر نہ ہونا چاہیئے۔ کانوں کو ناگوار گذرتا ہے

کس کی یہ ہوتی ہے صبا گفت و شنید باغ میں　　غنچہ سبھی دہان ہے گل بھی تمام گوش ہے

عنایات کو بجائے جمع واحد استعمال کیا ہے۔

جی فنا ہو ہی گیا اک نگہ گرم کے ساتھ　　درد کچھ اور عنایات نہ ہونے پائی

کنے بجائے پاس ندان بمعنی حال۔ کرئے بجائے کیجئے۔ بسرتی بجائے بسر ہوتی کد بجائے کب وغیرہ وغیرہ

آپکے دیوان میں تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار ہیں۔ لیکن معمولی اور لغو اشعار کی تعداد بہت ہی کم ہے میرے اندازے میں ایک ہزار شعر تو ایسے ہیں جو نہایت قابل تعریف اور شعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ آپ کا کلام سوز و گداز سے بھرے اور بچوں اور بوڑھوں سب کے پڑھنے کے لائق ہے۔

ذیل میں آپکے کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا　　حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا　　ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

شرر و برق کی سی بھی نہیں یاں فرصت ہستی　　فلک نے ہم کو سونپا کام جو کچھ تھا شتابی کا

میں اپنا معدل چاہا کہوں جس پاس عالم میں　　بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

اکسیر پہ ہوس اتنا نہ ناز کرنا — بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا

شل نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا — ہم رو سیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

یارب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے — غم رہ گیا کبھو، کبھو آرام رہ گیا

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشت دل میں ہو — درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

محتسب آج تو میخانہ میں تیرے ہاتھوں — دل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا — میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

دشت عدم میں جاکے نکالوں گا جی کا غم — کنج جہاں میں کھول کے دل میں نہ رو سکا

رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری اِدھر — یارب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

اے درد چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذب عشق — کچھ کہہ رہا ہے بس نہ چلے برگ گاہ کا

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہوگیا — کس کی نظر لگی جو یہ بیمار ہوگیا

کم فرصتی نے ہستی بے اعتبار کی — شرمندہ تیرے آگے اسے لے تسر کیا

مانند فلک دل متوطن ہے سفر کا — معلوم نہیں اس کا ارادہ ہے کدھر کا

کھلا دروازہ میرے دل پہ از بس اور عالم کا — نہ اندیشہ ہے شادی کا مجھے نے فکر ہے غم کا

چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل — گلوں کے منہ پہ یوں چڑھتی ہے دیدہ دیکھ شبنم کا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا — پر منہ پھر اس طرف کیا اُن نے جو گیا

برہم کہیں نہ ہو گل و بلبل کی آشتی — ڈرتا ہوں آج باغ میں وہ تند خو گیا

مجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

ترے کہنے سے میں ازبسکہ باہر ہو نہیں سکتا — ارادہ صبر کا کرتا تو ہوں پر ہو نہیں سکتا

کرے کیا فائدہ ناچیز کو تقلید اچھوں کی — کرم جانے سے کچھ اولا تو گوہر ہو نہیں سکتا

گل و گلزار خوش نہیں آیا — باغ بے یار خوش نہیں آیا

گذرا تھا بعد مدت وہ سامنے سے ہو کر — اے کوتہی نالہ یہ وقت تھا کسی کا

اہل زمانہ آگے بھی تھے اور زمانہ تھا — پر اب جو کچھ ہے یہ تو کسو نے سنا نہ تھا

بارے مجھے بتا تو سہی کیا سبب ہوا — پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو غضب ہوا

اس قدر تھا یا کرم یا ظلم ہی اس قدر — مہربانی اس قدر نامہربانی اس قدر

جوش جنوں کے ہاتھ سے فصل بہار میں — گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل — گل کو شگفتہ دل کہو یا شکستہ دل

حیران آئینہ دار ہیں ہم — کس سے یارب دوچار ہیں ہم

ازبسکہ ہیں محو لاتعین — ہر جا بے اختیار ہیں ہم

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم — تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم

ہستی نے تنک جگا دیا تھا — پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف طبعوں کی — ہوئی آتش سی گل کے بیٹھتے رنگ شرر شبنم

گلیم بخت سیہ سایہ وار رکھتے ہیں — یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں

نہ برق ہیں نہ شرر ہیں نہ شعلہ نے سیماب — وہ کچھ ہیں پر کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں

مژگان تر ہوں یا رگ تاک بریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

گو سلامت لبوں میں ظاہر میں یہ دل کے خراب — رات دن گھن کی طرح سینے میں کھاتے ہیں

نہ آوازہ ہوں قید ہوں زنجیر کی ہرگز — ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

نہ ہم غافل ہی رہتے ہیں نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں / انہیں طرحوں میں ہم ہر دم فنا فی اللہ ہوتے ہیں

وہ مرتبہ ہی اور ہے فہمید کے پرے / ہم جس کو بوجھتے ہیں وہ اللہ ہی نہیں

انساں کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں / بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں / دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو / دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ان نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں / پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

دونوں عالم سے کچھ پرے ہے نظر / آہ کس کا دل و دماغ ہوں میں

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو / ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پروانہ / کہ حال دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں / زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

نگینے کے سوا کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے / کہ ہو نام اور کا روشن اور اپنی روسیاہی ہو

اپنے بندے پہ جو کچھ چاہو تو بیداد کرو / یہ نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہووے / دوستاں درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ / تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے / کوئی اس بات سے نہ ہو آگاہ

دونوں جہاں کی نہ رہی پھر خبر اسے / دو پیالے تیری آنکھوں نے جسکو پلادئے

چھاتی پہ گر پہاڑ بھی ہووے تو ٹل سکے / مشکل ہے جی میں بیٹھے سو جی سے نکل سکے

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پاسکے / میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے / اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے / آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے / کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کی کیا چلے

غزل

از جناب سید عابد علی صاحب عابد

خوشبو بھی ہے سرور بھی میرے شباب میں[1]
پیتا ہوں میں گلاب ملا کر شراب میں

کیا کیا خیال آئے ہیں ذوق نگاہ کو
اللہ تیرا چہرہ رنگیں نقاب میں

کچھ میرے دل پہ عالم سوز و گداز ہے
کچھ درد بھی ہے زمزمہ ہائے رباب میں

دھوکا ہے مجھ کو شام پہ صبح بہار کا
وہ اور میرے پاس شب ماہتاب میں

دونی ہوئی ہے آپ سے مل کر بہار غم
نشتر سے چبھ گئے ہیں رگ اضطراب میں

دیکھی تھی کوندتی ہوئی برق جمال دوست
کچھ داغ پڑ گئے ہیں دل آفتاب میں

عابد فریب ناز ہے تمکین نقاب کی
پنہاں ہے ایک موج تبسم نقاب میں

---

[1] اسعد با حافظ غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادہ صافی گلاب را

سانچا نام تیرا

کشن پور میں جمعرات کو بہت بڑا بازار لگتا ہے۔ آس پاس کے موضعوں کے لوگ اپنی اپنی ہفتہ وار خرید و فروخت کے لئے اس "ہاٹ" میں ضرور آتے ہیں

جا کھن کا نمبردار اتم سنگھ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے غلے کی فروخت کو دیکھنے کے لئے کوئی ڈیڑھ بجے کشن پور روانہ ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ اس سال کئی اسامیوں کو بے دخلی کی دھمکی دے کر اس نے لگان کے علاوہ بٹائی میں بھی حصہ لگا لیا ہے اور اس کے پاس کوئی سوا سو من غلہ واجبی مطالبے سے زیادہ آ گیا ہے۔ کم و بیش ڈیڑھ سو پونے دو سو روپے کا اس کے اندازے سے زیادہ اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور اس طرح وہ ہیرا بڑھئی کی زمین جو اس کے پاس رہن سے ڈرا دھمکا کر سے اونے پونے اپنے قبضے میں کرے گا۔

بلدیوا کمہار بھی نواب گنج سے کچھ کپڑا لتا خریدنے کے لئے کشن پور کی ہاٹ جا رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اب کی مرتبہ پھر اس کا وار چل گیا اس نے بیٹی کو رخصت نہیں کیا اور داماد کو باتوں میں ٹال دیا۔ پچھلی بار اپنے داماد سے ایک گدہا وصول کر لیا تھا۔ اس مرتبہ گیارہ روپے اینٹھ لئے اور یہ کہہ دیا کہ بھادوں میں رخصت کرائے جانا۔ گیارہ روپے میں بلدیوا اپنے، اپنی بیوی، اور بیٹی کا ایک ایک جوڑا کپڑا لے گا اور جب داماد رخصتی کے لئے آئے گا تو اس پر یہ احسان رکھ کر کہ بڑی بیوی کے کپڑوں پر چار روپے خرچ ہوئے ہیں اس سے چار روپے اور وصول کر سکے گا۔

الٰہی بخش تیلی نے ٹانڈے سے کھلی اور تیل لے کر کشن پور کا رخ کیا۔ بارش اچھی ہوئی اس لئے ہری گھاس بہت ہو گئی ہے۔ لیکن چوپایوں کا دودھ پتلا پڑ گیا ہے۔ پانی کی گھاس میں دم نہیں ہوتا اور بوبہا بغیر کھلی کے گائے بھینس شوق سے نہیں کھاتی۔ ایک من کھلی میں میل جول کے گھان جما کر اس نے کل ڈھائی روپے صرف کئے تھے۔ لیکن بازار میں کھری تلی کی کھلی کہہ کر اس نے پانچ ساڑھے پانچ میں من بھر بیچے

[illegible]

لو دیا تھا ۔ وہ اس نے دو مہینے رکھ کر اپنی بھاوج کو تیس روپے میں اٹھا دیا اور کہا کہ دساور میں مانگ نہیں اس لئے چھ روپے من کے بھاؤ پر شادی بنئے نے بڑے لحاظ ملاحظے میں آکر خرید لیا ہے۔ پچھلی ہاٹ میں من بھر تیل تیرہ روپے میں بیچا تھا۔ اب تیل کا بھاؤ اور چڑھ گیا تھا ۔ اور الہی بخش کو امید تھی کہ پندرہ روپے سے چار چھ آنے زیادہ ہی میں اب کی بار وہ من بھر تیل بیچے گا۔

بھجو کری بھی اپنے گاؤں نگلے سے دو بچھڑے کرشن پور کی ہاٹ میں بیچا اسے روپے کی ضرورت تھی۔ اور اگرچہ اس موسم میں ٹھکانے کے دام لگنے کی امید نہ تھی لیکن بنئے نے دبا رکھا تھا۔ وہ کرتا تو کیا کرتا اور پھر یہ بچھڑے اسے مفت ہی ملے تھے۔ ایک تو تین چار مہینے ہوئے اس نے جمنا جی کے پار کے ایک گاؤں سے ہانک کر اپنے ریوڑ میں ملا لیا تھا۔ اور دوسرا اس نے اپنے چچا حولدار ظالم سنگھ کی گائے کا جو اس کے پاس چھوٹی ہوئی تھی دبا لیا تھا۔ اور چچا کو انبالے کی چھاؤنی میں یہ خبر بھیجدی تھی کہ تمہارا بچھڑا دس بارہ دن دکھی رہ کر مر گیا۔

حلقے کا پٹواری ہرسروپ بھی کرشن پور کی ہاٹ میں جمعرات کی جمعرات ضرور جایا کرتا تھا۔ اسے کوئی خاص کام تو تھا نہیں لیکن یونہی ذرا گاؤں گاؤں کا حال چال معلوم کرنے اور اپنی "بالائی آمدنی" بڑھانے کے موقعے ڈھونڈنے کو اس کا ہاٹ میں موجود ہونا اچھا ہی تھا پھر بھلا ہرسروپ منشی جی ہاٹ میں کیوں نہ جاتے۔

پنڈت بالکشن جی بھی ہاٹ میں دکھتا۔ سیندور، جنیو اور منکے لے کر جایا کرتے تھے۔ گیارہ جاتر کے جاتری تھے۔ رام نام کی سمرن کے علاوہ انھیں اور کوئی کام نہیں ۔ دھرم اور گیان کے بچن سے سوا کوئی بول ان کی زبان پر کبھی آتا ہی نہ تھا۔ وہ بھی ہاٹ میں اپنے ایک معتقد حلوائی کی دوکان کے آگے ایک بوسیدہ تخت پر آسن جمائے اور تبرکات پھیلائے موجود رہتے۔

تلسی مالی اپنی باڑی کے حاصل کو لے کر کرشن پور کی ہاٹ میں بلاسپور نگلے سے آٹھ میل کی مسافت طے کر کے جایا کرتا تھا۔ تین چار کاشی پھل اور دو چار اور ترکاریوں اور ساگ پات کا بوجھ اسے اپنے سر اور کمر پر اٹھا کر لے جانا پڑتا تھا پارسال کی بیماری میں اس کی بدھیا مر گئی تھی اور اس کے بعد دو پیسے ہاتھ میں ہوئے ہی نہیں کہ کوئی اور بدھیا خرید لیتا۔ بہرحال وہ محنت مزدوری سے اتنے پیسے ضرور کما لیتا تھا

کہ اپنے مختصر سے کنبہ کی ان گنی ضروریات کی کفالت کرسکے۔

آج ہاٹ بہت جلدی اٹھ گئی۔ دوپہر سے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر ایک کو یہی خیال تھا کہ آج شام ہونے تک مینہہ پڑنے لگے گا۔ کوئی پانچ بجے جب بوندا باندی شروع ہوئی تو خرید و فروخت کرنے والے جلدی جلدی اپنا کام کاج سمیٹ اپنے اپنے گاؤں کو روانہ ہوگئے۔ نمبردار اتم سنگھ بھی پیادہ اپنے گاؤں جاکھن کو چل کھڑے ہوئے۔ وہ تھانے میں داروغہ جی کو سلام کرنے گئے تھے۔ دیوان جی سے ملاقات ہوئی۔ دیوان جی کو صبح تفتیش میں ایک جگہ جانا تھا۔ گھوڑے ٹٹو کی فکر تھی۔ وہ نمبردار اتم سنگھ کی مہربانی سے پوری ہوگئی۔ جاکھن ڈھائی کوس تو تھا ہی نمبردار پیدل چلے جائیں گے۔ دیوان جی تفتیش کے لئے گھوڑے کو تھانے ہی میں رکھ لیں۔

کشن پور کی نہر کے پل کے پاس ایک اجڑی پیاؤ خالی پڑی تھی۔ بھولا بھٹکا راہگیر وقت بے وقت وہاں دو گھڑی کے لئے پیاؤ میں آندھی مینہ سے بچنے کے لئے رک جاتا تھا لیکن اس وقت تو دھواں دھار بارش بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے پناہ لینے کے لئے اس پیاؤ میں خاصی بھیڑ تھی۔ نمبردار اتم سنگھ اور پٹواری ہرسروپ آدھی پیاؤ میں چھائے کھڑے تھے جھوکری۔ الٰہی بخش تیلی۔ ملدیوا کمہار۔ پنڈت بالکشن جی کی بات پر کان لگائے ہوئے تھے۔ تلسی مالی بچارا سب سے غریب تھا اس لئے وہ پیاؤ کی ٹوٹی دیوار کے سہارے باہر کو منہ نکالے کھڑا تھا۔ بات چیت ہو رہی تھی لیکن گھر جانے کی جلدی ہر ایک کو تھی۔ بجلی کا کوندا۔ نیلے نیلے رنگ کا پیاؤ کے سامنے دل ہلا دینے والی کڑک کے ساتھ لہرایا اور چھپ گیا۔ سب سہم گئے۔ بات چیت کا زور کم ہوگیا۔ دو چار منٹ بعد پھر وہی بات ہوئی۔ بجلی کڑکی۔ اور پیاؤ کے دروازے پر لہرا کر پھر لوٹ گئی۔ مینہ اور زور کا پڑنے لگا۔ بڑی زور کی گرج ہوئی۔ پھر بجلی کوندی اور پیاؤ کے دروازے پر چمک کر لوٹ گئی۔

پنڈت بالکشن جی بولے بھائی پاپی کی دیکھ بھال میں سکھیہ دیوتا نکلے ہوئے ہیں۔ اور انیاؤ کرنا چاہتے نہیں۔ سو بھیا ہم میں سے جو پاپی ہے وہ باہر جوہڑ میں جا کھڑا ہو۔ مہاراج کے منہ کے نکلے بول سب کی سمجھ میں آگئے۔ پھر ان کا اثر زیادہ یوں ہوا کہ ست نام رام رام کرتے ہوئے مہاراج باہر نکل گئے اور کوئی تین چار منٹ کھڑے

رہے بجلی چمکی مگر ادھر کا رخ نہ تھا۔ مہاراج انگوچھا نچوڑتے اندر آگئے اور بولے نمبردار جی تم چھتری جاتی ہو اب تمہاری باری ہے۔ اتم سنگھ کرمل راجپوت بھلا مہاراج کہہ کر باہر نکل گیا لیکن نہ بجلی گری نہ بادل گرجا۔ غرض ایک ایک اپنا اپنا نام پتہ بتا کر آسمانی انصاف کی کسوٹی پہ کسے جانے کے لئے پیاؤ سے باہر جاتا کچھ دیر وہاں کھڑا ہو کر پیاؤ میں لوٹ جاتا۔ باہر جاتے ہوئے چہرے پر زردی ہوتی اور پیاؤ میں داخل ہوتے ہوئے بشاشی۔ جو صحیح سلامت اندر لوٹ آتا وہ سمجھتا کہ نرگ سے چھٹکارا ہوا۔ پاپ کی زندگی پر ایک آدھ فلسفیانہ جملہ کہتا اور ان کی طرف دیکھنے لگتا جن کی معصومیت کا ثبوت ابھی عناصر قدرت کے اعلان کا محتاج تھا۔

سب کھڑے کھڑے تلسی مالی کا منہ تک رہے تھے۔ بس وہی ایک امتحان کے لئے باقی رہا تھا اور ظاہر تھا کہ آسمان سے بجلی لہک لہک کے تڑپ تڑپ کے کوند کوند کے تلسی غریب کی تلاش میں آ رہی تھی۔ بالکشن جی مہاراج کی آواز پر تلسی نے آنٹی میں سے کھول کر گیارہ آنے کے پیسے مہاراج کو دئے کہ وہ اس کی عورت کو دیدیں مہاراج نے یہ آخری خدمت منظور کر لی۔ اور تلسی مالی سانچا نام تیرا کہتا ہوا باہر کھلے میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے نکلتے ہی بھرا بادل بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجنے لگا۔ اور بجلی زخمی ہرن کے مانند تڑپنے لگی پیاؤ کی چھت کے نیچے محفوظ کھڑے ہوئے پنڈت بالکشن جی مہاراج۔ نمبردار اتم سنگھ۔ پٹواری ہر سروپ منشی جی پیچو کرمی۔ الٰہی بخش تیلی۔ ملدیو اکمہار۔ بچارے غریب تلسی مالی کے سر پہ کھیلنے والی قضا کے درشن کا انتظار کرنے لگے۔

یکایک آواز ہوئی کہ جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔ بجلی کوندی کہ جیسے کئی سو نیلے نیلے سورج سانپ کی طرح لہراتے ہوئے زمین پر اتر آئے ہوں۔ اور چشم زدن میں پیاؤ پاش پاش ہو گئی۔ اس طرح کہ جیسے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ تلسی مالی بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اور جب ہوش میں آیا تو یہ کہتا ہوا اپنے گھر کو چل دیا کہ "سانچا نام تیرا"

غزل

از مصور جذبات میرزا ثاقب لکھنوی مدظلہٗ

غنچہ و گل ہیں یہ دو مہمان ہنستے بولتے | دیکھتے ہیں ہم خدا کی شان ہنستے بولتے
آپ بھی ہم سے کسی عنوان ہنستے بولتے | کیا نہیں انسان سے انسان ہنستے بولتے
ہم سخن تھے وہ تو نکلی جان ہنستے بولتے | خیر رخصت ہو گیا مہمان ہنستے بولتے
توبہ توبہ چشم ساقی اور وہ دور شراب | رو رہا ہوں کھو چکا ایمان ہنستے بولتے
راہ آزادی کھلی ہوتی تو ہم سے خوش مذاق | دل سے پیدا کر کے سو عنوان ہنستے بولتے
وہ سر بالیں تھے وقت نزع دل تھا شاد شاد | یہ بھی مشکل ہو گئی آسان ہنستے بولتے
خندہ گل دیکھ اور سن نغمہائے عندلیب | غم غلط ہوتا ہے میری جان ہنستے بولتے
پھول شبنم سے نہا کر صبح ہوتے چل بسے | اور کیا اک رات کے مہمان ہنستے بولتے
کچھ تبسم آپ کا تھا اور کچھ شکوے مرے | کٹ گئیں راتیں کسی عنوان ہنستے بولتے
مرنے والا ہوں مگر دم بھر کے جینے کے لئے | دل میں آجاتے ہیں کچھ ارمان ہنستے بولتے
حسن کی وہ صورت زیبا ہے جس کو دیکھ کر | دم بخود ہو جاتے ہیں انسان ہنستے بولتے
دل ہی پابند الم تھا ورنہ بزم عیش میں | ہم تری خاطر سے تا امکان ہنستے بولتے
ختم کی رو رو کے ہم نے داستان زندگی | کیا سرائے دہر کے مہمان ہنستے بولتے

بادہ گلگوں تھا ثاقب کلفت غم کا علاج
کیف بدمستی میں اے ناداں ہنستے بولتے

خیر مقدم

(از مولانا محمد حسین محوی، صدیقی، لکھنوی اردو لیکچرار مدراس یونیورسٹی)

یہ نظم گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس کے پروفیسر تاریخ اور ہمارے مکرم دوست جناب قطب الدین صاحب کی لندن سے واپسی پر لکھی گئی تھی اور مدراس کے نوجوان مسلمانوں کی مشہور سوسائٹی "انجمن ہلال" نے انھیں لامی ہال کی رفیع الشان عمارت میں جو اعزازی "ٹی پارٹی" دی تھی، اس میں پڑھی گئی۔ اس میں نہ صرف موصوف کو یورپ سے واپسی پر مبارکباد دی گئی اور اظہار تشکر کیا گیا ہے بلکہ آج کل کے تعلیم یافتہ طبقے اور کالج و اسکول کے طلبہ کی حالت کا خاکہ کھینچ کر اپنی ان توقعات کو ظاہر کیا ہے جو یورپ سے واپس آنے والے ہندوستانی سے وابستہ ہوتی ہیں اور یہ کہ مغرب کی سرزمین سے واپسی کے بعد ایک ہندوستانی فارغ کے فرائض کیا ہونا چاہئیں۔

(محوی)

شکر صد شکر آگئے یورپ سے واپس قطب دیں
جن سے وابستہ امیدیں سینکڑوں ملت کی تھیں

وہ کہ جن کی ذات ہے آئینۂ حسن عمل
وہ کہ جن کے دل میں ذوقِ علم و فن تھا جاگزیں

ہوکے آئے ہم کنارِ شاہدِ رعنائے علم
عزم اور ہمت پہ ان کی آفریں صد آفریں

کون یورپ؟ آج جو ہے مرکزِ فضل و کمال
کون یورپ؟ آج اک دنیا ہے جس کی خوشہ چیں

ہاں وہی یورپ کہ جو عالم کو دیتا ہے سبق
کائناتِ علم و حکمت جس کے ہے زیرِ نگیں

سکۂ رائج ہے جس کا سکۂ فضل و ہنر
ہاں وہی گہوارۂ دانش ہے جس کی سرزمیں

کچھ خبر بھی ہے؟ یہ وہ مغرب ہے جس نے مدتوں
آستانِ ایشیا پر اپنی رگڑی ہے جبیں

گوئے سبقت لے گیا ہے ایشیا سے آج جو
چپہ چپہ ہے جہاں کا آج حکمت آفریں

جس کا ایک ایک فرد ہے اک پیکرِ جوش عمل
محنت و ہمت میں دنیا میں نظیر اس کا نہیں

للہ الحمد آپ جا کر دیکھ آئے ہیں وہاں
ذوقِ علم و فضل کے نظارہ ہائے دلنشیں

[illegible]

کچھ ہمیں بھی دیجئے درسِ ہنر، درسِ کمال
تشنۂ مضراب ہے سازِ دلِ اندوہ گیں

کیجئے ہم میں بھی پیدا روحِ بیداری وہی
مٹ نہ جائیں رفتہ رفتہ یونہی غفلت میں کہیں

نوجواں ہم میں بھی ہیں، علم آشنا ہم میں بھی ہیں
لیکن ان میں روحِ ہمت، عزمِ بیداری نہیں

کالجوں کے فارغ التحصیل تو ہیں سیکڑوں
کھو رہے ہیں وہ مگر عمرِ عزیز اپنی یونہیں

جوہرِ قابل بھی ہوں گے سیکڑوں لیکن وہ ہیں
پست ہمت، بے عمل افسردہ دل عزلت گزیں

جیسے اب ان کی رگِ جاں میں نہیں آثارِ زیست
جیسے آ پہنچا ہے بیچاروں کا وقتِ واپسیں

آپ پیدا کیجئے بہرِ خدا کچھ زندگی
کچھ تو ہو آسودۂ راحت دلِ اندوہ گیں

پھونک دیجئے نوجوانوں میں نئی روحِ حیات
یہ جنوبی ہند بھی بن جائے مغرب کی زمیں

ولولے زندہ ہوں، پیدا ہو نیا جوش و خروش
اس جہادِ زندگی میں مردِ میداں ہوں ہمیں

پھر ہمارے حوصلوں میں آئے اک تازہ بہار
پھر یہاں چلنے لگے ہر سو نسیمِ عنبریں

پھر ہمیں ہو گرم اک ہنگامۂ عزم و عمل
پھر نظر کے سامنے آ جائے دورِ اولیں

پھر جواں ہوں ہمتیں، بیدار ہوں پھر قوتیں
جاگ اٹھے خوابِ نوشیں سے ہر اک راحت گزیں

ہاں جگا دیجئے ہمیں، ہاں ہاں دکھا دیجئے ہمیں
جلوہ ہائے دانش و بیداریِ مغرب ہمیں

جگمگا اٹھے جہاں، ہو وہ تجلی شعلہ بار
بسترِ راحت کو چھوڑیں مہ جبین و نازنیں

علم کی دیوی اٹھائے اپنے چہرے سے نقاب
پھر کریں نظروں کو خیرہ جلوہ ہائے آتشیں

پھر زمیں مدراس کی ہو آفتابِ علم و فن
پھر ہمیں سے ہو طلوعِ چہرۂ ماہِ مبیں

خوشہ چینِ خوانِ مغرب ہم رہیں گے تابکے
آستانِ غیر پہ رگڑیں گے کب تک یہ جبیں

غیرتِ قومی بھی ہے دنیا میں آخر کوئی چیز
کیا یونہیں چھوٹا رہے گا مسلکِ علم یقیں

کچھ خبر بھی ہے کہ کیا تعلیم دیتا ہے ہمیں
ملتِ بیضا کا شارع، ہادیِ دینِ متیں

آپ کی جانب نگاہیں اٹھ رہی ہیں بار بار
دیکھئے ہونے نہ پائیں قلب مایوس و حزیں

آپ جیسوں نے بھی گر پیدا نہ کی روحِ نشاط
پھر امیدِ زندگی اس قوم کو مطلق نہیں

تنقید و تبصرہ

کتب۔ سیرت رسول اللہ۔ رفیق تنہائی۔ دامن باغبان نغمۂ دل

نرالی اردو۔ خستان۔ عرفان۔ ندیم۔ البت۔

سیرت رسول اللہ مصنفہ پروفیسر سید نواب علی بہاؤ الدین کالج جوناگڑھ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی صفحات ۲۹۲ قیمت سے ؍

پروفیسر سید نواب علی صاحب اردو کے بہت پرانے مصنف ہیں آپ عرصے سے اپنے خیالات سے اردو داں حضرات کو مستفید کر رہے ہیں تاریخ صحف سماوی جن لوگوں کی نظر سے گذری ہے وہ آپ کی قابلیت سے خوب واقف ہیں۔ خاص سیرت پر بھی آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں، ہمارے نبی بچوں کے لئے بہت ہی صاف اور سلیس زبان میں آپ ہی کی قابل قدر تصنیف ہے۔ اسی موضوع پر ۱۹۱۳ء میں تذکرۃ المصطفےٰ کے نام سے آپنے ایک اور اچھی خاصی کتاب شائع کی اب سیرت رسول اللہ کے نام سے پیش نظر کتاب بھی آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں نہایت صاف اور سلجھی ہوئی زبان میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت کے پاکیزہ حالات اختصار لیکن صحت اور جامعیت کے ساتھ اس طرح ترتیب دئے جائیں کہ مخالفین کے اعتراضات بھی دفع ہوں اور اصل حالات آئینہ ہو کر زبان اردو میں ایک معتبر اور مختصر متن ہو جائے جس سے برادران ملت کے ایمان کو تقویت پہونچے اور اہل وطن کو ہدایت نصیب ہو امید ہے کہ یہ کتاب مصنف کے حسب مراد مسلمانوں میں مقبول ہوگی اور انھیں اس سے فائدہ پہونچے گا۔ (م۔ ق)

رفیق تنہائی یہ مجموعہ ان افسانوں کا جو علی عباس صاحب حسینی ایم اے نے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں تحریر فرمائے، علی عباس ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے ملک میں روشناس ہو چکے ہیں اس لئے ان کے مزید تعارف کی ضرورت نہیں

اس مجموعہ میں سات افسانے مطبوعہ ہیں اور دو غیر مطبوعہ افسانے ہر اعتبار سے مستحق تحسین ہیں۔ زبان، بیان، خیالات سب دلکش اور دل پذیر ہیں۔

جن صاحبوں کو افسانوں سے دلچسپی ہے وہ اس رفیق تنہائی کو ضرور اپنے پاس رکھیں۔

کاغذ اچھا، کتابت عمدہ طباعت غنیمت، قیمت صرف ایک روپیہ عہ

ملنے کا پتہ :- ۱۔ سید نثار مہدی، گدڑی، پٹنہ سٹی

۲۔ مکتبہ جامعہ ، دہلی

دامن باغباں | یہ جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب مدیر رسالہ "سعید" کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو کف گلفروش کے بعد لوگوں کے ہاتھوں بازار سخن میں پہونچا ہے، اس مجموعہ میں کل سات افسانے ہیں، منفرداً کسی افسانہ پر رائے ظاہر کرنا مشکل ہے سب ہی خوب ہیں، پہلا افسانہ "نقیبن کا بیاہ" بہت خوب ہے لیکن اس میں ہیں مولا بخش آرہ کش کی زبان سے "اولاد کا فتنہ" کہنا اصول افسانہ نگاری کے اعتبار سے کھٹکتا، ایک معمولی آرہ کش (جس کی کم علمی بلکہ بے علمی کا اعتراف افسانہ نگار نے کئی مواقع پر کیا ہے) کا قرآنی تلمیح استعمال کرنا بہت مستبعد ہے شائقین ادب کو اس مجموعہ کا ایک ایک نسخہ ضرور اپنے پاس رکھنا چاہیے۔

سرورق دیدہ زیب کاغذ عمدہ کتاب بہتر طباعت خوب، قیمت صرف ایک روپیہ عہ

ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ سعید، کوچہ چیلان دہلی۔ (ر۔ا۔ج)

نغمۂ دل | مجموعۂ کلام حکیم ضمیر حسن صاحب دل شاہجہان پوری، حضرت دل ہندوستان کے نغز گو شاعر ہیں ایک مرتبۂ خاص کے مالک ہیں، حضرت دل اگرچہ اب دنیائے سخن میں پرانے ہو چکے ہیں لیکن ان کا کلام اب تک نیا ہے اور دلوں کو گرماتا رہتا ہے، خوشی کی بات ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام شائع ہو گیا جس کا یقیناً حضرت دل کے قدردان بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔

ابتدا میں جناب نیاز فتحپوری کا مقدمہ ہے جس میں دل صاحب کے کلام پر مختلف حیثیات سے روشنی ڈالی گئی ہے پھر جناب عزیز لکھنوی کا تبصرہ ہے جس میں حضرت دل کے کلام پر بحث کی گئی ہے، پھر اصل کلام ہے اور بلا شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں جو خوبیاں ہونا چاہئیں تمام تر موجود ہیں، بلا انتخاب کے چند اشعار ادھر ادھر سے بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

وہ اپنے مجرموں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
اگر اے دل انھیں منظور ہوتا ہے سزا دینا

شب غم موت کا وعدہ بہر حالت وفا ہوتا
کوئی آتا تو کیا کرتا کوئی ہوتا تو کیا ہوتا

محبت کیا ہے دل کا بیکس و مجبور رہ جانا سکون و ضبط کی منزل سے کوسوں دور رہ جانا

صورت شمع جل خموشی سے ہے تقاضائے عشق سوز و گداز

اے درد عشق ہم کو عادت ہے ضبط غم کی ممکن نہیں کہ آئے نالہ کبھی زباں تک

کیا دیکھتے ہو میرے دم توڑنے کا عالم تم مڑ کے وقت رخصت شمع سحر کو دیکھو

اے دل نشاط دہر حقیقت سے دور ہے پھیلائے ناکجا کوئی دامان آرزو

بدلے یہ رنگ آرزوئے دل نے اے ضمیر اف بن گئی کبھی کبھی فریاد ہو گئی

خموش کب کوئی محو خیال ہوتا ہے نئی زبان میں اظہار حال ہوتا ہے

مری فغاں کبھی گوشش آشنا نہیں ہوتی مرا سکوت مگر عرض حال ہوتا ہے

یوں وقف دیر و کعبہ رہے ہم جناب دل اس گھر کے ہو گئے کبھی اس گھر کے ہو گئے

ہر خار دشت تھا مری ایذا پہ متفق چھالے بھی ٹوٹ ٹوٹ کے سب ایک ہو گئے
سر نذر خنجر ستم ایجاد کر دیا اس بار سے بھی آج سبک دوش ہو گئے
مشہور ہے کہ توڑ کے تقویٰ جناب دل پھر رندِ مے پرست و قدح نوش ہو گئے

کتابت طباعت عمدہ، ضخامت ۱۸۸ صفحہ قیمت عہ جناب مصنف سے محلہ ہاشمی تھان، شاہجہاں پور کے پتہ سے ملے گی۔
(ر۔ ا۔ ج)

زبان اردو مصنفہ ایم اے مغنی صاحب، حجم ۱۲۸ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، لکھائی چھپائی معمولی، قیمت ملنے کا

پتہ دفتر نرالی اردو کوچہ دکھنی رائے دریا گنج دہلی۔ یا مکتبہ جامعہ دہلی

نرالی اردو دلی کے کرخنداروں کی زبان ہے۔ یہ گویا لندن کی کاکنی کا جواب ہے۔ بے ساختگی، روانی اور مزے کے اعتبار سے یہ زبان لندن کے عوام کی زبان سے کم نہیں لیکن اسمیں انگریزی قوم کی آسودگی، اطمینان، تحمل، کند ذہنی، بے حسی کا رنگ جھلکتا ہے اور اس میں ہندوستانی مسلمانوں کے افلاس، پریشانی، بے صبری، بدمزاجی، طبیعت کی تیزی اور ذہنی کا عکس نظر آتا ہے۔ قابل مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہ صرف دلی کے اہل حرفہ کی زبان کا سچا نمونہ دکھلایا ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کا سچا نمونہ دکھایا ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر وہ مختصر افسانے اور ناول لکھیں جن کا موضوع دلی کے مختلف طبقوں کی زندگی ہو تو بہت کامیاب ہوں گے اور ادب اردو کی بڑی خدمت کریں گے۔ البتہ خدا انھیں اس روگ سے بچائے جو اردو کے اہل قلم کو آج کل لگ گیا ہے جہاں کوئی اچھا لکھنے والا پیدا ہوا اور درجنوں رسالوں نے فرمائش کی بھرمار شروع کی اب وہ جلد شہرت حاصل کرنے کی ہوس، یا تنگدستی یا محض رقت قلب کی بدولت ان سب کی فرمائش پوری کرتا ہے اور بدحواسی میں صفحے کے صفحے بلکہ جزو کے جزو گھسیٹ کر چھپوانا شروع کرتا ہے۔ ہر طرف سے واہ واہ ہوتی ہے، کوئی موٹا سا خانہ ساز خطاب مل جاتا ہے، دو چار روپے بھی وصول ہو جاتے ہیں مگر مضمون کی یہ گت بنتی ہے جیسے کسی نے برسات کی گھاس کاٹ کاٹ کے ڈھیر لگا دئے ہوں یا دوسری طرح کہئے تو یہ کہئے کہ سیر بھر دودھ میں گھڑوں پانی ملا دیا ہو۔ ہماری دعا ہے کہ نرالی اردو کے مصنف اپنے جوہر قابل کی قدر پہچان کر خاموشی اور محنت اور صبر سے اس کی پرداخت کریں گے تاکہ اس کی نشوونما قدرتی اصول پر مکمل ہو سکے

(ع - ح)

<u>خستان</u>| نام کا ایک ماہوار رسالہ راولپنڈی سے جناب محمد احمد صاحب بی اے کے زیر ادارت نکلنا شروع ہوا ہے، چند دن ہوئے کہ جب چند پرجوش نوجوانوں نے اردو زبان کی خدمت کا حوصلہ صوبہ سرحد میں پیدا کر کیا چنانچہ انھوں نے "بزم اردو" نام کی ایک انجمن بنائی۔ جس کے اہم مقاصد یہ تھے کہ علاقہ سرحد میں علم ادب کی نشر و اشاعت کی جائے اس کے ہونہار اور نوخیز انشا پردازوں کی درستی اور اصلاح ہو، ادبی جلسوں کا انتظام کیا جائے، انھیں مقاصد کے ماتحت اس پرچے کا اجرا بھی عمل میں آیا ہے، زیر تبصرہ رسالہ پہلی جلد کا پہلا نمبر ہے، مضامین اگرچہ بلند پایہ نہیں کہے جاسکتے ہیں تاہم غنیمت ہیں، اور اگر مقام اشاعت کا لحاظ کیا جائے تو قابل مدح و ستائش ہیں، زبان بھی اچھی ہے البتہ چھپائی ناقص ہے سالانہ چندہ سے ہے، اور مہتمم نخستان تھیلی محلہ راولپنڈی کے پتہ سے پرچہ مل سکے گا۔

<u>عرفان</u>| ایک علمی و ملی ماہوار رسالہ ہے جو کوٹ بہاں آباد (فتح پور) سے شائع ہونا شروع ہوا ہے ایڈیٹر محمد یونس صاحب ندوی کے ہیں اور سرپرست شاہ سید وارث حسن صاحب، مقاصد جناب مدیر ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں مواہتمام

کے متعلقات شائع کرنا، اسلام کی خوبیاں اقوام عالم کے سامنے پیش کرنا، مخالفین اسلام کا سنجیدگی سے جواب دینا، عوام و خواص میں مذہب سے دلچسپی پیدا کرنا" جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ بہت بلند ہیں اور کون ایسا مسلمان ہوگا جو جناب مدیر کے جذبات کی قدر نہ کرے گا، مگر افسوس ہے کہ ہمیں تو اس پرچہ میں کوئی بھی ایسا مضمون نظر نہ آیا جو مذکورہ بالا مقاصد کو پورا کرتا ہو، مگر جناب مدیر کے اس اعتذار سے کہ پرچے کے نکالنے میں عجلت سے کام لیا گیا ہے آئندہ اس سے بہتر ہو جانے کی توقع کی جاتی ہے کہ شاید آئندہ سے اس کا انتظام ہو، البتہ جوش ملیح آبادی کی ایک آدھ نظموں سے پرچہ میں جان پڑ گئی ہے، قیمت سالانہ عہ ہے، منیجر رسالہ عرفان قصبہ کوڑا جہاں آباد (ہسوہ) کے پتے سے مل سکتا ہے

ندیم | ایک ہفتہ وار پرچہ ہے جو بمبئی سے نکل رہا ہے، بدر جلالی صاحب اس کے مدیر اعلیٰ ہیں، پرچہ کی خوبیوں کی ضمانت ہمارے خیال میں خود صاحب موصوف کی ذات ہے، آپ مدت تک "مدینہ" کے ذریعے اپنے مشق صحافت کی داد اردو داں طبقے سے حاصل کر چکے ہیں۔ مخالف سے مخالف کو بھی آپ کی صحافتی قابلیت کا اعتراف ہے، ہمارے ہاتھ میں اس وقت ندیم کا تیسرا نمبر ہے جس میں اعلیٰ درجے کے مضامین کے علاوہ ہفتہ وار خبروں کے جمع کرنے اور پھر ایک صحیح رہنمائی کا فرض ادا کیا گیا ہے، سالانہ چندہ للعہ ہے۔

البت | نام کا ایک مصور اور ہفتہ وار رسالہ کلکتہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جہاں تک پرچے کے زیب و زینت کا تعلق ہے بہت خوب ہے۔ اگرچہ تصویروں کا انتخاب ہمارے نزدیک کچھ پسندیدہ نہیں ہے، مگر مجموعی حیثیت سے کچھ ضروری گزارش کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اختلاف خیال بری شے تصور نہیں کی جاتی ہے بشرطیکہ عقل و فہم، سچائی اور دیانت داری سے ہو، مگر اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ جن حضرات سے اختلاف ہو ان کے متعلق سب کچھ لکھنا جائز کر دیا جائے۔ بدقسمتی سے ہماری اردو صحافت کا اکثر یہ وطیرہ رہا ہے، کہ جہاں اختلاف ہوا، فوراً گالی گلوچ اور سب و شتم جائز، زیر تبصرہ رسالہ میں یہ چیز نمایاں ہے جس کی طرف توجہ کرنا فاضل ایڈیٹر کا فرض ہے، چندہ سالانہ عہ ہے اور ڈنزن لین کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

اوٹاوہ کانفرنس اور ہندوستان اوٹاوہ کانفرنس بالآخر بہت کامیابی سے ختم ہوگئی سلطنت برطانیہ کی مختلف ریاستوں کے درمیان کچھ تجارتی معاہدے ہوئے ہیں جو خیال کیا جاتا ہے کہ سب کے لئے مفید ہیں اور مجموعی حیثیت سے سلطنت کے استحکام اور معاشی ترقی کا ذریعہ بنیں گے۔ انگلستان اور دیگر خود مختار نوآبادیات اوٹاوہ کانفرنس کی کامیابی پر بجا طور سے خوش اور مطمئن ہیں لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں سیاسی اور تجارتی کسی حلقے سے اوٹاوہ کے معاہدے کی نہ تائید کی گئی اور نہ اس پر اظہار اطمینان کیا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ بلی اور چوہے کا کوئی معاہدہ اگر کمزور فریق کے لئے کسی صورت میں مفید ہے تو حکومت انگلستان اور حکومت ہند کا موجودہ معاہدہ بھی ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہوگا! پچھلے سوڈیڑھ سو سال کی تاریخ نے ہندوستان کو عام طور پر اس قدر بدگمان کردیا ہے کہ جو لوگ اوٹاوہ کے تجارتی معاہدات کی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھ سکتے وہ بھی اس معاہدے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جو مراعات انگلستان نے ہندوستان کے ساتھ کئے ہیں ان کو تسلیم کرنے سے انکار ہے ع۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

"ترجیحی محاصل" کا سوال کم و بیش ۳۵ برس سے ریاستہائے برطانیہ کے سامنے مختلف صورتوں میں پیش رہا ہے۔ سب سے پہلی کانفرنس اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ۱۸۹۷ء میں منعقد کی گئی تھی لیکن بعض نوآبادیات کے اصرار کے باوجود حکومت انگلستان اس وقت تجارتی لین دین میں اپنی نوآبادیات کے ساتھ غیر ممالک کے مقابلہ میں کوئی رعایت منظور کرنے کے لئے تیار نہ تھی یہاں تک کہ جنگ عظیم شروع ہوئی اور دوران جنگ میں انگلستان کو محسوس کرنا پڑا کہ سلطنت کی معاشی قوت اور استحکام اعضائے سلطنت کی معاشی قوت اور استحکام پر موقوف ہے، چنانچہ از خود انگلستان نے نوآبادیات کے مال کی درآمد پر محصول میں کچھ کمی کردی، نوآبادیات نے بھی اس احسان کا بدلہ احسان سے دیا، ہندوستان سے بھی توقع تھی کہ وہ "ترجیحی محاصل" کے طریقہ کو اختیار کرے گا لیکن اسی زمانے میں اصلاحات نافذ ہوئے تھے، تجارتی معاملات میں حکومت ہند کو آزادی مل چکی تھی اور سر ابراہیم رحمت اللہ کی زیر صدارت ایک کمیشن ہندوستان کی تجارتی پالیسی پر از سر نو غور کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا چنانچہ "ترجیحی محاصل

ملہ بھی تحقیقات کے لئے اسی کمیشن کے سپرد ہوا۔ کمیشن نے تحقیقات کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ ترجیحی محاصل سے وستان کو نقصان زیادہ ہے اور فائدہ کم اس لئے کہ اس قسم کی رعایتوں سے زیادہ فائدہ صنعتی ممالک کو ہوسکتا ہے اول ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، دوسرے یہ کہ صنعت و حرفت کے میدان میں اب قدم رکھ رہا ہے اور اس لئے دیسی وعات کی حفاظت کے لئے محصولات کی دیوار قائم کرنا ضروری ہے، دیسی صنعتوں کا مقابلہ اس وقت تک زیادہ تر لستان سے تھا اس لئے ترجیحی محاصل کے سلسلہ میں انگلستان کے ساتھ کوئی رعایت کرنے سے دیسی صنعتوں کی تامین ں ہوسکتی تھی۔ پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ چونکہ ہندوستان کی برآمد کا بیشتر حصہ غیر ممالک کو جاتا ہے اس لئے اگر ان ممالک کے ابلہ میں برطانیہ کے ساتھ کوئی رعایت کی گئی تو ہندوستان کی برآمد کو نقصان پہونچے گا۔

محض معاشی نقطہ نظر تو یہ تھا لیکن اس کے علاوہ اور بھی وجوہ تھے جن کی تصریح کرتے ہوئے کمیشن مذکور کی اقلیت نے ں میں خود صاحب صدر اور دیگر ہندوستانی ارکین شامل تھے، اپنی اختلافی رائے میں یہ ظاہر کردیا تھا کہ ترجیحی محاصل کے کسی قابلہ میں ہندوستان کی شرکت کا سوال ہی اس وقت تک نہیں پیدا ہوسکتا جب تک کہ۔

۱۔ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات کی خودمختاری نہ مل جائے یا کم از کم تجارتی معاملات پر فیصلہ اور رائے کا حق صرف "منتخب شدہ" ارکین اسمبلی کو نہ دیا جائے۔

۲۔ ہندوستان کی صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے حکومت ہند کے رویہ میں نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو

۳۔ اور سلطنت کی نوآبادیات میں ہندوستانیوں کے ساتھ نسل و رنگ کی تفریق نہ مٹ جائے۔

یہ رائے اس وقت ظاہر کی گئی تھی جب ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی تعلقات نہ اس قدر کشیدہ تھے۔ اور سودیشی کی تحریک کا اس قدر زور تھا اب بحالات موجودہ سیاسی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے ہندوستان کا مزاج بہت بگڑا ہوا ہے اور اگر ہندوستانی ایوانہائے تجارت اور سیاسی حلقوں کی طرف سے اوٹاوا کانفرنس میں حکومت ہند کے نمائندوں کی شرکت پر احتجاج کیا جارہا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

برطانیہ اور ہندوستان کے ساتھ جو تجارتی معاہدہ اوٹاوا میں ہوا ہے اس کی صورت مجملاً یہ ہوگی کہ انگلستان میں ہندوستانی مال کے محصول پر دس فی صدی رعایت کی جائے گی اور اس کے عوض ہندوستان میں بھی تمام انگریزی مصنوعات پر دس فیصدی محصول کی رعایت کی جائے گی البتہ انگریزی موٹروں پر صرف ۷½ فی صدی رعایت ہوگی۔

انگلستان اس قسم کے معاہدے کے لئے ایک عرصہ سے بے چین تھا۔ ہندوستانی بازاروں میں اس کی تجارت روز

بعد گھٹتی جا رہی تھی ایک طرف سے جاپان کا حملہ تھا جو انگریزی مال کے مقابلے میں سستے سے سستا مال مہیا کرتا ہے اور ہندوستانی اپنی غربت کی وجہ سے مجبور ہیں کہ سستی چیز خریدیں خواہ وہ خراب ہی کیوں نہ ہو، دوسری طرف امریکہ اور جرمنی نے ناک میں دم کر رکھا ہے اور ان کا بھی اچھا مال انگریزی مال کے مقابلہ میں نسبتاً کم قیمت پر بکنے لگے ہیں، پھر خریداروں کو بھی اس طرف انگریزوں سے کچھ للّہی ہو گئی ہے کہ وہ حتی الوسع انگریزی مال سے پرہیز کرتے ہیں اور امریکہ جرمنی یا کسی دوسرے ملک کے مقابلہ میں انگریزی مال اگر کچھ سستا اور اچھا بھی ہوتا ہے تب بھی دوسرے ملکوں کے مال کو ترجیح دیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی درآمد میں جنگ سے قبل انگریزی مال کا جو تناسب ۶۵ فیصدی رہتا تھا ۱۹۳۰ء میں ۴۴ فی صدی ہو گیا اور ۳۲-۱۹۳۱ء میں کل ۳۵ فیصدی رہ گیا ہے اور یہ یقین ہے کہ اگر سیاسی حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہوتی اور حکومت انگلستان نے اپنے سیاسی اقتدار سے بے جا فائدہ اٹھا کر ایسی تدابیر نہ اختیار کیں کہ غیر ممالک کا مال ہندوستان آنا زبردستی بند ہو جائے خواہ ہندوستان کا نقصان ہی اس سے کیوں نہ ہو تو ہندوستان کی درآمد میں انگلستان کا حصہ روز بروز کم ہوتا جائے گا۔

لیکن یہ صورت حال ایسی نہیں ہے کہ انگلستان اس کو آسانی سے نظرانداز کر دے چنانچہ ہندوستانی بازاروں میں اپنے رقیبوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے تو معیار طلا ترک کرنے کے بعد روپیہ اور اسٹرلنگ کی قانونی شرح مبادلہ قائم رکھی گئی جس کی وجہ سے خود بخود غیر ممالک کے مقابلے میں انگریزی مال ہندوستان کی منڈیوں میں سستا ملنے لگا۔ اور اب دوسری تدبیر یہ نکلی کہ اوٹاوہ کانفرنس بڑی دھوم دھام سے ہوئی، ہر نوآبادی کے نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے، ہندوستان بھی "پانچوں سواروں میں" شامل ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ کینیڈا، آسٹریلیا، افریقہ اور نیوزی لینڈ کی خود مختار نوآبادیات نے اپنے اپنے نمائندے خود مقرر کئے تھے، اور ہندوستان کے نمائندے وزیر ہند نے مقرر کئے تھے۔

ہمارے نمائندگان میں سر آتول چیٹرجی سابق ہائی کمشنر، مسٹر چٹی، اور حاجی عبداللہ ہارون لیڈر اسمبلی اور سر جارج رینی سابق وزیر تجارت حکومت ہند شامل تھے۔ ان حضرات کی قابلیت میں ظاہر ہے کہ کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ حکومت کے نامزد کردہ نمائندگان کو مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ کا لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے اس لئے ان کی مجبوریاں بھی ظاہر ہیں اصولی حیثیت سے بہرحال یہ بات قابل اعتراض ہے کہ ایک طرف تجارتی معاملات میں جب ہندوستان کو کھلا کھلا خود مختاری دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے تو پھر اس میں کیا قباحت تھی کہ خود اسمبلی کے منتخب شدہ اراکین اوٹاوہ کانفرنس کے لئے اپنے وفد کا انتخاب کرتے، یا ہندوستانی ایوانہائے تجارت سے استصواب رائے کر کے ضابطہ کی کارروائی کی جاتی، اور ہندوستان کی رائے عامہ کا اس معاملہ میں لحاظ کیا جاتا تھا مگر حکومت کو یہ اندیشہ تھا کہ

موجودہ ہندوستان کی رائے عامہ اوٹاوہ کانفرنس کی شرکت کے حق میں نہیں ہے تو یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ مذکورہ وفد واقعی ہندوستان کا نمائندہ تھا!

اب معاشی نقطۂ نظر سے یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان کو اس معاہدہ سے کیا فائدہ پہونچے گا؟ ہندوستان کی برآمد میں انگلستان کا حصہ کل ۲۷ فی صدی ہے لیکن جو سامان ہندوستان سے انگلستان جاتا ہے اس میں کچھ تو ایسا مال ہے جس کی تجارت پر ہندوستان کا قبضہ ہے مثلاً جوٹ، اس لئے جوٹ پر کسی رعایت کی ہندوستان کو ضرورت ہی نہیں۔ اس کو نکال کر باقی کل تیس کروڑ روپیہ کا ایسا مال انگلستان جاتا ہے جس پر ہندوستان کے ساتھ محصول میں رعایت کی جائے گی لیکن اس میں بھی ۱۶ کروڑ روپے کی چائے شامل ہے جس پر پورا قبضہ انگریزوں کا ہے انھیں کا سرمایہ لگا ہے۔ ہندوستان کو اس سے بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لحاظ سے کل ۱۴ کرور روپیہ کے ہندوستانی مال پر دس فی صدی کے حساب سے محصول میں رعایت ملے گی اور اس احسان کے بدلے میں ہندوستان ۲۵ کرور روپیہ کے انگریزی مال پر دس فی صدی کے حساب سے محصول میں رعایت کرے گا۔

حکومت ہند نے اوٹاوہ کانفرنس کے نتائج کی توضیح کرتے ہوئے اس پر زور دیا ہے کہ ہندوستان کی تجارت برآمد کو اور بالخصوص السی تلہن کی تجارت کو بہت فائدہ ہوگا لیکن حکومت کے بیان کے جواب میں بمبئی کی انجمن تاجران تلہن کے متعلق جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند نے اپنے بیان میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ تلہن کی کل برآمد تقریباً ۷ لاکھ ٹن سالانہ ہوتی ہے اس میں السی کل تین یا چار لاکھ ٹن زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور زیادہ مقدار مونگ پھلی کی ہوتی ہے اور مونگ پھلی کے اصل خریدار فرانس جرمنی اور ہالینڈ ہیں۔ چنانچہ انجمن مذکور کی یہ قطعی رائے ہے کہ السی کی تجارت کو ترجیح محاصل کی وجہ سے فائدہ کم پہونچے گا اور اندیشہ ہے کہ اگر فرانس جرمنی اور ہالینڈ نے اس کے جواب میں ہندوستان کے مال محصولات میں اضافہ کر دیا تو اس تجارت کو یقیناً نقصان پہنچیگا۔

جہاں تک ہندوستان کی تجارت درآمد کا تعلق ہے ابھی یہ نہیں معلوم کہ انگریزی مال پر رعایت کی کیا صورت ہوگی؟ آیا موجودہ محصول کی شرح میں جہاں تک انگلستان کے مال کا تعلق ہے دس فی صدی محصول کی تخفیف کردی جائے گی یا غیر ممالک کے مال پر دس فی صدی کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ بظاہر حالات ایسے ہیں کہ میزانیہ کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے نیز تامین محصول کی خاطر موجودہ شرح محصول میں کمی کر کے یہ رعایت انگلستان کے ساتھ نہ کی جائے گی بلکہ غیر برطانوی ممالک کے مال پر موجودہ شرح سے دس فیصدی کا اور اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگلستان کی تجارت کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان کے غریب خریداروں پر دس فی صدی کا محصول اور لگا دیا جائے گا

ہندوستان کی درآمد میں سب سے زیادہ اہم چیزیں اس وقت مشین، لوہے کا سامان، اور موٹر وغیرہ ہیں، امریکہ اور جرمنی دونوں ممالک مشین کی تجارت میں انگلستان کے سب سے بڑے مدمقابل ہیں، امریکہ نے موٹروں کی تجارت میں تو انگریزوں کو بھرے بازار میں شکست دی ہے اور ہندوستان میں بھی اس کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔ مشینوں پر اضافہ محصول کے معنی یہ ہوں گے کہ صنعت و حرفت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو اور موٹروں پر اضافہ محصول اس لئے نہ ہونا چاہیئے کہ ذرائع نقل و حمل کو ترقی دینے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس وقت بھی جو غیر تامینی محصول سامان درآمد پر محض آمدنی کی خاطر لگایا جاتا ہے وہ بھی ضرورت سے زیادہ ہے اس لئے خریداروں کے نقطۂ نظر سے نیز ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی کی خاطر بحالات موجودہ محصولات میں مزید اضافہ کی کوئی تائید نہیں کر سکتا لیکن بہرحال یہ تمام معاملات اپنی پیچیدگیوں کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ تحقیقات کے لئے ٹیرف بورڈ کے سپرد کئے جائیں اور جو فیصلہ کیا جائے اس میں ہندوستانی اہل تجارت کی رائے کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ورنہ ممکن ہے کہ جس طرح حکومت ہر مسئلہ کو زبردستی اپنے حسب منشا طے کرا لیتی ہے اسی طرح یہ مسئلہ بھی گویا طے ہو جائے اور پھر نئے دستور کے نفاذ کے فوراً بعد ان معاہدوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنا پڑے۔ یہ اندیشہ بھی کافی وزن رکھتا ہے کہ سودیشی کی تحریک اور انگلستان کے خلاف پبلک کے جذبات ان مراعات کو کالعدم کر دیں گے جو انگلستان اوٹاوہ کے معاہدوں سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

<u>کھدر</u> آل انڈیا اسپنرس ایسوسی ایشن کی سالانہ رپورٹ حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھدر کا کاروبار آہستہ آہستہ ترقی کر رہا ہے ستمبر سنہ ۳۰ء سے ختم دسمبر سنہ ۳۱ء تک ۷۲ لاکھ ۱۵ ہزار ۵۰۲ روپے کا کھدر تیار ہوا ہے اس سے پہلے سال میں تقریباً ۶۹½ لاکھ روپے کا کھدر تیار ہوا تھا گزوں کے حساب سے حسب ذیل اعداد درج ہیں۔

ختم سنہ ۳۰ء تک .... ایک کروڑ ۴۹ لاکھ ۵۷ ہزار ۲۴۸ گز

" سنہ ۳۱ء تک .... ایک کروڑ ۷۵ لاکھ ۷۶ ہزار ۵۷۶ گز

کھدر کی بکری سنہ ۳۰ء میں ۳۸ لاکھ ۱۲ ہزار روپے کی ہوئی تھی اور سنہ ۳۱ء میں ۹۰ لاکھ ۹۴ ہزار روپیہ کی ہوئی کھدر کی تنظیم اب تک ۷ ہزار گاؤں میں ہوئی ہے جس سے ۲ لاکھ سوت کاتنے والی عورتیں اور مرد، اور ۵ ہزار جلاہے اپنی روزی کماتے ہیں کھدر کی تنظیم میں اول نمبر صوبہ مدراس کا ہے جہاں کھدر کی پیداوار میں پچھلے سال کے مقابلہ میں ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہوا اور بکری میں ۷۰ فی صدی کا۔ سول نافرمانی اور سودیشی تحریکات نے کھادی کی مانگ بہت بڑھا دی ہے لیکن کھادی کی تنظیم کرنے والے سینکڑوں کارکنوں کے جیل چلے جانے سے کھدر کی تنظیم کا جو موقع گذشتہ دو سال کے اندر ملا تھا اس سے پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکا ورنہ زراعت پیشہ لوگوں پر گذشتہ دو سال بڑی مصیبت کے گذرے جب ان کی محنت کی کمائی کی کوئی قیمت ہی نہ رکھتی تھی۔ انھیں حالات میں اگر ان کو کوئی ایسی گھریلو محنت کا

جس سے دیہاتی آمدنی میں دو چار پیسہ بھی اضافہ کرسکتے تو نہایت خوشی سے وہ اس کے لئے تیار ہو جاتے۔ ہندوستان کے غریب ان پڑھ اور بے مہارت کسانوں کے لئے چرخہ بھی ایک ایسی صنعت ہے جسے وہ بآسانی اختیار کرسکتے ہیں اس مشین کے حاصل کرنے میں نہ زیادہ روپیہ صرف ہوتا ہے نہ سیکھنے میں زیادہ وقت، عورتیں بچے بوڑھے فرصت کے اوقات میں اس پر کام کرسکتے ہیں اور دوسرے کام کے وقت اس کو بیکار چھوڑ سکتے ہیں اس لئے جن دیہاتوں تک چرخا پہنچ گیا ہے وہاں کسان اور بیکار لوگ اس کو نعمت سمجھتے ہیں اس میں بلکہ اتنا سوت تیار ہونے لگا ہے کہ اس کی نکاسی کے لئے بڑے بڑے کارکنوں کو گھر گھر کھدر لے جاکر بیچنا پڑتا ہے۔

اچھوت بالآخر وزیر اعظم دام اقبالہ کے تصفیہ کا کم از کم ایک حصہ حرف غلط کی طرح مٹ گیا اور چند دنوں کے اندر ہندو جماعت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا کہ جس کا گمان بھی چند روز قبل بڑے سے بڑے ہندو رہنما نہیں کرسکتے تھے۔
فرقہ وارانہ تصفیہ سے علاوہ انگلو انڈین اور اچھوت جماعتوں کے اور کسی فرقہ کو اطمینان نہ تھا مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ نے اس تصفیہ کو قبول تو کر لیا ہے لیکن بادل ناخواستہ اور اس امید پر کہ جو کمی اس میں رہ گئی ہے وہ انشاء اللہ آئندہ پوری ہو جائے گی ہندوؤں اور سکھوں کا جہاں تک تعلق تھا انھوں نے من حیث الجماعت وزیر اعظم کے تصفیہ کی شدید مخالفت کی بلکہ سکھوں نے تو حکومت کے ساتھ ترک تعاون بھی شروع کر دیا ہے اور مجلس قانون ساز سے مستعفی ہو رہے ہیں ہندو بھی سکھوں کے ساتھ مل کر ایسی تدابیر پر غور کر رہے ہیں کہ کسی طرح اس تصفیہ کو ناقابل عمل بنا دیا جائے

ایک طرف یہ عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی کہ ۱۲ ستمبر کو حکومت برطانیہ اور گاندھی جی کی خط وکتابت شائع ہوئی۔
گاندھی جی نے اچھوتوں کے نام جداگانہ انتخاب کے فیصلہ کے خلاف پرزور احتجاج کیا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ۲۰ ستمبر تک اس تصفیہ میں جہاں تک اچھوتوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا تعلق ہے مناسب ترمیم نہ کی گئی تو وہ فاقہ کشی شروع کر دیں اور فاقہ کرتے کرتے جان دے دیں گے۔ گاندھی جی نے پہلا خط وزیر ہند کے نام ۱۱ مارچ کو لکھا تھا اس کا جواب وزیر ہند نے ۱۳ اپریل کو بھیجا مگر اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے حکومت کی رائے معلوم ہوتی۔ ۱۷ اگست کو وزیر اعظم کا تصفیہ شائع ہوا اور گاندھی جی نے ۱۸ اگست کو پھر ایک خط وزیر اعظم کے نام بھیجا اس میں اچھوتوں کے جداگانہ انتخاب کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ۲۰ ستمبر کو دوپہر سے برت شروع کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ وزیر اعظم نے ۸ ستمبر کو گاندھی جی کے خط کا جواب دیا اور اس میں اپنے تصفیہ کی توضیح کرنے کے بعد یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت خود اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن اگر ہندوؤں اور اچھوتوں میں باہمی سمجھوتا ہو جائے تو حسب اعلان سابق حکومت اس کو تسلیم کر لے گی

اس خط وکتابت کا شائع ہونا تھا کہ ملک کے طول وعرض میں ہیجان اور پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی برہمن اور اچھوت سب کے ہوش درست ہوگئے۔ ہندو رہنماؤں نے پوری عجلت سے کام لے کر بمبئی میں ایک اجتماع کیا حکومت نے اعلان کیا کہ روزہ شروع ہوتے ہی گاندھی جی کو جیل سے نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائیگا تاکہ وہ اچھوتوں کے مسئلہ کو سلجھانے کے لئے مشوروں میں حصہ لے سکیں لیکن چونکہ گاندھی جی خود کسی مشروط رہائی کیلئے تیار نہیں ہوئے اس لئے مجبوراً جیل کے دروازے ان لوگوں کے لئے کھول دئے گئے جو اچھوتوں کے معاملے کے متعلق گاندھی جی سے مشورہ اور گفتگو کرنا چاہیں۔

چنانچہ برت شروع ہونے سے قبل متعدد وفود گاندھی جی سے جیل میں ملے۔ دوستوں اور عقیدت مندوں نے اس آخری اقدام سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن پہاڑ آج تک کب اپنی جگہ سے ہٹے ہیں گاندھی جی نے اپنے عقیدے کی چٹان پر بھی جو ہمالیہ کے تزلزل پیدا کرنے والے افکار کو پاش پاش کردیا۔ بالآخر سب خاموش ہوگئے یہ معلوم تھا کہ بات کا دھنی لیگا تو یہی لیگا ورنہ جان دے دیگا! اس کا قدرتی اثر برقی قوت کی تیز رفتاری سے ملک کے گوشہ گوشہ تک پہونچا ہندو قوم کی ذہنیت جو ہزارہا سال سے ذات پات کی قیود میں مکڑی ہوئی تھی خود بخود بدلنے لگی، جگہ جگہ مندروں کے دروازے کھلنے لگے۔ برہمنوں نے بھنگیوں کو گلے لگایا، اونچ ذات والوں نے نیچ ذات کے ہاتھوں سے کھانا کھایا، اور چھوت چھات کے خلاف ایک شورش شروع ہوئی۔

گاندھی جی نے اپنے اس اہم فیصلے کے متعلق ایک بیان اخبارات کے نمائندوں کو دیا اور ایک بیان حکومت کے ذریعہ سے شائع کرایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ" اچھوتوں کے ساتھ ہندو قوم نے ہزارہا سال سے جو ظالمانہ برتاؤ کیا ہے اس کے کفارے کے لئے میری ایسی ہزاروں جانیں قربان ہوں تب بھی کافی نہیں لیکن اس کے باوجود میں اپنے ذاتی علم اور تجربہ کی بنا پر جانتا ہوں کہ اچھوت ذات کے لوگ ہندو دھرم ہی کے حلقہ بگوش ہیں اور وہ اسی میں رہنا چاہتے ہیں ایسی صورت میں جداگانہ طریق انتخاب کے ذریعہ اگر اچھوتوں کو ایک علیحدہ فرقہ تسلیم کرلیا گیا تو جو مصلحین نیچ ذاتوں کی اصلاح کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرچکے ہیں اور برابر ان کی ترقی اور اصلاح کے لئے کوشش کررہے ہیں ان کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا ہوجائیں گی کہ آئندہ یہ جماعت ہمیشہ کے لئے ایک علیحدہ فرقہ بن جائے گی اس لئے میرا مذہب اور میری سیاست اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہندو جاتی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اس کوشش کو میں نظرانداز کردوں اور اونچ ذات والے ہمیشہ اونچ ذات میں رہیں اور نیچ ذات والوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ اچھوت کے لئے مخلوط انتخاب میں ہر قسم کے تحفظات کرائے جائیں۔ ہر قسم کی رعایتیں کردی جائیں مگر جداگانہ طریق انتخاب سے ہندوؤں کے اندر قانوناً کوئی فرقہ قائم کردیا گیا تو میں اس کو گوارا نہیں کرسکتا۔

گاندھی جی نے اپنے خیالات ہندوؤں اور اچھوتوں کے نمائندوں کے سامنے بھی مختلف ملاقاتوں میں ظاہر کردیئے۔ مسئلہ زیادہ پیچیدہ تھا، ایک طرف اچھوتوں کے لئے جداگانہ انتخاب تھا دوسری طرف گاندھی جی کی جان۔ ظاہر ہے کہ ہندو قوم اپنے نمائندوں کو اس قدر آسانی سے قربان نہیں کرسکتی تھی۔ اچھوتوں کی ایک جماعت سمجھوتے کے لئے تیار تھی۔ دوسری جماعت اڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا دل بھی بالآخر پسیجا اور کئی دن کی گفت وشنید کے بعد فیصلہ ہوگیا۔ فوراً وزیر اعظم کو اس کی اطلاع دی گئی اور ۲۶ ستمبر کو چار بجے وزیر اعظم نے بحری پیغام کے ذریعے اپنے تصفیہ کے ہر حصہ کو جس کا تعلق اچھوتوں سے تھا منسوخ کرنے کا اعلان کردیا۔ یہ اطلاع گاندھی جی کو ۴ بجے شام کو ملی اور گاندھی جی نے ۵ بجے ایک بہت بڑی جماعت کی موجودگی میں جس میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور بھی تھے ساتویں دن برت توڑا۔

تصفیہ یہ ہوا کہ طریق انتخاب مخلوط ہوگا اور مختلف صوبجات میں حسب ذیل نشستیں اچھوتوں کے لئے مخصوص ہوں گی۔

جدید تصفیہ	نشستیں	وزیر اعظم کا تصفیہ۔	نشستیں
۱۔ مدراس	۳۰	مدراس	۱۸
۲۔ بمبئی	۱۵	بمبئی	۱۰
۳۔ پنجاب	۸	پنجاب	
۴۔ بہار اڑیسہ	۱۸	بہار اڑیسہ	۷
۵۔ ممالک متوسط	۲۵	ممالک متوسط	۱۰
۶۔ آسام	۷	آسام	۴
۷۔ بنگال	۳۰	بنگال	۱۰
۸۔ ممالک متحدہ	۲۰	ممالک متحدہ	۱۲
کل	۱۴۸	کل	۷۱

عام انتخاب سے قبل ایک ابتدائی انتخاب ہوگا جس میں صرف اچھوت رائے دہندگان اپنی رایوں سے ایک ایک نشست کے لئے چار چار نمائندے منتخب کریں گے اور صرف یہی نمائندہ عام انتخاب میں بطور امیدوار کے حصہ لے سکیں گے۔

یہ ابتدائی انتخاب دس سال کے بعد خود بخود یا اگر کوئی سمجھوتا ہو جائے تو اس سے پہلے ہی ختم ہوجائے گا۔ ممکن ہے پھر قانون ساز مجالس میں اچھوتوں کی نمائندگی اور دیگر مختلف فیہ امور کے متعلق بھی سمجھوتہ ہوگیا ہے لیکن وزیر اعظم کے تصفیہ میں چونکہ ان کا کوئی ذکر نہیں اس لئے فی الحال وہ خارج از بحث ہے البتہ جب کبھی وہ مسائل طے کئے جائیں گے تو متعلقہ مسائل اس سمجھوتے کی بنا پر خود بخود طے ہو جائیں گے۔

گاندھی جی نے اپنے برت کو توڑتے وقت یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ میں اپنے برت کو صرف ملتوی کر رہا ہوں۔ اگر ہندو جماعت نے ایک مدت کے اندر اچھوت چھات کو ترک نہ کر دیا تو میں پھر برت شروع کر دوں گا۔ گاندھی جی کا جو اثر مسلمانوں پر اور ہندوؤں کے ہر طبقے پر ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ ہندو جماعت اب دوبارہ گاندھی جی کو اس قسم کے برت کی تکلیف نہ دے گی۔ اچھوت خوش قسمت ہیں کہ گاندھی جی کی سرپرستی ان کو نصیب ہوئی اور اب بڑے بڑے اونچ ذات کے ہندو نیچ ذات والوں کو قعر مذلت سے نکالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ گاندھی جی کے اثر سے ایک طرف ہندو جماعت نے اس قدر غیر معمولی فراخدلی کا ثبوت دے کر سات کروڑ اچھوتوں کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیا۔ اب دیکھنا ہے کہ دوسرے فرقہ وارانہ اختلافات کو دور کرنے کے لئے ہمارے رہنما کیا قدم اٹھاتے ہیں

ممالک غیر

<u>جرمنی کی نئی حکومت</u> گذشتہ انتخابات کا نتیجہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اس وقت عارضی طور پر فان پاپن کی وزارت کام کر رہی تھی۔ آئندہ حکومت کی تشکیل کا مسئلہ زیر غور تھا۔ اس تشکیل کی چار صورتیں ہیں ۱۔ پہلی تو یہ کہ فان پاپن وزیر اعظم رہیں اور ان کے ساتھ مضبوط اور لائق حکمرانوں کا وہ چھوٹا سا گروہ ہو جسے صدر جمہوریت فان ہنڈنبرگ کا اعتماد حاصل ہو۔ یہ حکومت ہر مسئلہ پر وقت کی ضرورت کے لحاظ سے رائے قائم کرے گی اور بجائے فرقہ وارانہ پروگراموں کے جرمن قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھے گی۔ پارلیمنٹ کا نام باقی رہے گا ورنہ یہ حکومت دراصل صدر جمہوریہ کی نمائندہ ہوگی نہ کہ مجلس آئین سازی کی۔

۲۔ دوسری صورت یہ تھی فان پاپن مستعفی ہو جائیں اور ہٹلر کو جو پارلیمنٹ میں سب سے بڑی جماعت کا سردار تھا وزارت بنانے کے لئے کہا جائے۔ وہ اپنی قومی۔ اشتراکی اور قوم پرست (نیشلسٹ) جماعت کو ملا کر وزارت مرتب کرلے

۳۔ تیسری صورت یہ تھی کہ فان پاپن خود تو صدر اعظم رہیں لیکن اپنی وزارت میں کچھ لوگ جماعت وسطیٰ سے لے لیں

۴۔ چوتھی تجویز یہ تھی کہ ہٹلر صدر اعظم ہو، وزارت میں تین چار آدمی اپنی جماعت کے اور لے لے لیکن فان پاپن کی وزارت کے چند مضبوط آدمی بھی ساتھ رہیں تاکہ ساری قوت اس کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ یہ وزارت بھی پہلی تجویز والی وزارت کی طرح صدر جمہوریت کی نائب ہوتی۔ البتہ اس میں ہٹلر کو اپنے پروگرام کے ان حصوں پر عمل کا موقع مل جاتا جس نے جرمن نوجوانوں پر اتنا اثر کیا ہے اور فان ہنڈنبرگ اور فان شلائشر کی موجودگی اس کی ضامن ہوتی کہ زیادہ انقلابی کارروائیاں نہ کی جا سکیں گی۔

چوتھی صورت ہٹلر نے منظور نہ کی کہ وہ بلا پوری قوت کے ذمہ داری لے کر اپنی ہر دلعزیزی کھونے پر تیار نہیں تیسری صورت اس لئے ممکن نہ ہوئی کہ جماعت وسطیٰ کے سرآوردہ رکن ڈاکٹر بروننگ نے جو پہلے صدر اعظم تھے ہٹلر کی جماعت

کے ساتھ فان پاپن کی وزارت میں شرکت منظور نہ کی دوسری صورت کے لئے پہلے ہٹلر خود کچھ تیار نہ تھا۔ دعدوں میں مبالغے سے کام لینے والے اکثر ایفا کے امتحان سے بچنا چاہتے ہیں اور جب یہ آمادہ ہوا تو صدر جمہوریت ہنڈنبرگ نے اسے اتنی قوت دینا قومی مفاد کے خلاف جانا۔

چنانچہ پہلی ہی تجویز پر عمل ہوا۔ فان پاپن وزیر اعظم ہیں اور ان کے دست راست جنرل فان شلائشر وزیر جنگ۔ پارلیمنٹ کے افتتاح کے ساتھ ہی ایک کمیونسٹ کی تجویز پر بہت بڑی اکثریت نے اس وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ منظور کیا۔ عدم اعتماد کی تجویز پر رائے لینے سے پہلے فان پاپن نے صدر جمہوریت کا حکم لا کر صدر پارلیمنٹ کو دیا کہ پارلیمنٹ برخاست کر دی جائے۔ صدر نے رائے لینے سے پہلے اس حکم کو دیکھنے سے انکار کیا رائے لینے کے بعد پارلیمنٹ برخاست ہو گئی اور فان پاپن کی وزارت صدر جمہوریت کے حکم سے کام کر رہی ہے۔

جرمنی کی حکومت آج کسی معنی میں جمہوری نہیں۔ لیکن اس وقت حکومت کی شکل کا مسئلہ قوم کے سامنے نہیں بلکہ با امن اور منظم زندگی یا انراج کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس پریشان حالی میں قدیم جمہوری طریقوں سے نظم قائم کرنے کی امید بہت کم ہے کہ یہ پچھلے دنوں خوب آزمائے جا چکے ہیں۔ شاید موجودہ صورت میں سب سے بہتر صورت ہوتی اگر جمہوریت کا ہر دلعزیز صدر ہنڈنبرگ اس قدر ضعیف نہ ہوتا اور حکومت کا بوجھ خود اٹھا سکتا۔ جرمنی میں آج یہی ایک آدمی ہے جو عارضی طور پر پارلیمنٹی حکومت کی تلافی کر سکتا تھا لیکن اس کی کہنہ سالی سے اندیشہ ہے کہ اصل قوت بھی دوسرے ہاتھ میں رہے گی۔ اور قیاس ہے کہ یہ ہاتھ جنرل فان شلائشر کا ہوگا۔

جنرل فان شلائشر کا اثر فوج پر بھی ہے۔ جنگی بیڑہ پر بھی اور پولیس پر بھی۔ یہ غیر معمولی قابلیت کا آدمی ہے اور فوجی طبقوں میں بہت ہر دلعزیز ہے۔ یہ گمان کہ یہ شخص قدیم شاہی نظام کو دوبارہ قائم کرا دے گا۔ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس نے اپنی ایک معرکۃ الآرا تقریر میں صاف صاف کہا کہ جرمنی کی قومی زندگی سنگینوں اور فرمانوں سے نہیں چل سکتی اور حکومت وہی قائم رہ سکتی ہے جو اپنے کاموں اور اپنے ارادوں کے لئے قبول عام حاصل کر سکے۔ اس کا یہ قول بھی بہت پر معنی ہے کہ ہم فوج کو اس لئے استعمال نہیں کر سکتے کہ قوم کے ایک طبقہ کے مقابلہ میں کسی دوسرے طبقہ کو دبا کر رکھیں اور ہم اس سے یہ کام لے سکتے ہیں کہ ان معاشی اداروں کو سہارا دیں جو فرسودہ ہو چکے ہیں! کیا عجب ہے کہ یہی شخص کچھ عرصہ تک جرمنی سیاست پر حاوی رہے اور اگرچہ فان پاپن صدر اعظم ہو لیکن پس پردہ کار فرما قوت اسی کی شخصیت ہو۔

تخفیف اسلحہ کی کانفرنس اور جرمنی | جنیوا میں تخفیف اسلحہ پر تقریباً چھ مہینے تک جو تقریریں ہوئیں ان کا نتیجہ بالآخر کچھ نہ نکلا۔ قوموں کے نمائندوں نے طرح طرح کی تخفیف اسلحہ میں کمی کی پیش کیں لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو ہر ایک نے وہی تخفیف

پیش کی جس میں اس کا فائدہ تھا مہینوں کی چھان بین کے بعد ماہرین جادی پر بھی مشکل سے متحد ہوسکے اور بآلآخر
جب امریکہ کے صدر ہوور نے تخفیف کی حمایت پر زور دیا اور قرضہائے جنگ کے تصفیہ کو اس تخفیف پر مشروط ک
تو ایک قرار داد منظور کر کے کانفرنس کے کام کو آئندہ اجلاس کے لیے ملتوی کر دیا گیا جو چند ماہ بعد منعقد ہوگا! جرمنی ا
روس نے اس قرار داد کی مخالفت کی کہ ان کے نزدیک یہ سب ایک خالی ڈھونگ تھا۔ امن پسندی کے دعویدار چن
بیوقوف اور امن پسندی کی آڑ لینے والے چند سیاسی عیاروں کی یہ کانفرنس جب اپنی لاحاصل سعی میں معروف ت
اسی وقت قومیں آئندہ جنگ میں اپنے ساتھیوں کا انتخاب کر رہی تھیں اٹلی۔ ترچھی نظروں سے فرانس کو دیکھ رہا تھا
روس اور جرمنی سے اتحاد کا خواہاں تھا۔ جرمنی بھی روس سے ساز باز کر رہا تھا۔ فرانس اور انگریز جنگ کے لئے
جہیں تو قرضہائے جنگ کے تصفیہ کے لئے مل کر امریکہ کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ امریکہ بھی جاپان کی بڑ
ہوئی قوت کو روکنے کے لئے ہی امن پسندی کا علمبردار بن رہا تھا پھر کیسے ممکن تھا کہ وہ قومیں جو اس وقت کمزور ہی
ذرا بھی اطمینان کے ساتھ مستقبل کا انتظار کریں۔ انھیں قوموں میں جرمنی بھی ہے!

جرمنی کی فوجی قوت پر تو اب تک صلح نامہ ورسائی کی وجہ سے سخت پابندیاں عائد ہیں۔ جرمن قوم اپنی ا
توہین سے حد درجہ متاثر ہے اور کسی چیز سے نہیں۔ اس اسلحہ کانفرنس سے اسے توقع تھی کہ شاید فاتح اقوام اپنے ا
میں واقعی تخفیف کریں۔

اس کے نمایندوں نے صدر ہوور کی تجاویز کی تائید کی۔ برطانوی کی تجاویز کی تائید کی لیکن نتیجہ سوائے ب
کے کچھ نہ نکلا۔ بالآخر ۱۳ سال کی انتظار کشی کے بعد تمام امیدوں پر پانی پھرتے دیکھ کر ظاہر ہے جرمنوں کو کتنی ب
ہوئی ہوگی۔ انھوں نے خالی نقلی قرار داد کی تائید سے انکار کیا اور روس نے صاف صاف کہا کہ اگر تم اپنے اس
نہیں کم کرتے تو اب ہماری قوم اپنے اسلحہ پر پابندیاں گوارا نہیں کر سکتی۔ اور اٹلی کے نمایندہ کا ونٹ نادولنی
اعلان کیا کہ اگر ہمیں سب کی طرح اپنی حفاظت کا حق نہ دیا گیا تو ہم جنوری کی دوسری اسلحہ کانفرنس میں شرک
نہ کریں گے اس کے بعد جنرل فان شلائشر نے جو جرمنی کا وزیر جنگ ہے اسی خیال کو ایک تقریر میں نہایت
وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا اور پھر ایک باضابطہ نوٹ فرانسیسی حکومت کو اس مضمون کا بھیجا گیا۔ فرانس میں اس
سخت تشویش کا اظہار ہو رہا ہے اور انگلستان نے بھی جرمنی کی اس عبارت کو سراہا نہیں بلکہ باوجود اس دوست
جو وہ پچھلے دنوں برابر جرمنی کے ساتھ ظاہر کرتا رہا ہے غیر متوقع طور پر اس بارے میں جرمنی ہی کو الٹا ڈانٹا ہے۔ کیو
نہ ہو۔ اس وقت امریکہ سے قرضہائے جنگ کا معاملہ طے کرنے کے لئے فرانس سے ملا رہنا ضروری ہے۔ جرمنی سے اس
مرحلے کے طے ہو جانے کے بعد بھی دوستی کرنے کا موقع رہے گا۔ لیکن باوجود اس تشویش اور ناخوشی کے جرمنی اپ
ارادہ پر قائم ہے۔ اور اس نے مسٹر انیڈرسن کی دعوت کو کہ تخفیف اسلحہ کانفرنس کی کمیٹی میں شرکت کرے مسترد کر دیا

بلکہ اس کا تحریری جواب تک دینا ضروری نہیں سمجھا۔

روس اور ایشیا پچھلے دنوں روس نے اپنے ہمسایوں سے سیاسی تعلقات کو بہت کچھ استوار کر لیا ہے مشرق میں جاپان سے روز افزوں مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ چین سے جو تعلقات ۱۹۲۹ء میں منقطع ہوگئے تھے پھر جڑ چلے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ چینی مشرقی ریلوے پر جو جھگڑا چین اور روس میں ہوا تھا اس نے چینی قومی تحریک سے روس کا اثر تقریباً مٹا دیا تھا۔ لیکن منچوریا میں جاپان کی دراز دستی، منچوریا اور سائبریا کی سرحد پر فوجوں کے اجتماع نے چین اور روس میں پھر اشتراک مقاصد پیدا کر دیا ہے اور نانکنگ کی حکومت اشتراکی خیالات اور روسی اثر سے اب پہلے کی طرح نہیں بھڑکتی۔ بلکہ چند مہینے ہوئے ایک خاص چینی وفد ماسکو گیا جس نے مشرقی ریل کے قضیہ کو ختم کرکے ایک تجارتی معاہدہ کی طرح ڈالی ہے اور آخر جولائی سے چین میں روسی پھر آباد ہوگئے ہیں۔

ترکی سے تعلقات پہلے بھی اچھے تھے مگر حال میں دوستی کا مظاہرہ اور بھی زیادہ کیا گیا ہے۔ حال میں جب ترکی وزیر اعظم نے روس کا سفر کیا تو ان کا ایسا استقبال ہوا جس کی دوسری مثال روسی سوویت حکومت کی تاریخ میں موجود نہیں۔ روس ترکی اور اٹلی سے بھی روابط پیدا کرانا چاہتا ہے تاکہ یورپ میں فرانسیسی اثر توڑ سکے۔

جرمنی میں گذشتہ چند مہینوں کے واقعات نے جو سیاسی تبدیلی پیدا کی ہے اس کا نتیجہ پولینڈ نے یہ نکالا کہ وہاں فوجی اثر بڑھیگا اور عہد نامہ ورسائی کی شرائط خصوصاً جنگ کی ذمہ داری کا افسانہ عنقریب حرف غلط ثابت ہوگا۔ اگر وہ اپنے معاملات میں خالی فرانس کی مدد پر بھروسہ کرے گا تو دھوکا کھائیگا۔ چنانچہ اس نے روس سے ایک معاہدہ کر لیا ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے پر حملے سے محترز رہیں گی۔ اس معاہدہ میں کچھ دیر اس وجہ سے ہوئی کہ پولینڈ چاہتا تھا کہ رومانیہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہو اس لئے کہ پولینڈ اور رومانیہ میں پہلے سے یہ سمجھوتا تھا کہ ایسے معاملات میں دونوں ساتھ رہیں گے۔ روس کے لئے بھی بڑی دشواری تھی کہ وہ اپنے مغربی ہمسایوں سے جدا جدا معاملہ نہیں کر سکتا تھا اب اس نے پولینڈ کو الگ کر لیا ہے۔ اس سے رومانیہ کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی آسانی ہوگی اور مشرقی یورپ کی دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی غالباً جلد پولینڈ کی تقلید کریں گی اور یوں بین الاقوامی سیاست میں روس کی حیثیت خاصی قوی ہو جائے گی۔

جرمنی سے روس کے تعلقات اب تک بہت اچھے تھے ۱۹۳۲ء میں جرمن برآمد کے لئے روس کی منڈی دوسرے نمبر پر تھی اور ۱۹۳۳ء کے شروع میں تو جرمن کی سب سے زیادہ برآمد اسی ملک کو جا رہی تھی مگر حال میں جو واقعات جرمنی میں رونما ہوئے ہیں اور وہاں اشتراکین کے خلاف جو ردعمل ہوا ہے اس نے ان دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی ہے ادھر اوٹاوہ کانفرنس کی کارروائیوں سے اندیشہ تھا کہ برطانیہ اور برطانوی نوآبادیوں میں روسی تجارت کو خاصا نقصان پہنچے گا۔

ممالک اسلامی

۱۔ اعلیٰحضرت نادر شاہ غازی کی تقریر: آٹھویں اگست میں استقلال افغانستان کی چودھویں سالگرہ کا جشن نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ یہ زمانہ کابل میں بڑی رونق کا تھا۔ طرح طرح کے جلسوں اور کھیل تماشوں کا سلسلہ دو تین روز تک برابر جاری رہا لیکن ان وقتی ہنگاموں سے بڑھ کر ہمارے لئے قابل توجہ اعلیٰحضرت شہریار غازی کی وہ تقریر ہے جو اسی موقع پر انھوں نے ملت افاغنہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمائی۔ حالات آپ نے کہا:۔

"....آزادی نام ہے اس امر کا کہ ہم اپنی عزت و اقتدار کے ذریعے اپنے ملک اور دولت کو غیروں کے تسلط سے محفوظ رکھیں۔ آزادی کا تعلق زندگی کے جملہ شعبوں، تمام حیاتی ضروریات اور حوادث و واقعات سے ہے ملت اور حکومت کی آزادی کے لئے استقلال تام اور اختیار مطلق ناگزیر ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایسے فرزند چاہئیں جو صاحب عزم اور صاحب طاقت ہوں۔ جو قوم اپنے مضبوط اور مستحکم عزائم کی بناء پر اپنے حق آزادی کا ثبوت دے سکتی ہے اسی قوم کی دنیا میں عزت بھی ہوتی ہے اور وہی دوسری ملتوں سے اپنا رتبہ منوا سکتی ہے۔ اس کے عزم و ارادہ کے سامنے ہر قسم کی مشکلات اور ہر طرح کی پیچیدگیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ سعادت و اقبال مندی اس کے ہمرکاب ہوتی ہے...... اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو حریت کا درجہ نہایت بلند ہے اس کا منشا یہ ہے کہ دین کے مکمل احکامات کے مطابق ہم اپنی قومی حیثیت کو مضبوط کریں......... میں کمال انکسار اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں سپاس گزار ہوں کہ اس نے افغانستان کو آزادی و استقلال کی نعمت عطا فرمائی....

......میرا طریق حیات یہ ہے: بندگی اور عشق۔ بندگی خدا کے لئے اور عشق وطن سے۔ نہ خدا کے لئے میری بندگی مطامع دنیاوی کا نتیجہ ہے نہ عشق وطن میں مجھے عقل و اندیشے سے سروکار ہے میری کامیابیاں محض الطاف خداوندی سے ہیں... میں اپنی ملت کے لئے ایک دل پر درد اور پر آرزو رکھتا ہوں کہ اس دل اور بارگاہ ایزدی کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں۔ میں نے کوئی کام اپنی دانش و ثروت یا قوت سے نہیں کیا میری قوت میرا عجز ہے۔ میری عقل میرا عشق اور میری ثروت میرا اخلاص اور فداکاری۔ بارگاہ خداوندی میں میری دعا ہے کہ اس دولت بندگی سے مجھے کبھی محروم نہ رکھے اور میں ہمیشہ خلوص و فداکاری کے راستے پر استقامت کے ساتھ گامزن رہوں...... خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کی ملت عزیز کو دنیا و عاقبت میں کامیاب فرمائے...."

یہ افغانستان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسا حق گو اور حق پرست فرمانروا ملا ہے جو عیش و کامرانی کے بجائے

سے بڑے موقعوں پر بھی خدائے واحد و قہار کے سامنے انسانی عجز اور درماندگی کو فراموش نہیں کرتا جس کا دل اسلام کا شیفتہ اور عشق ملت سے مالا مال ہے اور جس نے تین برس کے قلیل عرصہ میں افغانستان کا مرتبہ دنیا کی ذی عزت قوموں کی نظر میں از سر نو ملند کر دیا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ انقلاب افغانستان کے تمام آثار اب ہر جگہ ناپید ہو چکے ہیں مولنا شوکت علی جنہوں نے شاہ نادر کی دعوت پر جشن استقلال میں شرکت فرمائی بیان کرتے ہیں کہ "افغانستان کے حالات نہایت اطمینان بخش ہیں حکومت کو کسی طرح کی مالی دقتیں درپیش نہیں۔ اس سال نظام آبپاشی کے لئے چالیس لاکھ روپیہ منظور ہوا ہے بیس لاکھ روپیہ اس سڑک کی تعمیر پر صرف کیا جائے گا جو کابل سے بدخشاں گئی ہے اور جو امید ہے کہ سال بھر میں تیار ہو جائے گی۔۔۔۔۔ تعلیم، صنعت و حرفت ۔۔۔۔۔ ہر چیز ترقی پر ہے ۔۔۔۔۔ اعلحضرت نادر شاہ غازی کو حکومت و سلطنت اور سپہ سالاری کے غیر معمولی ملکات عطا ہوئے ہیں۔ افغانوں کو ان کی ذات سے بیحد محبت ہے۔"

۲۔ پیام اقبال بہ ملت کوہسار | عنوان بالا کے ماتحت مجلہ کابل کے استقلال نمبر میں علامہ سر محمد اقبال کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کو ہم قارئین جامعہ کی ضیافت طبع کے لئے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ یہ گویا اسلامی ہند کا پیام مودت ہے اپنے افغان بھائیوں کے نام ہم جریدہ کابل کے شکر گزار ہیں کہ اس کی بدولت علامہ ممدوح کا تازہ کلام ایک مرتبہ پھر دیکھنے میں آیا۔

صبا بگوئے بہ افغان کوہسار از من — بمنزلے رسد آں ملتے کہ خود نگر است
مرید پیر خراباتیان، خود بیں، شو — نگاہ او ز عقاب گرسنہ تیز تر است
ضمیر تست کہ نقش زمانہ نو کشد — نہ گردش فلک است ایں نہ گردش قمر است
دگر نسلسلۂ کوہسار خود بنگر — کہ تو کلیمی و صبح تجلی دگر است
بیا بیا کہ بداماں نادر آویزم — کہ مرد پاک نہاد است و صاحب نظر است
یکے است ضربت اقبال و ضربت فرہاد — جز اینکہ تیشۂ ما را نشانہ بر جگر است

۳۔ ایران و ترکی کی اقتصادی ترقی | اس سال شاہ پہلوی کے ایک فرمان کی رو سے ایران کے طلائی سکے (اشرفی) کی قیمت ۱۰۰ ریال مقرر کی گئی ہے اور سابق قران کو ایک ریال کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ سکے کی اس تبدیلی کے ساتھ تمام زر کاغذی واپس لے لیا گیا ہے اور اب حکومت کا اختیار ہوگا کہ جب مناسب سمجھے کاغذی سکہ از سر نو جاری کرے ایران کی تجارت برآمد میں جو تخفیف رونما ہو گئی تھی اس کو درآمد پر مختلف قیود عائد کر دینے سے پورا کر لیا گیا ہے سواحل خزر میں چائے تمباکو اور ریشم کی کاشت برابر اضافہ پذیر ہے۔ شکر سازی دباغت اور پارچہ بافی کی صنعتیں

ترقی پر ہیں۔

قارئین جامعہ کو یاد ہوگا کہ حکومت ایران حتی الوسع تجارت درآمد برآمد کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی کچھ وجہ تو ایرانی تاجروں کا ناقص طریق کاروبار ہے اور کچھ حکومت کا یہ اندیشہ کہ وہ اپنے آپ کو دول خارجی بالخصوص روس کے پنجۂ آز سے محفوظ رکھ سکے۔ اس سال شکر، چائے، اور دیاسلائیوں کی تجارت حکومت کے اجارے میں آچکی ہے اور قرارداد ہے کہ موٹروں کی درآمد بھی حکومت کے زیر نگرانی آجائے تقریباً ۹۰ فی صدی موٹر ریاستہائے متحدہ سے منگوائے جاتے ہیں اور امریکہ اور ایران کے درمیان تجارت کی سب سے بڑی مد یہی ہے۔

مجلس ملیہ انگورہ کے اجلاس جولائی میں زیادہ تر بحث فضائی آمد و رفت کے مسئلے پر ہوئی لوروزکی بے (وزیر حرب) نے بیان کیا کہ پچھلے اکتوبر میں ایک امریکن کمپنی سے اس امر کی گفت و شنید ہوئی تھی کہ تمام اناطولیہ میں فضائی سفر کا انتظام کیا جائے چنانچہ اب ایک سال تک قیساریہ میں امریکن انجنیروں سے طیاروں کی ساخت میں مدد لی جائے گی۔ سال بھر کے بعد جانبین کو اختیار ہوگا کہ معاہدے کو ختم کردیں یا اس میں مناسب ترمیم کرلیں اول ہوائی ڈاک اور اس کے اسٹیشنوں کی تعمیر پیش نظر ہے اور اگرچہ امریکن کمپنی کو یہ حق ہوگا کہ وہ استنبول اور یورپ کے درمیان آمد و رفت کا انتظام کرے لیکن اناطولیہ کی ساری آمد و رفت حکومت کا اجارہ ہوگی۔ اس کے لئے ایک ترکی کمپنی قائم کی جارہی ہے جس کا ارادہ شروع میں ۱۲ طیارے بنوانے کا ہے۔

البتہ مجلس ملیہ کے اسی اجلاس کی کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو میزانیے کی ترتیب اور توازن میں غیر معمولی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سال اخراجات حکومت کا اندازہ تقریباً سولہ کروڑ پاونڈ ہے۔ سال گذشتہ کی نسبت اس میں ۲ کروڑ پاؤنڈ کی کمی ہے باوجود اس کے حکومت کو شدید ٹیکسوں کی ضرورت پیش آئی مگر ترک فیصلہ کرچکے ہیں کہ وہ اپنی آمدنی اور خرچ کے عدم توازن کو کسی طرح بھی قرض لے کر دور نہیں کریں گے۔

۴۔ حالات یمن | جریدہ "کرنٹ ہسٹری" کو بعض عربی ذرائع سے یمن کے متعلق جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کا ملخص یہ ہے۔

"یمن کی انتظامی تقسیم اب تک وہی ہے جو ترکوں کے زمانے میں تھی۔ حکومت کی کل آمدنی تقریباً پچاس لاکھ اسٹرلنگ ہے لیکن اس کے اخراجات بالعموم آمدنی کے ۱/۴ حصے سے زیادہ نہیں بڑھتے۔ نہ یمن میں اس زمانے کی مالی مشکلات کا چرچا ہے نہ کسی کو بے روزگاری کی شکایت ہے۔ حکومت کے محاصل جن ذرائع پر مشتمل ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ آبیانہ (۲) جاگیری اراضی کا ٹیکس (۳) جزیہ جو یہود سے لیا جاتا ہے ۴۔ جانوروں کا ٹیکس اور (۵) محصول تجارت ۸ فی صدی ضروریات پر اور ۱۵ سے ۲۰ فی صدی تک تعیشات پر۔ بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے موجود

ہیں جن میں اطالوی اور یمنی اطبا کام کرتے ہیں ہر گاؤں میں ایک ابتدائی مدرسہ قائم ہے اور شہروں میں ثانوی مدارس صنعا میں عربی مذہبی اور تعلیمی مدارس کے علاوہ ایک اعلیٰ مدرسہ بھی قائم ہے جس میں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یمن میں اطالوی اثر ترقی پر ہے اریٹریا (ساحل افریقہ) کے اطالوی مدرسوں میں یمنی بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اور بنک آف اٹلی کی شاخیں یمنیوں کو قرضہ دینے میں مطلق پس و پیش نہیں کرتیں۔ بایں ہمہ امام حمید الدین یحییٰ اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں کہ یمن کی آزادی قائم رہے۔ آمین۔

۵۔ <u>عراق کی دولت انگلستان میں</u> یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مشرق قریبہ میں دول مغرب نے "انتداب" کے نام سے جو دام بچھا رکھا ہے اس کا مقصد سیاست سے بڑھ کر اقتصادی اور تجارتی فوائد حاصل کرنا ہے آج کل انگریزی اخبارات میں عراق و شام کی ترقی کی داستانیں بڑے ذوق و شوق سے بیان کی جاتی ہیں۔ شہروں کی صفائی، ان کی تزئین اور آرائش، ذرائع آمد و رفت کی ترقی، سینما ہال، تھیٹر یہ چند چیزیں ہیں جن کے قیام کو آزادی اور روشن خیالی کا طغرائے امتیاز سمجھا جاتا ہے لیکن مقصود ان سب کا ایک ہے اور وہ یہ کہ انگلستان و فرانس کی کمپنیاں ان ممالک کی دولت سے مالا مال ہوں مثال کے طور پر عراق ہی کو لیجئے جہاں اب ایک فضائی بندرگاہ تعمیر ہوا ہے اور جس سے گویا انگریزوں کے پنجۂ سیاست کی گرفت عراق کے گلے پر اور زیادہ مضبوط ہو گئی ہے اس کے ساتھ ہی یہ دلچسپ خبر بھی سننے میں آئی ہے کہ بلدیہ بغداد نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شہر کے گلی کوچوں اور سڑکوں کی صفائی اور تعمیر کا کام مغربی طریقوں پر شروع کر دیا جائے ظاہر ہے کہ اس خدمت کو انگریز مہندسین ہی انجام دیں گے اور اس کے لئے جو مسالہ یا سامان درکار ہوا وہ بھی انھیں کی معرفت خریدا جائے گا بصرہ، اور موصل میں برقی کارخانے قائم ہو رہے ہیں اول الذکر کارخانہ لنکن کی کمپنی آسٹن اور ہارنس بائی کے ہاتھ میں ہوگا موخر الذکر گلاسگو کی دو کمپنیوں کے حصے آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مشرقی قومیں ابھی ایک مدت تک تجارت، صنعت و حرفت میں یورپ کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ ان کیلئے مغربی اقوام کا اشتراک اور تعاون ناگزیر ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ آخر آخر ان سب چیزوں کا فائدہ عراق ہی کو پہونچے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت کے آنے تک اہل عراق کا حشر کیا ہوگا۔ آزادانہ اشتراک اور مجبوری کے اشتراک میں کچھ تھوڑا فرق نہیں۔ یہ دراصل زندگی اور موت کا سوال ہے۔

۶۔ <u>سلطان ابن سعود کی مشکلات</u> ابن رفادہ کے قتل سے بظاہر شورش حجاز کا خاتمہ ہو گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سلطان ابن سعود کی حکومت اب مشکلات سے آزاد ہے۔ شمالی عرب میں ماورائے اردن کی سرحدوں پر نئی نئی پیچیدگیاں رونما ہو رہی ہیں یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ان اطراف کے اکثر قبائل ہاشمی دعوت کے زیر اثر ہیں اور گو شریف حسین اب اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی اولاد اپنے آبائی وطن اور کھوئی ہوئی حکومت کو ابھی تک نہیں بھولی۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ماورائے اردن کے علاقے

حکومت نجد و حجاز کے خلاف فتنہ دوانیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ سلطان ابن سعود فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ عقبہ بالعوذ کو کسی شکل میں تسلیم نہیں کریں گے۔ عقبہ پر انگریزی قبضہ ان کو شروع ہی سے ناگوار ہے اور انصاف سے دیکھا جائے تو انھیں اس کا حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ انگریزی سلطنت کے اس ناروا فعل پر صدائے احتجاج بلند کریں۔ ادھر عراق و ماورائے اردن کے ننھے منے "امیران عرب" جو دول مغرب کی انگشت انتداب پر ہمیشہ رقص کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اب "اتحاد عرب" کے آرزومند بنے ہیں ظاہر ہے کہ جس اتحاد کی دعوت انتدابی حکومتوں کے ہاتھ میں ہوگی وہ استقلال عرب کے لئے کس طرح مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بہرکیف ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ جلالت الملک کی حکومت ان خطرات سے غافل نہیں جو بہت ممکن ہے جلد یا بدیر عقبہ اور سرحد ماورائے اردن پر رونما ہو جائیں۔ تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ فلسطین میں سلطان کی حمایت کے لئے روپیہ اور سپاہی فراہم کئے جا رہے ہیں اگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو اہل فلسطین کی امداد سے سلطان اپنی جنگی تجاویز کو آسانی تکمیل کر سکیں گے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جلالۃ الملک نے سابق عرب اور ترک سرداروں کو جو کسی زمانے میں عساکر عثمانی کے ملازم تھے۔ بڑے بڑے عہدوں پر کام کرنے کی دعوت دی ہے اس طرح ان کو جنگی قابل اور آزمودہ کار افسروں کی ایک اچھی جماعت مل جائے گی لیکن ان کے انتخاب میں یقیناً ان کو احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔

بہر حال حکومت نجد و حجاز ابھی ہر طرف سے مطمئن ہے اور اس کا بڑا کام صرف یہ ہے کہ ایک تو نہایت خاموشی اور احتیاط کے ساتھ شمالی سرحد بالخصوص عقبہ کے حالات کو مد نظر رکھے اور ثانیاً اندرون نجد کے قبائل کو جن کا ولولۂ جہاد دن بدن نازک صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ امن و سکون سے کام لینے کی دعوت دے

۷۔ اندلس عربیت کے آغوش میں! تین ساڑھے تین سو برس کی خاموشی کے بعد سرزمین اندلس میں قدیم عربی تہذیب و تمدن سے جذبۂ محبت کے آثار پھر نمایاں ہو رہے ہیں۔ اول یہ سننے میں آیا تھا کہ ارض ہسپانیہ کا ایک نوخیز شاعر عہد اسلامی کی مٹی ہوئی یادگار پر مرثیہ خوانی کر رہا ہے۔ جریدہ معارف میں اس کی ایک نظم بھی شائع ہوئی تھی جس میں غرناطہ کی قدیم عظمت کا ماتم کیا گیا تھا۔ اب انقلاب اسپین کے ساتھ یہ اطلاع پہنچی ہے کہ حکومت عربی علوم فنون اور تاریخ اندلس کے عربی عہد کے مطالعہ کیلئے ایک جامعہ عربیہ قائم کر رہی ہے۔ بعض حلقوں کی تو یہاں تک خواہش ہے کہ جامعہ قرطبہ کو مسلمانوں کے حق میں واگذار کر دیا جائے مسلمانان عالم اس خبر کو سن کر یقیناً شاد کام ہوں گے کیا عجب ہے کہ حکومت کا یہ انقلاب عربی تمدن کے اس کھوئے ہوئے فردوس میں جس کے لئے مورخین اسلام نے ہمیشہ اعادہا اللہ للاسلام کے الفاظ استعمال کئے ہیں ایک اس سے بھی بہتر اور مسرت بخش انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

بس از مدت از یں شاخ کہن بانگ ہزار آمد

شذرات

جامعہ کا یوم تاسیس امسال بھی بدستور ۲۹ اکتوبر کو منایا جائے گا۔ ۲۸ کو پروفیسر محمد مجیب صاحب کی نگرانی میں روس کے
نہور ڈراما نگار گوگول کا ایک مزاحیہ ڈراما ہوگا جس کا جناب و ہاج الدین صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ بلکہ یوں
نا چاہیئے کہ اسے ہندوستانی لباس پہنا کر اپنا بنا لیا ہے ۲۹ کو شام کے وقت پہلے یادگار تاسیس کا جلسہ ہوگا اور پھر اردو
ادمی کا مشاعرہ جس میں ہمارے ملک کے مسلم الثبوت استاد اپنا اپنا منتخب کلام سنائیں گے۔

وہ زمین جو جامعہ کی عمارتوں کے لئے تجویز کی گئی تھی سارے قانونی اور عدالتی مرحلے طے ہونے کے بعد اب دو ہی چار روز
ں جامعہ کے قبضہ میں آنے والی ہے۔ اس لئے بعض حضرات کی رائے ہو کہ اسی موقع پر ان عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھنے
ں رسم بھی ادا کر دی جائے۔ مگر یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا۔ بہرحال جامعہ کے قدیم طلبہ اور دوسرے ہمدرد جو یوم تاسیس
ے موقع پر تشریف لائیں گے اوکھلے میں جو دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر جمنا اور نہر مغربی کے کنارے واقع ہے وہ
فضا منظر اور موزوں موقع دیکھ سکیں گے جو جامعہ کی عمارتوں کے لئے تجویز ہوا ہے اور جو حضرات تعمیر کے فن میں دخل رکھتے
ں وہ جناب شیخ الجامعہ کو اپنے مفید مشوروں سے مدد دے سکیں گے۔

اب جامعہ ملیہ کی زندگی کے بارہ سال پورے ہوئے ہیں ان میں سے ۵ برس علی گڑھ میں گزرے اور ۷ برس دہلی میں
ی گڑھ کا زمانہ بڑا پرآشوب زمانہ تھا۔ جامعہ ملیہ کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک جو مذہبی سیاسی جوش کے چڑھتے ہوئے دریا کے ساتھ
ٹھی اس دریا کے اتر جانے کے بعد بیٹھنے ہی والی تھی کہ ملت اسلامی کے دو حاذق طبیب مسیح الملک مرحوم اور ڈاکٹر انصاری
صاحب مد ظلہ العالی جامعہ ملیہ کو دہلی لے آئے۔ یہاں آنے کے بعد ایک طرف تو اس تحریک نے مستقل تعمیری صورت اختیار
ی اور مفید عملی کام انجام دیا مگر دوسری طرف مسیح الملک مرحوم کی زندگی ہی میں مالی دشواریاں پیش آنے لگیں اور ان کے
تقال کے بعد تو کچھ دن ایسے گزرے کہ کسی کو جامعہ کے چلنے کی مطلق امید نہ رہی مگر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب
ور جامعہ کے معلموں کی ہمت کو ہزار آفریں ہے کہ وہ اس تعلیم گاہ کو چلاتے رہے بلکہ آہستہ آہستہ ترقی دیتے رہے مالی
شکلات درمیان میں کچھ کم ہوگئیں مگر اب تک یہ حالت ہو کہ جناب شیخ الجامعہ اپنے وقت کا بڑا حصہ جامعہ کے لیے
لی امداد حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ قومی اقتصاد کے لحاظ سے کتنی بڑی فضول خرچی ہے کہ وہ دماغ جو مسلمانوں
ی تعلیم کی تھیوں کو سلجھا سکتا ہے ہر وقت چندے کی فکر میں الجھا رہے۔ اور وہ جوش عمل جو قوم کی ترقی اور اصلاح
ے کام آسکتا ہے۔ ایک تعلیمگاہ کی روزمرہ ضروریات فراہم کرنے میں کھپ جائے پھر اب انشاءاللہ جامعہ کی عمارتوں

کا کام شروع ہو جائے گا جس کے لئے ساٹھ ستر ہزار کی رقم پہلے سے موجود ہے مگر وہ بالکل ناکافی ہے کم سے کم ڈیڑھ دو لاکھ روپے کی ایک سال کے اندر ضرورت ہوگی اس کو فراہم کرنے کا بار بھی ظاہر ہے کہ شیخ الجامعہ اور ان کے رفیقوں پر ہے اس لئے جامعہ کے چند اساتذہ قدیم طلبہ اور دوسرے حضرات نے جو قومی تعلیم سے ذوق رکھتے ہیں "ہمدردان جامعہ کے نام" سے ایک حلقہ قائم کیا ہے اور جناب شیخ الجامعہ سے وعدہ کر لیا ہے کہ جامعہ کے ماہانہ مصارف کے لئے مستقل چندوں کے علاوہ جو ڈھائی ہزار روپے کی کمی پڑتی ہے اسے اپنی کوشش سے پورا کر دیں گے اس حلقے کے رکن وہ حضرات ہو سکتے ہیں جو خود ایک ماہوار رقم چندے کے طور پر دیں اور اپنے احباب کو بھی اس پر آمادہ کریں۔ ہر مقام پر ایک صاحب کے سپرد یہ کام ہوگا کہ وہ اپنے حلقے سے چندے کی رقم وصول کر کے بھیج دیا کریں اس کی خاص طور پر کوشش کی جا رہی ہے کہ امداد صرف انھیں لوگوں سے لی جائے جو جامعہ کے مقصد سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور ان سے بھی یہ درخواست کی جاتی ہے کہ صرف اس قدر رقم مقرر کریں جسے وہ آسانی سے ہر مہینے ادا کر سکتے ہوں ہمارا یہ خیال ہے اور غالباً صحیح ہے کہ رسالہ جامعہ کے قارئین کرام سب کے سب جامعہ ملیہ کے سچے ہمدرد ہیں اس لئے ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ "ہمدردان جامعہ" کے حلقے میں داخل ہو جائیں اور جناب شیخ الجامعہ کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مدد دیں۔ جو حضرات چاہیں وہ جامعہ کا نیا دستور العمل اور نصاب تعلیم منگا کر اس کے مقصد اور طریق کار سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

جامعہ ملیہ نے اس عرصہ میں جو کام کیا ہے اس سے ہمارے قارئین کرام وقتاً فوقتاً مطلع ہوتے رہے ہیں اور اتنا تو ہر شخص تسلیم کرےگا کہ دینی اور دنیاوی تعلیم، ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کے صحیح امتزاج کے لحاظ سے جامعہ ملیہ دوسری تعلیم گاہوں سے بہتر ہے تصنیف اور تالیف اور اشاعت علوم میں بھی جامعہ کی اردو اکادمی کی حقیر خدمات بہ قدر شناسوں کی نظر میں آ چکی ہیں قومی اور ملی خدمت کی جس راہ پر جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ چلنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی اتفاق رائے سے پسندیدہ قرار پا چکی ہے یعنی سادگی کفایت شعاری، کسب حلال، ایثار پر خود عامل ہونا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینا ملکی سیاست سے الگ رہ کر حب وطن، بے نفسی، رواداری سیکھنا اور سکھانا مشرقی تہذیب کا وہ رنگ اختیار کرنا جس میں مغربی تہذیب کے بہترین عناصر کھپ سکیں۔ قوم وملت کی اجتماعی زندگی سے اس طرح وابستگی پیدا کرنا کہ شخصی اور انفرادی نشو و نما میں خلل نہ پڑے غرض اس کا ہر طرف سے اعتراف ہو چکا ہے کہ جامعہ ملیہ وہ تعلیم گاہ ہے اور وہ کام کر رہی ہے جس کی مسلمانوں کو بہت شدید ضرورت ہے۔ جامعہ ملیہ کے کارکن اپنے قدردانوں کی تعریف سن کر بہ مقتضائے فطرت خوش ہوتے ہیں لیکن وہ خوب جانتے ہیں کہ ابھی ان کے کام کی صرف ابتدا ہوئی ہے جو انھوں نے کیا ہے وہ اپنی جگہ پر ایک چیز ہے لیکن جو انھیں کرنا ہے اس کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں۔

نچ روپیہ
قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپواکر شایع

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۹	بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۳۲ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

		صفحہ
۱. غالب کی فارسی شاعری (۲)	عابد علی صاحب عابد	۱۸۵
۲. تاریخ کی تعریفیں	ڈاکٹر یوسف حسین صاحب	۲۰۱
۳. مامون کا عہد حکومت	رئیس احمد صاحب جعفری	۲۲۶
۴. نظر کی لاگ (افسانہ)	بشیر احمد صاحب ہاشمی ایم اے ایم ای ڈی (لیڈس)	۲۴۵
۵. تصویر حشر (رینیر ماریا رلکے) ترجمہ	ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب	۲۵۰
۶. جگر پارے	حضرت جگر مرادآبادی	۲۶۰
۷. شاعر	ڈاکٹر یوسف حسین صاحب	
۸. نوائے محوی	محمد حسین صاحب محوی	
۹. تنقید و تبصرہ	....	
۱۰. شذرات		

ن بے کے دو نول

یہ پر ہندو اثرات دیر کے بعد

ت کا کوئی دخل معلوم نہیں ہوتا۔

یت کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔

ملا ہوا تھا۔ یہ لوگ جب موقع پاتے تھے فطرت و

محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) کرتے تھے۔ وہ تعلق جو فانی انسان اور ازلی خدا کے درمیان قائم ہے ان کا

غالب کی فارسی شاعری

۲

ارباب تصوف کے نزدیک خدا کا کامل ترین نام "حسن مطلق" ہے۔ حسن مطلق وحدت وجود اور کشف و شہود کے متعلقہ مسائل بیان کرنے سے پہلے تصوف کے تاریخی ارتقا کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

الفاظ صوفی اور تصوف کا ماخذ دریافت کرنا آسان نہیں بعض صوفی اس پر مصر ہیں کہ ان الفاظ کو صفائے قلب تصور کیا جائے اور صوفی کو ایک پاکیزہ دل و پاکیزہ نہاد سالک سمجھا جائے مستشرقین کا ایک گروہ ان کو σοφος ہم معنی خیال کرتا ہے، نولدکے اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ صوفی "صوف" سے مشتق ہے اور یہ لفظ سب سے پہلے ان مسلمان زاہدوں کے لئے استعمال کیا گیا تھا جو عیسائی راہبوں کی پیروی میں کھردرے اونی کپڑے پہنتے تھے۔

تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے مسائل بہت سے متنوع اثرات اور عناصر سے پیدا ہوئے ہیں۔ جہاں تک اس نظریے کا تعلق ہے کہ تصوف اس رد عمل کا نام ہے جو ایرانی ذہنیت کی وجہ سے اسلامی فتوحات کے خلاف پیدا ہوا تو جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوف کے کچھ مشہور و معروف علمبردار عربی النسل تھے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ تصوف بدھ کی تعلیمات کا آئینہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بدھ کی تعلیمات میں اور تصوف کے مرکزی مسائل میں یک گونہ مشابہت نظر آتی ہے لیکن دو چیزوں میں مشابہت کا پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ دونوں میں سے ایک دوسری سے ماخوذ ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں کسی دوسرے مشترک ماخذ سے حاصل کی گئی ہوں علاوہ ازیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی تہذیب پر ہندو اثرات دیر کے بعد مترتب ہوئے ہیں، کم از کم تصوف کے ابتدائی ارتقائی مراحل میں ہندو فلسفے کے اثرات کا کوئی دخل معلوم نہیں ہوتا۔

مستشرقین کا خیال ہے کہ ایران میں تصوف کا ارتقا ایرانی ذہنیت کا نتیجہ ہے وہ لکھتے ہیں۔

"قبل اسلام ایرانیوں کے مذہب میں ایک بے قرارانہ تشکک ملا ہوا تھا۔ یہ لوگ جب موقع پاتے تھے فطرت و انسان کے رموز کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ تعلق جو فانی انسان اور ازلی خدا کے درمیان قائم ہے ان کا

مرغوب موضوع تھا۔ زرتشت کے مذہب کے فروغ کے دوران میں بھی مانی اور مزدک کی تحریکات کے اثر نمایاں ط
ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے فلسفی تمام دنیا کے مذاہب سے اچھی باتوں کا انتخاب کر کے اپنے مذہب می
کر لیتے تھے۔ ایرانی دل و دماغ فطرتاً اس آشنا واقع ہوا ہے اور یہی خصوصیت ہے جو مانی اور مزدک کی تعلیمات می
اس میں کوئی شک نہیں کہ زرتشت کے مذہب میں امید افزا عناصر موجود ہیں۔ لیکن اوستا کی تعلیم بھی ایرانی فطرت کو
قاصر رہی ہے" اس نظریے کو بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر نکلسن "متصوفین اسلام" میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ تصوف درحقیقت مختلف مذاہب
کا نتیجہ ہے اور یہی نظریہ درست معلوم ہوتا ہے اب ہم مجمل طور پر ان مشابہتوں کا ذکر کرتے ہیں جو تصوف اور مختلف
درمیان پائی جاتی ہیں

قدیم ترین صوفیوں میں ریاضت، زہد، اور چلہ کشی کی جو مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں رہبانیت اس
جاتی ہے کہ عیسائیت کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے اسلام نے رہبانیت سے ہمیشہ ابا کیا ہے لیکن عیسائیت می
تقدس کا ایک جزو لازمی بھی جاتی رہی ہے۔ پروفیسر نکلسن کے خیال میں تو ذکر، خاموشی، اور محبت الٰہی کے تام
ہی سے ماخوذ ہیں۔

تصوف اور فلاطینس Plotinus کی تعلیمات میں حیرت انگیز مشابہت نظر آتی ہے۔ اس
نہیں کہا جا سکتا کہ تصوف فلاطینس کی تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اس کی وجہ دو ہیں ایک تو یہ کہ دو مذاہب میں مشابہ
ایک کے دوسرے سے ماخوذ ہونے کی دلیل نہیں۔ دوسری وجہ ہے کہ تمام مذاہب کا مقصد "اطمینان قلب" کا حص
قلب" خدا رسیدہ شخص کو حاصل ہو سکتا ہے بس یہی خدا رسیدگی ہر مذہب کی منتہائے نظر ہے اس مقصد اعلیٰ ک
کے باعث مذاہب میں جزیات و مسائل میں سخت اختلاف کے باوجود مرکزی طور پر یک گونہ مشابہت پائی جا

فلاطینس کا مقصد اعلیٰ "وصال خداوندی" ہے یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ مادی دنیا سے بالاتر ایک روحانی

شاعر کا فرض ہے کہ وہ (الف) مادی اور روحانی دنیا کے تعلقات کی تشریح کرے اور (ب) ان وسائل کو متعین کرے جن سے کام لے کر ہم روحانیت کی معراج کمال تک پہنچ سکتے ہیں۔

نوفلاطونی فلسفے کا مرکزی مسئلہ تسلسل شئے ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان مزاحمتیں موجود ہیں لیکن انکو ہٹایا جا سکتا ہے۔ سے "وحدت تام" کا تصور پیدا ہوتا ہے افلاطینس کی اصطلاح ہیں (τὸ ἕν) یہ وحدت حیات کا اصل اصول ہے خیر محض ہے حسن کامل ہے بلکہ اس سے بھی لطیف و عظیم تر ہے اس کا تصور کرنا ناممکن ہے اس کی توجیہ صرف نفی سے ظاہر کی جا سکتی ہے صوفی اس وحدت تام کو قدم کہتے ہیں اور اس کی عظمت و مہابت ظاہر کرنے کے لئے اکثر بحر ضیا۔ نور، شراب، حسن، صداقت سے استعارہ کرتے ہیں یونیورسل (Universal Mind) مائنڈ افلاطینس کے قول کے مطابق νοῦς ہے صوفی اسے عقل کل کہتے ہیں۔ عقل کل "وحدت تام" یا قدم کی پہلی تخلیق ہے اور ہر وقت وحدت کے مشاہدے میں غرق رہتی ہے اس کا رتبہ وحدت تام سے کم ہے کیونکہ تصور اور مشاہدہ ملشاہدوئی کا متقاضی ہے عقل کل افکار کا مخزن ہے صوفیہ کے نزدیک یہ افکار اعیان علمیہ ہیں۔ یہی اعیان علمیہ دنیائے امکان میں اعیان ثابتہ کہلاتے ہیں۔

یونیورسل سول افلاطینس کے قول کے مطابق ψυχή عقل کل کی تخلیق ہے صوفیوں کے نزدیک اس شئے کا نام جان کل یا نفس کل ہے نفس کل کے ذریعے عقل کل کا تعلق دنیائے حواس سے قائم ہوتا ہے۔ آسمانی عناصر سے متعلق ہونے کی وجہ سے نفس کل عقل کل سے نور وحدت حاصل کرتا ہے اور حواس ظاہری سے تعلق رکھنے کے باعث اس نور کو دنیائے امکان میں پھیلاتا ہے۔ دنیائے امکان مادی دنیا ہے۔ مادہ خود کوئی شئے نہیں۔ سرتا پا نقص ہے معدوم ہے اگرچہ اپنی حقیقت میں مادہ کچھ نہیں لیکن ہر صورت کا آئینہ ہے اس میں شر کے عناصر بھی ہیں کیونکہ یہ خیر سے بالکل خالی ہے۔ صوفیوں کا خیال ہے کہ عدم میں وجوب کے عکس سے امکان کی نمود ہے اگر حسن مطلق آئینہ عدم میں عکس نہ ڈالے تو دنیائے امکان کی کوئی چیز عالم وجود میں نہ آئے

حسن مطلق فطرتاً حسن کی تخلیق کرتا ہے وحدت اسی طرح قائم و سالم رہتی ہے لیکن تخلیق حسن کا فرض پورا ہو جاتا ہے خورشید جمال سے نور کی شعاعیں کائنات کے گوشے گوشے کو منور کرتی ہیں۔

ہلہ۔ مثنوی معنوی۔ مرتبہ نکلسن صفحہ ۲۱۴۔

خورشید رخت چو گفت پیدا | ذرات دو کون شد ہویدا
مہر رخ تو چوں سایہ افگند | زاں سایہ پدید گشت اشیا

(دروم)

ہر شے میں جمال الٰہی ہے جس حد تک کوئی شے مرکز وحدت کے نزدیک ہوتی ہے اسی حد تک اس حسن مطلق کے اشارے زیادہ پائے جاتے ہیں ہر ایک شے فطرتاً اس وحدت تام میں مل جانے کی کوشش کرتی ہے کے عکس سے کثرت آرائی کا تماشا نظر آتا ہے اس کشمکش سے کائنات پیدا ہوتی ہے ایک اضافی اور اعتباری

فلاطینس Plotinus کے خیال میں انسان کی روح مادی قالب کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے اس مادی قالب کے شر انگیز عناصر کی وجہ سے آلودہ ہو جاتی ہے ۔ انسان کا فرض ہے کہ اپنی روح کو منزہ کرنے بعد خدا تک پہونچنے کی کوشش کرے ۔ یہی اس کا مقصد اعلیٰ ہے ΕΠΙΣΤΡΟΦΗ ظاہر ہے کہ روح کے تمام نقائص جسم کے عیوب سے پیدا ہوتے ہیں ۔ جسم اور روح کا تعلق منقطع ہو جانے کے بعد روح خود بخود پاکیزہ ہو جاتی ہے تمام خواہشات نفسانی کو فنا کر دینے سے جسم کا غلبہ مٹ جاتا ہے اور روح پاک و صاف ہو جاتی ہے یہی خیال کا ہے ہوا و ہوس کو ترک کر دیا جائے تو سلطنت عشق حاصل ہو جاتی ہے

ان کے خیال میں ذوق و شوق کی آگ تمام جسمانی خواہشات کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور روح جلا پا کر حسن مطلق میں مل جاتی ہے

آں کہ بے پردہ بصد داغ نمایانم سوخت | دیدہ پوشید و گماں کرد کہ پنہانم سوخت
نہ بدر جستہ شرارہ نہ بجا ماندہ رماد | سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت
سینہ از اشک جدا دیدہ جدا می سوزد | ایں رگ ابر شرر بار بہ پریشانم سوخت
دیگر از خاتمۂ کفر چہ گویم غالب
من کہ رخشندگی جوہر ایمانم سوخت

گیارہویں صدی سے پہلے مشرقی ایران میں بدھ مت کی تعلیم کے آثار نظر آتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بلخ میں بدھ خانقاہیں قائم تھیں۔ پروفیسر گولڈ زیہر کے خیال میں ابراہیم ادہم شہزادہ بلخ کے ترک سلطنت کا واقعہ بدھ کے افسانے کا عکس ہے اور اسی ایک واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ کی تعلیم کس حد تک مقبول اور عام ہو چکی تھی پروفیسر نکلسن کے خیال میں صوفیوں نے تسبیح بدھ کے پیروں ہی سے سیکھی۔ بہر نوع اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں تک تزکیۂ قلب کے وسائل و ذرائع کا تعلق ہے۔ تصوف نے بدھ مت سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ تصور۔ تفکر اور ذکر کا متصوفانہ تخیل بدھ کی تعلیم کا ممنون احسان معلوم ہوتا ہے ان مشابہتوں کے ساتھ ساتھ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فنا کا متصوفانہ تصور یقیناً بدھ مت سے ماخوذ ہے لیکن بقا کا بدھ کی تعلیم میں ذکر تک نہیں۔ اس اعتبار سے ایرانی تخیل پر ویدانت کی تعلیمات کا اثر نسبتاً زیادہ معلوم ہوتا ہے فنا اور نروان ہم معنی ہیں۔ دونوں میں شخصیت کے مٹ جانے کا خیال قائم ہے لیکن بدھی نروان کے مطابق انسان صرف معدوم ہو جاتا ہے اور تصوف کے مطابق فنا کے بعد "وحدت تام" کی بقا میں شامل ہو کر زندہ جاوید ہو جاتا ہے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

اگر بقا کو فنا کے ایرانی تخیل سے علیحدہ رکھیں تو نروان اور فنا میں کوئی فرق نہیں رہتا پروفیسر ڈیوڈ نے نروان کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے

"اس گناہ آلود کیفیت ذہنی کو مٹا دینا جو کرم کے پراسرار موثرات کے باعث انسان کو ایک نیا چولا بدلنے پر مجبور کرتی ہے نروان ہے" فنا کے حصول کے لئے ان تمام آرزوؤں کو مٹانا ضروری ہے جن سے روح گناہ آلود ہو جاتی ہے:

غالب کے لئے خدا کا جمال کائنات کے ذرے ذرے میں پوشیدہ ہے وحدتِ وجود کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیا میں اس کے سوا کچھ اور موجود ہی نہیں۔ ایک ہی آفتاب حقیقت ہے جس کی شعاؤں سے کائنات کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا ہے وہ ایک بحر بیکراں ہے۔ ایک بیکرانہ ہے۔

جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ذرہ ذرہ اسی کے ذوقِ حسن سے سرمست ہیں بے اگر نگاہ کے سامنے سے ملوی نقاب اٹھ جائیں تو ہر چیز اس

کی طرف رہبری کرتی ہوئی نظر آئے۔

اس کی انجمن ناز میں بوتراب کی خستگی "شمع و گل" کا نشاط پرور اثر پیدا کرتی ہے۔ اس کے ساز محبت کے لئے واقعۂ کربلا زیر و بم ثابت ہوتا ہے۔

بزم ترا شمع و گل خستگیٔ بوتراب — ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا
نکبتیاں ترا قافلہ بے آب و نان — نعتیان ترا مائدہ بے اشتہا
آب نہ بخشی بروز خون سکندر ہدر — جاں نہ پذیری بہ تیغ نقد سخن نارسا

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کے ایما سے ہو رہا ہے چمن میں اسی کی دلکشی ہے۔ عشق و محبت اسی کی صفات کے آئینہ دار ہیں۔ صنم کدے بھی اسی کے جلووں سے لبریز ہیں۔ نشاط و انبساط کی ہر کیفیت، غم و اندوہ کا ہر احساس اسی کے ذوق جستجو سے پیدا ہوتا ہے

نشاط مغبچگاں از شراب خانۂ تست — فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست
بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست — کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست
فریب حسن بتاں پیشکش اسیر توایم — اگر خط و گر خال دام و دانۂ تست
ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں ما را — قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست
سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ — نہ ہر چہ دزد ز ما برد در خزانۂ تست
مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست — نہ تیزگامی توسن ز تازیانۂ تست
کماں ز چرخ و خدنگ از بلا و پر ز قضا — خدنگ خوردۂ ایں صید گہ نشانۂ تست
سپاس جوہر تو فرصت آفرینش را — دریں فریضہ دو گیتی بہاں دوگانۂ تست

اس کی راہ میں ہر چیز سالک سے گفتگو کرتی ہے۔ لیکن منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے حوصلہ بے سود ہے جمال الٰہی کی بجلی پروانہ مثال محبت کا تقاضا کرتی ہے اسی کے عشق کا راز امنر و ماور پردہ

زاہدوں کے سینوں میں نہیں طلبا ما سی ہے والوں کے دل میں ہے۔

پیوستہ دہد باده و ساقی نتواں خواند | ہموارہ ترا شد بت و آذر نتواں گفت
از وصل یاری طلب صاعقہ تیزاست | پروانہ شو ایں جا ز سمندر نتواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہاں لست نہ وعظ است | بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

اسی کا حسن دنیا پر کچھ اس طرح چھا گیا ہے کہ ہر چیز سرشار معلوم ہوتی ہے۔

آفتاب عالم سرگشتگی ہائے خودیم | میرسد بوئے تو از ہر گل کہ مے بوئیم ما

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ تو روئے نیست | در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

وہ حسن مطلق ہے اور انسان کی چشم بینا کے ذریعے گویا خود اپنے حسن کا مشاہدہ کرتا ہے

گر نہ مشتاق عرض تمنگاہ حسن خویش | جاں فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردہ

دنیا اسی کا "سراپردۂ رازہے" ذرے اسی خورشید حقیقت کی طرف پرواز کرنے کے لئے بیتاب نظر آتے ہیں لیکن وہ بے نیاز بھی ہے اس کی شان استغنا شکوہ شکایت سے بلند تر ہے۔ اس کا عدم التفات اچھا ہے۔ ورنہ اس کی برق جمال کی ایک چمک کائنات کو جلا کر راکھ کر دے۔

دوست در عالم معنی کہ ز صورت بالاست | عقل فعال سراپردہ ز د و در زمرم آراست
خوانده از دیده وری دیده وراں را بہ بساط | تا بہ بینید کہ اسرار نہانی پیداست
راز ہفت اختر و نہ چرخ بپرده ویدا یعجب | در دبستاں نتواں گفت کہ پرسش غوغاست
بر لب راز پژوہاں نسترد مہر سکوت | ساقی مسکدهٔ ہوش زبان گویاست
گفتنش چیست جہاں گفت سراپردهٔ راز | گفتنش چیست سخن گفت مگر گوشہ رماست
گفتم از کثرت و وحدت سخنے گوئے برمز | گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست

گفتمش ذرہ بخورشید رسد گفت محال   گفتمش کوشش من در طلبش گفت رواست
گفتم آن خسرو خوبان سخن گوش نہد   گفت گر گوش نہد زہرہ گفتار کراست

اس تصور کرنے کے لئے تزکیہ قلب کی ضرورت ہے۔

خیالش را بساطے بہر پا انداز می جستم   پسندیدیم بہ مستی مخمل خواب زلیخا را

وہ جو کچھ کہتا ہے مدارج ذوق اور مراتب نیاز کے مطابق کرتا ہے۔

چوں زبانہا لال و جانہا پر زغوغا کردۂ   بادیت از خویش پرسید انچہ با ما کردۂ
گر نہ مشتاق عرض دستگاہ حسن خویش   جاں فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردۂ
ہفت دوزخ در نہاد شرمساری مضمر ست   انتقام ست انکہ با مجرم مدارا کردۂ
صد کشاد آں را کہ ہم امروز رخ بنمودۂ   مژدہ باد آں را کہ محو ذوق فردا کردۂ
خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردۂ   با درستاں گرنوازشہائے پیدا کردۂ
خیمہ نوش است از زہر عتابت کام جاں   تلخی مے در مذاق ما گوارا کردۂ
ذرہ را روشناس صد بیاباں گفتہ   قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردۂ
دجلہ می جوشد ہمانا دیدہ ہا جوئے تست   شعلہ می بالد مگر در سینہ ہا جا کردۂ
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہرست   خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

منزل کبریا تک پہونچنے کے لئے سالک کو حیرت کے دشوار گذار اور سنگلاخ مقاموں سے گذرنا پڑتا ہے یہ حیرت دنیائے امکان کے مختلف مناظر و مظاہر کے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے۔ سالک کی چشم بصیرت روشن ہوجاتی ہے اور وہ اصنام خیالی کا راز دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ وحدت سے اتنے تعینات اور کثرت کے عناصر کس طرح پیدا ہوئے اس حالت میں کبھی حسن مطلق کی شان جمال کا مشاہدہ کرتا

ہے تو صد جلوہ روبرو نظر آتا ہے۔ اور انبساط کی کیفیت سے سرشار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

کیا آئینہ خانے کا وہ عالم تیرے جلوے نے   کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

کبھی شان جلالی کا اظہار ہوتا ہے تو افسردگی اور پژمردگی کی وہ حالت طاری ہو جاتی ہے جس میں انوار تجلی پر تعینات کا نقاب پڑ جاتا ہے۔ اس حالت قبض میں ہر چیز سنگ راہ بن جاتی ہے۔ غالب نے ان مختلف کیفیات کی طرف عجیب دل آویز انداز میں اشارہ کیا ہے۔

حیرانی ما آئینۂ شہرت یار ست   شد جادہ بکویش نفس باختۂ ما
ہر جادہ کہ از نقش پئے تست بہ گلشن   جا کیست بجیب ہوس انداختۂ ما

حیرت زدۂ جلوۂ نیرنگ خیالیم   آئینہ مداریدبہ پیش نفس ما
طول سفر شوق چہ پرسی کہ دریں راہ   چوں گرد فرو ریخت صدا از جرس ما

اگر توفیق الٰہی شامل حال ہو تو یہ کیفیت دیر تک باقی نہیں رہتی۔ سالک پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ دنیائے امکاں کا وجود ایک فریب نظر ہے۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جو چیزیں بظاہر "کثرت" سے لبریز نظر آتی ہیں وہ دراصل "وحدت" کا پرتو ہیں۔ رنگ، بو، حرکت، سکون، زمان، مکان سب وہم کی تخلیق ہیں۔ کائنات نمود بے بود ہے غالب نے بھی نمود بے بود کی سیمیائی حالتوں کا بیان کیا ہے۔

پیمانۂ رنگیست دریں بزم بگردش   ہستی ہمہ طوفان بہار است خزاں ہیچ
عالم ہمہ مرآۃ وجود است عدم چیست   تا کار کند چشم محیط است و کراں ہیچ
غالب زگرفتاری اوہام برون آ   باللہ جہاں ہیچ و بد و نیک جہاں ہیچ

موجہ از دریا شعاع از مہر حیرانی چراست | تا اصل مدعا باشی در برانجزایش ہیچ
آسماں وہم است از بر جیس و کیوانش مگوئے | نقش ما ہیچ است بر پنہان و پیدائش ہیچ

تا فصلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم | آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
ایماں بہ نسبت تفرقہ ارفت از ضمیر | زاسما گذشتہ ایم و مسمّا نوشتہ ایم

بے پردگی محشر رسوائی خویشم | در پردۂ یک خلق تماشائی خویشم
نقش بہ ضمیر آمدۂ نقش طراز م | حاشا کہ بود دعوی پیدائی خویشم

جب سالک کو معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا کے مظاہر گوناگوں اور اشکال بوقلموں نمود بے بود ہیں تو اسے منزل کبریا کے نشان نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت کی گلزمین تک پہونچنے کے لئے تزکیہ نفس کی منزل سے گذرنا پڑتا ہے جس مطلق کی شان مجاہدے اور مشاہدے سے اس قدر بلند ہے کہ جب تک اس کا نور ہدایت قلب کو روشن نہ کرے ایک مقام معرفت سے دوسرے مقام معرفت تک پہونچنا دشوار ہے عرفی نے کیا خوب کہا ہے۔

کمند کوتہ و بازوے سست و بام بلند | حوالۂ من ونا امیدیم گنہ گیرند

اس مرحلے پر خاصۂ باطنی کی حیرت انگیز قوت کا اظہار ہوتا ہے تزکیہ نفس اور مجاہدے سے روح کو ایک ادراک غیبی حاصل ہوتا ہے عرفان الٰہی کا یہی ذریعہ ہے۔ اسی کو علم باطن کشف۔ القا وغیرہ کہتے ہیں۔ اس سے بھی گو خدا کی ذات اور حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ہر حالت میں انسان کی دسترس سے بالاتر ہے لیکن صفات اور شیونات الٰہی کی تجلیاں روح پر پڑتی ہیں۔ اور ہر شخص بقدر استعداد عرفان کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ درجہ درس و تدریس بتعلیم و تعلم سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تزکیہ نفس اور تجرید و فنا سے حاصل ہوتا ہے جس قدر انسان علایق دنیوی سے بے تعلق ہو اور رسوم و قیود سے آزاد ہو جائے اسی قدر اس درجہ میں ترقی ہوتی ہے۔

اس مرحلے پر سالک "پیراہن تن" کو اتار کر وحدت کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔ تزکیہ قلب کے دوران

میں سالک پر مختلف النوع حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ کبھی تعینات کے پردے اٹھ جاتے ہیں تو وہ آفتاب حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے اور شان جمال کے تاثرات کو دل میں جذب کر لیتا ہے کبھی اشکال گوناگوں کے مشاہدے سے ایسا پریشان ہوتا ہے کہ بکار بکار کر بدرقہ توفیق سے رشد و ہدایت چاہتا ہے۔ غالب اس کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

محو کن نقش دوئی از ورق سینۂ ما　　　اے نگاہت الف صیقل آئینۂ ما

تزکیۂ نفس اور انجلائے باطن کی منزل ایسی کڑی ہے کہ بڑے بڑے جاں باز دل ہار جاتے ہیں۔ ذرا سی لغزش ہوئی اور تمام محنت اکارت گئی بالخصوص اگر کسی موقعے پر "پیر مغاں" یعنی مرشد کامل کا ساتھ چھوٹ جائے تو اس خطرناک راہ کی ہیبت سے سالک خوفزدہ ہو جاتا ہے

لرزہ دارد خطر از ہیبت ویرانۂ ما　　　سیل را پائے بسنگ آمدہ در خانۂ ما

بچراغے نرسیدیم دریں تیرہ سرا　　　شمع خاموش بود طالع پروانۂ ما

سفر شوق میں بعض حالتیں ایسی بھی پیش آتی ہیں کہ یکبارگی "بارقۂ جال" کی ایک چمک جادۂ منزل کو دور دور تک روشن کر دیتی ہے اور سالک بے خوف خطر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ جاتا ہے

غم افسردگیم سوخت کجائی اے شوق　　　نفسم را بہ پرافشانی آہے دریاب

نگار حقیقت کا عکس آئینۂ دل میں نظر آتا ہے لیکن اسی آئینے کو جلا دینے کے لیے طرح طرح کی سوختیں برداشت کرنی پڑتی ہیں بعض اوقات سالک ہجوم شوق میں بیقرار ہو جاتا ہے اور نیاز کی نارسائی دیکھ کر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس وقت مرشد کامل کی تلقین سے دل اطمینان پاتا ہے لیکن ذوق جستجو کی بے قراری کم نہیں ہوتی۔

اے کہ می گوئی تجلی گاہ نازش دور نیست　　　صبر نشتے از من و ذوق تماشا آتش است

ظاہر میں نگاہیں سالک میں کوئی تغیر نہیں دیکھتیں لیکن درحقیقت وہ آتش شوق میں جل کر خاک ہو جاتا ہے ہوا و ہوس کے مٹ جانے سے اس کی روح پاکیزہ ہو جاتی ہے۔

شنیدۂ کہ بہ آتش نسوخت ابراہیم　　　ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

نہ بد جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد   سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

محبت الٰہی وہ محور ہے جس کے گرد آسمان تصوف کے تمام ستارے پھرتے ہیں۔ وحدت وجود کا قائل ہر چیز میں جلوا الٰہی دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی مختلف مذاہب میں فرق نہیں کرتا محبت کی شعلہ کاری ہر قسم کی آلودگی کو جلا دیتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ کافر کیا اور مومن کیا دونوں محبوب حقیقی تک پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں اس عالم[1] میں دوست دشمن کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے غالب کہتا ہے۔

خشک و تر سوزیٔ این شعلہ تماشا دارد   عشق یکرنگ کن بندہ و آزاد آمد

با من کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست   در امر خاص حجت دستور عام چیست

کفر و دین[1] چیست جز آلایش پندار وجود   پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

دیر و حرم اس کی جلوہ گاہ ہیں لیکن سالک اس کا مقامی تعین کرنے کے لئے تیار نہیں

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

جب کسی کے دل میں محبت الٰہی گھر کرتی ہے تو وہ کائنات پر متصرف ہو جاتا ہے ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ رضائے الٰہی میں اس کی رضا ہوتی ہے۔ تو گویا جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اس کی رضا سے ہوتا ہے[2] محبت سے ورد زندگی کی دوا ملتی ہے اس کا ایک شرارہ موسیٰ کے دل میں تھا جس کی بدولت انھوں نے کلیم اللہ کا خطاب پایا اگر انسان کے دل میں یہ شعلہ بھڑکنے لگے تو وہ نظام کائنات کو بدل سکتا ہے

---

[1] نظیری ہیچ اکسیر بتاثیر محبت نہ رسد   کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

[2] عرفی۔ عارف ہم از اسلام خراب است وہم از کفر   پروانہ چراغ حرم و دیر ندارد

غالب نے بھی محبت کا اعلیٰ ترین معیار قائم کیا ہے چنانچہ کہتا ہے۔

بہ عشق از دو جہاں بے نیاز باید بود — مجاز سوز حقیقت گداز باید بود
بجیب حوصلہ نقد نشاط باید ریخت — بجان شکوہ تغافل طراز باید بود
چو لب ز ہرزہ سرایان شوق نتواں شد — چو دل ز پردہ سرایان راز باید بود
چو بزم عشرتیاں تازہ رو تواں جوشید — چو شمع خلوتیاں جاں گداز باید بود
کمر نہفتہ بتاراج خویش باید بست — شریک مصلحت سعی ناز باید بود
چو شوق بال کشاید تواں بخود بالید — چو ناز جلوہ گراید نیاز باید بود
بہ صحن میکدہ سرمست می تواں گردید — بہ کنج صومعہ وقف نماز باید بود
بخوں تپیدہ ذوق نگاہ نتواں زیست — شہید آں مژہ ہائے دراز باید بود
نگہ ز دیدہ بیدار جو کہ سائل را — بہ گریہ طالب در ہائے باز باید بود
چہ بر زراحت آزادگی خوری غالب — تراکہ ایں ہمہ با برگ و ساز باید بود

محبت الٰہی کے رموز کا مخزن انسان ہے یوں بھی مرکز حیات ہونے کی وجہ سے انسان کو صانع کائنات کی تخلیقات میں بہت بڑا رتبہ حاصل ہے۔ انسان کی تخلیق کا باعث اور اس کی نوعیت وعظمت تصرف اور فلسفے کے معرکۃ الآرا مسائل میں سے ہے۔ انسان میں روح ہے اور روح نور قدس کا پرتو ہے اس اعتبار سے صوفیہ انسان کو عالم اکبر کہتے ہیں۔

تمام عالم موجودات کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے یہ ہے۔ جماد۔ نباتات۔ حیوانات۔ انسان۔ اہل مذہب اور بعض حکما ایک درجہ اور قرار دیتے ہیں یعنی مجردات (فرشتہ) انھیں موجودات کے مجموعے کا نام عالم ہے حضرات صوفیہ کہتے ہیں کہ انسان جماد بھی ہے اور نبات بھی۔ حیوان بھی انسان بھی۔ فرشتہ بھی اور چونکہ کوئی

لہ نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر — خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

مخلوق ایسی نہیں جو ان تمام مراتب کا مجموعہ ہو اس لئے انسان عالم اکبر ہے[1]

بعض علماء تو انسان کو فرشتے سے بھی افضل تصور کرتے ہیں علامہ دوانی اخلاق جلالی میں لکھتے ہیں

"استحقاق انسان مرتبۂ خلافت را بنا بر کمال قابلیت اوست صفات متقابلہ را بر وجہے کہ مظہر اسمائے حسنیٰ و متقابلہ الٰہی تواند شد . و بعبارت عالم صورت و معنی قیام تواند نمود . چہ ملائک را اگرچہ جہت روحانیت و لوازم آں چوں اشراقات علمی و توابع آں از لذات عقلی بحسب فطرت حاصل است اما از جہت جسمانیت و کثافت مادہ کلی بے نصیب اند . و اجسام فلکی را اگرچہ بحسب حکمت ناطقہ ہست اما کمالات نفسانی ایشاں فطری است ......

بخلاف نشاۃ انسانی کہ بر جمیع اطوار محیط است . و بر تمام مراتب سایر . اولاً در بدو وجود از مرتبۂ جمادی بر مرتبۂ نما و از نما بمرتبت حیوانی رسیدہ و از انجا بدرجہ انسانی انجامیدہ . و چوں بحلیہ اعتدال مزاج و تعدیل قوائے جسمانی و نفسانی متحلی گردد من حیث البدن و النفس شبیہ بہ اجرام سماوی باشد چہ توسط بین الاضداد بمنزلۂ خلو از آں است......

و ازیں جہت است کہ ائمہ سنت و جماعت کہ مالکان ازمۂ براعت اند اتفاق نمودہ بر آں کہ خواص بشر بر خواص ملک افضل است . فاما در عوام بشر با عوام ملک خلاف کردہ اند . بعضے تفضیل عوام بشر کردہ اند و از حضرت مرتضوی .... ایں معنی منقول است کہ اللہ تعالیٰ ملک را عقل داد بے شہوت و غضب و حیوان را شہوت و غضب داد بے عقل . و انساں را ہر دو داد . پس اگر انسان شہوت و غضب را مطیع و منقاد عمل گرداند و بکمال عقل برسد رتبہ او از ملک اعلیٰ باشد . چہ ملک را مزاحمے در کمال نیست بلکہ اغتیاد یہی در آں نہ . و انساں با وجود مزاحم طبعی و اجتہاد بایں مرتبہ فائز شد . و اگر عقل را مغلوب غضب و شہوت گرداند

---

[1] شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۱۰۶

[2] اخلاق جلالی مطبوعہ مبارک علی لاہور صفحات ۲۵، ۲۶، ۲۷

[3] ملاحظہ ہو فلاطینس اور تصوف کی مشابہت ۔

ازمرتبت بہائم فروتر اندازد۔ چہ انشاں بواسطۂ فقدان عقل کہ وازع شہوت وغضب تواند بود در نقصان
۔رند بخلاف انساں

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں
گر کند میل ایں شود کم ازیں
ور کند قصد آں شود بہ ازاں

ن اللہ کا خلیفہ ہے اور اس اعتبار سے دنیا کی ہر چیز اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے کائنات اپنے ارتقا کے
انسان کی تخلیق کی محتاج تھی۔ کسی ایسے وجود کی ضرورت تھی جو فطرت کے منتشر اجزا کی تنظیم کے بعد ان
اپنی مرضی کے مطابق پورا پورا کام لے سکے۔ انسان کی تخلیق سے یہ ضرورت پوری ہوئی۔

صرف یہی نہیں کہ انسان فطرت کو مسخر کرتا ہے بلکہ اپنی دانشمندی اور ذوق حسن سے کام لے کر صانع
دقات کی پیدا کردہ اشیاء میں حسن اور افادے کے پہلو پیدا کرتا ہے اور یوں ارتقا کے اٹل قوانین کے ماتحت
رمین کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

غالب کہتا ہے۔

زآفرینش[1] عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقطۂ ما دور ہفت پرکار است

زما گرست ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

جزوے از عالمم واز ہمہ عالم بیشم
ہم چو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد
عمر ہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

لہ۔ انسان کے ارتقا کی طرف اشارہ ہے جو علی سینا نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

لہ ذوق۔ بنا یا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

برتهی پرد ز ملک بهر کسر نفس   خود را به بند سلسلهٔ آدم افگنم

هم به عالم ز اهل عالم برکنار افتاده‌ام   چون امام سبحه بیرون از شمار افتاده‌ام

سر از حجاب تعیّن اگر برون آید   چه جلوه‌ها که بهر کیش می‌توان کردن

تاریخ کی تعریفیں

یہ مضمون بتاریخ ۲۵ فروری سنہ ۳۳ء "بزم تاریخ" جامعۂ عثمانیہ کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت نواب مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس ریاست حیدرآباد نے فرمائی تھی۔

تاریخ کا موضوع عمران بشری کے ان حقائق کو پیش کرنا ہے جن سے عہد ماضی کی اجتماعی زندگی کا حال معلوم ہو۔ تاریخ ہمیں اگلے وقتوں اور اگلے لوگوں کے اخلاق۔ ان کے فنون و صنائع، ان کے تمول و ثروت اور ان کی حکمت و دانائی کے رازوں سے آشنا کرتی ہے۔ اس سے اقوام کے عروج و زوال کے اسباب کا پتہ چلتا ہے جو تعلق انسانی زندگی اور اس کے حافظہ کے درمیان ہوتا ہے وہی جماعتی زندگی اور تاریخ میں بھی ہے یعنی تاریخ نوع انسانی کے لئے بمنزلہ حافظہ ہے۔ اس کے ذریعے سے عہد حاضر کی حیات عمرانی اپنے ماضی کے ساتھ رشتہ جوڑتی ہے تاریخ علم بھی ہے اور فن بھی۔ اس کی تحقیق نظری بھی ہو سکتی ہے اور عملی بھی۔ نظری اس اعتبار سے کہ تاریخ صرف ماضی کے آثار و اخبار کو بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ کلیات وضع کرتی ہے اور واقعات کو ان کے علل کی روشنی میں پیش کرتی ہے۔ اور وہ اپنے کلیات و قوانین کو حقائق کی کسوٹی پر کستی ہے اور مشاہدہ سے ان کی تصدیق کرتی ہے تاریخ، علم المعیشت یا علم سیاست کی طرح اختصاصی علم نہیں وہ اپنا مسالا عمرانی اختصاصی علوم سے حاصل کرتی ہے اور اس مسالے سے اپنی عمارت کھڑی کرتی ہے۔ فلسفہ کی طرح تاریخ کی بھی اس صفت میں قوت اور کمزوری دونوں مضمر ہیں۔ تاریخ دراصل امتزاجی علم ہے۔ حیات عمرانی پر مختلف پہلوؤں سے جو تحقیقات ہوتی ہے اور جو نتائج حاصل ہوتے ہیں، تاریخ ان سبھوں کو ایک جگہ سمیٹ کر ان میں ربط پیدا کرتی ہے اور اجتماعی زندگی کی مجموعی تصویر پیش کرتی ہے جس کی گوناگونی اور بوقلمونی کو دوسرے عمرانی علوم اپنے حلقہ تحقیق کی تنگی کے باعث پورے طور پر ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن باوجود اس وسعت کے تاریخ چاہے تو اپنے دائرہ تحقیق کو محدود کر دے۔ یہ اس کی اختیاری چیز ہے وہ چاہے تو اپنی ہمہ گیری کے سارے ذرائع کسی ایک واقعہ یا کسی ایک دستاویز یا چند سالوں کے حالات کی تفصیل میں صرف کر دے۔ یہ ہوا تاریخ کا علمی

یا نظری پہلو۔ اب رہا اس کا فنی اور عملی پہلو۔ تو پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ فن سے مراد کیا ہے؟ فن انسانی
علم کے عملی پہلو کو کہتے ہیں علم کا کام تو بس یہ ہے کہ حقایق کی تحقیق کرے۔ اسے عملی زندگی سے مطلق کوئی بحث
نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے فن کے پیش نظر عمل ہوتا ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اس کا ایک نصب العین ہو
فنی اصول اس لئے وضع کئے جاتے ہیں کہ ان پر آئندہ عمل کیا جائے۔ علم کا یہ منصب نہیں کہ زندگی کے لئے
کوئی نئی راہ تجویز کرے جس سے اسے سعادت اور کامرانی نصیب ہو۔ مثال کے ذریعے سے ہم اس جگہ اپنے
مفہوم کو واضح کردیں۔ ہندوستان میں ذات پات کے رواج کے متعلق اگر علمی تحقیق کی جائے تو اس رواج
کی اچھائی یا برائی سے بحث کرنے کا علمی محقق کو حق نہیں اس لئے کہ علم کا کام یہ نہیں کہ قدر حیات کے مسئلہ کو
چھیڑے لیکن اگر فنی اور عملی نقطۂ نظر سے اسی مسئلہ پر بحث کی جائے تو ذات پات کے رواج کے حسن و قبح
کو اجاگر کرکے دکھایا جائے گا۔ اور یہ بھی بتایا جائے گا کہ آیا ہندوستانیوں کی بھلائی اس میں ہے کہ اس کو
قائم رکھا جائے۔ اس میں تبدیلیاں پیدا کی جائیں یا اس کو سرے سے مٹا دیا جائے تاریخ۔ علم اور فن دونوں
میں امتزاج پیدا کرتی ہے۔ وہ اپنی تحقیق کا ایک نصب العین بھی رکھتی ہے اور حقیقت کو بھی اپنے ہاتھ
نہیں جانے دیتی۔

ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ تاریخ کی تحقیق علم اور فن دونوں کے امتزاج سے عبارت ہے۔ اب سوال
یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ کا طریقہ تحقیق کیا ہونا چاہئیے؟ خود لفظ تاریخ ممکن ہے اس باب میں ہماری تھوڑی
بہت رہنمائی کرے۔ بعض ماہرین السنہ کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی نہیں لیکن بیشتر اس پر متفق ہیں کہ لفظ
تاریخ کا مادہ ارخ ہے۔ ارخ نوزائندہ بچھڑے یا بچھیا کو کہتے ہیں "لسان العرب" میں تاریخ کی توجیہ
یوں کی ہے۔ کانہ شئ حدث کما یحدث الولد۔ یعنی تاریخ کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کو کہتے ہیں
چونکہ بچھڑا یا بچھیا بھی کتم عدم سے عالم وجود میں آتی ہے اس لئے تاریخ کسی واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کو
کہنے لگے۔ تعجب ہے کہ جرمن زبان میں تاریخ کے لئے جو لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی Geschichte
اس کے معنی بھی یہی ہیں جو عربی لفظ کے ہیں Geschehen واقع ہونے کو کہتے ہیں انگریزی
فرانسیسی، لاطینی زبانوں میں تاریخ کے لئے یونانی لفظ Historia نے رواج پایا۔ اس لفظ کے

ا شروع شروع میں تلاش علم تھے پھر کچھ عرصہ بعد historikos کا لفظ قصہ گوؤں کے لئے مستعمل
نے لگا۔ چنانچہ یونان کے سب سے قدیم تاریخ نویس Herodotus کے ہاں تلاش علم کے ساتھ ساتھ
ں آرائی نے بھی راہ پائی۔ اس کے بعد Thucydides نے تاریخ کو بلند مرتبہ پر پہونچایا لیکن اس نے
انوی عناصر کی جگہ خطیبانہ عناصر اس کے اندر داخل کردئے اور یہ عناصر تاریخ میں ایسے داخل ہوئے کہ
ج تک نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ غرضکہ لفظ تاریخ کے ابتدائی اور اصلی معنوں کی چھان بین سے سوائے اس
کہ اس کے موضوع کی نوعیت کا تھوڑا بہت پتہ چلے طریقۂ تحقیق پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ہاں یہ ضرور پتہ چلتا
ہ کہ قدیم عربوں میں واقعہ اور پھر اس کے بیان کو تاریخ کہتے تھے غالباً کسی بدو کے گھر بچھڑا یا بچھیا پیدا ہوئی
ہگی اور اس کی خوشی میں اس نے گھر گھر اس کا چرچا کیا ہوگا۔ یہ چرچہ شاید اتنا عام ہوا کہ ہر ایسے واقعے کو
ے قبیلہ کے اندر شہرت دینا ہو تاریخ کہنے لگے ہوں گے۔

یونانیوں کے ہاں لفظ "استوریا" اس قدر وسیع معنی میں مستعمل تھا کہ اس میں تلاش علم کے تمام ضابطے اور
ستور سما سکتے تھے چنانچہ اس پر تعجب نہ ہونا چاہئیے کہ لفظ فلسفہ اور فلسفی سب سے پہلے یونان کے تاریخ نویسوں Hero
dotus اور Thucydides نے استعمال کئے۔ یہ علم اور یہ طبقہ دراصل اپنے وجود کے لئے تاریخ نویسوں
کا رہین منت ہے۔ لفظ ارخ اور لفظ historia سے دو مخصوص ذہنی رجحان مترشح ہوتے ہیں اول الذکر
روایت پر اور ثانی الذکر سند و درایت اور تنقیح و تنقید کو تاریخ کی بنا ٹھہراتا ہے۔

تاریخ کی تقسیم | تاریخ کے طریقۂ تحقیق کے پتہ چلانے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ ہم اس امر کی تحقیق کریں کہ تاریخ کی
قسیں کیا کیا ہو سکتی ہیں۔ ہم تاریخ کو دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۱۔ خصوصی تاریخ۔ ۲۔ عام تاریخ

خصوصی تاریخ کسی شخص کسی مقام یا کسی واقعہ کی نسبت پوری معلومات حاصل کرکے ان میں ربط
و ترتیب پیدا کرنے کو کہتے ہیں اس قسم کی تاریخ کا طریقۂ تحقیق بالعموم استقرائی ہوتا ہے۔ چنانچہ سوانح اور سیرت
اور رجال ہماری اس تقسیم کے تحت آتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہتمام اس امر کا ہونا چاہئیے کہ استقصار
کے ساتھ مواد فراہم کیا جائے اور پھر تنقید و درایت سے اس سب مواد کی تنقیح کی جائے اس باب میں مسلمانوں
نے جو علم تاریخ اور فن تاریخ نویسی کی خدمت کی ہے وہ علمی دنیا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ بقول ڈاکٹر اسپرنگر

"نہ کوئی قوم آج تک ایسی ہوئی اور نہ اب موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال دیوگراڈی، جیسا فن ایجاد کیا ہو اس فن کی بدولت آج ہم تقریباً پانچ لاکھ شخصوں کا حال جانتے ہیں: چنانچہ علامہ حافظ ابن حجر کی کتاب "تہذیب التہذیب" اور علامہ ذہبی کی "میزان الاعتدال" علمی دنیا کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ علم حدیث ہے۔ یہ علم دراصل ان اقوال و روایات کی تاریخ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت منسوب کی جاتی ہیں۔ آئمہ حدیث نے ثقہ اور غیر ثقہ کے درمیان بحث استناد کے وہ وہ نازک فرق نکالے ہیں اور اصول روایت کی رو سے مختلف راویوں کے فرق مراتب کو ثابت کیا ہے کہ کاوش علمی اس منظر کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے اس ضمن میں سوانح اور وہ تاریخیں بھی آجاتی ہیں جو انفرادی نقطہ نظر سے لکھی گئیں۔ بعض کا خیال ہے کہ تاریخ عالم دراصل مشاہیر کی تاریخ ہے آج اس زمانہ میں جب کہ ہمارا معیار اگلوں سے مختلف ہو گیا ہے ہمیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ چند صدی قبل کے مورخ افراد کی تاریخ کو قومی تاریخ کا نام دیتے تھے لیکن اگر ان تاریخوں کی ورق گردانی کیجئے تو معلوم ہو کر سوائے محلات کی سازشوں۔ جانشینی کے جھگڑوں اور لشکروں کی نقل و حرکت کی تفصیلات کے ان میں اور کچھ نہیں ملتا۔ تاریخ نویسی کا یہ طریقہ دراصل اس زمانہ کی یادگار ہے جب کہ ایک فرد پوری قوم کی تاریخ کو اپنے کل سے تخلیق کرتا تھا۔ بادشاہ، پیغمبر اور مشاہیر نوع انسانی کے محسن گذرے ہیں۔ ان کی بدولت زندگی کو وہ نعمت ملی جس کی وہ ہمیشہ بھوکی رہی یعنی نظم و ترتیب اور تہذیب و تمدن۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں حیات معاشرتی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بغیر اس کے حیات انفرادی کے سارے امکانات اور اس کی پوشیدہ صلاحیتیں پژمردہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ آج ہم تاریخ کو جس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں چند صدی قبل کا مورخ اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا تھا ہمارے اخلاقی اور ذہنی معیار اور ہیں اور ان کے اور تھے ہم اگلے تاریخ نویسوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بہت ہی معمولی اور جزئی باتوں پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں لیکن اپنے زمانہ کے طور طریقوں اخلاق و عادات صنائع اور فنون اور تمدن و معاشرت کے متعلق کچھ نہیں کہتے اور اگر کہتے ہیں تو بہت کم اگر ہم اپنے اس تاریخی احساس کی حقیقت پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو کہ ہم جس قسم کی معلومات حاصل کرنے کی توقع آج سے چند صدی قبل کے مورخ سے کرتے ہیں۔ وہ بالکل بیجا ہے دراصل ہماری یہ توقع عکس ہے ہمارے

زندگی کا۔ آج دنیا میں جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ انسانی مساوات کو گو عملی طور پر نہ سہی لیکن نظری طور پر
س تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں اجتماعی قدروں کا پلہ انفرادی قدروں پر بھاری ہے۔ سوسائٹی پہلے بھی
جود تھی لیکن اسے خود اپنا احساس اس شدت سے نہ تھا جیسا آج ہے۔ آج اگر اس زمانہ کا کوئی مؤرخ تاریخ
ں عمومی تحریکوں اور تمدن و معاشرت کے حالات کو اپنی تاریخ میں جگہ نہ دے تو اہل تحقیق اس پر اعتراضوں
ں بوچھار کردیں گے لیکن زندگی ہر آن بدلتی رہتی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ نسلوں کے معیار وہی رہیں گے
ہمارے ہیں؟ ممکن ہے کہ دو تین صدی بعد ہمارے زمانے کی تاریخوں کو بھی اس طرح یک طرفہ اور تشنہ
بتلایا جائے جیسے آج ہم اپنے پیشتیعوں کی تاریخوں کو بتلاتے ہیں ممکن ہے کہ آئندہ نسلوں کی جماعتی زندگی
کے معیار ان سے بالکل متضاد ہوں جو آج ہمارے عہد میں رائج ہیں۔ ممکن ہے کہ ہماری تاریخوں میں انھیں
ن حقایق حیات کی تلاش ہو وہ نہ ملیں۔ دراصل مورخ کو اس میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے
وہ واقعات کے انبار میں سے کیا چنے اور کیا چھوڑے اور کس واقعہ کو زیادہ اہمیت دے اور کس کو کم۔ سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ اہم اور غیر اہم کا فیصلہ کس اصول پر کیا جائے۔ اس اصول کے انتخاب میں مورخ کی ذاتی
رائے کا رنگ غالب آجاتا ہے چنانچہ اس بنا پر بعض ارباب علم و بصیرت کا یہ دعویٰ ہے کہ تاریخ کو معروضی
بنانے کی جا ہے کتنی کوشش کی جائے لیکن موضوعی رنگ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح اپنی جھلک ضرور
دکھا جائے گا۔

تاریخ کی دوسری قسم عام تاریخ ہے اس کا موضوع کسی خاص انسانی جماعت کے کسی مخصوص عہد کے
حالات کی تدوین ہے چنانچہ اس تدوین و ترتیب کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ صرف واقعات کو تاریخ وار منطقی
ترتیب سے بیان کردیا جائے اور دوسرے یہ کہ وقائع نگاری کے ساتھ ساتھ ان کی تاویل بعض اصول و ضوابط کے
تحت میں پیش کیجائے اس طریقے کے متبعین محض واقعات کو محفوظ کرنے کو تاریخ نہیں کہتے بلکہ اسے وقائع نگاری سے تعبیر
کرتے ہیں ان کے نزدیک تمام تاریخ کا مقصد اور منصب یہ ہے کہ وہ واقعات کے بے معنی طومار کو معنی پہنائے
اور انھیں کلیات کا پابند کرے اول الذکر کی مثال اسلامی مورخین کے یہاں ملتی ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق، ابن ہشام
ابن جریر طبری، مسعودی اور ابوالفدا کے یہاں زیادہ اہتمام اس بات کا ہے کہ واقعات کو ٹھیک ٹھیک پیش کیا جائے

اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ واقعات کا علم بے کم و کاست ہم تک پہنچ گیا لیکن فن تاریخ نویسی کو یہ نقصان برداشت کرنا پڑا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان محققین کی تنقید اور نتائج فکر سے محروم ہو گیا غالباً اسلامی مورخین نے ارباب مغازی و سیر کی تقلید میں احتیاط کا تقاضا یہی دیکھا کہ مستند حقائق کے علاوہ اور کسی طرف اعتنا نہ کی جائے بایں ہمہ ان کی اس کوشش کے باوجود یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ لکھنے والا مسلمان ہے اور خاص معتقدات کا پابند ہے

عام تاریخ کی دوسری وہ قسم ہے جو سلسلۂ معلومات کی ساری کڑیوں کو جوڑنے کے لئے تلاش و تحقیق کے سارے ذرائع صرف کرتی ہے اور ساتھ ہی حیات عمرانی کی موضوعی تاویل کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس قسم کی تاریخوں کے مرتب کسی طرح سے عدل و احتیاط و نکتہ دانی کی صفات سے محروم ہیں اصل میں ان کا طریقۂ تحقیق دوسرا ہے۔ وہ بالعموم موضوعی اور استخراجی طریقہ سے اپنے تاریخی نتائج قائم کرتے ہیں۔ تمدن و معاشرت کے مختلف دوروں میں یہ نتائج مختلف رہے ہیں۔ بالعموم یہ نتائج و کلیات ہر زمانہ کی مخصوص ذہنیت اور ضروریات اور مصلحتوں کا عکس ہوتے ہیں چنانچہ بندتو کروچے کا یہ دعویٰ اصلیت سے خالی نہیں کہ ہر تاریخ جو لکھی جاتی ہے چاہے وہ ماضی بعید کے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل زمانہ حال کی تاریخ ہوتی ہے[1] انسان اب تک ذہنی تجرید کی اس منزل تک نہیں پہنچا جہاں وہ اپنے گرد و پیش کے تاثرات سے بے نیاز ہو سکے ذیل میں ہم ان کلیات اور نظریوں کو تفصیل سے پیش کرتے ہیں جن کے مطابق مختلف زبانوں میں مختلف تاریخ نویسوں نے تاریخ علم کی تعبیر کی ہے۔

تاریخ اور نظریہ مذہب | مذہب نوع انسانی کا سب سے پرانا خادم ہے۔ اسی کی بدولت معاشرت قائم ہوئی اور تہذیب و تمدن اسی کے بطن سے پیدا ہوئے انسان کو سب سے پہلے اخلاق و ضبط کا سبق اسی نے دیا اور اسی کے دامن میں انسان کو سعادت و فلاح نصیب ہوئی۔ دنیا کا سب سے قدیم تاریخی سرمایہ ہمیں مذہبی کتب مقدس میں ملتا ہے۔ چنانچہ عہد عتیق Old Testament کو ہم بنی اسرائیل کی تاریخ کہہ سکتے ہیں بس کتاب مقدس سے ہمیں بنی اسرائیل اور ان اقوام کا حال معلوم ہوتا ہے جن سے بنی اسرائیل کو آئے دن

---

1. Theory and History of Historiography. By B. Croce.

طہ پڑا کرتا تھا۔ عہد عتیق میں جو تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہیں ان میں ایک خاص نقطہ نظر ملحوظ رکھا گیا ہے نقطہ نظر یہ ہے کہ تاریخ میں انسانی عاملین کے علاوہ ایک خارجی قوت کارفرما ہوتی ہے جس کی تدبیر اور ارادہ اقوام کے عروج و زوال کا باعث ہوتا ہے چنانچہ بنی اسرائیل کا خدا یہواہ ان کے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ اور بڑے سے بڑے کام میں دخل دیتا ہے چنانچہ عہد عتیق میں حضرت موسیٰ کو خطاب ہوتا ہے کہ "فرعون کے پاس جا اور یہ اس سے کہہ یہواہ یوں کہتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وے میری عبادت کریں اور اگر تو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کے سب کناروں کو مینڈکوں سے بھر دوں گا اور وے تیرے گھر میں اور تیری آرامگاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں پر اور تیرے آٹا گوندھنے کی لگنوں پر اچھلیں کودیں گے۔ (کتاب خروج)

کہیں یہواہ بنی اسرائیل کی لشکر کشیوں میں ان کے دوش بدوش نظر آتا ہے۔ عہد عتیق کی کتاب خروج میں یہ عبارت ملتی ہے۔ "یہواہ جنگ کا خدا ہے۔ یہواہ اس کا نام ہے۔ فرعون کی گاڑیاں اور اس کا لشکر اس نے دریا میں ڈال دیا۔ اس کے نامی رسالدار دریائے قلزم میں ڈوب گئے۔ اے یہواہ تیرا داہنا ہاتھ زور میں مشہور ہوا۔ تو نے اپنے بڑے جلال سے اپنا سامنا کرنے والوں کو مٹا دیا اور تیری ناک کے دم سے پانی ایک جگہ سمٹ گیا۔ تو نے اپنی رحمت سے ان لوگوں کو جنھیں تو نے خلاص کیا رہنمائی کی اور تو نے اپنے زور سے انھیں مقدس مقام تک لا پہنچایا" غرضیکہ عہد عتیق کے ہر صفحہ پر یہ نظر آتا ہے کہ انسانی تاریخ کی تہ میں کوئی مافوق قوت کام کر رہی ہے اور عمران بشری اپنی تشکیل خود اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کی بنا پر نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ ایک اعلیٰ مشیت کا پابند ہے۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھئے تو تاریخ میں انسان کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے گویا کہ وہ آلہ کار ہے ایک دوسری صاحب ارادہ ہستی کا۔ عہد عتیق کی عبارتوں سے پتہ لگتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے کو خدا کی برگزیدہ اور منتخب جماعت سمجھتے تھے گویا کہ وہ محور ہیں اور ساری انسانی تاریخ انکے گرد گھوم رہی ہے اس مخصوص ذہنیت اور نفسی کیفیت کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے محقق کو چاہئیے کہ ان حالات کا جائزہ لے جن سے بنی اسرائیل کو سابقہ کرنا پڑتا تھا۔ سیاسی حیثیت سے کلدانی، آشوری اور فراعنہ جیسے زبردست حریفوں سے ان کا مقابلہ تھا ان حالات میں تنظیم کے ساتھ ساتھ

اگر ان میں جماعتی احساس شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا تو اس پر مطلق تعجب نہیں۔ دراصل جماعتوں کی
شیرازہ بندی میں اس قسم کا احساس ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیے اس زمانہ میں بھی
اپنی تفضیل کا احساس ہر منظم انسانی جماعت میں موجود ہے۔ فرانسیسی اپنی شائستگی اور لطافت طبع پر
جرمن اپنی Kultur پر انگریز اپنے سیاسی اداروں پر امریکی اپنی صنعتی تنظیم پر اور اسی طرح دوسری
قومیں اپنی اپنی خصوصیات پر فخر کرتی ہیں اور انھیں بڑائی اور فضیلت کا معیار قرار دیتی ہیں ہندوستانی تک
باوجود اپنی اس گئی گذری حالت کے سمجھتے ہیں کہ ان کی تہذیب دنیا کی اعلیٰ ترین روحانی تہذیب ہے
اور دنیا کی سعادت اسی میں ہے کہ وہ ان کے تہذیبی پیغام کو کان دھر کے سنے مسلمانوں کا یہ یقین ہے
کہ وہ خیر امت سے خطاب کئے گئے ہیں اس لئے ان کے اصول تمدن و معاشرت دنیا کے لئے سب سے زیادہ
موزوں ہیں یہ صحیح ہے کہ ایک حد کے اندر اس قسم کا احساس اقوام کی خودداری اور خود اعتمادی پر دلالت کرتا
ہے لیکن اگر اس میں غلو برتا جائے تو وہ انسانیت کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

یہودیوں کے بعد مسیحی تعلیمات نے انسانی نجات کے ایک آسمانی مقصد کو ضروری ٹھہرایا سب سے
پہلا مسیحی مورخ جو یونانی کلیسا کا پیرو تھا Eusebius (۲۶۴-۳۴۰) ہوا ہے اس نے اپنی
تاریخ کلیسا میں دیانت کے باوجود کھلی ہوئی مذہبی جانبداری برتی ہے۔ اس عہد کے مسیحی تاریخی
احساس کو St. Augustine (۳۵۴-۴۳۰) نے اپنی کتاب De civitate Dei
یعنی خدائی شہر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقوام کا عروج و زوال خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس
کی قدرت کو پھول اور پتی کی بناوٹ اور چڑیا کے پر کی ساخت میں دخل ہے تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا
ہے کہ انسانی جماعتوں کی کامرانیاں اور ناکامیاں ان کی زندگی کے انقلابات اور اقبال و ادبار کا پورا
سلسلہ تقدیر الٰہی کے دخل کے بغیر عمل میں آئے اس کے نزدیک تاریخ عالم دراصل خدا کی مرضی کا پرتو ہے اور
اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے اسٹیج کا اصلی ایکٹر انسان ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں انسان
اپنے افعال کا مختار نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ مشیت کے تابع ہے اسی کتاب میں دوسری اہم بات [illegible]
[illegible] نے یہ ثابت کی ہے کہ اصلی نیکی انسان کے لئے اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ مسیحی مذہب کی

ین کو قبول کرے St. Augustine تمام انسانوں کو آدم کی اولاد بتلاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی
تا ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جنھوں نے خدا کے پیغام کو نہیں سنا اور اس کی پروا نہیں کی
و وہاں نصیب سعادت ابدی سے محروم رہیں گے۔ دوسرے وہ ہیں جنھوں نے خدا کے پیغام کو سنا اور
پنے معبود سے محبت کا رشتہ جوڑا۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں میں فائز المرام ہوں گے چنانچہ وہ اپنی کتاب میں
ن دونوں جماعتوں کی مناسبت سے دو شہر بساتا ہے ایک یزدانی شہر ہے اور دوسرا civitas diaboli
ی شیطانی شہر ہے وہ کہتا ہے کہ انسانی جماعتوں کو زبان، نسل، اور حکومت وغیرہ کے اعتبار سے مختلف
نوں میں تقسیم کرنا بے سود ہے۔ اس لئے کہ تمدن و معاشرت کی بنا نیکی ہے اور نیکی پر یزدانی شہر کے
دود کے باہر عمل نہیں ہو سکتا۔

یورپ کے ازمنہ وسطی کے تاریخی ادب میں اس نظریہ کا اثر نظر آتا ہے خانقاہیت کی تحریک
ے ساتھ علوم کے چرچے قائم رہے لیکن فلسفۂ تاریخ میں کوئی مجتہد اس زمانہ نے نہیں پیدا کیا
سولھویں صدی عیسوی میں Pere Thomassin نے ایک کتاب لکھی جس کا منشا یہ تھا کہ
یحیت کا پابند رہ کر قدیم غیر مسیحی مصنفین تاریخ کے ذخیرۂ معلومات سے کیونکر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس
تاب کا نام "Methode d'étudier et d'enseigner chrétiennement
les historiens profanes"

سترھویں صدی عیسوی میں بوسوئے نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ عالم پر تبصرہ" شائع کی۔ بوسوئے
مورخ ہونے کے ساتھ مشہور ادیب بھی ہے اور اپنے اسلوب بیان کے باعث ادب فرانسیسی کے چوٹی
کے لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ بوسوئے کی تصنیف تین حصوں پر منقسم ہے پہلے حصہ میں تخلیق عالم سے لے کر
شارلیمین کے زمانہ تک تاریخوار حالات ہیں دوسرے حصے میں ہے مذہب کے متعلق خیالات کا اظہار ہے
اور تیسرے حصے میں سلطنتوں کے عروج و زوال پر بحث کی ہے بوسوئے نے St Augustine
کے نظریہ تاریخ کو سلیس زبان میں پیش کرنے کے ماسوا اپنی طرف سے کوئی اجتہاد نہیں کیا۔ اگرچہ وہ اپنی
تاریخ کو تاریخ عالم کہتا ہے لیکن دراصل اس میں بنی اسرائیل دین مسیح اور شارلیمین کے زمانہ تک کے

سیاسی حالات کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ بوسوئے کے ہاں ترقی کا تصور بھی کہیں کہیں ملتا ہے چنانچہ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ دین مسیح دراصل حضرت موسیٰ کے مذہب کی ترقی یافتہ صورت ہے اس کے نزدیک مذہب کوئی جامد اور غیر متحرک چیز نہیں بلکہ اس میں ایک جاندار چیز کی طرح نشو و نما کی پوری صلاحیت موجود ہے وہ اپنی تاریخ میں معجزوں اور پیشین گوئیوں کو تاریخی حقائق کی طرح پیش کرتا ہے حیات انسانی میں غیر انسانی قوت مافوق کی دست اندازی کی نسبت وہ کہتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں مدبر حقیقی کا دخل ضرور ہوتا ہے علم تاریخ کا یہ فرض ہے کہ انقلابات کی تحقیق کرتے وقت اس حقیقت کا کھوج لگائے کہ معمولی اسباب کی تہ میں وہ کون سے ابدی قوانین ہیں جو تاریخ کی ہر چھوٹی بڑی تبدیلی کو پیدا کرتے ہیں۔ بوسوئے نے اپنی تاریخ میں غیر مسیحی اقوام کا جب کبھی ذکر کیا ہے اچھی طرح کیا ہے اور ان کی فضیلت اور خوبی کو اجاگر کرکے دکھانے کی کوشش کی ہے بوسوئے نے اپنی تاریخ میں استقرائی طریقۂ تحقیق کو بہت کم استعمال کیا ہے اس کے تمام تر تاریخی نتائج مذہبی عقائد پر مبنی ہیں۔ چنانچہ وہ تاریخ عالم کا صرف ایک منتہائے مقصد ثابت کرتا ہے اور وہ دنیا میں "مسیح کی بادشاہت" کا قیام ہے اور اس کے نزدیک "مسیح کی بادشاہت" اور رومن کیتھولک کلیسا میں کوئی فرق نہیں۔

تاریخ عالم کی مابعد الطبیعی تاویل انیسویں صدی کے شروع میں جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل نے اپنے لیکچروں میں جن کا عنوان "فلسفۂ تاریخ" ہے پیش کی ہے لیکن اس کے نقطۂ نظر اور St Augustine اور بوسوئے کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے یہ دونوں عقاید و دینیات کے تنگ دائرہ سے باہر نہیں نکلتے بخلاف ان کے ہیگل نے تاریخ کے مسائل پر فلسفیانہ نکتہ دانی سے بحث کی ہے اس کے نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ عالم تاریخ یا عالم انسانی کائنات فطرت سے علیحدہ ایک اپنا وجود رکھتا ہے ان لیکچروں میں ہیگل نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ تاریخ عالم عقل انسانی کی کارفرمائیوں کی ایک تصویر ہے عقل ہی کائنات کی غیر محدود قوت ہے اور یہی مابعد الطبیعی طاقت جسے خدا یا مشیت کہتے ہیں تاریخ عالم کی رفتار کو متعین کرتی ہے۔ عقل کو بعد میں چل کر وہ حقیقت اور مکمل عین سے تعبیر کرتا ہے آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ تاریخ عالم ان معنوی حقایق سے عبارت ہے جو روح کائنات کو اپنے عین کی تکمیل میں پیش آتے ہیں۔ ایک جگہ وہ تاریخ کی حسب ذیل الفاظ میں تعریف کرتا

ہے یعنی عقل اپنی محسوس شکل میں خدا ہے. خدا کائنات پر حکومت کرتا ہے. تاریخ عالم عبارت ہے اس کی حکومت کے منصوبوں کی تکمیل سے" اس جگہ تفصیل کا موقع نہیں اور میں اس کا اہل بھی نہیں کہ ہیگل کے فلسفہ کے متعلق رائے زنی کروں. اس ضمن میں صرف اتنا پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ تاریخ کا مذہبی اور مابعد الطبیعی نظریہ انیسویں صدی کے وسط تک یورپ کے نظام فلسفہ کا ایک جز رہا اور آج بھی اپنا روپ بدل کر کبھی کبھی دکھائی دے جاتا ہے

تاریخ اور جغرافیہ یہ خیال بہت قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے کہ قدرتی ماحول اور آب وہوا کا انسان پر اثر ہوتا ہے قدما میں بقراط نے طبی حیثیت سے مختلف لوگوں کے مزاج اور عادات کا ان کے مقام بود و باش اور آب و ہوا کو ذمہ دار ٹھہرایا سولھویں صدی میں فرانسیسی مفکر بودان اور اٹھارویں صدی میں مونٹسکیو نے اقوام کی زندگی اور طور طریقوں پر ماحول اور آب وہوا کے اثر کو ثابت کیا ہے ثانی الذکر اپنی مشہور کتاب "روح قوانین Esprit des lois" میں کہتا ہے کہ مختلف اقوام کے قوانین دراصل عکس ہوتے ہیں ان کے مخصوص جغرافی حالات کا اس کے ہمعصر بوفون نے بھی انسانی زندگی پر جغرافی اثر کو تسلیم کیا ہے کہیں ساتھ ہی وہ یہ تبلاتا ہے کہ انسان کو کائنات فطرت کی ایک مجبور اور بے بس ہستی سمجھنا غلط ہے بلکہ کائنات کے اسٹیج پر اس کی حیثیت ایک ایکٹر کی سی ہے. یہ سچ ہے فطرت اس پر اپنا اثر ڈالتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور قوت ارادی سے فطرت کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے. اس کے عمل کی بے پناہ زد خود فطرت میں تبدیلیاں پیدا کرنے پر قادر ہے. تاریخ اس پر شاہد ہے کہ وہ تقریباً تیس صدیوں سے فطرت کے ساتھ برسر پیکار رہے اس نے ویرانوں کو آباد کیا. بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنایا. پہاڑوں کے سینے چاک کئے. دریاؤں کو روکا، اور اپنے وجود کا سکہ کائنات فطرت کے ہر گوشہ پر بٹھایا.

حال کے مصنفین میں تاریخ عالم کی جغرافی تعبیر کرنے والے دو مشہور شخص ہوئے ہیں ایک جرمن Ratzel ہے جس نے اپنی مشہور کتاب Anthropogeographie. (جغرافیہ انسانی) اور Politische Geographie (جغرافیہ سیاسی) میں یہ ثابت کیا ہے کہ زمین آب وہوا، اور خوراک کا انسانی جماعتوں پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے دراصل تاریخ کی رفتار کا تعین انہیں عناصر سے ہوتا ہے مختلف انسانی گروہوں کے اخلاق و عادات ان کے علوم و فنون ان کے سیاسی اور معاشرتی ادارے اور ان کے قوانین ان موثرات

کا عکس ہوتے ہیں، چنانچہ Ratzel نے ایک کلیہ پیش کیا ہے کہ خاص قسم کے جغرافی حالات میں ہر جگہ ایک ہی
کے نتائج پیدا ہوں گے جس طرح کسی خاص قسم کی آب وہوا میں خاص قسم کے حیوانات و نباتات پیدا ہو سکتے
اس طرح انسان بھی اپنے ماحول کے ہاتھوں مجبور ہے چنانچہ سمندر کے کناروں پر جو لوگ آباد ہیں ان میں
ان کے زیادہ حوصلہ مندی ہوگی جو میدانوں میں آباد ہیں لیکن کیا یہ دعویٰ تنقیدی کسوٹی پر پورا اترتا ہے
انگلستان کے باشندوں میں تین سو سال قبل کوئی غیر معمولی حوصلہ مندی ہمیں نظر نہیں آتی فرانس کا مغربی
یعنی برتانیہ کا کنارہ، یا البانیہ کے کنارے جہاز رانی کے قابل ہیں لیکن تاریخ میں البانیہ یا برتانیہ کے لوگ
اب تک اپنی حوصلہ مندی کا کوئی ثبوت نہیں دیا یہ ہمیشہ سے ماہی گیری کا پیشہ کرتے رہے اور مثل مشہور ہے کہ
کاشتکار سے بھی زیادہ کم حوصلہ ہوتا ہے وہ اپنے ڈونگے میں بیٹھ کر سمندر پر روانہ ہوتا ہے لیکن اس کی نظر ہمیشہ
پر اور اپنے گھر پر رہتی ہے کہ کہیں وہ آنکھ سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اسی طرح بحیرۂ ایڈریاٹک کے دونوں ساحل
یعنی اٹلی اور کرواسیا کے کناروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ دونوں طرف ایک ہی قسم کی آسانیاں موجود ہیں
جہازرانی کی ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ اطالوی ساحل پر زبردست جہاز راں حکومتیں قائم ہوئیں اور تجار
کو فروغ ہوا لیکن کرواسیا کا ساحل (جو آج کل یوگوسلاویہ کے زیر اقتدار ہے) آج تک یوں ہی ویران پڑا
ہے۔ پورے ساحل پر سوائے فیوم کے کوئی بندر گاہ نہیں۔ اور اس بندرگاہ کو ساحل کرواسیا کے ماہی گ
نے نہیں بنایا بلکہ اطالوی ساحل کے ذی حوصلہ جہاز رانوں کی بدولت اس کی ساری رونق قائم ہے

Ratzel کے "مشیئت جغرافی" کے نظریہ کے خلاف فرانسیسی مورخ اور ماہر جغرافیہ Vidal de la
Blanche کا نظریہ ہے وہ کہتا ہے کہ جغرافی اثر کا انسانی جلن پر امکان ضرور ہے لیکن وہ لازمی نہیں
طرح فطرت انسان پر اپنا اثر کرتی ہے اس سے زیادہ اثر انسان فطرت پر ڈالتا ہے بلانش نے اپنے سلسلۂ مضا
میں جو Genres de Vie (زندگی کی نوعیتیں) کے عنوان سے شائع ہوئے یہ ثابت کیا
کہ مختلف انسانی گروہوں کی تاریخ میں مختلف قسم کے موثرات کارفرما رہے ہیں محقق کو چاہیئے کہ مختلف مظا
حیات کو الگ الگ تحقیق کے معیار پر پرکھے وہ انسان کے لئے agent natural یعنی عامل فط
کی اصطلاح استعمال کرتا ہے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جہاں سنگ مرمر پایا جاتا ہے وہاں سنگ

فن کی ترقی میں سہولت ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ سنگ تراشی کو وہاں لازمی طور پر فروغ ہو یونان میں پیرکلیز
ماضی میں بھی سنگ مرمر نکلتا تھا اور اس کے عہد کے چند صدیوں بعد بھی اس کا نکلنا بند نہیں ہوا لیکن پیرکلیز
زمانہ میں بت گری اور سنگ تراشی کے فنون کو خوب ترقی ہوئی اور پھر چند صدیوں بعد ہمیں یونان کی سرزمین بت گر
اہوں سے خالی نظر آتی ہے۔ دور کیوں جائیے خود ہمیں اپنی ریاست کی مثال لیجئے۔ خلد آباد میں انگوروں کی
ایت عمدہ کاشت ہوسکتی ہے وہاں کی زمین کی یہ صلاحیت ہمیشہ سے موجود ہے لیکن اسلامی بادشاہوں سے
ہلے کسی نے وہاں انگور کی کاشت نہیں کی اگر انسانی عمل کی کارفرمائی نہ ہو تو جغرافی صلاحیتیں مخفی رہتی ہیں۔
انسانی عمل کے طلسم سے وہ بیدار ہوتی ہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ انسانی عمل کا اصلی سرچشمہ جغرافیہ نہیں ورنہ
اسلامی بادشاہوں سے قبل بھی خلد آباد میں انگور کی کاشت ہونی چاہیئے تھی اسی طرح انگلستان میں آج سے
پانچ چھ صدی قبل بھی زبردست بیڑا ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ نظریہ جغرافی کے دعویٰ کے مطابق انگلستان
کا بیڑا اس کے جغرافی محل کے باعث وجود میں آیا ہے۔ اسی طرح یہ دعویٰ ٹھیک ہے کہ شہر زیادہ تر وہیں
آباد ہوتے ہیں جہاں ابتدائی ضروریات زندگی جیسے پانی وغیرہ آسانی سے دستیاب ہوسکیں یا غنیم کے
خلاف مدافعت میں سہولت ہو یا صنعت و حرفت کو ترقی دی جاسکے لیکن تاریخ کی جغرافی تعبیر کرنے والے
اس دعویٰ میں غلو برتتے ہیں گویا کہ انسانی ارادہ کو شہروں کے قائم کرنے میں کوئی دخل ہی نہیں ہیں
تاریخ میں ایسے شہروں کا حال ملتا ہے جن کا قیام محض ان کے جغرافی محل وقوع کی بنا پر نہیں بلکہ
اور دوسرے اسباب کے باعث وجود میں آیا فرانس کے شہر مارسیئی (Marseilles) کو مثال کے
طور پر پیش کیا جاسکتا ہے اس شہر کی آب و ہوا اور محل وقوع اتنا اچھا نہیں جو اس کے قریب اور دوسرے
بندرگاہوں کا ہے۔ میٹھے پانی کی قلت، ہواؤں کی تندی، زمین میں چونے کی زیادتی اور بنجرپن، اور
آس پاس کی پہاڑیوں کے باعث راستے بنانے کی دشواری لیکن باوجود ان تمام باتوں کے یہ شہر دن بدن
ترقی کر رہا ہے اور فرانس کا سب سے بڑا بندرگاہ ہے دوسرے مقامات کو جن کا محل وقوع اس سے کہیں
زیادہ بہتر ہے اس کے مقابلہ میں فروغ نہ ہوا Vidal de la Blache کا نظریہ جغرافی اثر سے انکار
نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی انسانی ارادہ اور عمل کو تاریخ کے اصلی محرکات سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک

انسان مجبور نہیں بلکہ فاعل مختار ہے۔ اپنی مصلحتوں اور ضروریات کے مطابق زندگی کو جس راہ پر چاہے ڈال دے۔ اس کے نظریہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عالمگیر کلیات قائم کرنے سے حتی المقدور بچتا ہے۔ پہاڑ میدان، سمندر، آب و ہوا اور پیداوار وغیرہ کا یقیناً حیات عمرانی اور حیات انفرادی پر اثر پڑتا ہے لیکن انسانی زندگی میں اور دوسرے عناصر کا اثر اس قدر قوی ہے کہ اس کے متعلق کلیہ قائم کرنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ کوئی ایک سبب زندگی کی گوناگونی کی تاویل نہیں پیش کر سکتا۔ انسانی چلن کی تعین میں خارجی اور داخلی دونوں قسم کے اسباب کام کرتے ہیں۔

مشہور مؤرخوں میں جنھوں نے تاریخ کی جغرافی تاویل کو پیش کیا ہے ہنری ٹامس بکل اور ژول مشلے کے نام قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے انگلستان کی تہذیب کی تاریخ لکھی ہے اور اس ضمن میں تاریخ عالم کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ بکل نہایت شدت سے اس خیال کا حامی تھا کہ علوم طبیعی کی طرح تاریخ کے بھی ایسے قوانین مقرر کئے جا سکتے ہیں جو عالمگیر ہوں۔ جغرافی تاویل کے ذریعہ اس کا خیال تھا کہ تاریخی قوانین میں صحت اور باقاعدگی پیدا کی جا سکتی ہے مشلے بھی اس کا ہم خیال ہے وہ اپنی کتاب Tableau de la France (مرقع فرانس) میں کہتا ہے "تاریخ دراصل جغرافیہ سے عبارت ہے... بغیر جغرافیہ کے تاریخ میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان، جو تاریخ کے ڈراما کا ایکٹر ہے، ہوا پر چل رہا ہے بالکل ان چینی تصاویر کی طرح جن میں زمین نہیں نظر آتی۔ زمین انسان کے ایکٹنگ کے لئے صرف تھیٹر ہی کا کام نہیں دیتی بلکہ اس سے اس کو غذا ملتی ہے اور اس کی آب و ہوا اس کی زندگی کی ضامن ہوتی ہے۔ زمین کا آدمی کی ذات پر سیکڑوں طریقوں سے اثر پڑتا ہے۔ جیسا گھونسلا ویسی چڑیا، جیسا وطن ویسا انسان۔ اپنی دوسری کتاب "تمہید تاریخ فلسفہ" میں کہتا ہے۔ "آپ مجھے کسی ملک کا نقشہ دیجئے جس سے اس کے طبعی حالات، آب و ہوا، بارش ہواؤں اور جغرافیہ کا علم ہو سکے اور میں دعوے کے ساتھ بتلا دوں گا کہ اس ملک کا آدمی کیسا ہوگا، اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں گا کہ تاریخ عالم میں یہ ملک کیا حیثیت اختیار کر سکتا ہے میرے اس دعوی کی صداقت اتفاقی نہیں ہوگی بلکہ حتمی ہوگی اور میرا یہ دعوی صرف کسی ایک عہد کی تاریخ تک محدود نہ ہوگا۔ بلکہ وہ ہر زمانہ پر حاوی ہوگا۔ اس عہد کے اور دوسرے مشہور تاریخ نویس جن نوا

...Victor Duruy اور جرمنی میں Ernest Curtius نے اسی نقطۂ نظر سے تاریخ کو
...یا ہے۔

...ندن | مسلمانوں میں چودھویں صدی عیسوی میں علامہ ابن خلدون نے تاریخ عالم کی یہ تعبیر کی
...دراصل تاریخ حضریت اور بدویت کی دائمی جنگ کا نام ہے۔ بدویت اپنی عصبیت اور شوکت کی بدولت
...پر کامیابی حاصل کرتی ہے اور پھر اسی کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ ابن خلدون کے ہاں بھی اس
...کو پیش کیا گیا ہے کہ زمان و مکان کی تبدیلی سے افراد و اقوام کے طور طریقوں میں تبدیلیاں پیدا
...تی ہیں۔ ابن خلدون نے تاریخ کی تعبیر میں حیات اجتماعی کے طبعی عوارض پر بھی بحث کی ہے چنانچہ
...لیے کہ بدویت کے طبعی عوارض کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمدن پر ہمیشہ غلبہ و استیلا حاصل کرے تاریخ
...بدویت اور حضریت کی کشمکش سے عبارت ہے۔ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ پر علیحدہ مضمون لکھنے
...دہ ہے اس لئے یہاں تفصیل سے ذکر نہیں کیا۔

...ود نسل | کوئی پچاس سال ہوئے کونت دے گوبینو نے اپنی کتاب Essai sur l'inegalité des races humaines
...(انسانی نسلوں کی عدم مساوات) میں یہ نظریہ پیش کیا کہ بعض نسلیں جن میں دوسری نسلوں
...ل نہیں ہوا ہے قدرتی طور پر تمدن و تہذیب کی اہل اور اس کے لئے موزوں ہوتی ہیں چنانچہ اس
...زدیک نارڈک نسل کی رگوں میں بے میل خون پایا جاتا ہے اور یہی دنیا کی سب سے اعلیٰ نسل ہے
...لی مساوات کو افسانہ سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتا اور اپنے خاص انداز میں دریافت کرتا ہے "اگر ایک
...Iroquois (شمالی امریکہ کا اصلی باشندہ) کا ذہن ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک انگریز یا فرانسیسی کا تو اس
...کیا وجہ ہے کہ اس نے صدیوں میں نہ تو سمجھا یا دریافت کیا اور نہ بھاپ کی قوت کا راز معلوم
...؟ میں Hindus سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تو ہمارے ہم قوموں سے برابری کا دعویٰ کرتا
...تو پہلے مجھے یہ سمجھا دے کہ تیرے قبیلے کے سورماؤں میں آج تک سیزر، یا شارلیمن کی حیثیت کا آدمی
...وں پیدا نہیں ہوا؟ اور تیرے بھاٹ اور جادوگر ہومر اور بقراط کے رتبہ کو آج
...تک کیوں نہ پہنچ سکے؟" کونٹ دے گوبینو کا خیال ہے کہ ایک ہی علاقہ میں اور ایک ہی جغرافی ماحول میں

بربریت اور اعلیٰ ترین تمدن کا دوش بدوش موجود ہونا ممکن ہے وہ مصر کی قدیم تاریخ سے عمل سے عاری فلاح اور ممفس Memphis (مصر کا قدیم دارالسلطنت) کے ذہین مذہبی پیشواؤں کو بطور مثال پیش کرتا ہے اس سے زیادہ اچھی مثال ہمیں ہندوستان کے آسمان تلے دکھائی دیتی ہے ہندوستان کے مختلف طبقوں کی ذہنی اور اخلاقی زندگی میں جتنا بڑا فرق نظر آتا ہے غالباً اور کسی ملک میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔

گوبینو کے بعد پچاس سال کے عرصہ میں علم النسل نے بہت ترقی کر لی ہے اب اس کے نتائج معروضی حقائق کی چھان بین کے بعد مستنبط کئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جدید تحقیق نے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ خالص نسل کا وجود افسانہ سے زیادہ نہیں۔ بعض نسلوں میں میل کم ہے اور بعض میں زیادہ۔ اور یہ بھی صحیح نہیں کہ جن نسلوں میں میل کم ہے وہ غیر معمولی طور پر تمدن کے لئے زیادہ موزوں ہیں اور تاریخ میں انھیں کوئی خاص حیثیت حاصل رہی ہے چنانچہ کنیڈا کے باشندوں میں دوسری نسلوں کا میل مقابلتہً بہت کم ہے لیکن آج تک لاپ لوگوں نے تہذیب و تمدن کے میدان میں کوئی ترقی نہیں کی۔ علم النسل نسلی خصوصیات سے انکار نہیں کرتا لیکن یہ خصوصیات محض عارضی ہوتی ہیں کُرد اور ارمنی ان نسلوں کی اولاد ہیں جنھوں نے بڑے بڑے تمدن قائم کئے تھے لیکن آج یہ کچھ بھی نہیں۔ آج سے چند صدیاں پیشتر سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کے باشندے تمام یورپ میں جنگجو مشہور تھے لیکن آج یہ دونوں ملک یورپ کے سب سے زیادہ امن پسند ملکوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

کونت دے گوبینو کے نظریہ کو انگلستان میں Chamber Cain نے رواج دیا اس نظریہ سے یہ فائدہ ہوا کہ جرمنی، فرانس اور انگلستان میں "علم الانسان" اور علم النسل کو فروغ ہوا اور آج یہ علوم دوسرے عمرانی علوم کے دوش بدوش کائنات انسانی کے رازوں کو تحقیق کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ کونت دے گوبینو کے نظریہ نسل کے علاوہ انیسویں صدی کا مشہور تاریخی نظریہ کارل مارکس کا ہے جو "تاریخ کی مادی تاویل" کے نام سے مشہور ہے۔ مارکس کے نزدیک تاریخ سوائے معاشی کشمکش کے کچھ نہیں۔ اس نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ژاں ژورس نے اپنی مشہور تصنیف "انقلاب فرانس کی اشتراکی تاریخ" لکھی اس میں نام نہاد جمہوریت کی حقیقت

ور یہ ثابت کیا ہے کہ انقلاب فرانس دراصل اشتراکی انقلاب تھا۔ طبقہ متوسط نے جمہوریت کے افسانے کو
مزدور کو اس کے جائز حق سے محروم کر دیا۔

انیسویں صدی کے یورپ کے تمام بڑے بڑے تاریخ نویسوں نے تاریخ کے معروضی حقایق پر موضوعی رنگ
ں کوشش کی۔ مثلاً میشے۔ تیرے، (Thierry) اور (Thiers) جمہوریت کے علمبردار ہیں اور
ر اس کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں۔ گیزو نے تاریخ کے علمی وقار کو قائم رکھنے کے لیے غیر جانبداری
ں کے باوجود فرانسیسی قوم کو یورپ کے سب سے زیادہ متمدن اور شائستہ قوم ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی
ا دیا۔

تنقید | انیسویں صدی کے اواخر میں فرانس میں تاریخ نویسی نے تنقیدی فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس
ں اسکول کے علمبردار موسیو رینوئے Renouvier ہیں۔ ان کی دو کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ (۱)
(1) "Essai de la critique Generale" (2) "Introduction à la philosop
Analatique de l'Hu ان تصانیف میں رینوئے نے تاریخ کو علوم صحیحہ یعنی کی فہرست
ں کیا ہے اس کی رائے میں تاریخ کا طریقہ تحقیق خالص استقرائی ہونا چاہیئے۔ ان کے بعد سینوبوس نے جو
ں باوجودیکہ سی کے پیرس یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اپنی کتاب Les conditions psychologique de la connaissance en
historie میں تنقیدی طریقہ تحقیق کی مزید توضیح کی۔ موصوف نے اپنی دلچسپ کتاب میں حسب ذیل
ر بحث کی ہے: تاریخی علم کی نوعیت (۲) اس کا مواد (۳) تاریخی واقعات کو دوسرے واقعات سے کس
حدہ کیا جائے (۴) طریقہ تحقیق کی کن خرابیوں کے باعث غلط نتیجے پیش کئے جاتے ہیں ۵۔ تاریخی
ت کی تصدیق و توثیق کا طریقہ۔

اس تنقیدی اسکول کا ایک عام رجحان یہ ہے کہ تاریخ کے حدود کو جہاں تک ممکن ہو محدود کرے۔ علمی
کے لئے تحدید ضروری ہے لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ تحدید ٹھیک نہیں۔ تاریخ امتزاجی علم ہے اس
نوع اجتماعی زندگی کے تمام رخوں پر حاوی رہنا چاہیئے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اس کا طریقہ تحقیق
ستخراجی ہو۔ اس کی تحقیق میں استقرائی اور استخراجی دونوں طریقہ ہائے تحقیق پہلو بہ پہلو کام کریں

تو بہتر ہے۔ بغیر اس کے اجتماعی زندگی کی مجموعی تصویر نا تمام رہے گی

یورپ میں تاریخ کا جدید ترین طریقۂ تحقیق اتحادی اصول پر مبنی ہے متفرق شخص اپنے موضوع کو زیادہ سے زیادہ محدود کرکے کام کرتے ہیں اور اس تمام کام کو ایک سلسلہ میں منسلک کردیتے ہیں۔ ایڈیٹر کا کام یہ ہوتا ہے کہ ان مختلف لوگوں کی تحقیقات میں ربط و وحدت پیدا کرے چنانچہ انگلستان میں (Dictionary of National Biography) اور The Cambridge History اور جرمنی میں Monumenta Germaniae Historica اور فرانس میں "Vue Générale de l' Histoire politique de l'Europe" اسی نوعیت کے کام ہیں جو اتحادی اصول پر انجام پائے ہیں۔

تاریخی دوروں کی تقسیم | تاریخی طریقہ تحقیق کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ اور ضروری مسئلہ یہ ہے کہ تاریخی دوروں سے کیا مراد ہے؟ تاریخ نویس اور دوسرے معاملات میں چاہے کتنا بھی اختلاف آرا ظاہر کریں لیکن یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت تک تاریخ کا صحیح تصور ہمارے ذہن نشین نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم اسے مختلف دوروں میں نہ تقسیم کریں۔ ماضی کی ذہنی گرفت کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرد‌ئے جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں مثلاً ایک ایسا جامع تصور آجاتا ہے جو اس زمانہ کی پوری حیات عمرانی پر حاوی ہوتا ہے۔ جاگیرداری، کلیسا، اور تمدن و معاشرت کی ایک تصویر زندگی کے سارے خط و خال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

فی الحقیقت دوروں کی تقسیم بالکل موضوعی حیثیت رکھتی ہے یورپ کے تاریخ نویس جدید یورپ کی تاریخ نشاۃ ثانیہ سے شروع کرتے ہیں لیکن کیا کوئی ایسا مطلق معیار موجود ہے جس پر یہ بات پرکھی جاسکے کہ "نشاۃ ثانیہ" سے یورپ کی ایک نئی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ بعض تاریخ نویسوں کو لفظ "نشاۃ ثانیہ" Renaissance پر اعتراض ہے اور ان کا اعتراض ٹھیک ہے اس لفظ سے تعصب اور جانبداری کی بو آتی ہے۔ یہ نام ان لوگوں کا دیا ہوا ہے جو قرون وسطیٰ کو تاریکی کے عہد سے تعبیر کرتے ہیں یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی تعلیمیافتہ اور دولت مند نوجوان اپنے غریب غیر تعلیم یافتہ بوڑھے باپ کو بات

جاہل اور تاریک خیال کے لقب سے خطاب کرے یورپ کو شاید یہ غرہ ہے کہ اس کے موجودہ معیار
ں اور ابدی ہیں لیکن تاریخ ہمارے ہمیں اس کے بالکل برعکس سبق دیتی ہے۔ آج جن اداروں
کو ناز ہے ہمیں کیا معلوم کہ زمانہ کے تغیرات ان کی صورت کو کس طرح مسخ کر دیں گے آج کلیسا
ے ایک مردہ حقیقت ہے لیکن کیا معلوم کہ کل ریاست اور خاندان کا بھی وہی حشر ہو جو کلیسا
ب ہمارے موجودہ معیار اور ہمارے موجودہ ادارے تاریک خیالی پر محمول کئے جائیں گے تو ہمیں کیا
لہ ہم اس وقت کے تمدن سے اپنے واسطے کلمۂ خیر کی توقع کریں جب کہ ہم اپنے ماضی کے لئے
ستعمال کرنے میں بخل برتتے ہیں۔ بہر حال اصل مسئلہ یہ ہے کہ تقسیم ادوار بالکل موضوعی چیز ہے
نقطہ نظر سے زمانہ ایک ناقابل تقسیم چیز ہے اس کا کوئی اور چھور نہیں۔ مثلاً یورپ کی تاریخ میں
یسے لمحہ، دن، یا سال کو متعین نہیں کر سکتے جب کہ دور جدید شروع ہوا ہوگا اور
وسطیٰ ختم ہوئے ہوں گے۔ ذرا ان لوگوں کا ذہنی تصور قائم کیجئے جو اس زمانہ میں یورپ
ندگی بسر کر رہے تھے۔ انھیں یہ سن کر کس قدر تعجب ہوتا اگر کوئی یہ اعلان کرتا کہ آج
رپ کی تاریخ کا دور جدید شروع ہو گیا۔ جو دور کسی انقلاب سے شروع ہوتے ہیں ان کا
ں ایک حد تک رہتا ہے لیکن وہ صرف ان لوگوں کو جو معیشت انسانی کے مسائل پر فکر کرتے
ندگی اپنے فوری اور عارضی مسائل میں اتنی منہمک رہتی ہے کہ ان باتوں کا انھیں احساس بھی نہیں
ل یوں سمجھئے جیسے کوئی آج کہے کہ جس گول میز کانفرنس کی پہلی نشست لندن میں ہوئی ہے اس
ے ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے اگر اس قسم کے اعلان کا ہندوستان کے ہر گاؤں
ھنڈورا پٹوایا جائے تو بھی یقین جانئے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں گے اور نہ اسے باور کریں گے

بعض دفعہ تاریخ پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا واقعات عہد و سنین کے پابند ہیں
یہ کی ہندوستان کی شورش کو لیجئے لوگوں کے ذہن میں اس شورش کے واقعات اور ۵۷ کا ہندسہ
دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں جیسے یہ شورش اس ہندسہ ہی نے کرائی ہو۔ اور اگر علم ریاضی میں
یسی صورت ممکن ہوتی کہ ۵۶ کے بعد ۵۸ آ جاتا تو شورش عظیم کا واقعہ ظہور پذیر ہی نہ ہوتا

پھر ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ ہر شخص چاہے وہ ہجری سن روزمرہ کے کاروبار میں استعمال کرتا ہو چاہے سمبت لیکن اس شورش کے واقعہ کو ہجری و سمبت سے نہیں بلکہ سن عیسوی کے ساتھ منسوب کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم قوم نے ۱۸۵۷ء کے واقعے کو غدر کہا اور اس کا اتنا چرچا کیا جس کی انتہا نہیں بس کیا تھا ہم بھی وہی کہنے لگے جو ہمارے حاکم نے کہا اس نے اس واقعہ کو غدر کہا ہم بھی غدر کہنے لگے بقول شاعر۔

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی می کند نسبت کہ من ہم درگماں افتادہ پندارم گنہگارم

دراصل سنین کا حساب بھی تاریخ میں مختلف دوروں کی تقسیم کی طرح رائج ہوا بالعموم سنین کا تعلق ایسے واقعات سے ہوتا ہے جو حیات عمرانی کے لئے اہمیت رکھتے ہوں مثلاً اسلام سے قبل اور ابتدائی اسلامی عہد میں حضرت عمر کے زمانہ تک عربوں میں عام الفیل رائج تھا۔ عرب قبائل ماضی کا تعین ابرہہ کے حملہ سے کیا کرتے تھے ظاہر ہے یہ واقعہ پوری عرب قوم کیلئے اہمیت رکھتا تھا اور ان کے تخیل پر اس کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے فوراً بدلنا مناسب نہ سمجھا ہجرت کے سترہ سال بعد حضرت عمر نے سن ہجری کو سرکاری طور پر رائج کیا اور دوسری اقوام کے بھی سنین کی یہی نوعیت رہی مثلاً اہل روما اپنا سن ۷۵۳ ق م سے شروع کرتے تھے اسی سال شہر روم کی بنا پڑی تھی۔ اسی طرح مسیحی سن کا آغاز اس وقت سے ہے جب کہ حضرت جبرئیل نے حضرت مریم کو حضرت مسیح کی بشارت دی ۲۵ مارچ کو Lady Day کا تہوار اسی روز کی یادگار ہے شروع شروع میں مسیحی سال ۲۵ مارچ ہی سے شروع ہوتا تھا پوپ گریگری نے تقویم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ماہرین ریاضیات و فلکیات کو جمع کیا تاکہ تمام مسیحی دنیا کے لئے واحد تقویم بنائی جائے۔ چنانچہ ان ماہرین کے مشورہ کے مطابق مسیحی سال کی ابتدا یکم جنوری سے کی گئی اور تمام مسیحی دنیا میں اس کا رواج ہوا۔

یہاں اس بحث کو چھیڑنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ یہ بتلاؤں کہ ادوار اور سنین کو تاریخ میں اہمیت ضرور حاصل ہے اس لئے کہ ان کے بغیر زمانہ کی گرفت ہی ہمارے لئے ناممکن ہے لیکن صرف ان ہی کو تاریخ خیال کرنا غلط ہے۔ تاریخ ان کی پابند نہیں ہے وہ تاریخ کے پابند ہیں۔

مامون کا عہد حکومت

جدید عہد حضارت اور نشر علوم کے ذرائع سے مصر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے، جہاں اس کا دامن تہذیب مغرب سے اثر پذیر ہونے کے باعث داغدار ہے۔ وہاں اس کا یہ پہلو نہایت روشن ہے کہ اس نے ایک مختصر مدت میں علمی و ادبی اعتبار سے نمایاں شہرت حاصل کر لی ہے

جدید مصر کے مطبوعات اپنی تحقیق و تدقیق، کاوش، جستجو اور غور و فکر کے اعتبار سے نہایت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، اگرچہ ان کی تصنیفات میں کبھی کبھی کہیں کہیں مستشرقانہ تحقیق انیق کے نمونے بھی مل جاتے ہیں جو قابل افسوس ہیں۔

پیش نظر صفحات ایک جدید الشیوع کتاب "عصر المامون" سے ترجمہ کئے گئے ہیں اصل کتاب مامون اعظم کی تاریخ پر ہے، اور اس ضمن میں خلافت راشدہ سے لے کر عہد ہارون رشید تک کے تمام علمی و ادبی سیاسی و معاشرتی انقلابات و تغیرات پر تحقیق اور تدبر سے بحث کی گئی ہے پھر اس کے بعد بسط و تفصیل سے مامون کی سیرت، اخلاق و عادات، اطوار و شمائل، جود و سخا، شجاعت و بسالت کے نمونے اور کارنامے پیش کئے ہیں، اور پھر عہد مامون کے سیاسی و معاشرتی حالات اس عہد کے مشاہیر علماء و فن، علمی و ادبی ترقیاں مع اصل حکومت کے تغیرات، غرض ان تمام چیزوں کو فاضل مولف ڈاکٹر احمد فرید رفاعی نے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے، اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اردو داں حضرات اس سے محروم رہیں، اس لئے اس ترجمہ کو پہلی قسط سمجھنا چاہیئے۔ آئندہ دو تین نمبروں میں اور ضروری مباحث بھی انشاء اللہ اردو میں منتقل کر دیئے جائیں گے!

رئیس احمد جعفری (ندوی)

علمی ترقیاں

بیت الحکمۃ کی تاسیس اگرچہ ہارون رشید کے عہد حکومت ہو گئی تھی، اور خاندان برامکہ کے اہل علم اور قدر شناس علم افراد نے اس میں یونانی، فارسی، اور ہندی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا لیکن مامون کے عہد حکومت میں اس بیت الحکمۃ نے عروج وارتقا کے تمام مراحل طے کرلئے سہل بن ہارون اس بیت الحکمۃ کا منتظم اعلیٰ تھا۔

یحییٰ بن ابی منصور موصلی محمد بن موسیٰ خوارزمی اور بہت سے ارباب علم وکمال مامون کے عہد حکومت میں اس کے "دارالحکمۃ" اور "بیت الحکمۃ" میں مصروف کار تھے جن کی فن نجوم میں مہارت ارصاد میں دا قفیت ان کے نقشے، اور ان کی زیجیں اب تک مشہور عالم ہیں۔

مامون نے صقلیہ کے مسیحی فرمان روا کو پیام بھیجا کہ وہ، اپنا موروثی کتبخانہ جو ہر طرح کے علم وفن کی کتابوں سے لبریز تھا فوراً دارالخلافت روانہ کردے، یہ پیام پا کر حاکم صقلیہ تذبذب میں پڑ گیا۔ ایک طرف مامون کی سطوت وہیبت اسے لرزہ براندام کر رہی تھی دوسری طرف یہ "خزانہ عامرہ" چھوڑنے پر طبیعت نہیں آمادہ ہوتی تھی، آخر کار اس نے یہ مسئلہ اپنی حکومت کے اعاظم رجال کے سامنے پیش کیا ان میں سے ایک نے کہا کہ علوم فنون کا یہ خزانہ فوراً دارالخلافت روانہ کر دیجئے۔ ایک سال بھی نہیں گذرے گا کہ ان علوم کی برکت آپ دیکھ لیں گے ان علوم کے ساتھ ہی عقاید وخیالات کو تباہ کرنے والے وہ جراثیم بھی جائیں گے جو ایک سال کے اندر ہی اندر اس قوم کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ شیخ کرد علی فرماتے ہیں کہ مامون نے اپنے عہد حکومت کے بعض حکماء کو طلب کیا۔ اور ان کو ایک نقشہ بنانے کا حکم دیا جو اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس نقشہ میں افلاک ونجوم، بر وبحر، زرخیز و ناکارہ زمین، مساکن امم ومدن سب ہی کی پوری پوری تصویر کشی کی گئی ہے اس کو جغرافیہ بطلیموس اور جغرافیہ مارینوس سب پر فضیلت دی جاتی ہے۔

زہری کا بیان ہے کہ عراق کے ستر فلسفی اس امر پر مامور تھے کہ وہ عمال دولت کی مدد کریں، اور جن جن ممالک پر عباسی پرچم لہرا رہا تھا ان کی نشان دہی کریں عرب میں فزاری پہلا شخص تھا جس نے

اسطرلاب استعمال کیا اور جو طب، علوم حیوانات و نباتات اور جڑی بوٹیوں کے فن میں مہارت تامہ کے علاوہ ریاضیات وغیرہ میں بھی بہت بڑے مرتبہ کا مالک ہوا ہے۔

ماموں کے عہد حکومت میں کتابوں کی بہت زیادہ کثرت تھی یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ماموں نے بھی ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا؟ اور ماموں کی اس سرگرمی سے کیا خاص فائدہ پہنچا، ماموں کے عہد حکومت کی علمی حالت کیا تھی؟ مشاہیر رجال اور تصانیف کون کون ہیں؟

مامون کے افادہ کا جہاں تک تعلق ہے عام اس سے کہ وہ کتابیں یونانی سے ترجمہ کی گئی ہوں یا فارسی سے، یا کسی اور زبان سے۔ اس پر ہم اس باب میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں جس میں ماموں کی شخصیت کی تحلیل کی گئی ہے اور جہاں اس کی زندگی پر بہ حیثیت طالب علم کے، ولی عہد کے، خلیفہ کے عالم وسیاسی کے، اور مذہبی شخصیت کے بحث کی گئی ہے۔

رہا عہد ماموں کی علمی زندگی کا خاکہ اس عہد کے رجال و مولفات کی تفصیل سو سطور ذیل میں وہی مواد پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مامون کو کتابیں جمع کرنے کا شوق کیوں ہوا؟ اور خزانۂ روم سے اس نے پورا کتبخانہ جبراً کیوں منگوایا؟ اس کے متعلق ابن ابی اصیبعہ اپنی طبقات میں یحیٰی بن عدی سے روایت کرتے ہیں کہ مامون نے کہا میں نے ایک خواب دیکھا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک آدمی بصد دبدبۂ و سطوت اس مقام پر بیٹھا ہے جہاں میں بیٹھا کرتا تھا، اسے دیکھ کر میرے دل میں اس کی عظمت و ہیبت بیٹھ گئی مجھے بتلایا گیا کہ وہ ارسطاطالیس ہے۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے اس سے کچھ پوچھنا چاہیئے، میں نے اس سے پوچھا حسن کیا ہے؟ اس نے جواب دیا جسے عقل اچھا سمجھے، میں نے پوچھا پھر؟ اس نے جواب دیا جسے شریعت مستحسن سمجھے، میں نے پوچھا پھر؟ اس نے کہا جسے جمہور پسند کریں۔ میں نے سوال کیا پھر؟ اس نے کہا پھر کچھ نہیں۔

روم سے کتب فلسفہ وغیرہ کے منگوانے کا سب سے بڑا سبب یہی خواب تھا جس کے سبب مامون اور شاہ روم میں خط و کتابت ہوئی اور بالآخر مامون اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا، پھر مامون

نے شاہ روم سے ان علوم قدیمہ کی اشاعت اور ترجمہ کی اجازت چاہی جس کی کچھ تامل کے بعد اس نے اجازت دے دی، حجاج بن مطر، ابن بطریق، اور سلم صاحب بیت الحکمۃ کو طلب کیا گیا جنھوں نے اس کنجانہ سے حسب مقصد و ضرورت کتابیں ترجمہ کیں، حسنین ابن اسحاق کو بھی جو ایک نوجوان انشا پرداز تھا مامون نے طلب کیا اور نقل و ترجمہ کا کام اس کے سپرد کر دیا کہ وہ حکماء یونان کی کتابوں کا ترجمہ کرے اور دوسروں کے ترجمہ کی اصلاح کرے یہ ذمہ داری اس نے قبول کر لی،

جو کتاب یونانی سے یا کسی اور زبان سے عربی میں ترجمہ کی جاتی تھی مامون اس کے برابر سونا تلوا کر دیا کرتا تھا۔

قاضی صاعد بن احمد اندلسی کا قول ہے کہ صدر اسلام میں اہل عرب نے علوم و فنون کی طرف توجہ نہیں کی، ان کی دلچسپی کا مرکز ان کی زبان تھی، یا احکام شریعت، ہاں طب اس سے مستثنیٰ ہے وہ البتہ اس زمانہ میں بھی ان کے اندر موجود تھی، اور اس کا ہونا ناگزیر تھا۔ اس لئے کہ اس کا تعلق اہم حوائج زندگی سے تھا تقریباً یہی کیفیت خلافت بنی امیہ میں رہی۔ لیکن جب تخت خلافت خاندان بنو ہاشم میں آیا تو اس خاندان میں سب سے پہلے جس شخص نے اس طرف اپنی توجہ مرکوز کی وہ خلیفہ ابو جعفر منصور تھا، وہ فقہ کے علاوہ علوم فلسفہ و نجوم میں دسترس رکھتا تھا۔ پھر جب سریر خلافت پر مامون اعظم جلوہ آرا ہوا تو اس نے اپنے جد محترم کی دیرینہ تمنا پوری کر دی، وہ جب علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوا۔ تو اس نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس وغیرہ کی کتابوں کے نہایت شستہ اور صحیح زبان میں ترجمے کئے اور جب ترجمے اشاعت پذیر ہوئے تو اس نے لوگوں کو ان کتابوں کے پڑھنے پر مائل کیا،

مامون حکماء کی صحبت بہت پسند کیا کرتا تھا، علماء کے علمی مناظروں سے بھی اسے بہت دلچسپی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اہل علم ہی کی وہ جماعت ہے۔ جس کا شمار برگزیدہ نفوس میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ گروہ تھا جس نے اپنی ساری توجہ علم پر صرف کر دی تھی، اور ان ترغیبات سے بے نیاز تھا جو لوگوں کو چین و ترک کی طرف لی جاتی تھیں۔

بہر حال مامون کے نزدیک فلسفہ و منطق کی یہ اہمیت تھی، جس کا زبردست ثبوت اس کے

عہد کے تراجم اور مولفات ہیں، ایک خیال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مامون قیاس عقل کی طرف زیادہ مائل تھا اور مذہب اعتزال نے اس پر اپنے نقوش قائم کر دیئے تھے آگے چل کر اس موضوع پر ہم مفصل گفتگو کریں گے یہاں یہ تو بہرحال ثابت ہو گیا کہ مامون نے ترجمہ و تالیف کی سرپرستی نہایت شاہانہ انداز سے کی بالخصوص مولفات ارسطو کا ترجمہ اس عہد کا خاص کارنامہ ہے اس قسم کی تالیفات کے تراجم سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علم کلام اور جدید فلسفۂ افلاطونی کی بنیاد پڑ گئی۔

رفتار نقل و ترجمہ:۔

استاد سنتلانہ نے جامعہ مصریہ میں ایک لیکچر "فلسفہ کے مذاہب کی تاریخ" پر دیا تھا جس کے آغاز میں انہوں نے فرمایا تھا کہ عہد آل عباس میں فن ترجمہ کی تاریخ تین ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

پہلا دور ابوجعفر منصور کی خلافت سے شروع ہوتا ہے اور ہارون رشید پر جا کر ختم ہو جاتا ہے جس کی مدت ۱۳۶ھ سے ۱۹۳ھ تک سمجھنی چاہیئے مترجمین کا طبقہ اول یہی ہے جس میں قابل ذکر اسماء یہ ہیں یحیٰ بن بطریق، مترجم مجسطی (عہد منصور میں) اور جورجیس بن جبرئیل طبیب، عبداللہ بن مقفع جس نے ادبی کتابوں کے علاوہ ارسطو کی بعض منطقی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ یوحنا ابن ماسویہ جو ہارون رشید کے زمانہ حکومت میں تھا اور متوکل کے زمانہ تک زندہ رہا اسے طب کی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی سلام الابرش جس کی برامکہ نے خاص طور سے پرورش کی تھی اور سہل المطران۔

دوسرا دور مامون کے عہد ۱۹۸ھ ہجری سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰۰ھ ہجری پر ختم ہو جاتا ہے۔ مترجمین کا یہ طبقہ ثانیہ ہے، اس عہد کی نمایاں شخصیتیں یہ ہیں۔ یوحنا بن بطریق، حجاج بن مطر، قسطا بن لوقا بعلبکی۔ عبدالمسیح بن ناعمہ حمص، حنین بن اسحاق۔ اسحاق بن حنین، ثابت بن قرۃ صابی اور حبیش بن الحسن جسے حبیش ام بن رخت حنین بھی کہتے ہیں اس عہد میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں زیادہ تر بقراط، جالینوس اور ارسطو کی کتابیں تھیں کچھ کتابیں افلاطون کی بھی ترجمہ ہوئیں باقی انہی کتابوں کے حواشی شروح اور تفاسیر ہیں۔

تیسرا دور ۳۰۰ھ سے چوتھی صدی ہجری کے وسط تک رہتا ہے دور ثالث کے مترجمین میں متی بن یونس

ہیں جن کی تاریخ وفات مجہول ہے صرف یہ معلوم ہے کہ سنہ ۲۶۷ہجری سے سنہ ہجری تک یہ بغداد میں تھے پھر سنان بن ثابت بن قرہ یحیٰی بن عدی۔ ابو علی بن زرعہ ہلال بن ہلال حمصی اور عیسیٰ بن سہر بخت ان لوگوں نے زیادہ تر ارسطو کی منطقی اور طبیعی کتابوں کا ترجمہ کیا شروح و حواشی میں اسکندر، فرودسی اور یحیٰی نحوی وغیرہ نے بڑا نام پیدا کیا۔

بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد حکومت کی علمی زندگی کا ایک خاکہ ہم دوسرے ابواب میں پیش کر چکے ہیں اب اس جگہ ہیں مامون اعظم کے عہد حکومت کے مشاہیر علم و فضل کے اسماء پیش کرنے چاہئیں عام اس سے کہ وہ علم الافلاک کے ماہر ہوں یا منطق کے اس لئے ہم نے ابن ندیم کی الفہرست اور طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ اور کتاب اخبار الحکما للقفطی وغیرہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ اب نام سننے کام کی تفصیل کچھ ابھی ہے کچھ آگے آئے گی۔

احمد بن محمد بن کثیر فرغانی۔ ماہر علم نجوم بختیشوع جورجیس جبرئیل بن بختیشوع جبرئیل، حارک حسن بن سہل بن نوبخت۔ ذکریا طیفوری۔ سہل بن شاپور، ابن سہل، سند بن علی، صالح بن بہلہ۔ ہندی عباس بن سعید جوہری، عبد اللہ بن سہل بن نوبخت۔ ابو حفص عمر ابن الفرخان۔ موسیٰ بن شاکر اور ان کے صاحبزادے محمد۔ احمد۔ حسن۔ یہ سب منجم تھے۔ قفطی نے تین اور بیٹوں کا ذکر کیا ہے جو ہندسہ اور علم الحیل میں کمال رکھتے تھے اور موسیٰ بن اسرائیل۔ ماشاء اللہ منجم یہودی میخائیل بن ماسویہ یحیٰی بن ابی منصور یعقوب بن اسحاق اور اس کے یگانۂ روزگار شاگرد حسنویہ۔ نفطویہ سیلویہ۔ حمویہ۔ احمد بن طیب۔ یوحنا بن بطریق۔ یوحنا بن ماسویہ نصرانی ابو قریش المعروف۔ عیسیٰ صیدلانی وغیرہ مثلاً آل ثابت و اسرجویہ و آل الکرنی و ابن دہن ہندی مدیر بیمارستان برامکہ۔ بن ندیم کا قول ہے کہ یہ شخص سنسکرت سے عربی میں کتابوں کے ترجمہ کیا کرتا تھا اور منکہ طبیب ہارون رشید، یہ بھی سنسکرت سے عربی میں تراجم کرتا تھا خیر۔ اب کہاں تک یہ طویل فہرست پیش کی جائے اس فہرست کے علاوہ اور بہت سے قابل ذکر اسماء ہیں جو بشمار ہیں لہذا انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اب ان افاضل میں سے اگر ہم ایک ایک کے فضائل و خصوصیات۔ حالات و سوانح بیان کرتے

لکھیں تو ایک اچھی خاصی معجم ہو جائے اور اگر کچھ نہ لکھیں تو عہد مامونی کا مرقع نا تمام رہتا ہے۔ بعض سہیل تمثیل بربنائے انتخاب کسی اور جگہ جبرئیل بن بختیشوع اور بعض جلیل القدر لوگوں کے کچھ حالات لکھ دینگے

(ج) کتابیں

ذیل میں ہم ان کتابوں کی فہرست پیش کرتے ہیں جو یونانی، فارسی، سنسکرت، قبطی، عبرانی، لاطینی اور نبطی زبان سے اس عہد میں ترجمہ ہوئیں۔ یہاں دلی سپاس کے ساتھ اس کا اعتراف ضروری ہے کہ اس فہرست کے مرتب کرنے میں تراجم الحکما طبقات الحکما ابن ندیم اور التمدن الاسلامی سے بڑی مدد ملی ہے۔

سب سے پہلے ہم یونانی کتب فلسفہ و ادب کا تذکرہ کرتے ہیں

کتب افلاطون:-

۱ کتاب السیاسہ	مترجم حنین بن اسحاق
۲ " المناسبات	" یحییٰ بن عدی
۳ " النوامیس	" حنین و یحییٰ
۴ " طیماوس	" ابن البطریق، تصحیح حنین نے کی
۵ مکتوب افلاطون بنام اقرطن	" یحییٰ بن عدی
۶ کتاب التوحید	" "
۷ " الحس واللذۃ	" "
۸ " اصول الہندسہ	" قسطا بن لوقا۔

کتب ارسطو:-

۱ قاطیغوریاس (اقوال)	مترجم حنین بن اسحاق
۲ کتاب العبارۃ	" حنین نے سریانی میں اور اسحٰق نے عربی میں

ترجمہ کیا۔

۳۔ کتاب البرہان	اسحاق نے سریانی میں اور متی نے عربی میں ترجمہ کیا
۴ کتاب الجدل	مترجم یحیٰ۔
۵ تحلیل القیاس	مترجم تیادورس، اصلاح حنین نے دی
۶ کتاب المغالطات او الحکمۃ الموہمۃ	ابن ناعمہ اور ابوبشر نے سریانی میں اور یحیٰ نے عربی میں ترجمہ کیا۔
۷۔ الخطابۃ	مترجم اسحاق و ابراہیم بن عبد اللہ
۸ کتاب الشعر	ابوبشر نے سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا
۹ " السماع الطبیعی	مترجم ابوروح صابی و حنین و یحیٰ و قسطا و ابن ناعمہ
۱۰ " السماء والعالم	مترجم ابن بطریق، حنین نے اصلاح دی
۱۱ " الکون والفساد	اسحاق اور دمشقی نے عربی میں ترجمہ کیا۔
۱۲ " الآثار العلویہ	ابوبشر و یحیٰ
۱۳ " النفس	مترجم اسحاق
۱۴ " الحس والمحسوس	مترجم ابوبشر متی بن یونس
۱۵ " الحیوان	مترجم ابن البطریق
۱۶ " الحروف او الالہیات	مترجم اسحاق و یحیٰ، حنین و متی
۱۷ " الاخلاق	مترجم اسحاق
۱۸ " المرآۃ	مترجم حجاج بن مطر
۱۹ " اثولوجیا	"

کتب ارسطو کی متعدد شرحیں اور تعلیقیں بھی لکھی گئیں، اور یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔

اس سلسلہ میں قابل ذکر کنادفرطس، دیدوخس برقلس ۔ اسکندر۔ افرودیسی فرفوریوس ۔ امونیوس ۔ تامسطیوش نیقولاوش ۔ فلوطرخس اور یحیٰ نحوی ہیں۔

ان میں سے بعض کے شروح و تعلیقات کے علاوہ مولفات بھی ہیں۔ جو تمامتر فلسفہ اور اس کے متعلقات پر ہیں۔ بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن کا عربی میں ترجمہ تو ہوا ہے لیکن ان کے مترجم لا معلوم ہیں ابن ندیم نے الفہرست میں ان کا تذکرہ کیا ہے لیکن ہم چھوڑتے ہیں

جالینوس کی طبی کتابوں کے علاوہ فلسفہ اور ادب کی بعض کتابیں بھی ذکر کی جاتی ہیں مثلاً کتاب "ما یعتقدہ رایا" جس کا ترجمہ ثابت نے کیا ہے اور "تعریف المرء عیوب نفسہ" جس کا ترجمہ توما نے کیا ہے۔ اور تصحیح حنین نے اور کتاب الاخلاق جس کے حبیش مترجم ہیں اور کتاب "انتفاع الاخیار باعدائھم" ترجمہ حبیش نے کیا اور "المحرک الاول لا متحرک" جس کا حبیش و عیسیٰ نے ترجمہ کیا ہے اس کے علاوہ اور بھی کتابیں ملتی ہیں

کتب طب

بقراط کی کتابیں:-

۱. کتاب عہد بقراط	مترجم حبیش و عیسیٰ
۲. کتاب الفصول	مترجم حنین
۳ " الکسر	"
۴ " تقدمۃ المعرفۃ	مترجم حنین و عیسیٰ بن یحییٰ۔
۵. " الامراض الحادہ	مترجم عیسیٰ بن یحییٰ
۶. " ابیذیمیا	"
۷ " الاخلاط	"
۸ " قاطیطون	" حنین
۹ " الماء والھوا	" حنین و حبیش

۱۰ کتاب طبیعۃ الانسان ● مترجم حنین و عیسیٰ

کتب جالینوس :-

جالینوس کی مشہور ترین کتابیں یہ ہیں۔ (۱) کتاب الفرق (۲) الصناعۃ (۳) کتاب النبض (۴) شفاء الامراض (۵) المقالات الخمس (۶) الاسطقصات (۷) کتاب المزاج (۸) القوی الطبیعۃ (۹) العلل والامراض (۱۰) تعرف علل الاعضاء الباطنۃ (۱۱) کتاب النبض الکبیر (۱۲) کتاب الحایات (۱۳) البحران (۱۴) ایام البحران (۱۵) تدبیر الاصحا (۱۶) حیلۃ البرء، ان تمام کتابوں کا ترجمہ حنین بن اسحاق نے عربی میں کر ڈالا ہے۔ کتاب العلل الباطنۃ، النبض الکبیر۔ تدبیر الاصحاء اور حیلۃ البرء کا ترجمہ حنین نے نہیں کیا تو ان کتابوں کو حبیش نے عربی میں منتقل کر ڈالا۔ رہیں باقی کتابیں تو ان کے اور ان کے مترجمین کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱. التشریح الکبیر	مترجم حبیش الاعسم
۲. اختلاف التشریح	" "
۳ تشریح الحیوان الحی	" "
۴ " " المیت	" "
۵ علم البقراط بالتشریح	" "
۶. الحاجۃ الی النبض	" "
۷. علوم ارسطو	" "
۸. تشریح الرحم	" "
۹ آراء بقراط و افلاطون	" "
۱۰. العادات	" "
۱۱. خصب البدن	" "
۱۲. المنی	" "
۱۳. منافع الاعضاء	" "

۱۴ ترکیب الادویہ	مترجم حبیش الاعسم
۱۵۔ الریاضتہ بالکرۃ الصغیرہ	" "
۱۶۔ " " الکبیرۃ	" "
۱۷ الحث علی تعلیم الطب	" "
۱۸ قوی النفس ومزاج البدن	" "
۱۹۔ حرکات الصدر	مترجم اصطفان۔ مصحح حنین
۲۰ علل النفس	" " "
۲۱ حرکتہ العضل	" " "
۲۲ الحاجتہ الی النفس	" " "
۲۳ الامتلاء	" " "
۲۴ المرۃ والسودا	" " "
۲۵ علل الصوت	حنین
۲۶۔ الحرکات المجہولہ	"
۲۷۔ افضل الہیات	"
۲۸۔ سوء المزاج المختلف	"
۲۹ الادویۃ المفردہ	"
۳۰ المولود لسبعتہ اشہر	"
۳۱۔ ردار النفس	"
۳۲ الذبول	"
۳۳ قوی الاغذیہ	مترجم حنین
۳۴ التدبیر الملطف	" "

۳۵۔ مداواۃ الامراض	مترجم حنین
۳۶۔ البحران فی الامراض الحادۃ	" "
۳۷۔ الی تراسو بولوس	" "
۳۸۔ الطبیب والفیلسوف	" "
۳۹۔ کتب البقراط الصحیحہ	" "
۴۰۔ محنۃ الطبیب	" "
۴۱۔ افلاطون فی طیماوس	مترجم حنین و اسحاق
۴۲۔ تقدمۃ المعرفۃ	" عیسیٰ
۴۳۔ الفضلاء	" " و اصطفان
۴۴۔ صفات الصبی یصرع	" ابن الصلت
۴۵۔ الاورام	" "
۴۶۔ الکیموس	مترجم ثابت و حبیش
۴۷۔ الادویۃ والادوار	مترجم عیسیٰ
۴۸۔ الترياق	مترجم ابن البطریق ۔

اس کے علاوہ اور بھی کتب طب اور ان کے متعلقات ہیں جن کا صاحب "الفہرست" نے ذکر کیا ہے لیکن مترجمین کے نام نہیں دئے ہیں لا یستوریدس جسے جہانیان جہاں گشت کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نے محض گھاس پات، اور جڑی بوٹی کے خواص معلوم کرنے کے لئے ساری دنیا چھان ڈالی، اس کی بھی ایک کتاب ہے جس کی تاریخ آگے آئے گی

۳۔ کتب ریاضیات، نجوم و دیگر علوم

اس جگہ ایک سرسری نظر ہمیں علم نجوم، ہندسہ، حساب، موسیقی اور میکانیات پر ڈال لینی چاہیئے

کتب اقلیدس جس میں اصول ہندسہ بھی شامل ہے حجاج بن مطر نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور اسحاق بن حنین نے بھی اسے عربی میں منتقل کیا ہے، ثابت بن قرہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور یہ کتاب اب تک موجود ہے

اقلیدس کی جن کتابوں کے مترجمین گمنام ہیں وہ یہ ہیں کتاب الظاہروت. کتاب اختلاف المناظر. کتاب موسیقی کتاب القسمۃ. کتاب القانون. اور کتاب الثقل والخفۃ.

۲. کتب ارخمیدس جو کل دس کتابیں ہیں لیکن مترجمین کے نام نامعلوم ہیں.

۳. ابلونیوس صاحب کتاب المخروطات. وکتاب قطع السطوح. وقطع الخطوط. والنسبۃ المحدود والدائر المماسۃ. ان کتابوں کے مترجمین کے نام نامی بھی نہ معلوم ہو سکے.

۴. منالاوس، صاحب کتاب "الاشکال الکرویہ" واصول الہندسہ، اس کتاب کا ترجمہ ثابت بن قرہ نے عربی میں کیا ہے.

۵. بطلیموس القلوذی جس کی "مجسطی" مشہور عالم ہے. جس کے متعلق گذشتہ ابواب میں کہیں گفتگو ہو چکی ہے اس کی دوسری کتاب کتاب الاربعہ" کا ترجمہ ابراہیم بن الصلت نے کیا ہے. تصحیح حنین نے کی ہے. اور کتاب "جغرافیہ المعمور وصفت الارض" کا ترجمہ ثابت نے کیا ہے. جو بہت خوب ہے بطلیموس کی بندرہ اور کتابیں مشہور ہیں جن کے مترجمین نامعلوم ہیں.

۶. ابرخس. صاحب کتاب "صناعۃ الجبر ولیعرف بالحدود" اور کتاب قسمۃ الاعداد" ان دونوں کے مترجمین بھی گمنام ہیں.

۷. ذیوفنطس، صاحب کتاب. صناعۃ الجبر. مترجم نامعلوم

ریاضیات ہیئت اور زیچ میں اور دوسری بہت سی کتابوں کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے لیکن ان کے مترجمین کا نام اسے بھی نہ معلوم ہو سکا مثلاً ابیون البطریق کی کتاب" العمل بالاسطرلاب المسطح" اس کے علاوہ ارسطرخس کی کتاب" جرم الشمس والقمر" اور کتاب العمل بذات الحلق اور زیچ بطلیموس کی جدولیں جسے "القانون المسیر" بھی کہتے ہیں اور العمل بالاسطرلاب. ان سب کتابوں کا ترجمہ تاون اسکندری نے

عربی میں کیا ہے۔

علاوہ ازیں یونانی سے فن موسیقی میں بہت سی کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں مثلاً نیقوماخس کی کتاب "الموسیقی الکبیر" اقلیدس کی "موسیقی المنسوب" فیثاغورس کی "مقالات فی الموسیقی" وغیرہ اور کتاب الرسوس۔ ارسطکاس کی "کتاب الایقاع" اور کتاب الآلات المصوتہ المساۃ بالارغن البوقی اور الارغن الزمری وغیرہ۔

ارخمیدس کے علاوہ اور بھی میکانکی کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے مثلاً "الحیل الروحانیہ" رفع الاثقال وغیرہ وغیرہ۔

فارسی کتابیں۔

عہد عباسیہ میں فارسی سے عربی میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں زیادہ آداب واخبار۔ سیر و اشعار اور کچھ نجوم وغیرہ سے متعلق ہیں ان کتابوں کو آل نوبخت اور علی بن زیاد تمیمی وغیرہ نے عربی میں منتقل کیا ہے ان کی کتابیں یہ ہیں۔

۱۔ کتاب رستم واسفندیار	مترجم جبلہ بن سالم
۲ بہرام شوس	" "
۳ خدا نیامہ فی السیر	مترجم عبداللہ بن مقفع
۴ کتاب آئین نامہ	" "
۵ " کلیلہ دمنہ	" "
۶ " مزدک	" "
۷ " التاج فی سیرۃ انوشیرواں	" "
۸ " الادب الکبیر	" "
۹ " " الصغیر	" "
۱۰ " الیتیمہ	

۱۱ کتاب ہزار افسانہ — مترجم نامعلوم
۱۲ " شہرزاد مع ابرویز — " "
۱۳ " الکارنامع انوشرواں — " "
۱۴ " الدار والصنم الذہب — " "
۱۵ " بہرام وترسی — " "
۱۶ " الدب والثعلب — " "
۱۷ " ہزار داستان — " "
۱۸ سیر ملوک الفرس، متعدد حصوں میں ہے۔ ایک کا ترجمہ محمد بن جہم نے کیا۔ دوسرے کا زادویہ بن شاھویہ نے کیا اور تیسرے کا محمد بن بہرام بن مطیار اصفہانی نے۔

ہمیں فردوسی کے شاہنامہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئیے جو ۳۸۴ھ ہجری میں محمود غزنوی کے لئے لکھا گیا تھا اور ۶۰،۰۰۰ ہزار بیت پر مشتمل ہے جس میں فارس کی قدیم تاریخ پر بھی نظر ڈالی گئی تھی اس کتاب کا ترجمہ فتح بن علی بنداری نے نثر میں شاہ عیسیٰ ایوبی کے لئے کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۶۲۰ھ ہجری میں مکمل ہوا تھا۔ عربوں نے فارسی سے دوسری بہت سی تاریخی و ادبی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا بالخصوص مذاہب قدیم سے متعلق تو متعدد کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔

سنسکرت:۔

اہل عرب نے سنسکرت سے بے شمار کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا بالخصوص طب۔ نجوم۔ ریاضی۔ قصص حساب اور تاریخ میں تو بہت سی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔ افسوس کہ ان میں سے اکثر سے ہم اس وقت تہی دامن ہیں۔

بات یہ ہے کہ بغداد عہد عباسیہ میں منزل کمال کو پہونچ گیا تھا۔ وہ علماء۔ اطبا۔ تجار۔ اور سیاحوں کا مرکز تھا جہاں ہر ملک و قوم کے لوگ آتے تھے۔ برامکہ کو ہندوستان کے ویدوں سے خاص مناسبت تھی، چنانچہ منکہ، بازی گری۔ قلیرفل اور سندباز وغیرہ وغیرہ خاص طور سے ہندوستان سے بغداد میں بلوائے گئے

تھے۔

عہد عباسی کے اختتام کے بعد بھی جب مسلمانوں نے ادب، طب، صیدلۃ یا سیر میں کتابیں لکھیں تو ان میں ہندی کتابوں پر اکثر و بیشتر اعتماد کیا ہے۔ مثلاً اگر آپ ابن سینا کے قانون کا مطالعہ کریں یا کسی اور طب کی بڑی کتاب کو دیکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب وہ بعض امراض کا تذکرہ کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہندوستانی وید ایسے یہ کہتے ہیں یا اس مرض کا علاج اس طرح کرتے ہیں عقد الفرید اور دوسری ادبی کتابوں میں بھی ان کے مولف ہندوستان کے آداب و اخلاق کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں مثلاً کتاب الہند میں فلاں بات کے متعلق ایسا ایسا ہے۔

کتب طب

صاحب طبقات الاطبا نے عہد عباسی کے مشہور اطبا و علمار ہند کا تذکرہ کیا ہے، جو طب، نجوم اور فلسفہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ مثلاً کنکہ ہندی جو نہایت بلند حیثیت پر فائز تھا، طب کے علاوہ اسے علم نجوم میں بھی پوری دسترس حاصل تھی۔ اس کے بہت سے مولفات تھے جن میں سے کتاب النموزفی الاعمار کتاب اسرار الاوالید۔ کتاب القرانات۔ الکبیر والصغیر وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں کنک کے علاوہ صنجل اور بالکھر وغیرہ بھی بہت بلند حیثیت علمار ہند میں رکھتے تھے۔۔

ان میں سے اکثر کی کتابیں جو نجوم و طب پر مشتمل تھیں عربی میں منتقل ہوئیں۔ نقل و ترجمہ کی دو صورتیں تھیں ۱۔ براہ راست ۲۔ بالواسطہ۔ دوسری صورت یہ تھی کہ کتاب سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئی پھر فارسی سے عربی میں۔ جیسے کتاب سیرک اسے فارسی سے عربی میں عبداللہ بن علی نے ترجمہ کیا دوسری کتاب علاجات الادوار و معرفۃ علاجہا تھی جسے یحیٰ بن خالد برمکی نے ترجمہ کرایا اس کے علاوہ اور متعدد کتب طب د "فروع الطب" عربی میں منتقل ہوئیں۔

منکہ ہندی کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اب اس کی شان نزول بھی سن لیجئے۔ یحیٰ ابن خالد برمکی کے اشارہ پر یہ حکیم ہارون رشید کے معالجہ کے لئے آیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہارون صحت یاب ہو گیا پھر اس نے

منکہ کو موسلین دولت میں داخل کرلیا۔ منکہ فارسی خوب جانتا تھا وہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتا تھا پھر وہ عربی میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ صاحب طبقات الاطبا نے اس کا بہت مفصل تذکرہ اپنی "طبقات" میں کیا ہے۔

اس عہد میں صالح بن بہلہ ہندی بھی ایک امتیاز خاص کا مالک تھا۔ یہ ہارون رشید کے عہد حکومت میں عراق آیا اور آتے ہی مشہور ہوگیا۔ ہندوستان کے دوسرے مشہور حکما رواطبا میں ایک شاناق بھی ہے اس کی کتاب کا سنسکرت سے فارسی میں منکہ ہندی نے ترجمہ کیا پھر یحیٰی بن خالد کے حکم سے ابو حاتم بلخی نے عربی میں ترجمہ کیا۔ پھر مامون کے لئے دوبارہ اس کا ترجمہ عباس بن سعید جوہری نے کیا

دوسرا مشہور حکیم جودر تھا اس کی بھی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

وہ طبی کتابیں جو سنسکرت سے عربی میں عہد بنو عباس میں ترجمہ ہوئیں۔ ان کا تذکرہ ہو چکا ہے لیکن کتب ذیل ان کے علاوہ ہیں

۱. اسمار عقاقیر الہند	منکہ ہندی نے ترجمہ کیا
۲ کتاب سسرو فی الطب	" "
۳. استانکر الجامع	ابن دھن نے ترجمہ کیا۔
۴ صفوۃ النجح	" "
۵. کتاب مختصر الہند فی العقاقیر	مترجم نامعلوم
۶ علاجات الحبالی للھند	" "
۷. کتاب روسا الھندیہ فی علاجات النساء	" "
۸. السکر للھند	" "
۹. التوہم فی الامراض والعلل	" "
۱۰. کتاب رای الہند فی اجناس الحیات وسمومہا	" "

کتب نجوم و ریاضی

فن ریاضیات و کواکب میں ہندوستان کا بہت بڑا درجہ تھا ہم کہیں سند ہند کا ذکر کر چکے ہیں اہل عرب کی نظر میں اس کی زیچ فن نجوم میں بڑی اہمیت رکھتی تھی چنانچہ انھوں نے اس کی پیروی کی اور اسی نہج پر کتابیں تالیف کیں، اس کے مسلک پر جن لوگوں نے تالیف کی ان میں محمد بن ابراہیم فزاری حبش بن عبداللہ بغدادی اور محمد بن موسیٰ خوارزمی وغیرہ خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے فزاری عربوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے اسطرلاب استعمال کیا، مسلمانوں میں ہر اس فلکی نے جس نے علم نجوم میں کچھ بھی توسیع کرنی چاہی اس کے لئے ان ہندی علماء کی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا۔ خواہ اصل سنسکرت میں ہوں یا پھر عربی کے تراجم۔ اکثر مسلمانوں نے آداب ہند کی تحصیل و تکمیل میں اپنا بڑا وقت صرف کیا جن میں ابو ریحان۔ البیرونی تو مشہور روزگار ہیں۔ انھوں نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔ سارے ہندوستان کو چھان ڈالا۔ ہندیوں کے آداب و علوم پر دسترس حاصل کی پھر اپنی مشہور کتاب "الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ" تالیف کی، علوم ہند پر ان کی اور متعدد بلند مرتبہ تصانیف ہیں خواہ وہ ترجمہ ہوں یا تصحیح یا تنقید۔

اس باب میں ان کی جو کتابیں ہیں ان کے متعلق وہ فرماتے ہیں۔ میں نے ایک کتاب "جوامع الموجود لخواطر الہنود، علم نجوم میں لکھی جو ۵۵۰ اوراق پر محیط تھی ارکند کی زیچ کی میں نے ترتیب و تہذیب کی۔ اور اس کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا۔ اس لئے کہ جو ترجمہ موجود تھا وہ ناقص تھا۔ پھر میں نے مدارین متحدین اور متساوین پر ایک کتاب لکھی اس لئے کہ یہ خیال آتا جاری تھا کہ کوئی زیچ اس سے خالی ہی نہیں تھی۔ میں نے ایک کتاب حساب میں بھی لکھی جس میں ہندوستان کے اہل علم کے طریقۂ تعلیم در بارہ حساب کی کیفیت مندرج تھی میں نے اس پر بھی لکھا کہ مراتب عدد میں اہل عرب کی رائے اہل ہند سے زیادہ قرین صواب تھی، اس کے علاوہ اور متعدد کتابیں لکھیں۔

بیان بالا سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کے حکما نجوم وغیرہ میں اہل علم عرب کے

تھے۔ اور مسلمانوں نے ان سے بہت کافی استفادہ کیا۔

ادبی کتابیں

ادبی کتابوں میں سے جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں ادب۔ تاریخ۔ منطق۔ قصص اور دل بہلاوے کی کتابیں ہیں مثلاً کلیلہ دمنہ۔ یہ فارسی سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ زبان بن عبدالحمید ابن لاحق اور علی بن داؤد نے اس کو نظم کا جامہ بھی پہنایا۔ ۲۔ سندباد کبیر ۳ سندباد صغیر ۴ کتاب البد ۵۔ کتاب یوذاسف۔ ۶۔ یوذاسف مفرد (۷) ادب الہند والصین (۸) کتاب اہل فی الحکمۃ (۹) کتاب الہندی فی قصۃ ہبوط آدم۔ (۱۰) کتاب طرق۔ (۱۱) کتاب ذبک الہندی فی الرجل والمرآۃ (۱۲) کتاب حدود منطق الہند (۱۳) کتاب سادیرم (۱۴) کتاب ملک الہند القتال والسباح (۱۵) کتاب بید بانی الحکمۃ۔ موسیقی میں بھی ایک کتاب ترجمہ ہوئی جس کا سنسکرت میں نام تھا "بیافر" جس کے معنی ہوئے حکمت کے پھل" اس کتاب میں راگ اور سر کے اصول بتائے گئے تھے۔

نبطی کتابیں

یونانی سے عربی میں جن فلسفہ اور طب کی کتابوں کا ترجمہ ہوا انھیں آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اب ہم ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو کلدانی یا نبطی زبان سے براہ راست عربی میں ترجمہ ہوئیں اہم کتابیں یہ ہیں۔ کتاب الفلاحۃ النبطیۃ اپنے موضوع پر یہ کتاب فرد فرید ہے احمد بن علی بن مختار نے عربی میں ترجمہ کیا اس کتاب کا فرنگی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اگر عربی میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوتا تو یہ ضائع ہو جاتی اور اس کے ضیاع سے دنیا کو بڑا نقصان پہونچتا جیسا کہ اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے مولف کتاب کہتا ہے۔

میں نے یہ کتاب کسدانی۔ دکسدان۔ کلدان۔ نبط۔ سب کے معنی ایک ہی ہیں) میں پائی جس کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ کتاب فلاحۃ الارض واصلاح الزرع والشجر والثمار و دفع الآفات عنہا تکسدانی

لوگ اس کی بڑی حفاظت کرتے تھے کہ کہیں کسی کو اس کتاب کا علم نہ ہوجائے اس کے چھپانے میں وہ اپنی پوری کوشش صرف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے مجھے اس زبان سے واقفیت ہوگئی۔ اس طریقہ سے میں کتاب پر دسترس حاصل کرسکا۔ یہ کتاب ایک فاضل شخص کے پاس تھی مجھ سے اس نے چھپایا جب مجھے علم ہوا تو میں نے کہا۔ اگر تم نے اس علم کو چشم مردم سے پنہاں رکھا تو پھر لوگ کاہے کو بھی تمہارا ذکر کریں گے اگر کوئی ایسی ہی کتاب کی حفاظت کرے تو وہ کتاب کاہے کو ہوئی، پتھر ہوئی بس اس نے تصدیق کی اور مجھے اپنی کتابوں تک پہونچا دیا بس میں نے ایک کے بعد ایک کا ترجمہ شروع کردیا سب سے پہلے جس کتاب کا میں نے ترجمہ کیا وہ دوانائی ابابلی کی کتاب تھی جس کا موضوع "معرفتہ اسرار افلاک والاحکام علی حوادث النجوم" تھا۔ وہ کتاب بھی بڑے مرتبہ کی ہے اس کے بعد میں نے اس کتاب "الفلاحتہ" کا ترجمہ کیا۔"

(۲) کتاب طرد الشیاطین (۳) کتاب السحر الکبیر (۴) کتاب السحر الصغیر (۵) کتاب دوا علی مذہب النبط۔ (۶) کتاب مذاہب الکلدانیین فی الصنام (۷) کتاب الاشارۃ فی السحر (۸) کتاب اسرار الکواکب (۹) کتاب الفلاحتہ الصغیر (۱۰) کتاب فی الطلسمات (۱۱) کتاب الحیاۃ والموت فی علاج الامراض (۱۲) کتاب الاصنام (۱۳) کتاب القربین۔ (۱۴) کتاب الطبیعتہ (۱۵) کتاب الاسمار ان میں سے اکثر کتابیں ابن وحشیہ (صاحب کتاب الفلاحتہ) نے ترجمہ کی ہیں۔

عبرانی، لاطینی اور قبطی کتابیں

یہود کے علوم وآداب بہت کثرت سے عربی میں ترجمہ ہوئے اب ان میں سے اکثر چیزیں ضائع ہوچکی ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ مواد تو مل ہی جاتا ہے۔ عبرانی زبان سے توراۃ کے اسفار کو سعید فیومی المتوفی ۳۳۰ھ نے ترجمہ کیا عربی میں توراۃ کا سب سے قدیم ترجمہ وہی ہے۔

لاطینی سے بھی عربی میں کافی کتابیں ترجمہ ہوئیں اس لئے کہ لاطینی میں بھی بہت سے علوم از قبیل فلسفہ و تاریخ و شریعت وغیرہ موجود تھے افسوس ہے کہ تاریخ کے اس صفحہ کو بھی حوادث دہر نے

دھندلا کردیا ہے۔ اکثر آثار محو ہو چکے ہیں۔ مترجمین کے ضمن میں ہمیں یحیٰ بن بطریق کا نام نظر آتا ہے۔ یہ غیر زبانوں میں لاطینی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے انھوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے ظاہر ہے کہ وہ ترجمہ لاطینی ہی سے ہوگا۔

قبطی زبان سے براہ راست عربی میں شاید ہی کوئی ترجمہ ہوا ہو اکثر ترجمے یونانی زبان کے واسطے سے ہوئے ہیں۔ خصوصاً قدیم کیمیائی صنعت اور اس قسم کی دوسری چیزوں میں مصریوں کو کمال حاصل تھا ان سے یونانیوں نے لیا اور پھر یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ کیمیا کا ترجمہ قبطی اور یونانی سے ساتھ ساتھ خالد بن یزید کے حکم سے ہوا تھا۔

عہد ماموں کی رفتار ترقی :-

یہ تھیں اس زمانہ کی کتابیں جن کا تذکرہ ہوا۔ ان مترجم علوم وفنون نے سب سے پہلے عقل و دماغ پر اثر کیا۔ پھر عربی حضارت وتمدن پر اپنے نقوش قائم کئے ہم دیکھتے ہیں کہ ماموں کے زمانہ میں علمی رفتار اتنی سریع ہوئی کہ اس نے ضرب المثل کی صورت اختیار کرلی یہاں تک کہ نولڈکے اور انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے مدیر وغیرہ بھی ماموں کو نوشیرواں سے تشبیہہ دیتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ ماموں اور عہد ماموں دونوں کا زمانہ "قبل از وقت" رہا۔ اگر ان کا دور یہ ہوتا جو اب ہے تو وہ یورپ کی ترقیوں سے بھی بازی لے جاتے۔ ڈاکٹر طوطح۔ ایک انگریزی رسالہ میں لکھتے ہیں۔ جب کہ شارلمان اپنے اتراب کے ساتھ مدرسہ میں پڑھنا سیکھ رہا تھا ماموں فلسفہ کا ماہر ہو چکا تھا۔ اپنے مضمون میں ایک دوسرے مقام پر ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں۔ ماموں نے اپنے بیت الحکمتہ کو زیادہ قیمتی بنالیا تھا جب کہ یونان کے علوم وفنون ترجمہ کرائے۔

عہد ماموں کی غیر معمولی ترقیوں پر بہت سے قابل ذکر اقوال موجود ہیں جن میں سے ہم سر ولیم میور کی رائے ایک مقام پر پیش کر چکے ہیں جو کافی ہے۔ فن تاریخ وجغرافیہ میں اس زمانہ میں کوئی ممتاز ترقی نہیں ہوئی۔

اب ہم خلق قرآن کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں کہ یہ اس زمانہ کی ذہنی و دماغی علمی وعقلی فضار

پر بہت اثر انداز ہوا

مسئلہ خلق قرآن :-

ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں روایت کی ہے کہ جعد بن درہم نے ہشام کے زمانے میں خلق قرآن کی تحریک کی۔ وہ گرفتار کر کے خالد قسری کے پاس بھیج دیا گیا جو عراق کا گورنر تھا۔ ہشام نے جعد کے قتل کا حکم دیا۔ خالد نے اسے قید کر دیا۔ قتل نہیں کیا۔ ہشام کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے خالد کو ملامت کی اور پھر قتل کی تاکید کی۔ خالد نے اسے قید خانہ سے نکالا جب بقر عید کی نماز پڑھ چکا تو اس نے اپنے خطبہ میں کہا۔ "لوگو! اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اور قربانی کرو۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آج جعد بن درہم کی قربانی کروں اس لئے کہ وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے گفتگو نہیں کی اور نہ ابراہیم خلیل اللہ کو اپنا دوست بنایا۔ توبہ۔ توبہ۔ جعد کتنی بڑی بات کہتا ہے پھر وہ منبر سے اترا، اور جعد کو ذبح کر دیا۔

ابن اثیر کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق قرآن کی بدعت کا آغاز عہد اموی میں ہوا۔ چونکہ فضا موافق نہیں ملی اس لئے نشوونما نہ پا سکی۔ یہاں تک کہ مامون کا زمانہ آیا، اب ایک ایسی شخصیت مل گئی جو صاحب نفوذ و اقتدار تھی جس کی طبیعت سختگیر تھی اس موافق فضا میں یہ تحریک خوب پھلی پھولی۔

یہاں دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا مامون حقیقتاً حامی تھا یا یہ اس کے طبعی غلو کا نتیجہ تھا جس نے اسے راہ اعتدال سے ہٹا دیا تھا؛ قبل اس کے کہ ہم ان سوالات کا جواب دیں اور اس مسئلہ پر مختلف حیثیات سے نظر ڈالیں۔ ہم سر ولیم میور کی رائے نقل کر دینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا۔ اُن کا نقطۂ نظر جدا ہے۔ پھر بھی ہم ان کی رائے اس لئے پیش کرتے ہیں کہ ایک بڑے مستشرق کی رائے بھی سامنے رہے۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جہاں مامون کا ذکر کیا ہے۔ کہا ہے "واقعہ یہ ہے کہ مامون کو فارس سے ایک قسم کا تعصب تھا اس لئے کہ اس کی ماں کا مسقط راس وہی تھا

علویوں کی طرف بھی وہ بہت مائل تھا۔ آخری چند سالوں میں اس کے اشارہ ہی سے تعصب اور آزادی فکر میں ایک اچھا خاصا تصادم ہوگیا۔ اس لئے کہ بعض مسائل میں وہ پورا آزاد خیال واقع ہوا تھا اس نے عیسائیوں کو اس کی اجازت دیدی کہ وہ بے دھڑک مناظرہ کریں کہ کون دین افضل ہے اسلام یا مسیحیت؟ فارسیت کی طرف اس کا میلان ہمیشہ اس پر اثر انداز ہوتا رہتا تھا، مامون نے اپنے عہد کے تمام علماء کو اپنے سامنے ان مسائل پر مناظرہ کی دعوت دی جن پر اس سے پہلے گفتگو بھی ممنوع تھی، مثلاً انسان کا اپنے خالق سے کس قسم کا رشتہ ہے؟ وغیرہ۔ آخر میں ان خیالات کی طرف مائل ہوگیا تھا جو مذہب صحیح کے مخالف تھے مثلاً جبر و اختیار میں اس نے اختیار کا پہلو اختیار کیا تھا۔ قرآن کے متعلق کہتا تھا کہ اگرچہ وہ وحی ہے لیکن ہے مخلوق یہ مسلک ان لوگوں کے خلاف تھا جو قرآن کو ازلی اور غیر مخلوق مانتے تھے[1] مامون نے یہ اعلان بھی کردیا تھا کہ حضرت علی، رسول اللہ کے بعد سب سے زیادہ اشرف ہیں قرآن مجید کی تفسیر بھی وہ اپنی طرف سے کیا کرتا تھا اس حریت فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے شراب کی اباحت اور متعہ کے جواز کا فتویٰ دے دیا[2]۔

---

[1] شیخ عبدالوہاب نجار نے اس مسئلہ کے متعلق فرمایا ہے کہ جس طرح اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے حقیقتاً صورت مسئلہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ خلق قرآن کا قول ایک بالکل نئی چیز تھی رسول اللہ صحابہؓ تابعینؒ نہ کسی کے ہاں بھی اس مسئلہ پر کوئی قول نہیں ملتا ہے، نہ حمایت میں، نہ مخالفت میں۔ جب مامون کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہوئی تو اس نے علماء اثر سے دریافت کیا۔ انھوں نے پہلے کلام اللہ کو دیکھا اس میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملا پھر سنت رسول اللہ کو دیکھا اس میں بھی کچھ نہیں ملا۔ علماء ظاہر ہے کتاب و سنت کے سوا کس چیز کی طرف رجوع کرسکتے تھے؟ جب انھوں نے ان دونوں میں کچھ نہ پایا۔ تو ان کی دیانت مذہبی کا تقاضہ یہی تھا کہ خاموش رہیں مامون کو یہ خاموشی پسند نہ آئی اس نے حمایت پر علماء کو مجبور کیا۔ جو نہیں مجبور ہوئے انھیں قید و بند کے مصائب جھیلنے پڑے

[2] قاضی احمد بن داؤد کی نصیحت کے بعد مامون نے اپنے قول سے رجوع کرلیا تھا۔

آخری چند سالوں میں مامون اپنے اس مسلک پر بہت سخت ہوگیا تھا چنانچہ اس نے والی بغداد کو لکھا کیونکہ خود جملہ روم میں شریک تھا کہ تمام علماء وفقہا کو مجتمع کیا جائے اور اس مسئلہ میں ان سے جوابات طلب کئے جائیں اکثر علماء متاثر ہوگئے اور انھوں نے خلق قرآن کا مسئلہ قبول کر لیا۔ بعض حق آگاہ ہستیاں اپنے مسلک پر قائم ہیں اور قرآن کے غیر مخلوق ہونے کا اعلان کرتی رہیں مثلاً امام احمد بن حنبل، جو پابہ زنجیر خلیفہ کے لشکر میں لائے گئے۔ کئی مخالفین کو قتل کی دھمکی دی گئی۔ ان میں سے بیس آدمی پولیس کی حفاظت میں طرطوس بھیجے گئے کہ جب خلیفہ جنگ سے واپس آئے تو کچھ فیصلہ ہو لیکن راستہ ہی میں ان قیدیوں کو اطلاع مل گئی کہ مامون کا انتقال"

یہ تو تھی سر ولیم میور کی رائے۔ اب آپ کے سامنے ہم بھی اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مامون یحییٰ بن مبارک زیدی کا شاگرد تھا جن پر اعتزال کا اتہام لگایا جاتا ہے۔ ثمامہ بن اشرف سے اس کے جو تعلقات تھے ان سے بھی آپ واقف ہیں۔ ثمامہ مذہب اعتزال میں مسلک ثمامی کا بانی تھا۔ مامون اسے اتنا پسند کرتا تھا کہ دوبار اس نے قلمدان وزارت پیش کیا جیسا کہ ہم "باب الوزرات" میں بیان کر چکے ہیں۔ اس سے بھی آپ ناواقف نہیں ہیں کہ مامون مجلس بحث ومناظرہ منعقدہ کیا کرتا تھا جس میں ہر قسم کے ارباب رائے ونظر شریک ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر تیز وطرار اور صاحب علم وفضل شخصیت کو مامون سے قرب کا موقع بہم پہونچا مثلاً ابو حذیل علاف۔ ابراہیم ابن سیار وغیرہ۔ یہ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ثمامہ۔ علاف، اور ابراہیم مشائخ اعتزال میں شمار ہوتے ہیں جب یہ تمام حقائق پیش نظر ہیں پھر تعجب کیا ہے اگر مامون پر یہ خیالات غالب ہوئے؟

مذکورہ بالا عوامل تو خیر کمیاں سے تھے لیکن اور بھی عوامل تھے جن کے اثرات بہت قوی ظاہر ہوئے ایک تو نقل وترجمہ کی گرم بازاری ہے۔ مامون کو فلسفہ ومنطق کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے دل میں ارسطو وغیرہ کی محبت راسخ ہوگئی۔ یہاں تک کہ سوتے جاگتے وہ اسی کا نام لیا کرتا تھا۔ یہ آخری صورت بھی پہلی صورت سے کم موثر نہیں تھی۔ بہرحال ان اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں اعتزال رچ گیا۔ اور غلو کی بنا پر کچھ سختیاں بھی سرزد ہوئیں۔ مزید تفصیل کسی آئندہ موقعہ پر ملے گی۔

نظر کی لاگ

وہی صبح۔ وہی شام۔ آج اسی قدر فرسودہ ہے۔ جس قدر کل تھا۔ اور آنے والا دن اسی قدر بے کیف ہوگا۔ کیوں نہ ہو۔ موسم بدلتے ہیں۔ لیکن گرمی برسات جاڑے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کا کام بدل جائے۔ سورج وہی مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں ڈوب جاتا ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مغرب سے نکلے اور شمال میں غروب ہو چاند وہی ایک مدت تک بڑھتا ہے اور پھر ایک مدت معینہ میں گھٹتے گھٹتے نابود ہو جاتا ہے۔ پھر وہی مقررہ دستور کے مطابق اس کا بھی طلوع وغروب۔ سمندر کا تلاطم بھی ایک غلامانہ نظام کا پابند ہے پہاڑوں کی بلندیاں بھی ایک قاعدے کے مطابق تغیر و تبدل پذیر ہوتی ہیں بہار کی نمو میں بھی ایک وضع احتیاط نظر آتی ہے۔ نیرنگی کہاں ہے؟ پھولوں میں ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ پھول تو یکسانیت کے مکمل نمونے ہیں۔ خیر یہ سب چیزیں تو نامکمل ہیں۔ اشرف المخلوقات لوگ کہتے ہیں مکمل ہے۔ لیکن اس کی تکمیل بھی ایک انتظام کا مظاہرہ ہے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بڑھتا رہتا ہے۔ قوی ہوتا رہتا ہے جوان ہو جاتا ہے۔ جذبات سے متمتع رہتا ہے پامال بندہے تلے جذبات سے۔ عمر بڑھتی رہتی ہے۔ ساٹھ ستر۔ اسی۔ نوے۔ سو۔ کچھ ہی ہو۔ پھر وہی پابندی۔ پھر وہی مجبوری زندگی ختم۔ پھر موت کہنے میں اس کے بعد اور زندگی ہے۔ ضرور ہوگی۔ لیکن بلحاظ قدرت وہ تو زمین کی زندگی سے بھی زیادہ خشک معلوم ہوتی ہے روز حساب اور پھر سزا اور جزا کا لامتناہی سمندر عمر بھر کے اعمال کا شمار یہ طول امل۔ قدرت کا کارخانہ ہی پابندیوں اور مجبوریوں کا تماشہ خانہ ہے۔

لیکن اکثر بچے عمر کا دور پورا ہونے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ اور حادثے بھی پیش آتے ہیں۔ مگر یہ بھی کیا ہیں ایک نظام کے خلاف احتجاج کا نتیجہ ان سے پابندیاں اور مجبوریاں اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ واہ واہ

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم   ایں چہ حیرت خانہ امروز و فردا ساختی

ہارون صبح صبح اپنے بستر پر پڑا ہوا یہ باتیں سوچتا رہا۔ وہ اپنی زندگی سے تنگ تھا۔ اس کے مینی

نہیں کہ وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ اس میں نئے نئے رنگ بھرنا چاہتا تھا وہ امروز و فردا کے تار و پود میں شفق سے زیادہ نرالے رنگوں کی آمیزش دیکھنا چاہتا تھا اسے فکر معاش نہ تھی وہ ایک آسودہ حال بلکہ متمول نوجوان تھا۔ وہ جاہل نہ تھا بلکہ عالم تھا ہندوستان میں اس نے عربی فارسی اور مروجہ علوم کی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں پائی تھی منتہی کا درجہ حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد ایک طویل مدت تک یورپ میں رہکر فلسفہ، ادب اور سائنس کا مطالعہ مختلف یونیورسٹیوں میں قیام پذیر ہو کر کیا۔ وہ ناکارہ نہ تھا۔ زمانے کے دستور کے مطابق اس نے بہت سی ڈگریاں۔ برلن۔ پیرس اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے لی تھیں لیکن اس کا مطالعہ جس قدر وسیع ہوتا گیا۔ اسی قدر اس کی طبیعت وقت پسند ہوتی گئی۔ اسے ہر چیز ناتمام نظر آنے لگی اور اس کی نظروں میں خوشی۔ رنج صحت۔ بیماری۔ شہرت۔ گمنامی کا تضاد بے حقیقت معلوم ہونے لگا۔ وہ سفر کرتا رہا۔ سیاحت میں مشغول رہا لیکن پھر گھبرا کر ہندوستان واپس آگیا۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ دنیا میں تنہا تھا۔ ہندوستان میں اس نے شہر شہر کی سیاحت کی لیکن یہاں بھی اس کا دل نہ لگا۔ پھر دوبارہ دنیا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ مشہور اور متمدن ممالک کے علاوہ وہ نامعلوم اور غیر مہذب ممالک میں بھی پھرتا رہا افریقہ کا اس نے کونا کونا چھان مارا چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بھی اقامت گزیں رہا بڑے بڑے پرخطر مقامات پر گیا موت سے بارہا دوچار ہوا لیکن باوجود ان تمام مراحل کے اس کے دل کو تنوع کی جستجو تھی اور جس قدر اس کے علم اور تجربے کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اسی قدر یہ پیاس بڑھتی چلی گئی۔ وہ پھر ہندوستان واپس آگیا اور اسی شہر دہلی میں آبائی مکان میں قیام پذیر ہو گیا۔

اس کے احباب اسے تاہل کی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہے لیکن وہ برابر انکار کرتا رہا اس کا خیال تھا کہ قوانین حیات کی غلامی کے بھی مدارج ہیں اور جس قدر قیود کم ہوں اسی قدر اور کچھ نہیں تو ظاہری تنوع زیادہ ہوگا۔

وہ زیادہ تر وقت کتب بینی میں صرف کرتا تھا۔ لیکن اکثر کتابوں کو شروع کرتے ہی اسے معلوم ہو جاتا کہ کسی کتاب کے فلسفیانہ نظریہ سے مصنف کیا کیا نتائج اخذ کیا چاہتا ہے۔ بیشتر افسانے شروع کرتے ہی چھوڑ دیتا کیونکہ اسے پتہ لگ جاتا تھا۔ کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا نئے نئے انکشافات اور معلومات اس کے دل کو گدگدانہ

سکتے تھے کیونکہ وسائل قدرت کے لازمی نتیجے اس کے لئے کوئی قدرت نہ رکھتے تھے وہ اکثر شعر کا مطالعہ شوق سے کرتا تھا لیکن آج کل کے شاعروں کے یہاں کیا رکھا ہے۔ وہی چبائے ہوئے نوالے چباتے رہتے ہیں اور پھر شعر کا انحصار ہے قیود عروض و قوافی پر اور جب کسی شے کا اساس اولین نہ ٹوٹنے والے قوانین پر منحصر ہو تو وہ ہارون کو بہت دیر تک منہمک نہ رکھ سکتی تھی اور کیونکر رکھتی یہاں بھی قدرت ناپید۔ تنوع مفقود۔

ہارون خود ایسی حرکات کرتا تھا کہ جو سوسائٹی کو شدید صدمے پہنچاتی تھیں اس کا وقت بیداری رات تھی۔ اور دن کو وہ رات بنائے رکھتا اس کے مکان کی آرائش اس درجہ بے تکی تھی کہ اس میں مروجہ وضع کے ہر جز کی مخالفت نظر آتی۔ اس کا لباس۔ اس کا طریقہ گفتگو غرض ایک ایک چیز مروجہ اطوار تمدن کے خلاف تھی۔ اس کی متعدد تصانیف بھی تھیں ہر تصنیف کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ سماج کے اجتماعی ضمیر کو شدید صدمہ پہنچائے۔ یہ سب کچھ تھا اور مدتوں رہا لیکن سماج کی مدت حافظہ بہت قلیل ہوتی ہے جماعت کا استعجاب دیرپا نہیں۔ ہارون کی ہر حرکت پر چند اعتراضات ہوئے سوسائٹی نے ناک بھوں چڑھائی دو چار روز چہ میگوئیاں ہوئیں اور پھر خاموشی۔ ہارون دنیا کے سمندر میں ایک اس قدر کم حیثیت قطرہ تھا کہ سمندر اس کی طرف دیر تک اعتنا نہ کر سکتا تھا۔ اور اس شکست کا احساس ہارون کو پھر وہی کلیہ یاد دلا دیتا کہ دنیا کی بنیاد قدرت اور تنوع کے فقدان پر ہے وہ ہر وقت یہی کہتا رہتا۔

ایں چہ حیرت خانہ امروز و فردا ساختی۔

آخر ہارون نے اعتراف شکست کر لیا۔ نظام معاشرت اور دستور مدنیت کے آگے ہار مان لی اور خود بھی وہی طریقہ زندگی اختیار کر لیا کہ جو رواج کے پابند مہذب افراد کا روزمرہ ہے یعنی دنیاوی کاروبار میں منہمک ہو گیا۔ اپنے بھولے ہوئے دوست احباب کو پھر اپنے دائرہ ملاقات و ارتباط میں شریک کر لیا کلب کا ممبر ہو گیا۔ دہلی کے ایک آدھ کالج ایک دو شفاخانوں اور دوسرے مدنی اداروں کی انتظامیہ جماعتوں کا رکن بن گیا۔

ہارون کی اس تجدید بیعت اور تبدیلی معاشرت پر مہذب مخلوق نے پھر ایک نگاہ استعجاب

ڈالی لیکن اس مرتبہ اس تعجب کی زندگی بہت ہی قلیل تھی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے ہارون پھر اسی طبقے میں شریک ہوگیا تھا جو اس پر معترض تھا۔ اس کے انقباض اور انبساط کے بھی وہی اسباب تھے جو مہذب مخلوق کے پھر آخر اعتراض دیرپا ہوتا تو کیوں؟

دھلی میں مورگن صاحب کے سرکس کو تماشہ دکھاتے ہوئے آج پندرہ دن ہوگئے ہیں لیکن عوام کی دلچسپی کا حال یہ ہے کہ سرکس کے مالک نے اگرچہ پندرہ دن کے بعد دھلی سے چلے جانیکا اعلان کیا تھا مگر اب ایک ہفتہ اور قیام کا اشتہار دے دیا ہے۔ سرکس کا ہر کھیل نہایت ہی حیرت انگیز ہے۔ ہاتھی گھوڑے۔ ریچھ شیر وغیرہ وغیرہ کے کرتب کے علاوہ خود مورگن صاحب کی لڑکی کا تار پر ناچنا اور طرح طرح کے ہنر دکھانا اپنی مثال آپ ہی ہوسکتا ہے۔ پانچ برس کی عمر سے اس نے رسی اور تار پر کھیل شروع کیا تھا۔ اور اب پندرہ برس کی پیہم مشق اور انہماک نے اس حسین لڑکی کو اپنے فن میں یکتا بنا دیا ہے۔ دھلی کے متمول اور مہذب طبقے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص بچا ہو جس نے مس مارگن کو خراج تحسین نبات خود نہ پیش کیا ہو۔ اور جس نے مس مارگن کے اعزاز میں چائے کی دعوت نہ دی ہو۔ ہارون جیسے جہانیاں جہاں گشت کا بیان ہے کہ اس نے اس فن میں مس مارگن سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔ اس گرویدگی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ روز اول سے آج تک کوئی تماشہ ایسا نہیں ہوا کہ جس میں ہارون نہ گیا ہو۔ اور اب تو معمول یہ ہے کہ مس مارگن کی شام ہارون کے ساتھ صرف ہوتی ہے اور تماشہ شروع ہونے سے صرف آدھ گھنٹے قبل ہارون روز اپنی جان پر کھیلنے والی حسین رقاصہ کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے سرکس کے کیمپ پر واپس آتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہارون کو مس مورگن سے الفت ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ ہارون کو یہ کریدبھی لگی ہوئی ہو۔ کہ زمین سے بیس گز اوپر ایک باریک سے تار پر اس طرح بے دھڑک ناچنے میں روزمرہ کی مشق کے علاوہ اور کیا بھید ہے کیا یہ ممکن ہے کہ صرف اجتماع خیال اور خطرے سے بیگانگی کی بدولت مس مورگن اس قدر کمالات دکھاتی ہے۔

ہارون نے مس مورگن سے اس کے متعلق سوال کیا تو اس نے اتنا کہا کہ مجھے کبھی کسی قسم کا خوف نہیں

معلوم ہوتا ہیں ٹکٹکی باندھ کر کسی ایک شخص یا کسی ایک چیز کو دیکھتی رہتی ہوں۔ اور میرے ہاتھ پاؤں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ میں ہر روز تماشائیوں کے مجمع میں کسی نہ کسی کو اس کی جاذب نگاہی کی وجہ سے منتخب کر لیتی ہوں یہاں آپ ہی روز موجود ہوتے ہیں۔ اور اس لئے اول سے آخر تک میرے مدنظر آپ ہی ہوتے ہیں جب میں موت کے ناچ میں لرزتے ہوئے دست و پا کو سنبھالے ہوئے چکر پہ چکر لگاتی ہوں تو ہر چکر کے پہلے اور ہر چکر کے بعد ایک پل کے پل میں میری نگاہیں آپ کو ڈھونڈھ نکالتی ہیں

آج مورگن صاحب کے سرکس کا دھلی میں آخری کھیل ہے پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ہارون بھی اپنی روزمرہ کی نشست پر متمکن ہے اس کے چہرے پر روز کی سی شادابی نہیں اور اس لئے اس کے احباب کنایۃً حسین رقاصہ سے جدائی کے خیال کو ہارون کے محزون اور متفکر چہرے کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں مختلف کرتب ہوتے رہے۔ تماشہ ختم پر پہنچا حسین اور شوخ و شنگ مس مورگن اکھاڑے میں آئی چاروں طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے یہاں سے وہاں تک تالیاں بجنے لگیں اس نے مسکراتے ہوئے جھک جھک کر حاضرین کی قدردانی کا شکریہ ادا کیا درجہ خاص کی پہلی صف کو دیکھ کر مسکرائی۔ طناب کی رسی پر پہونچکر ہارون کو دیکھا اور پھر پل کے پل میں زمین سے بیس گز اوپر کھچے ہوئے تار پر اپنے جسم کو تولنے لگی۔ ابتدائی مراحل طے ہوگئے۔ رقص شروع ہوا موت کا دوہرا اور بیتاب رقص لرزہ براندام تار پر ناچنے والی لڑکی چکر کاٹنے لگی موت کے جیسے بیخود اور مست چکر

ہارون کی نگاہ رقاصہ پر جمی ہوئی تھی۔ کہ یکایک اس نے ایک خفیف سی جنبش کی اپنی کرسی پر جھک کر اگلی کرسی کی آڑ میں ہو گیا۔ اسی لمحے بیدھڑک رقاصہ کے پاؤں نے لغزش کی اور وہ بیس گز اوپر سے اکھاڑے میں آ رہی۔ گرتے ہی گردن کے ٹوٹ جانے سے اس کی جان نکل گئی۔

ہارون نے قہقہہ لگایا۔ تماشائیوں کے مبہوت مجمع کو چھوڑ کر روانہ ہو گیا اس وقت سے وہ آہنگ ہوش اور وضع احتیاط کے منازل سے گذر گیا ہے اور وقت بے وقت یہ مصرعہ پڑھتا رہتا ہے ۔

این چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

تصویرِ حشر

(ایک راہب کی بیاض سے)

ایک ایک کرکے سب جیسے حماموں سے نہائے دھوئے۔
اپنی ٹوٹی پھوٹی قبروں سے اٹھیں گے،
کیونکہ بازدید پہ ایمان ہے سب کا
اور کیسا شدید، کیسا بے پناہ ایمان۔

آہستہ بول اے خدا! کہیں کوئی یہ نہ سمجھے
کہ تیرے ملک کا صور پھنک رہا ہے؛
اور اُس کی آواز کے آگے۔
نہ کوئی گہرائی گہری ہوگی نہ کوئی بلندی بلند،
پھر تو ذرّہ ذرّہ اور پتھر پتھر سے گزرے ہوئے زمانے جگ جگ اٹھیں گے۔
اور خاک نشینانِ پارینہ
میلی میلی بے رونق چادروں میں
لڑکھڑاتے، مٹی کے بوجھ سے جھکے جھکے،
ہر طرف نظر آئیں گے۔
خوب ہی واپسی ہوگی یہ،
خوب ہی سے وطن میں۔

اور جو مجھ سے کبھی آشنا تک نہ تھے، وہ بھی
شور مچائیں گے،
اور تیری ربوبیت اور تیری رحمت پر اپنا حق جتائیں گے،
جیسے انسان کا آب و دانہ پر حق ہو۔

اے سب کچھ دیکھنے والے! تو واقف ہے اس وحشت ناک تصویر سے،
جس کے رنگ میں اپنے سینے کی تاریکی میں
اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے بھر رہا ہوں
آخر تجھی سے سب کچھ نکلا ہے، کیونکہ تو باب الابواب ہے،
اور سب کچھ پہلے تجھ میں تھا،
اور پھر ہمارے چہروں میں آ کر گم ہوا۔
تجھے معلوم ہے وہ نقشہ؟ یوم الجزا کا طولانی نقشہ:
ایک صبح ہے وہ، لیکن ایسی صبح جس کے نور کو
تیری لازوال و لاانتہا محبت نے ہرگز نہیں پیدا کیا۔
ایک شور ہے وہ، لیکن تیری پکار کی آواز کا نہیں۔
ایک رعشہ ہے وہ، لیکن اس دہشت کا جو تیری بخشش سے بعید ہے۔
ایک ہلنا ڈلنا ہے وہ لیکن تیرے توازن سے دور۔

ایک کھڑکھڑاہٹ ہے وہ،
اور پھٹ پھٹ کر کڑکڑاتی ہوئی عمارتوں کے درمیان۔
ننگلوں کی سہمی ہوئی کڑ

اپنے داموں کی لڑ جھگڑ بھی اور اپنی سہتی کا اصراف بھی،
اپنے آپ سے ہم آغوشی بھی اور اپنے آپ ہی سے تصادم
اور ساری پرانی مٹی ہوئی خوشیوں کی ایک آہستہ آہستہ اندھی ٹٹول،
اور ساری گذری ہوئی لذتوں کی ایک مرجھائی ہوئی دھندلی سی یاد۔
اور کلیساؤں کے سروں پر،
جو زخموں کی طرح چاک در چاک ہوں،
سیاہ پرند جو ہتے ہر گز نہیں بنائے،
منتشر قطاروں میں بدحواس ادھر سے ادھر اڑ رہے ہیں۔
یوں اپنے آپ سے کشتیاں لڑتے ہیں،
یہ مدتوں کے ستائے ہوئے،
اور اپنے خاردار دانتوں سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں،
لیکن جب خون نکلتا نہیں دیکھتے تو سہم جاتے ہیں۔
اور اپنی سرد انگلیوں سے، آنکھوں کے گڑھوں کے آس پاس،
اپنے گم گشتہ آنسوؤں کو ڈھونڈتے ہیں۔
اور تھک جاتے ہیں۔

ان کی صبح کے چند ہی لمحوں کے بعد شروع ہو جاتی ہے اُن کی شام۔
اور یہ مہجوران حشر اپنے آپ کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں
اور تیار ہو جاتے ہیں کہ جیسے ہی تیری محبت کے شگفتہ چہرے پر
تیرے جلال کے پرہول نظارے نمایاں ہوں،
دامن طوفان پکڑ کر اوپر چڑھ جائیں۔

کہ حکمِ حاکم کو، ذرا نزدیک سے،
اپنے کانوں سن لیں۔
اور پھر ایک آفت کی چیخ پکار کے بعد شروع ہوتی ہے،
ایک اس سے بھی زیادہ آفت کی خوفناک خاموشی۔
سب کے سب بیٹھ جاتے ہیں جیسے سیاہ دروازوں کے سامنے،
اور ایسی روشنی میں جس میں ان کے جسموں پر
بڑے بڑے زخموں کے سے روشن دھبے نظر آئیں
آخر کار دیر ہو جاتی ہے، اور شام بڑھی پرانی
اور پھر راتیں بڑے بڑے تاریک ٹکڑوں کی طرح
اُن کے ہاتھوں اور ان کی پیٹھوں پر کٹ کٹ کر گرتی ہیں
اور وہ اُن کالے بوجھوں کے نیچے دب کر ڈگمگانے لگتے ہیں۔
دیر تک انتظار کرتے ہیں وہ، اور ان کے کندھے
اس بار انتظار سے لہرانے لگتے ہیں جیسے ایک سیاہ سمندر،
اور بیٹھتے ہیں وہ تو جیسے خیالوں میں ڈوبے ہوئے۔
لیکن ہوتے ہیں خیالات سے یک لخت خالی۔
یہ اپنے سروں کو کیا تھامتے ہیں؟
ان کے بھیجے تو ہوں گے کہیں اور
کسی گڑھے میں پچے سکڑے،
زمین کی تہوں میں سے کسی تہ میں دبے ہوئے۔
بیچاری بوڑھی زمیں بڑے سوچ میں ہے
اور اس کے اونچے اونچے معمر درختوں کے پتے لرزاں ہیں۔

•

اے سب کچھ دیکھنے والے! کبھی خیال آتا ہے تجھ کو
اس مردہ رو ڈراؤنی تصویر کا
جس کی سی دوسری تصویر
تیری "کن" کی ساری داستان میں موجود نہیں؟
تجھے ڈر نہیں لگتا اس شہر خموشاں سے،
جو تیرے دامن سے چپکا ہوا ہے، جیسے ایک مرجھایا ہوا پتا،
اور تیرے غضب کی آنچ تک پہونچنے کے لئے منتظر ہے
اے خدا! ذرا دن رات دونوں کے پہیوں کو روکے ہوئے،
کہ بہت جلد نہ پہونچ جائیں اس منزل تک،
یا شاید اب بھی ممکن ہو، کہ یہ گاڑی
اس دن کی ہیبتناک خاموشی سے
بچ کر نکل جائے۔
جو ہم دونوں نے دیکھی ہے۔
یا شائد تو ہم میں سے ایک ایسے کو بھی اٹھا سکے،
جو اس خوفناک نئی زندگی کے مقصد،
اس کی بیتابی اور اس کی روح کو سلب کرے،
ایک ایسے کو جس کا ریشہ ریشہ خون ہو گیا ہو۔
اور پھر بھی سب کچھ سہتا جائے
اور بحر حوادث میں خوش و خرم تیرتا جائے،
جو ساری قوموں کا مخزن فیض ہو،

جو ہر تار کے لئے ساز ہو،
ہر ساز کے لئے مضراب؛
وہ ناشناختہ، نامجروح غواص،
جو ہر موت کی تہ سے ناگشتہ ہم کنار ہو
...... اور یوں بھی نہیں تو پھر کیسے
مجھے اس دن کے برداشت کی ہمت ہے،
جس کا طول سارے دنوں کے مجموعی طول سے زیادہ ہوگا
اور جس کا خوفناک راگ ہوگا۔ اس کی خوفناک خاموشی!
جس دن تیرے تمام فرشتے، صورت سوال بنے
تیری جانب ہر طرف سے پر پھٹ پھٹاتے جی دہلاتے
گھسے چلے آتے ہوں گے؟
دیکھ تو سہی، وہ کیسے اپنے پروں پر ٹنگے ہوئے پھڑک رہے ہیں
اور ان میں سے ایک ایک لکھوکھا آنکھوں سے
تجھ سے اپنی مظلومیت کے فریادی ہیں؛
اور ان کے گانوں کی بھولی بھالی آوازوں میں
راگوں کے اتار چڑھاؤ کی بھول بھلیوں میں سے نکل کر
سچے سروں کی تہ تک پہونچنے کی سکت باقی نہیں۔
اور جب سن سپید بڈھے،
جو تیری بڑی سے بڑی فتوحات میں تیرے صلاح کار رہے،
اپنی لمبی لمبی داڑھیاں لئے،
آہستہ آہستہ اپنے سر ہلائیں گے،

اور جب ابن مریم کی دودھ پلائیاں
اور اس کے قریب خوردہ حواری
اور وہ ساری کی ساری کنواریاں۔
جو اس پر سے نچھاور ہوگئیں۔
وہ تیرے تاریک تاریک باغوں کے چمکتے ہوئے روشن شمشاد۔
کس کا سہارا لے گا تو
جب ان سبھوں کی چپ۔
تیرا منہ تکے گی؟
تیرے تخت کے گرد بیٹھنے والوں میں سے
ایک تیرا بیٹا بھی تو اٹھے گا
کیا تیری آواز اس دم اس کے دل تک نہ اتر جائے گی؟
کیا اس وقت تیرا اکیلا درد آلود دل آہستہ سے نہ پکارے گا
بیٹا!
کیا تو اس وقت
اس کی آنکھیں نہ ڈھونڈے گا،
جس نے یہ عدالت بلائی،
تیری عدالت اور تیری دہائی۔
تیرا بیٹا!
تو پھر اس وقت کیا تو یہ حکم دے سکیگا،
کہ تیرا وارث تیرے ممتاز ترین پشیمان گنہگاروں کو ساتھ لئے،
آہستہ آہستہ،

پھر ان کے پاس اتر جائے،
جن کی صرف ایک آرزو ہے:
کہ پھر سے مر جائیں
لیکن یوں ہوتا تو یہ تیرا آخری شہنشاہانہ حکم ہوتا۔
تیرا آخری رحم اور تیرا آخری قہر،
اور اس کے بعد ایک عالم سکوت:
آسمان پر، تیری عدالت پر، اور تجھ پر۔
اس وقت معمۂ ہستی کے سارے حجاب،
جو اب تک چہرہ کائنات پر پڑے تھے،
اٹھ جاتے
..... لیکن مجھے ڈر ہے .....
او سب کچھ دیکھنے والے! دیکھ، مجھے کتنی دہشت ہے،
اندازہ کر میری دہشت اور پریشانی کا!
مجھے ڈر ہے کہ تجھ کو گزرے ہوئے زمانہ ہوا،
اس آن،
جس آن تو نے روز اول،
اپنے علم کل کے محیط میں،
اس زرد نقشہ کی تصویر دیکھی،
جس کی طرف تو چار و ناچار بڑھ رہا ہے،
اے سب کچھ دیکھنے والے
کیا تو اس تصویر کو دیکھ کر بھاگ نہیں گیا تھا؟

لیکن کہاں؟
مجھے تو بتلا کہ کہاں،
کیونکہ مجھ سے بڑھ کر رازداں،

تجھے یہاں ملیگا نہ وہاں،
مجھ سے بڑھ کر،
جو تجھ سے
زاہدوں کی طرح حور و قصور کے لئے
دغا نہ کریں گے۔
میں تو صرف اس لئے کہ میں بھی تنہا ہوں جیسے تو
اور تھک گیا ہوں جیسے تو،
بلکہ شاید مجھ سے بھی زیادہ،
اور مجھے بھی اس بڑی عدالت کی دہشت
ویسی ہی کچھ ہے جیسی تجھ کو،
چاہتا ہوں کہ تجھ سے لپٹ جاؤں
اور اپنا چہرہ تیرے چہرہ سے
چپکا لوں؛
شاید کچھ زور لگا کے
تو اور ہم مل کر،
زمانے کی چکی کے اس بے پاٹ پہیے کو روک لے جائیں،
جس کو رات اور دن کے ہانپتے بل کھاتے دھارے

گردش مے رہے ہیں۔
کیونکہ: واویلا، مردے اٹھیں گے ضرور۔
ان کا ایمان ہے یہ:
اور یہ ایمان بھی کیسا شدید کیسا بے پناہ۔

جگر پارے

جو بجائے خود آہ ہوتی ہے — ہائے وہ کیا نگاہ ہوتی ہے
دل سے جب دل کو راہ ہوتی ہے — آہ ہوتی ہے واہ ہوتی ہے
ایک نظر دل کی سمت دیکھ تو لو — کیسی دنیا تباہ ہوتی ہے
وقفۂ ہوش عشق آہ نہ پوچھ — فرصتِ یک نگاہ ہوتی ہے
ایک ایسا بھی وقت ہوتا ہے، — مسکراہٹ بھی آہ ہوتی ہے
جو الٹ دیتی ہے صفیں کی صفیں — اک شکستہ سی آہ ہوتی ہے
آہ پیہم یہ تھا مدار حیات — وہ بھی اب گاہ گاہ ہوتی ہے
ہم سے پوچھو تو عشق کی بھی نگاہ — سخت کافر نگاہ ہوتی ہے
مرے غم خانۂ مصیبت کی — چاندنی بھی سیاہ ہوتی ہے
وہ بھی ہے اک مقام عشق جہاں — ہر تمنا گناہ ہوتی ہے
حسن کو بھی جو رنگ دیتی ہے — ایک سادہ نگاہ ہوتی ہے
حسن جاناں کی منزلوں کو نہ پوچھ — ہر نفس ایک راہ ہوتی ہے
وہ سرھانے کھڑے ہیں اور یہاں — رخصت اشک و آہ ہوتی ہے
بے دلی نے دکھا دیا آخر — شام فرقت سیاہ ہوتی ہے
کیا خبر تھی کہ عشق کے ہاتھوں — ایسی حالت تباہ ہوتی ہے
سانس لیتا ہوں دم الجھتا ہے — بات کرتا ہوں آہ ہوتی ہے
حاصل حسن و عشق اسے سمجھو — وہ جو پہلی نگاہ ہوتی ہے
درد بے وجہ کو نہ چھیڑ جگر — یہ خوشی گاہ گاہ ہوتی ہے

شاعر

تری نگاہ میں مستور شاہدِ معنی
تری شراب سے مخمور شاہدِ معنی

ہے تیرے جوشِ طبیعت سے دلبری کو فروغ
بتوں کے حسن کی رونق فسوں گری کو فروغ

طلسم سینہ ترا سرِ غیب کا معدن
ترے نفس نے کیا بزمِ زیست کو روشن

خزاں کے بعد نمو کا پیام تو لایا
مئے حیات کا اک تازہ جام تو لایا

حضورِ ناز میں وقفِ نیاز تیری جبیں
نشانِ سجدہ سے ہے بزمِ شوق کی تزئیں

وفورِ نغمہ سے ہو جائے سب جہاں معمور
فروغِ نطق سے اپنے دکھا دے جلوۂ طور

یہ نقش تو نے جو کھینچے ہیں جوشِ وجداں میں
انھیں کا عکس جھلکتا ہے لوحِ امکاں میں

ترے خیال کی رنگینیاں صنم ایجاد
بنی ہیں صنعتِ ونچی[1] و مانی و بہزاد

حجاب جوہرِ اندیشہ میں ہنر مستور
ہو جیسے پردۂ شب میں رخِ سحر مستور

بہارِ طبع سے باغِ حیات رشکِ جناں
نشاطِ نغمہ سے طاؤسِ آرزو رقصاں

حجابِ نغمہ میں بیٹھا ہے چھپ کے شاہدِ رنگ
طلسمِ حرف میں پنہاں نقوشِ صد آہنگ

کمالِ شوق کی بے مدعائیاں ہیں وہی
نگاہِ یار کی کافر ادائیاں ہیں وہی

ہنوز فطرتِ انساں ہے لرزہ دارِ تپش
ہنوز درد کی سوزش ہے دہر کی گردش

شباب ہو تمنائے جلوۂ جاناں
تری نگاہ سے تارِ ربابِ دل جنباں

---

[1] س کا پورا نام لیونارڈو دا ونچی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کا مشہور اطالوی مصور و سنگ تراش (۱۴۵۲-۱۵۱۹ء)

کھلا ہی دفترِ عشق و شباب تیرے لئے ۔ کتابِ حسن کا ہے انتخاب تیرے لئے
حیا و عشوہ و ناز و ادا کا تو محرم ۔ غرورِ حسن کی اک اک ادا کا تو محرم
غمِ حیات سے بس دلفگار تو ہی ہی ۔ جہانِ درد کا اک راز دار تو ہی ہی
ملا ہے شاہدِ بزمِ ازل سے تجھ کو پیام ۔ جہان والوں نے شاعر رکھا ہے تیرا نام

نوائے محوی

غمِ حبیب یہ کیا میرے دل کا حال ہوا ۔ کہ ایک بات بھی جینا مجھے محال ہوا
جو تیری راہِ تمنا میں پائمال ہوا ۔ وہ دل جہانِ محبت میں اک مثال ہوا
کہاں کا طور وہ ہی بزمِ کائنات کا رنگ ۔ کہ ذرّہ ذرہ یہاں پیکرِ جمال ہوا
لبوں پہ ان کے تبسم ہی، شرم آنکھوں میں ۔ سمجھ گیا مرے شکوے کا جو مآل ہوا
وفائے بعدِ جفا چارہ سازِ غم نہ ہوئی ۔ جگر کا زخم نہ ممنونِ اندمال ہوا
اجل بھی آئے تو پیغامِ زندگی لائے ۔ انھیں جو پرسشِ بیمار کا خیال ہوا
بہار نے نہ اڑایا ہو تیرا رنگِ شباب ۔ ہر اک نہالِ چمن پیکرِ جمال ہوا
دلِ حزیں کو نہ ٹھکرا کہ ای نگاہِ عتاب ۔ یہ جوشِ شوق میں مجبورِ عرضِ حال ہوا
قدم دیارِ محبت میں ہم نے یوں رکھا ۔ نہ دل کی فکر نہ کچھ دردِ جان و مال ہوا
خوشا فریبِ تمنا نہ ہے تصورِ دوست ۔ کہ رشکِ خرمنِ گل دامنِ خیال ہوا

ملا ہے وہ دلِ درد آشنا ہمیں محوی
کسی کے چوٹ لگی اور اسے ملال ہوا۔

تنقید و تبصرہ

The Quatrains of Hali: a verse translatio
by C. S. Tute. (Oxford University Press

یہ مولانا حالی کی رباعیات کا ترجمہ ہے۔ پہلے ایک صاحب جی۔ای وارڈ (G. G. Ward)
باعیات کا لفظی ترجمہ کیا، پھر اسے ٹوٹ صاحب نے نظم میں لکھ دیا۔ نثر کا ترجمہ عموماً صحیح ہے، لیکن منظوم ترجمہ میں
خوبی نہیں اور نظم اور لفظی ترجمہ میں جابجا اختلاف بھی ہے۔ اس اعتبار سے کہ یہ مولانا حالی کے خیالات کو انگریزی
تک پہنچانے کی ایک کوشش ہے، ہمارا فرض ہے کہ ٹوٹ صاحب کی ہمت شکنی نہ کریں، مگر ہمیں خوشی اس
ہوتی جب ان کے ترجمے میں کوئی ایسی صفت ہوتی جو مولانا حالی کے کلام کو مرغوب بنا سکتی۔ موجودہ ترجمے سے
ید رکھنا فضول ہے۔

ڈ سورتھ اور اس کی شاعری | مصنفہ جناب میر حسن صاحب، مدیر مجلۂ عثمانیہ، معتمد بزم اردو، کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۰۸ صفحے۔

لسلۂ ادبیات اردو کی دسویں کتاب ہے۔ سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ اردو دانوں میں صحیح مذاق پیدا کرے اور صحیح مذاق
وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ذہن میں وسعت ہو اور دوسری زبانوں کے ادبی کارناموں سے دلچسپی اور واقفیت
یکتہ سلسلے کے مدیر عمومی ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری نے اپنے دیباچہ میں واضح کر دیا ہے، اور ان کے خیال
ت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ انگریزی شاعروں میں سے ورڈسورتھ کا انتخاب بھی بہت بجا کیا گیا ہے، کیونکہ
کے کلام کی سی سادگی کسی اور انگریزی شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی، اور شہروں کی غبار آلود فضا کے دلدادہ
دستانیوں کے لئے اس کی فطرت پرستی ایک بہت اچھا سبق ہے۔

فاضل مصنف نے موضوع کو ترتیب دینے اور ورڈسورتھ کی شخصیت اور اس کی سیرت کا اس کے کلام پر جو اثر
اسے دکھانے میں بڑی نکتہ سنجی سے کام لیا ہے۔ اردو میں اس قسم کی سوانح عمریاں بہت کم ہیں، لیکن کسی قسم
یاد نظر کے سامنے نہ ہونے کے باوجود لائق مصنف کی یہ کوشش بہت کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ ہمیں اس بات کا
ہیں ہے کہ ورڈسورتھ کی نظموں کا ترجمہ ایسا نہیں ہے جو اردو دانوں کے دل میں اس کے کلام سے رغبت پیدا کرنے
ں کہیں ترجمہ میں غلطیاں بھی نظر آئیں۔ مثلاً دوسرے صفحہ پر "قوس قزح" میں "So is it when
I am a ma" کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: "وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ میں آدمی ہو گیا ہوں" شاعر کا مطلب

ہرگز یہ نہیں ہے کہ پہلے وہ "آدمی نہیں تھا بلکہ پہلے وہ بچہ تھا" اب جوان ہے، اس کے بعد دوسری سطر میں when oo ende o کا ترجمہ یا یہ کہ میں مرجاؤں، کیا گیا ہے، جو بالکل غلط ہے اس کے بجائے "اور جب میں مرجاؤں گا، ہونا چاہیئے صفحہ ۱۱ پر The Prelude کے اقتباس میں لکھا ہے" ایسے فوارے جو اپنے آپ ہی گنگناتے ہوئے جاری تھے، یہ بھی کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے چاہے وہ ورڈسورتھ کی عبارت کا بالکل صحیح ترجمہ کیوں نہ ہو لائق مترجم نے اس بات کا خیال نہیں رکھا ہے کہ ترجمہ کی عبارت چاہے لفظاً اصل سے کچھ مختلف بھی ہوجائے لیے بامحاورہ ضرور ہونا چاہیئے۔

الطریقۃ المرضیہ فی التمرینات الثمانیہ | مولفہ مولوی حکیم محمد احمد صاحب معلم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ چھوٹی تقطیع حجم ۲۲ صفحات مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ

یہ عربی نحو کی مشق کے لئے ایک چھوٹا سا رسالہ ہے مگر بڑے کام کا ہے۔ حکیم صاحب موصوف مدت العمر سے عربی نحو و نحو وغیرہ پڑھاتے ہیں۔ انھوں نے نہایت غور و خوض سے اس کے اصول ذہن نشین کرانے کے لئے جدید طریقہ نکالا ہے جس کی یہ آٹھ مشقیں ہیں۔ ان سے طلبا کے ذہن میں نحو کی اصولی باتیں نقش ہو جاتی ہیں اور وہ جملوں کی ترکیب آسانی سے سمجھنے اور کرنے لگتے ہیں۔ حکیم صاحب موصوف نے اٹھارہ طلبا کو اس طریقہ پر تعلیم دی اور تجربہ نہایت کامیاب رہا یعنی وہ بہ نسبت ان طلبا کے جو معمولی اور رائج الوقت طریقہ سے نحو سیکھتے ہیں زیادہ بہتر رہے اور تھوڑی محنت میں ان کو بہت نفع مل گیا۔ اس لئے جو لوگ عربی نحو سیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ رسالہ بہت کارآمد ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مصنف ممدوح کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

گنجینۂ تحقیق | از جناب محمد احمد صاحب بیخود موہانی ایم اے۔ منشی فاضل شیعہ کالج لکھنؤ حجم ۲۴۴ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ اس کتاب پر اکتوبر ۱۹۳۸ء کے جامعہ میں ریویو ہوچکا ہے اب ہمیں مرزا محمد ہادی صاحب رسوا مرحوم کی تنقید حاصل ہوئی ہے جو اب تک کہیں نہیں چھپی ہم اسے تبرک کے طور پر شائع کرتے ہیں۔

جناب مولانا مولوی سید محمد احمد صاحب بیخود موہانی ایم اے۔ کی کتاب گنجینۂ تحقیق میری نظر سے گذری نہایت عمدہ کتاب ہے اور ہر مسئلہ کو پوری پوری تفتیش کے ساتھ لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تحقیق (ریسرچ) کا خزینہ اور تدقیق کا گنجینہ ہے۔ تنقید میں انشا پردازی کو معراج کمال تک پہونچا دیا شرح اشعار کو شاہد مضمون کا مرقع بنا دینا حیرت انگیز ہے۔ کلام غالب کی شرح نہایت عمدہ طور سے فرمائی ہے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اساتذہ ہند و عجم کے اشعار سے اسناد حسب موقع پیش کئے ہیں اکثر اشعار اس قسم کے ہیں کہ ان کی صحیح شرح اب تک نہ ہوئی تھی ان کو نہایت خوبی سے حل کیا ہے مثلاً

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

...اریں ایسے ایسے لطیف پہلو اور نازک نکتے بیان کئے ہیں کہ نکتہ سنجی وجد کرتی ہے مثلاً

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

...نے شرح کا حق ادا کر دیا ہے اور داد نکتہ پروری دی ہے تنقید کے متعلق اردو میں کوئی ایسی بلند پایہ تصنیف ...سے نہیں گذری خلاق المعانی حکیم خاقانی کے اشعار میں ایسی موشگافی کی ہے کہ باید و شاید۔ یہ کتاب ...وسعت نظر اور نکتہ رسی اور قدرت بیان کا آئینہ ہے۔

یہ کتاب پانچ تنقیدی مضمونوں کا مجموعہ ہے اور امید ہے کہ نہایت مقبول ہوگی اور طرز تحریر پر اہل نظر ...کریں گے۔ (مرزا محمد ہادی)

...رامی | ملک الشعراء مولانا شیخ غلام قادر گرامی مرحوم شاعر خاص اعلیٰ حضرت نظام اللہ دکن خلدٗ ملکہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۸

تعداد صفحات ۲۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ اعلیٰ قیمت دو روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ:۔

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

مولانا گرامی اس آخر عہد میں ان پختہ گو شعراء میں سے تھے جن سے فارسی شاعری سرزمین ہند ...تھی۔ ان کے کلام میں صفائی، بلندی اور استادانہ پختگی ہے۔ دیوان میں غزلیں، قطعات، مثنویاں ...سب کچھ ہیں اور ہر رنگ میں گرامی کا کمال نمایاں ہے۔

خانخاناں کا مشہور شعر ہے

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است — جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

اس پر مولانا گرامی کی غزل داد کے قابل ہے لکھتے ہیں

ز ذوق بیخودی از من مپرس تا چند است — کہ سینہ چاک نظرہائے فتنہ پیوند است

رخ تو عید نظرہاست چند زیر نقاب — درآ بجلوہ کہ یک شہر آرزومند است

تو آرزوئے دل من ز من چہ می پرسی — ز دل بپرس کہ چون است و آرزو چند است

بسے بگشتم و جز ملک عشق کم دیدم — ولایتے کہ درآں بندہ بے خداوند است

...ڈاکٹر اقبال کی شان میں فرماتے ہیں

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

بزرگوں کے ساتھ گرامی کو خاص عقیدت ہے۔ اکثر کی مدح لکھی ہے خاص کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں پر زور قصیدہ لکھا ہے۔ شیخ مبارک علی نے اس دیوان کو شائع کر کے ادب پر ایک احسان کیا ہے۔ (۱-۵)

اطلاع

۲۹ اکتوبر ۴۲ء کو یوم تاسیس کے موقع پر مکتبہ جامعہ نے مندرجہ ذیل کتابیں شائع کی تھیں شائقین انھیں خرید کر ہمت افزائی فرمائیں۔

۱۔ کیمیاگر (مختصر افسانے) پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) عمر

۲۔ صید زبون (ڈراما) پروفیسر اشتیاق حسین قریشی ایم اے ۱۰/

۳۔ دیانت۔ (ڈراما) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی ۲/

۴۔ سرکار دو عالم (سیرت پاک) جناب حسین عسّان صاحب ندوی ۸/

۵۔ عقاید اسلامی۔ دینیات کی تیسری ریڈر ۱/

۶۔ سچی باتیں۔ مولوی سعدالدین انصاری ندوی ۴/

۷۔ قاعدہ۔ مولوی عبدالغفار صاحب مدھولی ۴/

۸۔ رہنمائے قاعدہ۔ مولوی عبدالغفار صاحب مدھولی ۲/

ان کتابوں کو شائع کرنے کے علاوہ مکتبہ نے "پیام تعلیم" کا سائز چھوٹا کر کے اسے بالکل چھوٹے بچوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور کتاب نما کی اشاعت بھی باقاعدہ شروع کر دی ہے

شذرات

یوم تاسیس اہل جامعہ کے لئے خوشی کا دن ہے۔ کیونکہ یہ انھیں وہ دن یاد دلاتا ہے جب حریت پسند مسلمانوں نے اپنی تعلیمی آزادی کا جھنڈا لہرایا تھا، رنج کا دن ہے کیونکہ یہ ان بزرگوں کی فرقت کا داغ تازہ کرتا ہے جن کے آغوش محبت میں جامعہ نے پرورش پائی، احتساب کا دن ہے کیونکہ اس دن جامعہ والے اپنے سال بھر کی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہیں، اہتمام کا دن ہے کیونکہ اس روز وہ آئندہ سال کے کام کا منصوبہ باندھتے ہیں۔ اب کی بار یہ دن اس لحاظ سے خصوصیت رکھتا ہے کہ جامعہ کی بدویانہ زندگی ختم ہونے اور حضری زندگی کے شروع ہونے کا مژدہ لایا ہے۔ جلسے میں جناب شیخ الجامعہ نے یہ جانفزا خبر سنائی کہ اوکھلے کی اراضی خریدنے کی کارروائی مکمل ہو چکی۔ زمین پر جامعہ کا قبضہ ہو گیا اور اب تعمیر کا کام جلد شروع ہونے والا ہے۔ اگر ہم یہ امید کریں تو بے جا نہیں کہ آئندہ سال کم سے کم اتنا ہو جائے گا کہ یوم تاسیس کا جلسہ اوکھلے میں اپنی عمارت میں منعقد ہو۔ آئندہ سال کے لئے اور جو ارادے کئے گئے ہیں انھیں زبان پر لانے سے یہ بہتر ہے کہ دل میں رکھے جائیں اور کر کے دکھائے جائیں۔ مگر ایک ارادہ ایسا ہے جسے پورا کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا پورا ہونا قوم و ملت کی توفیق و تائید پر منحصر ہے۔ جناب شیخ الجامعہ کا مقصد ہے کہ آئندہ اکتوبر تک امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ العالی اور بیگم محمد علی صاحبہ کی مدد سے جامعہ کی عمارت کے لئے اتنا چندہ جمع کر لیں کہ موجودہ ضرورت کے لائق ایک چھوٹی سی بستی بن جائے اور بس جائے اور جامعہ کے معلموں اور قدیم و جدید طلبہ کا یہ حوصلہ ہے کہ اس سارے ملک میں ہمدردان جامعہ کے حلقے قائم کریں اور وہ چاہتے ہیں کہ سال بھر کے اندر جامعہ کے ہمدردوں کی تعداد ہزاروں میں شمار ہونے لگے اور ان کے ماہوار چندے کی مقدار ڈھائی ہزار تک پہنچ جائے اس وقت تک تقریباً پانچ سو حضرات "حلقہ ہمدردان جامعہ" میں داخل ہو چکے ہیں اور ان کے چندے کی مقدار چار سو سے متجاوز ہو چکی ہے اس لئے قوی امید ہے کہ جو اندازہ کیا گیا ہے وہ پورا ہوگا۔ انشاء اللہ۔ رسالہ جامعہ کے قارئین کرام بھی یقیناً جامعہ کی اس معاملے میں پوری مدد کریں گے۔

جلسے میں اس بار سال گذشتہ سے زیادہ مجمع تھا۔ مقامی حضرات کے علاوہ باہر سے جامعہ کے قدیم ے ہمدرد زیادہ تعداد میں تشریف لائے تھے ۲۸ کو ڈراما میں بھی خوب رونق تھی۔ ڈراما لوگوں نے بہت پسند کیا خصوصاً نقل کو جس میں پریم چند صاحب نے سرکاری ستیاگرہ کا

مضحکہ اڑایا ہے۔ برکت علی متعلم ثانوی چہارم نے پنڈت موٹے رام کا پارٹ اس خوبی سے کیا کہ لوگوں کی رائے میں عطائی ایکٹر تو کیا ہمارے ملک کے پیشہ ور ایکٹر بھی شاید ہی کر سکتے۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب۔ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جامعہ کے مہمانوں کے لئے پاکیزہ تفریح کا یہ سامان بہم پہونچایا۔

---

۲۹ کو جلسے کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں مقامی شعرا میں سے۔ اکبر حیدری صاحب، ڈاکٹر سید عابد صاحب، حضرت یاس و مومن۔ اور باہر کے لوگوں میں سے حضرت اخگر مرادآبادی، حضرت جگر مرادآبادی حضرت حسرت موہانی، حضرت ثاقب لکھنوی۔ اور حضرت صفی لکھنوی نے حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ ان بزرگوں میں سے بعض نے اب مشاعروں کی شرکت قطعاً ترک کر دی ہے اور محض اس دلی تعلق کے سبب سے جو وہ جامعہ ملیہ سے رکھتے ہیں یہاں تشریف لے آئے تھے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشاعرے کی یہ صحبت ایسی تھی کہ برسوں سے سارے ہندوستان میں کسی جگہ دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی اس محفل میں اور اس کے بعد دو دن تک جامعہ کے اساتذہ اور طلبا کو ان سحر بیان سخنوروں کی زبان سے دل کے سچے جذبات حقیقت اور معرفت کے نکتے، زندگی کے گہرے راز شعر کے پردے میں سننے کا موقع ملا۔ اس سے طبیعت نے جو لطف اٹھایا اور جو فیض پایا وہ بیان نہیں ہو سکتا ہم ان سب بزرگوں کے تہ دل سے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہم غریبوں کی خاطر اس قدر زحمت اٹھائی۔ خصوصاً مولانا صفی مدظلہ العالی کے جو اس پیرانہ سالی میں بہت سے ضروری کاموں کا حرج کر کے اور طویل سفر کی تکلیف برداشت کر کے تشریف لائے خدا ان سب بزرگوں کو تا دیر سلامت رکھے اور اردو زبان و ادب کی مزید خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

اگست کے جامعہ میں جو اعلان کیا گیا تھا اس کے مطابق یکم اکتوبر کو اردو اکادمی کا جلسہ منعقد ہوا یہ اس تعلیمی سال کی پہلی صحبت تھی اور ایسے وقت میں کی گئی کہ دہلی یونیورسٹی اور دوسری تعلیم گاہیں کھلنے نہیں پائی تھیں اور شملے سے دفاتر بھی نہیں آئے تھے اس لئے اندیشہ تھا کہ مبادا مجمع کم ہو لیکن جو مقالہ پڑھا جانے والا تھا اس کا عنوان وہ تھا 'تہذیب نفس کا حقیقی مفہوم' اور خواجہ غلام السیدین صاحب کا نام لوگوں کو کھینچ ہی لایا اور جلسہ شروع ہونے سے پہلے تعلیمی مرکز کا ہال بھر گیا۔ صدر جلسہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے چند الفاظ معزز فاضل کی خیر مقدم میں فرمائے اور اس کے جناب خواجہ صاحب کی تقریر شروع ہوئی ابتدا میں موصوف نے قصے کے پیرائے میں ہندوستان کی قدیم جدید تہذیب کا مقابلہ کیا اور دونوں کی عبرتناک حالت دکھائی اس سے آپ نے ایک تو اس بات کی و ثابت کی کہ تہذیب نفس کا حقیقی، مفہوم وضاحت اور صحت کے ساتھ معین ہو جانا چاہیے اور دوسرے ا

مفہوم کے تعین کے لئے بہت سے مفید نکتے حاصل کئے اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوا جس میں موصوف نے تہذیب نفس کے اہم عناصر کی تشریح کی اور یہ دکھایا کہ تعلیم کا کام ان عناصر کو نفس انسانی میں ابھارنا یا ان کے ابھرنے میں مدد دینا ہے۔ موصوف کی تقریر میں دلیل کی قوت اور بیان کا زور اصلاح کا جوش اور تحقیق کا ضبط ظرافت کا لطف اور متانت کا وزن اس طرح سمویا ہوا تھا کہ سننے والے محو ہو کر سن رہے تھے۔ ہم انشاء اللہ نومبر یا دسمبر کے جامعہ میں اس مقالے کا خلاصہ شائع کریں گے اور اس کے بعد بہت جلد یہ ایک علیحدہ رسالے کی شکل میں شائع ہوگا۔

اکاڈمی کا آئندہ جلسہ ۲۶ نومبر ۳۲ء یوم شنبہ ۶½ بجے شام کو ہوگا۔ جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب پی ایچ ڈی (برلن) ذیل کے عنوان سے وہ فاضلانہ مقالہ پڑھیں گے جو انھوں نے اپنے قیام جرمنی کے زمانے میں ایک عرصے کے مطالعے اور تحقیق کے بعد لکھا ہے: "عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ"

ہمارے پاس "دار المصنفین اور اس کا تخیل، در گذشتہ تاریخ"۔ اس نام سے ایک چھوٹا سا رسالہ تنقید کے لئے پہنچا ہے۔ اس جید علمی ادارے کی وقیع خدمت کا ذکر چند سطروں میں ناممکن ہے اس لئے ہم آئندہ مہینے کے جامعہ میں مفصل ریویو ایک مستقل مضمون کی صورت میں شائع کریں گے۔

بعض ناگزیر وجوہ سے اس مہینے کے رسالے میں "دنیا کی رفتار" کے تحت کچھ نہیں لکھا جا سکا۔ ہم ناظرین کرام سے معافی چاہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہم آئندہ مہینے میں اس کی تلافی کر سکیں گے۔

مالیات عامہ

اور

ہمارے افلاس کے اسباب

"وہ جو دھوپ اور گرمیوں کی مصیبت اٹھاتے ہیں جن کا اسراف یہ ہے کہ وہ دنیا کی مسرف ترین حکومت کا بار اٹھائے ہوئے ہیں جن کی سخاوت اس میں مضمر ہے کہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر مالیہ ادا کرتے ہیں اور جو اپنے کندھوں پر برطانیہ کی عظمت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں ان کے نام سے یہ کتاب معنون کی جاتی ہے بیلوں کے تھکے تھکے شانوں پر جب وہ ہماری واہی کر رہے ہوں"

ان الفاظ میں اس کتاب کے مصنف مسٹر جے سی. کمار پانے مالیات عامہ کو غریب مزدوروں اور کسانوں کے نام سے معنون کیا ہے۔ اس مختصر کتاب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر مالیات عامہ نے کیا کیا اثر ڈالے ہیں۔ محض قانون سازی ہمارے افلاس کو دور نہیں کر سکتی نہ چند اشخاص کے تونگر ہو جانے سے ملک خوشحال کہلا سکتا ہے۔ اصل خوشحالی وہ ہے جب ملک کا غریب ترین انسان بھی دو وقت پیٹ بھر کر روزانہ کھا لیا کرے۔ گاندھی جی نے اس کے مطالعہ کی سفارش کی ہے۔ عام فائدہ کی غرض سے قیمت بے انتہا کم رکھی گئی ہے یعنی صرف ۸/ صفحات ۲۲۵۔

اسلامی قانون فوجداری

یعنی کتاب اختیار کا ترجمہ جو مولانا سلامت علی خاں نے تصنیف کی تھی اور انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں فقہ حنفی کے ان ہی اصول و قواعد کے مطابق مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ دیسی ریاستوں میں تو اب بھی بیشتر اسلامی فقہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ جو وکلا، ان ریاستوں میں کام کرتے ہیں یا جو ارباب ذوق اسلام کے تعزیری احکام کا مقابلہ تعزیرات ہند سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے علمی حیثیت سے یہ کتاب مفید ہو سکتی ہے۔
قیمت چار روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپواکر شایع کیا

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۵

بابت ماہ نومبر ۱۹۳۲ع

۱۵

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927.

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت

…نا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

…لد ۱۹	بابتہ ماہ نومبر ۳۲ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

		صفحہ
غالب کی فارسی شاعری (۳)	عابد علی صاحب عابدؔ	۳۶۱
اسپین کا عہد سعادت	مولوی عبد السلام صاحب قدوائی	۳۸۲
فلسفۂ عرب و یورپ اور اس کا تدریجی ارتقا	مولوی خلیل احمد صاحب جامعی	۳۹۵
افغانی اور برطانوی جنگیں	عبد الواحد صاحب سندھی	۴۱۷
دنیا کی رفتار۔ ہندوستان	ش۔ ر۔ ق	۴۲۲
ممالک اسلامی	ع۔ ع	۴۴۰
ممالک غیر	ذ۔ ح	۴۴۵
شذرات	......	۴۵۳

(محمد مجیب صاحب بی اے آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ دہلی سے شائع کیا

غالبؔ کی فارسی شاعری

۳

شعر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ ولی آگسٹائن کا قول ہے "اگر آپ مجھ سے شعر کے متعلق کچھ نہ پوچھیں تو میں سب جانتا ہوں اور پوچھ بیٹھیں تو کچھ نہیں جانتا" جانسن کہتا ہے "شاعری وہ فن لطیف ہے جس کے ذریعے ہم عقل کو تخیل کی مدد سے اس قابل بنا دیتے ہیں کہ مسرت او صداقت کو جمع کر سکے۔ اس فن کا جوہر اختراع تخلیق ہے" مِل لکھتا ہے "شاعری کیا ہے۔ ایسے الفاظ اور خیالات جن میں جذبہ خود بخود ایک فطرتی طریق سے سما گیا ہے" کارلایل کے نزدیک شاعری "مترنم خیال" کا نام ہے ہیزلٹ شاعری کو تخیل اور جذبات کی زبان سمجھتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو کا قول ہے "شاعری حسن کی مترنم تخلیق ہے"۔

مندرجہ بالا تعریفات سے یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شعر کی کوئی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام تعریفات سلسلہ جنبان خیال ہیں۔ شبلی نے شعر العجم کے چوتھے حصے میں شعر کی نوعیت پر مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لے تو شعر ہو جاتا ہے۔

حالی کے قول کے مطابق "شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو"[۱] جوش کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے "جوش سے یہ مراد ہے کہ مضمون بے ساختہ الفاظ اور موثر پیرائے میں بیان کیا جائے" غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شعر کی تمام تعریفات میں جوش اور تخلیق و اختراع کا ذکر موجود ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جذبے اور اختراع کے مجموعے کو شعر کہہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ موزوں ہو۔ کوئی خیال کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو جذبے کی شمولیت کے بغیر بے جان ہے۔ تخیل کی تحریک اور اختراع و تخلیق کی تکمیل کے لئے کسی احساس کی جذبے کا برانگیختہ کرنے والا اثر درکار ہے۔ کیونکہ اس اثر کے بغیر

---

[۱] مقدمہ دیوان حالی ۵۷

تخیل بھی ناکارہ اور مردہ رہتا ہے۔ نثری تصانیف میں بعض اوقات جذبے کا پرزور اظہار نہیں ہوتا بعض پختہ کار ادیبوں کی تحریریں جذبہ اتنا گھنچا ہوا۔ اتنا رکا ہوا۔ اتنا قابو میں ہوتا ہے کہ قاری پڑھتا جاتا ہے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اور نہیں سمجھ سکتا کہ جذبات کی آگ کو کہاں پوشیدہ رکھ دیا ہے لیکن نظم میں یہ اصول کارفرما نہیں اس کی وجہ ظاہر ہے۔ نثر ہنگامہ حیات کی زبان ہے۔ تجارت اور سودمندی کی زبان۔ اور نظم متفقہ طور پر روح اور دل کی پرواز خیال کا آئینہ ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کے شعلوں کا مظہر ہے نظم موزوں کلام کا نام ہے۔ اور شدید جذبات ہمیشہ اپنے اظہار کے لئے موزوں کلام کا پیراہن تلاش کرتے ہیں انسانی دل کے تمام ہنگامہ پرور جذبات گیت کے ذریعے ادا ہونا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعر جذبے سے لبریز ہوتا ہے عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ جذبے کے ساتھ تخیل کی اختراعی اور تخلیقی قوت کی شمولیت ضروری ہے جب تخیل کسی جذبے پر اپنا عمل شروع کر دیتی ہے۔ تو شعر کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔ جذبات تو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن شاعر اپنی اختراعی قوتوں سے کام لے کر ان کا ایسا تخیلی خاکہ تیار کرتا ہے جو مرکزی خیال اور مرکزی جذبے کے تمام پہلوؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

غالب ان نکات سے بخوبی واقف ہے چنانچہ اپنی اختراع و تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم — در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

در وجد اہل صومعہ ذوق نظارہ نیست — ناہید را بزمزمہ از منظر افگنم

معشوقہ را ز نالہ بدانساں کنم حزیں — کز لاغری ز ساعد او زیور افگنم

ہنگامہ را تہم جنوں بر جگر زنم — اندیشہ را ہوائے فسوں در سر افگنم

نخلم کہ ہم بجائے رطب طوطی آورم — ابرم کہ ہم بروئے زمیں گوہر افگنم

با غازیاں ز شرح غم کارزار نفس — شمشیر را برعشہ تن از جوہر افگنم

با دیریاں ز شکوۂ بیداد اہل دیں — مہرے ز خویشتن بدل کافر افگنم

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر — بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

سلہے زکنج دیر بہ مینو کشادہ ام   ازخم کشم پیالہ و در کوثر افگنم

غالب بہ طرح منقبتِ عاشقانہ
رفتم کہ کہنگی زتماشا بر افگنم

اپنے جذبات کی شدت کے متعلق لکھتا ہے۔

قماش ہستیٔ من یکسر آتش است آتش   مرا چو شعلہ بود پشت روئے کار یکے
چہ شد کہ ریخت زباں رنگ صد ہزار سخن   بخوں سرشتہ نوائے ز دل بر آر یکے

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ الہام شعری کے ماتحت شاعر ایک ہی نشست میں بیسیوں اچھے شعر کہہ لیتا ہے اور پھر ان میں ترمیم کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی یہ غلط ہے۔ ممکن ہے کہ بعض استثنائی حالتوں میں شاعر معمولی کوشش سے اچھا شعر کہہ لے لیکن عام طور پر اچھے شعر کی تخلیق کے لئے غیر محدود کاوش و جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود اچھے شعر کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شاعر نے ذوقِ انتخاب سے کام لیا ہے۔

"اگر شاعر[1] اپنے نقوش تاثر کو سیدھے سادے طریقے پر انہیں الفاظ میں بیان کرنا شروع کرے جن میں وہ اظہار کا تقاضا کرتے ہیں۔ تو اس کا کلام بالکل بے لطف اور نثری ہوگا۔ اس کی حیثیت محض منظوم واقعے کی ہوگی۔ علاوہ ازیں اس کی نوعیت بھی شخصی اور انفرادی رہے گی۔ اس لئے شاعر غور و فکر سے کام لیتا ہے۔ اپنے ذہنی تجربے کو عامتہ الورود واقعے میں تحویل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تفصیلات و جزئیات کو ترک کر کے صرف چند امتیازی و اہم خصوصیات کو دلکش و لطیف پیرائے میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ غزل گو شاعر صرف ایک ہی شعر میں اپنے ذہنی تجربے کی ترجمانی کرتا ہے اس لئے مناسب و موزوں الفاظ کے انتخاب، بندش کی چستی۔ جملوں کی ترکیب وغیرہ پر بڑی توجہ صرف کرنی پڑتی

---

[1] غزل پر ریزہ خیالی کا الزام ہمایوں لاہور مئی سنہ ۱۹۲۱ء۔ (مولوی محمد حسین، ادیب ایم اے۔ بی اے ڈی)

ہے۔ غرض کہ تمام نفسیاتی و عروضی مدارج طے کرنے کے بعد ایک شعر تکمیل پذیر ہوتا ہے"

امیر مینائی کہتا ہے۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے | تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

غالب نے کئی جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بینیم از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل | غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

گدازِ دل کی ترکیب جذبے کی شدت اور تیزی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ ایک جگہ تو اشارتاً یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کئی معانی بکر اور نو ادر فکر مناسب الفاظ نہ ملنے کے باعث نہاں خانۂ ضمیر ہی میں رہ گئے۔

معنی غریب مدعی و خانہ زاد ماست | ہر جا عقیق نادر و اندر یمن بے ست
مشکیں غزالہا کہ نہ بینی بہ ہیچ دشت | در مرغزار ہائے ختا و ختن بے ست
در صفحہ نبودم ہمہ آنچہ در دل ست | در بزم کمتر ست گل و در چمن بے ست

کانٹ نے کہا ہے۔ بہت سے اشعار ہوتے ہیں جن میں آزاد حسن ہوتا ہے وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشامِ جان کو معطر کرتے ہیں۔ اگر ان کے نثر کرنے اور ان کے مطالب کے دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہو گی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو پانے کی غرض سے ان کے پھول کو توڑ کر علیحدہ کر دے" غالب کی پروازِ تخیل کانٹ سے بھی زیادہ ہے اس کے خیال میں بعض "مطالب شعری" ایسے ہوتے ہیں جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے پیراہن سے گریز کرتی ہے۔ وہ نغموں کی آوازِ بازگشت کی طرح شاعر کے دل ہی میں رہتے ہیں۔

طوطیاں را نبود ہرزہ جگر گوں منقار | خوردہ خونِ جگر از رشکِ سخن گفتنِ ما
سخنِ ما ز لطافت نپذیرد تحریر | نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

شعر کہنے کی صلاحیت ایک نعمت الٰہی ہے جس کو عطا ہوتی ہے اس کا دل انبساط سے سرشار
ہوتا ہے اس کا کاشانہ دولت دنیا سے خالی ہوتا ہے لیکن حکومت کا اقتدار اس کی چوکھٹ پر سر جھکانا اپنا
فخر سمجھتا ہے۔ اس کے پاس لال و جواہر نہیں لیکن اس کے الفاظ میں لال و جواہر سے زیادہ تابانی ہوتی
ہے۔ وہ رنگین و درخشاں الفاظ کے استعمال سے محبت اور عشق کے عشرت خانے تعمیر کرتا ہے اور پھر ان کو شمعِ
دل سوزی سے روشن کرتا ہے اس کے عشرت خانوں کی روشنی سے فرشتوں کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔

غالب کہتا ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند   دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند   ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایت شاہانِ عجم برچیدند   بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند   بسخن ناصیۂ فرِ کیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند   ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند
ہرچہ در جزیہ ز گبراں مئے ناب آوردند   بشب جمعۂ ماہِ رمضانم دادند
ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند   تا بنالم ہمہ از جملہ زبانم دادند

غالب نے اپنے سامنے شعر گوئی کا جو معیار رکھا تھا۔ اس کی عدم مقبولیت وہ اپنی زندگی ہی میں دیکھ چکا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح سمجھتا تھا کہ عوام الناس تو ایک طرف سخن فہموں کا ایک گروہ بھی اس کی شاعری کا قایل نہیں۔ چنانچہ کلکتہ میں[1] جو کچھ مرزا پر گذری اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مذاقِ عام کا رخ کس طرف تھا۔ "بادِ مخالف" میں غالب نے ذوقِ عامہ کی بے دردی کی طرف نہایت پُرحسرت انداز میں اشارہ کیا ہے۔

---

[1] یادگار غالب۔ صفحہ ۱۰

اے تماشائیان بزم سخن
وے مسیحا دمان نادره فن

اے گران مایگان عالم حرف
خوش نشینان این بساط شگرف

اے سخن پروران کلکته
وے زبان آوران کلکته

کار احباب ساختن رسم است
میهمان را نواختن رسم است

کنیتم دل شکسته غم زده
بیدلے خسته ستم زده

برقِ بے طاقتی بجان زده
آتشِ غم بجان و ما زده

دوستان را اگر ز من گله است
که خراست خلاف قافله است

مے روم از پے قتیل همه
ساخته مرد را دلیل همه

مے شوم خویش را به صلح دلیل
مے سرایم نوائے مدح قتیل

گرچه ایرانیش نخواهم گفت
سعدی ثانیش نخواهم گفت

لیکن از من هزار بار به است
از من و هم چو من هزار به است

من کفِ خاک او سپهر بلند
خاک را کے رسد به چرخ کمند

مرحبا ساز خوش بیانی او
حبذا شور نکته دانی او

نظمش آب حیات را ماند
در روانی فرات را ماند

نثر او نقش بال طاؤس است
انتخاب صراح و قاموس است

بادشاهے که در قلمرو حرف
کرده ایجاد نکته هائے شگرف

خامه هندوئے پارسی دانش
هندیان سر بخط فرمانش

این رقمها که ریخت کلک خیال
بود سطرے ز نامهٔ اعمال

بوکہ آید بر عذر خواہیِ ما   رحم بر او بے گناہی ما

ایک فارسی غزل کے مقطع میں لکھتا ہی:

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی   مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

انھیں حالات میں غالب نے اپنے کلام کے متعلق مندرجہ ذیل پیشین گوئی کی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوتی ہی:

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن   این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است   شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
ہم سواد صفحہ مشک سودہ خواہد بیختن   ہم دواتم ناف آہوئے ختن خواہد شدن
مطرب از شعرم بہ بزمے کہ خواہد زد نوا   چاکہا ایثار جیب پیرہن خواہد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت   دشنگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

اتنا کہ کر غالب پر پھر مایوسی طاری ہوتی ہی. اور اب وہ پھر ذوق عامہ کے ابتذال کا ذکر کرتا ہی

ہر چہ مے گویم اگر این است وضع روزگار   دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن
آنکہ صور نالہ از شور نفس موزوں دمید   کاش دیدی کیں نشید شوق فن خواہد شدن
کاش فہمیدی کہ بہر قتل یک معنی قلم   جلوۂ کلک و رخم دار و رسن خواہد شدن

---

۱ - اردو دیوان میں بھی اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل، سن سن کے اسے سخنوران کامل، آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش، گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل۔

چشم کور آئینۂ دعوی بکف خواہد گرفت — دست شل مشاطۂ زلف سخن خواہد شدن
شاہد مضموں کہ اینک شہرۂ جان و دل است — روستا آوارۂ کام و دہن خواہد شدن
زاغ زاغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں — ہم نوائے پردہ سنجان چمن خواہد شدن

شعر اور نغمے میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بعض نقاد تو یہ کہتے ہیں کہ شعر کی سب سے بڑی خصوصیت نغمہ ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آرٹ کا مقصد تخلیق حسن ہے۔ اس اعتبار سے جس تحریر میں انداز کی صفات جمالی زیادہ نمایاں ہوں گی، اسے آرٹ کا مکمل نمونہ کہا جائیگا۔ شعر کے حسن کا دارومدار زیادہ الفاظ پر ہے اور الفاظ کا حسن نغمے سے عبارت ہے۔ تو گویا صناع اپنے احساسات و خیالات کے اظہار کے لئے حسن سماعت ہی کو زیادہ متاثر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر فطرتاً موسیقی سے عام آدمیوں سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ موسیقی ہی وہ مظہر ہے جس کے ذریعے جذبات کے لطیف سے لطیف پہلو بہ آسانی ادا ہو سکتے ہیں۔ رقص، تی اور ورت کے ذریعہ وہ نازک حقایق بھی ادا ہو جاتے ہیں جن کو الفاظ[1] کی زنجیروں میں مقید کرنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

خصوصاً ہندوستانی موسیقی اتنی جامع مکمل اور لطیف ہے کہ تال اور لے کی تکمیل اور نزاکت کے اعتبار سے کسی ملک کی موسیقی اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

ملا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں لکھتا ہے:

"نغمۂ ہندوستانی بمرتبہ ایست کہ زیادہ بر آن متصور نیست۔ بر ہمگان پیداست کہ حسن صوت بالخصوص اگر منکیف بہ کیفیت نغمہ شود، در دل کشائی و خاطر ربائی اثرے عظیم است چنانچہ در اطفال بے تمیز مشاہدہ و معاین است لہذا ہیچ امتے از امم بے موسیقی نیست حتیٰ سکان شوامخ جبال و قطان براری و قفار۔ و آنچہ از وسعت دستگاہ و غرابتی ادا ہائے نازک و فراوانی معانی رنگیں و مضامین دل نشیں، و مراتب ناز و نیاز در نغمۂ ہندوستان ہاست در دیگر

---

[1] نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے — معنی کہ بر وجامۂ حرف تنگ است

نغمات عشرت (۱) انداعتنار و یکے از ہزار نیست۔ و بالجملہ حسن نغمۂ ہندوستان چوں نغمۂ حسن ہند عالمگیر است
حسن پرستان و نغمہ شناسان ہر دیار او را اسیر

گوش چشمے شود چو آرد رنگ　　　چشم گوشے شود چو گیرد چنگ

و بسا از صوفیان صافی دل و ریاضت مندان پیوند گسل در محفل فیض منزل سماع و تواجد جان بجاناں بہ آسانی سپردہ اند و ودیعت حیات را بشگفتہ پیشانی۔ تفصیل آں از بسیاری شہرت محتاج نگارش نیست"

غالب نے بھی بعض تشبیہات و استعارات فن موسیقی اور اس کی اصطلاحوں سے مستعار لئے ہیں ایک جگہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر دیدۂ بصیرت نور معرفت سے روشن ہو جائے تو تعینات کے حجاب خود بخود چاک ہو جاتے ہیں اور کثرت کے مناظر توہمات پیدا کرنے کی بجائے وحدت تام کی طرف رہبری کرتے ہیں۔

ہر (۲) حجابے کہ وہ روئے بہ ہنگامۂ شوق　　　پردۂ ساز بود زمزمہ سنجان ترا

از ترنک خوش نوائی ساز خیال من　　　مضراب نے بہ ناخن ناہید بودہ است

اس شعر میں خیال کی تشبیہ ساز سے اتنی جامع اور لطیف ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ خیال بھی اپنی پرواز میں غیر محدود ہے۔ ساز کی نزاکت آواز اور لطافت اظہار کی بھی کوئی حد نہیں۔ ساز کے لئے بھی مضراب کی ضرورت ہے۔ خیال کے لئے بھی ایک تحریک شعری درکار ہے۔ ساز میں بھی نغمے یوں مشہود ہیں جیسے پتھر میں شرار۔ ایک ذرا چھیڑنے کی دیر ہے۔ اسی طرح خیال بھی صرف ایک اشارہ کا منتظر ہوتا ہے۔

از تیغ وجد بذوق نشاط نغمہ نیابی　　　گر بدل گذرد مرگ ناگہانش ورزد

---

(۱) ملا صاحب کا ذوق نظر بھی داد کے قابل ہے۔

(۲) محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا۔　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خوش نوا بلبل پروانہ نژادے دارم — شعلہ در خویش ز گلبانگ پریشاں زدہ

اے ز ساز زنجیرم در جنوں نواگر کن — بند گر بدیں ذوق است پا ز نو گراں تر کن

غالب کے لئے موسیقی ایک شعلہ پرور اور دلگداز کیفیت ہے جس سے متاثر ہو کر انسان مدہوش ہو جاتا ہے اور اس بے خودی کے عالم میں عارضی طور پر غم حیات سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس اثر کے ضائع ہو جانے پر قلب پر اندوہ کا احساس زیادہ شدت سے مستولی ہو جاتا ہے۔

مغنی[1] دگر زخمہ بر تار زن — گل از نغمہ تر بدستار زن
بہ پروازش آں گل افشاں نوائے — نگویم غم از دل دل از من ربائے
دل از خویش بردار و بر ساز نہ — ہم از خویش گوشے بر آواز نہ
ز گنجینۂ ساز بردار چند — دریں پردہ نقشے بہ ہنجار بند
برامش برآور ہم آواز شو — بہ آہنگ دانش نوا ساز شو
کہ دانم ز دستاں سرائے چنیں — دل آویز باشد نوائے چنیں
ز کام و زباں ہر سہ جاں را درود — ز جاں جاودانی رواں را درود
خوشست ابد غالب بہ ساز آمدن — نوا سنج قانون راز آمدن

بہشت اور دوزخ کے متعلق جو تصورات و عقائد رسمی عوام الناس میں مقبول ہیں۔ غالب نے ان سے بیزاری کا اظہار کیا ہے مثلاً۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

---

[1] مثنوی یازدہم۔ کلیات غالب نولکشوری نسخہ

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا　　وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

ایک خط[1] میں مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں۔

مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ لیکن یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منی جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر خلد اور ایک حور۔ اقامت جاودانی ہے۔ اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی۔ وہی زمردیں کاخ۔ وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار　　کہ تقویم پارینہ ناید بکار

اس "خوش مذاقی" سے غالب نے اپنی ایک فارسی مثنوی میں بھی کام لیا ہے۔ اور جس قدر اشارے مذکورہ بالا خط میں پائے جاتے ہیں ان کو تفصیل سے لکھا ہے۔ راقم کی رائے میں یہ مثنوی غالب کا کارنامہ ہے اور اس قابل ہے کہ اس میں سے جستہ جستہ اشعار نقل کئے جائیں تاکہ مرکزی خیال کا ہر ایک پہلو نمایاں ہو سکے۔

پہلے خدا کی تعریف میں کچھ شعر ہیں۔

سپاسے کزو نامہ نامی شود　　سخن در گذارش گرامی شود
سپاسے کہ فرخ سروشان راز　　براں زمزم آباد گویند باز

---

[1] ان کی محبوبہ چنا جان کی تعزیت میں یہ خط لکھا گیا تھا

مہاے دوئی سوز کثرت ربائے　　　سپاہِ دل افروز بینش فزائے
خدارا سزد کز دروں پروری　　　بدیں شیوہ بخشد ثنا ساوری

کشاید ہوا پرنیانی بنفش　　　شود شاخِ گل کاویانی درفش
شود باغ صحرائے محشر ز سرو　　　پر ذرّہ مرہر سو ز بالِ تذرو
چمن خلد و کوثر شود آبگیر　　　خیاباں ز جوش سمن جوئے شیر
بیندیش کیں روزگار از کجاست　　　نمود طلسمِ بہار از کجاست
بدانش ترا دیدہ ور کردہ اند　　　چراغے دریں بزم بر کردہ اند
نہ بیند جز یں ہیچ بینندۂ　　　کہ مارا بود آفرینندۂ
نگارندۂ پیکرِ آب و گل　　　شمارندۂ گوہرِ جان و دل
رگِ ابر را اشکباری ازوست　　　دمِ برق را بے قراری ازوست
گراں مایگاں غرق گوہر ازو　　　خساں خستۂ موج ساغر ازو

مناجات کے بعد اس بات کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے۔

دریں گونہ گوں آرزو خواستن　　　بود چوں بسا لیست آراستن
سپہر چرخ و الائی و برترے　　　بچار آخشیج آدمی پیکرے
بہ یزدانیاں فرّۂ ایزدی　　　بہ یونانیاں بہرۂ بخردی
بکشور کشایاں دم گیر و دار　　　بہ مسکیں گدایاں غمِ پود و تار
بہ ناہیدیاں بادۂ بے غمے　　　بہ کیوانیاں گوشۂ ماتمے۔
بے در فروغے کہ چوں بردمد　　　ز سیمائے میخوارہ نیز دمد
بساقی خرامے کہ از دلبری　　　ز شاہد برد دل بساقی گری

اس کے بعد لکھتا ہے کہ دنیا میں ہر شخص تیری نعمتوں سے بہرہ یاب ہے لیکن ایک میں ہوں

واندوہ کے ہاتھوں ہر وقت نالاں رہتا ہوں۔

نہ سودائے عشق و نہ راہِ صواب — نہ در سینہ آتش نہ در دیدہ آب
نہ دستور دان و نہ خسرو شناس — نہ از شحنۂ شرع در دل ہراس
بہر گونہ کالا روائی زتست — بما بہرۂ ناروائی زتست

اپنی زبوں حالت کا بیان کرنے کے بعد پھر قیامت کا ذکر چھیڑتا ہے۔

بروزے کہ مردم شوند انجمن — شود تازہ پیوند جاں ہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازندگاں — بسرمایۂ خویش نازندگاں
گہرہائے شہوار پیش آورند — فرو ہیدہ کردار پیش آورند
بہنگامہ با ایں جگر گوشگاں — درآیند مشتے جگر تو شگاں
دراں حلقہ من باشم و سینۂ — زغمہائے ایام گنجینۂ
درآب و درآتش بسر بردۂ — ز دشواری زیستن مردۂ

بہ نخشبائے بر ناکسی ہائے من — تہی دست و در ماندہ ام وائے من
بدوش ترازو منہ بار من — نسنجیدہ بگزار کردار من

وگرہم چنین است فرجام کار — کہ مے باید از کردہ راندن شمار
مرا نیز یارائے گفتار دہ — چوں گویم براں گفتہ زنہار دہ
دریں خستگی پوزش از من مجوئے — بوہ بندۂ خستہ گستاخ گوئے
دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود — چوں ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود
زباں گرچہ من دارم اما زتست — بہ تسرت ارچہ گفتارم اما زتست

همانا تو دانی که کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم

نکشتم کسے را به اهریمنی
نبردم کسے مایه در رهزنی

مگرمے که آتش بگورم ازوست
بهنگامه پرواز مورم ازوست

من اندوه گیں و مے اندُه
چه می کردم اے بنده پرور خدای

حساب مے و رامش و رنگ و بوی
زجمشید و بهرام و پرویز جوئی

که از باده تا چهره افروختند
دل دشمن و چشم بد سوختند

نه از من که از تاب مے گاه گاه
بدریوزه رخ کرده باشم سیاه

نه بستاں سرائے نه میخانهٔ
نه دستاں سرائے نه جانانهٔ

نه رقص پری پیکراں بر بساط
نه غوغائے رامشگراں در رباط

شباں گه به مے رهنمونم شدے
سحرگه طلبگار خونم شدے

تمنائے معشوقهٔ باده نوش
تقاضائے بیهودهٔ میفروش

چه گویم چوں هنگام گفتن گذشت
زعمر گراں مایه بر من گذشت

بسا روزگاراں بدلدادگی
بسا نوبهاراں به بے بادگی

بسا دو زباران و شبهائے ماه
که بوداست بے مے بچشمم سیاه

افقها پر از ابر بهمن هی
سفالینه جام من از مے تهی

بهاران و من در غم برگ و ساز
در خانه از بے نوائی فراز

جهاں از گل و لالهٔ پر بوئے و رنگ
من و حجره و دامنے زیر سنگ

دم عیش جز رقص بسمل نبود
به اندازهٔ خواهش دل نبود

اگر تافتم رشته گوهر شکست
اگر یافتم باده ساغر شکست

بنازک نگارے که نازش کشم
بهر بوسه زلف درازش کشم

چوں دل زیں ہو سہا بجوش آیدے — زدل بانگ خونم بگوشش آیدے
چوں آں نامرادی بیاد آیدم — ز فردوس ہم دل نیاسایدم

اب بہشت کی تصویر کشی شروع ہوتی ہے۔

دلے را کہ کمتر شکیبد بباغ — در آتش چہ سوزی بسوزندہ داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور — کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبروی ہائے مستانہ کو — ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
درآں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجائش شورش نائے و نوش
سیہ مستیٔ ابر باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ — غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ ایمنش کجا — فریبد بسوگند دینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گوئے — دہد کام و نبود دلش کام جوئے
نظر بازی و ذوق دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزو مند درلالۂ — نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ
ازینہا کہ پیوستہ می خواست دل — ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
چوں پرسش رگے را بکاود ز دل — دو صد دجلہ خونم تراود ز دل
بہر جرم گز روئے دفتر رسد — زمن حسرتے در برابر رسد

گذشتم ز حسرت امیدیم ہست — سپید آب روئے سپیدیم ہست
کہ البتہ ایں رند ناپارسا — بہ کج اندیشہ گبر مسلماں نما

پرستار فرخندہ منشور تست
ہوادار فرزانہ دستور تست

بہ بند امید استواری ورست
بہ غالب خط رستگاری ورست

مثنوی ایک ساقی نامے پر ختم ہوتی ہے جس کے کچھ شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

بیا ساقی آئینِ جم تازہ کن
طراز بساطِ کرم تازہ کن

بپرویز از مے درودے فرست
بہ بہرام از نے سرودے فرست

بہ دور پیاپے بہ پیمانۂ مے
بشور دمادم بفرسائے نے

قدح را بہ پیمودن مے گمار
نفس را بہ فرسودنِ نے گمار

نکیساد ماں را برامش درآر
ہی سرورا در خرامش درآر

بختم از بلائی زیاراں بگرد
بکامِ دل شاد خواراں بگرد

مبادا نظامی ز راہت برد
بدستاں سوئے خانقاہت برد

فریبش مخور چوں مے آشام نیست
ستم دیدۂ گردشِ جام نیست

خود اوراست از پارسا گوہری
سپہری بسروشی۔ بساقی گری

رضائے جوئے من شوکہ ساغر کشم
گرم نیل و جیحوں دہی در کشم

اگر زود مستم پریشاں نیم؛
وگر دیر مستم گراں جاں نیم

بعض نقاد صداقت کو فنونِ لطیفہ کا مقصد اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر یہ مسئلہ طے ہو جائے کہ آرٹ کا مقصد آفرینشِ حسن ہے یا جویائی حق و صداقت۔ حق و صداقت کے لفظ خود پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ وہ آرٹ کے انتہائی مقاصد نہیں۔

صداقت سائنس کا مقصد ہے۔ سائنس اور آرٹ متضاد اشیا ہیں۔ صداقت کا مقصد افادہ، تہذیب اخلاق اور اشاعت علم ہے۔ یہ چیزیں آرٹ کی مملکت میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ محقق اور صناع کے نقطہ ہائے نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صداقت عقل و ذہن سے متعلق ہے

اور آرٹ تخیل کا پروردہ ہے۔ صداقت سیدھے سادے تصنع سے خالی الفاظ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور آرائش آرٹ کا ایک جزو لازم ہے۔

معلم، مقرر، خطیب۔ نقاد، محقق۔ اور شاعر کے دائرہ ہائے عمل جداگانہ ہیں۔

ایک مثال لیجئے: اگر صداقت آرٹ کا منتہائے نظر ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ گناہ کی عریاں لفظی تصویریں آرٹ کے دائرے میں داخل ہوں گی بشرطیکہ ان میں صداقت سے سرمو تجاوز نہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ آرٹ میں گناہ اور بدی کے پہلوؤں کا اظہار بھی ہوتا ہے لیکن صرف تقابل و تضاد پیدا کرنے کی خاطر۔ صرف اس غرض کے لئے کہ نیکی اور راست کرداری کو زیادہ نمایاں کرکے دکھایا جائے۔

ملٹن کی جنت گم شدہ اس دعوی کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے۔ جو خیال مرکزی طور پر کتاب کے ہر ورق سے نمایاں ہے وہ یاس آفریں اور زندگی کش نہیں بلکہ ایک پیغام حیات ہے۔ جاودانی نجات اور ابدی زندگی کا پیغام ہے۔

ڈانٹے کی "انفرنو" میں ہیبت اور خوف کا ایک تاریک اور شعلہ آفریں دوزخ پوشیدہ ہے مگر اس تصنیف کا حسن خوف کی تصویر کشی میں نہیں بلکہ اس تقابل اور تضاد میں ہے جو دوزخ اور جنت کے درمیان پایا جاتا ہے گناہ اور نیکی دونوں موجود ہیں لیکن آخری فتح نیکی کی ہے۔

کوئی ادبی تحریر اخلاقی نقطہ نظر سے نہیں جانچی جا سکتی۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ادب اور آرٹ اخلاق کے قوانین کو ملیامیٹ کرنے کے لئے عالم وجود میں نہیں آئے اگر کوئی تصنیف صداقت اور اخلاق کے اصولوں کے منافی ہو تو وہ کسی طرح اچھی ادبی تصنیف نہیں کہلا سکتی۔ اس کی وجہ نہیں کہ صداقت اور اخلاق فنون لطیفہ کے مقاصد ہیں۔ بلکہ یہ کہ آرٹ اعلیٰ ترین صداقت اور نیکی سے ہم آہنگ ہوتا ہے حسن صداقت اور نیکی ایک ہمہ گیر اصول کے مختلف مظاہر ہیں۔ جمالی دنیا میں صرف حسن کا وجود ہے اور اس دنیا میں حسن اور نیکی میں کوئی تمیز نہیں کی جا سکتی۔

نظم بالخصوص اخلاقی اصولوں کی تبلیغ کے لئے غیر موزوں ہے۔ نظم ادب کے ان لطیف ترین

شاہکاروں کا مظہر ہیں جن کی تخلیق کا مقصد ذوقِ جمال کی تسکین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن نظموں کا مقصد تہذیب اخلاق ہوتا ہے عام طور پر ان میں کوئی دلکشی نہیں پائی جاتی۔ قادر الکلام شاعر استثنائی طور پر میں اخلاقی مضامین کو بھی شعریت سے لبریز کر دیتے ہیں۔ لیکن عام طور پر نثر ہی کو تہذیب اخلاق کا بہتر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔

غالب نے بھی بعض اشعار میں اخلاقی اصول بیان کئے ہیں شاعری بہت کم ہے۔

غالب نظرتاً خود دار اور آزاد منش واقع ہوا تھا۔ اشعار میں بھی جابجا اس نے اپنی خود داری نازک مزاجی کا مختلف پیرایوں میں اظہار کیا ہے

گوشہ گیرانیم و محو پاس ناموس خودیم ‏ ‏ آبروئے ناگدا زجوہر رفتار ما
سخت جانیم و قماش خاطر ما نازک است ‏ ‏ کارگاہ شیشہ بیداری بود کہسار ما
می فزاید در سخن رنجے کہ بر دل می رسد ‏ ‏ طوطیِ آئینہ ما ے شود زنگار ما

کمن نازِ داوا چندیں ولے رسباد جا نہم ‏ ‏ دماغ نازک من بر نمی تا بد تقاضارا
تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جا دہم ‏ ‏ گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

---

۵ بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ‏ ‏ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ‏ ‏ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم ‏ ‏ اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت ‏ ‏ اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

دردام ہمسر دانہ نیفتم گر قفس　　　چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

تا تنگ مایہ بدریوزہ خود آرا نشود　　　نرخ پیرایہ گفتار گراں می بایست

غالب جبر کا قائل تھا۔ اگرچہ اس کے لہجے میں وہ طنز کا رنگ نہیں جو خیام کی رباعیات میں پایا جاتا ہے لیکن اس کے شعر بھی لطف سے خالی نہیں۔

خستۂ عجزیم دارد ناجز گنہ مقبول نیست　　　تکیہ دارد بر شکست توبہ استغفار ما

ازتست اگر ساختہ پرداختۂ ما　　　کفرے نبود مطلب بے ساختۂ ما
پروردہ نازیم بر حکمت دۂ عجز　　　برپائے تو باشد سرافراختۂ ما

غالب کی نظر میں خود نمائی وہ عیب ہے جس سے حریفان بادہ پیما کو نفرت ہونی چاہیئے

درمشرب حریفاں منع است خودنمائی　　　بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

حصول لذات کا شوق عیب نہیں لیکن لذتوں میں غرق ہو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جانا ہے۔

دردہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود　　　بر قند نہ بر شہد نشیند مگس ما

ترک مال و دولت سے اطمینان کلی نصیب ہو جاتا ہے۔

بہ ترک جاہ گو تا گردش ایام برخیزد　　　کہ گلخن تاب دایم در نظر دارد بہاراں را

ریاضت صفائے قلب کے لئے ہونی چاہیئے تن پروری کے لئے نہیں۔

تن پروری خلق فزوں شد ز ریاضت　　　جز گرمی افطار ندارد رمضاں ہیچ

شئے مطلوب کے حصول کے لئے اس کے حصول کی صلاحیت اور استعداد ضروری ہے۔

ہر غنچے رانشاے درخواست بوئے پیراہن بہ کنعاں می رود

ایسے اشعار کے علاوہ غالب نے مسلسل اخلاقی غزلیں بھی لکھی ہیں ، اگر غزل کو کسی طرح اخلاقی کہا جا سکتا ہے۔

خیرہ کند مرد را مہر درم داشتن حیف ز ہم چوں خودے چشم کرم داشتن
وائے ز دل مردگی خوئے بد انگیختن آہ ز افسردگی روئے دژم داشتن
راز بر انداختن از روش ساختن دیدہ و دل باختن لیت و نعم داشتن
جوہر ایماں ز دل پاک فرو رفتن گر دے از اں در خیال ہر قسم داشتن

تازگی شوق چیست رنگ طرب ریختن چہرۂ خوناب اشک رشک ارم داشتن
با ہمہ تنگی دم ز درستی زدن با ہمہ دل خستگی تاب ستم داشتن
در غم دام بلا بال فشاں زیستن با سر زلف دو تا عربدہ ہم داشتن
دل چو بکوش آیدے عذر بلا خواستن جاں چو بپا سایدے شکوہ ز غم داشتن
ہر فریب از یاد ام تواضع مپیچ دل ز بادیدے تیغ زخم داشتن
نقش پے رفتگاں جادہ بود در جہاں ہر کہ رود بایدش پاس قدم داشتن
با نگہ خویشتن چہرہ نیاراست شد عشوہ دہد گر حیات ز آئینہ دم داشتن
اشک جہاں بے اثر نالہ چنیں نارسا دیدہ و دل را نزد ماتم ہم داشتن
خجلت کردار زشت گشتہ بعاصی بہشت باج ز کوثر گرفت جبہہ ز نم داشتن
گریہ ام از بیکسیست بو کہ دریں پیچ و تاب تن بردانی دہد نامہ ز نم داشتن

غالب آوارہ نیست گر چہ پیش سزا
خوش بود از چوں توئی چشم کرم داشتن

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو — کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن — جوئے بہ خیاباں رو سیلے بہ بیاباں شو

ہم خانہ بہ ساماں بہ ہم جلوہ فراواں بہ — در کعبہ اقامت کن در بتکدہ مہماں شو

آوازۂ معنی را بر ساز دبستاں زن — ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو

افسانۂ شادی را انگیسر خط بطلاں کش — غمنامۂ ماتم را آرایش عنواں شو

گر چرخ فلک گردی سر بر خط فرماں نہ — ور گوئے زمیں باشی وقف خم چوگاں شو

جاں داد بنغم غالب خوشنودی روحش را
در بزم عزائے کش در نوحہ غزل خواں شو

(باقی آئندہ)

اسپین کا عہد سعادت

اسلامی تہذیب و تمدن علوم وفنون اور صنعت وحرفت

انھیں صفحات میں محمد کرد علی رئیس مجمع العلمی عربی دمشق کی کتاب غابر الاندلس وحاضرہا کا ذکر آچکا ہے اکتوبر ۱۹۲۵ء کے جامعہ میں عربوں کی رواداری کے عنوان سے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا گیا تھا آج ایک دوسرے باب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

عبدالسلام قدوائی

اہل اندلس کی قوت ایجاد واختراع مکانوں اور کارخانوں میں ہندسی کمالات دکھانے ان میں نقش ونگار بنانے اور آراستگی و پیراستگی پیدا کرنے ہی پر ختم نہیں ہوئی کیونکہ یہ عام باتیں تو اس عظیم الشان دولت وثروت کا لازمہ تھیں جو انھیں زراعت وتجارت اور صنعت وحرفت سے حاصل ہوتی تھی۔ انھوں نے اس ابتدائی ارتقار پر قناعت نہیں کی بلکہ اس معمولی اور لازمی مدنیت سے قدم آگے بڑھایا اور کیا صنعت کیا تجارت کیا زراعت سبھی میں ایجاد واختراع کے دریا بہا دئے۔

زراعت وباغبانی میں ان کی سعی وکوشش کا یہ عالم تھا کہ شام سے قسم قسم کے درخت طرح طرح کی ترکاریاں اور رنگ برنگ کے پھول منگوائے جن کا اس سے پہلے اس ملک میں کہیں وجود بھی نہ تھا جیسے کیلے۔ کھجور۔ چاول۔ روئی۔ شہتوت۔ شکر۔ زعفران۔ لیموں۔ کامیلیا اور گلاب ان لاتعداد اور انواع واقسام کی ایک مختصر فہرست ہے جن کی ترویج محض عربوں کی بدولت اندلس اور وہاں سے دوسرے مغربی ممالک میں ہوئی

کھیتوں پھولوں پھلوں اور ترکاریوں کی پیداوار و نگہداشت میں ان کا طریقۂ عمل یہی آج کا یورپین طرز زراعت وباغبانی تھا ان کی اس سعی وکوشش اور جدت وندرت عمل کا نتیجہ تھا کہ اندلس کا

معتدل و زرخیز ملک سال میں تین تین بار فصلیں لاتا تھا اور اپنے باشندوں پر خوش حالی فارغ البالی اور دولت و ثروت کے دروازے کھول دیتا تھا۔ ان کے نزدیک آباد و ویران اور بنجر و زرخیز کی کوئی تفریق نہ تھی۔ ان کی سعی و ہمت نے ساری مشکلیں اور صعوبتیں ختم کر دی تھیں، کنووں کی تعمیر، نہروں کے اجرا، بندوں کی بندش، حوضوں اور تالابوں کی درستی اور آبی خزانوں کے قیام نے قحط و خشک سالی کی طرف سے مطمئن کر دیا۔

صنعت و حرفت ان کی خاص چیز تھی صیقل گری کا فن تو وہ دمشق ہی سے لائے تھے چنانچہ اسپینی الفاظ damasquinage، damasquineric، damasquinerere اور damasquinure اس انتساب کو ظاہر کرتے ہیں۔ ریشم و کتاں بافی اور اس پر صورت گری بھی دمشق ہی سے آئی تھی damasser اسی انتساب کا اظہار ہے۔

قرطبہ کھالوں کی دباغت اور اشبیلیہ ریشم کے کام کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا۔ ۱۵۰۰ء میں اشبیلیہ کے اندر سولہ ہزار کارخانے قائم تھے جن میں ایک لاکھ تیس ہزار مزدور کام کرتے تھے لیکن عربوں اور یہودیوں کے اخراج کے ڈیڑھ ہی سو برس بعد ۱۶۷۳ء میں صرف چار سو کارخانے رہ گئے۔ مالقہ میں شیشہ کا کام ہوتا تھا اور شام تک وہاں کے برتنوں کی دھوم تھی۔ مرسیہ۔ دیباج، اونی کپڑوں اور نقش و نگار کی صنعت میں مشہور تھا وہاں صرف اونی کپڑوں کے چھ ہزار کارخانے تھے، قصبہ باجہ چمڑے اور کتاں کی صنعت کے لئے خاص تھا مرسیہ میں ریشم بافی کے آٹھ سو اور دیباج اور نفیس زریں ملبوں کی تیاری کے لئے ایک ہزار کارخانے کھلے ہوئے تھے۔ اسقلاطونی[۱]، جرجانی، اور اصفہانی کپڑوں کی تیاری کے لئے بھی اسی قدر کارخانے تھے حیرت انگیز عتابی معاجر (ایک قسم کی مہین چادر) اور بہترین خوب صورت اور خوشنما پردوں کی ساخت کے لئے بھی بکثرت مستقل قائم تھے۔ اس کے علاوہ لوہے، شیشے اور تانبے کے بیش بہا آلات اور لاجواب برتن بھی یہاں تیار ہوتے تھے۔

---

[۱] ۔ اسقلاطون روم کا ایک شہر تھا اس کی طرف یہ کپڑا منسوب تھا بعد میں خود کپڑا ہی اسقلاطون کہلانے لگا صاحب تاج العروس نے اسے رومی لفظ قرار دیا ہے۔

دیباج سازی اور نقش نگاری پہلے قرطبہ کا خاص ہنر تھا لیکن بعد کو اسپین مرسیہ سبقت لے گ
چنانچہ سارے اندلس میں کوئی شخص مرسیہ والوں کا سا دیباج تیار نہ کر سکتا تھا۔ سرقسطہ سمور کی کاریگری میں مشہور
اس خصوصیت کی وجہ سے اس کپڑے کا نام ہی سرقسطہ ہو گیا۔ ریشم و کتان کا کام تو سارے ملک میں ہوتا
مقام جیان میں حریر کے چھ سو کارخانے تھے۔ ریہ میں سماٹے تیار ہوتے تھے زیور اور آلات قرطبہ طلیطلہ
اور بجزیں ڈھالے جاتے تھے شاطبہ میں ۸۵۰ھ سے کاغذ بکثرت تیار ہونے لگا چنانچہ یاقوت لکھتا ہے

فی شاطبہ یعمل الکاغذ الجید ویحمل منہا
الیٰ سائر بلاد الاندلس

شاطبہ میں عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے
اور وہیں سے سارے اندلس میں لے جایا جاتا

مجوں لکھتا ہے کہ اندلس میں بہت سے مشہور کارخانے تھے جنھیں نعیا دایک قسم کا عماری سا
تیار ہوتا تھا یہ صنعت رومیوں سے آئی تھی اہل اندلس اسے مفصص کہتے تھے۔

اسی طرح جوں جوں تمدن قائم اور دیر پا ہوتا گیا صنعت و حرفت کے قدم بھی جمتے گئے ابن
کا بیان ہے کہ:۔

فانا نجد فی الاندلس رسوم الصنائع قائمۃ و
اصولہا مستحکمۃ راسخۃ فی جمیع ما تدعوا الیہ عوائد
امصارہا کالمبانی والطبخ واصناف الغناء واللہو
من الآلات والاوتار والرقص وتنضید الفرش
فی القصور وحسن الترتیب والاوضاع والبناء
وصنوع الآنیۃ من المعادن والخزف وجمیع
المواعین واقامۃ الولائم والاعراس وسائر الصنائع
التی یدعوا الیہا الترف وعوائدہ فنجدہم اقوم علیہا
والبصر بہا ونجد صنائعہا مستحکمۃ لدیہم فہم علی حصۃ موفورۃ
من ذلک وحظ متمیزۃ بین جمیع الامصار"

ہم اندلس میں تعمیر طباخی آلات رقص
سرود۔ فرشوں اور محلوں کی درستی بر تن
کی تیاری اور تمام دوسری ضروری صن
کو مضبوط و مستحکم حالت میں پاتے ہیں اند
اس بارہ میں بہت کافی حصہ ملا ہے ا
وہ اس بارہ میں تمام ممالک پر خاصہ امتیا
رکھتے ہیں۔

موسیو سدیو نے لکھا ہے کہ:۔

عرب اخلاق وعادات علم وفن اور صنعت وحرفت کے اعتبار سے اسپینیوں سے بدرجہا ترقی یافتہ تھے۔ ان کی طبیعت متین اور اخلاق بلند تھے ان میں کرم واخلاص تھا وہ احسان فراموشی سے ملوث تھے جو ان کے دشمنوں کو چھو بھی نہیں گیا تھا علاوہ خود داری وعزت نفس کے پتلے تھے اور ہمیشہ اس میں ممتاز رہے۔ اسپین میں عربوں کے علوم وفنون اور آئین وآداب اور تہذیب وتمدن نے ان کی عزت وعظمت اور قدر ومنزلت بہت بڑھا دی۔ اسی طرح زراعت وصنعت میں ان کے کارنامے شہرہ آفاق ہیں عقلی لذائذ سے ساری قوم کو عام ذوق تھا شعر ترقی نفس کا باعث تھا۔

وہ تمام مصنوعات پر آمر و مامور اور مالک وصانع کا نام کندہ کرتے تھے تاکہ دونوں کا نام نیک یادگار رہے اور قوم کی نظر میں دونوں مستحق تعریف ہوں۔

ہندسہ وموسیقی نے ان کے یہاں بڑی ترقی پائی آج تک یورپ میں ان کے اسالیب وانداز نیا پروس دیا اور ان کے بنائے ہوئے نقوش پر حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اندلس میں موحدین کو فن تعمیر سے خاص ذوق تھا انھوں نے جامع مسجدیں اذان کے منارے، شفاخانے سرائیں اور پبلک عمارتیں گوشہ گوشہ میں تعمیر کرائیں۔ انھوں نے راستے بنائے پل تعمیر کئے بند باندھے نہریں نکالیں اور کنوے کھودے۔

وہ اپنی کانوں سے زیبق۔ توتیا۔ لوہا سیسہ چاندی اور سونا نکالتے تھے گندھک نکال کر اور اس سے کرم تیار کرتے تھے جو اپنے رنگ ولطافت کے لئے ساری دنیا میں مشہور تھا اس کے علاوہ وہ لوگ طرح طرح کے بے نظیر وبے مثل رنگ تیار کرتے تھے جس سے ریشمی اونی اور سوتی کپڑے رنگے جاتے تھے وہ کشتیوں پر اپنی پیداوار اور مصنوعات ممالک عربیہ بلکہ ان سے گزر کر مشرق ومغرب سارے عالم میں پہنچاتے تھے اس غرض سے ساحلوں پر ان کے جہاز بھی تیار رہتے تھے تاکہ تجارتی معدنیات غلہ اور پھل وغیرہ اشیاء یورپ اور افریقہ تک پہنچا سکیں۔

کاباتوں کا بیان ہے کہ:۔

"اسپین کے مادی معاملات میں عربی تمدن کا نمایاں اثر تھا گو ان کے زرعی وسائل جن کی مدد سے انھوں نے بنجر و ویران اور خشک و بے آب و گیاہ زمینوں کو سیراب و زرخیز اور سرسبز و شاداب بنا دیا تھا کلیۃً عربی ایجاد و اختراع نہ تھے مگر انھیں تعمق و خرابی سے عربوں ہی نے عروج و کمال تک پہنچایا تھا۔ انھوں نے حریر۔ چمڑے۔ بلور۔ اون۔ روئی۔ کتاں اور شکرسازی کے کارخانے قائم کئے معابد عامہ کی بنیاد ڈالی جو آٹھ سو برس گزر جانے کے بعد آج بھی اقوام عالم کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث ہیں۔

ایک دوسرا یورپین عالم کہتا ہے کہ:۔

"عربی تہذیب و تمدن کے زمانے میں صرف صناعوں اور کاریگروں کی تعداد چار کروڑ تھی حالانکہ آج اسپین کی کل آبادی صرف دو کروڑ دس لاکھ اور پرتگال کی ساٹھ لاکھ ہے۔ اس عہد میں اس عظیم الشان تمدن کی بنیاد پڑی جس کے آثار آج تک لوگوں کے حیرت و استعجاب کا باعث ہیں۔ اس عہد میں عربوں کی ہندسہ دانی کی برکت سے ویرانے معمور اور کھیتیاں سرسبز و شاداب تھیں پانی ہر حصہ میں پہنچایا جاتا تھا جس سے ہر قسم کی زمینیں تر و تازگی حاصل کرتی تھیں"۔

ایک دوسرے شخص کا بیان ہے کہ:۔

عربوں کا عہد حکومت اسپین کا بہترین اور مبارک ترین زمانہ تھا کیونکہ اس عہد میں ان کے فن آب رسانی نے زراعت کو ترقی دی ان کی مہارت و حسن کار نے باغبانی کو کمال پر پہنچایا۔ ان کی محنت و کارکردگی نے معدنی اشیاء برآمد کیں اور زمین کی دولت شکم سے پشت پر آگئی ان کی توجہ نے شہروں کی طرح دیہاتوں کو بھی آباد و بارونق بنا دیا۔

صنعت و حرفت زراعت و باغبانی اور تجارت و کان کنی کی اس کثرت و ترقی کے بعد اگر ۳۰۲ ہجری میں دو کروڑ دینار خراج و مالگزاری میں وصول ہوا تو تعجب کی کیا بات ہے ابن حوقل کہتا ہے۔

لست اخشک علی ما یوجبه النظر و تواطابه الخبر فیا | مجھے عقلاً و روایتاً اس میں ذرہ بھی شک نہیں

جمیه الحکم بعد هلاک ابیه من خدمه والصادرین للذین | کہ حکم نے اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان تمام

انوانی جملتہ عن اسباب الاندلس ولوازمھا
جبایاتھا وخراجھا واعشارھا وصدقاتھا و
والیھا تمام اربعین الف الف دینار وبلغ خراج
الاندلس علی عھد عبدالرحمٰن الثالث ۱۲ ما کانت
ولتہ غنیا ....۵۴۸۶۲۲ دیناراً۔"

اور کارپردازوں سے خراج لیا جبایہ عشر
وصدقات وغیرہ کی آمدنی چار کروڑ دینار
وصول کی عبدالرحمٰن ثالث کے عہد میں اندلس
کا خراج ....۵۴۸۶۲۲ دینار تک پہونچ چکا
تھا۔

ابن خلدون نے بعض ثقات مورخین اندلس سے روایت کی ہے کہ:۔

ن عبدالرحمٰن الناصر خلف فی بیوت اموالہ خمسۃ
لاف الف الف دینار مکررۃ ثلاث مرات
ون جملتھا بالقناطیر خمسمأۃ الف قنطار وکان
ھذا الملک یقسم الجبایہ اثلاثاً ثلث للجند وثلث
للبناء وثلث مدخر وکان جبایۃ الاندلس یومئذ
ن الکور والقری خمسۃ آلاف الف وار بعماۃ
الف وثمانین الف دینار ومن التون والتخلص
سبعماۃ الف وخمسۃ وستین الف دینار واما اخماس
س الغنام فلا یحصیھا دیوان وانتھت جبایۃ
ترطبۃ ایام ابن ابی عامر الی ثلاثۃ آلاف الف
دینار بالانصاف۔"

عبدالرحمن الناصر نے بیت المال میں پچاس
کھرب دینار مرنے کے بعد چھوڑے جو قنطار کے
حساب سے پانچ لاکھ قنطار ہے اس بادشاہ نے خراج
کے تین مصارف مقرر کر رکھے تھے ایک ثلث
لشکر پر دوسرا ثلث عمارت پر صرف کرتا تھا اور
تیسرا ثلث جمع کرتا تھا اس زمانے میں کل اندلس
کا خراج چون لاکھ دینار تھا ستون وتخلص سے سات
لاکھ ۶۵ ہزار دینار وصول ہوتے تھے اس کے
علاوہ مال غنیمت تھا جس کا حساب نہیں رکھا جاتا تھا
ابن ابی عامر کے عہد میں قرطبہ کی آمدنی تین لاکھ دینار
بالانصاف تھی۔

اہل اندلس کو علوم کے استخراج و استنباط میں خاص مہارت تھی چنانچہ عباس بن فرناس حکیم اندلس نے اپنے گھر میں مصنوعی آسمان بنایا تھا جس میں وہ ستارے، بادل، برق و رعد جملہ فلکی مناظر دکھاتا تھا اسی حکیم نے اندلس میں پتھر سے شیشہ بنانے کا طریقہ نکالا یہی پہلا شخص ہے جس نے موسیقی میں مشہور و معروف آلہ منتقال ایجاد کیا تاکہ اوقات کا علم بلا مثال کے ہو اس نے اپنے آپ کو ہوا میں اڑانے کا بھی انتظام

کیا تھا چنانچہ اس نے اپنے جسم کو پروں سے ڈھانکا پھر وہ مانند لگائے اس کے بعد وہ دور تک اڑا پھر نیچے گر گیا۔ گویا یہ پہلا شخص ہے جس نے ہوا میں اڑنے کی کوشش کی اور اس طرح فن طیران کا موجد کہا جا سکتا ہے۔ اہل قرطبہ وہ پہلے لوگ ہیں جنھوں نے میونسپلٹیوں کا انتظام کیا اور اسی طرح قرطبہ ہی میں سب سے پہلے راتوں کو روشن کرنے کا سامان ہوا۔

غرناطہ میں ملوک بنی احمر کے دور حکومت میں جب علوم و فنون نے ترقی کی تو ان لوگوں نے توپیں ایجاد کیں جن سے اب تک دنیا نا واقف تھی۔ ان کی توپیں جو غرناطہ میں استعمال ہوئی تھیں آج تک اسپین کے ہر ایک عجائب خانے میں محفوظ ہیں۔

اندلس ہی سے چھاپہ کا طریقہ ایجاد ہوا جس سے زیادہ انسانیت کے لئے کوئی چیز مفید ثابت نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک اندلسی شخص اس بارہ میں سبقت رکھتا ہے۔ طبع و نشر کا مفصل طریقہ تو ہم تک نہیں پہنچ سکا البتہ اجمالاً اتنا معلوم ہے کہ عبد الرحمن بن بدر وزیر خلیفہ الناصر اپنے گھر میں فرامین کے مسودے لکھتا تھا اس کے بعد انھیں چھپنے کے لئے بھیج دیتا تھا جب چھپ کر اس کے پاس آجاتے تو پھر انھیں عمال کے پاس روانہ کر دیتا جسے وہ نافذ کرتے۔

اگر اس طبع سے مراد یہی مشہور طباعت ہی جیسا کہ ہمارا خیال ہے تو ابن بدر عربی کو مشہور جرمن مخترع طباعت گوٹنبرگ پر چار سو برس کی سبقت حاصل ہے۔

مورخین کا بیان ہے کہ سلاطین غرناطہ موجدین کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتے تھے تاکہ ہر شخص کوشش کرے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی سعی کرے۔ بسا اوقات فرانس کے کولبیر اور لوئی چہاردہم کی طرح ان لوگوں کو خاص حقوق اور امتیازات بھی عطا ہوتے تھے۔

اہل اندلس صنعت و حرفت کے متعلق آسان اور عام فہم رسالے لکھتے تھے تاکہ عام طور سے کاروبار میں سہولت پیدا ہو۔ وہ ان رسالوں میں ترکیبیں اتنی آسان اور سہل العمل لکھتے تھے کہ صناع اور کاریگر اپنے پیش نظر کاموں میں آسانی سے فائدہ اٹھا سکیں۔

نقش و نگار کی طرح انھوں نے خاص قسم کے خطوط ایجاد کئے تھے جو مشرقی ممالک میں بہت پسند کئے

جاسکتے تھے۔

صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے ساتھ علمی و ادبی دلچسپی میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھے جس کی تفصیل پچھلے باب میں گذر چکی ہے۔ نظم و نثر میں ان کے طبقے کسی واقفکار سے پوشیدہ نہیں کوئی شہر خوش فکر شاعروں اور فصیح و بلیغ انشا پردازوں سے خالی نہ تھا شلب کی طرح کے چھوٹے اور کاروباری شہروں میں بھی بہت کم ایسے لوگ مل سکتے تھے جو شعر نہ کہتے ہوں یا ادبیات کی خدمت نہ کرتے ہوں اگر آپ ایسے کاشتکار کے پاس سے بھی گذرتے جو بیل سے کھیت جوتنے جا رہا ہو اور اس سے تازہ اشعار کی فرمائش کرتے تو فوراً موزوں کر کے سنا دیتا اور جس کے معنی دریافت کرتے فوراً بتا دیتا۔ وادی آش کے لوگ خصوصیت کے ساتھ ادب و شعر سے گہرا تعلق رکھتے تھے ایک باخبر اور واقفکار شخص نے اس ذوق شعری کی کتنی صحیح توجیہ کی ہے کہ درختوں کی سرسبز و شاداب قطاریں دریاؤں اور نہروں کی سبک خرامی پرندوں کی نغمہ سنجی عیش و نشاط کی فراوانی جس قدر انھیں میسر تھی دوسروں کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہ تھا یہی وہ حالات تھے جنھوں نے ان کے ادبی ذوق کو بہت ہی بلند کر دیا تھا۔ اس مذاق سخن کے ساتھ وہ نقاد بھی بے مثل تھے یہی وجہ تھی کہ وہ سوقیت سے محفوظ رہے۔ اس فن میں بہت سے صاحب کمال پیدا ہوئے اور بہت سی مفید کتابیں تصنیف کیں۔

اس کے علاوہ قرآن، کتابت، حساب اور دوسرے علوم کی تعلیم کے لئے مسجدوں میں درس کے حلقے قائم تھے جن میں داخلے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی فلکیات، جغرافیہ۔ لغت۔ طب۔ نحو۔ طبیعیات کیمیا اور علم موالید ثلاثہ وغیرہ سے انھیں پوری واقفیت تھی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ صرف قرطبہ کی دس لاکھ آبادی میں اسّی عام مدرسے تھے۔ موحدین نے اندلس بھر میں عام اور اعلیٰ مدارس بکثرت قائم کر دیئے تھے علماء پر ان کا فضل و احسان عام تھا۔ ان کی تمنا تھی کہ قرطبہ پھر عہد اموی کی ساتھ رونق و عظمت حاصل کر لے۔

حکم نے قرطبہ میں غربا و مساکین کے ستائیس مدرسے قائم کئے تھے جن میں اتالیق و معلم مقرر تھے جو غریب بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے روزینے اور وظائف مقرر تھے۔

اوران سے سعی و کوشش اور وعظ و نصیحت کا وعدہ لے لیا جاتا تھا اور اس ساری کوشش سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے سوا اور کچھ مقصود نہ تھا ابن شخفص نے اپنے ان اشعار میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

و ساحة المسجد الاعلی مکللة　　مکاتب للیتامی من نواحیھا
لوکمنت سور القران من کلم　　نادتک یاخیر تالیھا وداعیھا

رضوان نصری ۷۵۰ھ ہجری میں غرناطہ میں مدرسہ کی بنیاد ڈالی اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا لوگ جیسا کہ ابن سعید کا بیان ہے مسجدوں میں تمام علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے وہ علم کو محض علم کی خاطر حاصل کرتے تھے اس سے کسی نفع کی تمنا نہیں رکھتے تھے اسی وجہ سے کثیر العلم وسیع النظر اور دقیقہ رس علماء پیدا ہوتے تھے کیونکہ وہ محض اپنی خواہش طبعی کی بناء پر اپنا کاروبار چھوڑ کر اور اپنے پاس سے خرچ کرکے علم حاصل کرتے تھے۔

بہت سے سلاطین ایسے تھے جو اعلان کر دیتے تھے کہ جس نے فلاں کتاب حفظ کر لی اسے اس قدر انعام ملے گا اس انعام کی تمنا میں سیکڑوں اشخاص اسے یاد کر ڈالتے تھے۔ مذاق ادب ساری قوم میں عام تھا بہت سے شعراء ملوک و امراء کی شان میں مدح و ثنا کے قصائد لکھتے اور انعام واکرام سے مالا مال ہو جاتے اور مدتوں وابستہ دولت رہتے۔

اس عام تعلیم کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم بھی ان کے یہاں شائع وضائع تھی۔ بہت سی ایسی عورتیں تھیں جنھیں متعدد دیوان ازبر تھے وہ آج کل کی مغربی عورتوں کی طرح بلاتکلف نظم و نثر نگاری پر قدرت رکھتی تھیں۔

اس علم کے بعد کہ مدارس کا جال شہروں سے دیہاتوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے جس کا ایک یورپین مورخ نے بڑے تعجب سے ذکر کیا ہے کہ اسلامی اسپین میں گنتی کے چند آدمیوں کو چھوڑ کر پوری آبادی بخوبی لکھ پڑھ سکتی ہے یہ اس زمانہ کا حال ہے جب شماسہ کے چند افراد کو چھوڑ کر تمام یورپ کے اعلیٰ ترین افراد بھی اُمّی و ناحرف شناس تھے۔

اہل اندلس کو مطالعہ کے لئے کتابوں کے عام کرنے کا خاص شوق تھا۔ ان کے عام وخاص کتب خانے تھے جن سے عوام وخواص بھی فائدہ اٹھاتے تھے قرطبہ کتابوں کی کثرت کے اعتبار سے اندلس کا سب سے بڑا شہر تھا یہاں کے لوگ کتب خانوں سے خاص شغف رکھتے تھے یہاں تک کہ یہ وہاں امارت وریاست کی علامتوں میں شمار ہوتے تھے کوئی گھر نہ تھا جو نفیس کتابوں سے خالی ہو حکم ثانی نے مطالعہ کرنے والوں کے لئے بہت سے کتب خانے قائم کئے تھے اس کے گماشتے مشرقی ممالک میں پھرا کرتے تھے اور کتابیں حاصل کرتے رہتے تھے مصنفین جیسے ہی اپنی تصنیف ختم کرتے فوراً ایک یا متعدد نقلیں ہوکر دربار خلافت میں پہنچ جاتی تھیں اور اس طرح ملک کسی عقلی اور دماغی محنت کے فوائد سے محروم نہ رہتا۔ اس کا کتبخانہ چار لاکھ کتابوں پر مشتمل تھا صرف فہرست چوالیس جلدوں میں تمام ہوئی تھی۔ سلاطین اندلس اکثر مشرقی مصنفین ومولفین کو گرانقدر انعامات وصلے عطا کرتے تھے تاکہ وہ اپنی کتابوں کے مقدموں میں یہ ذکر کریں کہ ہم نے یہ کتابیں سلاطین اندلس کے کتبخانوں کے لئے لکھی ہیں۔

علوم ومعارف کی نشر واشاعت کی غرض سے آج کل کی اکاڈیمیوں اور سوسائٹیوں کی طرح سے علمی مجلسیں قائم تھیں جن سے علم وفن کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔

مظفر بن افطس امرا میں ادب کا سب سے بڑا عالم تھا علوم وفنون کے تذکرے میں اس کی کتاب مظفری مشہور ہے جو پچاس جلدوں میں ہے۔ وہ اپنے بیٹے عبداللہ ابوالحزم بن علیم اور اس طرح کے دوسرے باذوق حضرات کو مباحثہ ومناظرہ کے لئے جمع کرتا تھا کہ آپس میں افادہ واستفادہ کا موقع ملے اسی طرح ہشام کے عہد حکومت میں ابوعامر امیر اندلس کی ہفتہ وار مجلس بحث وکلام مشہور ہے جس میں اس عہد کے علمار جمع ہوکر بحث اور مذاکرے میں حصہ لیتے تھے۔ خود حکم نے قصر مروان میں اسی طرح کی ایک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کی تقلید میں امرار دولت نے بھی متعدد مجلسیں قائم کی تھیں۔ احمد بن سعید نے طلیطلہ میں ایک علمی اکاڈمی قائم کی جس میں طلیطلہ اور اس کے قرب وجوار کے چالیس عالم سال میں تین مہینے اکٹھے ہوتے اور جلسے کرتے جلسے کی ابتدا کلام پاک کی چند آیتوں سے ہوتی پھر انھیں آیتوں کی تفسیر ہوتی اس سلسلہ میں مختلف علوم وفنون پر بحث ہوتی۔

حیوانات و نباتات کی جانب بھی توجہ تھی کبھی جانوروں سے ضاہلیوں کی لڑائی سے لطف اندوز ہوتے۔

مختلف قسم کے نباتاتی اور حیوانی باغات و عجائب خانے تیار کرائے تھے جن میں انواع کے پودے اور حیوانات جمع تھے۔ صور و تماثیل سے بھی دلچسپی تھی فتح سے پہلے کے اس قسم کے تمام عبرت پذیری کے لئے باقی رہ گئے تھے جوں جوں حضارت و مدنیت بڑھتی گئی اس کا ذوق بھی بڑھتا گیا عمارتوں سے عیاں ہے۔

اندلس کے عربی تمدن کا یہ اجمالی بیان ہے اب سوچو کہ تمہارے ذہن میں تہذیب و تمدن و عمران، علوم، معارف، طرق و اسالیب اور طرز و ادا کا کوئی ایسا خاکہ قائم ہو سکتا ہے جسے سلاطین، امراء و ارباب ریاست اور عام اہالی و باشندگان اندلس عملی قالب میں نہ ڈھال چکے ہوں۔

فلسفۂ عرب و یورپ اور اس کا تدریجی ارتقا

"فلسفہ کی متعدد اور مختلف تعریفوں سے قطع نظر کر کے" اس مضمون کے لکھنے سے میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ فلسفۂ عرب و یورپ کے تدریجی ارتقاء کو بیان کر دوں، اس لئے میں نے کسی خاص نظم و ترتیب کا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے، بلکہ فلسفۂ عرب و یورپ کے نظریوں کو ایک جا جمع کر دیا ہے، اگرچہ وہ باہم ایک دوسرے سے غیر مرتبط ہیں، صرف اس لئے کہ نظروں کے سامنے ایک خاکہ آجائے اور اس سے ہماری سہل انگاری اور دوسروں کی سعی عمل کا اندازہ ہو۔ ان ابتدائی جملوں کے کہنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اصل مضمون کے پہلے جزیعنی فلاسفۂ عرب کے متعلق اجمالاً یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ادوار فلسفہ کے کس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

آغاز مقصد سے پہلے چند ابتدائی و تمہیدی کلمات کا لکھنا اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ ارتقاء فلسفہ کے سلسلہ میں ربط کا ایک مجمل سا خاکہ ذہن نشین ہو جائے

فلسفہ نے جس وقت سے علمی حیثیت اختیار کی ہے، اس وقت سے لے کر اس وقت تک مختلف ناموں کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے، اس کا اندازہ فلسفہ کے مختلف ازمنہ میں مندرجہ ذیل مصداقات سے ہو سکتا ہے:۔

ایجابیت، انتقادیت، ارتیابیت، اذعانیت، عقلیت، استقرائیت، تصوریت، حقیقیت، مادیت، تصوریت، روحانیت، .... انھیں مصداقات سے فلسفہ کے مختلف مذاہب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو ارتیابی، حلولی وغیرہ وغیرہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

آسانی کی خاطر فلسفہ کے مختلف عہود و قرون مان لئے گئے ہیں جس طرح کہ آغاز آفرینش سے لے کر اس وقت تک زندگی کو مختلف زمانوں اور عہدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ فلسفہ کے تین عہد تسلیم کئے گئے ہیں۔ عہد قدیم، عہد وسطانی، عہد جدید۔

عہد قدیم میں چار مدتیں رکھی گئی ہیں۔

مدت اول۔ قبل سقراط۔ اس میں خاص الہیات یا زمانہ فطرت، نفی حدوث اور توحید
سے بحث کی گئی ہے۔

مدت ثانیہ، عہد سقراط۔ اس میں انتقادیت، فلسفہ نفس سے بحث ہوتی ہے۔

مدت ثالثہ۔ زمانہ بعد از ارسطو، مدت رابعہ، نوفلاطونیت

عہد وسطانی میں بھی چار مدتیں ہیں لیکن اس عہد کے تغیرات کو صرف دو دوروں
گیا ہے۔

دور اول، فلاطونی عیسوی دینیات کا عہد

دور ثانی، مشائی مدرسیت کا زمانہ

اس کی پہلی مدت کا آغاز تکوین فلسفہ مدرسیہ سے ہوتا ہے۔ عہد وسطانی کی اسی پہلی مد
فلاسفہ عرب کا بھی شمار ہے، جن کے ذکر سے اصل مضمون کی ابتدا ہوتی ہے۔

مدت ثانیہ مدرسیت کا زمانہ ہے، مدت ثالثہ انحطاط فلسفہ مدرسی کا، اور مدت رابعہ نہضت

عہد جدید کا پہلا دور از سرتاپا الہیات سے لبریز ہے، دوسرے دور میں تنقید کا آغاز ہوا
عہد جدید کے دور ثانی کو عہد تنقید کہتے ہیں۔

فلسفہ عہد جدید کی بھی کئی مدتیں ہیں،

پہلی مدت میں فلسفہ مدرسی، تجربی، اور انتخابی آتا ہے، دوسری میں فلسفہ فرانس
مذہب حسی، مادی، عقلی، اقتصادی وغیرہ، فلسفہ انگلستان میں مذہب تصوری، ارتیابی، وج
افادی، فلسفہ جرمن، اور فلسفہ حلول آتے ہیں، تیسری مدت، فلسفہ جدید کا تیسرا دور سمجھا جانے لگا
اس کا تعلق بھی فلسفہ جرمن، فرانس، اور انگلستان سے ہے۔

تعلیم عرب | یہ تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ عربوں نے فلسفہ اور مختلف علوم کو یونانیوں سے حاصل کیا، ج
یورپ نے مسلمانوں سے، اور ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر غیر عالم جاننے والے سے اکتساب علم

(یونانیوں نے مصریوں سے تحصیل علم کی غرض عرب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے فلسفہ اور ہر اس علم کو جو یونانیوں کے پاس تھا، انھیں سے حاصل کیا۔ اقتضائے عقل بھی یہی ہے، کہ

ہر کجا چشمۂ بود شیریں   مردم و مور و مرغ گرد آیند

بعثت نبوی سے پہلے عرب فلسفہ تو کیا، شاید اس کے نام سے بھی ناواقف تھے، اور تقریباً یہی حالت ان کی دوسرے علوم میں تھی۔ ہاں میدان شاعری کے مرد تھے، اور ان کا شب و روز کا یہی ایک مشغلہ تھا اچھے سے اچھے اشعار کہہ لینا ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔

بعثت نبوی کے بعد گو یہ حالت نہ رہی تھی مگر پھر بھی ان کی حد پرواز ہیئت سے آگے نہ بڑھی تھی لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ آگے بڑھ ہی نہ سکتے تھے، بلکہ ضرورتاً اور باقتضائے وقت وہ اپنی کوششوں کو مذہبی تعلیمات تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔

۷۵۰ء میں جب کہ بنو امیہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور تاج و تخت ان کے قبضے سے نکل کر بنو عباس کے قبضے میں آیا تو ان کا پہلا حکمران اگرچہ اپنے وقتی مشاغل کے باعث علم کی طرف کوئی نمایاں پیش قدمی نہ کر سکا اور اسی طرح اس کے بعد دوسرے عباسی حکمران بھی کسی وجہ سے اپنی توجہ ادھر مبذول نہ کر سکے لیکن سلسلۂ عباسیہ کا پانچواں حکمران ہارون الرشید اقتصادی اور علمی دونوں صفوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جس طرح اس کے زمانے میں صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی، اسی طرح علم کا بھی چرچا ہوا۔ ہارون رشید کی صنعتی دلچسپیوں میں اس نادر گھڑی کا خاص طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے جو اس نے شاہ شارلیمن کو بطور تحفہ کے بھیجی تھی۔

عہد عباسی اپنی طوالت عمر کی وجہ سے بہت سے کارہائے نمایاں کا حامل ہے، بہت ممکن ہے کہ امویوں کو اگر اس قدر وقت ملتا، تو ان کی علمی موشگافیاں صرف حدیث و تفسیر، شعر و شاعری اور طبابت تک محدود نہ رہتیں، اسے عباسیوں کی خوش قسمتی ہی سمجھنا چاہیئے کہ ان کا عہد علمی حیثیت سے بھی اس قدر درخشاں ہے معقولات کے ایک بہت ہی اہم جزیعنی فلسفہ کی ابتدا نے ان کے عہد میں ایک بہت بڑی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔

میں اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ مسلمانوں (عرب) نے فلسفے کے علاوہ اور علموں کو بھی دوسروں سے لیا

ہی طب ہی کو لیجئے، گو وہ ایک عرصے سے مسلمانوں میں آچکی تھی، مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اسے بھی یہودیوں اور عیسائیوں سے لیا، اور درحقیقت یہ لوگ اس زمانے میں بھی جب کہ مسلمان طبیب ہونے لگے تھے، مسلمانوں سے کہیں زیادہ قابلیت رکھتے تھے، منصور کے دربار میں دو عیسائی طبیبوں کا رہنا اس کا بدیہی ثبوت ہے، ان دونوں طبیبوں کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ یہ علم ہیئت میں بڑی مہارت رکھتے تھے" اسی لئے منصور نے جب کہ اسے یہ معلوم ہوگیا کہ یہودی اور عیسائی بہت سے علوم کے حامل ہیں، تو بڑے بڑے انعامات دے کر غیر زبانوں سے تراجم کرائے۔

۱۷۰ھ میں جب ہارون رشید تخت نشین ہوا، تو اس کے دربار میں اگرچہ شعرا کی بہت قدر ہوتی تھی لیکن اسی کے ساتھ دوسرے باکمال حاملانِ علوم کی بھی عزت افزائی کی جاتی تھی، آخر اسی کے سفرا نے روم۔ ارمن۔ شام اور مصر میں تلاش علم کی اور یونانی زبان میں علوم و فنون کی جس قدر کتابیں مل سکیں، ہر ممکن طریقہ سے حاصل کیں اور ان کے تراجم کروائے۔

البتہ مامون نے ایک قدم اور آگے کو بڑھایا، یعنی یونانی زبان کے علاوہ سنسکرت سے بھی تراجم کرائے اسی کے زمانہ میں ایک ایسا مدرسہ بھی قائم ہوا جس میں صرف ترجمہ کا کام ہوتا تھا اور ترجمہ کرنے والے یہی مذکورالصدر اشخاص ہوا کرتے تھے۔ افلاطون۔ ارسطو۔ بقراط۔ جالینوس وغیرہ کے تراجم حنین عبادی عیسائی نے کئے جو مدرسہ تراجم کا صدر تھا۔

مامون نے جعفر، احمد، اور حسین، کو شام میں یونانی کتابوں کو تلاش کرنے کے لئے بھیجا، اور جو کتابیں وہ حاصل کر سکے، ان کے تراجم بھی انھیں سے کرائے۔

عباسیوں کی طرح فاطمیین مصر اور شاہان اندلس نے بھی فلسفہ کی ترویج کی، اور یونانیوں سے عربی زبان میں تراجم کرائے، اندلس نے بڑے بڑے علماء و فلاسفر پیدا کئے، ابن عربی صاحب فصوص الحکم وغیرہ۔ اندلس کی خاک پاک سے پیدا ہوئے، ابن رشد مشہور فلسفی اندلس کے دارالخلافہ قرطبہ میں پیدا ہوا۔ فلسفۂ ارسطو اپنی تکمیل میں بڑی حد تک اسی کی کوششوں کا شرمندۂ احسان ہے، اگرچہ اسے اپنے معاصروں کی مخالفانہ کوششوں سے بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر خلیفہ منصور کی ایک نظر عنایت نے ان سب

اضافہ کر دیا۔

بہر حال فاطمیین مصر کا شعبۂ علم میں بہت بڑا حصہ ہے، ان کی علمی کوششوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ کتابخانۂ شاہی میں ایک لاکھ علمی کتابیں موجود تھیں۔ اسی طرح اندلس کے کتابخانہ میں چھ لاکھ جلدیں تھیں

یورپ کا عربوں سے استفادہ۔ جب کہ بنو امیہ ناکامی کا منہ دیکھ چکے، اور وہ سلطنت جس کا لطف انھوں نے برسوں اٹھایا تھا بہ حسرت و یاس عباسیوں کے حوالے کر دی، تو عبدالرحمٰن جو خاندان بنو امیہ کا ایک رکن تھا کسی طرح اندلس پہونچا، اور وہیں اپنے لئے پناہ ڈھونڈی۔ پھر اس کی کوشش نے اندلس کی زمام حکومت بھی اسی کے ہاتھ میں دیدی۔ خاندان بنی امیہ کے ان نئے فرمارواؤں نے اندلس کو اس زمانہ کے ممالک متمدنہ کے ہم پلہ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور ان کی کوششوں سے آخر کار وہ ہر ایک لحاظ سے قابل صد رشک بن گیا۔ کیا اقتصادیات اور کیا حکمت و فلسفہ، غرضکہ ہر چیز میں وہ اپنی آپ نظیر تھا، قرطبہ کے متعلق تاریخ کی ورق گردانی سے بے انتہا معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔

مسلمان چونکہ اس وقت یورپ سے قریب تر تھے، اس لئے یورپ نے اس موقع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور ایک سچے طالب کی طرح عربوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، گو کہ ابتدا میں ان کی جانب سے کچھ زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا، مگر گیارھویں صدی کے قریبی زمانے میں کثرت کے ساتھ یوروپین اندلس کے فلسفی مدارس میں داخل ہو کر فلسفہ حاصل کرنے لگے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی سہولتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے عربی زبان سیکھی، اور اس کا ایک فائدہ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ زبان آجانے کے بعد ارسطو اور دوسرے فلاسفہ کی کتابوں کے تراجم میں آسانی ہوگی۔

سب سے پہلا شخص قسطنطین راہب تھا جس نے تیس برس تک عربوں میں بود و باش رکھی، اور جو اسے سیکھنا تھا سیکھا۔ پھر اپنے وطن کو واپس ہو گیا۔ اور وہاں پہونچنے کے بعد آخر عمر تک اس کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ عربی زبان کے تراجم اپنی زبان میں کرتا رہا، یورپ نے یہی نہیں کہ کسی خاص فن کو عربوں سے لیا ہو بلکہ ہر اس فن کو جو ان کے پاس نہ تھا اسے عربوں سے سیکھا۔

ڈانیال مورلی جو آکسفورڈ کا طالب علم تھا۔ اس نے ریاضی کی تحصیل طلیطلہ میں عربی زبان میں

کی، اور اس تحصیل سے جو کچھ اس نے فائدہ حاصل کیا، اس کا اظہار اس طور پر کیا کہ وطن پہنچ کر مدد کتابیں نظام عالم علوی، اور اصول ریاضیات تصنیف کیں، رابرطین جو بہت دنوں تک اندلس میں رہا، اور جس نے ملک عرب کی سیر بھی کی ہے، اس نے لاطینی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا، اڈلارڈ جو ہنری اول کے زمانہ میں عربوں میں ریاضی حاصل کرنے آیا تھا، اس نے عربی سیکھ کر ارسطو کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، اسی طرح اور بہت سے مترجمین نے ارسطو کی کتابوں کا فرانسیسی، جرمنی، اور ایطالی زبان میں ترجمہ کیا۔

ایک سو صدی تک تراجم کا سلسلہ جاری رہا، اور ہر شخص کی آخری کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ عربی سے ترجمہ کر دیتا تھا، مگر بارھویں صدی کے شروع میں عربی تراجم پر اکتفا کرنے کے بجائے اصل تحریر سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی، پیرس میں لوگ ارسطو کی اصل تحریر سے واقف ہونے لگے۔

ملٹون نے اس کو عملی جامہ اس طور پر پہنایا کہ اصل کتابوں کی تعلیم کا رواج جرمنی میں دیا، شروع شروع میں مذہبی لوگ مانع ہوئے، مگر بعد کو چند شرائط کے ساتھ فلسفۂ ارسطو کی تعلیم کی اجازت دے دی گئی، پیرس میں بھی منطق و الٰہیات وغیرہ کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی، انگلینڈ میں لوگ مشائیں کے فلسفے کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے لگے، اور وہی چیز جو کل تک غیر مانوس نظروں سے دیکھی جاتی تھی آج ان کی دلچسپیوں کی مرکز تھی؛

شاہ فریڈرک (ایطالیہ) نے بھی فلسفۂ قدیم کی اشاعت میں بڑی امداد دی، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس وقت کسی چیز کی کامیابی کی امید فضول ہے، جب تک کہ اس کی حمایت با اقتدار اور ذمہ دار لوگ نہ کریں شاہ موصوف نے بہت سی کتابوں کے تراجم اپنی زبان میں کرائے۔

ابن رشد، بوعلی سینا، ابو علی حسن، محمد بتانی، اور ابن اظہر کی کتابوں کے تراجم بھی انگریزی میں ہوئے۔ ابن رشد کی طب کی کتاب کا ترجمہ بھی لاطینی میں کیا گیا، جو کلیات ابن رشد کے نام سے مشہور ہے، جوانڈس نے قانون شیخ کا ترجمہ خاص شہر طلیطلہ میں لاطینی زبان میں کیا۔ بعد کو جاکبس دی پارسیس نے اس ترجمہ کی تصحیح کی، اور اس کی شرح بھی لکھی، جرمنی اور دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔

یہ اور اعد سنجیدہ انگریزوں کی اس کوشش کا بجائے اس کے کہ استقبال کیا جاتا، اور کشمکش شروع
یعنی جرمنی فلسفہ مشائین نے انگلستان میں قدم رکھا، تو فلسفہ اور مسیحیت میں تصادم شروع ہو گیا، اس
علمبردار مسیحیت کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے دلائل کے معاملہ میں وہی طریق اختیار کیا، جو متکلمین اسلام
کر چکے تھے۔ لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ دو چیزیں صورت اور طریق عمل کے لحاظ سے ایک معلوم ہوتی ہوں
کا اختلاط مفید ہونے کی بجائے بعض وقت مضر ہو جاتا ہے۔ یہ ہی حشر یہاں ہوا، فلسفہ و مذہب کا باہمی
ج اصلاح فلسفہ کے لئے مانع ہو گیا، اور جس طرح فلسفہ ارسطو کے مسلمانوں میں آنے سے مختلف مذاہب
ہوئے، اسی طرح عیسائیوں میں بھی۔

یزوں میں تجدید اور ارتقا کا فلسفہ | اوائل چودھویں صدی تک تو انگریزی دماغ فلسفہ ارسطو ہی کی شعاعوں
یرہ رہی، اور چاہئیے بھی یہی تھا اس لئے کہ کوئی بھی چیز ہو، جب تک ذہن میں راسخ ہو کر جلا نہ پا جائے،
میں ترقی وجدت کی آرزو بیکار ہے، چودھویں صدی کے درمیانی زمانے میں واقعی وہ اس وصف سے متصف
، اسی لئے اس وقت انھوں نے اپنے کاندھوں سے تقلیدی جوئے کو بھی اتار پھینکا، اور فلسفہ ارسطو کو
ے پرزے کر ڈالا۔

یہی وقت ہے جب کہ یورپ فلسفہ کی شاہراہ پر ترقی کا قدم رکھتا ہے۔

ارسطو جس کا فلسفہ تمام تر جدلی ہے، اس میں سب سے بڑی چیز استدلال قیاسی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ
یات سے جزئیات کو مستنبط کیا جائے لیکن ہر شخص کو معلوم ہے، کہ اس طور سے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا یقینی نہیں
جن قضایا سے نتیجہ کا استنباط کیا جا رہا ہے، ممکن ہے کہ وہ خود ہی غلط ہوں، ایسی صورت میں نتیجہ کی صحت معلوم
بہ فلسفہ استقرائی جس کا دوسرا نام استدلال شہودی ہے، یہ ایک چیز ہے جس سے اطمینان حاصل ہو سکتا ہے
ں لئے کہ جہاں مشاہدہ کے بعد نتیجہ کا استخراج کیا جاتا ہے، یا یوں کہیے کہ جہاں جزئیات سے کلیات بنائے
تے ہوں، وہاں غلطی کا کیا ذکر۔

ونج فلسفہ جدید کی علت | یہ ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے کہ جب تزکیہ دماغی سے ذہن میں صلاحیت پیدا ہو جاتی
، اور وہ حقائق کو زیادہ آسانی سے سمجھنے لگتا ہے، تو وہ ابتدائی خیالات کو اسی حد تک تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے

جہاں تک وہ صحیح طور پر مبادیات کا کام دیں، لیکن جن باتوں کا مدار وہمیات و ظنیات پر ہو، اُن کے تسلیم کرنے کی اس میں آمادگی ہی نہیں پائی جاتی۔

فلسفۂ قدیم سے انحراف کی بہت سی وجوہ ہیں، اس میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے دلوں میں مذکورہ بالا طریق استدلال کی بنا پر فلسفۂ قدیم سے انحراف کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، اسی کے ساتھ اس تجدید سے ان کا یہ منشا بھی تھا کہ اس طرح سے ایک بہتر مستقبل ہمارے ہاتھ آ جائے گا، اس کی تائید میں اپنے فلسفہ کے مبنی بر مشاہدات ہونے کو پیش کرتے تھے، اور ظاہر ہے کہ مشاہدہ محض ذہنی تمیز اور اختراع سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔

یہ دستور ہے کہ ہر شے اپنے بانیٔ اول کی طرف منسوب کی جایا کرتی ہے، اس لئے کہ وہی مرکز اعلیٰ ہوتا ہے مستقبل کی ترقیات کا؛ اسی لئے فلسفۂ جدید کی کامیابی کا سہرا راجر بیکن راہب کے سر پر باندھا جاتا ہے، یہ عربی اور کئی دوسری زبانوں کا ماہر تھا، اسی کے ساتھ تمام فنون فلسفہ پر حاوی، فلسفہ، ریاضی اور جر ثقیل وغیرہ میں کتابیں لکھیں، یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے فلسفۂ قدیم سے انکار کیا، اور ایک نئے فلسفہ کی بنا ڈالی لیکن اس کے زمانہ میں کوئی اہم تغیر نہیں ہوا۔

اوائل سترھویں صدی میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوا، فلسفۂ ارسطو کو درہم برہم کر دیا گیا، لیکن قدامت پرستوں کی بدولت ان مجددین کو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں، لیکن پھر بھی یہ لوگ اپنے صحیح جذبات کی ترجمانی سے باز نہ آئے۔ اس جماعت کے قوی تر بن جانے کی یہ صورت از خود نکل آئی کہ اس کے افراد نے اپنے لئے دو راہیں نکال لیں: ایک نظری جس نے صرف اصول کے بیان کرنے پر اکتفا کیا، دوسری عملی، جس نے ان اصول کو عملی جامہ بھی پہنایا۔

سب سے بڑا انقلاب علم ہیئت میں پیدا ہوا، عرب نظام بطلیموس کے مطابق زمین کو ساکن مانتے تھے اور یہی خیال اب تک ان میں موجود تھا، اگرچہ ۶۰۰ ق م میں فیثاغورس وغیرہ اس کے قائل تھے کہ آفتاب جو کرۂ ناری ہے، اپنی جگہ پر قائم ہے، اس کے گرد سیارے حرکت کرتے ہیں جو بالذات ظلمانی مستنیر بالشمس ہیں، اور یہ سیارے ہمارے عالم کی طرح معمور ہیں، اور تمام سیارات و ثوابت غیر متناہی

دساوی میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ایک ایسا وقت آیا کہ اس پرانے خیال کی جگہ نظام بطلیموسی نے لے
س لئے کہ عوام اسے ایک نوعی معما سمجھنے لگے تھے۔

حقیقت اگر زمانے کی دستبرد سے مستور ہو بھی جائے، تب بھی وہ حقیقت ہی ہے، اسی لئے وہ
لہور کے لئے موقع کی منتظر رہتی ہے، اوائل سولھویں صدی میں فیثاغورث کے خیالات کو حیات
حاصل ہوئی کلمبس کا امریکہ کو معلوم کرنا، اور اس کا معکوس القدم ہونا، نیز مجلن وغیرہ کا زمین کے گرد سیاحت
ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں جن سے زمین کا عملاً کروی ہونا ثابت ہوا، یہی چیزیں فیثاغورثیوں
کے لئے مبادیات نہیں۔

اس نظام کے احیا کی کوشش سب سے پہلے نیکولس کوپرنیکس نے کی، ۱۵۰۷ء میں وہ اس نظام
ت کا قائل ہوا، مگر مخالف حالات کی موجودگی میں اس نے اپنے اس نئے عقیدہ کے اظہار میں بہت
باط سے کام لیا، مگر اسی کے ساتھ وہ نظام جدید کی تحقیقات اور تجربات میں لگا رہا۔ اسی تحقیق
نتیجہ تھا کہ اس نے ۱۵۳۰ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نظام کی تشریح کی گئی تھی مگر مخالفین
خوف سے وہ اسے شائع نہ کر سکا۔ حالانکہ اس پر کافی وقت صرف کیا گیا تھا،

اس کے ایک دوست نے جو اس کا ہم خیال تھا ۱۵۴۰ء میں ایک چھوٹا سا رسالہ شائع کیا جس میں
س کے خیالات درج تھے لیکن مؤلف کا نام نہیں لکھا، جب اسے معلوم ہوا کہ لوگ اس پر معترض نہیں
ں تو پھر دوبارہ اپنے نام کے اندراج کے ساتھ شائع کیا، اور رسالہ میں درج کردہ خیالات کو بالتصریح
پرنیکس کی طرف منسوب کیا، لیکن اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ہی کوپرنیکس کو
ستوں کے اصرار پر اصل کتاب چھپوانا پڑی، اگرچہ وہ اس کتاب کو مطبوعہ صورت میں دیکھنے سے
پہلے ہی دنیا سے چل بسا مگر اس کی سعی بار آور ہوئی چونکہ کتاب ذرا دقیق تھی اس لئے عام لوگوں کو
س کی طرف کوئی خاص توجہ نہ ہوئی اور اسی لئے وہ اعتراضات کی زد سے بھی محفوظ رہی۔

برونو نے انگلینڈ میں اسی نظام کی تبلیغ کی، جس کی بنا کوپرنیکس نے اپنی کتاب میں رکھدی
ی ۱۵۸۴ء اس نے ایک کتاب تعدد عالم کے متعلق لکھی، جس میں اس نے ثابت کیا کہ ثوابت آفتاب

ہیں جن کے گرد کرات ظلمانی چکر کاٹ رہے ہیں۔ برونو کے اس خیال کا ماخذ کوپرنکیس کا وہ خیال
جس میں اس نے خلاء غیر متناہی کا اثبات کیا ہے، اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس خلاء میں کچھ کرات منور بالذا
ہیں اور کچھ ظلمانی بالذات، اور ان میں سے اکثر میں حیوانات اور دوسری چیزوں کی آبادیاں ہیں۔ اسی کا
بھی اعتقاد تھا کہ عالم کے لئے ایک روح ہے جو علت صوری ہے، اگرچہ علت مادہ نہیں، اور روح ہر اس چ
میں جس پر شیئیت کا اطلاق ہوتا ہے، موجود ہے، نیز ہر شے اجسام نباتیہ اور حیوانیہ سے ترکیب کی استعدا
رکھتی ہے، نیز یہ کہ مادہ، ام الوالید ہے اور تمام موالید صورتوں کے فنا ہونے کے بعد مادے سے جا ملتے ہ
اسی نے حرکت ارض کے اثبات کے لئے مختلف مقامات کا دورہ کیا، اور اگرچہ معاندین کی مخا
کوششوں سے وہ آگ میں جلا دیا گیا، مگر جس خیال کو اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، آخر و
مقبول ہو کر ہی رہا۔

گلیلیو جو ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا، اس نے بھی نظام کوپرنکیس ہی کی تائید کی، اور اپنی تحقیقات
سے نظام کوپرنکیس کو ثابت کر دکھایا، مگر مخالفین کی دستبرد سے یہ بھی نہ بچ سکا، زندان روما میں سڑ
جان دی۔ تعصب کی وجہ سے اسے گورستان احیاء میں دفن کرنے کی اجازت نہ دی گئی، اور جب اس
کے احباب نے چاہا کہ اس کی کوئی یادگار بنائیں تو پوپ نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ لیکن اس
تلافی انیسویں صدی میں اچھی ہوئی جب کہ ہر طرف اسی کے خیالات کی تائید ہونے لگی۔

غرضکہ کوپرنکیس اور گلیلیو نے اس خیال کو تو لوگوں کے دلوں سے دور کر دیا کہ زمین ساکن ہے، مگ
کہ کواکب کس طرح آفتاب کے گرد قائم ہیں، اسے کیپلر نے معلوم کیا۔ اس نے چند قوانین مرتب کئے "جو قو
کیپلر" کے نام سے مشہور رہیں، ان میں اس نے حالات کواکب کی توضیح کی ہے۔

اس کے بعد اسحاق نیوٹن پیدا ہوا، اس نے فیثاغورسی نظام کو اسی طرح مرتب کیا جس طرح ار
نے بطلیموسی نظام کو مرتب کیا تھا، وہ سترھویں صدی کے اس سب سے بڑے سائنسداں نے اپنے استاد لا
کی جانب اپنی نسبت تلمذ کو حق بجانب ثابت کرنے میں کوئی فروگذاشت نہیں کی، اسی کی فلکی تحقیقا
سائنس جدید کی بنیاد رہیں، ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۷ء میں وفات پائی۔

اس سلسلۂ جدید کی بہت ہی اہم کڑی جارج برکلے ہی ۱۶۸۵ء میں آئرلینڈ میں پیدا ہوا ۱۷۵۳ء
ں آکسفورڈ میں وفات پائی، اس کی مشہور تصنیفات "مکالمات ہیلاس وفاوس" اور "نکتہ رس فلسفی"
ں۔

اس نے اپنے فلسفہ کی بنا بھی "لاک" کے نظریۂ معرفت پر رکھی ہی، اس کا خیال ہی کہ .... "ہم اشیار
معرفت اُن ارتسامات سے حاصل کرتے ہیں، جو ہمارے تخیل نے ان کے لئے مہیا کئے ہیں، اسی لئے ان
ے احساس کو واقعیت سے تعبیر نہیں کر سکتے" اور ہم کہ سکتے ہیں کہ ..... اشیار کے لئے کوئی وجود فعلی نفس الامری
یا نہیں جاتا" اسی لئے ان کا واقعیت سے متصف ثابت کرنا ہمارے لئے ناممکن ہی، کیونکہ ہمارے علم کی انتہا
وہ خیالات ہیں جو ہمارے دماغ میں چکر لگاتے ہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان تصورات کو اپنے محل و موضوع
ے کس حد تک مطابقت ہی،

برکلے کا یہ خیال بھی ہی کہ .... "ادراک سے پہلے تصورات کوئی حیثیت نہیں رکھتے، لہٰذا موجود
ا اطلاق انھیں اشیار پر کیا جائے گا جو ان تصورات کا ادراک کرتے ہیں۔

لیکن اس نظریہ پر ایک بہت بڑا اعتراض ہے وہ یہ کہ .... پھر تو ہم ہی ہم عالم میں موجود
ہیں سے، اور کسی کو موجود کہ ہی نہیں سکتے؛ اس کے علاوہ اس کے فلسفہ میں دو ایک چیزیں اور بھی قابل اعتراض
نظر آتی ہیں، مثلاً ایک تو یہی .... کہ جب غیر مدرک اشیار کوئی وجود نہیں رکھتیں، تو خدشات کی بہت سی
مثیلوں کو چھوڑ کر پوچھا جا سکتا ہے، کہ ہم اپنے مدرسہ کی چار دیواری کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے جب کہ جاگنے
کی حالت میں تو اس کا ادراک قابل تسلیم ہے لیکن سو جانے کے بعد اگر اس کا ادراک ناممکن ہی، تو پھر اس کو
معدومیت سے محفوظ رکھنے کے لئے کون سے نفوس بر روئے کار آتے ہیں۔

بہرحال برکلے کی اس ساری کاوش کا دلی مقصد یہ تھا کہ مادیت کی زنجیروں کو توڑ کر انسانی رشتوں
کو روحانیت سے جوڑ دے، مگر اس کی زندگی ہی میں ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا جس نے اپنے زبردست دلائل
کے ساتھ روح کے وجود سے قطعاً انکار کر دیا؛ دنیا اسے ہیوم کے نام سے موسوم کرتی ہی،

سلسلۂ ارتقا جاری تھا کہ کانڈیاک کی باری آئی یہ والٹر کا ایک وفادار شاگرد تھا، اگرچہ لاک کے

فلسفے نے وانڈی کی بدولت فرانس میں رواج پایا، لیکن جہاں تک اس کی نشو و نما کا تعلق ہے وہ کنڈیاک ہی کا مرہون منت ہے، شہر گرنیویل میں ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۸۰ء میں وفات پائی۔

شاہ لوئی پانزدہم (فرانس) کے لڑکے کا اتالیق تھا، اسی کے لئے اس نے ایک سلسلۂ اسباق مرتب کیا تھا اس کی اہم تالیفات میں سے ایک تو "مبحث فی اصل المعارف البشریہ مطبوعہ ۱۷۴۶ء" دوسری کتاب المذاہب مطبوعہ ۱۷۴۹ء" تیسری کتاب الاحساسات مطبوعہ ۱۷۵۴ء" اور چوتھی "لغۃ الاعداد" ہے جس کا علم اس کی وفات کے بعد ہوا،

اول الذکر دونوں کتابوں میں کانڈیاک کی حیثیت صرف ناقل کی ہے، کیونکہ انھیں اس نے اپنے استاد لاک کے فلسفہ مبدء لغت و فکر کے ساتھ اس کے تعلق کو بیان کیا ہے، البتہ آخر الذکر دو میں اپنے استاد کی مخالفت کی ہے، اور بتلایا ہے کہ ہمارے قوائے اور معارف کے صدور کا تعلق صرف احساس سے ہے، اس کے ثبوت میں اس نے ایک بہت ہی دلچسپ مثال پیش کی ہے،

وہ کہتا ہے کہ "ایک ایسا بت فرض کرو، جس کی ترکیب ہم سے مشابہت رکھتی ہو، اور وہ صاحب عقل بھی ہو، مگر افکار سے خالی، پس جب کبھی اس کی قوت شامہ حرکت میں آئے گی، تو اس کی شمومیت کا انحصار اسی عضو میں رہے گا جس میں اس تاثیر کا حدوث ہوا ہے جسے فلاسفہ نے انتباہ سے تعبیر کیا ہے، اور اس انتباہ ہی کو تمام قوائے ادراکیہ کا منبع و مبدا تسلیم کریں گے اب اگر انتباہ نے ترکیبی شکل اختیار کر لی ہے، تو اسے مقارنت کہیں گے، اور ذاکرہ ان اثرات کو جو احساس ماضیہ سے بچ رہے ہیں۔"

منطقی جس چیز کو حکم کہتے ہیں، وہ اسی مقارنت سے پیدا ہوتا ہے،

اب ذرا تفصیل کے ساتھ مذکورہ بالا مثال کو ملاحظہ فرمائیے، درس نظامی کے فضلاء کے لئے جو اکثر و بیشتر منطقی سلسلۂ بحث کو اس کے درس نظامی میں ایک تحریک غالب کی حیثیت رکھنے کے باعث زیادہ دلچسپی سے دیکھتے ہیں، یہ تشریح زیادہ پر لطف ثابت ہو گی۔

ترجمۂ تاریخ فلسفہ مصنفہ الفریڈ ویبر میں فلسفہ کانڈیاک کو بیان کرتے ہوئے ماخذ تصورات صرف ایک مبدء فکر کو قرار دیا گیا ہے اس کے ثبوت میں ذیل کی مثال پیش کی ہے؛

کانٹ ایک کہتا ہے، کہ "ہم ایک ایسا بت فرض کریں جو ذی حیات و ذی اعضاء ہو مگر اس کی جلد مرمریں خارجی ہیجانات کو مجاز دخول نہیں بننے دیتی" اس بت کا جلد سے تدریجی انخلا اس کی ذہنی و اخلاقی ترقی کا راستہ پیدا کرتا ہے،

الغرض، قوائے شمومیہ سے پردہ ہٹا دیا جائے تو وہ صرف بو کا ادراک کرسکے گا، اگر اس کے سامنے گلاب کا ایک پھول رکھ دیا جائے تو وہ اس کی بو کا احساس کرے گا، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک بت ہی جو گلاب کو سونگھ رہا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے نفس کی حقیقت ہی بوئے گل ہے، اس کی انانیت بوئے گل کے سوا اور کچھ نہیں۔

ابھی تک چونکہ اس کا سلسلۂ احساس صرف اسی ایک شے سے وابستہ ہے، اس لئے اس کو توجہ کہا جائیگا اب اگر اس کے سامنے سے اس پھول کو ہٹا دیا جائے، تو جو جھلک یا اثر اس بت میں رہ جائے گا، اسے حافظہ کہیں گے،

اس کا پہلا احساس چونکہ بالکل ابتدائی تھا، اس لئے اس کے متعلق خوشگوار یا ناخوشگوار کے تعبیری الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے: ہاں اگر اس کے سامنے بیلا، چمبیلی، ہینگ اور گیندا رکھ دئے جائیں، تو اب اس میں متعدد احساسات پیدا ہوں گے۔ ذہن حافظ کے اثرات کی موجودگی میں ان کا باہمی مقابلہ کرے گا، نتیجۃً بعض خوشگوار اور بعض ناخوشگوار معلوم ہوں گے، خوشگوار سے الفت اور ناخوشگوار سے نفرت پیدا ہوگی، اس مقابلہ سے اس میں جذبات خواہشات اور ارادے پیدا ہوں گے، ارادہ خواہش کا مترادف ہے، البتہ اس کا درجہ احساس، توجہ، حافظہ اور موازنہ وغیرہ کے بعد آتا ہے۔

کثرت احساسات کے بعد موازنے و مقابلے فکر و تصدیق اور استدلال وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، موجود احساس کے مقابلے میں جو احساسات ماضیہ پیدا ہوتے ہیں، وہ درحقیقت احساسات نہیں ہوتے بلکہ ان کی نقل یا شبیہ جن کی صحیح تعبیر تصورات ہے۔

ایک ہی وقت میں دو تصورات پر توجہ کرنے سے ہم میں قوت موازنہ ہوتی ہے، اب اگر ہمیں ان کی باہمی موافقت و مخالفت کا ادراک ہو تو اسے تصدیق کہیں گے۔

ہو کے ذریعہ لذت والم کے احساسات جو بہت سی کیفیات میں مشترک تھے حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں، پھر ان مشترک احساسات کو جزئی احساسات سے الگ کر لیا جاتا ہے، اب یہ اپنے تعمیمی پہلو کے لحاظ سے تصورات عامہ کہہ کر پکارے جاتے ہیں مختصر یہ کہ ایک احساس ہی ایسی چیز ہے جو تمام ملکات کا سرچشمہ ہے۔

۱۷۱۲ء اور ۱۷۹۵ء کے درمیان فلسفہ جدید کی شمع جس شخص کے سامنے لا کر رکھی گئی، وہ ہیوم ہے، اس کا فلسفہ بالکل ارتیابی ہے، لیکن متقدمین کی تشکیک سے ممتاز کرنے کے لئے اس کے فلسفہ کو اثباتیت یا ایجابیت سے موسوم کرتے ہیں۔

اس کا سنہ پیدائش ۱۷۱۱ء ہے اور سنہ وفات ۱۷۷۶ء میں۔ بعض لوگوں نے ۱۷۷۷ء بھی تاریخ وفات لکھی ہے، ابتداءً اس نے وکالت کے لئے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا، پھر تجارت کا ارادہ کیا، اس میں بھی یہی صورت ہوئی، مجبور ہو کر فرانس کا رخ کیا، اور اس جگہ قیام کیا جو ڈیکارٹ کا مولد ہے

۱۷۳۹ء میں اپنی تالیف "الطبیعۃ البشریہ" کے ابتدائی اجزا شائع کئے، ایک خاص حصہ جو اخلاقیات سے متعلق تھا، ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آیا۔

اس نے جب دیکھا کہ اس کی تصانیف کو کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، تو موقع پا کر جنرل سینٹ کا جب وہ جرمنی و اطالیہ کا سفیر تھا، پرائیویٹ سکریٹری بن گیا، مگر علم سے اس کی دلچسپی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا اور جب وہ وطن کو واپس ہوا تو اپنی کتاب "مباحث فی العقل البشر" شائع کی، ۱۷۵۲ء میں "مدرسۃ الوکلاء" واقع اڈنبرا کا امین مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد اس نے انگلستان کی وہ تاریخ لکھی جو اس کی شہرت کا باعث ہوئی،

برکلے نے لاک کے مقرر کردہ مبادیات سے عالم ظاہری کے عدم وجود کا اثبات کیا ہے مگر ہیوم نے جوہر خواہ وہ جسمی ہو یا روحی، کے عدم وجود کا اثبات کیا۔

اس نے فلسفہ کی غرض یہ بیان کی ہے، کہ فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس کی ادراکی قوت کی تنقید کریں جو ہمیں یہ بات بتلاتی ہے کہ اشیاء کا وجود ہم میں اور ہمارے فائدے کے لئے ہے۔

لیکن چونکہ ہم اپنے وجدانی حالات اور ان علاقات کے سوا جو ایک دوسرے سے منسلک ہیں،

ہیں جاتے اس لئے وجدانی حالات دو کیفیتیں سے متصف ہوں گے۔

(۱) تاثیرات یا موجودہ ادراکات جو احساسات، خواہشات اور مشاعر جن کے ذریعہ ہمیں شعور حاصل

ہے، پر مشتمل ہیں۔

(۲) مثالیں یا تاثیرات کی وہ مکرر صورتیں جو تخیل و تذکر کے ذریعہ ہمیں حاصل ہوتی ہیں۔

وہ علاقات کیا ہیں جو حالات وجدانیہ کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہیں؟ وہ وہی ہیں جو مطالعہ

ن کے لئے بطور اساس و بنیاد کے کام دیتے ہیں، انھیں کو علاقہائے مشابہت و مناقضت سے تعبیر کرتے

؛ اور جو کہ زمان و مکان اور دوام کو مستلزم ہیں.... یہ اس کے فلسفہ کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔

ہیوم کے وطن کو چھوڑ کر ایک خاندان نے ایک اہم علمی انقلاب پیدا ہونے سے کئی پشت پہلے جرمنی میں

نت اختیار کر لی تھی اسی خاندان میں کانٹ کی ولادت ہوئی مشرقی پروشیا کا کونگز برگ اس کا مولد، اور

اپریل ۱۷۲۴ء اس کی تاریخ پیدائش ہے؛

اس نے اپنے شہر کی یونیورسٹی میں فلسفہ اور مختلف علوم حاصل کئے، پھر یہیں اس کو پروفیسر بنا دیا گیا، فلکیات و

ضیات، فلسفہ اور مختلف علوم کی تعلیم دیتا تھا۔ ۱۸۰۴ء میں بڑی عزت و شہرت پا کر وفات پائی۔

کانٹ کے فلسفیانہ خیالات پر ہیوم اور اخلاقیات پر روسو کا اثر ہے، بعض مورخین نے کانٹ کی تعریف

شاعری کی حد تک غلو کیا ہے، اس سلسلہ میں مورخ ہیشلیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

کانٹ اپنے ابنائے عصر میں ایک نرالی شان کا مالک ہے، وہ یہ کہ نہ تو وہ کبھی اپنے صوبے سے باہر گیا

شادی کی، اس کی زندگی میں انضباط بہت نمایاں طور پر نظر آتا ہے، غالباً کانٹ ہی وہ شخص ہے جو ہر

ت سیر و تفریح میں بھی منٹوں کا شمار رکھتا تھا، اسی کے ساتھ وہ بہت ہی خوش خلق اور ملنسار بھی تھا۔

اس کی تین تصانیف کو بہت اہمیت دی جاتی ہے (۱) انتقاد عقل مجرد یا نظری مطبوعہ ۱۷۸۱ء

تقاد عقل عملی مطبوعہ ۱۷۸۸ء (۳) انتقاد حکم مطبوعہ ۱۷۹۰ء

کانٹ نے فلسفہ انتقاد کی تدوین ایک خاص اثر کے ماتحت کی ہے، وہ یہ کہ .... کہ ہیوم ولف

تھا کہ نوعیت اشیاء معلوم کرنے کے لئے فہم کی قابلیت و استعداد کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، لیکن

ہیوم نے یہ کہکر کہ علت و معلول میں جو تعلق ہے، اس کی دریافت صرف عادت ذہنیہ ہی نہیں، بلکہ اس
بڑھی ہوئی کوئی چیز کرتی ہے"

یہ ایک طرح کا شک تھا جسے ہیوم نے اس استعداد کے متعلق پیدا کیا، اسی بنا پر کانٹ نے
محسوس کیا کہ اب فلسفہ کی حیثیت اعتقادی باقی نہیں رہی ہے، بلکہ اب وہ محتاج تنقید ہے، اس لئے وہ ا
فلسفہ کو تنقیدی قرار دیتا ہے۔

توالی علل کے سلسلہ میں وہ ایک ایسے نظام کا بھی اثبات کرتا ہے جس میں تمام چیزیں موجود ہوں
اور ایسے نظام کا خیال اس کی اصطلاح میں تصور ناظم کے ساتھ موسوم کئے جانے کا مستحق ہے۔

اس کے نزدیک ایسے تصورات جو محرکات علمیت ہوتے ہیں تین ہیں:-

(۱) طبعیات کا مرکز یعنی علت اول

(۲) ذہن ہی کسی نہ کسی حالت شعوری کا جویا ہوتا ہے (یعنی نفس جوہری)

(۳) مقصد فلسفہ یعنی مبدء عالم حقیقت،

کانٹ کے فلسفہ کو پڑھ جائیے تو یہ معلوم ہوگا کہ اسے تحلیل و تجزیہ پر غیر معمولی قدرت ہے لیکن پھر
اس نے بہت سی جگہوں پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔

مثلاً ایسی جگہ پر کہ "عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جس نے انسانی نفوس کی حقیقت کی طرف ہماری رہنما
کی ہے، حالانکہ عقل کو صرف وجدان اور ضمیر کا علم ہو سکا ہے، وغیرہ وغیرہ"

غرضکہ کانٹ بحیثیت ایک فلسفی کے عجیب و غریب انسان تھا، اس نے دنیائے فلسفہ میں ایک
برپا کر دیا، اس کی عظمت کی نورانی کرنیں یورپ کے سر فلک معقولاتی قصور پر اب تک پڑ رہی ہیں، ک
اس کے فلسفہ کو بہت ہی دلچسپ طریقہ پہ دو لفظوں میں ادا کیا ہے کہتا ہے کہ ... کانٹ کے فلسفہ کی حقیقت
صرف دو لفظ ہیں، "اس کا فلسفہ ارتیابی حقایق اشیاء سے متعلق ہے، اور فلسفہ یقینی اخلاق سے"

فشتے جس کا تلامذہ کانٹ میں شمار ہوتا ہے، شہر بینیا کی مشہور درسگاہ میں تعلیم پا رہا او
یہیں مدرس بھی ہو گیا، ۱۷۹۹ء میں دہریت کے الزام کے ساتھ مدرسی سے علیحدہ کر دیا گیا، کافی

کی بیکاری کے بعد برلن یونیورسٹی میں پروفیسر بنادیا گیا، قابل ذکر کتابوں کا مصنف ہے اسی کی اخلاقی تعلیم کے اثر نے جرمنوں کو نپولین کے خلاف آمادۂ حرب و پیکار کر دیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ کانٹ کے فلسفہ کی اصلاح اشیاء کی ظاہری اور باطنی حالات میں تطبیق دے کر کر دی جائے۔

اس نے ایک عجیب بات یہ کہی ہے کہ:-

"خدا ایک زندہ ہستی ہے، جو انسانوں کے اخلاقی تعلقات میں زندہ ہے لیکن مجھے تمام ایسے مذہبی تصورات سے نفرت ہے، جن میں خدا کو ایک شخص تصور کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس صورت میں ایک طرح کی تحدید لازم آئے گی، اگرچہ یہ ہمارا ہی فعل ہوگا، مگر پھر بھی خدا کو ایسا محدود شخص تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

لیکن خدا کی شخصیت کے انکار سے اس نے آئیت یعنی ذات مطلق یا مناسب لفظوں میں خدا کے (جو موجودات کا خالق ہے) انکار کا التزام کیا ہے جس کی کوئی مناسب توجیہ بھی نہیں کی۔

شیلنگ ۱۷۷۵ء میں لین برگ میں پیدا ہوا، ٹیوبنگن یونیورسٹی میں تعلیم پائی ۱۷۹۸ء میں ینا یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر ہو گیا۔ ارلانگن، میونخ اور برلن کی یونیورسٹیوں میں بھی پروفیسر رہا۔ ۱۸۵۴ء میں وفات پائی۔

فشٹے کے اس خیال میں کہ "غیر انا، انا کی غیر شعوری پیداوار ہے" یہ دلائل ترمیم کرتا ہے، کہ انا اور غیر انا دونوں ایک بالاتر اصل سے نکلتے ہیں، جو ان سے الگ مگر ان کی علت ہے"

اس کے فلسفہ کے مخصوص اطراف کو چھوڑ کر خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل اہم امور کا ذکر کیا جا سکتا ہے، اور یہی اس کے فلسفہ کی جان ہیں،......

فلسفۂ انانیت کی استادانہ تنقید۔

ہستی مطلق کو ارادہ تصور کرنا، جو کانٹ، فشٹے اور اسپینوزا کے فلسفہ کی بنیاد ہے، فلسفۂ فطرت اور فلسفۂ تاریخ۔

ہیگل ۱۷۷۰ء میں اسٹٹ گارٹ میں پیدا ہوا۔

ہائیڈلبرگ اور برلن میں اس نے عرصہ تک پروفیسری کی، ۱۸۳۱ء میں برلن ہی میں وفات پائی۔
اس کا خیال تھا کہ اگر عالم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ عالم "سراپا خیر ہے"، اس کے نزدیک فکر و کائن ایک ہی چیز ہیں "اس لئے کہ" ہر معقول موجود حقیقی ہے اور ہر حقیقی معقول"
کانٹ نے ہیولے اور صورت میں تفریق کی ہے، لیکن ہیگل ان دونوں میں امتزاج کا قائل ہے اور قوانین فکریہ کو واقعیہ قرار دیتا ہے۔
علم کے اتمام وجود کے لئے، وہ کہتا ہے، "یہ ضروری ہے کہ وہ تین متعاقب حالات سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔۔۔۔
(۱) حالت وضعیہ۔ (۲) سلبیہ۔ (۳) تالیفیہ۔
ہربرٹ سپنسر۔ ۲۷ اپریل ۱۸۲۰ء کو شہر ڈربی میں پیدا ہوا اس کا باپ ایک اسکول میں مدرس تھا۔
ہربرٹ کو ابتدا ہی سے تحصیل علم کا اچھا موقع مل گیا تھا، اس لئے بچپن ہی سے علوم طبیعہ و سیاسیہ سے اس کو شغف پیدا ہوگیا، سترہ سال کی عمر میں لندن کے ایک ماہر ہندس سے علوم ریاضیہ کی تحصیل شروع کردی، ۲۶ سال کی عمر میں علوم سے فراغت حاصل کرلی ۱۸۴۸ء سے لے کر ۱۸۵۳ء تک ایک اقتصادی رسالہ کی چیف ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیے، اس کی تالیفات کے سلسلہ میں ان کتابوں کا نام آتا ہے، الاصول الاول مبادی و اصول علم النفس، اصول علم الاجتماع اور اصول علم الاخلاق۔
"اس کے فلسفہ کا مدار نظریہ نشو و ارتقا کے قریب قریب ہے"
ہربرٹ قوانین عقل بشری کی تشریح کرتے ہوئے جب مل کے نظریۂ عادت پر پہونچتا ہے تو اپنی طرف سے نظریۂ وراثت کا بھی اضافہ کردیتا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ:۔
عادت تقویت حاصل کرنے کے بعد طبیعت بن جاتی ہے یعنی تکوین انسانی میں آلیت کی صورت اختیار کرکے محرک ذاتی کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے، اس طرح پر کہ یہ استعدادات عضویہ وراثتاً منتقل پذیر ہوتی ہیں یعنی ہماری پیدائش کے ساتھ ساتھ وہ تجربیات بھی ہم میں پائے جائیں گے جو ہمارے

اسلاف کے زیر نظر تھے، اسی لئے ہربرٹ کی نظر میں وراثت علوم کی ایک عام اور ضروری اصل ہے، عام تو اس لئے کہ انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وراثت سے گریز کرسکے" اور ضروری اس لئے کہ میراث ایک شے واقعی کی طرح فرد کے لئے لازم شدہ حیثیت رکھتی ہے"

"مذکورہ بالا نظریہ سے مادہ کی ازلیت وابدیت کا اثبات ہوتا ہے:"

دوام قوت، ارتداد حرکات، جن کا سرچشمہ ان کا ماحول ہے ایک اساسی ارتداد جو تمام ارتدادات کا سرچشمہ ہے، اور جس کو ارتقاء و تفلک سے تعبیر کرتے ہیں، تمام چیزیں نمو پاتی ہیں پھر لاشے ہو جاتی ہیں، یہ تکوین عضوی یا ترقی و تقدم کا اجمالی خاکہ ہے۔

پس تکوین ارض، سطح بسیط پر نمو حیات، پھر نمو ہیئت بشری، اسی کے ساتھ حکومت، تجارت۔ صنعت، لذت وادب، اور علم و فن، اور یہ سب کی سب قانون نمو و تفلک کی فرضیت کے محرکات ہیں۔

ہربرٹ کا خیال ہے کہ عالم جس حیثیت سے پایا جارہا ہے، وہ ایک شے واقعی ہے، گویا ہربرٹ نے دنیا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ عالم کی مثال علوم وفنون کی اصطلاحات کی سی نہیں ہے جو وضع واضع کی محتاج ہیں۔

شوپنہار ۱۷۸۸ء میں شہر وینزک میں پیدا ہوا ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۱ء تک گاٹنجن میں تعلیم پائی، اس کے بعد برلن میں ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۳ء تک، ..... ۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۱ء تک فلسفہ کا استاد رہا، پھر تدریس سے علحدگی اختیار کرکے فرنیک فرٹ میں دریائے مین کے قریب مستقل سکونت اختیار کرلی اور ۱۸۶۰ء میں یہیں وفات پائی، اس کا باپ بہت بڑا تاجر تھا۔

اس نے اپنی تحریروں میں اپنے فلسفہ کو پیش کیا ہے۔

(۱) الجذور الاربع لمبدأ السبب الکافی

(۲) العالم ارادۃٌ و تمثیلٌ

اس کی رائے یہ ہے کہ ہمارے تمام اختبارات، ہمارے احکام، اشکال زمان ومکان، فعل

فاعل اور اس کا نتیجہ۔ ان سب کا مصدر و مرجع ارادہ کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہے یہی ایک کافی ووافی علت ہے تمام اشیاء کے وجود کے لئے۔

"بس عالم یا تو وہ چیز ہے جو ہمارے فعل کا نتیجہ ہے یا پھر نتیجہ فہم"

شوپنہار کی شہرت کا اصلی سبب مسئلہ قنوطیت ہے، اس کی تشریح وہ اس طرح کرتا ہے کہ ....

"تحقیق نے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ انسانی رنج اور اس کی شدت کا احساس، اس کی یا عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے بوڑھے تو اور بھی زیادہ اس مصیبت کا شکار ہوتے ہیں، اسی طرح "محبت" بھی یہ تو گویا مصیبتوں کا سرچشمہ ہے یہی وہ چیز ہے جس کا وجود عالم میں اکثر و بیشتر ہوتا رہا ہے یہی منشائے بغض و جنگ، نفرت و خیانت، اور شرمندگی و جنون سامانی بنتی ہے"۔

"مطلق" جس نے کائنات کی تمام چیزوں کو بغیر کسی غایت و سبب کے پیدا کیا ہے، اس نے کائنات میں خواہش حیات پیدا کی ہے اور اس کی تحصیل قربانی سے نہیں بلکہ اس طرح پر ہوتی ہے کہ انسان بدھ مذہب کی روشنی میں اپنے آپ کو کرۂ عظیم کے مطالعے میں غرق کر دے۔

اس کا یہ بھی خیال ہے کہ موجودہ عالم ان تمام عالموں سے جن کے وجود کا امکان ہے بدتر ہے۔

ڈارون ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء میں شروزبری میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۲ء میں ویسٹ منسٹر ایبے میں وفات پائی۔ اپنے شہر کے مدرسہ میں پڑھنے کے لئے داخل کیا گیا، لیکن اسے سوائے کھیل کود اور شکار کے کسی دوسری چیز سے دلچسپی ہی نہ تھی، یہاں تک کہ ایک دن اس کا باپ بھی تنگ آکر یہ کہہ بیٹھا کہ "تم خاندانی شرافت پر دھبہ لگا کر چھوڑو گے"۔

۱۸۲۵ء میں اسے طب پڑھنے کے لئے اڈنبرا بھیجا گیا، لیکن یہاں بھی اس کی وہی حالت رہی اس کی بڑی وجہ اس کے باپ کی وہ کافی دولت تھی، جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ باپ کی وفات کے بعد یہ دولت بے عمل و عیش زندگی بسر کرنے کے لئے بہت کافی ہوگی۔

بدرجۂ مجبوری ہسپتال میں اس کا سلسلۂ آمد و رفت جاری تو رہا، لیکن آپریشن روم کے نظاہر ہولناک مناظر اس کے لئے بہت ہی خوفناک تھے ایک دن اتفاقاً دو ایسے مریض آپریشن کے لئے لائے

جن میں سے ایک صغیرالسن تھا، اس بچہ کی زخم شگافی کے منظر کی تاب نہ لاسکا، اس طرح بھاگا کہ
ر ہسپتال میں کبھی قدم نہ رکھا۔

دو سال بعد کیمبرج میں منتقل ہوگیا۔ یہاں اس کا مشغلہ یہ تھا کہ مختلف قسم کے حشرات ارض جمع کرتا
رہتا تھا۔ اسی اثنا میں اس کی جان پہچان مشہور عالم نباتات ہنسلو سے ہوگئی۔

دسمبر ۱۸۳۱ء میں ایک جماعت کے ساتھ ایک طویل سفر کیا۔ یہاں ۱۸۳۶ء تک مقیم رہا، اس
دوران میں اس کی زندگی میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہوگیا، اور وہ پہلا سا ڈارون نہیں رہا۔

۱۸۳۹ء میں اپنے چچا کی بیٹی ایما دی جور سے شادی کرلی، لندن سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر
قام ڈاون میں ایک جائداد خریدلی، اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

اس کی تالیفات مندرجہ ذیل ہیں:—

اصل الانواع۔ تسلسل انسان بنظر تاثیرات۔ انسان وحیوان میں۔

اس کا فلسفہ فطرت ہے، اس کے فلسفہ میں کسی قدر فرانسیسی فلسفی لامارک کے فلسفہ کی بھی
جھلک نظر آتی ہے۔

اس کے نظریہ فطرت کا ملخص جو ڈارون کی تھیوری یا مسئلہ ارتقا کے نام سے مشہور ہے، یہ ہے:—

"تمام انواع وحیوانات ونباتات، گذشتہ وموجودہ بطریق ارتقا تدریج ایک تسلسل رکھتی ہیں
اور یہ تسلسل تین یا چار اصول کے ماتحت ہوتا ہے۔ اور بعض وقت ایک ہی اصل کے ماتحت، کیونکہ مقامات
مواصلات بہیں ایک بہت ہی بعید نقطۂ خیال کی طرف لے جاتی ہے، اور یہ اس بات کا اعتقاد ہے کہ تمام
حیوانات ونباتات کا تسلسل ایک ہی نوع کا ہے"۔

ڈارون اس ارتقا اور تدریجی تکمیل کو فطرت کے تمام قوانین پر چسپاں کرتا ہے، کہتا ہے:— کہ
"زندہ کائنات کا ارتقا کے سہارے حد سے زیادہ کثرت کی طرف میلان پایا جاتا ہے، اور یہیں سے
تنازع للبقا کا آغاز ہوتا ہے"

اس تنازع کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ کمزور افراد اصلح و احسن کی بقا کی خاطر فنا کردیے جاتے ہیں، اسی

کا نام "انتخاب طبعی" ہے۔

عضو میں بیشی استعداد کی بنا پر ہر انتخاب ارتقا کی دعوت عام ہوتی ہے، جس سے وہ چھٹکارا نہیں پا سکتا، اس لئے کہ قانون اختلاف صفات کے رو برو۔ بہر حال اسے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے، پھر فرصت کے مواقع پر ہر ذات اپنے معمولی عوامل کی موجودگی میں طبعی شکل اختیار کر لیتی ہے، یہیں سے نئی نئی اور مختلف انواع کا نشو و نما ہوتا ہے۔

"ہر نوع قائم بذاتہ ہوتی ہے، اور لازمی طور پر تدریجی ترقی کرتی ہے"

نوع انسانی بھی اس قانون ارتقا سے منفرد نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ڈارون نے کہا کہ انسان نے بندر سے قانون ارتقا کے ماتحت تدریجی ترقی کرتے کرتے موجودہ شکل پائی ہے"

ڈارون کے بعد اس سلسلہ میں دو مشہور فلسفی اور بھی آتے ہیں، ان میں سے ایک انگریز ہیڈربرٹ ہے، اس کی پیدائش ۱۸۲۰ء میں اور وفات ۱۹۰۳ء میں ہوئی، اور دوسرا ولیم جیمس امریکن فلسفی ہے، یہ ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوا، اور آج سے بائیس سال پہلے یعنی ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

اس کا فلسفہ "نظریہ عملیت" ہے، یعنی شے کا معیار حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اس کا انسانی اغراض و مفاد سے تعلق ہو، بیسویں صدی کے آغاز میں اس نظریہ کا اس نے اظہار کیا۔

افغانی اور برطانوی جنگیں

انگریزی اور افغانی تعلقات کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے آخر میں ابدالیوں نے متعدد بار ہندوستان پر حملے کئے جس میں وہ ناکام رہے۔ ان حملوں نے انگریزی مدبرین کو چوکنا کر دیا۔ ان کو یہ خطرہ لاحق ہونے لگا کہ مبادا افغان ہندوستان پر حملہ کرکے برطانوی اقتدار و سیادت کو ہمیشہ کے لئے سرزمین ہند سے فنا کر دیں مزید برآں نپولین اول نے روس کے ساتھ جنگ کی۔ جنگ کے بعد روس اور فرانس میں ایک معاہدہ ہوا جس کا لب لباب یہ تھا کہ دونوں طاقتیں مل کر ہندوستان پر حملہ کریں۔

اس معاہدے نے انگریزی مدبرین کو ایک عرصہ تک پریشان رکھا، چنانچہ روسی حملے کی افواہیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ برطانوی مدبرین نے یہ ارادہ کیا کہ ایران کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کرکے روسی پیش قدمی کا انسداد کیا جائے۔ اسی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے ۱۸۰۰ء میں ایک سفارت مسٹر مالکم مشہور ماہر تاریخ ایران کی سرکردگی میں ایران کو روانہ کی۔ ایرانیوں نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اس سفارت کا استقبال کیا اور برطانوی اور ایرانی نمائندوں نے ایک معاہدہ کیا جس کی خاص دفعات حسب ذیل تھیں۔

۱۔ ایران میں برطانوی تجارت کو ترقی دی جائے۔

۲۔ اگر روسی اور افغان ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو ایران کا فرض ہوگا کہ انگریزوں کا حلیف بنے۔

اسی اثناء میں نپولین گرفتار ہو گیا۔ اسی وجہ سے روس نے تن تنہا ہندوستان پر فوری حملے کے خیال کو ملتوی کر دیا۔ اور وسط ایشیاء میں بھی اپنی پیش قدمی کی پالیسی کو بدل دیا یعنی تیز رفتاری کو سست کر دیا۔ الغرض روسی اپنی نپی تلی رفتار سے وسط ایشیاء میں شہنشاہیت کی اغراض کو پھیلا رہے تھے۔ نپولین کی گرفتاری کے بعد انگریزوں کو روس اور فرانس کے خطرے سے اطمینان تو ہوا لیکن روسی پیش قدمی

کا خیال ابھی تک انگریزی مدبرین کے لئے باعث خطر بنا ہوا تھا۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں ایران اور روس میں ایک لڑائی ہوئی۔ انگریزوں نے ۱۸۱۴ء کے معاہدے کو پس پشت ڈال دیا اور ایرانیوں کی کوئی مدد نہیں کی۔ اس چیز نے ایرانیوں کو انگریزوں سے بد دل کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لئے یہ بہتر سمجھا کہ روسیوں کے ساتھ تعلقات قائم کریں نہ کہ برطانیہ کے ساتھ۔ ایران اور روس میں ایک معاہدۂ مودت مرتب ہوا جس کی تصدیق دونوں حکومتوں کے نمائندوں نے کی اسی اثنا میں قدرت نے انگریزوں کو ایک زریں موقع عطا کیا اور وہ یہ کہ ۱۸۰۹ء میں ابدالی سرداروں میں تخت کابل کے لئے بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ شاہ شجاع شکست فاش کھا کر ہندوستان میں آیا۔ پہلے پہل رنجیت سنگھ اس کے بعد انگریزوں کے ہاں پناہ لی۔ انگریزوں نے شاہ شجاع کے گذارے کے لئے وظیفہ معین کر دیا لیکن شاہ شجاع ابھی تک حکومت کابل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگریزوں اور سکھوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ دونوں طاقتیں مل کر شاہ شجاع کو تخت کابل پر واپس لائیں یہاں سے برطانوی اور افغانی تعلقات کی ابتدا ہوتی ہے۔ انگریزوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور شاہ شجاع کی امداد کے لئے ایک فوج براہ بولان افغانستان کو روانہ کی جس نے قندھار، غزنی اور کابل پر قبضہ کر کے شاہ شجاع کو دوبارہ تخت کابل پر بٹھایا۔

چونکہ شاہ شجاع نہ تو فوجی قابلیت رکھتا تھا نہ سیاست کا مرد میدان تھا، مزید برآں اس نے انگریزوں کے قدموں سے سرزمین افغانستان کو پامال کرایا جس کی وجہ سے افغان شاہ شجاع سے دلی نفرت کرنے لگے۔ چنانچہ آئے دن افغانستان میں بغاوتیں اور شورشیں ہونے لگیں۔ انگریزوں نے شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے کچھ مدت تک اپنی فوجوں کو افغانستان میں ٹھہرانا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں انگریزی چھاؤنیاں قائم ہوگئیں۔ اس چیز نے افغانوں کی ناراضگی میں مزید اضافہ کر دیا۔ الغرض ان اسباب کی بنا پر افغانوں کے جذبات مشتعل ہوئے۔ انھوں نے انگریزی فوجوں اور شاہ شجاع کے استیصال کا عزم بالجزم کر لیا۔ تمام افغانستان میں بغاوت پھیل گئی باغیوں کی قیادت سردار اکبر خاں ایک افغانی سردار نے کی جو حب الوطنی اور شجاعت کے جذبات میں اپنی

نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اس نے انگریزی فوج کے کارندوں کو ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کیا جس کی دفعات یہ تھیں:۔

تخت کابل امیر دوست محمد کو دیا جائے۔ اور جلد سے جلد انگریزی فوجیں افغانستان کو خالی کر دیں۔ چنانچہ انگریزی فوجیں کابل سے ہندوستان کو روانہ ہوئیں۔ راستہ میں جلال آباد کے قرب وجوار کے افغانی قبائل نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اتفاقاً ایک ڈاکٹر جان بچا کر پشاور پہونچا اور اس نے یہ خبر انگریزوں کو پہنچائی اس واقعے نے انگریزوں کو افغانوں کا جانی دشمن بنا دیا۔ اس طریقہ پر افغانستان کی پہلی جنگ کا اختتام ہوا۔ اور دوسری جنگ کی تیاری شروع ہوئی۔ اب آئندہ صفحات میں ان تمام جنگوں کا تفصیل وار بالترتیب ذکر کیا جائے گا جو انگریزوں اور افغانوں کے درمیان آج تک ہوتی رہیں۔

افغانستان کی پہلی جنگ | اسباب:۔ (۱) حکومت برطانیہ وسط ایشیا میں روس کا روز افزوں اقتدار دیکھ کر بہت خائف تھی کیونکہ روس ایک مدت سے اپنے مقبوضات اور محروسات کی توسیع میں مشغول تھا۔ اور اپنے منصوبۂ عظمت کو وسط ایشیا میں بغیر کسی ناکامی کے پھیلا رہا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں کاسکوں کو زیر اقتدار کرنے کے بعد اس نے اپنے قدم وسط ایشیا کے مشہور دریا جیحوں پر جما لئے۔ اب ایک تدریجی رفتار سے مشرق کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا اور ہر قدم پر وسط ایشیا کے مختلف صوبوں پر اپنی آہنی گرفت تخت تر کرتا جاتا تھا۔ اس قبضہ کو مضبوط کرنے کے لئے اس نے ایک سلسلۂ قلعہ جات تعمیر کرایا جو جھیل یورال سے شروع ہو کر سات سو میل مشرق کی جانب قلعہ ورنو تک پہنچا تھا۔

مزید برآں مدبرین روس ہمیشہ سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح دربار ایران میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں اور اس کے ساتھ مل کر افغانستان پر روسی اثر قائم کریں اور اس طریقہ پر روسی پیش قدمی کا رخ ہندوستان کی طرف بڑھے جو ان کا اصلی مطمع نظر تھا۔ بغضکہ فتح علی شاہ کے عہد میں روسیوں کو دربار ایران میں اثر و اقتدار حاصل ہو گیا۔ کیونکہ ایرانی انگریزوں کی بے سود دوستی کو روسیوں کی دوستی سے زیادہ پسند کرتے تھے یہ حالت دیکھ کر انگریزوں نے بھی دربار ایران میں مختلف سفارتیں بھیجیں لیکن ان کو وہ رسوخ حاصل نہ ہو سکا جو روسیوں کو ہوا۔ انگریزوں کے لئے ایران میں روسیوں کا رسوخ خطرہ کا باعث

تھا۔ کیونکہ ایران میں روسی اقتدار کے یہ معنی تھے کہ روس آہستہ آہستہ افغانستان میں قدم جمائے گا اور اس کے بعد اس کی رفتار کا رخ سرزمین ہند کی طرف ہوگا۔ انگریزوں کی یہ دلی تمنا تھی کہ کسی بہانے سے افغانستان میں اپنا اقتدار قائم کر کے ہندوستان کی سرحدوں سے دور روسی پیشقدمی کو روک دیں۔

۲۔ مسئلہ ہرات۔ ہرات کے موقع و محل اور اس کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے شاہان ایران کی للچائی ہوئی نظریں ایک عرصے سے اس کے اوپر پڑ رہی تھیں۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں ایرانیوں نے ہرات پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں کے نزدیک ایرانیوں کے ہرات پر حملہ کرنے کے یہ معنی تھے کہ روسی اثر و اقتدار ہندوستان کی دہلیز یعنی ہرات تک پہنچ جائے۔ انگریزی سفیر ایران مقیم طہران نے اس مہم کی مخالفت کی اور روسی سفیر نے ایرانیوں کی اس مہم میں ہر طرح سے مدد کی۔

برطانوی وزارت خارجہ نے ان کارروائیوں کے متعلق روسی وزارت خارجہ کو ایک یادداشت بھیجی۔ وہاں سے جواب ملا کہ روسی سفیر نے اپنی حکومت کے ہدایات پر یہ قدم آگے بڑھایا ہے اس لئے اس کو واپس بلا لیا جائے گا لیکن روسی حکومت نے اس اطمینان کی طرف کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ مزید برآں روس کے سرکاری گزٹ نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں برطانوی یادداشت پر بحث کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ برطانیہ کے ساتھ اب کی دفعہ صلحنامہ کی شرائط کلکتہ میں طے کی جائیں گی۔ اس واقعے نے انگریزوں پر روسیوں کی دلی آرزوؤں کا انکشاف کر دیا۔ مزید براں مہم ہرات کے متعلق سیاسی حلقوں میں یہ خیال کیا جانے لگا کہ اس مہم کی کامیابی درحقیقت برطانوی ایشیائی اقتدار کے لئے پیغام اجل اور روس کے لئے مژدہ جانفزا کا حکم رکھتی ہے۔ خود ہندوستان میں اس مہم کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور اس کی گونج شمالی ہند سے گذر کر جنوبی ہند تک پہنچ چکی تھی۔

۳۔ جب شاہ شجاع ہندوستان میں آ کر انگریزوں کے سایہ عاطفت میں پناہ گزیں ہوا تو اس کی جگہ ۱۸۲۶ء میں دوست محمد خان بارکزئی تخت کابل پر رونق افروز ہوا۔ دوست محمد خاں بڑا غیور افغان تھا حب وطنی کے جذبے میں اپنے ہمعصر سرداروں سے وہ کہیں ممتاز تھا۔ اسی زمانہ میں پشاور پر سکھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ دوست محمد خاں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح پشاور سکھوں سے واپس لے لے۔

۱۸۳۵ء میں دوست محمد خاں نے سکھوں سے پشاور لینے کا عزم راسخ کر لیا تمام ملک میں منادی کرادی کہ جس کا جی چاہے جہاد میں شریک ہو کر دینی اور دنیاوی فلاح حاصل کرے۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیڑھ لاکھ غازی مرنے اور مارنے کے لئے دوست محمد خاں کے علم کے نیچے جمع ہوئے اور ان سب نے مل کر پشاور کی طرف کوچ کیا۔ رنجیت سنگھ نے اس جرار لشکر کی آمد کا غلغلہ جو سنا تو اس کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ اس وقت اس نے ایک قسمت آزما امریکن مسمّٰی ہارلینڈ کو دوست محمد کے لشکر میں بھیجا جو بظاہر تو کہتا تھا کہ وہ رنجیت سنگھ کا پیغام لے کر دوست محمد خاں کے پاس آیا ہے لیکن خفیہ طور پر اس نے یہ حرکت کی کہ تمام افغانی سرداروں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر افغانی فوج کو منتشر کر دیا چنانچہ وہی فتنہ باز امریکن اپنے اس کارنامہ پر فخر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ایک دن پیشتر جہاں ڈیڑھ لاکھ انسان مرنے مارنے پر تیار تھے صبح کو وہاں ایک انسان بھی نظر نہ آتا تھا" الغرض اس طریقے پر تمام افغانی سردار ایک دوسرے سے بدظن ہو کر افغانستان کو واپس روانہ ہو گئے۔ دوست محمد خاں بھی نہایت اضطراب اور ملال کی حالت میں کابل واپس ہوا۔ اس کے بعد دوست محمد خاں نے انگریزوں کے سامنے پشاور کا معاملہ رکھا لیکن انگریزوں نے بھی دوست محمد خاں کو کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا۔ اسی اثنا میں انگریزوں نے مسٹر برنس کی سرکردگی میں ایک تجارتی سفارت کابل کو روانہ کی۔ دوست محمد خاں نے انگریزی سفارت سے ملاقات کی اور تجارتی معاہدہ اور دوستانہ تعلقات کے قیام پر آمادگی اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ انگریز سکھوں سے پشاور واپس دلا دیں۔ انگریزی سفارت نے اس معاملے کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ معاملہ سکھوں اور افغانوں کا ہے، انگریزوں کا اس میں دخل دینا مناسب نہیں ہے۔ الغرض انگریزی سفارت ناکام ہندوستان کو واپس ہوئی۔

اب دوست محمد خاں نے روس کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرنے کی سلسلہ جنبانی شروع کی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ روسی مدد حاصل کر کے وہ سکھوں سے پشاور واپس لے لے۔ روسی سفیر افغانستان میں آیا تو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا۔ دوست محمد خاں نے اب روسیوں کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھانے شروع کئے۔ اس چیز نے انگریزوں کے دلوں میں افغانوں کی دشمنی پیدا کر دی غرضیکہ مندرجہ

بالا ہیں اسباب کی بنا پر شاہ شجاع کو تخت کابل دلانے کے بہانہ سے ۱۸۳۸ء میں انگریزی فوجیں درہ بولان کے راستہ افغانستان پر حملہ آور ہوئیں۔

افغانستان کی پہلی مہم کی روانگی | اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نومبر ۱۸۳۸ء کو وہ انگریزی فوج جو افغانستان پر پیشقدمی کرنے والی تھی، فیروز پور (پنجاب) میں جمع ہوئی۔ اس موقع پر خود گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف موجود تھے یہاں طرح طرح کے فوجی کرتب اور مصنوعی لڑائیاں ہوئیں۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۸۳۸ء کو ۲۸ ہزار لشکر فیروز پور سے سر ہیگناٹن کی سرکردگی میں دریائے سندھ کے کنارے کنارے ایک ہزار میل پیچدار راستہ سے افغانستان کی پیشقدمی کے لئے آگے بڑھا۔ اس راستہ کے اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قریب ترین راستہ جو افغانستان کو جاتا تھا وہ درّہ خیبر سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ راستہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں سے ہو کر گذرتا تھا جس نے راستہ دینے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ مجبوراً انگریزوں کو درّہ بولان کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ مزید برآں اس راستہ کے اختیار کرنے میں ایک غرض اور بھی پوشیدہ تھی کہ ان علاقوں میں فوجی مظاہرے کر کے امیران سندھ سے کچھ نذرانے وصول کریں۔ ابتدا میں تو امیران سندھ نے انگریزوں کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا لیکن فوجی مظاہرے نے انھیں مجبور کیا کہ تین لاکھ روپیہ انگریزوں کی نذر کریں۔

امیرانِ سندھ سے تین لاکھ روپیہ وصول کرنے کے بعد انگریزی فوج دریائے سندھ کو عبور کر کے بمبئی کے فوجی دستے سے ملی جو سرجان کین کی سرکردگی میں تیار ہوا تھا۔ اب ان تمام فوج کا افسر اعلیٰ سرجان کین کو بنایا گیا۔ ۵ اپریل ۱۸۳۹ء بدقت تمام یہ تمام فوج درّہ بولان کو پار کر کے کوئٹہ پہنچی۔

رسد کی کمی کی وجہ سے فوج میں ایک طرح کی بددلی پھیلی لیکن سرجان کین کے انتظام نے اس کو رفع دفع کر دیا شال کی سرسبز وادی کے بعد انگریزی فوجوں نے درّہ کوجک کی دشوار گذار وادی کو طے کیا۔ اس کے بعد ۲۵ اپریل کو قندھار میں داخل ہوئیں۔ قندھار کا حاکم دوست محمد خاں کا بھائی تھا وہ شکست کھا کر مغرب کی طرف بھاگ گیا۔ قندھار کے داخلہ کے بعد کابل کے تخت پر شاہ شجاع کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔

قندھار کی تسخیر کے بعد انگریزی فوجیں غزنی پر حملہ آور ہوئیں۔ غزنی کا حاکم دوست محمد خاں کا بیٹا حیدر خاں تھا۔ جس نے انگریزوں کے حملہ سے پہلے ہی غزنی کے قلعہ میں چھ ماہ کی رسد جمع کر رکھی تھی اور قلعہ غزنی اپنی مضبوطی اور موقع ومحل کے لحاظ سے وسط ایشیا میں بہت ہی مشہور تھا۔ ابتدا میں تو انگریزوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن چیف انجینیر مسٹر ٹامسن نے قلعہ کے ایک کمزور حصہ کو دیکھ کر سپہ سالار کو مشورہ دیا کہ اس کو سرنگ لگا کر بارود سے اڑا دیا جائے اور اس کے بعد فوج کا ایک دستہ ہلہ کر کے قلعہ میں داخل ہو جائے چنانچہ اسی مشورے پر عمل کیا گیا اور فوج کے ایک دستہ نے ہلہ بول دیا بڑی خونریزی اور آویزش کے بعد غزنی ...... انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور دوسرے دن صبح کو غزنی پر انگریزی جھنڈا لہرانے لگا۔

غزنی کی تسخیر نے انگریزی فوجوں کے لئے کابل کا راستہ صاف کر دیا۔ غزنی سے انگریزی لشکر کابل کی تسخیر کے لئے آگے بڑھا۔ اب دوست محمد خاں نے اپنے سرداروں کو جمع کر کے وطن کی حفاظت کے لئے پر زور اپیل کی اور کہا "تم نے تیرہ سال تک میرا نمک کھایا ہے۔ کم از کم ایک مرتبہ تو میرے دوش بدوش کھڑے ہو کر شورے لے کا مقابلہ کرو۔ اگر شکست ہوئی تو اس وقت شاہ شجاع کے ساتھ شرائط طے کر لینا۔ لیکن اس محب وطن کی اپیل نے سرداروں پر کچھ اثر نہ کیا آخر مایوس ہو کر تمام اسلحہ بامیان میں دفن کر کے بخارا کی طرف بھاگ گیا۔ انگریزی سپاہی چھ دن تک متواتر اس کا تعاقب کرتے رہے لیکن دوست محمد خاں افغانی حدود پار کر کے امیر بخارا کی حدود میں داخل ہو گیا اور انگریزی سپاہی ناکام واپس ہوئے۔

۷ اگست ۱۸۳۹ء کو شاہ شجاع انگریزی فوجوں کی امداد سے نہایت شان وشوکت کے ساتھ کابل میں داخل ہوا۔ شاہ شجاع کا شاہی جلوس کابل کے مختلف بازاروں سے گشت کرتا ہوا بالاحصار میں پہونچا۔ باشندگان کابل کے لئے اس نمائش میں کسی قسم کی خوشی نہیں پائی جاتی تھی ہر ایک افغانی دل سے شاہ شجاع کو کوس رہا تھا اس لئے کہ اسی نے پہلے پہل انگریزی فوجوں کو سرزمین افغانستان سے روشناس کرایا تھا۔

کابل کی تسخیر کے بعد تمام افغانستان پر انگریزوں کی مدد سے شاہ شجاع کا قبضہ ہوگیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ شجاع بغیر انگریزی فوج کے ایک لمحے کے لئے بھی تخت پر بیٹھ نہیں سکتا تھا اس وجہ سے انگریزوں نے جو افغانستان پر پیشقدمی کی تھی ان کے مقصد کی تکمیل اس کے بغیر نظر نہیں آتی تھی کہ ایک عرصہ تک انگریزی فوجیں افغانستان میں قیام کریں مزید برآں انگریز چاہتے تھے کہ روسیوں کی پیشقدمی کو روکنے کے لئے وسط ایشیار کی حکومتوں کے پاس اپنی سفارتیں بھیجیں چنانچہ بخارا وغیرہ میں انگریزی سفارتیں گئیں لیکن ناکام واپس ہوئیں۔

افغانستان کی سیاسی رفتار کا رخ دیکھ کر انگریزی افسروں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ جو انگریزی فوجیں کابل میں ہیں آیا مستقل طور پر اس وقت تک رکھا جائے جب تک کہ شاہ شجاع کی حکومت مضبوط نہ ہو جائے یا واپس بلا یا جائے۔ بالآخر گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ نے یہ طے کیا کہ انگریزی فوجیں مستقل طور پر رکھی جائیں۔ اس کے بعد چھاؤنی کا مسئلہ پیش ہوا تو طے ہوا کہ قلعہ بالاحصار انگریزی فوج کے لئے سب سے موزوں و مناسب جگہ ہے۔ اس لئے کہ بالاحصار سے پورے شہر کابل پر زد پڑ سکتی ہے۔ لیکن شاہ شجاع نے اس کو اپنی سکونت گاہ بنا لیا تھا اس لئے انگریزی فوج کے لئے شہر سے باہر کھلے میدان میں ایک چھاؤنی تعمیر کرائی گئی جو بالکل غیر محفوظ تھی۔

اسی اثنا میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ دوست محمد خاں نے جو امیر بخارا کے ہاں بھاگ کر پناہ حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن امیر بخارا نے اس کو قید کر دیا تھا۔ اتفاقی طور پر قید سے رہائی پاکر ازبکوں کو جمع کر کے کابل پر ایک مرتبہ اور قسمت آزمائی کرنا چاہی۔ اس کوشش میں پہلی بار تو شکست کھائی اور پہاڑوں میں جا چھپا لیکن پھر نئے سرے سے تیاری کر کے دوبارہ کابل پر حملہ کیا اب کی بار انگریزی فوجوں کو شکست دی مگر دوسرے ہی دن اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا انگریزوں نے اسے کلکتہ بھیجدیا اور اس کے گذارے کے لئے دو لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

۱۸۴۱ء میں گورنر جنرل کی مجلس شوریٰ میں انگریزی افواج مقیم افغانستان کے اخراجات کا مسئلہ پیش ہوا۔ کیونکہ افغانستان میں شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے فوج رکھنے کی وجہ سے خزانہ ہند

پر بہت بڑا بار پڑ رہا تھا۔ سالانہ اخراجات کا تخمینہ کوئی ڈیڑھ کروڑ روپیہ تھا مجلس شوریٰ نے گورنر جنرل کے سامنے اپنے خیالات پیش کیے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ شاہ شجاع کی برقراری کے لئے افغانستان میں ایک بہت بڑی فوج رکھنے کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ بڑی فوج کے لئے بہت زیادہ اخراجات کرنے ہوں گے اس لئے انگریزوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ اپنی بے تعلقی کا اعلان کردیں اور تمام انگریزی فوجیں افغانستان سے واپس بلالی جائیں مجلس شوریٰ نے نہایت قوی دلائل کے ساتھ گورنر جنرل کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا۔ اس وقت افغانستان میں امن و امان کا دور دورہ تھا دوست محمد خاں جو افغانستان کا دعویدار تھا گرفتار ہوچکا تھا اور دربار ایران کے ساتھ بھی انگریزوں کے دوستانہ تعلقات تھے اور روسی پیش قدمی بھی ایک حد تک دھیمی پڑچکی تھی ان اسباب کی بنا پر اگر اسی وقت مجلس شوریٰ کے مشورہ پر عمل کرتے تو انگریزی فوجیں واپس بلالی جاتیں تو وہ مصائب اور تباہی اس پر نہ آتیں جو آگے چل کر پیش آئیں۔

لیکن بدقسمتی سے اس مسئلہ کا حل ان فوجی افسروں کے ہاتھ میں چھوڑ گیا جنھوں نے جنگ افغانستان میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے گورنر جنرل کو سمجھایا کہ اس وقت شاہ شجاع کو برطانوی امداد سے محروم کرنا سیاسی بے رحمی کے مرادف ہوگا جب تک کہ شاہ شجاع کی حکومت مضبوط نہ ہوجائے انگریزی فوجوں کا وجود افغانستان کے امن کے لئے لابدی ہے۔ الغرض اس مشورہ کو گورنر جنرل نے مان لیا اور یہ طے پایا کہ فی الحال مستقل طور پر انگریزی فوجیں افغانستان میں شاہ شجاع کی حمایت کے لئے مقیم رہیں لیکن فوج اور اخراجات میں اضافہ نہیں کیا جائے گا بلکہ اور تخفیف کی جائے گی۔

انگریزوں نے افغانستان میں امن قائم رکھنے کے لئے تمام سرداروں کے لئے وظائف مقرر کئے تھے چنانچہ اس تخفیف نے ان وظائف پر کافی اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام افغانستان میں بغاوت پھیل گئی اس بغاوت میں سفیر برطانیہ مسٹر برنس بھی قتل کردیا گیا۔ اور انگریزی چھاؤنی پر باغیوں نے حملہ کردیا جس کی وجہ سے کابل سے انگریزی فوجوں کے قدم اکھڑ گئے۔ موسم سرما کی وجہ سے برف باری نہایت زوروں پر تھی۔ تمام راستے بند تھے جس کی وجہ سے جلال آباد اور قندھار سے کمک بھی نہیں آسکتی

تھی۔ علاوہ ازیں افغانوں نے انگریزی فوجوں کی رسد بھی بند کردی اور وہ بھوکوں مرنے لگی۔ ان گوناگوں مجبوریوں کی بنا پر انگریزوں نے اب مجبوراً باغیوں کے ساتھ صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی چنانچہ افغانی سرداروں اور انگریزی افسروں میں ایک معاہدہ طے پایا جس کی بڑی بڑی شرطیں مندرجہ ذیل ہیں،

۱۔ تمام افغانستان کا انگریزی فوجوں سے کلی تخلیہ کردیا جائے

۲۔ دوست محمد خاں اور اس کے خاندان کے لوگوں کو رہا کردیا جائے اور تخت کابل اس کے سپرد کردیا جائے۔

۳۔ شاہ شجاع کو افغانستان میں نظر بند رکھا جائے یا انگریزی فوجیں اس کو اپنے ساتھ ہندوستان لے جائیں،

انگریز مورخین کی رائے میں ایسا ذلت آمیز صلحنامہ حکومت برطانیہ کو ایشیا میں پہلی مرتبہ تسلیم کرنا پڑا تھا اور خود سفیر برطانیہ اپنی ذلت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے روزنامچے میں تحریر کرتا ہے کہ ہر طرف سے مصیبتوں اور بلاؤں میں محصور ہو کر گراں بار ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر جن میں کوئی اور حصہ بٹانے والا تھا نہ ایسے وقت میں جب کہ برطانوی عزت و اقتدار کی کشتی بھنور میں تھی اور دشمن برطانوی فوج کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے، ہمیں مجبوراً اپنے لشکر کا ئے مصیبت کی کمزوری کی وجہ سے اس ذلت آمیز صلحنامے کی شرائط قبول کرنی پڑیں۔

اس معاہدہ پر برطانوی اور افغانی سرداروں کے نمائندوں کے دستخط ہو جانے کے بعد انگریزی افسر اعلیٰ نے تمام چھاؤنیوں میں فوج کی واپسی کے احکامات جاری کردئے۔ انگریزی فوج کابل واپسی کی تیاری کر رہی تھی کہ باغیوں نے چھاؤنیوں پر حملہ کردیا۔ اس شورش میں تین انگریزی افسر مارے گئے جس میں انگریزی سفیر بھی تھا جس کو اکبر خاں نے خود گولی ماری۔ اب قائم مقام سفیر نے افغانی سرداروں کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کیا جس کی شرائط پہلے عہد نامہ سے بھی زیادہ ذلت آمیز تھیں۔

اب نئے معاہدہ کی رو سے انگریزوں کو بطور یرغمال کے کچھ انگریز کابل میں اکبر خاں کے پاس رکھنے پڑے۔ اس کے بعد ۶ جنوری ۱۸۴۲ء کو انگریزی فوجیں کابل سے ہندوستان کو روانہ ہوئیں چونکہ موسم سرما تھا اور برفباری ہو رہی تھی، تمام راستے برفباری کی وجہ سے نہایت دشوار گذار تھے چنانچہ اس برفباری نے انگریزی فوج کو تقریباً بالکل تباہ و برباد کر دیا اور باقیماندہ فوج کو غلزیوں کے بے پناہ حملوں نے تہس نہس کر ڈالا۔ جلال آباد پہونچتے پہونچتے تمام فوج کا خاتمہ ہو گیا ایک فوجی ڈاکٹر برائڈن نامی بدقت تمام ایک تھکے ماندہ گھوڑے پر نہایت خستہ حالت میں پہنچا جس نے انگریزی فوج کی تباہی و بربادی کا ہولناک قصہ سنایا۔ اس واقعہ نے تمام انگریزوں اور خاص طور پر لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل کے دل کو غم و غصہ سے بھر دیا۔ گورنر جنرل نے رنج کی وجہ سے ہمت ہار دی لیکن مجلس شوریٰ کے ہمت بندھانے سے ایک اعلان کیا کہ جلال آباد اور قندھار کی محصور فوج کے لئے کمک بھیجی جائے تاکہ وہ اس کو چھڑا کر واپس لائے۔ لیکن اس اعلان کو عملی جامہ پہنانے سے پیشتر ہی لارڈ آکلینڈ کا عہد حکومت ختم ہو گیا اور اب نئے گورنر جنرل لارڈ الینبرو نے کلکتہ پہونچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا۔

<u>افغانستان کی دوسری جنگ</u> لارڈ آکلینڈ کے عہد حکومت کے خاتمہ پر افغانستان کی پہلی مہم کا نتیجہ بہت ہی دردناک ہوا تھا جس کی وجہ سے مدبرین برطانیہ افغانستان سے انتقام لینے کے لئے بیتاب تھے چنانچہ لارڈ آکلینڈ کے جانشین لارڈ الینبرو کے عہد حکومت میں افغانستان کی دوسری مہم روانہ کی گئی مورخین کا خیال ہے کہ دوسری مہم درحقیقت پہلی مہم کا تتمہ تھی لیکن اگر پہلی اور دوسری مہم کا بنظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلی مہم کے اسباب دوسری مہم سے بالکل مختلف تھے۔ پہلی مہم کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

۱. روسی پیشقدمی کا انسداد۔
۲. ہرات پر ایرانیوں کا قبضہ نہ ہونے دیں۔
۳. شاہ شجاع کو تخت افغانستان واپس دلانا

برخلاف اس کے دوسری مہم کے اسباب حسب ذیل تھے۔

۱۔ قندھار۔ کابل اور جلال آباد کی محصور شدہ فوجوں کی رہائی۔

۲۔ انگریزی فوجوں کے استیصال سے افغانستان میں جو انگریزی اقتدار مٹ چکا تھا۔ اس کو دوبارہ قائم کرنا۔

اس فرق سے واضح ہوتا ہے کہ دوسری مہم افغانستان کا مقصد پہلی مہم سے بالکل الگ تھا۔ اس لئے بعض مورخین نے دوسری مہم کو افغانستان کی دوسری جنگ قرار دیا ہے۔

لارڈ البنرو جو اپنے معاصرین میں مشرقی مسائل پر عام طور سے اور مسائل ہند پر خاص طور سے وسیع معلومات رکھتے تھے انھوں نے عہدۂ گورنر جنرلی کا چارج لیتے ہی سب سے پہلے ۵ رفروری ۱۸۴۲ء کو جنرل پولک کے زیر سرکردگی ایک فوج افغانستان کو روانہ کی، تاکہ وہ جلال آباد کی محصور شدہ فوج کی مدد کرے کابل کے انگریز اسیران جنگ کو رہائی دلائے پشاور سے انگریزوں اور سکھوں کی متحدہ فوجیں جلال آباد پہنچیں، جلال آباد میں جنرل سیل رابرٹ محصور تھا۔ ان امدادی فوجوں نے افغانوں سے لڑکر محاصرہ اٹھایا اور جلال آباد پر قبضہ کرلیا۔

اسی اثناء میں افغانی سرداروں نے انگریزوں سے جلال آباد خالی کرنے کا مطالبہ کیا۔ تمام فوجی افسروں نے متحدہ طور پر یہ طے کیا کہ جلال آباد کا تخلیہ نہ کیا جائے اور انگریزی فوجیں اپنے بادشاہ کے وقار کے لئے آخر دم تک لڑتی رہیں۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں افغانستان میں نہایت شدید زلزلے رونما ہوئے جس کی وجہ سے جلال آباد کا قلعہ گر کر بالکل زمین کے برابر ہوگیا لیکن انگریزی فوجوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ تھوڑے عرصے میں اس کی مرمت کرڈالی۔

اب اکبر خاں نے اپنی فوجی قوت کو مضبوط کرکے جلال آباد کا دوبارہ محاصرہ کیا۔ اور انگریزی افسروں سے جلال آباد کے تخلیہ کا مطالبہ کیا جسے انگریزی افسروں نے نامنظور کردیا۔ اس بات پر اکبر خاں نے ایک طرف انگریزی فوجوں کی رسد بالکل بند کردی اور دوسری طرف اپنے محاصرے کو تھوڑے قریب تر کرتا گیا۔ انگریزی افسروں نے ایک جانبازانہ حملہ کرکے اکبر خاں کو شکست دی اکبر خاں

کی تمام فوج منتشر ہوگئی اور اس کے تمام جنگی ذخیرے انگریزی فوجوں کے قبضہ میں آئے۔ اس کے بعد انگریزوں نے جلال آباد کے قلعہ کو مضبوط کیا۔ اب جلال آباد کے اطراف واکناف کے افغانی سرداروں نے آکر حلف وفاداری اٹھایا۔ اس طرح سے انگریزوں نے اپنا اقتدار جلال آباد پر جما یا۔ اس کامیابی سے انگریزی فوجوں کی بہت ہمت بندھی۔

اسی سلسلے میں اگر مغربی افغانستان میں انگریزی محصور شدہ فوجوں کا تذکرہ کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ افغانستان میں جو عام بغاوت انگریزوں کے خلاف پیدا ہوئی تھی اس میں باغیوں نے مرزا احمد کی ماتحتی میں قندھار پر ایک لخت حملہ کیا لیکن جنرل نوٹ اور رالنس کی فوجی قابلیت اور پامردی نے افغانوں کو پسپا کر دیا مگر جنرل انگلینڈ جس کی حفاظت میں غزنی تھا وہ افغانوں سے شکست کھا کر قندھار کی طرف پسپا ہوا اور غزنی افغانی سردار کے قبضہ میں آگیا۔

تسخیر غزنی نے انگریزی حکام کی اس رائے کی تائید کر دی کہ افغانستان میں انگریزی فوجوں کا رہنا بالکل بیکار ہے اس لئے بہتر ہوگا کہ افغانستان سے انگریزی فوجوں کو واپس بلا لیا جائے۔ مجلس شوریٰ کے مشورہ کے بعد لارڈ الینبرو نے جنرل پولک اور جنرل نوٹ کو اس مفہوم کا ایک مراسلہ بھیجا کہ قندھار اور جلال آباد کو سرنگ کے ذریعہ مسمار کر کے تمام فوجیں ہندوستان واپس چلی آئیں۔ اس مراسلہ کے جواب میں دونوں جنرلوں نے یہ لکھا کہ موجودہ حالت میں افغانستان سے انگریزی فوجوں کی واپسی انگریزی قوم کے لئے باعث بدنامی ہوگی مزید برآں محصورین کابل کو بے یار و مددگار چھوڑ کر انگریزی فوجوں کا ہندوستان واپس آنا کسی حالت میں مناسب و موزوں نہ ہوگا بلکہ اس سے انگریزی قوم کے وقار پر ایک کاری ضرب پڑے گی اور خود ہندوستان میں افغانستان سے انگریزی فوجوں کی واپسی کے متعلق کچھ اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ اس واپسی کو ہر ذی فہم ہندوستانی افغانستان میں انگریزوں کی ہزیمت کے مرادف تصور کرتا تھا۔ اب لارڈ الینبرو نے ایک اعلان شائع کیا جو حسب ذیل ہے:

"اب ہمارا اصول عمل یہ ہے کہ ہم افغانیوں پر ایک آخری اور کاری حملہ کرکے اپنی فوجی نیکنامی کو پھر قائم کر دیں تاکہ افغانیوں پر اور ہماری رعایا اور اتحادیوں پر یہ واضح ہو جائے کہ ہم ان لوگوں کو سزا دے سکتے ہیں جو سفاکیاں اور بیرحمیاں کرتے ہیں اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو قطعی طور پر واپس بلالیں نہ اس وجہ سے کہ وہاں فوجی قبضہ رکھنے کے وسائل وذرائع کی ہمارے لئے کمی ہے بلکہ اس لئے کہ ہم کو یقین ہو گیا ہے کہ جس بادشاہ کو ہم نے تخت پر بٹھایا ہے اس کے متعلق ہم کو غلط فہمی ہوئی اس لئے انگریزی قوم اس کی تائید نہیں کر سکتی"۔

انھیں ایام میں شاہ شجاع قتل کر دیا گیا اور انگریز اسیران جنگ سردار زماں شاہ کے قبضہ میں آگئے یہ سردار ان اسیران جنگ پر بہت مہربان تھا۔ لیکن تمام افغانی سرداروں نے اس کو مجبور کیا کہ وہ ان انگریزی قیدیوں کو قاضی القضاۃ کے سپرد کردے۔ زماں شاہ نے تمام قیدی قاضی القضاۃ کے سپرد کر دے جس نے سب کو اکبر خاں کے ہاتھ چار ہزار میں بیچ دیا۔ اکبر خاں نے ان اسیران جنگ کو لاکر بدیع آباد میں مقید رکھا۔ جو جلال آباد سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے اب ان انگریز اسیران جنگ کو یہ اچھا موقع مل گیا کہ انھوں نے جلال آباد کے انگریز فوجی افسروں سے خط وکتابت شروع کر دی لیکن چند دنوں کے بعد اکبر خاں نے ان قیدیوں کو کابل کے قریب کسی قلعہ میں منتقل کر دیا جہاں ان کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ آرام تھا۔

اسی زمانہ میں اکبر خاں نے ایک انگریز قیدی کے ہاتھ ایک خط جنرل ہولک کے نام جلال آباد بھیجا اس خط کا مضمون یہ تھا کہ اگر جنرل موصوف کابل کی پیش قدمی کو ملتوی کرکے اپنی فوجیں ان کے ساتھ ہندوستان واپس لے جائیں تو تمام انگریز اسیران جنگ بلا استثنار ہا کر دئے جائیں گے، ورنہ تمام قیدی ترکستان میں ازبکوں کے ہاتھ بیچڈالے جائیں گے۔ لیکن جنرل ہولک نے اس تجویز کو نامنظور کیا۔

اگست ۱۸۴۲ء میں جنرل ہولک نے کابل پر پیش قدمی کی راستہ میں غلزیوں نے راستہ روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن انگریزوں کی تازہ دم فوجوں کے سامنے تمام رکاوٹیں بے کار

ثابت ہوئیں۔ کابل کے قریب اکبر خاں نے انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا لیکن میدان انگریزوں ہی کے ہاتھ رہا اور اکبر خاں خود بھی میدان چھوڑ کر معزور ہوگیا اور انگریز قیدیوں کو اپنی دھمکی کے مطابق ترکستان بھیجدیا۔

جنرل ہولک نے ۱۵ ستمبر کو کابل فتح کر کے بالاحصار پر انگریزی جھنڈا لہرایا دوسرے دن جنرل نوٹ اپنی فوج قندھار سے لے کر کابل میں داخل ہوا۔ اب انگریزی افسروں نے انگریزی قیدیوں کی تلاش میں ایک فوجی دستہ بامیان کی طرف روانہ کیا۔ یہ لوگ افغانی سردار صالح خاں نامی کے پاس مقید تھے۔ صالح خاں نے ان قیدیوں کو انگریزوں کے حوالہ اس شرط پر کیا کہ اس کو بیس ہزار کیشت اور بارہ ہزار سالانہ دئے جایا کریں۔ یہ تمام قیدی فوجی دستے کی معیت میں کابل پہونچے جہاں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور تمام انگریزی فوج میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

استالف کوہستان کے ناقابل تسخیر قلعہ میں افغانی فوجیں سردار امین اللہ خاں کی سرکردگی میں جمع ہورہی تھیں جنرل ہولک نے ایک فوجی دستہ روانہ کیا تاکہ افغانی فوجوں کو منتشر کر کے قلعہ مذکور پر قبضہ کرلے چنانچہ اس فوجی دستہ نے تمام افغانی افواج کو منتشر کر کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

اب اگرچہ اس انتقامی مہم کی غایت پوری ہوچکی تھی اور پورے افغانستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوچکا تھا یعنی تمام افغانی سرداروں نے انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی تھی اور افغانستان میں برطانیہ کا کھویا ہوا اقتدار از سر نو قایم ہوگیا تھا۔ لیکن یہ تمام چیزیں انگریزوں کے خون آشام جذبے کو مطمئن کرنے کے لئے ناکافی تھیں چنانچہ انگریزی فوج نے تمام کابل کو لوٹا اور طرح طرح کی سفاکیاں اور بے رحمیاں کیں اور آخر میں اس پر بھی آتش انتقام ٹھنڈی نہ ہوئی تو انھوں نے کابل کے صدر بازار کو سرنگ لگا کر زمین کے برابر کردیا۔ جو فن تعمیر کے لحاظ سے تمام وسط ایشیا کی عمارتوں میں سب سے ممتاز تھا اس طرح گویا انگریزوں نے افغانوں سے انتقام لیا۔ اس فتح کے بعد لارڈ النبرو نے مندرجہ ذیل اعلان کیا۔

"وہ مصیبتیں جن کی نظیر تاریخ عالم صرف ایسے ہی موقعوں پر پیش کرسکتی ہے جب کہ ان کے نازل

ہونے کے اسباب ویسی ہی غلط کاریوں سے خود پیدا کرلئے گئے ہوں، جیسے کہ ان مصیبتوں کے لئے خود پیدا کرلئے گئے تھے وہ سب ختم ہوگئی ہیں اور تمام گذشتہ ناکامیوں کا انتقام ہر ہر موقع پر ایک مختصر سی فوج کشی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ انگلستان اور ہندوستان کی مشترکہ فوج ایک طرف اپنے سلاح جنگ "اپنی قواعد اور جانبازی اور دوسری طرف اپنے اعلیٰ درجے کے قائدوں کے اعتبار سے ایشیا کی ان تمام فوجوں کا مقابلہ کر سکتی ہے جو اس وقت میدان میں لائی جاسکیں اور ایسے تمام مخاصمین کے مقابلہ میں وہ اپنی پامردی سے کبھی میدان نہ چھوڑے گی۔ اور کبھی اس کا زور توڑا نہیں جاسکتا۔ بلکہ عنایت ایزدی سے ہمیشہ اس شاندار سلطنت کو اپنے قابو میں رکھے گی جو اس فوج نے اپنی جانبازی اور سرفروشی سے حاصل کی ہے"۔

کابل کو غارت کرنے کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو انگریزی فوجیں ہندوستان کو واپس ہوئیں ستہ میں جلال آباد کے مستحکم قلعہ کو مسار کیا۔ فتح و کامرانی کے نشہ سے مخمور یہ فوجیں فیروزپور پہونچیں جہاں ورنر جنرل نے ان کا استقبال کیا۔ دو سال قبل اسی مقام سے لارڈ آکلینڈ کے زمانہ میں افغانستان ں پہلی مہم روانہ ہوئی تھی اور گورنر جنرل نے اس کو اسی مقام پر الوداع کہا تھا۔ اس کے بعد نگریزوں نے تمام افغانی قیدیوں کو رہا کردیا اور دوست محمد خان دوبارہ تخت کابل پر رونق فروز ہوا۔

دنیا کی رفتار

(الف) ہندوستان

الہ آباد کانفرنس ہندوستان میں فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لئے اب تک معلوم نہیں کتنی کوششیں کی گئی ہیں مگر ہر سعی ناکام ثابت ہوئی اور مصالحت کی ہر گفتگو بے نتیجہ! ابتداءً فرقہ وارانہ اختلافات گائے اور باجے کی بدولت تھے لیکن نہرو کمیٹی نے خیالات اور اختلافات کا رخ بالکل بدل دیا اور گائے باجے کی جگہ چون فیصدی اور چھپن فیصدی یا جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے جھگڑے شروع ہوئے۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ چون فیصدی اور چھپن فیصدی کے سیاسی اختلافات گائے اور باجے کے مذہبی اختلافات سے اپنی شدت میں کسی طرح کم نہیں ہیں۔ سیاسی مسائل میں اختلاف رائے کوئی بری چیز نہیں، بشرطیکہ ان اختلافات سے کسی مشترکہ مقصد اور مشترکہ مفاد کو نقصان نہ پہنچے لیکن ہماری بدقسمتی سے مذہب اور سیاست کے نام پر جہالت، اور تنگ نظری، ضد اور ہٹ دھرمی مذہب کے اعلیٰ اصول اور سیاست کے مبادی سے ناواقفیت کا ایسا بدنما مظاہرہ پیش کیا گیا کہ فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے لئے ہر اجتماع "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق ہوا۔ اور بڑے بڑے رہنما اور مدبرین عاجز آکر بالآخر اس مسئلہ پر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

لیکن ملک اس وقت سیاست کے ایک نازک دور سے گذر رہا ہے، قدم قدم پر ہر شخص کو محسوس کرنا پڑا کہ بغیر فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کئے منزلِ مقصود تک پہنچنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اگر آپس میں سمجھوتہ کی کوئی صورت نہیں نکلتی تو پھر کسی ثالث کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے، ظاہر ہے کہ جو گروہ فرقہ وارانہ فیصلہ کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹیں پیدا کرتا رہا، وہ صرف حکومت وقت کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا سکتا تھا، اس لئے وزیر اعظم برطانیہ عظمیٰ نے اور بہت لیت و لعل کے بعد ان کا تصفیہ صادر ہوا "عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد"، اس تصفیہ نے ہر فرقہ کی آنکھیں کھول دیں، اور اپنی اپنی جگہ اقلیتوں نے اور سب سے زیادہ اکثریت نے یہ محسوس کیا کہ آپس کا ہر سمجھوتہ سرکاری تصفیہ سے بہرحال زیادہ بہتر ہوگا۔ ہندو اور سکھ وزیر اعظم کے تصفیہ کو مسترد کرانے کی تجاویز پر غور کر رہے تھے کہ گاندھی جی نے بھی سرکاری تصفیہ کے ایک حصہ کے خلاف اس قدر شدید احتجاج شروع کیا کہ ایک طرف ہندوؤں اور اچھوتوں کو دو چار دن کے اندر ایک متفقہ سمجھوتہ کرنا پڑا اور اس کے فوراً بعد وزیر اعظم کو چار و ناچار ہندوؤں اور اچھوتوں

کے متفقہ سمجھوتہ کو تسلیم کر کے اپنے تصفیہ میں ترمیم کرنا پڑی۔

اس موقعہ پر اکثریت نے فراخدلی کا ثبوت دیا اور وہی طرز عمل اختیار کیا جو اس کے شایان شان تھا اس کے بعد اکثریت کی طرف سے ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا اور اچھوتوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں کے ساتھ سمجھوتے کی کوشش شروع کی گئی۔ اقلیتوں کے با اثر رہنماؤں نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا اور مختلف فرقوں کے نمائندوں کا ایک اجتماع اوائل نومبر میں بمقام الٰہ آباد منعقد ہوا۔ سولہ سترہ دن کی گفتگو اور مبادلہ خیالات کے بعد تمام مختلف فیہ مسائل پر سمجھوتہ ہو گیا جو مجملاً حسب ذیل ہے۔

۱۔ مذہب و معاشرت کا تحفظ بنیادی حقوق کی دفعات میں داخل کر دیا جائے گا۔

۲۔ کسی ملت کے پرسنل لاء میں ترمیم نہ کی جائے گی جب تک کہ خود اس ملت کی طرف سے اس کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

۳۔ مذہب پر اثر انداز ہونے والے قوانین کو گورنر یا گورنر جنرل ایک سال کے لئے ملتوی کر دے گا اس کے بعد بھی اگر مجلس اس مسودہ میں کوئی ترمیم نہ کرے گی تو گورنر یا گورنر جنرل کو اختیار ہو گا کہ اس کو منظور کرے یا مسترد کرے نامنظوری کی صورت میں مرافعہ بہر حال سپریم کورٹ کے سامنے کیا جا سکے گا۔

۴۔ مرکزی حکومت کی کابینہ میں حتی الامکان مسلمان سکھ اور دوسری کثیر التعداد اقلیتوں کو رواج کے ذریعہ داخل کیا جائے گا۔ ابتدائی دس سال میں ایک نشست سکھوں کو ضرور دی جائے گی۔

۵۔ مرکزی مجلس میں برطانوی ہند کی مجموعی نشستوں میں سے ۳۲ فیصدی نشستیں مسلمانوں کے لئے اور ۴½ فیصدی سکھوں کے لئے مخصوص ہوں گی۔

۶۔ صوبجات میں آئندہ دس سال تک وہی پاسنگ قائم رہے گا جو مسلم اقلیتوں کو اب تک حاصل ہے۔

۷۔ صوبہ سرحد میں وہی نظام حکومت ہو گا جو دیگر صوبجات میں ہو گا۔

۸۔ بنگال میں دس سال تک ۵۱ فیصدی نشستیں مسلمانوں کو ملیں گی اس کے بعد نشستوں کی تخصیص خود بخود ختم ہو جائے گی۔

۹۔ پنجاب میں دس سال تک حسب ذیل انتظام نافذ رہیگا۔

(۱) وزارت میں کم سے کم ایک ہندو اور ایک سکھ ضرور ہو گا، وزارت مشترکہ طور پر مجلس کے سامنے جوابدہ ہو گی۔

(۲) اگر کسی مسودہ قانون یا وزارت کی کسی پالیسی کو تمام اقلیتوں کے ⅔ اراکین کی اقلیت

کے مفاد کے خلاف سمجھ کر مخالفت کریں تو وزارت مسودہ قانون کو واپس لے لے گی ورنہ یہ معاملہ مرکزی حکومت کے مقرر کردہ تین ججوں کی عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔ ان ججوں میں کوئی دو جج ایک ہی ملت کے نہ رکھے جائیں گے اور جس ملت کی شکایت ہوگی اس کا ایک جج ضرور ہوگا اس عدالت کا فیصلہ ایک مہینے کے اندر صادر ہو جائیگا اور صوبجاتی حکومت کو اسے قبول کرنا پڑے گا یا وزارت مستعفی ہو جائے گی، نیز اگر اس قسم کا کوئی قانون غیر سرکاری رکن پیش کرے تب بھی یہی طریق عمل اختیار کیا جائے گا۔ یہ تحفظ صوبہ متحدہ، بمبئی، سندھ اور بہار میں بھی نافذ العمل ہوگا۔

(۲) مجلس میں مخصوص حلقہائے انتخاب کو شامل کرکے نشستوں کا تناسب حسب ذیل ہوگا۔
مسلمان ۵۱ فیصدی ہندو ۲۷ فیصدی، سکھ ۲۰ فیصدی، عیسائی دو فیصدی۔

۱۰۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے گا اور جس قسم کے تحفظات دیگر صوبجات کی اقلیتوں کو دئے گئے ہیں وہی سندھ کی اقلیتوں کو دئے جائیں گے۔

(۱) وزارت مشترکہ طور پر مجلس کے سامنے ذمہ دار ہوگی اور ایک وزیر کم از کم ہندو ہوگا۔
(۲) مجلس میں ہندوؤں کے لئے ۳۰ فی صدی نشستیں مخصوص ہوں گی اس کے علاوہ ملازمت اور امتیازی قوانین وغیرہ کے متعلق بھی بالتصریح تحفظات کر دئے گئے ہیں اور دس آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی جو سندھ کی مالیات میں خسارہ پورا کرنے کی تجاویز سندھیوں کی منظوری کے لئے پیش کرے گی۔

۱۱۔ مخلوط طریق انتخاب اختیار کیا جائے گا لیکن آئندہ دس سال کیلئے محمد علی فارمولا کی مندرجہ ذیل ترمیم شدہ تجویز نافذ رہے گی:۔

جو امیدوار اپنی ملت کے کم سے کم ۳۰ فیصدی ووٹ حاصل کریں گے ان میں جسے مجموعی طور پر سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوں گے منتخب قرار دیا جائے گا۔ اگر کوئی امیدوار ایسا نہ ہو جسے اپنی ملت کے تیس فیصدی ووٹ ملے ہوں تو ان دو امیدواروں میں سے جنہیں اپنی ملت کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوں گے وہ امیدوار کامیاب ہوگا جس کی مجموعی تعداد زیادہ ہوگی۔

دس سال کے بعد تیس فیصدی کا یہ قاعدہ خود بخود ختم ہو جائے گا لیکن اس سے قبل بھی اگر کوئی ملت چاہے تو خالص مخلوط انتخاب قبول کر سکتی ہے۔

۱۲۔ حکومت ہند کو خود مختاری دی جائے اور صرف ایسے تحفظات رکھے جائیں جو ہندوستان کے مفاد کے

لئے ضروری ہوں۔ اور یہ تحفظات بذریعہ قانون ایک مدت معینہ کے لئے ہوں۔

۱۴۔ اس تصفیہ کے تمام حصّے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، ایک کے رد سے سب کا رد لازم آئے گا۔

اس سمجھوتہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہی سب باتیں طے ہوئیں جو اس سے پہلے بار بار پیش کی جا چکی ہیں لیکن مسلمان، اسلامی نقطۂ نظر سے، ہندو، قومی نقطۂ نظر سے اور سکھ، اصولی نقطۂ نظر سے اس کو قبول کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہ ہوئے کسی فرقہ کو نہ خود پر اعتماد تھا نہ دوسرے پر مگر حالات اور واقعات نے اسلامی، قومی، اور اصولی ہر سہ نقطۂ نظر میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ ہندوستان کے تینوں اہم فرقے سمجھوتے پر خود بخود راضی ہو گئے اسی سمجھوتے میں ہزار نقائص ہوں لیکن سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے تمام با اثر نمائندوں نے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ ایک نقص صرف ابھی رہ گیا ہے کہ فرنگی تجار کا کوئی نمائندہ الہ آباد کے سمجھوتہ میں شریک نہ تھا، اور ضرورت ہے کہ اس نقص کو بھی جلد از جلد دور کیا جائے۔

مسلم لیگ، مسلم کانفرنس، اور جمعیۃ العلماء کا ایک گروہ الہ آباد سمجھوتے کی تائید کر رہا ہے اور دوسرا گروہ آمادہ مخالفت نظر آتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ یہ تینوں مسلم ادارے اپنے مخصوص اجلاس علیحدہ علیحدہ منعقد کر کے جلد از جلد یہ فیصلہ کریں کہ کون اُن کے حقیقی نمائندے ہیں وہ جو ان اداروں کی طرف سے الہ آباد کے سمجھوتے کو تسلیم کر چکے ہیں۔ یا وہ جو انھیں اداروں کے نام سے سمجھوتے کی مخالفت کر رہے ہیں۔

معاہدہ اٹاوہ | اٹاوہ کانفرنس کی کارروائیوں پر رسالہ جامعہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں بحث کی جا چکی ہے گذشتہ اکتوبر میں اصل معاہدہ شائع ہوا اور کم و بیش ایک مہینہ تک پبلک کو اس پر اظہار رائے کا موقعہ ملا اس کے بعد یہ معاہدہ اسمبلی میں آخری منظوری کے لئے پیش ہوا اراکین اسمبلی نے دوران مباحثہ میں اصرار کیا کہ مسئلہ چونکہ بہت زیادہ پیچیدہ اور اہم ہے اس لئے اسمبلی کی ایک نمائندہ کمیٹی پہلے اس معاہدے کے ہر پہلو پر غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے تاکہ اراکین کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ پندرہ ارکان کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں سر ہری سنگھ گور، مسٹر مسعودی، ڈاکٹر ضیاء الدین اور سر عبدالرحیم وغیرہ شامل تھے۔ کمیٹی نے چھ دن اس اہم اور پیچیدہ مسئلہ کی تحقیق پر صرف کئے اور چار ماہرین کی رائیں بھی سنیں جس میں سے تین کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ معاہدے کے خلاف تھے۔ اس کے بعد کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ بارہ ارکان معاہدے کے حق میں

ے اور تین مخالف ہیں۔ موافقین میں سر ہری سنگھ گور، ڈاکٹر ضیاء الدین اور مسٹر مودی کے نام قابل ذکر
ں اور مخالفین میں سر عبد الرحیم، مسٹر سارد ا، اور مسٹر سیتارام راجو ہیں۔

کمیٹی اس بات پر متفق ہے کہ اس مسئلہ پر کافی غور کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ لیکن اس کے باوجود اکثریت
رائے ہے کہ ہندوستان کی تجارت برآمد کو اس معاہدے سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے اور معاہدے میں شریک نہ ہونے
صورت میں نقصان ہوگا۔ اقلیت نے اپنی اختلافی رائے میں اکثریت کے اندیشوں کو بے بنیاد اور ان کی توقعات
بلا ثابت کیا ہے۔ فریقین جن نتائج پر پہونچے ہیں وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔
اکثریت کا خیال ہے کہ ہندوستان کی تجارت برآمد میں کچھ اشیاء ایسی ہیں جن پر رعایت ملنے سے کوئی
اص فائدہ نہ ہوگا مثلاً سوت، سوتی کپڑا اور چاول وغیرہ، لیکن ان کے علاوہ بعض اور چیزیں ہیں جن پر
تیازی محصول کی وجہ سے ان اشیاء کی تجارت میں فی الفور نہ سہی لیکن بالآخر معتدبہ اضافہ ہو جائے گا مثلاً
ہوں اور سن کی مصنوعات بالخصوص ٹاٹ۔ انگلستان میں ٹاٹ کا بازار اس وقت ارجنٹائن کے قبضہ میں
ہے۔ لیکن معاہدہ کے نفاذ کے بعد ہندوستانی ٹاٹ کی تجارت انگلستان میں بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور
رجنٹائن کے لئے مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ سب سے زیادہ فائدہ اس معاہدہ سے چاء کی تجارت کو پہونچیگا
س لئے کہ انگلستان سیلون کے ساتھ نیز دیگر نوآبادیات کے ساتھ معاہدہ کر چکا ہے۔ اب اگر ہندوستان اٹاوہ
لمعاہدہ میں نہ شریک ہوا۔ تو انگلستان میں ہندوستانی چاء سیلون یا دیگر نوآبادیات کی چاء کا مقابلہ نہ کرسکے گی
ی حال کافی تمباکو اور بعض دیگر اشیاء کی تجارت کا ہے۔ کمیٹی کی اکثریت کو اس کا افسوس ضرور ہے کہ اس
معاہدہ میں بنولوں پر کسی رعایت کا ذکر نہیں ہے حالانکہ اس سے بہت زیادہ فائدہ ہندوستان کو پہونچ سکتا تھا۔
جہاں تک تجارت درآمد کا تعلق ہے اکثریت کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ امتیازی محصول کے طریقہ سے
یسی صنعتوں کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ جن صنعتوں میں کوئی تامین حاصل ہے ان میں امتیازی محصول رکھا
یں گیا ہے۔ باقی صنعتوں پر اگر اس معاہدہ کی وجہ سے کوئی مضر اثر پڑے تو ٹیرف بورڈ اس کا تدارک کرسکتا ہے
یصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ امتیازی محصولات کی وجہ سے خریداروں پر کیا اثر پڑے گا اس لئے حکومت کو
ہیئے کہ ایک کمیٹی مقرر کرے جو معاہدہ کے نفاذ کے بعد قیمتوں پر اس کے اثر کا مطالعہ کرے۔ کمیٹی کو وزیر مالیات
ے یہ اطمینان بھی دلادیا ہے کہ معاہدے کی وجہ سے جو انتظامات عمل میں آئیں گے ان میں اس بات کا خاص خیال
ما جائے گا کہ کروڑ گیری کی آمدنی میں کوئی تخفیف نہ ہونے پائے۔ اس لئے کمیٹی کی اکثریت نے تین سال کے
ے معاہدے کو تسلیم کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس مدت کے بعد حکومت ایک مفصل رپورٹ اس معاہدے کے

نتائج پر پیش کرے۔ اس وقت اگر یہ معاہدہ ہندوستان کے مفاد کے خلاف ثابت ہو تو معاہدے کی دفعہ ۱۴ کے مطابق کارروائی کی جائے یا اگر حکومت چاہے تو نوٹس مدت کے اختتام سے پہلے معاہدے کو مسترد کرنے کی ضروری کارروائیاں کر سکتی ہے۔

اکثریت کی مندرجہ بالا رائے سے سر عبدالرحیم اور ان کے دوسرے دو ہمخیال اراکین کمیٹی کو اختلاف ہے ان کی رائے میں ہندوستان کی تجارت برآمد میں کچھ اشیاء ایسی ہیں جن میں اجارہ حاصل ہے اور کچھ ایسی ہیں جن میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جن چیزوں میں اجارہ حاصل ہے ان کے لئے نہ امتیازی محصولات کی ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ۔ اور جن اشیاء میں ہندوستان کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان پر امتیازی محصولات کا یہ اثر پڑے گا کہ بجائے غیر ممالک جانے کے انگلستان کے بازاروں میں بھی جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح ہماری برآمد میں انگلستان کا حصہ بڑھ جائے گا۔ مگر ہندوستان کو اس سے کیا فائدہ پہونچے گا؟ بلکہ ان ہندوستانی تجار کو نقصان ہوگا جو ایک عرصہ سے غیر ممالک کے ساتھ کاروبار کر رہے ہیں۔ نیز غیر ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی کاروبار پر اس طرز عمل کا مضر اثر پڑے گا۔ ہندوستان کے زرعی حالات پیش نظر رکھ کر یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ تجارت بڑھنے سے خام اشیاء کی پیداوار ہندوستان میں فوراً بڑھائی جا سکے گی۔ اس لئے تجارت برآمد کا رخ بدلنے سے ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اکثریت کا یہ اندیشہ بھی بالکل بے بنیاد ہے اگر ہندوستان نے اس معاہدے کو قبول نہ کیا تو دیگر نو آبادیات ہندوستان کے مال کو انگلستان کے بازاروں سے خارج کر دیں گی۔ ہندوستان برطانیہ کا مقروض ہے اور برطانیہ مجبور ہے کہ ہندوستان کی تجارت برآمد سے اپنے قرضہ کو وصول کیا کرے۔ اور بالفرض انگلستان معاندانہ رویہ اختیار بھی کرے تو اس سے ہندوستان کو اتنا زیادہ نقصان نہ ہوگا جتنا کہ خود انگلستان کو! ہندوستان کی برآمد میں انگلستان کا حصہ بہت کم ہے!

لیکن تجارت برآمد سے زیادہ تجارت درآمد پر اس معاہدے کا اثر غور طلب اور تحقیق طلب ہے۔ معاہدے میں یہ شرط بے شک موجود ہے کہ کسی ایسی صنعت میں امتیازی محصول کا اصول نافذ العمل نہ ہوگا جس کی تامین پہلے سے کر دی گئی ہے۔ لیکن سینکڑوں صنعتیں ایسی موجود ہیں یا قائم ہوتی جا رہی ہیں جن کی تامین نہیں کی گئی ہے مگر وہ بیرونی مقابلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتی ہیں۔ اس لئے یہ اندیشہ بے جا نہیں ہے کہ یہ دیسی صنعتیں بیرونی مقابلہ میں یا تباہ ہو جائیں گی یا خاطر خواہ ترقی نہ کر سکیں گی۔ اس وقت تامینی صنعتوں میں سب سے زیادہ اہم صنعت آہنگری اور سوتی کپڑے کی صنعتیں ہیں۔ ان دونوں صنعتوں میں غیر ممالک کے مقابلہ میں انگلستان کے ساتھ خاص مراعات کی گئی ہیں اور امتیازی تامین کا جو اصول [illegible] نے تسلیم کر لیا ہے اسی کے ماتحت

ندہ بھی انگلستان کے ساتھ ایسے مراعات ہوتے رہیں گے جس سے اصول تامین کالعدم ہوجائے تعجب ہے
اکثریت یہ فیصلہ نہ کرسکی کہ امتیازی محصولات کا اثر خریداروں پر کیا پڑے گا. لیکن تجارت برآمد کے اعداد
ار پر نظر ڈالنے سے ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ ابھی بہت عرصہ تک اشیاء درآمد کا نرخ ممالک غیر کی مقرر
ہ قیمت سے مقرر ہوگا۔ اور اس لئے خریداروں پر ایک مزید بار پڑنا یقینی ہے. ان وجوہ سے سر عبدالرحیم
ان کے رفقاء اس وقت معاہدہ کے منظور کرنے کے خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ پہلے ماہرین کی ایک کمیٹی
مسئلے کے مختلف پہلوؤں کی تحقیقات کرے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

فریقین نے جو رائے ظاہر کی ہے۔ اس کے بعد اس مسئلے کا فیصلہ کرنا اور زیادہ دشوار ہوگیا ہے لیکن
ین ہے کہ اسمبلی اس معاہدہ کو رد نہ کرے گی. گو تجارتی حلقوں سے برابر اس کی مخالفت کی جارہی ہے۔

نہ مردم شماری ہندوستان کی گذشتہ مردم شماری ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء کی رات کو کی گئی تھی. اور اس کے
ج مفصل طور پر اٹھائیس جلدوں میں حکومت نے شائع کئے ہیں، مردم شماری کے اعداد و شمار
یک خلاصہ بھی شائع کیا گیا ہے. جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ء سے اس وقت تک گذشتہ دس
ں کے اندر کل آبادی میں ۱۰٫۶ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے، پیشوں کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو
آبادی میں ۴۴٫۴ فیصدی. زرعی کام کرنے والے ۱۳٫۵، تجارت کرنے والے ۹٫۹ صنعت
ت میں اور ۱٫۵۲ نقل و حمل کے کام میں مشغول ہیں. کل آبادی میں فی ہزار ۱۵۶ مرد اور ۲۹ عورتیں
ہ ہیں. انگریزی خواں مرد اور عورتوں کی تعداد فی ہزار ۲۵ اور ۳ سے زیادہ نہیں ہے. کل پڑھے
ے لوگوں کی تعداد ۲ کروڑ ۳۹ لاکھ مرد اور ۴۱ لاکھ ۶۹ ہزار عورتوں سے زیادہ نہیں ہے،
۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کا مقابلہ بعض حیثیتوں سے ایک نقشہ میں کیا گیا ہے جو دوسرے
ے پر درج کیا جاتا ہے۔

نتائج پر پیش کرے۔ اس وقت اگر یہ معاہدہ ہندوستان کے مفاد کے خلاف ثابت ہو تو معاہدے کی دفعہ ۱۴ کے مطابق کارروائی کی جائے یا اگر حکومت چاہے تو اُس مدت کے اختتام سے پہلے معاہدے کو مسترد کرنے کی ضروری کارروائیاں کر سکتی ہے۔

اکثریت کی مندرجہ بالا رائے سے سر عبدالرحیم اور ان کے دوسرے دو ہم خیال اراکین کمیٹی کو اختلاف ہے ان کی رائے میں ہندوستان کی تجارت برآمد میں کچھ اشیاء ایسی ہیں جن میں اجارہ حاصل ہے اور کچھ ایسی ہیں جن میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جن چیزوں میں اجارہ حاصل ہے ان کے لئے نہ امتیازی محصولات کی ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ۔ اور جن اشیاء میں ہندوستان کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان پر امتیازی محصولات کا یہ اثر پڑے گا کہ بجائے غیر ممالک جانے کے انگلستان کے بازاروں میں بھی جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح ہماری برآمد میں انگلستان کا حصہ بڑھ جائے گا۔ مگر ہندوستان کو اس سے کیا فائدہ پہونچے گا؟ بلکہ ان ہندوستانی تجار کو نقصان ہوگا جو ایک عرصہ سے غیر ممالک کے ساتھ کاروبار کر رہے ہیں۔ نیز غیر ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی کاروبار پر اس طرز عمل کا مضر اثر پڑے گا۔ ہندوستان کے زرعی حالات پیش نظر رکھ کر یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ تجارت بڑھنے سے خام اشیاء کی پیداوار ہندوستان میں فوراً بڑھائی جا سکے گی۔ اس لئے تجارت برآمد کا رخ بدلنے سے ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اکثریت کا یہ اندیشہ بھی بالکل بے بنیاد ہے اگر ہندوستان نے اس معاہدے کو قبول نہ کیا تو دیگر نو آبادیات ہندوستان کے مال کو انگلستان کے بازاروں سے خارج کر دیں گی۔ ہندوستان برطانیہ کا مقروض ہے اور برطانیہ مجبور ہے کہ ہندوستان کی تجارت برآمد سے اپنے قرضہ کو وصول کیا کرے۔ اور بالفرض انگلستان معاندانہ رویہ اختیار بھی کرے تو اس سے ہندوستان کو اتنا زیادہ نقصان نہ ہوگا جتنا کہ خود انگلستان کو! ہندوستان کی برآمد میں انگلستان کا حصہ بہت کم ہے!

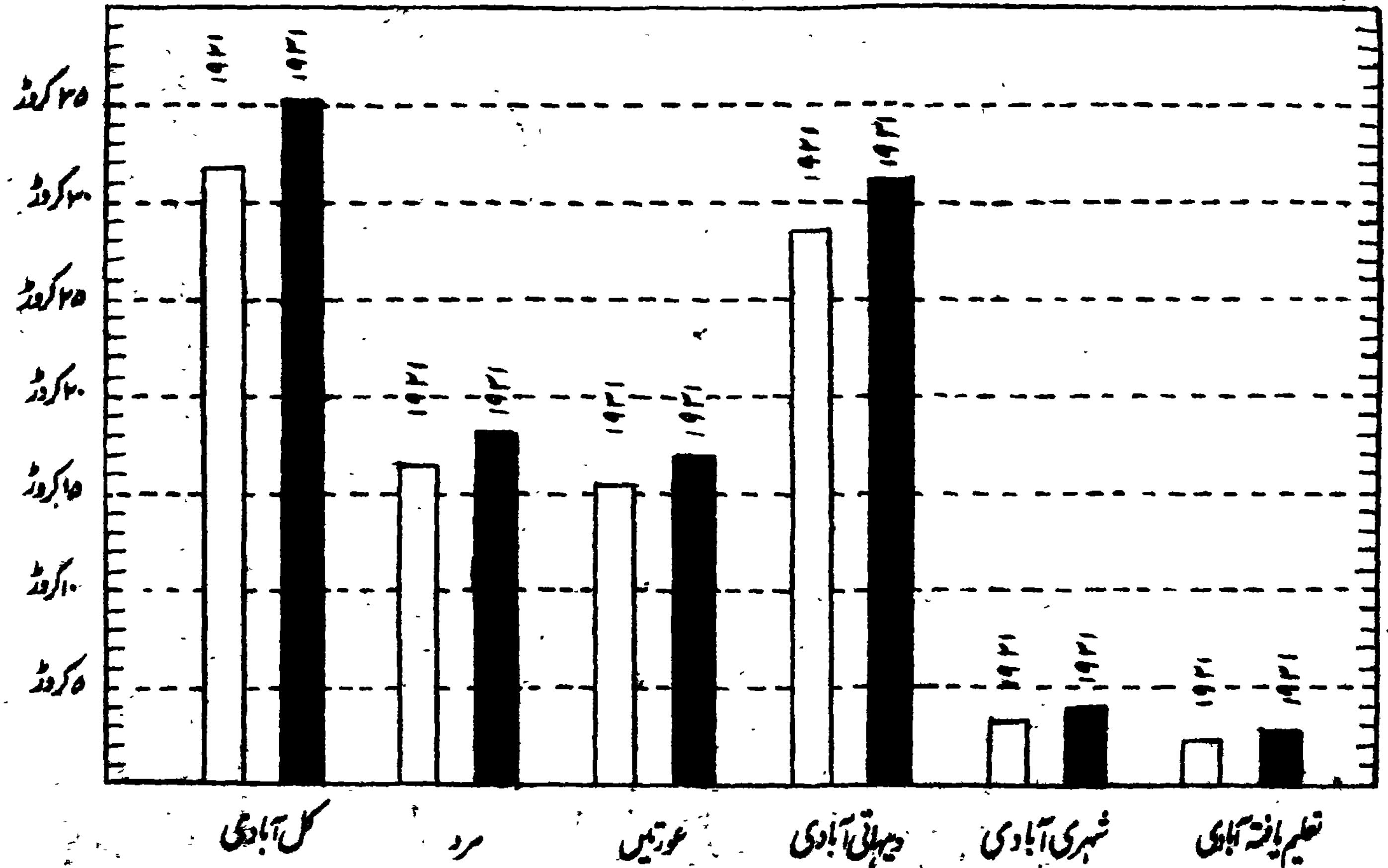
لیکن تجارت برآمد سے زیادہ تجارت درآمد پر اس معاہدے کا اثر غور طلب اور تحقیق طلب ہے۔ معاہدے میں یہ شرط بے شک موجود ہے کہ کسی ایسی صنعت میں امتیازی محصول کا اصول نافذ العمل نہ ہوگا جس کی تامین پہلے سے کر دی گئی ہے۔ لیکن سینکڑوں صنعتیں ایسی موجود ہیں یا قائم ہوتی جا رہی ہیں جن کی تامین نہیں کی گئی ہے مگر وہ بیرونی مقابلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتی ہیں اس لئے یہ اندیشہ بے جا نہیں ہے کہ یہ دیسی صنعتیں بیرونی مقابلہ میں یا تباہ ہو جائیں گی یا خاطر خواہ ترقی نہ کر سکیں گی۔ اس وقت تامینی صنعتوں میں سب سے زیادہ اہم صنعت آہنگری اور سوتی کپڑے کی صنعتیں ہیں۔ ان دونوں صنعتوں میں غیر ممالک کے مقابلہ میں انگلستان کے ساتھ خاص مراعات کی گئی ہیں اور امتیازی تامین کا جو اصول ہندوستان نے تسلیم کر لیا ہے اسی کے ماتحت

آئندہ بھی انگلستان کے ساتھ ایسے مراعات ہوتے رہیں گے جس سے اصول تامین کالعدم ہوجائے تعجب ہے کہ اکثریت یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ امتیازی محصولات کا اثر خریداروں پر کیا پڑے گا۔ لیکن تجارت برآمد کے اعداد وشمار پر نظر ڈالنے سے ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ ابھی بہت عرصہ تک اشیاء درآمد کا نرخ ممالک غیر کی مقرر کردہ قیمت سے مقرر ہوگا۔ اور اس لئے خریداروں پر ایک مزید بار پڑنا یقینی ہے۔ ان وجوہ سے سرعبدالرحیم اور ان کے رفقاء اس وقت معاہدہ کے منظور کرنے کے خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ پہلے ماہرین کی ایک کمیٹی اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کی تحقیقات کرے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

فریقین نے جو رائے ظاہر کی ہے۔ اس کے بعد اس مسئلے کا فیصلہ کرنا اور زیادہ دشوار ہوگیا ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ اسمبلی اس معاہدہ کو رد نہ کرے گی۔ گو تجارتی حلقوں سے برابر اس کی مخالفت کی جارہی ہے۔

گذشتہ مردم شماری | ہندوستان کی گذشتہ مردم شماری ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء کی رات کو کی گئی تھی۔ اور اس کے نتائج مفصل طور پر اٹھائیس جلدوں میں حکومت نے شائع کئے ہیں، مردم شماری کے اعداد و شمار کا ایک خلاصہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ء سے اس وقت تک گذشتہ دس سال کے اندر کل آبادی میں ۱۰٫۶ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے، پیشوں کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کل آبادی میں ۴۴٫۴ فیصدی۔ زرعی کام کرنے والے ۱۳٫۵، تجارت کرنے والے، ۹٫۹ صنعت و حرفت میں اور ۱٫۵۲ نقل و حمل کے کام میں مشغول ہیں۔ کل آبادی میں فی ہزار ۱۵۶ مرد اور ۲۹ عورتیں خواندہ ہیں۔ انگریزی خواں مرد اور عورتوں کی تعداد فی ہزار ۲۵ اور ۳ سے زیادہ نہیں ہے۔ کل پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ۱ کروڑ ۲۹ لاکھ مرد اور ۴۱ لاکھ ۶۹ ہزار عورتوں سے زیادہ نہیں ہے، ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کا مقابلہ بعض حیثیتوں سے ایک نقشہ میں کیا گیا ہے جو دوسرے صفحہ پر درج کیا جاتا ہے۔

…ء اور …ء کی مردم شماری کا تصویری مقابلہ



(ب) ممالک اسلامی

ترکیا جدید ترکی حکومت کے دہ سالہ جشن کی تقریب سے منچسٹر گارڈین نے اپنے ہفتہ وار ایڈیشن مورخہ ۴ نومبر میں ایک دلچسپ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

جب اتحادی مدبرین نے معاہدہ سیورے کے ذریعے ترکی کے حصے بخرے کئے تو انھیں خود ترکی کے نمائندوں کی طرف سے کچھ زیادہ مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ترکی سلطنت کی قسمت میں بھی وہی لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا جو آسٹریا ہنگری کی لیکن ان مدبروں نے اس ترکی فوج کو فراموش کردیا تھا جو بالکل مرتب حالت میں ایشیائے کوچک میں موجود تھی یہ لوگ ان "فرمانبردار خدام آل عثمان" سے بالکل مختلف تھے یہی لوگ تھے جنھوں نے ترکی کی تشکیل نو کی اور اسے ایک ایسی قومی حکومت کی شکل دی جس کی دسویں سالگرہ آج کل منائی جا رہی ہے۔ تقدیر ان لوگوں کی اچھی تھی اشتراکی روس ان کا پشت پناہ تھا اور قسطنطین کی واپسی کی وجہ سے یونان میں جو اختلافات شروع ہو گئے تھے ان کی وجہ سے بجز یونان کے اور کوئی طاقت ان لوگوں کے مقابلے پر نہ تھی۔ لوزان کے معاہدے سے ترکوں کو تمام ترکی علاقہ مل گیا اور یونانی ایشیائے کوچک سے ہمیشہ کے لئے خارج کردئے گئے۔ اس کی توقع تو کی بھی نہیں جاسکتی تھی کہ اس مقابلے کا جو بظاہر تمام دنیا کی طاقتوں سے تھا نتیجہ جب فتح کی صورت میں نمایاں ہوگا تو ترک اعتدال سے کام لیں گے۔ ان لوگوں کو جو معاہدہ سیورے کے ذمہ دار تھے اس کا خمیازہ بھی اٹھانا پڑا یونانی مظالم کا قصاص السن بالسن کے اصول پر لیا گیا اور دس لاکھ سے زیادہ یونانی ملک بدر کردئے گئے۔ "ارمنی مسئلہ" کا فیصلہ قدیم طریقے پر کیا گیا اور ایسا آخری فیصلہ کیا گیا کہ پھر یہ مسئلہ اٹھ سکتا ہی نہیں جو سفاکیاں اس تمام زمانے میں دکھائی گئیں وہ ناقابل فراموش ہیں زیادہ سے زیادہ جو کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ میدان بالکل صاف ہوگیا اور اب تو یونان نے اپنے قدیم دشمن سے سمجھوتا بھی کرلیا ہے۔ اس قومی فتح کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ آل عثمان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ خاندان سیورے کی ذلت کے ساتھ اس قدر وابستہ تھا کہ اس کی بقا کسی طرح ممکن ہی نہ تھی آخری سلطان نے ٹھیک دس برس ہوئے سلطنت سے دست برداری کی اور عثمانی خلافت نے ۱۹۲۴ء میں ساحل باسفورس سے کوچ کیا۔

یہ قدیم روایات سے ایک ایسا زبردست انقطاع تھا کہ تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں جس وقت مصطفیٰ کمال فاتح کی حیثیت میں سمرنا میں داخل ہوئے تو وہ ملک جسے انھوں نے آزاد کیا تھا ایک قدامت پسند مذہبی حکومت سے زیادہ نہ تھا۔ عبدالحمید کی اصلاحات یا نوجوان ترکوں کی کوششوں نے ترکی روایات پر بہت خفیف سا اثر چھوڑا تھا۔ ابھی تک عدالتوں پر فقہ حنفی کا اسی طرح قبضہ تھا اور دیدبینوں

کا اثر ملک میں ذرا بھی کم نہ ہوا تھا۔ کسانوں کی معلومات کا انحصار چند زبانی روایات پر تھا۔ مراعات جن کی رو سے دول خارجہ کے نمائندوں کو اپنے ہم ملک افراد کے معاملات میں تھوڑا اقتدار حاصل تھا اب تک سترھویں صدی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ اب جو اصلاحات کی گئیں وہ گو تعداد میں کم تھیں لیکن جوش عمل کو ان میں بہت زیادہ دخل تھا۔ کمال کے عاقلانہ مشورے کے مطابق ترکوں نے "اتحاد اسلامی" کے خیال کو جن سے ترکی کو گذشتہ زمانے میں بجز تکالیف کے اور کچھ ہاتھ نہیں لگا تھا بالکل ترک کر دیا۔ مجلس ملی نے پہلا کام یہ کیا کہ سرزمین عرب میں ہر قسم کے ترکی حقوق سے دستبرداری کا اعلان کیا۔ اب خلافت کی منسوخی کی وجہ سے آل عثمان سے "امیر المومنین" ہونے کا شرف بھی چھن گیا۔ ان نئے رہنماؤں نے جو فرانس کے تعلیم یافتہ تھے انقلاب فرانس کا نمونہ اپنے سامنے رکھا متشکک ہونے کے باعث ان لوگوں کے لئے آسان تھا کہ اس قدیم اتحاد پر جو تمام اسلامی سلطنتوں میں دینی و دنیاوی طاقتوں کے درمیان موجود تھا حملہ کرتے۔ درویش نکال دئے گئے خانقاہیں بند کر دی گئیں اور فقہ اسلامی کی جگہ سوئٹسانی قانون نے لے لی۔ ان اصلاحات کے نتائج کچھ عجیب سے ہوئے۔ اسلام کی بے سیون ردا کے اس آسانی سے دو ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے جب تک قرآن پڑھا جاتا ہے۔ خواہ وہ ترکی زبان ہی میں کیوں نہ ہو اس وقت تک اس کی تعلیمات اور کمال کے رائج کردہ قوانین میں جو اختلاف ہے اس کا احساس بھی مٹ نہیں سکتا۔

کمال کے قوانین نے جو انقلاب پیدا کر دیا ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ عورتیں نقاب اور حرم کے جھگڑوں سے آزاد ہو گئی ہیں اور مردوں کو سزا کی دھمکی دے کر اس بات پر مجبور کیا گیا ہے کہ چھجے دار ٹوپیاں پہنیں (یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو نماز میں سجدہ کرنے سے روکتا ہے) رغب قدس کے مراسم کو اب ایا صوفیا سے لاسلکی کے ذریعے ملک میں شائع کیا جاتا ہے۔ یہ دیکھنے میں تو بہت خفیف اور غیر اہم تبدیلیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن مشرق کے لئے جہاں رسم و رواج اور لباس پر بہت زور دیا جاتا ہے یہ بنیادی تبدیلیاں ہیں۔ کمال اسلام کی مخالفت نہیں کرتے۔ یہ سب سے بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ اسلام کا اثر عام ترکوں پر ابھی بہت گہرا ہے۔ لیکن وہ اسلام کے اجتماعی اثرات کی ہر ہر قدم پر مخالفت کر رہے ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی حالت میں جب کہ مذہب قائم ہے وہ کہاں تک کامیاب ہو سکتے ہیں ایک ایسے مذہب کی جگہ پر جس کی امتیازی خصوصیت مساوات ہے وہ اپنے پیروؤں کو قومیت کی تعلیم دے رہے ہیں۔ جنگ آزادی کے ساتھ ایک صحیح جذبہ قومیت ترکی میں پیدا ہوا اور اب ہر طریقے سے اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ترکوں کی تاریخ بالکل ابتدائی عہد سے لے کر آج تک کی دوبارہ لکھی جا چکی ہے۔ ترکی زبان عربی رسم الخط اور خارجی عناصر سے پاک کر دی گئی ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ زبان

تمام آری اور سامی زبانوں کا ماخذ یا بالفاظ دیگر ام الالسنہ ہے نئی قوموں کو ہمیشہ دردِ نمو برداشت کرنا پڑتا ہے ترکی کو باوجود عثمانی سلطنت کی قدامت کے اب از سرِ نو اپنی قومیت کا احساس ہوا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ایک طرف نئے نکھار پن ہے اور دوسری طرف وہ مظالم جو قدامت پرست ترکوں یا کردوں پر کئے جا رہے ہیں لیکن باوجود تہذیب کی ان تمام خامیوں کے جو عقل پرستوں اور فوجیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ایک پس ماندہ لیکن پرجوش اور زندہ دل قوم پر مسلط کر رہی ہے ان لوگوں کا کارنامہ ناقابلِ انکار ہے ان کی اجتماعی اصلاحات میں قومی تعلیم اور تربیت کا ایک پرجوش جذبہ بھی کارفرما ہے ان کے رفاہِ عام کے کام بہت وسیع ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ یہ لوگ اب قوموں کی برادری میں پھر داخل ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنے ہمسایوں سے تعلقات پھر اچھے کر لئے ہیں۔

ترکی زبان | منچسٹر گارڈین کا استامبولی نامہ نگار اس کے ہفتہ وار ایڈیشن مورخہ ۱۱ نومبر میں لکھتا ہے:۔ اب کہ ترکی زبان کی سب سے پہلی کانفرنس ختم ہو گئی ہے۔ اس کی تجاویز کی مجموعی روداد پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ کانفرنس کمال پاشا کی موجودگی میں ایوانِ صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ تمام ملک میں ایک بڑی جماعت مقرر کی جائے جو ان الفاظ کو جمع اور مرتب کرے جو عوام کی زبان پر تو چڑھے ہوئے ہیں مگر ادبی زبان میں ان کو جگہ نہیں ملی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ "عثمانی" زبان کو "ترکی" زبان بنا دیا جائے۔ اب تک جو زبان ترکی کہلاتی ہے وہ درباری زبان تھی۔ اور عملاً قوم کے روزمرہ سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب کہ عثمانی سلطنت ختم ہو گئی کوئی وجہ نہیں کہ عثمانی زبان قائم رہے۔

یہ امید کی جاتی ہے کہ الفاظ کے جمع کرنے کا کام چھ مہینے میں ختم ہو جائے گا دس ہزار سے لے کر پندرہ ہزار مدرسین تک اناطولیہ اور تھریس میں اس کام پر لگائے جائیں گے اس تحریک کے بار آور ہونے کی توقع اس لئے زیادہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ صرف قسطنطنیہ کے مزدوروں سے ایک شخص نے ڈیڑھ ہزار "نامعلوم" الفاظ جمع کئے ہیں، اسی طرح اناطولیہ کے چند دیہات سے ایک پرجوش کارکن نے ۲۵ ہزار الفاظ اور دوسرے نے چالیس ہزار الفاظ جمع کئے ہیں اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی جماعت نے وسطی اناطولیہ سے پندرہ ہزار الفاظ اکٹھا کئے ہیں آج کل ترکی لغات میں صرف چالیس ہزار الفاظ ملتے ہیں۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ بہت سے بیرونی الفاظ کو چھانٹ دینے کے بعد بھی اسی یا نوے ہزار الفاظ ترکی زبان کے مل سکتے ہیں۔ فرانسیسی زبان میں بھی تقریباً اتنے ہی الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کی جمع کا کام ختم ہو جائے گا۔ تو جامع استامبول کے اساتذہ کی ایک جماعت دوسرے علماء کی مدد سے ان کی چھان بین کرے گی۔ اس کام کی نگرانی مرکزی لسانی کمیشن کے سپرد کی گئی ہے جو الفاظ قبول کرئے جائیں گے۔ انھیں یہ کمیشن سرکاری طور پر اخباروں

میں یا مخصوص رسائل کی صورت میں شائع کرے گا۔ اس طرح ان الفاظ کا سرکاری داخلہ موسوعہ عام ادبی زبان میں ہوگا۔ مقصد اصلی یہ ہے کہ بول چال اور ادبی زبان میں کوئی کلی فرق باقی نہ رہ جائے پرانے الفاظ کی تلاش کے ساتھ ہی نئے الفاظ کے تراشنے کا کام بھی جاری رہے گا۔ موجودہ مرکب الفاظ کی ترکیب پر غور کرکے ایک ایسا سادہ قاعدہ مقرر کیا جائے گا جس سے علمی اور فنی اصطلاحات کے ڈھالنے میں آسانی ہو خیال ہے کہ ترکی زبان کی تخلیق نو میں یہی کام سب سے زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔ اس بات پر زور دینے کے لئے کہ عثمانی زبان ترک کردینی چاہیئے ایک عثمانی۔ ترکی لغت بھی شائع کیا جائے گا۔ یہ تجویز بھی پیش ہوئی ہے کہ نئے الفاظ کو عام نظموں اور گیتوں میں باندھنا چاہیئے تاکہ تمام قوم ان غیر شہری الفاظ سے مانوس ہوسکے اس کانفرنس میں جو خاص علمی نظریہ پیش کیا گیا تھا اور جس پر کئی مقالے بھی پڑھے گئے وہ یہ ہے کہ ترکی زبان ہندوروپی (Indo-European) سامی اور سومیری زبانوں کی جڑ ہے۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہے نہیں کہ ترکی کے علاوہ اور کسی ملک کے علماء اس نظریہ کو تسلیم نہیں کریں گے مگر ترکی علماء اس پر مصر ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ تمام دنیا کی زبانوں کا اس نظریہ کی روشنی میں پھر سے مطالعہ کیا جائے۔ ان کا بیان ہے کہ ترکی زبان کا اسلامی دور لسانی انحطاط کا دور تھا اور اس کی ذمہ داری وہ عثمانی سلاطین اور ان کے درباریوں پر رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جرکسی بیگمات اور لونڈیوں سے گھر کر سلاطین قومی زندگی اور قومی زبان دونوں سے الگ تھلگ رہنے لگے تھے۔ فتوحات کے نشہ میں سرشار ہو کر وہ اس کو فخر کی بات سمجھتے تھے کہ مفتوحہ قوموں کے الفاظ کو بھی زبان میں داخل کرلیا جائے۔ سلاطین کو خوش کرنے کے لئے درباریوں نے بھی ایک درباری ادب کی طرح ڈالی اور ہر وہ عنصر جو اناطولی یا ترکی تھا انہیں اڑا اڑا کر ادب سے خارج کردیا گیا۔ یہ خوش مذاقی میں داخل ہوگیا تھا کہ ترکی زبان کا جو "ام الالسنہ" ہے ہر طرح خاکہ اڑایا جائے اور اسے محض ایک دیہاتی زبان بنادیا جائے اس کانفرنس میں اس قسم کی "قوم نا پرستی" کو بہت برا کہا گیا۔ مقررین میں ایک ارمنی مستشرق صاحب بھی تھے جو بلغاریہ سے آئے تھے اور ایک ترکی خاتون بھی۔ بعض "راکین قبائل" بھی تھے جنھوں نے ان اصطلاحات کی پوری تائید کی۔

مصر | کچھ دنوں سے جماعت وفد میں باہمی اختلافات رونما ہوگئے تھے لیکن حال میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے "معتدلین" اور "متشددین" پھر ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سعد پاشا زغلول کے انتقال کے بعد بیگم زغلول نے اپنے گھر کو گویا وفد کا صدر دفتر بنا دیا اور اس جماعت کے سربرآوردہ ارکان برابر وہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ اس گھر کو وفدی "بیت الملۃ" اور بیگم زغلول کو "ام المصریین" کہتے ہیں۔ بیگم زغلول اس جماعت کے

متشدد طبقہ کی سردار ہیں اور سعد پاشا زاغلول کی یاد تازہ اور ان کی سیاسی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے انھوں نے خود اپنی ذات اور اپنے گھر کو وقف کر دیا ہے۔ صدقی پاشا وزیر اعظم سے یہ نہ دیکھا گیا اور انھوں نے بیگم زاغلول کو نوٹس دے دیا کہ وہ اپنے گھر کو اگر صرف اپنی ذاتی ضروریات کے لئے استعمال کریں تو اچھا ہے۔ حکومت یہ نہیں دیکھ سکتی کہ وہ ایک مخالف جماعت کا ملجا و ماوا رہے۔ اس نوٹس کا یہ اثر ہوا کہ وفد کے دونوں طبقوں میں اتحاد ہو گیا ہے اور آٹھ معتدلین نے بیگم زاغلول کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ البلاغ کی روایت ہے کہ بیگم زاغلول نے اس نوٹس کا بہت سخت جواب دیا ہے اور صدقی پاشا کو دعوت دی ہے کہ وہ جتنی سختی ان پر کر سکتے ہوں شوق سے کریں۔

عراق | گذشتہ اکتوبر میں عراق کو جمعیۃ اقوام کی رکنیت کا فخر حاصل ہو ہی گیا۔ صدر جمعیۃ نے عراق کے نمایندوں کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا۔ عراق کی نمایندگی کا شرف نوری پاشا السعید وزیر اعظم، جعفر پاشا العسکری وزیر حرب، اور رستم بے حیدر وزیر مال کو۔ صدر جمعیۃ نے اپنے خطبۂ خیر مقدم میں فرمایا:۔ "صدیوں کے پردیسی اقتدار کے بعد عراق نے بالآخر آزادی حاصل کر لی اب وہ صرف ایک چیز کا پابند ہوگا، جس کے ہم سب پابند ہیں یعنی بین الاقوامی قانون!" صدر کے اس فقرہ کو نہ معلوم جاپانی مندوب نے کن جذبات کیساتھ سنا ہوگا ؟! بغداد میں عنقریب اتحاد عربی کے قیام کے لئے ایک کانفرنس ہونے والی ہے اعزازی صدر شاہ فیصل ہوں گے اور جلسوں میں صدارت کا کام یٰسین پاشا انجام دیں گے۔ توقع ہے کہ عراق، شام، فلسطین، مصر، حجاز، تمام ممالک سے نمایندے اس میں شریک ہوں گے، عراقی صحایف میں یہ بات خاص طور پر لکھی جا رہی ہے کہ شام اور عراق میں اتحاد کا مسئلہ اس کانفرنس میں ضرور آئے گا۔

اس زمانہ میں جب قوموں میں معاشی اور سیاسی جدائی روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے قوموں میں اتحاد کی ہر کوشش بہت غنیمت معلوم ہوتی ہے اور کیا عجب ہے کہ یہ مسلمان اقوام تعاون قومی کی اس نئی راہ سے پھر اتحاد اسلامی کے فراموش کردہ تخیل کو زندہ کر دکھائیں۔

(ج) ممالک غیر

لٹن کمیشن کی رپورٹ | آج کل جنیوا میں جمعیۃ اقوام کا نہایت معرکۃ الآرا اجلاس ہو رہا ہے اور چین و جاپان کا قضیہ در پیش ہے۔ جمعیۃ کی کونسل نے ایک کمیشن لارڈ لٹن (انگریز) کی صدارت میں مقرر کیا تھا کہ اس قضیہ کی

تحقیقات کرے۔ اور دونوں ملکوں کے بنیادی اختلافات میں سمجھوتے کی کوئی راہ نکالے۔ صدر کے علاوہ کمیشن میں حسب ذیل اراکین شامل تھے۔ (۱) کاؤنٹ مارس کوتی (اٹلی)؛ ۲. آنری کلودل (فرانس) ۳. میجر جنرل راس میکائے (ریاستہائے متحدہ امریکہ) اور ۴. ڈاکٹر ہائنرش اشنے (جرمنی)۔

اس کمیشن نے اکتوبر میں اپنی رپورٹ پیش کردی۔ رپورٹ تقریباً ایک لاکھ الفاظ پر مشتمل ہے تمہید کے بعد دس باب ہیں۔

(۱) پہلے باب میں چین کی اندرونی حالت کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے۔ چین کے مختلف سپہ سالاروں نے جب کبھی کہیں اپنا اقتدار قائم بھی کرلیا تو اس کے معنی مرکزی حکومت سے علیحدگی تو نہیں سمجھے گئے لیکن ۱۹۲۱ء سے اشتراکیت البتہ مرکزی حکومت کے رقیب کی حیثیت سے سامنے آئی ہے۔ اور اس کا اثر ملک کی اندرونی حالت پر بہت خراب پڑا ہے۔ اور اس خرابی سے سب سے زیادہ نقصان جاپان نے اٹھایا ہے۔ جاپان نے بار بار مداخلت کی اور اس سے چینیوں میں سخت تلخی پیدا ہوئی۔

(۲) دوسرے باب میں منچوریا کی آبادی کا تخمینہ ۳ کروڑ کیا گیا ہے جس میں سے دو کروڑ اسّی لاکھ چینی ہیں اور کوئی ڈیڑھ لاکھ روسی؛ اور بتایا گیا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں روس اور چین کا جو معاہدہ ہوا اس نے چینی جاپانی تعلقات کی سابقہ بنیادوں کو کالعدم کردیا۔ اس اندیشہ نے کہ شمالی ملک کا اشتراکی مسلک اور جنوب میں جاپان کے خلاف کومن تانگ کا پروپیگنڈا کہیں مل نہ جائیں جاپانیوں کو یہ تدبیر سجھائی کہ ان دونوں کے بیچ میں منچوریا کو لا حائل کریں جو دونوں کے اثر سے پاک ہو۔ جاپان کی بدگمانیوں کو اس سے اور بھی تقویت پہنچی کہ پچھلے سالوں میں روس نے منگولیا میں اپنے قدم بہت مضبوط کرلئے اور چین میں بھی اشتراکیت کے مسلک کو بہت فروغ ہوا۔"

۳. تیسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ منچوریا میں چین اور جاپان کے معاشی و سیاسی مقاصد کے بنیادی اختلافات موجودہ کشمکش کا باعث ہیں جن کا اظہار اکثر و بیشتر ریلوے کی شکل میں ہوا کیا ہے۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں جب کشاکش شروع ہوئی ہے تو چین اور جاپان کے مابین کوئی تین سو تصفیہ طلب مقدمات منچوریا کے متعلق تھے! جن کے تصفیہ کی با امن سب تدبیریں بے سود نظر آتی ہیں۔

۴. فضائیں مکدر تھی ہی کہ جاپان کے وزیر جنگ نے جو تقریریں ٹوکیو میں کیں انھوں نے چینیوں کو اور مشتعل کیا۔ ناگوار واقعات پیش آئے، ۱۹ ستمبر کو جاپانیوں نے مکڈن پر قبضہ کرلیا۔ پھر اس باب میں بعد کے تمام واقعات کی تفصیل ہے اور یہ اشارہ بھی کہ جاپانیوں نے ضرورت سے زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کیا۔

۵. پانچویں باب میں واقعہ شنگھائی کی تفصیلات ہیں۔

۶. چھٹے میں منچوریا کے حالات اور وہاں نئی حکومت کے قیام کی تفصیلات ہیں۔ کمیشن کا خیال ہے کہ

منچوکو کی نئی ریاست کے قیام کے اور کتنے ہی اسباب ہوں لیکن وہ سب سے موثر اسباب یہ تھے کہ وہاں جاپانی فوجوں کا تسلط تھا، اور جاپانی افسر نئی حکومت کے قیام کی تدابیر کر رہے تھے۔ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نئی حکومت اہل منچوریا کی خواہش آزادی کا مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت میں جاپانی حکام ہی پیش پیش ہیں۔ یہ اہم محکمہ پر جاپانی مشیروں کا تسلط ہے۔ یہ جاپانی افسر جس جس طرح حکومت کے سارے نظام پر حاوی ہیں اس کی تفصیلات بھی اسی باب میں درج ہیں۔

۷۔ ساتویں باب میں چینی بائیکاٹ کی تحریک کا ذکر ہے اور بتلایا گیا ہے چین کو جاپان سے تجارت میں اتنا فائدہ نہیں جتنا جاپان کو چین سے تجارت کرنے میں ہے۔ اس لئے بائیکاٹ کا حربہ جاپان کے خلاف بہت کارگر ہے۔ خصوصاً جب حکومت اس تحریک کو پوری مدد دے جیسا کہ ۱۹۲۵ء سے ہو رہا ہے۔

۸۔ آٹھویں باب میں منچوریا کے معاشی معاملات کا ذکر ہے اور اس حقیقت کا اقرار کہ منچوریا کوئی خارجی حکومت کوئی معتد بہ مستقل فائدہ اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتی جب تک چینی آبادی کا تعاون اسے حاصل نہ ہو۔ اور نہ چین کے لئے اس وقت تک چین ہے جب تک اس علاقہ میں روز روز کے جھگڑے فساد اور تاخت و تاراج کا سدباب نہ ہو جائے۔ جاپان پر لازم ہے کہ اس علاقہ کو چینی تسلیم کرے اور چین پر واجب ہے کہ جاپان کے معاشی اغراض کی پاسداری کرے اور اس کے ساتھ ساتھ تمام دوسری دول کو اس ملک میں معاشی آزادی حاصل ہو۔

۹۔ نویں اور دسویں باب میں مستقبل سے بحث ہے۔ پہلے تو مصالحت کی ان تجاویز کا ذکر ہے جو کمیشن کی رائے میں صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ صورت حالات بالکل پہلی سی ہو جائے۔ کمیشن کے نزدیک یہ محض نظری تصفیہ ہوگا جسے حقیقت حال سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ نئی ریاست منچوکو کو قائم رکھا جائے کمیشن اسے بھی درست نہیں سمجھتا اس کا قیام چین کے مفاد کے خلاف ہوگا اور خود منچوریا کے لوگوں کی خواہشات کے خلاف۔ جاپان کے لئے بیشک معاشی اعتبار سے منچوریا میں اثر رکھنا بہت مفید ہے لیکن اس کو اپنی معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ منڈیاں بھی تو درکار ہیں اور جاپان کے لئے سب سے بڑی چین ہو سکتا ہے جو اس تصفیہ کی صورت میں وہ مشکل سے بن سکے گا۔ اس لئے یہ تصفیہ خود جاپان کے لئے بھی مفید نہ ہوگا اور اگر جاپان کی نیت یہ ہو کہ منچوریا کو کسی مخالف قوت کے ہاتھ میں پہنچ کر اپنے خلاف فوجی کارروائیوں کا مرکز نہ بننے دے تو یہ بھی محل تامل ہے اس لئے کہ ایک تو منچوریا پر فوجی قبضہ کے مصارف بے حساب ہوں گے دوسرے جنگ کی حالت میں منچوریا میں جاپانی فوج مخالف چینیوں کے ملک میں کچھ بہت محفوظ نہ ہوگی۔

چنانچہ کمیشن نے تصفیہ کے لئے یہ شرائط ضروری قرار دی ہیں:۔

التصفیہ میں چین اور جاپان دونوں کے اغراض کا پاس ہو۔

۲۔ روس کے مفاد کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

۳۔ بین الاقوامی معاہدوں کے مطابق ہو۔ جمعیۃ اقوام کے معاہدہ پیرس، اور معاہدہ واشنگٹن کے دفعا کی خلاف ورزی نہ ہو۔

۴۔ منچوریا میں جاپان کے معاشی حقوق تسلیم کئے جائیں۔

۵۔ چین اور جاپان میں منچوریا کے متعلق از سرنو معاہدہ ہو جس میں متنازعہ فیہ معاملات آئندہ کے صاف کردیئے جائیں۔

۶۔ اختلاف کی صورت میں با امن تصفیہ کی موثر تدابیر کے متعلق اس معاہدے میں دفعات ہوں۔

۷۔ چین کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرکے منچوریا کو حکومت خود مختاری دی جائے۔

۸۔ ملک میں قیام امن کے لئے مقامی جندرمہ فوج ہو۔ باقی سب فوجیں ملک سے چلی جائیں۔

۹۔ چین اور جاپان میں معاشی مصالحت کی کوشش کی جائے۔

۱۰۔ تمام اقوام کو مل کر اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ چین میں خود اندرونی حالات درست ہوں اور سیاسی سکون پیدا ہو کہ بلا اس کے جاپان ہی سے تعلقات کا درست ہونا دشوار نہیں بلکہ اور ممالک کے بھی پیچیدگیوں کا اندیشہ ہے۔

کمیشن نے آخر میں یہ مشورہ دیا ہے کہ پہلے تو جمعیۃ اقوام چین اور جاپان کو دعوت دے کہ وہ اپنے معاملات کا تصفیہ کرنے کے لئے باہم ملیں۔ جب یہ دعوت قبول کرلی جائے تو ایک کانفرنس کی جائے جس میں تینوں مشرقی صوبوں کی بے دستور حکومت کے متعلق تجاویز طے ہوں۔ اس کانفرنس میں چینی اور جاپانی حکومتوں کے نمائندے شریک ہوں۔ مقامی آبادی کی نمائندگی دو وفد کریں جن میں سے ایک چینی حکومت کی ہدایات کے مطابق دوسرا جاپانی حکومت کی ہدایات کے مطابق منتخب کیا جائے، اور اگر طرفین رضامند ہوں تو غیر جانبدار مشیر بھی بلائے جائیں بعض امور پر یہ کانفرنس متفق نہ ہو سکے وہ جمعیۃ اقوام کی کونسل کے سامنے پیش ہوں۔

اس کانفرنس کے ساتھ چین اور جاپان اپنے قضیوں کے متعلق گفت و شنید شروع کردیں، اور جلد از جلد چار دستاویزیں مرتب ہو جائیں۔

۱۔ چین کی طرف سے اعلان ہو کہ تینوں مشرقی صوبوں (منچوریا) میں کانفرنس مذکورہ بالا کے فیصلے کے مطابق حکومت قائم کی جاتی ہے۔

۲۔ منچوریا میں جاپانی حقوق کے متعلق چین اور جاپان کا معاہدہ جدید۔

۳۔ چین وجاپان میں ایک معاہدۂ صلح وتعاون جس میں متنازعہ فیہ معاملات کے پرامن تصفیہ کے متعلق دفعات ہوں۔

۴۔ چین وجاپان میں ایک تجارتی معاہدہ۔

جاپان اور منچوریا ہم نے اس نہایت اہم رپورٹ کا اقتباس اس لئے دیا ہے کہ غالباً یہی چین وجاپان کے آئندہ تعلقات کی تاریخ میں نقطۂ آغاز ہوگی اگرچہ لکھتے وقت حالات بہت امید افزا نہیں ہیں۔ منچوریا پر جاپان کا قبضہ ہے جاپانی جنرل روز جمعیۃ اقوام کے ارادوں کی سختی سے علی الاعلان مخالفت کررہے ہیں اور جاپانی حکومت ان کے اعلانات پر یا تو خاموش رہتی ہے یا ان پر مہر قبول لگاتی ہے۔ منچوریا کی نئی حکومت بہرحال ایک واقعہ ہے اور اس کا تمام وکمال جاپانی اثر میں ہونا مسلم۔ ابھی لٹن کمیشن کی رپورٹ شائع بھی نہ ہوئی تھی کہ جاپان نے اس نئی ریاست کا گورکھ دھندا کھڑا کردیا اور اسے بلا دوسروں کا انتظار کئے آزاد حکومت تسلیم کرکے اس سے معاہدہ بھی کرلیا۔ جمعیۃ کے جلسے میں پریسیڈنٹ ڈی ولیرا کا غصہ یا جمعیۃ اقوام کے ہسپانوی نمائندہ سینیور سالواڈور کا طعن ان واقعات کے اثر کو معدوم نہیں کرسکتا۔

امریکہ، روس اور جاپان دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کی رائے عامہ جاپان پر کب تک اثر نہیں کرتی؟ اور اس رائے عامہ کو امریکہ اور روس کی عملی مدد سے کہاں تک تقویت پہنچ سکتی ہے۔

گزشتہ پرچوں میں تفصیل سے بتایا جاچکا ہے کہ امریکہ جاپان کے اقدام کو بہت ناپسند کرتا ہے۔ روس بھی جانتا ہے کہ اس کے اثرات اس کے لئے بہت کچھ اچھے نہیں۔ لیکن ان دونوں قوموں کے پاس مسئلہ کا حل کیا ہے؟

امریکہ منچوریا کی نئی حکومت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا، نہ آسانی سے دنیا کی اور ریاستیں اسے تسلیم کریں گی۔ لیکن صرف تسلیم نہ کرنا کافی نہیں۔ اس سے جاپان کو نقصان پہنچ سکتا ہے مگر چین کو فائدہ نہ پہنچیگا۔ کیا کوئی چین کی اندرونی حالت کو درست کرکے منچوریا میں امن وامان قائم کراسکتا ہے؟ کیا جمعیۃ اقوام وہاں وہ کام کرسکتی ہے جو جاپان بہ جبر کررہا ہے؟ یہیں آکر جمعیۃ کی بےبسی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے پاس اپنے تعمیری پروگرام کو عمل میں لانے کی طاقت نہیں۔

ادھر روس سے بظاہر جاپان نے معاملہ ہموار کرلیا ہے۔ چند مہینے پیشتر جو فوجیں سائبیریا میں بھیجی گئی تھیں وہ واپس ہورہی ہیں۔ حال میں روس اور جاپان میں سودا ہوا ہے کہ ہر سال جاپان روس سے ایک لاکھ ٹن تیل لےگا اور عوض میں ماہی گیری کا سامان بھیجےگا۔ باکو کے تیل کے اس سے بھی بڑے بڑے سودے

عنقریب ہونے والے ہیں۔ تیل آج کل فوجی سامان میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان سودوں سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں ریاستوں کے پیش نظر اس وقت باہمی جنگ کا امکان بھی نہیں ہے اور قیاس ہے کہ روس سے جاپان کو راہ راست پر لانے میں جو مدد مل سکتی تھی اس سے دنیا کو فی الحال مایوس ہی ہونا پڑے گا۔

ہاں، اگر معاملے کے رو براہ آنے کی کچھ امید ہو سکتی ہے تو اس سے کہ موجودہ صورت حال کا جاری رہنا خود جاپان کو تباہ کر سکتا ہے۔ ملک کا رقبہ چار لاکھ مربع میل ہے۔ آبادی میں چینی اور جاپانی کی نسبت سو اور ایک کی ہے، چینی اقوام نے شبخون کا طریقہ اختیار کر لیا ہے، اور جاپانی فوج کو دم لینے کی مہلت نہیں۔ نئی حکومت کی فوجیں کرایہ کے لشکر ہیں، ٹوکیو سے تنخواہ لے کر بھی جاپان سے وفاداری یقینی نہیں اور ان پر مشکل ہی سے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں عام بدامنی پھیل گئی ہے کسانوں کی کھیتیاں اور مویشی محفوظ نہیں۔ روز دیہات لٹتے ہیں۔ ریلوں پر آئے دن چھاپے پڑتے ہیں۔ ریل گاڑیاں پٹری سے اتار دی جاتی ہیں غرض ایک عام انتشار اور خلفشار ہے اس میں امن پیدا کرنے کے لئے جاپان روپیہ کہاں سے لائے گا، جاپان ہی سے لا سکتا ہے اور وہاں بظاہر سرکاری مطالبات آخری حد کو پہنچ چکے ہیں، حکومت کے میزانیہ میں بہت بڑا خسارہ ہے، سکہ کی شرح مبادلہ گر رہی ہے؛ زرعی علاقوں کی حالت نازک ہے، چینی بائیکاٹ جاری ہے اور جاپان کی جتنی تجارت پوری مملکت چین سے ہے، اتنی صرف ایک چینی شہر کینٹن سے تھی، شاید یہ حالات جاپان کو لٹن کمیشن کے پیش کئے ہوئے طریق پر چلنے کے لئے آمادہ کر سکیں۔

جرمنی اس مہینے میں جرمنی میں پھر عام انتخابات ہوئے اس سال میں یہ پانچواں انتخاب ہے! اور ابھی ایک مہینہ سال میں اور باقی ہے! ۱۳ مارچ کو صدارت کا انتخاب ہوا جس میں فیصلہ نہ ہو سکا، پھر ۱۰ اپریل کو انتخاب ہوا ابھی ۳۱ جولائی کو رائشس ٹاگ کا عام انتخاب ہوا اور یہ نمائندے ۱۲ ستمبر کو مشکل سے چھ گھنٹے اپنی نمائندگی سے کام لے سکے تھے کہ رائشسٹاگ برخاست کر دی گئی۔ ۲۴ اپریل کو پروشیا اور کئی دوسری ریاستوں میں عام انتخابات ہوئے۔ ان سب انتخابات میں ہٹلر اور اس کی قومی اشتراکی جماعت (نیشنل سوشلسٹ کا جسے مختصر کر کے 'نازی' لکھنے لگے ہیں) اثر برابر بڑھتا گیا۔ البتہ اس نومبر والے انتخاب میں ہٹلر کی جماعت کے نمائندے کم ہو گئے ہیں جس سے پہلے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس جماعت کا اثر جتنا بڑھنا تھا بڑھ چکا تھا اب روبزوال ہے۔ اس آخری انتخاب میں غالباً ہٹلر کی جماعت کے پاس روپیہ پہلے سے کم تھا۔ بڑے بڑے اہل صنعت جو پہلے دل کھول کر ہٹلر کی مدد اس لئے کر رہے تھے کہ اس کی جماعت کے ذریعہ سے اشتراکیت اور حزب العمال کا اثر کم کر سکیں گے۔ اب انھیں ہٹلر کی ضرورت نہیں رہی۔ فان پاپن نے اپنے

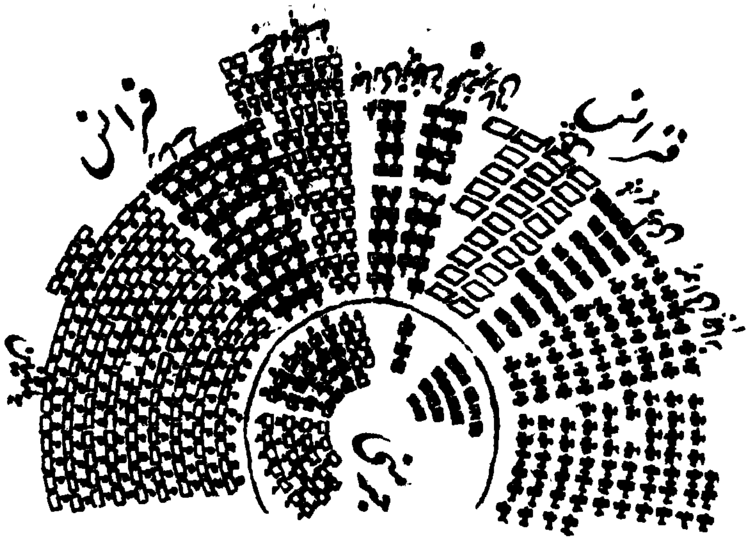
پروگرام میں انھیں وہ دے دیا جو ہٹلر نہ دے سکتا۔

متوسط طبقہ کے لوگ اور خصوصاً نوجوان جو چاہتے تھے کہ عہدنامہ ورسائی کی ان دفعات کو کالعدم کردیا جائے جو تاوان جنگ اور اسلحہ پر پابندی سے متعلق ہیں وہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہٹلر کے بغیر ہی تاوان جنگ کا مسئلہ کم و بیش ان کے موافق طے ہو ہی گیا اور دوسرے معاملہ میں فان پاپن کے نفس ناطقہ جنرل فان شلائیشر کی تیز و تند تقریریں انھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔

ادھر فان پاپن کی حکومت نے جرمنی کے تیسرے "جیبی جنگی جہاز" کی تیاری شروع کرا دی ہے جو ہر چند کہ صرف ۱۰ ہزار ٹن کا ہے مگر جنگی اعتبار سے بڑے جہازوں کا ہم پلہ ہوگا۔ پھر صدر فان ہنڈنبرگ نے پچھلے دنوں نوجوانوں کی جسمانی تربیت کے لئے ایک قومی ادارے کا آغاز کرلیا ہے اور اس کے لئے تقریباً ایک کروڑ روپیہ منظور کردیا ہے۔ تین ہفتہ تک جرمن نوجوان ایک سی وردی پہنے، کمر کسے، پشتارہ لادے سارے ملک کا چکر لگائیں گے اور حکومت ان کے تمام مصارف برداشت کرے گی۔ اس چیز نے بھی ہٹلر کی جماعت میں سے بہت سے نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ اس لئے کہ نوجوانوں کے لئے ہٹلر کی وردی اور فوجی پریڈ بہتیرے نوجوانوں کو نیشنل سوشلسٹ جماعت میں لا داخل کرتی تھی۔

لیکن ہٹلر کی قوت کم ہونے سے بھی جمہوری حکومت کے قیام میں آسانی نہیں ہوئی اس وقت رائشتاگ میں جماعتوں کی جو تقسیم ہے اس میں کوئی جماعت حکومت قائم نہیں کرسکتی نہ کوئی دو یا تین جماعتیں مل کر کام کرنے پر آمادہ ہیں۔ غالباً صدر جمہوریت پھر فان پاپن یا کسی ایسے شخص کو وزیر اعظم مقرر کردیں گے جو کسی سیاسی جماعت کا قائد نہ ہو اور اپنی ہدایت و نگرانی میں غیر جانبدارسی حکومت قائم کریں گے جس کی طرف جرمنی کی رائے عامہ بھی رفتہ رفتہ مائل ہوتی جاتی ہے۔

<u>فرانس اور جرمنی کی جنگی حکومت</u> گذشتہ اشاعتوں میں جرمنی کے اس مطالبہ کا بارہا ذکر آچکا ہے کہ افواج اور سامان جنگ کے بارے میں اسے حق مساوات حاصل ہونا چاہئے اور عہدنامہ ورسائی کی دفعات سے جرمنی کی قوت حرب پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں انھیں ختم کردینا چاہئے۔ اس پر فرانس اور ... نے شور مچایا کہ جرمنی دوسری جنگ کی تیاری کرنا چاہتا ہے اس سے امن عالم کو خطرہ ... نقشے درج کرتے ہیں جن سے جرمنی کی موجودہ فوجی بے بسی اور فرانس ...



جرمنی کے پاس		فرانس کے پاس
۱۱۳۴	ہلکی مشین گن	۱۶۰۰۰
۷۹۲	بھاری مشین گن	۱۷۰۰۰
۳۵۲	سرنگ انداز	۸۰۰
۲۸۸	ہلکا توپ خانہ	۱۵۰۰
ندارد	بھاری توپ خانہ	۱۰۰۰
...ارد	ٹینک	۱۷۰۰
	جنگی ہوائی جہاز	۱۸۰۰

نمایندگی سے کام
میں عام انتخابات ہوئے۔ ان سب
مختصر کرکے نازی لکھنے لگے ہیں) اثر برابر بڑ
کم ہوگئے ہیں جس سے بلکہ اس خیال کی
اب روبزوال ہے۔ اس آخری انتخاب میں غالباً
اہل صنعت جو پہلے کھول کر ہٹلر کی مدد اس لیے
اور حزب العمال کا اثر کم کرسکیں گے۔ اب انھیں ہٹلر کی ضرورت نہیں

شذرات

سیرت محمد علی مکتبہ جامعہ نے حال میں شائع کی ہے۔ کتاب کی ترتیب میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشورہ وہدایت کو بڑا دخل ہے اور موصوف نے دیباچہ لکھ کر اس کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

سیرت محمد علی کا مطالعہ کرنے والے محمد علی کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے بیشمار قومی و ملکی خدمات کا اجمالی بیان اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے لیکن مولانا کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی، ان کی بے چین طبیعت اور بلند ہمت بے شمار مہمات پر متوجہ رہی۔ اس جد و جہد میں ان کو اپنے عزیز دوستوں قدیم رفقائے کار قومی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں سب سے جنگ کرنی پڑی۔ ملکی تحریکات میں ان کا مرتبہ قائد کا تھا جہاں اختلاف رائے کے باعث بعض مرتبہ وہ اپنے مقلدین کو بھی خوش نہیں رکھ سکے۔ ان اسباب کی بناء پر مولانا کی سیرت میں تخاص و آرا کا تصادم قدم قدم پر نمایاں ہے اور چونکہ واقعات ہنوز تازہ ہیں اور بعض ان میں سے ابھی تک سیاسیات حاضرہ میں داخل ہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ یہ مباحث بعض حلقوں میں گرانی طبع کا باعث ہوں نیز کتاب میں بعض اختلافی مسائل کا تذکرہ اس انداز میں آگیا ہے جس سے واقعات پر رائے زنی کا گمان ہوتا ہے، لیکن اگر ایسا ہو بھی تو ان آرار کو خود مولانا محمد علی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے یا بعض موقعوں پر جناب مؤلف کی جانب۔ ورنہ کر اصل میں ابھی کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ ان واقعات پر رائے زنی کرے اور نہ اس کتاب کا یہ مقصد ہے۔

سیرت محمد علی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں سوانح حیات اور حصہ دوم مولانا کے مہتم بالشان خدمات اور کارناموں کی تفصیل ہے۔ کتاب کی حسن طباعت اور خوبیٔ ترتیب قابل ستائش ہے اور مولف سیرت رئیس احمد جعفری صاحب ندوی مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے مولانا کے بے شمار عقیدتمندوں کے لئے ایک قابل قدر تحفہ پیش کیا ہے۔

اردو اکادمی کا دوسرا جلسہ ۲۶ نومبر کو زیر صدارت مولانا محمد اسلم ...
...بد العلیم صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے اپنا فاضلانہ مقالہ "معجزہ...
...صاحب نے اس مسئلہ کی تحقیق میں کافی وقت صرف کر...
ڈاکٹر صاحب نے قرآن کے معجزے تسلیم...

کے دلائل کو نہایت شرح و بسط سے واضح فرمایا۔ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے اس مضمون کو اختیار فرما کر وہ فرض کفایہ ادا کیا ہے جو ان مسلمان نوجوانوں کے ذمہ عرصہ سے عائد ہوتا رہا ہے جنھوں نے اسلامیات اور عربی کے مطالعہ اور تحقیقات کے لیے مغربی ممالک میں بھی اپنا وقت صرف کیا ہے۔ حاضرین کی تعداد توقع سے بہت زیادہ تھی اور لوگوں نے مقالے کو بہت غور اور دلچسپی سے سنا۔

اکاڈمی کا جلسہ ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر عباد الرحمٰن صاحب صدر شعبہ جغرافیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے جادو کی لالٹین سے جاپان کے فطرتی مناظر اور معاشرتی زندگی کی بہت سی تصویریں دکھائیں یہ تصویریں نواب مسعود یار جنگ بہادر نے اپنے سفر جاپان کے سلسلہ میں حاصل کی تھیں اور اب جناب موصوف نے انھیں ازراہ علم پروری مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کو عطا فرما دی ہیں۔ یہ تصاویر واقعی قابل دید ہیں اور ان سے جاپان کی جغرافیائی ساخت، آب و ہوا، پیداوار اور خانگی، اجتماعی اور مذہبی زندگی کا اچھا خاصا اندازہ دیکھنے والوں کو ہو جاتا ہے۔ ان میں بالخصوص جاپانی پھولوں کی تصویریں خوب تھیں اور ایک دکان بہ دوش گلفروش کی تصویر تو لاجواب تھی۔

ہم ڈاکٹر عباد الرحمٰن صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اتنی زحمت گوارا کر کے نہ صرف ہماری تفریح نظر کا سامان کیا بلکہ ہماری واقفیت میں بھی اضافہ فرمایا۔
